ماہ نامہ

زندگی رام پور

شعبان سنہ ۱۳۸۲ھ
جنوری سنہ ۱۹۶۳ء

جلد ۔ ۳۰
شمارہ ۔ ۱

مدیر :۔ سید احمد عروج قادری

● خط و کتابت و ارسالِ زر کا پتہ — منیجر "زندگی" رام پور۔ یو۔ پی

● زرِ سالانہ :۔ صہ ر ششماہی :۔ تین روپیہ فی پرچہ :۔ پچاس نئے پیسے

● ممالکِ غیر سے :۔ دس شلنگ بشکلِ پوسٹل آرڈر

پاکستانی اصحاب مندرجہ ذیل پتہ پر اپنی رقوم بھیجیں اور رسید ہمیں ارسال فرمائیں۔
منیجر "ہفت روزہ شہاب" ع/۱۱ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور۔

مالک :۔ جماعت اسلامی ہند۔ ایڈیٹر :۔ سید احمد عروج قادری۔ پرنٹر پبلشر :۔ احمد حسن۔ مطبع :۔ ناظم پریس بازار نصر اللہ خاں۔ رام پور۔ یو پی
مقام اشاعت :۔ دفتر زندگی دکانیں۔ رامپور۔ یوپی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

(سید احمد قادری)

کسی قوم کی خوش حالی اور آرام و عافیت کا دور دراصل بڑی آزمائش کا دور ہوتا ہے لیکن اس آزمائش
ھنے اور دیکھنے کے لیے بصیرت کی روشنی درکار ہوتی ہے ہاں، بدحالی اور تکلیف و مصیبت کا دور ایک ایسی
ش ہے جسے انسان کی بصارت بھی دیکھتی ہے، جس چیز کو دل کی آنکھیں نہ دیکھ سکی تھیں، اسے سر کی آنکھیں دیکھ لیتی
اس وقت بھارت، ایک مصیبت کے دور سے گزر رہا ہے، اس کی سرحدوں کے اندر رہنے والے تمام باشندے
- وہ جس مذہب و ملت سے بھی تعلق رکھتے ہوں — چینی جارحیت کا ہدف ہیں۔ اگر خدانخواستہ یہ جارحیت کامیاب
ئے تو پھر کسی کی بھی خیر نہیں ہے کمیونزم — وہ تیغ تیز ہے جس کی کاٹ سے کوئی مذہبی عقیدہ اور کوئی مذہبی و
تہذیب بچ نہیں سکتی۔ وہ جبر و استبداد کا ایک ایسا نظام ہے جس کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس حملے
ملات جہاں تک پریس کا تعلق ہے، تمام ملک ہم آواز ہے، اور پورے بھارت پر قومی اتحاد کی فضا چھائی ہوئی ہے
اس بات کا قوی اندیشہ موجود ہے کہ کہیں یہ اتحاد سطحی اور عارضی نہ ہو۔ ہمارے لیڈروں اور ان لوگوں کو جن کے ہاتھوں
لک کی باگ ہے، اس پر گہری نظر رکھنی چاہیے۔ سطحی اور ظاہری یک جہتی کا اندیشہ کئی وجوہ سے پیدا ہوتا ہے۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ یہاں ایک کثیر تعداد ایسے لوگوں کی موجود ہے جو نظریاتی طور پر کمیونزم کی مومن صادق ہے
اس تعداد میں بڑی بڑی تعلیم یافتہ، ذہین و چالاک اور ذی اثر شخصیتیں داخل ہیں۔ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی
پشت پر چالیس سالہ تاریخ رکھتی ہے، اس کی تاریخ پر جن لوگوں کی نظر ہے وہ بتاتے ہیں کہ آزادی ہند کے بعد
ان لوگوں نے چین کی طرف اپنے میلان کا اظہار کر دیا تھا۔ مغربی بنگال، مدراس، اور سابق حیدرآباد کے تلنگانہ
نہ میں ان کی شورشوں اور ان کی "آزاد دستہ" کی ہنگامہ خیزیوں پر زیادہ مدت نہیں گزری ہے۔ ابھی حال میں
وستان کی سب سے چھوٹی ریاست کیرلہ میں یہ لوگ دو سال تک برسر اقتدار بھی رہ چکے ہیں، اور اقتدار پا کر جو اودھم

انھوں نے مچایا تھا وہ بھی ہمارے سامنے ہے۔ دنیا میں کمیونزم کے پھیلنے کی تاریخ بھی یہی ہے کہ پہلے کسی ملک میں مختلف بھیس میں گھس کر اس کا پرچار کیا جائے، اس پر ایمان رکھنے والی ایک مضبوط جماعت تیار کی جائے اور پھر اس کی ہر طرح مدد کر کے اس نظام کو وہاں برسر اقتدار لایا جائے۔ روس بھی یہی کرتا رہا ہے اور چین بھی یہی کرتا رہا ہے۔ توڑ پھوڑ، تخریبی سرگرمیاں، طبقاتی کش مکش پیدا کرنا، مزدوروں کو ابھار کر ہڑتالیں اور فساد کرانا اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے ہر جائز و ناجائز تدبیر اختیار کرنا اس نظام کے مسلمات میں داخل ہے۔ باہر سے فوجی کارروائی کا موقع تو شاید ہی کبھی آتا ہے اور یہ وہاں آتا ہے جہاں کے لوگ سیدھی طرح اس نظام کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ تبت، اس کی تازہ مثال ہے۔ سرخ چین نے پہلے کوشش کی کہ وہاں کے لامہ اور مذہبی عوام بطیب
قبول کر لیں لیکن جب وہ آمادہ نہ ہوئے تو پھر بزور شمشیر یہ نظام وہاں مسلط کر دیا گیا۔ اسے فو
سے بھر دیا گیا اور آج وہ بدنصیب ملک چین کی فوجی چھاؤنی اور ہندستان پر حملے کے لیے ایک
زبردست چوکی بنا ہوا ہے۔ چین کے لیڈر اس بات سے ناواقف نہ ہوں گے کہ یہ زمانہ ا
بھی براہ راست قابض رہنے کا نہیں ہے۔ اس لیے وہ ہندستان جیسے بڑے ملک پر اپنے قبضے کا خواب نہیں دیکھ سکتے۔ وہ یہاں کے عوام کو اپنے جوئے کے نیچے نہیں دبا سکتے۔ اس لیے یہ بات بالکل قرین قیاس ہے کہ وہ نیفا اور لداخ کے مطلوبہ علاقوں پر قبضہ جما کر یہاں کے کمیونسٹوں کو تقویت پہنچانا چاہتے ہوں گے تاکہ بھارت کے سر پر اُن کی سرخ تلوار لٹکتی اور ان کا لال جھنڈا لہراتا رہے اور ان کے چیلے اس تلوار کو دیکھ دیکھ کر اپنے حوصلے بڑھاتے اور اس جھنڈے کو سلامی دے دے کر بھارت کے میدانوں میں مارچ کرتے رہیں تاآنکہ یہ ملک دنیا کے سرخ دائرے میں داخل اور ان کے زیر اثر ہو جائے۔ اس طرح چینیوں کو دو بڑے فائدے حاصل ہوں گے، ایک یہ کہ اشتراکی نظام کو وسعت حاصل ہوگی اور دوسرا یہ کہ ایشیا کی قیادت کے لیے میدان اُن کے حریف سے خالی ہو جائے گا۔ یہ باتیں راز نہیں ہیں جن کی سراغ رسانی کی گئی ہو بلکہ یہ سب کے سامنے ہیں۔ اس صورت حال میں کمیونسٹوں کو جیسے ہی موقع ملے گا وہ اتحاد کے اس لبادے کو اتار پھینکنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ کریں گے جو انھوں نے اس وقت عوام اور حکومت کے دباؤ سے مجبور ہو کر مصلحتہً اوڑھ لیا ہے۔ ان کے شر سے بچنے کی حقیقی تدبیر تو یہ تھی کہ نظریاتی میدان میں کمیونزم کا مقابلہ کیا جاتا، ہندستانی عوام کے سامنے ان کے لیڈر اور سربراہ کار اشتراکیت سے بہتر نظام قولاً و عملاً پیش کرتے، یا کم سے کم اس وقت جب اشتراکیت کی جارحیت برہنہ ہو چکی ہے اس کا اصلی چہرا لوگوں کو دکھاتے۔ پورے ملک میں اس نظام کے خلاف (نہ کہ چین کے خلاف) نشر و اشاعت کی ایک مہم چلاتے۔ کیونکہ چینی عوام

خود اس جابر نظام کے نیچے دبے ہوئے کراہ رہے ہیں۔ لیکن افسوس کہ ہم اس کے خلاف مہم چلتے دیکھ رہے ہیں۔ ہمارے بڑے بڑے لیڈر چین کے ہوس ملک گیری کی پرانی تاریخ تو لے دے رہے ہیں نظر آتے ہیں لیکن اشتراکیت کی نئی تاریخ جبر پیران کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلتا۔ ہندستان کے کمیونسٹوں کی گرفتاری شاید ہی اس مرض کا علاج بن سکے۔ بہر حال رموزِ مملکت کو تو وہی جانتے ہیں، ہم جیسے عامی اس کی حقیقت کیا سمجھیں۔ لیکن اتنا لکھے بغیر چارہ نہیں کہ اگر وہ اس تدبیر کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے تو آئندہ اس جارحیت سے بچنے کی صرف ایک تدبیر اور رہ جاتی ہے کہ چینی حملہ آوروں کو میک موہن لائن سے پیچھے دھکیل دیا جائے۔ اگر نیفا یا لداخ کے کسی حصے پر بھی ان کا قبضہ تسلیم کر لیا گیا تو اس ملک پر چین کی جارحیت کا خطرہ کابوس کی طرح سوار رہے گا۔

موجودہ قومی اتحاد کے عارضی و سطحی ہونے کا جو اندیشہ پیدا ہوتا ہے اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ یہاں ایسے سورماؤں اور دیوروں کی بھی کثیر تعداد آباد ہے جس نے اپنی دیوتا کی نمائش کے لیے بھارت کے مسلمانوں کو چن لیا ہے۔ اس کی دیوتا کا نزلہ اسی عضوِ ضعیف پر گرتا ہے۔ توقع تھی کہ شاید ایسے لوگ اس نازک دور میں اپنی بس بھری باتوں اور زہریلے رویے سے باز آجائیں، لیکن یہ توقع پوری نہیں ہوئی۔ اس وقت بھی جب چین کی فوجیں آسام کی سرحدوں تک پہنچ چکی ہیں، جن سنگھی سورما بھارت کے ہندو عوام کو ہوشیار کر رہے ہیں کہ وہ مسلمانوں سے غافل نہ ہوں کیونکہ یہاں کے مسلمان بھی ہمارے دشمن ہیں۔ ان دشمنوں سے بھی ہوشیار رہنا چاہیے۔ اس زمانے میں بھی ان کے مقررین کو اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کو صلواتیں سنانے میں ذرہ برابر جھجک محسوس نہیں ہوتی۔ اور حیرت یہ ہے کہ "ہنگامی حالات" کا اعلان ہو جانے کے باوجود کوئی نہیں، جو اُن کی زبان یا قلم پکڑ سکے۔ ان کو اب بھی پوری آزادی حاصل ہے کہ وہ جس قدر چاہیں، مسلمانوں کے دلوں میں کچوکے لگائیں۔

اندیشے کی تیسری وجہ، مسلمانوں کے معاملے میں خود حکومت ہند کا رویہ ہے۔ اس کی طرف سے کوئی ایسی بات ظاہر نہیں ہوئی جس سے پتہ چلتا ہو کہ وہ وطن کی مدافعت میں مسلمانوں پر بھی اعتماد کرتی ہے۔ اب اگر کوئی شخص اس قومی اتحاد کو جس کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے سطحی و عارضی قرار دیتا ہے تو آخر کس دلیل سے اس کی بات رد کی جا سکتی ہے حالانکہ یہ ایک ایسا قدرتی موقع تھا جس سے فائدہ اٹھا کر پائدار اور دور رس قومی اتحاد و رواداری کی داغ بیل ڈالی جا سکتی تھی۔

اوپر جو کچھ لکھا گیا اس کا زیادہ تعلق برادرانِ وطن اور حکومت سے تھا۔ ہم تو صرف یہی کر سکتے ہیں کہ قابلِ لحاظ پہلو

ان کے سامنے پیش کر دیں۔ باقی رہا مسلمانوں کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر کو بدل دینا تو یہ ہمارے بس میں ہے
کب ـــــ لیکن ہمارا کام اتنی بات پر ختم نہیں ہو جاتا۔ برادران وطن اور حکومت مسلمانوں کو نظر انداز بھی کریں
جب بھی ہمیں اپنے فرائض اور ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے سے باز نہ آنا چاہیے۔ ہمارے ظرف میں اتنی وسعت ہونی
چاہیے کہ حقوق سے بے نیاز ہو کر فرائض کی طرف توجہ کر سکیں۔ بھارت کے مسلمان افراد اور جماعتوں نے بلا استثنا متفقہ
طور پر اپنا تعاون حکومت کو پیش کیا ہے اور چینی جارحیت کے خلاف اپنے غم و غصہ کے اظہار میں وہ کسی سے پیچھے نہیں ہیں
لیکن اس کے پیچھے کوئی سنجیدہ فکر بھی ہے یا نہیں یہ قابل غور ہے ۔

ہم یہاں اس بات پر غور کرنا چاہتے ہیں کہ بھارت کے مسلمانوں کو اس مسئلے میں حکومت سے
اور چینی جارحیت کے سامنے ایک مضبوط دیوار کیوں بن جانا چاہیے۔ نیز یہ بھی سوچنا ہے کہ اس تعا
اس سلسلے میں جو کچھ لکھنا چاہتا ہوں اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں کے سنجیدہ اہل فکر نے اب تک ...
بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان باتوں کو مختلف انداز میں بار بار پیش کیا جائے ۔

میں تعاون پر گفتگو سے پہلے محرک پر گفتگو ضروری سمجھتا ہوں، اس لیے کہ کسی کام کی افادیت و اہمیت کا بہت بڑا انحصار
اس محرک پر ہوتا ہے جس کے ماتحت وہ انجام دیا جاتا ہے۔ اگر محرک صحیح ہو تو کام بھی اثر انگیز اور مفید ہوتا ہے اور غلط ہو
بے اثر اور مضر ہو جاتا ہے ۔

بھارت کے مسلمان اپنے بارے میں برادران وطن کی بہت بڑی تعداد کے نقطۂ نظر سے واقف ہیں۔ وہ جانتے ہیں
کہ ان پر اعتماد نہیں کیا جاتا اور جن سنگھی ذہنیت کے لوگ انہیں غدار سمجھتے ہیں۔ اس لیے تحریر و تقریر میں جوش و خروش
اور تعاون کے دوسرے کاموں کا محرک احساس کہتری، مرعوبیت اور خواہ مخواہ کا اظہار وفاداری بھی ہو سکتا ہے۔ اگر
مسلمانوں کی کسی تھوڑی تعداد کے اندر بھی یہ محرک کام کر رہا ہو تو اسے جان لینا چاہیے کہ یہ بالکل غلط محرک ہے، اس
محرک کے تحت ان کا تمام جوش و خروش اور تعاون بے اثر رہے گا۔ ایسے لوگ اس طرح اپنے وقار کو خود اپنے ہاتھوں
مزید نقصان پہنچا دیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ مسلمانوں کو غدار کہہ رہے ہیں ان کے پاس پہلے بھی کوئی دلیل موجود
نہیں تھی ان کی بے اعتمادی اور شک و شبہہ کے وجوہ دوسرے ہیں اور وہ کل بھی موجود رہیں گے۔ کچھ لوگ ایسے بھی
ہو سکتے ہیں جو یہ سوچ رہے ہوں کہ اگر اس وقت مسلمانوں نے بھارت کی مدافعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور فوجیں محاذ
جنگ سے فتحیاب اور کامیاب واپس لوٹیں تو مسلمان زندگی کی رعنائیوں میں حصہ دار بنا لیے جائیں گے۔ یہ کوئی قیاس
نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کے ایک سنجیدہ اخبار کے اداریے میں میں نے یہ خیال پڑھا بھی ہے میرے نزدیک اس جذبے کے ساتھ

[منـ]فعتِ وطن میں حصہ اپنا صرف یہی نہیں کہ غلط ہے بلکہ حماقت بھی ہے۔ جو لوگ جنۃ الحمقاء میں قیام پسند کرتے ہیں وہی اس [طـ]رح کی باتیں سوچ سکتے ہیں ——— ایک محرک یہ بھی ہو سکتا ہے کہ با اقتدار افراد کی خوشنودی حاصل کر کے کچھ [ذ]اتی یا خاندانی منفعت حاصل کی جائے اگر کسی ایک مسلمان کے ذہن میں بھی یہ محرک پل رہا ہو تو یہ سب سے گھٹیا اور گھناؤنا محرک ہے جس قدر جلد ممکن ہو اسے اپنے ذہن کو اس گندگی سے پاک کر لینا چاہیے میرے نزدیک اس تعاون کے لیے صحیح ترین محرک صرف ایک ہے اور وہ ہے ادائے فرض۔

چینی حملہ آور ملک سے بھارت کی مدافعت میں یہاں کے مسلمانوں کو تعاون کیوں کرنا چاہیے؟ اس "کیوں" کے متعدد وجوہ واسباب ہیں

پہلی وجہ یہ ہے کہ بھارت ہم مسلمانوں کا بھی اسی طرح وطن ہے جس طرح یہاں کے دوسرے باشندوں کا۔ اور وطن کی مدافعت ہر شریف اور خود دار قوم کا فرض ہے۔

باشندگان ملک کا آپس میں اختلافات اس مدافعت میں مانع نہیں ہو سکتا یا اسے مانع نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ایک گھر کے چار شریک جن کا اس گھر کے بارے میں باہم مناقشہ بھی ہو اس بات کی اجازت نہیں دے سکتے کہ ڈاکوؤں کا کوئی گروہ اس پر قبضہ جما لے۔ اگر ایک گاؤں کے لوگ جو وہاں کے کھیتوں، باغوں اور ندی نالوں کے بارے میں جھگڑ رہے ہوں اس بات کو گوارا نہیں کر سکتے کہ دوسرے گاؤں والے زبردستی اس کے مالک بن جائیں تو آخر ایک ملک کے متنازع باشندے کیسے طرح گوارا کر سکتے ہیں کہ بیرونی حملہ آور ان کے وطن پر قابض ہو جائیں۔ اگر گھر یا گاؤں یا ملک کا کوئی شریک اس کی مدافعت و حفاظت میں تعاون نہیں کرتا یا دوسرے شرکاء کی ضد میں اس سے غفلت برتتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے فرض ہی سے آنکھیں نہیں چراتا بلکہ اپنی شرافت کو بھی داغدار کرتا ہے، اپنی حماقت کا بھی ثبوت بہم پہنچاتا اور اس طرح اپنے دعویٔ حصہ داری سے خود دست بردار ہو جاتا ہے۔ بھارت کے کچھ لوگ (اور یہ کچھ تعداد میں کتنے ہی کیوں نہ ہوں) مانیں یا نہ مانیں، یہ ملک مسلمانوں کا بھی وطن ہے، اس لیے اس کی مدافعت ان پر بھی فرض ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر خدانخواستہ چین کا اشتراکی نظام یہاں غالب آ جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارا مذہبی ملک، الحاد و دہریت کا شکار ہو جائے اور ہمیں مذہبی عبادات و مراسم کی جو آزادی حاصل ہے وہ بھی چھن جائے۔ چین کی سرخ حکومت خدا کی منکر ہے۔ وہ ہر ایسے عقیدے، ہر ایسی رسم، ہر ایسی عبادت، ہر ایسے تمدن اور

ہر ایسی تہذیب کی دشمن ہے جس میں کسی نہ کسی حیثیت سے خدا اور آخرت کا تصور موجود ہو۔ گویا چین کا حملہ صرف ہمارے وطن پر نہیں ہے بلکہ ہمارے عقیدہ و مذہب اور تمدن و تہذیب پر بھی ہے۔ اس لیے چین کے خلاف مسلمانوں کا تعاون صرف تحفظ وطن کی حیثیت سے نہیں بلکہ تحفظ مذہب کی جہت سے بھی ضروری ہے۔ ہماری مسجدیں، مدرسے، خانقاہیں، ہماری عبادتیں، ہمارے مذہبی تہوار اور ہماری اخلاقی و روحانی قدریں براہ راست اس تیغے کی زد میں ہیں۔ ان سب کو بچانے کے لیے اور اشتراکیت کی خدا بیزاری و الحاد سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان اپنا پُرخلوص تعاون پیش کریں۔ وہ مسلم ممالک جو روسی و چینی سامراج کے شکنجے میں پھنسے ہوئے ہیں، ہماری عبرت کے

ہمارے تعاون کی تیسری وجہ اس جمہوریت کا تحفظ بھی ہے جس کا ہندستان علمبردار ہے
ہی ناقص کیوں نہ ہو، اس جبّارانہ ڈکٹیٹرشپ سے کہیں بہتر ہے جو چین پر چھائی ہوئی ہے۔ گزشتہ
استبداد اس استبداد کا پاسنگ بھی نہ تھا جو عہد حاضر کے "عوامی لیڈر" ماؤزے تنگ کی "جمہوریت نواز [illegible]"
ہے۔ اس استبداد کو وہی لوگ خوش آمدید کہہ سکتے ہیں جنہوں نے اپنے ذہن کو خدا، مذہب، اخلاق اور جوہر انسانیت سے خالی کرلیا ہو ——— مختصراً یہ وہ اسباب ہیں جن کی بنا پر مسلمانان ہند کو چینی جارحیت کے خلاف اپنا تعاون پیش کرنا چاہیے

آخر میں مسلمان بھائیوں اور بہنوں کو اس بات کی طرف متوجہ کرنا ضروری ہے کہ اس ادائے فرض اور اس تعاون کے لیے بھی ہمارے دین و مذہب نے کچھ حدود مقرر کیے ہیں انہیں ان حدود کو توڑنا نہ چاہیے۔ اپنا ہر تعاون شرعی و اخلاقی حدود کے اندر پیش کرنا چاہیے۔ کیونکہ مسلمان کے لیے مذہب و اخلاق تمام دوسری چیزوں پر مقدم ہے۔ رقص و سرود، بے جا جوش و خروش، نقصان رساں مظاہرے، بے قابو جلسے و جلوس نہ صرف اسلامی نقطۂ نظر سے غلط ہیں بلکہ سنجیدگی و وقار کے بھی خلاف ہیں۔

دوسری مسلم جماعتوں کی طرح جماعت اسلامی ہند نے بھی حکومت کو اپنا تعاون پیش کیا ہے۔ جماعت اسلامی ہند کے لیے چینی حملے کی پسپائی ان وجوہ و اسباب کی بنا پر تو ضروری ہے ہی جن کا ذکر اوپر گزرا، اس کے لیے چینی جارحیت سے مقابلہ ایک اور سبب سے بھی ضروری ہے اور وہ ہے اس کا نصب العین، اس کی جد و جہد، اس کا مقصد حیات۔ اگر خدانخواستہ یہاں چینی جارحیت غالب آجائے تو یہ بات کسی درجے میں ممکن بھی ہوسکتی ہے کہ مسلمانوں ان کے کچھ حقوق مل جائیں۔ انہیں سجدے اور روزے کی اجازت حاصل ہوجائے لیکن جو بات عملاً ناممکن کا درجہ اختیار کرلیتی [illegible]

خالص اشتراکی مملکت میں آزادیٔ رائے، آزادیٔ ضمیر اور آزادیٔ تبلیغ کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا وہاں تو
سانی خیال و فکر تک پر پہرا بٹھانے کی کوشش کی جاتی ہے اس لیے اس نظام میں تحریک اسلامی کا نام لینا بھی جرم ہوگا
ب اگر جماعت کو اپنے نصب العین سے محبت ہے تو اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ اس نظامِ استبداد کو روکنے کے لیے
ر جائز تدبیر اختیار کرے۔ اور اس کے بس میں جو کچھ ہے کر گزرے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس کے پاس نہ مال و دولت
ی فراوانی ہے اور نہ ان ذرائع و وسائل میں سے کسی پر قابو حاصل ہے جن سے جنگ جیتی جاتی ہے لیکن اس کے
پاس ایک ایسی شے ہے جو حقیقت نفس الامری کے لحاظ سے سب سے زیادہ قیمتی اور انمول دولت ہے وہ ہے حق کا
پیغام، اسلام کی دعوت اور ایک صالح ترین نظام زندگی کی امانت، وہ شعور کے ساتھ اس حقیقت پر یقین رکھتی
ہے کہ آج خشکی و تری میں جو ہولناک فساد پھوٹ پڑا ہے اس کا سبب صرف یہ ہے کہ انسان خدا کا باغی بنا ہوا ہے،
جو اس کائنات کا حقیقی فرماں روا ہے۔ انسان نے اس دستورِ حیات کو پسِ پشت ڈال دیا ہے جو اللہ نے اس کی فلاح
بہبود کے لیے نازل کیا تھا، وہ خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے ان رہنماؤں کی پیروی سے انکار کر رہا ہے جو انسانیت
کے سچّے بہی خواہ تھے وہ آخرت کی اس عدالت سے بالکل بے پروا ہے جو قائم ہو کر رہے گی اور انسانوں کے بارے
میں اس کا فیصلہ حقیقی عدل و انصاف کا مظہر ہوگا نیز یہ کہ وہاں کی کامیابی بھی ابدی ہوگی اور ناکامی بھی ابدی ہوگی۔

جماعت اسلامی ہند کی مجلس شوریٰ نے اپنے ارکان کو جو ہدایات دی ہیں وہ عرصہ ہوا شائع ہو چکی ہیں
اور ان کے مطابق پورے ملک میں کام بھی ہو رہا ہے۔ اس وقت یہ ہمارے لیے بڑا اچھا موقع ہے کہ ہندوستانی
عوام کے سامنے اشتراکیت کا بھیانک رخ پیش کریں۔ کل تک ہم نظریاتی طور پر لوگوں کے سامنے اس نظام کی
خرابیاں پیش کرتے تھے اور آج ہم سب عملاً اس کے ظالمانہ حملے کا مزا چکھ رہے ہیں۔ اس لیے اس وقت اس نظام کی
ایک ایک خرابی کو لوگوں کے سامنے واضح کر کے اس کے مقابلے میں اسلامی نظام کی خوبیاں واضح کرنی چاہییں۔ روپے
پیسے اور سونا چاندی کا مادی تعاون بھی ایک بڑا تعاون ہے لیکن روحانی و اخلاقی تعاون کا درجہ اس سے بہت
اونچا ہے۔ ملک کے سامنے اگر وہ صحیح طریقِ زندگی واضح ہو جائے جس پر چل کر وہ اپنے اخلاق و کردار کو بلند
کر سکتا اور مادی و روحانی ترقیوں کے آسمان پر پہنچ سکتا ہے تو یہ تعاون ہر دوسرے تعاون سے زیادہ قیمتی ہوگا۔

اوپر کی تحریر نومبر کے تیسرے ہفتے میں لکھی گئی تھی۔ اُس وقت سے اب تک حالات میں تھوڑا سا فرق ہوا ہے
ایک یہ کہ چین کی حکومت نے اچانک یک طرفہ جنگ بندی کا اعلان کر دیا اور محاذِ جنگ عارضی طور پر (باقی ص۴۶ پر)

قرآن کا تعارف

(مولانا سید جلال الدین عمری)

ایسے بہت سے لوگ آپ کو ملیں گے جو قرآن کو ایک مذہبی کتاب سمجھتے ہیں، جا
ہے۔ یہ تعارف قرآن اور انسانوں کے درمیان ایک زبردست حجاب ہے۔ وہ ا
ہاتھ نہیں لگاتے اور دور بھاگتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مذہبی کتابوں کے ساتھ د
گئے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ بے دلیل عقائد کا مجموعہ ہیں اور ان کی تعلیمات بعید از عقل اور دور از کار ہوتی ہیں۔ یہ
کتابیں دلیل سے اپنی بات نہیں ثابت کرتیں، بلکہ زبردستی منوانا چاہتی ہیں۔ مذہب دورِ قدیم کی یادگار ہے
جب کہ انسان اوہام و خرافات میں گرفتار تھا اور مذہبی کتابیں اسی دور کی ترجمان ہیں۔ ان کو بے دلیل تو مانا
جا سکتا ہے لیکن عقل کی کسوٹی پر جانچا نہیں جا سکتا۔

مذہبی کتابوں کے بارے میں دوسرا تصور یہ ہے کہ وہ پوجا پاٹ کی تعلیم کے دفتر ہیں۔ ان کا سرمایہ چند
مذہبی مراسم کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ہماری زندگی سے ان کا تعلق ان ہی مراسم کی حد تک ہے، اس کے بعد وہ ہم
سے کٹ جاتی ہیں۔ وہ چند مذہبی رسوم کا مطالبہ کرتی ہیں ان رسومات کو انجام دینے کے بعد ان کا مطالبہ ختم ہو جاتا
ہے۔ وہ یہ تو بتاتی ہیں کہ مذہب کے رسوم کس طرح ادا کیے جائیں لیکن یہ نہیں بتاتی ہیں کہ زندگی کے پیچیدہ مسائل
کیسے حل کیے جائیں۔ ان کتابوں میں یقیناً بعض اخلاقی تعلیمات ملتی ہیں لیکن ان تعلیمات کے لیے ہم ان کے محتاج
نہیں ہیں، بلکہ انسان کی عقل اور فطرت خود سے انہیں معلوم کر سکتی ہے۔ ہماری اجتماعی و انفرادی زندگی کے
لیے ان میں کوئی ہدایت اور رہنمائی نہیں ہے۔

قرآن کے بارے میں یہ دونوں تصورات صحیح نہیں ہیں۔ وہ عام معنوں میں 'مذہبی کتاب' نہیں ہے بلکہ ایک
'نظریاتی کتاب' ہے، جو براہِ راست آپ کی عقل سے اپیل کرتی ہے۔ اس کا مطالبہ یہ ہرگز نہیں ہے کہ بے دلیل اس
کی بات مان لی جائے بلکہ وہ سنجیدہ غور و فکر کی طالب ہے۔ قرآن بے دلیل بات نہیں کہتا بلکہ جو کچھ کہتا ہے اس

کے پیچھے دلیل ہوتی ہے۔ وہ زندگی کے کسی ایک گوشے سے بحث نہیں کرتا بلکہ پورا 'دین' پیش کرتا ہے اور آپ کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ اسے شکایت ہے کہ خدا نے انسان کو عقل دی ہے لیکن وہ اس سے کام نہیں لیتا' اس کے ارد گرد غور و فکر کا سامان پھیلا ہوا ہے لیکن وہ آنکھیں کھول کر چاروں طرف نہیں دیکھتا' بلکہ جانور کی طرح سر جھکائے دلائل پر سے گذر جاتا ہے۔ جو لوگ آنکھ رکھنے کے باوجود نہیں دیکھتے، کان رکھنے کے باوجود نہیں سنتے، دل و دماغ رکھنے کے باوجود نہیں سوچتے ان کے بارے میں اس کا فیصلہ ہے کہ" اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ " (وہ چوپائے ہیں بلکہ ان سے بھی بدتر)

قرآن نے جن لوگوں سے سب سے پہلے خطاب کیا انھوں نے اس کی سخت مخالفت کی' اسے شاعری کہا' افسانہ کہا' قصۂ ماضی کہا، پیغمبر کی من گھڑت داستان کہا، دیوانہ کی بڑ کہا لیکن اس کے باوجود قرآن نے سنجیدگی سے انہیں جواب دیا کہ محض پھبتیاں کسنے اور پیغمبر پر دیوانگی کا الزام لگانے سے تمہاری ذمہ داری ختم نہیں ہو جاتی۔ تم انسان ہو' اللہ نے تمہیں سمجھ بوجھ عطا کی ہے۔ ٹھنڈے دل سے سوچو' تنہائی میں اور اپنی مجلسوں میں اس پر غور کرو اور اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو کہ قرآن کی مخالفت صحیح ہے یا نہیں؟ کیا یہ تمہاری عقل کا فیصلہ ہے یا محض ہٹ دھرمی میں سب کچھ کیے جا رہے ہو؟ اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ بِهٰذَآ اَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ الطور۔ (کیا ان کی عقلیں ان سے یہی کہتی ہیں۔ یا وہ سرکشی کر رہے ہیں)

قرآن کا دعویٰ ہے کہ انسان خدا کا بندہ ہے اسے صرف خدا کی عبادت کرنی چاہیے اسی میں اس کی ابدی نجات ہے۔ 'عبادت' پرستش کے ہم معنی لفظ نہیں ہے بلکہ عبادت یہ ہے کہ انسان خدا کے احکام کا تابع بن جائے اور اس کی ہدایت کے سامنے جھک جائے۔ 'عبادت' خدا کی مکمل غلامی کا نام ہے۔ اس کا تعلق ہماری زندگی کے کسی ایک گوشے سے نہیں ہے بلکہ پوری زندگی سے ہے۔ عبادت میں اس نفاق کی گنجائش نہیں ہے کہ پرستش تو خدا کی کی جائے اور معاملاتِ زندگی میں خدا کو چھوڑ کر کسی اور کی اطاعت کی جائے۔ ذکر و فکر تو خدا کا ہو اور پیروی نفس اور شیطان کی رہے شخصی زندگی میں تو خدا کا چرچا ہو اور اجتماعی زندگی سے اس کا تعلق نہ رہے۔ اگر زندگی کا کوئی ایک گوشہ بھی خدا کی غلامی سے آزاد ہے یا اس پر غیر خدا کی حکومت ہے' تو عبادت ناقص ہوگی۔ عبادت کا حق اسی وقت ادا ہوگا جب کہ انسان اپنے تمام معاملات میں خدا کی تابعداری قبول کرلے اور خدا کے سوا ہر ایک کی غلامی سے کٹ کر صرف خدا کا بندہ بن جائے۔

انسان کی حیثیت کے بارے میں قرآن کا یہ دعویٰ انتہائی معقول اور مدلل دعویٰ ہے' کوئی شخص

آسانی سے اس کی تردید نہیں کرسکتا۔ آپ اس پر جس پہلو سے بھی غور کریں گے اس میں کوئی خلا یا نقص نہیں محسوس کریں گے۔
کسی دعوے کی صداقت کو تین طریقوں سے جانچا جاسکتا ہے۔ عقل، نفسیات اور تاریخ۔ قرآن کے دعوے کی تائید ان تینوں طریقوں سے ہوتی ہے۔ اس دعوے کے ثبوت کے لیے کسی کھنڈر کی کھدائی یا کسی کتاب کی ورق گردانی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ انسان کی عقل و شعور کے فیصلے، اس کے جذبات و احساسات اور اس کی فطرت کے تقاضے اس کی گواہی دیتے ہیں اور انسانی تاریخ کا کوئی واقعہ آپ کو ایسا نہیں ملے گا جو اس کی تردید کرتا ہو۔ چنانچہ قرآن نے اپنے دعوے کی تائید میں علمی و نفسیاتی دلائل بھی دیے ہیں اور تاریخی:

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي	ہم انہیں اپنی نشانیاں آفاق
أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ	ان کے نفوس میں دکھائیں گے، یہاں
الْحَقُّ ۔	ہو جائیگا کہ یہ قرآن حق ہے۔
وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ	وہ بھلائی کے بجائے برائی کے لیے جلدی
الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِمُ	مچاتے ہیں حالانکہ ان سے پہلے (خدا کے باغیوں کی تباہی
الْمَثُلَاتُ (الرعد ۶)	کی) مثالیں گزر چکی ہیں۔

آئیے ان دلائل کی روشنی میں قرآن کے دعوے پر کسی قدر تفصیل سے غور کریں۔

عقل کا فیصلہ

یہ کائنات کیسے وجود میں آئی، اس کے بارے میں جو سب سے زیادہ نامعقول بات کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کا کوئی پیدا کرنے والا نہیں ہے بلکہ وہ از خود وجود میں آگئی ہے۔ عقل سے قریب تر بات یہ ہے کہ اس کا ایک خالق ہے جس نے اسے پیدا کیا ہے۔ اسی کو ہم خدا کہتے ہیں۔ جب یہ کائنات خود بخود نہیں پیدا ہوئی ہے تو انسان بھی خود سے نہیں پیدا ہوا ہے بلکہ خدا نے اسے پیدا کیا ہے، لہٰذا عقل کا صریح تقاضا ہے کہ اسے خدا ہی کی غلامی کرنی چاہیے۔ یہ ایسی حقیقت ہے جس کی تائید کائنات کے ذرہ ذرہ سے ہوتی ہے۔ قرآن اپنے دعوے کے ثبوت میں کائنات کی کوئی ایک چیز نہیں بلکہ پوری کائنات پیش کرتا ہے اور پوچھتا ہے کہ یہ آسمان جو تمہارے اوپر بلند کیا گیا ہے، یہ زمین جو تمہارے قدموں کے نیچے بچھائی گئی ہے۔ یہ جنگل و بیابان، یہ دریا اور پہاڑ، یہ میوے اور کھیتی باڑی، یہ بارش کی خنکی اور نسیم سحری کی لطافت جن سے تمہاری زندگی کا علیش ترکیب پاتا ہے کیا یہ خود بخود پیدا ہو گئے ہیں؟ کیا خدا کے علاوہ ان کے پیدا کرنے میں کسی اور کا بھی ہاتھ ہے؟ اس وسیع کائنات میں خدا

کے سوا کون ہے جو دانہ کو پھاڑ کر پودا نکالتا ہے، کون ہے جو بے جان مادہ میں زندگی کی روح پھونکتا ہے، کس کے حکم سے صبح کی نمود اور سکوتِ شب نصیب ہوتی ہے، کون چاند، سورج، زمین اور دوسرے سیاروں کو گردش دیتا ہے؟ جب خدا کے سوا کسی دوسرے میں یہ طاقت نہیں ہے تو تمہارے لیے خدا کے سوا کسی دوسرے کی بندگی بھی جائز نہیں ہے۔ یہ بات انتہائی غلط ہوگی کہ زمین و آسمان سے تم پر خدا کی نعمتوں کی بارش ہوتی ہو اور تمہارے جذباتِ عبودیت کسی دوسرے کے لیے ہوں۔ خدا تم پر شب و روز اپنا احسان کرے اور تمہاری پیشانی پر غیرِ خدا کی غلامی کا داغ ہو۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوا نِعْمَتَ	اے لوگو! اپنے اوپر اللہ کے احسان کو
اللَّهِ عَلَيْكُمْ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ	یاد کرو۔ کیا اللہ کے علاوہ بھی کوئی خالق ہے جو تمہیں
اللَّهِ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ	آسمان اور زمین سے رزق پہنچاتا ہے؟ (واقعہ
لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ فَأَنَّىٰ تُؤْفَكُونَ ○	یہ ہے کہ) سوائے اس کے کوئی بندگی کے قابل نہیں
(فاطر: ۳)	ہے۔ پھر تم کہاں بہکائے جا رہے ہو۔

جس شخص کے اندر مطالعہ کائنات کی صلاحیت ہے وہ ہر آن قرآن کی صداقت کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔ اس کے سامنے ہر لمحہ ایسی دلیلیں آئیں گی جو قرآن کی تائید کرتی ہیں۔ صبح و شام کا ہر انقلاب اس کے لیے غور و فکر کا قیمتی مواد فراہم کرے گا۔ اگر ایک دلیل اس کے لیے اطمینان بخش نہ ہو تو دوسری دلیل تشفی کا سامان فراہم کر سکتی ہے لیکن افسوس کہ غلط افکار و خیالات نے عقل پر پردے ڈال دیے ہیں اور دلائل کی روشنی میں سوچنے والے انسان کم ہیں۔

نفسیّات کی تائید

قرآن کے دعوے کا ثبوت خارج کی دنیا ہی نہیں پیش کرتی بلکہ انسان کی نفسیات بھی اس کی تائید کرتی ہیں۔ انسان کی عقل و بصیرت اسے جس طرف لے جاتی ہے وہ وہی راہ ہے جو قرآن بتاتا ہے۔ اس کے جذبات و احساسات جس حقیقت تک رسائی کے لیے تڑپتے ہیں اسی حقیقت تک قرآن اسے پہنچاتا ہے، اس کی امنگیں اور آرزوئیں جس مقصود کی تلاش میں ہیں اسی مقصود کی جانب قرآن اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ قرآن کا دعویٰ انسان کی نفسیاتی طلب کا جواب ہے۔ اس کی نفسیات پکار پکار کر گواہی دیتی ہیں کہ وہ خدا کا غلام ہے اور اس کائنات میں اس کی

کوئی دوسری حیثیت نہیں ہے۔ انسان بظاہر خدا کا ہزار بار انکار کرے لیکن زندگی کے نازک اور سنگین مواقع پر وہ اپنی حقیقی نفسیات کو چھپا نہیں سکتا۔ چنانچہ جب وہ کسی مصیبت میں گھر جاتا ہے اور تمام ظاہری سہارے ٹوٹ جاتے ہیں تو اس کی یہ نفسیات ابھر آتی ہیں اور وہ خدا کو پکارنے لگتا ہے۔ اس وقت نہ وہ خدا کا انکار کرتا ہے اور نہ اس کی حکومت میں کسی دوسرے کو شریک کرتا ہے۔ آج دہریت کا غلبہ ہے، کائنات پر خدا کے اقتدار کو تسلیم نہیں کیا جاتا، علوم وفنون سے خدا کا ذکر خارج ہو چکا ہے، ذہنوں سے خدا کا تصور مٹ رہا ہے، لیکن اس کے باوجود آزمائش کی گھڑی آتی ہے تو بڑے سے بڑا منکر خدا بھی خدا کے سوا کسی دوسرے کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتا۔ جب حالات پرسکون ہوں تو انسان انکارِ خدا کے دلائل ڈھونڈھتا ہے، رخ بدل جائے تو اعتراف کرنے پر مجبور ہوتا ہے کہ کائنات پر صرف خدا کی حکومت ہے اور کسی کو کوئی اقتدار حاصل نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص خدا کا انکار کرتا ہے وہ اپنے اندر سے اٹھنے والی ایک سچی آواز کو دباتا ہے۔ وہ ایک ایسی بات کہتا ہے، جس کے خلاف خود اس کا ضمیر ...

اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ لِیُرِیَكُمْ مِّنْ اٰیٰتِهٖ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝ وَاِذَا غَشِیَهُمْ مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ فَلَمَّا نَجّٰهُمْ اِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمَا یَجْحَدُ بِاٰیٰتِنَاۤ اِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُوْرٍ ۝

(لقمٰن، ۳۱، ۳۲)

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ کے فضل سے کشتیاں سمندر میں چلتی ہیں تاکہ وہ (اس طرح) تمہیں اپنی نشانیاں دکھائے۔ یقیناً اس میں ہر صابر و شاکر کے لیے نشانیاں ہیں۔ جب (سمندر میں) ان پر کوئی موج سائبانوں کی طرح چھا جاتی ہے تو وہ اپنی بندگی اور غلامی کو صرف خدا کے لیے خالص کرتے ہوئے اسے پکارتے ہیں لیکن جب اللہ انہیں خشکی پر پہنچا کر نجات دیتا ہے تو ان میں سے بعض راہِ اعتدال پر قائم رہتے ہیں (اور بعض سرکشی کی روش اختیار کرتے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ) ہماری نشانیوں کا انکار وہی شخص کرتا ہے جو غدار اور ناشکرا ہے

تاریخ کی شہادت

قرآن نے اپنے دعوے کے ثبوت میں اتنی کثرت سے تاریخی واقعات پیش کیے ہیں کہ آدمی کے لیے انکار ناممکن

ہو جاتا ہے۔ کسی قوم کے عروج و زوال کے جو نمایاں اور حقیقی اسباب ہوتے ہیں قرآن ان ہی سے اپنی حقانیت ثابت کرتا ہے۔ اس مقام پر قرآن کا استدلال خالص واقعاتی استدلال ہوتا ہے جس کی تردید ممکن نہیں ہے۔ قرآن عرب میں نازل ہوا۔ اہل عرب ماضی کی جن قوموں سے واقف تھے قرآن نے ان کی ترقی و تنزل کے واقعات بیان کیے ہیں۔ یہ قومیں بڑی طاقتور تھیں، ان کا تمدن بہت اونچا تمدن تھا، ان کو مال و دولت کی فراوانی حاصل تھی لیکن اس کے باوجود وہ تباہ ہوگئیں۔ اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں تھی کہ انھوں نے خدا سے بغاوت کی اور اس کی بندگی سے انکار کر دیا۔ خدا کے پیغمبروں نے ان سے کہا کہ خدا کے بندے بنو اور اس کی بندگی اختیار کرو ورنہ تم پر خدا کا عذاب آئے گا اور تم اس سے بچ نہ سکو گے لیکن انھوں نے پیغمبروں کی اس دعوت کا مذاق اُڑایا اور اسے رد کر دیا جس کے نتیجے میں وہ ہلاک کر دیے گئے۔ اِنْ كُلٌّ اِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ (ان میں سے ہر ایک نے رسولوں کو جھٹلایا تو ان پر میرا عذاب آگیا) خدا کی عبادت سے قوم نوح نے انکار کیا نذر طوفان ہوگئی۔ قوم ثمود نے انکار کیا آسمانی کڑک نے اسے پیوند خاک کر دیا، قوم عاد نے انکار کیا آندھی نے کھوکھلے درختوں کی طرح اسے اکھاڑ پھینکا، قوم لوط نے انکار کیا کہ اس پر پتھروں کی بارش ہونے لگی، قوم سبا نے انکار کیا خدا کی نعمتوں سے محروم ہوگئی، فرعون اور اس کی قوم نے انکار کیا غرق نیل ہوگئی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اگر آج تم خدا کی عبادت کے لیے تیار نہیں ہو تو اپنی تباہی کا سامان کر رہے ہو۔ تہذیب و تمدن، مادی قوت، اسبابِ عیش ان میں سے کوئی بھی چیز تمہیں تباہی سے نہیں بچا سکتی۔ جو قوم بھی خدا کی بندگی سے انکار کرے اس کے لیے بربادی مقدر ہو چکی ہے وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔

اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ	کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے کہ
فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ	ان سے پہلے کی قوموں کا کیا انجام ہوا۔ وہ ان سے
مِنْ قَبْلِهِمْ كَانُوْا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً	زیادہ طاقتور تھیں اور انھوں نے زمین میں ان سے
وَّاٰثَارًا فِي الْاَرْضِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ	مضبوط نشانیاں چھوڑی تھیں لیکن اللہ نے ان کے گناہوں
بِذُنُوْبِهِمْ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنَ	کی وجہ سے ان کو پکڑ لیا اور کوئی انہیں اللہ کی پکڑ
اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانَتْ	سے بچانے والا نہیں تھا۔ ایسا اس لیے ہوا کہ ان کے
تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَكَفَرُوْا	پاس ان کے رسول کھلی نشانیاں لیکر آتے تھے لیکن
فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ اِنَّهٗ قَوِيٌّ شَدِيْدُ	اس کے باوجود انھوں نے انکار کیا تو اللہ نے انہیں

الْعِقَابِ ۝ اپنی گرفت میں لے لیا یقیناً وہ قوی ہے اور سخت عذاب دینے والا ہے۔ (المومن: ۲۲، ۲۱)

قرآن پوری زندگی پر حکومت کرنا چاہتا ہے، آپ اسے قبول کریں، یا رد کریں، لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہماری اجتماعی و تمدنی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کا دعوٰے بے دلیل نہیں ہے بلکہ اس کی تائید عظیم ترین سیاروں سے لے کر کائنات کا چھوٹے سے چھوٹا ذرہ کر رہا ہے۔ اس کی پشت پر ماضی کی پوری تاریخ ہے، اور خود انسان کی نفسیات اس کی گواہی دے رہی ہیں اتنے مستحکم اور مدلل دعوے کو بھی اگر کوئی شخص رد کرتا ہے تو میں کہوں گا کہ آج تک دنیا کے سامنے کوئی مدلل دعوٰے پیش ہی نہیں ہو سکا ہے

قرآن — یاددہانی ہے

(۱) وہ بھولا ہوا سبق جو قرآن یاد دلا رہا ہے وہ ہے جو نوعِ انسانی کی پیدائش کے آغاز میں دیا گیا تھا اور جسے یاد دلاتے رہنے کا اللہ تعالےٰ نے وعدہ کیا تھا اور جسے یاد دلانے کے لیے قرآن سے پہلے بھی بار بار ذکر آتے رہتے ہیں۔

(۲) انسان اس سبق کو بار بار شیطان کے بہکانے سے بھولتا ہے اور یہ کمزوری وہ آغازِ آفرینش سے برابر دکھا رہا ہے۔ اس لیے انسان اس کا محتاج ہے کہ اس کو پیہم یاد دہانی کرائی جاتی رہے۔

(۳) یہ بات کہ انسان کی سعادت و شقاوت کا انحصار بالکل اس برتاؤ پر ہے جو اللہ تعالےٰ کے بھیجے ہوئے اس "ذکر" کے ساتھ وہ کرے گا آغازِ آفرینش ہی میں صاف صاف بتا دی گئی تھی آج یہ کوئی نئی بات نہیں کہی جا رہی ہے کہ اس کی پیروی کرو گے تو گمراہی اور بدبختی سے محفوظ رہو گے ورنہ دنیا و آخرت دونوں میں مبتلائے مصیبت ہو گے۔

(۴) ایک چیز ہے بھول اور عزم کی کمی اور ارادے کی کمزوری جس کی وجہ سے انسان اپنے ازلی دشمن شیطان کے بہکائے میں آجائے اور غلطی کر بیٹھے اس کی معافی ہو سکتی ہے بشرطیکہ انسان غلطی کا احساس ہوتے ہی اپنے رویے کی اصلاح کرلے اور انحراف چھوڑ کر اطاعت کی طرف پلٹ آئے۔ دوسری چیز ہے وہ سرکشی اور سرتابی اور خوب سوچ سمجھ کر اللہ کے مقابلے میں شیطان کی بندگی اس چیز کے لیے معافی کا کوئی امکان نہیں ہے۔

(تفہیم القرآن جلد سوم)

قرآن مجید کے کتابِ الٰہی ہونے کا ثبوت

(مولانا صدرالدین اصلاحی)

(زیرِ ترتیب کتاب "قرآن مجید کا تعارف" کا ایک باب)

آج آسمانی ہدایت ناموں کے نام سے دنیا میں جو کتابیں موجود ہیں، ان میں سے ایک قرآن مجید بھی ہے۔ تاریخی طور پر یہ سب سے بعد کی کتاب، اور سب سے آخری ہدایت نامہ ہے۔ آگے کی سطروں میں اسی کتابِ الٰہی کا تفصیلی تعارف پیش نظر ہے۔

لیکن اس تعارف سے پہلے ضرورت اس بات کی ہے کہ خود اس کتاب کی واقعی حیثیت اور اس کے کتابِ الٰہی ہونے کا ثبوت معلوم ہو جائے۔ کیونکہ کسی کتاب کے بارے میں اگر یہ دعویٰ کیا جاتا ہو کہ وہ آسمانی کتاب ہے، تو اس سے یہ کسی طرح لازم نہیں آجاتا کہ وہ فی الواقع بھی آسمانی کتاب ہے۔ دعوے جہاں صحیح بات کے کیے جاتے ہیں، وہاں غلط بات کے بھی کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ مذاہب کی تاریخ میں ایسی مثالوں کی کمی نہیں کہ جس طرح نبوت اور نزولِ وحی کے جھوٹے مدعی پیدا ہوئے اسی طرح کتنے ہی مذہبی بزرگوں کو خدا کا پیغمبر بلکہ خدا تک بنا دیا گیا اور اُن کا کلام، کلامِ الٰہی قرار پا گیا، حالانکہ نہ انھوں نے کبھی اپنے پیغمبر ہونے کا دعویٰ کیا تھا نہ اپنے کلام کو کلامِ الٰہی قرار دیا تھا۔ ان تاریخی حقائق کی موجودگی میں قرآن مجید کے متعلق بھی اس سوال کو بھی اٹھنا ہی چاہیے کہ آخر اس کتاب کے کلامِ الٰہی ہونے کا ثبوت کیا ہے؟ اور صحیح بات تو یہ ہے کہ قرآن کا سب سے بنیادی تعارف بھی یہی ہے کہ اس کا کتابِ الٰہی ہونا ایک ناقابلِ انکار حقیقت بن کر لوگوں کے سامنے واضح ہو جائے۔

قرآن مجید کے کتابِ الٰہی ہونے کے خاص خاص دلائل یہ ہیں:-

پہلا ثبوت

اس امر کا ابتدائی ضروری ثبوت تو یہ ہے کہ یہ قرآن کا اپنا صریح بیان ہے، صرف اس کے ماننے والوں کا دعویٰ نہیں ہے۔ اس نے اس امر کی بار بار صراحت کی ہے کہ میں کسی انسان کا کلام نہیں بلکہ اللہ رب العالمین کا کلام ہوں، جسے اس نے اپنے خاص فرشتے، جبرئیل کے ذریعے اپنے بندے، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)

تک پہنچایا تھا۔ مثلاً :۔

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ	اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ (قرآن) پروردگار
نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ، عَلٰى قَلْبِكَ	عالم کا نازل فرمایا ہوا ہے۔ اسے امانت دار فرشتے
لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ بِلِسَانٍ	نے (اے محمد) تمہارے دل پر اتارا ہے، تاکہ تم
عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ؈	(لوگوں کو عذاب آخرت سے) خبردار کرنے والے
(شعراء $\frac{192}{195}$)	بنو، صاف ستھری عربی زبان میں

بلاشبہ قرآن کا اپنے بارے میں یہ بیان دینا بھی کہ میں اللہ کی کتاب ہوں، اپنی جگہ سے اس کا کتاب الٰہی ہونا ثابت نہیں ہو جاتا۔ لیکن اس کے باوجود اس بیان کی حیثیت "ابتدائی ضروری ثبوت" کی بھی ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر اثبات و استدلال کی گفتگو سرے سے چل ہی نہیں سکتی، بلکہ شروع بھی نہیں ہو سکتی۔ اور یہ اس لیے کہ یہی بیان وہ چیز ہے جو قرآن مجید کے بارے میں کتاب الٰہی ہونے کے دعوے کو باضابطہ اور قابل توجہ بناتی ہے، اور اسی کی بنیاد پر یہ دعویٰ غور و بحث کا حق دار قرار پاتا ہے، جس کے دو بڑے اہم اور اصولی وجوہ ہیں :۔

ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی کتاب کوئی عام معنوں کی کتاب اور تصنیف نہیں ہوتی کہ اس کی باتوں سے اتفاق یا اختلاف کرنے میں لوگ آزاد ہوں حتیٰ کہ سرے سے اس کے پڑھنے کے بھی مکلف نہ ہوں، بلکہ وہ فی الواقع سلطانِ کائنات کی طرف سے نافذ ہونے والا فرمان ہوتی ہے۔ اور اس مطالبے کے ساتھ آتی ہے کہ اس کے آگے گردنیں جھکا دی جائیں، اس کی بلا چون و چرا پیروی کی جائے، اور لازماً کی جائے، ورنہ انسان کے لیے ہلاکت ہی ہلاکت ہوگی۔ ظاہر ہے کہ جس کتاب کی غایت، اہمیت اور حیثیت یہ ہو، بالکل ناگزیر ہے کہ وہ خود اپنی زبان سے اپنی اس حیثیت کی صاف و صریح لفظوں میں منادی کر دے۔ اس کے بغیر وہ اصولاً اس بات کی ہرگز حق دار نہ ہوگی کہ لوگ اسے لازماً پڑھیں، اس کی حیثیت کو ضروری زیر بحث لائیں، اس کے بارے میں اس امر کی بہر حال تحقیق کریں کہ وہ کتاب الٰہی ہے یا نہیں، اور پھر اسے اپنے آقائے حقیقی کا فرمان اور آسمانی ہدایت نامہ تسلیم کر کے اس کی پیروی کریں ——— ٹھیک اسی طرح جس طرح حکومتیں اپنے قوانین گزٹ میں شائع کر کے اس بات کا باضابطہ اعلان کرتی ہیں کہ باشندگانِ ملک کے لیے اس وقت یہ قوانین بنائے گئے ہیں، اور جب تک وہ ایسا نہیں کر لیتیں، رعایا پر ان قوانین کے بارے میں کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوا کرتی۔

دوسرے یہ کہ کسی کتاب کے کتاب الٰہی ہونے کا دعویٰ فی الواقع اس کا اپنا (یا اس کے لانے والے پیغمبر کا) دعویٰ ہوتا ہے، نہ کہ اس کے پیرووں کا۔ اس کے پیرو تو اس دعوے کے ماننے والے ہوتے ہیں، اس لیے ان کا یہ کہنا کہ یہ کتاب کتاب الٰہی ہے، اس دعوے کی صرف ایک شہادت ہو سکتا ہے، نہ کہ اصل دعویٰ۔ اور کسی شہادت کا سوال پیدا اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ کوئی باضابطہ دعویٰ سامنے آچکا ہو۔ اس کے بغیر شہادت بالکل بے محل، بے ضرورت اور ناقابلِ التفات ہوگی۔ کیونکہ یہ عین ممکن ہے کہ شہادت ایک ایسے دعوے کی دی جا رہی ہو جس کا فی الواقع کوئی وجود ہی نہ ہو، اور ایک ایسے شخص کو خدا کا پیغمبر اور ایک ایسی کتاب کو اللہ کی کتاب ہونے کی گواہی دی جا رہی ہو جس نے خود اس طرح کا کوئی دعویٰ ہرگز نہ کیا ہو۔ تاریخ ادیان کے صفحات پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ اس امکان کو عقیدتوں کے غلو نے بارہا واقعیت کا جامہ پہنایا ہے۔ کتاب میں ایک جملہ بھی ایسا نہیں جو اس دعوے کی صراحت کرتا ہو کہ میں آسمانی کتاب ہوں، مگر لوگوں نے خود اپنی طرف سے یہ دعویٰ مہیا کر لیا اور ایک انسانی کلام کو وحی اور فرمودۂ الٰہی بنا کر رکھ دیا۔

ان وجوہ سے ضروری ہے کہ قرآن کے کتاب الٰہی ہونے کی بحث کو اس بات پر موقوف رکھا جائے کہ وہ اپنے بارے میں خود اپنی زبان سے اس بات کا صریح دعویٰ کرتا ہے یا نہیں۔ اگر کرتا ہے تو اس بحث کو اعتنا کے قابل اور فکر و تحقیق کا حق دار سمجھا جائے، ورنہ نہیں۔ اس لیے قرآن کا اپنا یہ صریح بیان کہ میں اللہ تعالیٰ کا نازل کیا ہوا ہوں، بڑی بنیادی اہمیت رکھتا ہے، اور اس کی حیثیت بھی ایک طرح کے ثبوت کی ہو جاتی ہے۔

دوسرا ثبوت قرآن کی اور اس کے لانے والے پیغمبر کی آمد کا ذکر و اعلان پچھلے آسمانی صحیفوں (تورات اور انجیل) میں بشارت کے طور پر پہلے ہی سے ہو چکا تھا، اور یہ ٹھیک انہی صفتوں اور علامتوں کے ساتھ دنیا میں نمودار ہوا جو ان صحیفوں میں اس کی بتائی گئی تھیں۔ چنانچہ اس نے اپنے مخاطبین کے سامنے اس بشارت کو بار بار ایک کھلی ہوئی حجت کے طور پر پیش بھی کیا۔ مثلاً:۔

مَا كَانَ حَدِيثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ الخ (یوسف - ۱۱۱)	یہ (قرآن) کوئی گھڑا ہوا (اور انسانی) کلام نہیں ہے، بلکہ (اللہ کا کلام ہے اور) اپنے سامنے کی موجود پچھلی آسمانی کتابوں کی پیشین گوئیوں کے عین مطابق ہے۔
..... اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ	..... جو اس امی رسول اور نبی کی پیروی کرتے

النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَہٗ مَکْتُوْبًا عِنْدَھُمْ فِی التَّوْرٰاۃِ وَالْاِنْجِیْلِ (اعراف۔۱۵۷)

کریں جس کا تذکرہ وہ اپنے یہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا موجود پا رہے ہیں۔

تورات اور انجیل میں یہ بشارت یا پیشین گوئی کہاں کہاں اور کن لفظوں میں تھی؟ اس سوال کا صحیح اور مکمل جواب اسی وقت مل سکتا تھا جب یہ کتابیں آج بھی اپنی حقیقی شکل میں موجود ہوتیں، اور ان میں کوئی کمی بیشی اور تبدیلی نہ ہوئی ہوتی۔ مگر تاریخی طور پر یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ یہ کتابیں بعینہٖ انہیں الفاظ و عبارات میں اب محفوظ باقی نہیں رہ گئی ہیں جن میں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی تھیں، بلکہ ان کے علمبرداروں نے ان میں کافی ردو بدل کر ڈالا ہے۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ وہ پیشین گوئیاں اور بشارتیں باقی نہیں رہ سکتی تھیں جو قرآن اور صاحبِ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ان کتابوں میں ہوئی تھیں، خصوصاً اس حقیقت کے پیشِ نظر تو یہ بات بالکل ہی غیر متوقع ہے کہ ان کتابوں سے اور رسالتِ محمدی کی صداقت کا ثابت ہوجانا کسی حال میں بھی گوارا نہ تھا لیکن ان باتوں کے باوجود ان میں آج بھی ایسے فقرے کثرت سے موجود ہیں جن میں ایک مخصوص نوعیت کی کتاب ———— اور ایک مخصوص شان کے رسول کی آمد کی صریح پیشین گوئیاں مذکور ہیں، اور ان پیشین گوئیوں کا مصداق اگر کوئی قرار پاسکتا ہے تو وہ قرآن کریم اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔ مثال کے طور پر ذیل کے چند فقرے دیکھیے۔

(۱) "خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر آشکارا ہوا۔ وہ کوہِ فاران سے جلوہ گر ہوا، اور لاکھوں قدسیوں میں سے آیا۔ اس کے دہنے ہاتھ پر ان کے لیے آتشیں شریعت تھی۔" (استثنا، باب۳۳، آیت۲)

(۲) "میں ان کے لیے ان ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا، اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا، اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے گا تو میں ان کا حساب اس سے لوں گا۔" (استثنا، باب۱۸، آیات ۱۸، ۱۹)

(۳) یسوع نے ان سے کہا کیا تم نے کتاب مقدس میں کبھی نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو معماروں نے رد کیا وہی کونے کے سرے کا پتھر ہوگیا۔ یہ خداوند کی طرف سے ہوا اور ہماری نظر میں عجیب ہے۔ اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہی تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے دے دی جائے گی اور جو اس پتھر پر گرے گا ٹکڑے ٹکڑے ہوجائے گا لیکن جس پر وہ گرے گا اسے پیس ڈالے گا۔"

(متی کی انجیل۔ باب۲۱، آیات ۴۲ تا ۴۴)

(۴) "مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہے، مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ یعنی سچائی کا روح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھلائے گا۔ اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا، لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا۔" (یوحنا کی انجیل، باب ۱۶، آیات ۱۲، ۱۳)

(۵) "دیکھو میں اپنے رسول کو بھیجوں گا اور وہ میرے آگے راہ درست کرے گا، اور خداوند جس کے تم طالب ہو ناگہاں اپنی ہیکل میں آ موجود ہوگا۔ ہاں عہد کا رسول جس کے تم آرزو مند ہو آئے گا۔ رب الافواج فرماتا ہے۔" (ملاکی، باب ۳، آیت ۱)

(۶) اس وقت سے یسوع نے منادی کرنا اور یہ کہنا شروع کیا کہ توبہ کرو کیونکہ آسمان کی بادشاہی نزدیک آگئی ہے۔" (متی، باب ۴، آیت ۱۷)

(۷) "اگر تم مجھ سے محبت رکھتے ہو تو میرے حکموں پر عمل کرو گے۔ اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرا مددگار (یا وکیل، یا شفیع) بخشے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے۔"

(یوحنا، باب ۱۴، آیات ۱۶، ۱۷)

"لیکن مددگار یعنی روح القدس جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا وہی تمہیں سب باتیں سکھائے گا اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے وہ سب تمہیں یاد دلائے گا۔" (آیت ۲۶)...." اور اب میں نے تم سے اس کے ہونے سے پہلے کہہ دیا ہے تاکہ جب ہو جائے تو تم یقین کرو۔ اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا۔ کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں۔" (آیت ۲۹، ۳۰)......"لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لیے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئے گا لیکن اگر جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا۔ اور وہ آ کر دنیا کو گناہ اور راست بازی اور عدالت کے بارے میں قصور وار ٹھیرائے گا۔" (باب ۱۶، آیات ۷، ۸)

(۸) "دیکھو پرانی باتیں پوری ہوگئیں اور میں نئی باتیں بتاتا ہوں۔ اس سے پیشتر کہ واقع ہوں میں تم سے بیان کرتا ہوں۔ اے سمندر پر گزرنے والو اور اس میں بسنے والو! اے جزیرو اور ان کے باشندو! خداوند کے لیے نیا گیت گاؤ۔ زمین پر سرتاسر اسی کی ستائش کرو۔ بیابان اور اس کی بستیاں، قیدار کے آباد گاؤں اپنی آواز بلند کریں۔ سلع کے بسنے والے گیت گائیں۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر سے للکاریں، وہ خداوند کا جلال ظاہر کریں اور جزیروں میں اس کی ثناخوانی کریں۔ خداوند بہادر کی مانند نکلے گا۔ وہ

جنگی مرد کی طرح اپنی غیرت دکھائے گا۔ وہ اپنے دشمنوں پر غالب آئے گا۔ میں بہت مدت سے چپ رہا۔
......میں پہاڑوں اور ٹیلوں کو ویران کروں گا.......اور اندھوں کو اس راہ سے جسے وہ نہیں جانتے
لے جاؤں گا۔ میں ان کو ان راستوں پر جن سے وہ آگاہ نہیں لے چلوں گا۔ میں ان کے آگے تاریکی کو روشنی
اور اونچی نیچی جگہوں کو ہموار کروں گا۔ میں ان سے یہ سلوک کروں گا اور ان کو ترک نہ کروں گا۔ جو کھودی ہوئی
مورتوں پر بھروسا کرتے اور ڈھالے ہوئے بتوں سے کہتے ہیں تم ہمارے معبود ہو وہ پیچھے ہٹیں گے اور بہت
شرمندہ ہوں گے۔" (یسعیاہ۔ باب ۴۲، آیات ۹ تا ۱۷)

توراۃ اور انجیل کے ان فقروں اور پیشین گوئیوں پر یہاں کوئی تفصیلی بحث تو نہیں کی جا سکتی، البتہ ٹکڑوں کے متعلق ضروری وضاحت درج ذیل ہے:-

"کوہِ فاراں" مکہ میں واقع ہے۔ "آتشیں شریعت" کے معنی جہاد و قتال اور غلبہ و اقتدار۔ "ان ہی کے بھائیوں" (یعنی بنی اسرائیل کے بھائیوں) سے مراد بنی اسمٰعیل ہیں، جن میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے تھے۔ "تیری مانند" کا مطلب یہ ہے کہ وہ بھی تیری ہی (یعنی حضرت موسیٰؑ ہی کی طرح) مستقل کتاب اور شریعت لانے والا رسول ہوگا۔ "جس پتھر کو معماروں نے رد کیا" یہ اشارہ بھی بنی اسمٰعیل کی طرف ہے۔ کیونکہ جہاں بنی اسرائیل ایک مدت دراز تک امامت کے منصب پر فائز، اور صاحبِ کتاب و رسالت رہے، اس دوران یہ لوگ اس شرف سے یکسر محروم تھے۔ "وہی کونے کا پتھر ہوگیا" یعنی آخر میں وہی خانوادہ اس منصب امامت کا حامل بنایا گیا اور آخری کتاب جو اللہ کی طرف سے نازل ہوئی اسی میں نازل ہوئی۔ "خدا کی بادشاہی" سے مراد مکمل اور معیاری حکومت الٰہیہ ہے۔ "پھل لائے گی" یعنی اللہ تعالیٰ کے احکام و مرضیات کا پورا پورا انفاذ کرے گی اور اپنی برکتیں ظہور میں لائے گی۔ "مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے" مطلب یہ ہے کہ تم احکامِ خداوندی کی مزید امانت کا بوجھ اٹھانے کی سکت نہیں رکھتے، اس لیے میرے ذریعہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی تکمیل بھی نہیں فرما رہا ہے۔ "ناگہاں اپنی ہیکل میں آموجود ہوگا" یعنی اس رسولِ موعود کی آمد اس طرح، ایسی جگہ اور ایسے لوگوں کے اندر ہوگی جس سے تمہیں تعجب سا ہو جائے گا۔ "عہد کا رسول" میں 'عہد' سے مراد 'ختنہ کا عہد' ہے جو ابراہیم علیہ السلام اور ان کی نسل سے لیا گیا تھا۔ (جیسا کہ کتاب پیدائش باب ۱۷، آیت ۱۰ میں صراحت فرمائی گئی ہے) اس لیے 'عہد کے رسول' کے معنی ہوں گے ایسا رسول جو ختنے کی ابراہیمی سنت کو عام اور عالم گیر بنا دے گا، اور یہ رسم اس کی شریعت کی اور اس کی امت کی ایک معروف و ممتاز علامت ہوگی۔ "مددگار" جس اصل عبرانی لفظ کا ترجمہ ہے اس کا عربی ترجمہ 'فارقلیط'

یا گیا ہے اور "فارقلیط" کے معنی قریب قریب وہی ہیں جو لفظ "محمد" یا "احمد" کے ہیں۔ "ابد تک تمہارے ساتھ رہے" مطلب بالکل کھلا ہوا ہے، اور وہ یہ کہ اس کی لائی ہوئی کتاب و شریعت تورات و انجیل کی طرح ایک محدود زمانے کے لیے نہیں بلکہ ہمیشہ کے لیے ہوگی۔ "دنیا کا سردار" یعنی سارے جہان اور پوری نوعِ انسانی کے لیے اللہ کا رسول، نہ کہ صرف کسی خاص قوم یا ملک کے لیے۔ "مجھ میں اس کا کچھ نہیں" یعنی میرے (عیسیٰؑ کے) مقابلے میں وہ بہت اونچا اور بلند پایہ رسول ہوگا۔ "...... خداوند کے لیے نیا گیت گاؤ" مطلب یہ کہ پوری دنیا اور اس کے سارے بحر و بر کے لیے ایک نئی کتاب اور ایک نئی شریعت آنے والی ہے۔ "قیدار" بنی اسماعیل میں ایک مشہور شخص گذرا ہے، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی شخص کی نسل میں پیدا ہوئے۔ "سلع" مدینہ کے نزدیک کی ایک پہاڑی کا نام ہے۔ "میں بہت مدت سے چپ رہا" یعنی زمانۂ دراز تک وحی و رسالت کا سلسلہ موقوف رہا ——

امید ہے کہ یہ مختصر سی توضیحات بھی ان فقروں کا حقیقی منشا معلوم کرلینے کی کوشش میں کافی مددگار ثابت ہوں گی جس کے بعد ہر راست باز اور حق پسند انسان کے سامنے یہ حقیقت پوری طرح روشن ہو جائے گی کہ تورات اور انجیل کی ان پیشین گوئیوں میں جس کتاب اور جس نبی کی آمد کی بشارتیں دی گئی ہیں وہ قطعی طور پر قرآن اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔ چنانچہ جب قرآن نازل ہوا تو یہودی اور نصرانی علماء کو یہ سمجھ لینے میں ذرا بھی دقت نہیں ہوئی کہ یہ وہی کتاب ہے جس کے ہم منتظر تھے، اور جس کے بارے میں ہمیں پیہم بشارتیں دی جاتی رہی ہیں۔ جیسا کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے :۔

وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ (انعام ۔۔ ۱۱۵)	جن لوگوں کو ہم نے اپنی کتاب (تورات) دی تھی وہ جانتے ہیں کہ یقیناً یہ (قرآن) تمہارے رب کی طرف سے حق کے ساتھ نازل فرمایا ہوا ہے۔
... اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (شعراء ۔ ۱۹۷)	...... یہ کہ بنی اسرائیل کے علماء اس (قرآن) کو جانتے پہچانتے ہیں۔

چنانچہ ان میں جو صحیح معنوں میں علماء تھے اور جن کے دلوں میں خدا کے خوف اور حق کی محبت پر گروہی عصبیت غالب نہیں ہو سکی تھی، وہ بے تامل اس کتاب الٰہی سے آ چمٹے، اور جب ان کے سامنے قرآن کی دعوت پیش ہوئی تو ایسا محسوس ہوا جیسے یہ ان کی اپنی ہی متاعِ مطلوب تھی جو انھیں عطا کی جا رہی ہے۔ قرآن مجید کے اندر اس تاریخی حقیقت کا اظہار ان لفظوں میں کیا گیا ہے :۔

فَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۔ (عنکبوت - ۴۷)
پس وہ لوگ جنھیں ہم نے (صحیح معنوں میں) کتاب دی تھی اس (قرآن) پر ایمان لا رہے ہیں۔

وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ؁ (مائدہ - ۸۳)
اور (یہ نیک باطن نصاریٰ) جب اس (رسول) پر نازل ہونے والے کلام (قرآن) کو سنتے ہیں تو تم دیکھتے ہو کہ ان کی آنکھیں معرفتِ حق سے اشک بار ہو جاتی ہیں، وہ کہتے ہیں کہ خدایا! ہم اس پر ایمان لائے، ہمیں (بھی اس کے) گواہوں (میں لکھ لے)۔

تاریخ ان حق پسندوں کی جو فہرست پیش کرتی ہے، وہ کافی لمبی ہے۔ ان میں حبشہ کے بھتیجے ذومخمر، فلسطین کے رومی گورنر اور اسقف ابن ناطور، نجران کے عیسائی حاکم کے ۔۔ بنی طے کے سردار عدی بن حاتم، تورات کے مشہور علماء کعب الاحبار، وہب بن منبہ اور عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہم اجمعین جیسے لوگ بھی شامل ہیں۔ ان بے شمار یہودیوں اور نصرانیوں کا قرآن پر ایمان لانا بجائے خود اس امر کی ایک ناطق دلیل ہے کہ وہی تورات اور انجیل میں مذکور پیشین گوئیوں کا مصداق تھا۔ کیونکہ یہ حضرات پہلے ہی سے صاحبِ کتاب و شریعت تھے۔ قریش وغیرہ کی طرح 'بے کتاب' نہ تھے، کہ اپنی اس احتیاج اور محرومی کو دور کرنے کے لیے قرآن کو خواہ مخواہ بھی کتابِ الٰہی تسلیم کر لیتے۔ اس لیے اگر انھوں نے تورات اور انجیل کی جگہ اب قرآن کی پیروی اختیار کر لی اور موسوی یا مسیحی ملت سے اپنے قدیم جذباتی رشتے کو کاٹ کر امتِ محمدیہ کے دائرے میں شامل ہو گئے تو نفسیاتی اور عقلی دونوں حیثیتوں سے ایسا اسی لیے ممکن ہو سکا کہ ایک طرف انھوں نے اپنے صحیفوں میں مذکور پیشین گوئیوں کو دیکھا، دوسری طرف قرآن اور صاحبِ قرآن پر نظر ڈالی، اور ان کے دل پکار اٹھے کہ جس چیز کی ہمیں خبر دی گئی تھی بلاشک وہ ظہور میں آ چکی ہے، اور پھر ان کی حق پسندی نے انھیں اسے اختیار کر لینے پر مجبور کر دیا۔

تیسرا ثبوت قرآن مجید کے اندر کوئی اختلاف اور تضاد نہیں پایا جاتا۔ اس کی یہ صفت اس کی صداقت کی ایک واضح دلیل ہے۔ جیسا کہ اس نے خود بھی فرمایا ہے:۔

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا (نساء - ۸۲)
اگر یہ قرآن اللہ کے بجائے کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس کے اندر بڑا اختلاف پاتے۔

اور یہ اس لیے کہ یہ کتاب تیئیس برس کی لمبی مدت میں، اور سخت متضاد حالات کے اندر پایۂ تکمیل کو پہنچی تھی اگر

یہ انسانی تصنیف ہوتی تو عادۃً اور عملاً یہ ہرگز ممکن نہ تھا کہ اس کے مضامین، اس کے اصول و افکار، اور اس کی تعلیمات تضاد اور اختلاف سے یکسر پاک ہوتیں۔ انسانی تصنیف تو بالعموم ایسی حالت میں بھی ان عیوب سے پاک نہیں ہوتی جب کہ اسے ایک سے حالات میں، صرف چند مہینوں کے اندر، اور مسلسل طور پر لکھا گیا ہو۔ پھر جس کتاب کی تکمیل میں سیکڑوں مہینے اور ہزاروں دن گذرے ہوں، اور جسے حالات کے غیر معمولی اتار چڑھاؤ سے سابقہ پیش آیا ہو، اس کے اندر تضاد اور اختلاف کا موجود نہ ہونا عادۃً کیونکر ممکن ہے؟ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کے اندر یہ "ناممکن" صراحتًہ ممکن بن کر ایک واقعی کی شکل میں موجود ہے، اور اس کے پھیلے ہوئے مضامین اور مفصل احکام و ہدایات میں غایت درجہ کی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ اس کے معنی اس کے سوا اور کیا ہو سکتے ہیں کہ اس کا "مصنف" کوئی انسانی ہستی نہیں، بلکہ وہ علیم و خبیر اور قادر مطلق ہستی ہے جس کے علم میں اختلاف کبھی راہ نہیں پا سکتا، اور جس کی فرمائی ہوئی باتوں میں زمانے کا بڑے سے بڑا فصل بھی کوئی تضاد نہیں پیدا کر سکتا۔

چوتھا ثبوت قرآن نے اپنے مشن کے سلسلے میں متعدد پیشین گوئیاں کیں، اور بالعموم ایسے حالات میں کیں جب کہ ان کے پورے ہونے کے ظاہری اسباب و قرائن ناپید تھے، مگر دنیا نے ان میں سے ایک ایک کو پورا ہوتے دیکھا، اور کوئی پیشین گوئی بھی غلط ثابت نہ ہوئی۔ مثلاً:

(الف) اس نے سن چھ ہجری میں صلح حدیبیہ کے موقع پر مسلمانوں کو یہ خوش خبری سنائی تھی کہ:-

لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ	تم ان شاء اللہ مسجد حرام (کعبہ) میں ضرور
اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَ	داخل ہو گے، پورے امن و اطمینان کے ساتھ،
مُقَصِّرِيْنَ لَا تَخَافُوْنَ ؕ	اپنے سروں کو منڈائے اور بالوں کو ترشوائے،
(فتح - ۲۷)	حال یہ کہ تمہیں کسی کا کوئی خوف نہ ہوگا۔

ان لفظوں کے جزم و یقین کو دیکھیے۔ پھر اس حقیقت کو یاد کیجیے کہ یہ الفاظ اس موقع پر فرمائے گئے تھے جب مسلمانوں کو کفار مکہ سے بہت کچھ دب کر صلح کرنا پڑا تھا، جب وہ اپنے مرکز دین (کعبہ) کے دروازوں پہنچ کر زبردستی روک دیے گئے تھے اور انھیں اس کی زیارت کیے بغیر پوری دل شکستگی کے عالم میں واپس چلے آنا پڑا تھا۔ یقیناً یہ حالات ہرگز ایسے نہ تھے کہ ان کے اندر مسلمانوں کو مکے میں فاتحانہ داخلے کی توقع دلائی جا سکتی۔ مگر قرآن نے صرف توقع ہی نہیں دلائی بلکہ پورے جزم و یقین کے ساتھ فرمایا کہ ایسا ضرور ہو کر رہے گا حتی کہ اس داخلے کی تصویر کشی تک اس نے کر دی، اور پھر دو سال بعد ہی ایسا ہو بھی گیا، مسلمان ٹھیک اسی شان کے ساتھ مکے میں داخل ہو گئے جس کی

مذکورہ بالا لفظوں میں خبر دی گئی تھی۔

(ب) اس نے مسلمانوں سے کہا تھا کہ:۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ	تم میں سے جو لوگ سچے ایمان والے اور نیکوکار
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ	ہیں ان سے اللہ کا یہ وعدہ ہے کہ وہ انھیں زمین
فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ	میں خلافت کا اقتدار عطا فرما کر رہے گا جس طرح کہ
مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ	اس نے ان سے پہلے کے لوگوں کو
الَّذِى ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ	ان کے اس دین کو یقیناً مضبوط
مِنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ	اس نے ان کے لیے پسند فرمایا
(نور - ۵۵)	خوف کی حالت امن سے لازماً بدل دے۔

یہ بات مسلمانوں سے جس وقت اور جن حالات میں فرمائی گئی تھی ان کی وضاحت خود ان ہی لفظوں کے اندر موجود ہے۔ یعنی یہ کہ یہ حالات سر تا سر خوف و دہشت کے حالات تھے، دین کے عدم استحکام کے حالات تھے، غلبہ واقتدار سے محرومی کے حالات تھے۔ پھر چند برسوں کے اندر ہی اندر یہ حالات جس طرح پلٹ کر رہ گئے اور عرب کی زمین و آسمان بدل کر کچھ سے کچھ ہو گئے، اس کی تفصیل سے پوری دنیا واقف ہے، جو آیت مذکورہ کے الفاظ کو واقعات کی شکل اختیار کرتے اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھ چکی ہے۔

(ج) اس نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں مدینے کی پُر آشوب اور جنگی خطرات سے بھری ہوئی فضا میں بھی اعلان کیا تھا کہ:۔

وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (مائدہ ۶۷)	اللہ تمہیں سارے لوگوں سے محفوظ رکھے گا۔

اور مکے کی دہشت و مظلومیت اور بے چارگی کے دوران بھی اطمینان دلایا تھا کہ:۔

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ	تم اپنے رب کے حکم پر جمے رہو، کیونکہ تم
فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا (طور - ۴۸)	ہماری (یعنی اللہ کی) نگاہوں میں ہو۔

اس سلسلے میں یہ بتانے کی مطلق ضرورت نہیں کہ مکے کے بالادست مشرکوں، مدینے کے بدباطن منافقوں اور سازشی یہودیوں، اور پورے عرب کے کثیر التعداد اسلام دشمنوں کی تمام تر خواہشوں اور کوششوں کے باوجود قرآن کی یہ اطمینان دہانی ایک روشن حقیقت ثابت ہوئی اور رسول خدا کی ذات کے خلاف کوئی تدبیر کوئی

[س]ازش اور کوئی سعی و جہد بالکل کامیاب نہ ہوسکی۔ حالانکہ نبوت کے تیئیس سالہ دَور میں آپ بار ہا ایسے خطرناک [ح]الات سے گذرے جن میں حیاتِ مبارکہ کا باقی رہ جانا کسی طرح متوقع نہیں کہا جاسکتا تھا ـــــ ایسا بھی ہوا کہ مکے کے دورِ ناتوانی میں ایک خاندان بنی ہاشم کے سوا قریش کے باقی سارے قبیلوں نے آپ کو قتل کر ڈالنے کے لیے متحدہ اقدام کیا، ایسا بھی ہوا کہ ہجرت کے دوران تعاقب کرنے والے اس غار کے دہانے پر جا کھڑے ہوئے جس کے اندر آپؐ چھپے بیٹھے تھے، ایسا بھی ہوا کہ اس تعاقب کے دوران ایک مسلح دشمن نے آپ کو راستے میں دیکھ لیا، لیکن آپؐ کو پکڑ لینے کی کوشش میں اس کے گھوڑے نے بار بار ٹھوکر کھائی اور اس کے قدم زمین میں دھنس کر رہ گئے، ایسا بھی ہوا کہ یہودیوں نے ایک دعوت کے بہانے آپ کو ایک خاص راستے سے لے جانا چاہا تا کہ اوپر سے ایک بھاری پتھر گرا کر آپؐ کو شہید کردیں، ایسا بھی ہوا کہ جنگل میں آپؐ کو سوتے پاکر ایک دشمن اسلام نے آپ کی تلوار اپنے قبضے میں کرلی اور یقین کے لہجے میں بولا۔ "بتا اب تجھے میرے ہاتھ سے کون بچا سکتا ہے؟" پھر ایسا بھی ہوا کہ اُحد اور حنین کے معرکوں میں کئی کئی ہزار اعدائے دین کے درمیان آپؐ تقریباً تنہا رہ گئے ـــــ غرض ایسے کتنے ہی مواقع پیش آئے جن میں انسانی قیاس اور تجربے کی نظروں میں آپ کا زندہ بچ رہنا انتہائی غیر متوقع یا ناممکن تھا۔ لیکن ہر موقع پر یہی دیکھا گیا کہ "فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا" کا تقاضا اپنی جگہ سے نہ ٹل سکا اور "وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ" کی بات اپنی جگہ جوں کی توں قائم ہی رہی۔

(د) اس نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بارے میں اعلان کیا تھا کہ:۔

..... وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ (حجر ۹) ..... یقیناً ہم اس قرآن کو محفوظ رکھیں گے۔

یہ اعلان یا پیش گوئی جس طرح ایک حقیقت اور واقعہ ثابت ہوتی چلی آرہی ہے، کوئی دیانت دار منکر اسلام بھی اس کا انکار نہیں کرسکتا۔ قرآن جن لفظوں میں اور جس شکل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے پیش ہوا تھا، آج بھی وہ بعینہٖ ان ہی لفظوں میں اور ٹھیک اسی شکل میں پوری طرح محفوظ پایا جا رہا ہے، جب کہ اس سے پہلے کی آسمانی کتابوں میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں جس کے بارے میں اس کامل محفوظیت کا دعویٰ بھی کیا جاسکتا ہو، اس کا ایک حقیقت ثابت ہونا تو دور کی بات ہے لیکن قرآن نے اپنے متعلق جو خبر دی تھی کہ میں ہمیشہ محفوظ رہوں گا، اب تک کی تاریخ گواہی دے رہی ہے کہ یہ خبر ذرہ برابر غلط نہ تھی۔

(ہ) اس نے ایرانی مجوسیوں کے ہاتھوں رومی عیسائیوں کی شکست فاش کے موقع پر یہ اطلاع دی تھی کہ:۔

غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِيْ أَدْنَى الْأَرْضِ ..... رومی مغلوب ہوگئے ہیں، سرزمین عرب کے

وَ هُمْ مِنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ (روم - ۲ تا ۴)
قرب میں لیکن وہ اپنی اس مغلوبیت کے بعد، چند ہی برسوں میں، پھر غالب ہو رہیں گے۔

سات برس گذرتے گذرتے یہ اہلِ کتاب رومی آتش پرست ایرانیوں پر فی الواقع غالب آ گئے، اور اس طرح قرآن کریم کی دی ہوئی یہ اطلاع تاریخ کا ایک سچا واقعہ بن گئی۔

(د) اس نے یہودیوں کے متعلق ان کی حق دشمنی کی پاداش بیان کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:۔

.....لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ (اعراف - ۱۶۷)
..... وہ (یعنی اللہ تعالیٰ) ان پر ... ایسے لوگوں کو مسلط کرتا رہے گا مصائب میں ڈالیں گے۔

یہ قوم ایک طویل مدت سے جس طرح رہ رہ کر ذلیل وخوار اور تباہ و برباد ہوتی نظر آ رہی ہے۔ کبھی اشوریوں نے انھیں پامال کیا، کبھی بابل کے حکمراں بخت نصر نے ان کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دی، کبھی رومی شہنشاہ ٹیٹس نے انھیں تہس نہس کر ڈالا، کبھی اہلِ اسلام کے ہاتھوں انھیں قتل اور جلاوطنی اور غلامی کا عذاب اٹھانا پڑا، کبھی ہٹلر ان پر قہر بن کر ٹوٹا۔ اب آئندہ جو کچھ ہونے والا ہے، اسے تو اپنے وقت ہی پر دیکھا جا سکے گا۔ اس وقت تو زمانۂ حال ہی تک کی تاریخ زیرِ بحث لائی جا سکتی ہے، اور اس کے بارے میں ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ وہ ہمہ گیر قومی رسوائیوں اور بربادیوں کے عبرت ناک واقعات سے بھری پڑی ہے۔

ان چند اہم اور نمایاں قسم کی پیشین گوئیوں کے علاوہ قرآن میں اور پیشین گوئیاں بھی موجود ہیں، اور انہی کی طرح وہ سب بھی ایک ایک کر کے پوری ہو چکی ہیں۔ یہ صورتِ واقعہ اس امر کا ناقابلِ انکار ثبوت ہے کہ یہ پیشین گوئیاں کرنے والا الغیب کا قطعی علم رکھتا تھا۔ ورنہ یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ وہ یوں سب کی سب سچ نکلتیں، اور ان میں سے کوئی ایک بھی غلط ثابت نہ ہوتی۔ آخر دنیا میں نجومی اور کاہن بھی پیشین گوئیاں کرتے ہی رہتے ہیں، مگر کسی ایک بھی ایسے نجومی یا کاہن کا نام نہیں لیا جا سکتا جس کی ساری کی ساری پیشین گوئیاں یوں صحیح نکلتی رہی ہوں۔ اس کے خلاف ہوتا یہ ہے کہ اگر ان کی ایک پیشین گوئی صحیح نکل آئی تو چار غلط ثابت ہو گئیں جس کی وجہ بھی بالکل واضح ہے، اور وہ یہ کہ یہ پیشین گوئیاں لازمی طور پر صرف قیاس اور اندازے پر مبنی ہوتی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ مستقبل کے بارے میں ہوشیار سے ہوشیار انسان کے اندازے بھی ہمیشہ صحیح ثابت نہیں ہو سکتے۔ اب اگر قرآنی پیشین گوئیوں کا حال اس عام اور ہمہ گیر صورتِ حال سے مختلف رہا، اور وہ بلا تفریق سب کی سب سچ ہی ثابت ہوئیں تو یہ اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے

کہ ان کی بنیاد انسانی قیاس اور اندازے پر ہرگز نہیں تھی، بلکہ غیب کے واضح اور قطعی علم پر تھی، یعنی وہ کسی انسان کی طرف سے نہ تھیں، بلکہ اس خدا کی طرف سے تھیں جس کے سوا غیب کا واضح اور قطعی علم کسی اور کو حاصل ہی نہیں — دوسرے لفظوں میں یہ پیشین گوئیاں جس کتاب نے کی ہیں وہ ہرگز کوئی انسانی تصنیف نہیں بلکہ یقیناً خدائی کلام ہے۔

پانچواں ثبوت

قرآن مجید کے کتاب الٰہی ہونے کا پانچواں ثبوت یہ ہے کہ اس نے پچھلے انبیاءؑ کی سرگزشتوں کو اس طرح بیان فرمایا ہے جس طرح کوئی آنکھوں دیکھا حال بیان کرتا ہے۔ یہ سرگزشتیں کثر ایسی ہیں جن کی صحیح تفصیل سے اس سے پہلے نہ آپؐ کو کوئی واقفیت تھی نہ آپ کے وطن اور قوم میں ان کا کوئی چرچا تھا۔ جیسا کہ قرآن نے بعض قصوں کو بیان کرکے آخر میں فرمایا بھی ہے کہ "اس پورے واقعے کو آج سے پہلے نہ تم جانتے تھے نہ تمہاری قوم جانتی تھی" (مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَا أَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا - ھود - ۴۹) پھر یہ انبیاء جن کے قصے قرآن نے اپنے دعوتی مصالح کے تحت جا بجا بیان کیے ہیں۔ زیادہ تر بنی اسرائیل کے انبیاء تھے، بنی اسماعیل یعنی قوم عرب سے تعلق رکھنے والے نہ تھے، کہ اس قومی اور نسلی تعلق کی بنا پر اس قوم کو ان سے فطری دلچسپی ہوتی اور اپنی تاریخ اور روایات میں وہ انھیں جگہ دیتی۔ اس لیے قدرتی طور پر بھی آپؐ کو اور عام بنی اسماعیل کو ان کے حالات سے کوئی خاص واقفیت نہیں ہوسکتی تھی۔ اس صورت حال کی موجودگی میں قرآن نے ان انبیاء کی سرگزشتیں بیان فرمائیں، اور اس طرح بیان فرمائیں کہ خود تورات کو، جو انہی انبیاء کے صحیفوں کا مجموعہ ہے، ان میں سے کسی کی تردید کی جرأت نہ ہوسکی۔ اور اگر اس نے کہیں یہ جرأت کی بھی تو وہ کامیاب نہ ہوسکی۔ بلکہ اس کے ذریعہ اس نے درحقیقت خود اپنی ہی تردید کرلی۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ تورات کے بیانات قرآنی بیانات سے جہاں کہیں مختلف ہیں، وہاں کا یہ اختلاف حقیقی اور اصل تورات کا اختلاف نہیں ہے، بلکہ یہ ان تحریفات کا اختلاف ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی تورات میں اس کے پیرووں کے ہاتھوں راہ پاچکی ہیں۔ چنانچہ جو شخص بھی نبوت کا مقام و منصب سمجھتا ہے، فلسفۂ تاریخ سے واقفیت رکھتا ہے اور تنقید کے اصول اور قرائن سے کام لے کر ان بیانات کو پرکھ سکتا ہے، وہ تحقیق کی گہری نظر ڈال کر صاف محسوس کرے گا کہ جہاں کہیں بھی قرآن اور تورات کے بیانوں میں اختلاف ہے وہاں تورات کے بیانات حقیقت کے مطابق ہرگز نہیں ہوسکتے، اور یہ کہ حق قطعی طور پر قرآن ہی کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔

قرآن مجید کے لیے پچھلے انبیائے کرام کے قصوں کو اس طرح صحیح صحیح بیان کر دینا کہ موجودہ تورات کی غلطیوں کی بھی تصحیح ہو جائے، اس کے سوا اور کوئی معنی نہیں رکھتا کہ اس کے یہ بیانات خدائے علیم و خبیر کی طرف سے ہیں، اور وہ ضرور بالضرور آسمانی کتاب ہے۔

(باقی آئندہ)

جدید و قدیم کا فریب

(جناب عبد المغنی، ایم۔ اے)

جدید اور قدیم کا تصور وقت سے متعلق سمجھا جاتا ہے یعنی زمانے کی حدود میں جو چیز
ور جو فرسودہ ہو جائے وہ پرانی منطقی طور پر اس تصور کا فطری نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ماضی قدیم
ماں چہ گذری ہوئی تمام باتیں فرسودہ ہیں اور سامنے کی تمام باتیں تازہ۔ لیکن زمانے کی خانوں
صحیح مان لیا جائے تو انسان کی باتوں کا دائرہ نہایت محدود ہو جاتا ہے۔ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ یہ مقولہ
صحیح نہ بھی ہو تو کم از کم یہ حقیقت پیش پا افتادہ ہے کہ ہر حال کی رگوں میں ماضی کا خون دوڑتا ہے۔ ہر جدید، قدیم کا
وسرا رخ ہے۔ حاضر سماج کی بنیادی قدروں کا تجزیہ کیا یا جائزہ ہی لیا جائے تو ان میں کوئی ایک چیز بھی مشکل ایسی
لے گی جو ماضی میں بھی ٹھیک اسی طرح موجود نہیں رہی ہو۔ یہاں تک کہ ان قدروں کی تعبیر اور تعمیل میں بھی کوئی فرق واقع
ہیں ہوتا۔ دیانت، شجاعت اور فیاضی کے عناصر صفحۂ ہستی پر بسنے والے پہلے آدم سے آج تک ویسے ہی ہیں (بشرطیکہ
ہم آدم کو حیوانوں کی اولاد سمجھ کر ان عناصر کی تشریح اس کے آبا کی وحشت کے مطابق نہ کرنے لگیں!) ہم یہ مان بھی
یں کہ قدرت کے کارخانے میں سکون محال ہے تو حرکت بہر حال ایک تدریج اور تسلسل کے ساتھ ظہور پذیر ہوگی۔ پھر
رکت کا مطلب لازمی طور پر تغیر تو نہیں۔ ترقی کے لیے تبدیلی شرط تو نہیں۔ انقلاب زندہ باد یا مردہ باد، اس کا مطلب
ر اگلی چیز کو الٹ کے رکھ دینا نہیں ہو سکتا   نہیں ہوتا ہے۔

مربوط اور ترقی پذیر سماج میں ایک چیز ہوتی ہے روایت جس سے بغاوت نام کی کوئی حرکت معقول اور
مفید تو نہیں ہی ہے ممکن بھی نہیں۔ روایت سے بغاوت کر کے آدمی جائے گا کہاں اور حاصل کیا کر لے گا۔ سمندر کا رخ
موڑ دینے کا تصور بڑا ولولہ انگیز ہے لیکن عالم واقعہ میں آج تک ایسا ہو نہیں سکا۔ تاریخ بھی ایک سمندر ہے جس کا
سیل اس میں سانس لینے والوں کو ازل کے ایک دہانے سے ابد کے دوسرے ساحل تک بہائے لیے جا رہا ہے۔ شوریدہ
نہریں کتنا ہی اچھلیں، راہ کے آس پاس پڑی ہوئی چٹانوں سے کتنا ہی سر ٹکرائیں، حیطۂ آب سے باہر نہیں نکل پاتیں، تھک ہار کر

بالآخر دوسرے پرسکون دھاروں کے ساتھ مل جاتی ہیں۔ بے کراں کائنات کی یہ نیل گوں فضا اپنے ایک حقیر سیالے کی طرح کسی محور پر گردش نہیں کر رہی ہے۔ کسی مقصد کی جانب آہستہ آہستہ گام زن ہے۔ ہم اس حقیقت کو محسوس کریں یا نہ کر پائیں اس طلسم میں اسیر ضرور ہیں۔ ہاں تو انسانی سماج کی اپنی ایک مسلسل روایت ہے جس کی بنیاد پر یہ ایک مربوط ارتقا کے پیہم عمل سے گزر رہا ہے۔ ہر دور ہمارے سامنے ایک نیا زینہ پیش کر دیتا ہے۔ اس ترتیب سے آدم خاکی عروج کی منزلیں طے کر رہا ہے، تاکہ اپنی کھوئی منزل کو حاصل کرکے معراج سے ہم کنار ہو۔ ظاہر ہے کہ ترقی کی اس سیڑھی کا اگر کوئی ایک ڈنڈا بھی نکال لیا گیا تو اوپر کی طرف چڑھتے ہوئے آدم کے قدم ڈگمگانے لگیں گے اگرچہ اسے چھوڑے ہوئے زینے پر لوٹ کے نہیں آنا ہے۔ لیکن اصل چیز تو پوری سیڑھی کی متوازن ساخت ہے، جس کی کلی مضبوطی ہی اگلے قدموں کی ضامن ہے۔ سائنس کے نظریات بھی ایک ارتقا کی تائید کرتے ہیں۔ انقلاب کا کھیل کچھ لڑکوں کے دل بہلانے کے لیے ہی ہو سکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ انسانی سماج کی اس ارتقائی روایت کا عمل دست بدست وراثت ہی کی شکل میں جاری رہ سکتا ہے۔ ہر پچھلی نسل اپنے اگلوں سے وہ بنیادی باتیں سیکھتی چلی جاتی ہے جن کی روشنی میں اس کو اپنے حصے کے حوادث سے گذرنا ہے۔ ہر بیٹا اپنے باپ کے تجربوں کا وارث ہوتا ہے۔ اس طرح ذہنی سرمایے نسل بعد نسل منتقل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ کائنات کی ظاہر سے بے ربطیوں میں اصل ربط یہی ہے۔ اسی کی بدولت ہمارے نظام میں وہ توازن ہے جس کی کشش کے سبب ہی سیارے باہم ٹکرا کر پاش پاش ہو جانے کی بجائے اپنی جگہ ضوفشاں ہیں۔ ایسی یگانگت کی فضا میں جدید اور قدیم کی تفریق ایک تفرقہ ہے۔ اس سے وسعتِ نظر کے اس فقدان کا ثبوت ملتا ہے جس کو اقبال نے اس انداز میں واضح کیا ہے۔

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک   دلیل کم نظری قصۂ جدید و قدیم

آدمی کی زندگی ایک کُل اور ایک وحدت ہے۔ اس زندگی کا نظام مربوط ہے اور ایک منظم کائنات کے اندر مستحکم ہے۔ اس نظم و ضبط کے باوصف کائنات اور حیات میں انتشار اور بے ربطیوں کے بے شمار مظاہر نظر آتے ہیں۔ یہ بھی عالم کی ترتیب کا ایک ضروری جز ہے۔ اس لیے کہ زندگی کی ترکیب ایک قسم کے مادے سے نہیں ہوئی۔ اس کے خمیر میں رنگ برنگ عناصر شامل ہیں۔ حیات کا لطف بہت کچھ اس تنوع سے وابستہ ہے، ورنہ انسان کی سیمابی طبیعت یکسانی سے اکتا جاتی۔ مگر تنوع کا مطلب انتشار پسند تلون نہیں۔ ممکن ہے انسان کی فطرت اس کی طرف لپکتی ہو لیکن جو طاقت کائنات اور حیات کے کارخانے کو چلا رہی ہے وہ کسی طرح اس کی اجازت

نہیں دے سکتی۔ یہ دنیا، اس پر سانس لیتی ہوئی زندگی اور اس پر بسنے والے جاندار بہرحال اس عظیم طاقت کے تخلیقی منصوبے کے چند اجزا، چند پہلو ہیں۔ چنانچہ یہ طاقت اپنے اس منصوبے کو بروئے کار لانے کے لیے کچھ انداز رکھتی اور کچھ تدبیریں اختیار کرتی ہے، جس کو ہم کائنات کی 'تقدیر' کہہ سکتے ہیں۔ کائنات کی سطح پر حرکت کرنے والا (اور جامد بھی) ہر فرد، دانستہ یا نادانستہ، چار و ناچار اس تقدیر کا پابند ہے۔

جب ہماری زندگی اتنی باضابطہ اور پیوستہ ہے تو ظاہر ہے کہ وقت کے جو ٹکڑے، حیات کے پہلو اور [illegible]
کے اجزا، ہیں الگ الگ دکھائی دیتے ہیں وہ دراصل ایک بڑے کُل کے متفرق جز ہیں [illegible]
دوسرے سے بالکل جڑے ہوئے۔ یوں سمجھیے کہ کائنات دھاگوں کا ایک لچھا ہے جس کے [illegible]
کھلتے جاتے ہیں۔ لہٰذا کہنا چاہیے کہ زمانہ ایک ہے، حیات ایک ہے اور کائنات بھی [illegible]
لاتعداد موجوں کو لیے ہوئے افق کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے کی طرف بہتا چلا جا رہا ہے۔

جدید و قدیم کا قصہ کم نظری کے سوا کسی اور بات کی دلیل نہیں ہو سکتی۔ اگر بصیرت اور وسعت نظر سے کام لیا جائے تو جدید اور قدیم دونوں ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ثابت ہوں گے۔

پھر جدید اور قدیم کے الفاظ ہی کیوں وضع ہوئے؟ بات یہ ہے کہ ہمارا وجود مطلق نہیں۔ ہماری پوری ہستی اور اس کا ہر عمل اضافی ہے۔ ہم ہمیشہ ہر کام کچھ حدوں کے اندر ہی کر پاتے ہیں۔ چناں چہ ہمارے لغت کے بے شمار دوسرے الفاظ کی طرح جدید اور قدیم بھی ہمارے محدود ذہن کے تصورِ وقت کی ناقص تعبیریں ہیں۔ ایک عارضی وجود کے مالک ہونے کے سبب ہم لمحوں میں سوچنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ہماری نگاہ صرف گذرتی ہوئی گھڑیوں پر پڑتی ہے۔ ہم اس حد تک اپنے حال میں اسیر ہیں کہ اپنے پیچھے اور آگے جانے اور آنے والے زمانوں کے لیے ماضی اور مستقبل کی علاحدہ اصطلاحیں وضع کر لی ہیں۔ ہماری نگاہِ نارسا کی یہ حدیں ناگزیر ہیں۔ ہماری نظر کتنی ہی بڑھ جائے پھر بھی کم رہے گی۔

ہم سورج اور چاند کو ایک افق سے ابھر کر دوسرے میں ڈوبتا ہوا دیکھتے ہیں۔ ہماری نظر صبح و شام، طلوع و غروب کے اس تماشے میں بند ہے۔ ہم شب و روز، ماہ و سال کے زندانی ہیں۔ چناں چہ زمان و مکان میں اس طبعی اسیری کا منطقی نتیجہ ہے کہ ہم زمانے کی حرکت کو جدید اور قدیم کی ابھرتی اور مٹتی ہوئی لکیروں میں منقسم کر دیتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے روزمرہ مشغلوں کی تقویم بنتی ہے۔ چناں چہ جہاں تک جدید اور قدیم کے اضافی اور عملی استعمال کا تعلق ہے وہ ہماری ایک فطری ضرورت ہے۔ اپنے گزشتہ کے احتساب، حال کے فہم اور مستقبل کے قیاس کے لیے ہم نئے اور پرانے کی تعبیریں کرنے پر مجبور رہیں۔ اس میں کوئی مضائقہ بھی نہیں۔

لیکن اصل مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب جدید و قدیم کی اس تقسیم کو امتیاز اور تعارف کی بجائے تنازع اور افتخار پر محمول کر لیا جائے۔ یہ فرض کر لیا جائے کہ جدید اور قدیم ایک دوسرے سے متضاد اور باہم برسرِ پیکار ہیں اور یہ کہ ہر نئی بات اچھی اور قابلِ فخر ہے اور ہر پرانی بات بری اور موجبِ عار ہے۔ سب سے زیادہ مغالطہ انگیز تصور یہ کہ ماضی میں ابھرنے والی ہر چیز اگر معدوم نہیں تو ازکاررفتہ اور بھلا دینے کی ہے اور حال میں پائی جانے والی ہر شے اہم اور مفید ہے۔ گزشتہ سے وابستگی پس ماندگی اور تنزلی ہے اور موجودہ کی پابندی سراسر ترقی اور عروج ہے۔ مختصر یہ کہ جدت اور قدامت نام کے دو نظریے مستقل اور مختلف فکری مکتبوں کی شدت اختیار کر لیں اور ان کی بنیاد پر دو متقابل عملی ادارے منظم ہو جائیں۔ کم از کم نئے اور پرانے کی صفیں دو ذہنی رجحان اور عملی کردار کی شکل میں صف آرا ہو جائیں۔ یہ صورتِ حال مغالطے پر مبنی اور ہلاکت خیز ہے۔

یہ مغالطہ دراصل دو سماجی حرکت کی دو مختلف لہروں کو نہیں سمجھنا اور خلط ملط کر دینے سے پیدا ہوتا ہے۔ سماجی حرکتوں کے دو مظاہر ہیں۔ ایک مسائل، دوسرے قدریں۔ مسائل سطحی اور عارضی ہوتے ہیں۔ یہ وقت اور مقام کے اعتبار سے ابھرتے اور مٹتے رہتے ہیں۔ جیسے بے روزگاری، ضبطِ ولادت وغیرہ۔ اس کے برخلاف قدریں بنیادی اور دائمی ہوتی ہیں۔ یہ کچھ مجرد اوصاف ہیں جو ہر مقام اور وقت کے لیے یکساں اہمیت رکھتے ہیں۔ جیسے ایمان داری، بہادری، حیا، سخاوت وغیرہ۔ مسائل اپنے ہنگامی کردار کے سبب بعض وقت فرسودہ ہو جا سکتے ہیں۔ مگر اقدار کی ابدیت انہیں ہمیشہ تازہ رکھتی ہے۔ چنانچہ جدید و قدیم کی تفریق سماجی حرکت کے ان اطوار میں کسی حد تک صحیح ہو سکتی ہے جنہیں ہم مسائل کہتے ہیں۔ وہ آفاقی اوصاف جو اقدار کہے جاتے ہیں بہرحال وقت کی دست برد اور مقام کی گرفت سے آزاد ہیں۔

چنانچہ سماج کے عمرانی ارتقا میں روایت سے بغاوت کا تصور غیر منطقی ہے۔ روایت نام ہے اقدار کے مجموعے کا۔ کسی دور میں پیش آنے والے ہنگامی مسائل جب گذر جاتے ہیں تو ان کی تہ میں بیٹھی ہوئی قدریں اجاگر ہو کے اپنا ایک نظام بنا لیتی ہیں۔ یہ نظام دوسرے دور میں ایک زندہ اور فعّال طاقت کی حیثیت سے منتقل ہو جاتا ہے۔ وہاں پھر یہ نظامِ اقدار کچھ نئے مسائل سے دوچار ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ بھی اپنی مدت پوری کر جاتے ہیں۔ اور نظامِ اقدار پھر نئی آب و تاب کے ساتھ ایک اور منزل میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ یوں سمجھیے کہ مسائل موجوں کی طرح اچھلتے اور بکھرتے رہتے ہیں اور قدریں موتیوں کی طرح تہ میں پرورش پاتی رہتی ہیں۔ سماج اپنے قیمتی گوہروں کو سطح کی طوفانی لہروں سے بچا کر اسی طرح صدف میں محفوظ رکھتا ہے۔ اور جو موتی جتنا پرانا ہو شاید اتنا ہی آب دار

اور بیش قیمت ہوتا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اس معاملے میں نئے اور پرانے کی تمیز بے وقوفی اور محرومی بلکہ تباہی ہے۔
لہٰذا جدید و قدیم کی زمانی و اضافی حقیقت تو مسلم ہے لیکن اس بنا پر دونوں کے درمیان اس انداز کی تفریق کہ ایک کو اختیار اور دوسرے کو ترک کیا جائے محض فریب ہے۔ فکر و عمل کے معاملے میں ردّ و قبول کا معیار اشیاء کی مطلق قدر اور ان کا ذاتی وصف ہے، نہ کہ عارضی و ضمنی اعتبارات۔ بجائے خود نیا پن کوئی خوبی نہیں اور نہ پرانا ہونا کوئی خرابی ہے۔ اپنی اپنی صلاحیت کے لحاظ سے سماج میں دونوں کی جگہ مساوی ہے۔ اس طرح قدیم پختہ و مجرب ہو سکتا ہے اور جدید خام اور ناقص۔ نہ یہ تازہ، نہ وہ فرسودہ۔

ان حقائق کے باوجود جدید اور قدیم کی کش مکش انسانی تاریخ کا ایک واقعہ ہے۔ پرانے کی آویزش سامنے آجاتی ہے۔ اقبال کے الفاظ میں ؎

آئینِ نو سے ڈرنا، طرزِ کہن پہ اڑنا منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی

ظاہر ہے کہ یہ مشکل غلط فہمی کے سبب پیش آتی ہے۔ آئینِ نو کی سرکشی طرزِ کہن کو اندیشوں میں [illegible] ورنہ اگر پچھلے سنجیدگی سے کام لیں تو اگلوں کی امید وہی ہیں۔ اسی طرح اگر اگلے دور اندیشی کو راہ دیں تو پچھلے ان کا ہی سرمایہ ہیں۔ بزرگوں کی رہ نمائی کے بغیر خرد ایک قدم آگے نہیں بڑھا سکتے، اور خرد اگر اپنے قدم روک لیں تو بزرگ راستے ہی میں تھک کر چور ہو جائیں گے۔ بوڑھوں کی بصیرت اور جوانوں کی حرکت ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ باپ بیٹے جب تک ایک دوسرے کو سمجھ کے سہارا نہیں دیں گے آدمی کا خاندان بڑھے گا تو کیا سنبھل بھی نہیں سکتا۔ دونوں کے درمیان تعاون کی بنیاد بیٹے کی فرماں برداری اور باپ کی حوصلہ افزائی ہے۔

چناں چہ سماج کی زندگی اور ترقی کے لیے بغاوت اور انقلاب کی وحشت نہیں، روایت اور ارتقاء کی متانت درکار ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایک صالح اور متحرک سماج بہت سے فاسد اور جامد مادوں کو خارج کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے لیکن ارتقاء کا عمل خود ایسی تمام اصلاحات کا ضامن ہے۔ یہ ارتقاء دراصل جدید اور قدیم کی کش مکش میں نہیں، خیر اور شر کی آویزش میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ کائنات کے ارتقاء میں خیر و شر کی یہی قوتیں ایک دوسرے سے پیہم نبرد آزما ہیں۔ یہی وہ روحانی جدلیات ہے جو صحیح معنی میں ہماری تہذیبی تاریخ کی ترجمانی کرتی ہے۔ حیات و موت کی تخلیق ہمارے عمل کی آزمائش کے لیے ہوئی ہے۔ ہمارے انجام کا فیصلہ نیک اور بد کی اس پیکار میں ہماری شرکت کے مطابق ہوگا۔ ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

زکوٰۃ کا ایک جُزئیہ

(۲)

(سید احمد قادری)

میں نے زندگی ماہ ستمبر ۱۹۶۲ء کے شمارے میں "زکوٰۃ کا ایک جزئیہ" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا، اس مضمون کے تین حصے تھے، پہلے حصے میں فقہ حنفی کی تصریحات کی روشنی میں سائل کا جواب تھا، دوسرے حصے میں مولانا عامر عثمانی مدیر تجلی کی تحقیق پر اظہار خیال کیا گیا تھا اور تیسرے حصے میں ہندوستانی وزن کے مطابق مقدار نصاب پر گفتگو تھی۔ ماہ نومبر ۱۹۶۲ء کے "تجلی" میں اس مضمون پر فاضل مدیر تجلی نے اظہار خیال فرمایا ہے۔ میرے مضمون کی بعض عبارتوں کو انھوں نے جس انداز میں پیش کیا ہے اس سے غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے اس لیے توضیح مزید کی ضرورت پیش آئی۔ میں اپنی اس تحریر میں حسب سابق غیر متعلق مباحث پر گفتگو نہیں کروں گا کیونکہ خلطِ بحث سے مسئلہ الجھتا ہے سلجھتا نہیں ہے۔ میں جو کچھ لکھنا چاہتا ہوں اس کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ غلط فہمی دور کی جائے اور دوسری غرض یہ ہے کہ نقطۂ اختلاف کو مزید وضاحت کے ساتھ پیش کیا جائے۔ طولِ بیان میں نقطۂ اختلاف گم ہو جاتا ہے۔

(۱) میں نے اپنے مضمون میں تنویر الابصار اور اس کی شرح درمختار کی ایک عبارت نقل کی تھی۔ فاضل مدیر تجلی نے اس عبارت میں سے صرف ایک ٹکڑا لانھما خلقا اثمانا فیزکیھما کیف کانا نقل کرکے لکھا ہے:

"ہم عرض کرتے ہیں کہ کسی بھی عام فقرے میں سے وہ چیزیں یقیناً مستثنیٰ ہو جایا کرتی ہیں جن کا استثناء دوسرے اصول و کلیات کا مقتضیٰ ہو، مثلاً اسی اصولی فقرے میں یہ تقیید بالکل نہیں کہ یہ سونا چاندی بقدر نصاب ہونا چاہیے مگر یہ سب جانتے ہیں کہ نصاب سے کم مقدار پر اس کا اطلاق نہیں ہوگا۔"

آگے چل کر انھوں نے صفحہ ۸ پر میری ایک اور تحریر نقل فرمائی ہے۔ میں نے لکھا تھا:-

"فقہ حنفی کے لحاظ سے چاندی سونے میں بہر صورت زکوٰۃ واجب ہوتی ہے چاہے ان کی حیثیت مستقل ہو یا نہ ہو۔"

میری یہ تحریر نقل کرکے وہ لکھتے ہیں :-

"ہمیں یہ تعمیم و اطلاق تسلیم نہیں دو تولے سونے پر کوئی حنفی زکوٰۃ کا قائل نہیں چاہے چاندی پچاس تولے ہو اس پر زکوٰۃ عائد نہیں ہوتی ۔ نابالغ ہزار من سونے کا وارث بنے تب بھی زکوٰۃ سے بری ہے ۔"

جس شخص نے میرا مضمون نہیں پڑھا ہے وہ میری منقولہ عبارت اور اس سے مدیر تجلی کے اختلاف کو پڑھ کر بجا طور پر اس غلط فہمی میں مبتلا ہوسکتا ہے کہ میں سونے چاندی میں وجوب زکوٰۃ کی ایک ایسی تعمیم و اطلاق کا قائل ہوں جس میں نصاب کا بھی کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا، گویا میں ایک اجماعی مسلک سے اختلاف کر رہا ہوں ۔ ... مضمون میں مقدار نصاب کا ایک مستقل حصہ شامل ہے اور اپنے جوابی مضمون کے آخر میں ... فاضل مدیر نے بھی کیا ہے ۔ اس کے علاوہ اگر وہ تنویر و درمختار کی پوری عبارت نقل کرتے جو ... لکھی ہے تو نقدین میں وجوب زکوٰۃ کے قاعدۂ کلیہ میں ان استثناءات کی کوئی گنجائش نہ ... میں طوالت سے بچنے کے لیے عربی عبارت کا صرف ترجمہ یہاں پھر نقل کرتا ہوں ۔

"چاندی اور سونے کے ڈھلے ہوئے سکوں میں اور ان سے بنی ہوئی چیزوں میں اگر چہ وہ ڈھلے ہوئے ٹکڑے ہوں یا زیور ان کا استعمال مباح ہو یا نہ ہو اور اگرچہ وہ زینت اور خرچ کے لیے ہوں اس لیے کہ چاندی اور سونا خلقۃً ثمن ہیں، لہٰذا ان دونوں کی زکوٰۃ ادا کی جائے گی جس شکل میں بھی ہوں ۔"

اس عبارت سے صاف معلوم ہوا کہ قاعدۂ کلیہ کی کلیت اور اس کے عموم کا تعلق سونے چاندی کی صرف اشکال سے ہے اس کا تعلق نہ مقدار سے ہے اور نہ اس سے کہ زکوٰۃ کن لوگوں پر واجب ہوتی ہے اور کن پر واجب نہیں ہوتی چونکہ عورتوں کے زیورات اور چاندی سونے کی بنی ہوئی بعض دوسری چیزوں پر دیگر ائمہ کے یہاں زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی اس لیے فقہائے احناف مسلک حنفی کی توضیح کے لیے تعمیم و اطلاق کے وہ جملے لکھتے ہیں جن کا ذکر اوپر گزرا اور اسی لیے دلیل کے طور پر صاحب درمختار نے جو جامع فقرہ لکھا ہے اس میں کیف کا لفظ استعمال کیا ہے جو کیفیت اور شکل کو بیان کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے کمیت اور مقدار کو بیان کرنے کے لیے استعمال نہیں ہوتا ۔ اس کے علاوہ میں نے اصلاً نقدین میں وجوب زکوٰۃ کے لیے صاحب بدائع کی عبارت پیش کی تھی اور اس میں اتفاق سے نصاب کا ذکر بھی موجود ہے ۔ میری جو دوسری عبارت انھوں نے پیش کی ہے، اس میں یہ جملہ کہ " چاہے ان کی حیثیت مستقل ہو یا نہ ہو" بتا رہا ہے کہ "بہر صورت" کی تعمیم کا تعلق مستقل و غیر مستقل سے ہے نہ کہ مقدار یا کسی اور چیز سے، فاضل مدیر تجلی نے یہ روش کیوں اختیار کی اور قارئین تجلی کو انھوں نے میرے بارے میں یہ تاثر کیوں دیا اس کا جواب وہی

دے سکتے ہیں، بہر حال میں پھر لکھتا ہوں کہ صاحب درمختار کی عبارت سے جو قاعدہ نکلتا ہے اس میں سرے سے ان استثناؤں کی گنجائش موجود نہیں ہے جو فاضل مدیر نے پیش کیے ہیں، چاندی سونا جس شکل میں بھی موجود ہوں ان پر فقہ حنفی کی رو سے زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، کتنی مقدار پر واجب ہوتی ہے اور کتنی پر نہیں ہوتی کن لوگوں پر واجب ہوتی ہے اور کن لوگوں پر نہیں ہوتی، کن حالتوں میں واجب ہوتی ہے اور کن حالتوں میں نہیں ہوتی ان کو اپنے اپنے محل پر دیکھنا چاہیے، قاعدۂ کلیہ کے عموم کو ان مباحث سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

(۲) میں نے لکھا تھا:۔ "ایسے سکے جن میں چاندی کم اور کھوٹ زیادہ ہو عروض میں داخل ہیں"۔ اس پر موصوف لکھتے ہیں:۔

"ہم علی الاطلاق اسے بھی درست نہیں سمجھتے بازار میں جو سکہ رائج ہے اس میں چاندی تو برائے نام ہی ہوگی سارا کھوٹ ہی کھوٹ ہے۔ پھر بھی اسے سامان (عروض) نہیں کہیں گے"۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ مذکورہ قسم کے کھوٹے سکوں کو عروض میں نے اپنی طرف سے نہیں کہا ہے، تمام فقہائے احناف انہیں عروض ہی کہتے ہیں، ان کی اصطلاح میں سونے چاندی کے سوا تمام دوسری دھاتیں اور سامان عروض میں داخل ہیں وہ ماسوی النقدین کو عروض ہی کہتے ہیں، اس لیے فاضل موصوف کا یہ اختلاف مجھ سے نہیں فقہائے احناف سے ہے۔ متنِ ہدایہ کی مختصر عبارت یہ ہے:۔

واذا کان الغالب علی الورق الفضۃ	اور جب چاندی کے سکے میں چاندی غالب
فھو فی حکم الفضۃ واذا کان الغالب	ہو تو وہ چاندی کے حکم میں ہے اور جب اس میں
علیھا الغش فھو فی حکم العروض۔	کھوٹ زیادہ ہو تو وہ عروض کے حکم میں ہے

لفظ "مال" کا اطلاق فقہی اصطلاح میں سونے چاندی پر بھی ہوتا ہے اور "سامان" پر بھی اسی لیے سامان تجارت کی زکوٰۃ کا مسئلہ بھی فقہاء "زکوٰۃ المال" کے باب میں تحریر فرماتے ہیں۔ اسی طرح کے کھوٹے سکوں کے بارے میں، میں نے لکھا تھا۔

"اگر وہ بازار میں رائج ہیں یا ان کی تجارت مقصود ہے تو قیمت دیکھی جائے گی اگر ان کی قیمت چاندی کے نصاب تک پہنچ جاتی ہے تو زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں"۔

اس پر موصوف لکھتے ہیں:۔

"جو سکے بازار میں رائج ہیں ان کی زکوٰۃ کا تعلق اس چاندی سے ہرگز نہیں ہے جو ان میں پائی جاتی ہے"۔

میں اتنی ہی عبارت پڑھ کر حیران رہ گیا کہ میری عبارت کے کس لفظ سے یہ نکلتا ہے کہ یہ رائج سکوں میں اس چاندی کا

اعتبار کر رہا ہوں جو اس میں پائی جاتی ہے، کیا موصوف کو قیمت کے لفظ سے دھوکا ہوا؟ حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ فقہی اصطلاح میں "قیمت" مالیت ہی کو کہتے ہیں، اس لیے عبارت کا مطلب یہی ہے کہ مروجہ سکوں کی مالیت اگر چاندی کے نصاب تک پہنچ جائے تو زکوٰۃ واجب ہوگی، مالیت کے بجائے قیمت کا لفظ میں نے اس لیے اختیار کیا ہے کہ فقہا اس موقع پر قیمت ہی کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ میری منقولہ عبارت کے بعد کی عبارت بھی بتا رہی ہے کہ کھوٹے سکوں کے رواج کی شکل میں یا ان کی تجارت کی صورت میں ان کی مالیت کا اعتبار نہیں ہے جو اس میں موجود ہے بلکہ چاندی کا اعتبار اس صورت میں ہوگا جب وہ سکے بازار میں رائج نہ ہوں۔ میں نے لکھا تھا:۔

"اور اگر وہ بازار میں رائج نہیں ہیں اور نہ ان کی تجارت مقصود ہے تو ان میں زکوٰۃ واجب ہونے کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ ان میں خود اتنی چاندی موجود ہے جو دو سو درہم کے ہم وزن ہے تو زکوٰۃ واجب ہوگی دوسری یہ کہ ان میں نصاب سے کم چاندی ہے لیکن صاحب عروض کے پاس الگ سے کچھ سونا یا سامان تجارت موجود ہے اور اس کی قیمت ملانے سے نصاب پورا ہو جاتا ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔"

یہ عبارت بھی ضرور موصوف کی نظر سے گزری ہوگی، ان باتوں کی موجودگی میں پتہ نہیں کس طرح فاضل مدیر نے میری عبارت کا ایک ایسا مطلب اخذ کر لیا جو اس سے نہیں نکلتا اور پھر اس کی زور دار تردید بھی کر ڈالی۔

(۳) تجلی جولائی ۱۹۶۲ء میں موصوف نے خیال ظاہر فرمایا تھا کہ مسئلہ زیر بحث میں قانوناً تو زکوٰۃ واجب نہ ہونی چاہیے لیکن احتیاطاً زکوٰۃ ادا کرنی چاہیے اس کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے ان کے عدم وجوب کی رائے پر تبصرہ سے پہلے لکھا تھا:۔

"ویسے زیر بحث مسئلے میں عملی حیثیت سے ہمارے اور ان کے درمیان کوئی بڑا اختلاف نہیں ہے کیونکہ وہ بھی کہتے ہیں کہ احتیاطاً زکوٰۃ ادا کرنی چاہیے اور وہ بعض جلیل القدر فقہائے احناف کے اس قول سے واقف ہوں گے کہ عبادات میں احتیاط واجب ہے۔"

اس پوری عبارت میں سے انھوں نے خط کشیدہ جملے اپنے جوابی مضمون میں نقل کر کے تحریر فرمایا ہے:۔

"عاجز کی رائے ہے کہ فقہا کے اس قول کا حوالہ برمحل نہیں دیا گیا یہ قول اتنا غیر محدود نہیں ہے کہ ٹھیٹ قانونی بحث میں کارآمد ہو سکے۔"

تعجب ہوا کہ جو عبارت میں نے یہ دکھانے کے لیے لکھی تھی کہ ہمارے اور ان کے درمیان کوئی بڑا اختلاف

زکوٰۃ کا ایک جزئیہ

نہیں ہے، اس کی تردید بھی انھوں نے ضروری سمجھی۔ اوپر کی عبارت میں "عملی حیثیت" کی قید بتا رہی ہے کہ میں نے بعض فقہاء کا قول بحیثیت قانونی بحث میں کارآمد بنانے کی غرض سے نقل نہیں کیا تھا بلکہ اختلاف کی شدت کو کم دکھانے کی غرض سے لکھا تھا لیکن اب راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ بعض فقہاء کا منقولہ قول بحیثیت قانونی بحث میں بھی کارآمد ہے۔ "واجب" بہرحال ایک قانونی لفظ ہے اور جب وہ عبادات میں احتیاط کو واجب قرار دیتے ہیں تو یہ بحیثیت قانونی مسئلہ بن جاتا ہے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص بعض فقہاء کے اس قول کو تسلیم نہ کرے لیکن تسلیم کر لینے کے بعد وہ اس کی قانونیت سے انکار نہیں کر سکتا ـــــ فاضل مدیر نے تردید کرتے ہوئے احتیاط کی جو مثالیں دی ہیں انھیں پڑھ کر حیرت ہوئی، مثلاً انھوں نے لکھا ہے:-

"وضو میں احتیاط کا تقاضا ہے کہ منہ کو پانچ سات مرتبہ دھویا جائے، ہاتھ پیر پر میل ہو تو اسے مل کر چھڑایا جائے مگر اس احتیاط کو واجب کون کہہ سکتا ہے"

یہ بات پہلی دفعہ معلوم ہوئی کہ وضو میں منہ کو پانچ سات مرتبہ دھونا یا ہاتھ پیر کے میل کو چھڑانا احتیاط کا تقاضا ہے۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ اعضاء وضو کو تین مرتبہ سے زیادہ بلاضرورت دھونا سنت کے خلاف اور اسراف میں داخل ہے۔ اسی طرح ہاتھ پاؤں کے میل کو چھڑانا تنظیف و استحباب سے تعلق رکھتا ہے، نہ کہ احتیاط سے۔ لفظ احتیاط کا یہ استعمال میرے لیے بالکل جدید استعمال ہے۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ عبادات میں احتیاط کا لفظ دو موقعوں پر استعمال کیا جاتا ہے ایک یہ کہ کسی چیز کے بارے میں کوئی حتمی و یقینی فیصلہ دشوار ہو اور دوسرا یہ کہ اختلاف فقہاء سے بچ کر عمل کرنا بہتر سمجھا جائے، اس کی روح یہ ہے کہ عبادت بغیر کسی شک کے ادا ہو یا کسی واجب کی ادائیگی چھوٹ نہ جائے۔ میں اس کی کئی مثالیں پیش کرتا ہوں۔

چاندی کی بنی ہوئی کسی چیز میں اگر کھوٹ شامل ہو تو اس کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ چاندی غالب ہو اور کھوٹ مغلوب ہو، اس صورت میں وجوب زکوٰۃ کے مسئلے میں حتمی طور پر اس چیز کا حکم خالص چاندی کا ہوگا، دوسری یہ کہ کھوٹ غالب ہو اس صورت میں یقینی طور پر اس کا حکم عروض کا ہوگا غالب چاندی کا نہ ہوگا۔ تیسری یہ کہ چاندی اور کھوٹ دونوں مساوی ہوں اس صورت میں اس کا حکم کیا ہو؟ یقینی طور پر کوئی فیصلہ دشوار ہے ایسی ہی صورت میں بعض جلیل القدر فقہائے احناف فرماتے ہیں کہ احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ وجوب زکوٰۃ کے مسئلے میں اس چیز پر بھی غالب چاندی کا حکم لگایا جائے اور چونکہ عبادات میں احتیاط واجب ہے اس لیے پورے وزن کی زکوٰۃ ادا کی جائے۔ فرض کیجیے ایک سو دس تولے کا کوئی ظرف ہے جس میں ۵۵ تولہ چاندی اور ۵۵ تولہ تانبا ملا ہوا ہے تو پورے ایک سو دس میں

تولہ کی زکوٰۃ ادا کرنی چاہیے۔ اس موقع کی دوسری مثال ماءِ مشکوک ہے۔ اگر کسی کے پاس صرف ماءِ مشکوک موجود ہے تو وہ کیا کرے؟ تیمم کرے یا وضو؟ فقہاء فرماتے ہیں کہ تیمم بھی کرے اور وضو بھی۔ کیونکہ اس صورت میں دونوں کو ضم کرنا احتیاط کا تقاضا ہے۔ اسی ماءِ مشکوک کے سلسلے میں ایک مسئلہ یہ ہے کہ اس سے وضو کرنے میں نیت ضروری ہے یا نہیں؟ فقہاء میں اختلاف ہے لیکن وہ فرماتے ہیں کہ احوط یہ ہے کہ نیت کی جائے۔ اس کی تیسری مثال تھوک اور خون کا مساوی ہونا ہے اس صورت میں فقہاء احتیاطاً اسے ناقضِ وضو مانتے ہیں۔ اختلافِ فقہاء سے بچنے کی مثال یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک فیئ زوال کے سوا دو مثل تک ظہر کا وقت ہے اور دیگر ائمہ ... مثل تک۔ علماء فرماتے ہیں کہ احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ ایک مثل کے اندر ظہر کی نماز ادا کرلی جا... معلوم ہوا کہ احتیاط کے مسئلے میں بعض فقہاء احناف کے جس قول کا حوالہ میں نے دیا ہے وہ بے محل ... مسئلے میں وجوب زکوٰۃ بالفرض مشکوک بھی ہو تو احتیاطاً اسے واجب قرار دیا جائے۔ البتہ فاضل ... کی جو مثالیں پیش کی ہیں ان میں سے اکثر پر فقہی محاورے کے لحاظ سے یہ لفظ صادق ہی نہیں آتا۔

(۴) ہمارے اور فاضل مدیر تجلی کے درمیان نقطۂ اختلاف کیا ہے؟ اسے ذہن نشین کرنا چاہیے۔ ہمارے اور ان کے درمیان یہ نقطۂ اختلاف نہیں ہے کہ اگر کسی کے پاس سچے گوٹے لچکے کی شکل میں بقدر نصاب چاندی یا سونا موجود ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ ہم سب کے نزدیک واجب ہوگی۔ ہمارے اور ان کے درمیان یہ اختلاف بھی نہیں ہے کہ اگر اس بقدر نصاب چاندی سونے کے علاوہ الگ سے کسی کے پاس کچھ اور چاندی اور سونا موجود ہو تو دونوں کو ملاکر زکوٰۃ دینی ہوگی یا نہیں؟ ہم دونوں قائل ہیں کہ ملاکر دینی ہوگی۔ ہمارے درمیان یہ اختلاف بھی نہیں ہے کہ اگر کسی کے پاس سچے گوٹے لچکے کی شکل میں نصاب سے کم چاندی سونا ہے اور اس کے علاوہ الگ سے چاندی سونے کی کوئی اور مقدار موجود نہیں ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ ہم سب متفق ہیں کہ واجب نہ ہوگی۔ ہمارے درمیان یہ اختلاف بھی نہیں ہے کہ اگر کسی کے پاس سونے اور چاندی دونوں قسم کے زیور ہیں یا کچھ سونا اور کچھ چاندی موجود ہے اور دونوں میں سے کوئی بقدر نصاب نہیں ہے لیکن سونے اور چاندی دونوں کی قیمت لگائی جائے تو ایک نصاب پورا ہو جاتا ہے تو ایسی صورت میں اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ میں کہتا ہوں کہ امام ابوحنیفہؒ کے مذہب میں واجب ہوگی اور انہیں بھی اس سے اختلاف نہیں ہے ——— ہمارے اور ان کے درمیان نقطۂ اختلاف یہ ہے کہ اگر کسی خاتون کے پاس سونے کا کوئی زیور موجود ہے جو بقدر نصاب نہیں ہے اور کچھ چاندی گوٹے لچکے اور کامدانی کے تار کی شکل میں موجود ہے اور وہ بھی بقدر نصاب نہیں ہے لیکن سونے کی قیمت ملادینے

زکوٰۃ کا ایک جزئیہ

سے چاندی کا نصاب پورا ہو جاتا ہے تو اس صورت میں زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں ؟ میں کہتا ہوں کہ مذہب حنفی کی رو سے واجب ہوگی وہ کہتے ہیں کہ اس صورت میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی ۔ میں نے اپنے مضمون میں فقہ حنفی سے جو دلائل دیے ہیں ان کا اعادہ بے کار ہے ۔ مزید توضیح کے لیے یہاں "بہشتی زیور" سے دو مسئلے پیش کرتا ہوں ۔

مسئلہ ۸

کسی کے پاس نہ تو پوری مقدار سونے کی ہے نہ پوری مقدار چاندی کی، بلکہ تھوڑا سونا ہے اور تھوڑی چاندی تو اگر دونوں کی قیمت ملا کر ساڑھے باون تولہ چاندی کے برابر ہو جائے یا ساڑھے سات تولہ سونا کے برابر ہو جائے تو زکوٰۃ واجب ہے اور اگر دونوں چیزیں اتنی تھوڑی ہیں کہ دونوں کی قیمت نہ اتنی چاندی کے برابر ہے نہ اتنے سونے کے برابر تو زکوٰۃ واجب نہیں، اور اگر سونے اور چاندی دونوں کی پوری پوری مقدار ہے تو قیمت لگانے کی ضرورت نہیں ۔ (بہشتی زیور حصۂ سوم)

چاندی کو سونے کے ساتھ ملا کر زکوٰۃ دینے کی مزید توضیح مثال دے کر مسئلہ ۹ میں کی گئی ہے ۔

مسئلہ ۹

فرض کرو کہ کسی زمانے میں پچیس روپے کا ایک تولہ سونا ملتا ہے اور ایک روپیہ کی ڈیڑھ تولہ چاندی ملتی ہے اور کسی کے پاس دو تولہ سونا اور پانچ روپیہ ضرورت سے زائد ہیں اور سال بھر تک وہ رہ گئے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہے کیونکہ دو تولہ سونا پچاس روپیہ کا ہوا اور پچاس روپیے کی چاندی پچھتر تولہ ہوئی تو دو تولہ سونے کی چاندی اگر خریدو گی تو پچھتر تولہ لے گی اور پانچ روپیہ تمہارے پاس ہیں اس حساب سے اتنی مقدار سے بہت زیادہ مال ہو گیا جتنے پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے البتہ اگر فقط دو تولہ سونا ہوا اور اس کے ساتھ روپیہ اور چاندی کچھ نہ ہو تو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی ۔ (بہشتی زیور حصہ سوم)

اب صورت مسئلہ یہ بنتی ہے کہ اگر کسی عورت کے پاس دو تولہ سونا کے ساتھ پانچ تولہ چاندی زیور کی شکل میں موجود ہے یا ڈلے کی شکل میں موجود ہے یا کسی ظروف کی شکل میں موجود ہے یا روپیے کی شکل میں موجود ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہے لیکن اگر کہیں سچے گوٹے لچکے کی شکل میں موجود ہے تو مولانا عامر عثمانی کے نزدیک زکوٰۃ ساقط، اور لطف یہ ہے کہ فقہ حنفی ہی کی رو سے ساقط ۔ اگر اس عجیب و غریب فیصلے پر کسی کو اطمینان حاصل ہے تو ٹھیک ہے ۔ ہر شخص کو اپنے فہم کے مطابق رائے قائم کرنے کا اختیار ہے ۔

(۵) نقطۂ اختلاف کی وضاحت کے بعد امداد الفتاویٰ کی ان عبارتوں پر چند لفظ کہنا چاہتا ہوں جنھیں فاضل مدیر

نے پیش کیا ہے۔ افسوس کہ امداد الفتاویٰ مرکز کی لائبریری میں موجود نہیں ہے اور نہ کہیں سے مطالعہ کے لیے مل سکی۔
لیکن اس کی جتنی عبارتیں انھوں نے نقل کی ہیں ان سے تو بس اتنا معلوم ہوتا ہے کہ سکوں میں یا دوسری چیزوں میں چاندی یا سونا کم اور کھوٹ زیادہ ہو تو انہیں چاندی یا سونا کہا جائے گا اور نہ ان پر غالب چاندی یا سونے کے احکام عائد ہوں گے۔ یہ بات وہی ہے جو تمام فقہاء لکھتے ہیں وہ ایسے سکوں اور چیزوں کو نقدین سے خارج کر کے عروض میں داخل کرتے ہیں۔ ان عبارتوں سے یہ بات نہیں نکلتی کہ کھوٹے سکوں میں نصاب سے کم جو چاندی یا سونا ہو اس کو علیحدہ سونے چاندی سے ملا کر زکوٰۃ ادا کرنا واجب نہیں ہے۔ امداد الفتاویٰ میں جو عبارتیں ہیں کیا فاضل مدیر نے اس سے یہ بات اخذ کی ہے؟ اگر ایسا ہے تو یہ استنباط صحیح نہیں ہے۔
ہو سکتا ہے کہ اگر کھوٹے سکوں میں نصاب سے کم چاندی ہو اور الگ سے اس کے پاس ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔ امداد الفتاویٰ کی منقولہ عبارت نقدین کو ضم کرنے کے مسئلے سے بحث نہیں کرتی نقدین کو ایک دوسرے کے ساتھ ضم کرنے کا مسئلہ میں نے بہشتی زیور سے اوپر نقل کیا ہے۔ اس لیے فاضل مدیر کو امداد الفتاویٰ کی عبارت سے کوئی امداد نہیں ملتی۔ پھر یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آئی کہ اگر امداد الفتاویٰ کی عبارت مغلوب چاندی اور سونے کو کالعدم قرار دیتی ہے تو پھر آگے چل کر فاضل موصوف نے اس عبارت میں یہ شرط کہاں سے بڑھائی "بشرطیکہ مغلوب سونا بجائے خود حد نصاب کو پہنچا ہوا نہ ہو۔" کیا مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ علیہ نے امداد الفتاویٰ میں کسی جگہ اس شرط کا ذکر کیا ہے اگر کیا ہے تو موصوف کو پیش کرنا چاہیے تھا۔ یہ بات عجیب ہے کہ ایک طرف تو وہ مغلوب چاندی سونے کو کالعدم قرار دیتے ہیں اور دوسری طرف ایک شرط لگا کر اپنی بات خود رد کر دیتے ہیں۔ اگر بات مذہب حنفی کی ہو تو وہ کھوٹے سکوں کی نصاب سے کم چاندی سونے کو کالعدم قرار نہیں دیتا جیسا کہ آگے آرہا ہے۔

(۶) آخر میں فاضل مدیر نے "الفقہ علی المذاہب الاربعہ" کی ایک عبارت نقل کی ہے جس میں نصاب سے کم مغلوب چاندی سونے کو زیورات وغیرہ کے ساتھ ضم کر کے زکوٰۃ ادا کرنے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اس کتاب کے مصنف نے اپنی کتاب میں اس مسئلے کا ذکر نہیں کیا تو کیا اس کی وجہ سے یہ مسئلہ فقہ حنفی سے خارج ہو جائے گا؟ مغلوب چاندی سونے کا کیا ذکر فاضل مدیر جانتے ہوں گے کہ اس کتاب میں نقدین کو ایک دوسرے کے ساتھ ضم کر کے زکوٰۃ ادا کرنے کی کسی صورت کا ذکر نہیں۔ "مسئلہ ضم نقدین" سے یہ کتاب خالی ہے تو کیا اس کی وجہ سے یہ مسئلہ فقہ حنفی سے نکال باہر کیا جائے گا؟ فرض کیجیے کوئی شخص سوال کرتا ہے کہ اگر

کسی کے پاس دو تولے سونا اور دس تولے چاندی موجود ہے اور سونے کی قیمت ملا دینے سے چاندی کا نصاب پورا ہو جاتا ہے تو فقہ حنفی کی رو سے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ اس سوال کا کوئی صاحب "الفقہ علی المذاہب الاربعۃ" پڑھ کر جواب تحریر فرمائیں کہ فقہ حنفی کی رو سے اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی کیونکہ اس کتاب میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے تو کیا یہ جواب فاضل مدیر کے نزدیک صحیح ہوگا؟ فاضل مدیر نے اس کتاب کے عدم ذکر سے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ یہ ہے:-

"گھٹے ٹھپے میں پائی جانے والی چاندی کی کیفیت بالکل یہی ہے کہ وہ کھوٹ سے آمیز ہوتی ہے اور کھوٹ ہی غالب بھی ہوتا ہے تو حنفیہ کے اصول پر یہ چاندی، چاندی مانی ہی نہیں جائے گی جب تک کہ بجائے خود نصاب کو نہ پہنچے اسے زیور وغیرہ سے جوڑ کر نصاب کا حساب کرنا اگر حنفیہ کا مسلک ہوتا تو اس موقع پر کان الخالص فیہ اولم یبلغ خالصہ نصاباً جیسی تحدید کی بجائے وہ ضرور یہ اشارہ دیتے کہ قلیل سا مغلوب سونا چاندی اگر کسی اور زیور سے مل کر نصاب پورا کر دیتا ہے تب بھی زکوٰۃ واجب ہوگی لیکن انھوں نے اس کا اشارہ نہیں دیا حالانکہ یہ بات تو ان پر بھی منکشف تھی کہ چھوٹا موٹا زیور تو عموماً ہر گھر میں موجود ہوتا ہی ہے۔"

میں موصوف کی یہ عبارت پڑھ کر ششدر رہ گیا اور فقہ حنفی سے واقف ہر شخص حیران رہ جائے گا، اگر موصوف نے الفقہ علی المذاہب الاربعہ کے علاوہ دوسری کتابیں نہیں پڑھی تھیں تو کم سے کم فتح القدیر کی وہ عبارت ان کی نظر سے ضرور گزری ہوگی جو میں نے اپنے مضمون میں نقل کی تھی۔ وہ عبارت یہ ہے:-

فان کانت بحیث یتخلص منھا	تو اگر وہ کھوٹے سکے اس طرح ہوں کہ ان سے تنہا
فضۃ تبلغ نصاباً وحدھا او لا	چاندی الگ ہو سکتی ہے جو تنہا نصاب تک پہنچ جائے
تبلغ لکن عندہ ما یضم الیھا	یا وہ تنہا تو نصاب تک نہ پہنچے لیکن اس کے پاس ایسی
فیبلغ نصاباً وجب فیھا	چیز ہے جس کو ملا دینے سے وہ نصاب تک پہنچ جاتی
(ج ۱ مطبوعہ مصر ص ۵۲۳)	ہے تو اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔

اب دیکھ لیجیے کہ فقہائے احناف اشارہ ہی نہیں اس بات کی تصریح کر رہے ہیں کہ مغلوب چاندی کو زیورات وغیرہ کے ساتھ ملا دینے سے اگر نصاب پورا ہو جاتا ہے تو زکوٰۃ واجب ہے اور فاضل مدیر فرما رہے ہیں کہ فقہائے احناف نے اس کا اشارہ تک نہیں کیا ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ اس انکار کی کیا تاویل کی جائے۔

فتح القدیر کی عبارت بالکل کافی ہے لیکن میں یہاں ایک اور حوالہ دیتا ہوں۔ متن تنویر اور اس کی شرح درمختار میں ہے :۔

وما غلب غشه منهما يقوم كالعروض ويشترط فيه النية الا اذا كان يخلص فيه ما يبلغ نصابا او اقل وعنده ما يتم به او كانت اثمانا رائجة وبلغت نصابا من ادنى نقد تجب زكوته فتجب والا فلا۔	سکوں میں اگر کھوٹ زیادہ اور چاندی سونا کم ہو تو ان کی سامان تجارت کی طرح قیمت لگائی جائے گی اور وجوب زکوٰۃ کے لیے تجارت کی بھی شرط ہوگی الا یہ کہ ان سکوں سے سونا چاندی الگ ہو سکتی ہو یا نصاب سے کم۔ پاس ایسی چیز ہے جس سے نصاب پورا ہو یا وہ سکے بازار میں رائج ہوں اور کم سے کم نقد (سونا چاندی) اتنے جن میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، وہ سکے نصاب تک پہنچ جائیں تو ان سکوں میں زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں۔

عندہ ما یتم بہ کی شرح میں علامہ شامی نے لکھا ہے :۔

ای من عروض تجارۃ او احد النقدین۔	یعنی سامان تجارت یا سونا چاندی میں سے کوئی ایک موجود ہو۔

فتح القدیر، درمختار اور شامی کی عبارتیں بغیر کسی ابہام کے واضح کر رہی ہیں کہ اگر کسی کے پاس مغلوب چاندی سونا نصاب سے کم ہو لیکن اس کے پاس الگ سے اتنا سونا چاندی یا سامان تجارت موجود ہو جس کی قیمت ملا دینے سے نصاب پورا ہو جاتا ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور وہ مغلوب سونا چاندی کالعدم نہیں قرار پائے گا۔ ان عبارتوں کو پڑھ کر آپ فاضل مدیر تجلی کی وہ عبارت پڑھیے جو اوپر نقل کی گئی ہے۔ نیتوں کا حال تو خدا جانتا ہے لیکن حیرت ضرور ہوتی ہے۔

جہاں تک افہام و تفہیم کا تعلق ہے میرے نزدیک بات واضح ہو چکی اس لیے اب راقم الحروف اپنی طرف سے یہ بحث ختم کرتا ہے۔

زندگی بعدِ موت

علامہ ابن تیمیہ کے ایک مقالے کا ترجمہ

(مترجم: مولانا عبدالقدیر مونگیری)

سلفِ صالحین کی اصل بنیاد اور جمہور علماء کا استدلال یہ ہے کہ اجسام پر حوادث زمانہ مختلف انداز سے اثر ڈالتے ہیں، اطباء اور فلاسفہ کی بھی یہی تحقیق ہے۔ خود اجسام کی تخلیق پر نظر کرنے سے یہ چیز برابر مشاہدے میں آتی رہتی ہے کہ اللہ تعالےٰ ایک جسم کو بدل کر دوسرے جسم کی تشکیل کرتا ہے۔ یہی مسلک تمام فقہائے امت اور جمہور کا ہے۔ یہیں سے فقہاء میں اختلاف ہوجاتا ہے کہ کوئی نجاست اپنی پہلی صورت سے دوسری صورت اختیار کرنے کے بعد بھی پاک ہوسکتی ہے یا نہیں، مثلاً گوبر ایک نجاست ہے جو خشک ہوکر پھر آگ میں جل کر راکھ بن جاتا ہے، گدھا نمک کی کان میں گرکر نمک بن جاتا ہے۔

منی رحم مادر میں قرار پاکر خون منجمد اور گوشت کا لوتھڑا ہوجاتی ہے۔ یہی تغیر اور تصرف ایک پھل کے ساتھ ہوتا ہے جو اولاً ہوا اور پانی کے اتصال سے رطوبت کی صورت میں تھا اس کو اللہ تعالےٰ پھول اور پھر پھل کی شکل عطا کرتا ہے اور اس سے دانہ اور غلہ تیار کرتا ہے۔

خدا کی حکمت کی یہی رنگارنگی ہر چیز سے نمایاں ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کو دیکھو کہ اللہ تعالےٰ نے سڑی مٹی سے آپ کی تخلیق فرمائی پھر کیا ہوا کہ مٹی کی ہیئت ہی بدل کر رکھ دی۔ اب وہی مٹی گوشت پوست اور ہڈی بن جاتی ہے، اسی سے بدن کے اعضاء و جوارح بن جاتے ہیں۔ (آیت ۱۲ سورۂ مومنون)

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ
مِّن طِينٍ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ
مَّكِينٍ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا
الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا

اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصے سے پیدا کیا
پھر ہم نے اس کو محفوظ جگہ میں نطفہ بنایا پھر ہم نے نطفے
کو لوتھڑا بنایا پس لوتھڑے کو بوٹی بنایا پھر بوٹی سے
ہڈیاں بنائیں پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا پھر اس کو

فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا — دوسری صورت میں بنا دیا تو بابرکت ہے وہ اللہ
آخَرَ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ — جو بہترین خالق ہے پھر تم سب اس کے بعد مرنے والے ہو پھر تم
ثُمَّ إِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ — سب قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے۔

ایک ہرے بھرے درخت پر نگاہ ڈالو تو خدا کی حکمت کا جلوہ وہاں نظر آئے گا کہ کس خوبی سے ایک سرسبز و شاداب درخت سے ایک متضاد شے یعنی آگ کی چنگاری پیدا کر دیتا ہے۔ اس درخت سے نکلی ہوئی چنگاری کیا ہے ... درخت کا مادہ اور اس کا ایک جز ہی تو ہے، کیونکہ ایک ہرے بھرے درخت میں حقیقتاً آگ ... درخت کی شاخوں میں حقیقتاً پھل موجود نہیں ہوتا جس طرح جنین شکم مادر میں پہلے سے موجود نہیں ... کی کرشمہ سازی ہے کہ اس نے ایک مادے کو مختلف ادوار اور مدارج سے گزار کر ایک نئی ... سامنے لا کر رکھ دی، ورنہ ایک جنین اپنے دور اول میں شکم کے اندر بصورت جنین ہرگز نہ تھا بلکہ ایک سیال مادے کی صورت میں تھا، اسی طرح ایک پھل یا پھول درخت کے اندر پہلے پہل اپنی اصلی صورت میں کبھی بھی موجود نہ تھا، بلکہ ایک عرق تھا جو جسم شجر میں جاری و ساری تھا۔ ایک درخت سے نکلی ہوئی چنگاری خود اس درخت کا مادہ یا اس کی رطوبت ہی تو تھی جس کو اللہ کی حکمت نے آگ کی شکل دے دی۔ ٹھیک اسی طرح جب کہ انسان کا پورا جسم قبر کی مٹی میں سڑ گل جائے گا اور صرف اس کی ریڑھ کی جڑ باقی رہ جائے گی جس کو (عَجْبُ الذَّنَب) کہا جاتا ہے اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے ریڑھ کی جڑ کو باقی رکھے گا تاکہ اسی سے انسان کو دوبارہ پیدا کرے۔

كَمَا ثَبَتَ فِي الصَّحِيْحَيْنِ عَنِ النَّبِيِّ — جیسا کہ صحیحین میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت
صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ كُلُّ ابْنِ — ہے آپ نے فرمایا کہ ہر ایک ابن آدم سڑ گل جائے گا
آدَمَ يَبْلٰى إِلَّا عَجْبُ الذَّنَبِ مِنْهُ خُلِقَ — مگر اس کی ریڑھ کی جڑ باقی رہے گی کیونکہ اسی سے ابن آدم
ابْنُ آدَمَ وَمِنْهُ يُرَكَّبُ — کی تخلیق ہوئی اور اسی سے اس کی دوبارہ ترکیب ہوگی۔

انسان کا قبر سے دوبارہ جی اٹھنا نشاۃ ثانیہ میں نشاۃ اولیٰ کی طرح نہ ہوگا کیونکہ نشاۃ اولیٰ خراب و خستہ ہو کر فنا ہونے والی تھی، لیکن موت کے بعد جو نشاۃ ثانیہ ہوگی وہ پائیدار اور دائمی ہوگی۔ اہل جنت جو کھانے کھائیں گے اس کے فضلات ان کے جسم سے خارج نہیں ہوں گے جس طرح دنیا میں ہوتا ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے۔

كَمَا ثَبَتَ فِي الصَّحِيْحِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ — جیسا کہ حدیث صحیح میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے
وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ أَهْلُ الْجَنَّةِ لَا يَبُوْلُوْنَ وَلَا — ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا ہے کہ اہل جنت پاخانہ پیشاب

يَتَغَوَّطُوْنَ وَلَا يَبْصُقُوْنَ وَ لَا يَتَمَخَّطُوْنَ وَاِنَّمَا هُوَ رَشْحٌ كَرَشْحِ الْمِسْكِ

نہیں کریں گے نہ بلغم خارج کریں گے، نہ ناک چھنکیں گے بلکہ (جسم سے) ایک قسم کا پسینہ خارج ہوگا جو مشک کے عرق کی طرح ہوگا۔

وَفِي الصَّحِيْحَيْنِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ قَالَ يُحْشَرُ النَّاسُ حُفَاةً عُرَاةً غُرْلًا ثُمَّ قَرَأَ كَمَا بَدَأْنَا اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ وَعْدًا عَلَيْنَا اِنَّا كُنَّا فَاعِلِيْنَ

اور صحیحین میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ لوگ ننگے پاؤں ننگے بدن غیر مختون اٹھائے جائیں گے۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ كَمَا بَدَأْنَا الخ یعنی جس طرح سے ہم نے انسانوں کو پہلی دفعہ پیدا کیا اسی طرح پھر پیدا کریں گے، یہ ہمارے ذمہ ایک وعدہ ہے جسے ہمیں پورا کرنا ہے۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ اور مجاہدؒ نے فرمایا کہ تم لوگ ابتداءً بے حقیقت تھے تو اللہ تعالےٰ نے خلعتِ وجود بخشا اسی طرح پھر جب تم سب دوبارہ نیست و نابود ہو جاؤ گے تو وہ دوبارہ تم لوگوں کو خلعتِ وجود سے نوازے گا۔

مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ۝

اسی سے (مٹی سے) ہم نے تم لوگوں کو پیدا کیا اور اسی میں دوبارہ لوٹا دیں گے اور اسی سے دوبارہ تم لوگوں کو نکالیں گے۔

فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ ۝

زمین میں تم لوگ زندگی بسر کرتے ہو اور اسی میں مر کر جاتے ہو اور پھر اسی سے نکالے جاؤ گے۔

زمین میں تم لوگ زندگی بسر کرتے ہو اور اسی میں مر کر جاتے ہو اور پھر اسی سے نکالے جاؤ گے۔
اللہ تعالےٰ نے قرآن حکیم میں انسان کی نشاۃِ ثانیہ کو کئی مقام پر زمین کی نشاۃِ ثانیہ سے تشبیہ دی ہے۔ چند آیات کا ترجمہ ملاحظہ کیجیے۔

"وہی ہے جو اپنی رحمت (بارش) سے پہلے ہواؤں کو خوشخبری کے لیے بھیجتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ بھاری بھاری بادلوں کو اٹھاتی ہیں تو ہم ان کو ایک مردہ بستی کی طرف ہانک دیتے ہیں اور اس سے پانی برساتے ہیں اور اس سے طرح طرح کے پھل پیدا کرتے ہیں اسی طرح ہم مردوں کو نکالیں گے (یہ ہم اس لیے بیان کرتے ہیں) تاکہ تم لوگ نصیحت حاصل کرو۔ (الآیۃ)

اے لوگو! اگر تم سب کو (مرنے کے بعد) جی اٹھنے میں شک ہے (تو یاد رکھو) کہ ہم نے (پہلی دفعہ) تم لوگوں کو مٹی سے پیدا کیا پھر اس سے نطفہ بنایا اس سے لوتھڑا بنایا اور اس سے بوٹی بنائی بعض کی بناوٹ کامل ہوتی اور بعض کی ناقص تاکہ تم پر اپنی قدرت ظاہر کر دیں اور ہم جس کو چاہتے ہیں ایک مقرر مدت تک رحموں کے اندر ٹھہرائے رکھتے ہیں پھر تم لوگوں کو بچہ بنا کر نکال لیتے ہیں پھر تم جوانی کو پہنچتے ہو اور تم میں سے بعض مر جاتے ہیں اور تم میں سے بعض شیخ فانی ہو جاتے ہیں تاکہ (بہت کچھ) جاننے کے بعد بالکل لاعلم ہو جائیں ...
زمین کو (ایک وقت) میں دیکھتے ہو کہ وہ خشک پڑی ہے پھر جب ہم اس پر مینہ برسا...
اٹھتی ہے اور بڑھتی ہے اور قسم قسم کی حسین چیزیں اگاتی ہے (یہ ہم نے اس لیے بیان...
کہ اللہ حق ہے اور وہ مردوں کو زندہ کر سکتا ہے اور وہ بلا شبہ ہر چیز پر قادر

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہی اللہ ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے جو بادلوں کو ابھارتی ہیں پھر ہم اس کو مردہ شہر کی طرف لے جاتے ہیں اور اس سے مردہ زمین کو زندہ کر ڈالتے ہیں اسی طرح مردوں کو بھی جی اٹھنا ہے۔

حیات بعد موت، حیات قبل از موت کی طرح ہو گی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ الآیۃ

هُوَ الَّذِیْ یَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ - وہی ہے جو تخلیق کی ابتدا کرتا ہے اور پھر وہ اس کا اعادہ کرے گا

اس سے معلوم ہوا کہ حیات ثانوی حیات اولیٰ کی طرح ہو گی۔ الآیۃ

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّ رُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِیْدًا قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِیْدًا اَوْ خَلْقًا مِّمَّا یَكْبُرُ فِیْ صُدُوْرِكُمْ فَسَیَقُوْلُوْنَ مَنْ یُّعِیْدُنَا قُلِ الَّذِیْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَسَیُنْغِضُوْنَ اِلَیْكَ رُءُوْسَهُمْ وَ یَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ قُلْ عَسٰۤى اَنْ یَّكُوْنَ قَرِیْبًا یَوْمَ یَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِیْبُوْنَ

اور ان لوگوں نے کہا جب ہم مر کر بوسیدہ ہڈیاں اور چور چور ہو جائیں گے تو کیا از سر نو اٹھائے جائیں گے کہہ دو کہ (خواہ) تم پتھر ہو جاؤ یا لوہا یا کوئی اور سخت چیز بنجاؤ جو تمہارے دلوں میں اس سے بھی زیادہ سخت اور کٹھن معلوم ہو تو جھٹ کہہ دو گے کہ بھلا ہمیں دوبارہ کون اٹھائے گا کہہ دو کہ وہ جس نے پہلی بار تم لوگوں کو پیدا کیا تھا تعجب سے تمہارے سامنے سر ہلائیں گے اور پوچھیں گے کہ ایسا کب ہو گا کہہ دو امید ہے کہ عنقریب

بِحَمْدِهٖ وَتَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا ۝

ہوگا۔ جس دن وہ تم سب کو پکارے گا تو تم لوگ اس کی حمد کرتے ہوئے لبیک کہوگے اور تم لوگوں کو گمان ہوگا کہ تم سب دنیا میں بہت کم ٹھہرے

اَوَلَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ بَلٰى وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ۝

(یٰس - ۲۳)

کیا وہ ذات جس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ ان جیسے انسانوں کو پیدا کر ڈالے ہاں اللہ تعالےٰ بہت بڑا خالق ہے اور صاحب علم ہے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِيَ الْمَوْتٰى بَلٰٓى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

کیا ان لوگوں نے دیکھا نہیں کہ وہ خدا جس نے آسمانوں اور زمین کی تخلیق کی اور وہ ان کی تخلیق سے تھکا بھی نہیں، اس بات پر قادر ہے کہ مردوں کو زندہ کرے بلکہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ وَنُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى فَلَوْلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝

(واقعہ: ۲۷)

کیا تم لوگ (اتنی سی بات) نہیں سمجھتے کہ جو منی تم ٹپکاتے ہو اس کے (حقیقتاً) آیا تم خالق ہو، یا واقعی ہم اس کے خالق ہیں۔ بے شک ہم نے تم لوگوں کے مابین موت کی مدت مقرر کر رکھی ہے اور ہم اس بات سے عاجز نہیں ہیں کہ تمہارے جیسے زندوں کو تمہاری جگہ لا کھڑا کر دیں اور تم لوگوں کو اس طرح پیدا کریں جس کا تم لوگوں کو علم نہیں جب تم لوگوں نے پہلی پیدائش کو جان لیا تو پھر کیوں نہیں نصیحت حاصل کرتے۔ الآیۃ۔ واقعہ۔ ۲۷

یہ کہنا کہ تمہارے جیسے انسانوں کی تخلیق پر ہم قادر ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم تم لوگوں کو دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہیں۔ جیسا کہ آیت اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِيَ الْمَوْتٰى سے معلوم ہوتا ہے۔

قوم کا جھگڑا اس امر میں نہ تھا کہ اللہ تعالےٰ ان کے جیسے انسانوں کو ان کی جگہ پر لا سکتا ہے کیونکہ یہ تو برابر قانونِ قدرت کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے کہ ایک قوم کی جگہ دوسری قوم کو دنیا کے اسٹیج پر لاتا رہتا ہے بلکہ اللہ تعالےٰ نے اولاً ماں باپ سے انسان کی تخلیق فرمائی اور اس نشاۃ اولیٰ سے نشاۃ ثانیہ پر دلیل قائم کی اور فرمایا کہ جب تم لوگوں کو نشاۃ اولیٰ کی خبر ہوگئی تو نشاۃ ثانیہ کے بارے میں کیوں متردد ہو۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَۃَ الْاُوْلٰی فَلَوْلَا تَذَکَّرُوْنَ ہ

جب نشاۃ اولیٰ کو جان گئے (تو اسی سے نشاۃ ثانیہ) کو کیوں نہیں سمجھ لیتے۔

وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِیَ خَلْقَہٗ قَالَ مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَھِیَ رَمِیْمٌ قُلْ یُحْیِیْھَا الَّذِیْٓ اَنْشَاَھَآ اَوَّلَ مَرَّۃٍ ط وَھُوَ بِکُلِّ خَلْقٍ عَلِیْمٌ ہ

اس نے ہماری مثل بیان کو بھول گیا وہ کہتا ہے ہڈیوں میں جان ڈالے گا جبکہ وہ سڑ گل چکی۔ اس میں وہی دوبارہ جان ڈالے گا جس نے پہلی دفعہ اس میں جان ڈالی تھی اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

(یٰس - ۲۳)

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَۃٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَۃٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَۃٍ مُّخَلَّقَۃٍ وَّغَیْرِ مُخَلَّقَۃٍ لِّنُبَیِّنَ لَکُمْ۔

اے لوگو! اگر تم لوگوں کو دوبارہ اٹھنے میں شک ہو تو بلا شبہ ہم نے (اول اول) تم لوگوں کو مٹی سے پیدا کیا پھر نطفہ سے پھر لوتھڑے سے پھر بوٹی سے اس طرح کہ بعض کامل اور بعض ناقص رہ جاتی ہے تاکہ تمہارے سامنے (اپنی قدرت) ظاہر کردیں۔

اسی وجہ سے حسن بن فضیل بجلیؒ نے فرمایا کہ میرے نزدیک آیت عَلٰٓی اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَکُمْ وَنُنْشِئَکُمْ فِیْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے نشاۃ اولیٰ میں تم لوگوں کو عدم سے وجود بخشا، اس کا اجمالی علم تم لوگوں کو ہوگیا لیکن اس کی (تفصیلی خبر نہیں ہے) کہ کس طرح سے ہم نے عدم سے وجود میں لانے کا ارادہ کیا ہے اس کیفیت سے تم سب ناواقف ہو۔ نشاۃ ثانیہ نشاۃ اولیٰ سے کسی قدر ممتاز ہوگی۔ نشاۃ اولیٰ سے نشاۃ ثانیہ میں کسی قدر فرق ہے۔ اتنا تو سبھی جانتے اور مانتے ہیں کہ انسان نشاۃ اولیٰ میں اولاً نطفہ کی صورت میں تھا پھر بتدریج حکمت خداوندی سے لوتھڑا بنا اور لوتھڑے سے بوٹی اور بوٹی سے پوری شکل انسانی کے لباس

میں منتقل ہوا اور اس میں روح پھونکی گئی، پھر اس نطفہ پر غور کیا جائے تو وہ نطفہ مرد و عورت کی منی سے بنتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کو حیض کے خون سے غذا پہنچاتا ہے اور اس نطفے کی پرورش شکم مادر کی تین تاریکیوں میں ہوئی (۱) مشیمہ کی تاریکی، (۲) رحم کی تاریکی (۳) شکم کی تاریکی ان میں اللہ تعالیٰ اپنی حکمت سے پرورش کرتا ہے۔ ان تمام مدارج کے لحاظ سے نشاۃ ثانیہ نشاۃ اولیٰ سے ممتاز اور جدا شے ہے کیونکہ انسان نشاۃ اولیٰ کی طرح سے نشاۃ ثانیہ میں نہ تو بطن مادر میں رہے گا، نہ اس کی پرورش حیض کے خون سے ہوگی بلکہ انسان کو اس سے جداگانہ طور سے دوبارہ زندگی بخشی جائے گی۔

مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىٰ	ہم نے تم لوگوں کو زمین سے پیدا کیا اور اسی میں تم لوگوں کو لوٹائیں گے اور اسی سے دوبارہ تم سب کو نکالیں گے۔
وَفِيهَا تَحْيَوْنَ وَفِيهَا تَمُوتُونَ وَمِنْهَا تُخْرَجُونَ ○	اس میں تم لوگ زندگی بسر کرتے ہو اور اسی میں مرکر جاتے ہو اور اسی سے نکالے جاؤ گے۔
وَاللَّهُ أَنبَتَكُم مِّنَ الْأَرْضِ نَبَاتًا ثُمَّ يُعِيدُكُمْ فِيهَا وَيُخْرِجُكُمْ إِخْرَاجًا ○	اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کو زمین سے پیدا کیا پھر اسی میں تم لوگوں کو دوبارہ لوٹا دیتا ہے اور اسی سے نکال باہر کرے گا۔

حدیث میں مذکور ہے کہ بلاشبہ لوگ قبروں سے اس طرح نکلیں گے جس طرح (بارش کے بعد) زمین سے پودے نکلتے ہیں۔ اسی کی طرف حقیقتاً اللہ تعالیٰ کا اشارہ آیات كَذَٰلِكَ النُّشُورُ، كَذَٰلِكَ الْخُرُوجُ، كَذَٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ وغیرہ میں ہوتا ہے۔

معلوم ہوا کہ یہ دونوں نشاتیں ایک ہی جنس کی دو شاخیں ہیں جو ایک جہت سے یکساں اور متماثل بھی ہیں اور دوسری جہت سے دیکھو تو متمایز اور متغایر بھی ہیں اسی لیے اللہ تعالیٰ نے معاد کو عین مبدا بھی قرار دیا ہے اور ایک کو دوسرے کے مثل بھی بتایا۔ اور آیت ثُمَّ يُعِيدُكُمْ فِيهَا سے یہی مترشح ہوتا ہے کیونکہ عربی زبان میں کسی چیز کے اعادہ سے یہی مفہوم ہوتا ہے کہ اعادہ مبدا ہی کی طرح ہوگا خواہ وہ اعادہ جسمانی ہو یا عرضی۔ مثلاً نماز کا اعادہ ہے جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر ایک شخص کے پاس سے ہوا جو صف کے پیچھے تنہا نماز پڑھ رہا تھا تو آپ نے اس سے فرمایا کہ تم نماز کا اعادہ کرو۔ یہ جسمانی اعادے کی مثال ہوئی اور عرضی اعادہ یہ ہے کہ تم کسی سے کہو کہ اپنے

کلام کا تم اعادہ کر دیا تم یہ کہو کہ فلاں نے فلاں کے کلام کا اعادہ کیا یا فلاں سبق کا اعادہ کر رہا ہے ان صورتوں
میں کلام ایک ہی ہے اگرچہ ہر ایک کی آواز اور انداز بیان جدا جدا ہے۔ پس آیت مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا
نُعِيْدُكُمْ میں جس اعادے کی خبر دی گئی ہے وہ یہی اعادہ ہے جس کو مشرکین اور مسلمانوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ
وسلم سے سمجھا اور جس پر لفظ اعادہ خود دلالت کرتا ہے۔ یعنی معاد بعینہٖ مبدء ہے اگرچہ ہر ایک کے لوازم اور کیفیات
مختلف ہیں لیکن لوازم اور کیفیات کے عارضی اختلاف سے اس میں کوئی فرق نہیں آتا کہ معاد حقیقتاً مبدء ہی کا
نقش ثانی ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا جب کہ وہ کچھ بھی نہ تھا اسی طرح وہ دوبارہ
پرائے گا جب کہ وہ کچھ بھی باقی نہ رہے گا اور فنا ہو کر نیست و نابود ہو جائے گا۔ جسم کے اجزا
جہاں منتقل ہو کر گئے تھے وہاں سے واپس کیے جائیں گے اس طرح ایک ایک قبر میں ہزار ہزار مر
میں تبدیل ہو چکے ہوں گے تو اس کا اعادہ ہوگا یعنی از سر نو پھر عدم سے وجود میں لائے جائیں گے جس طرح یہ
ملکِ عدم میں تھے، لیکن تخلیقِ اول کی طرح نشاۃ ثانیہ میں تدریج کی چنداں ضرورت ہوگی کہ پہلے اللہ تعالیٰ نطفہ
بنائے اور نطفہ سے علقہ اور علقہ سے بوٹی اور بوٹی سے شکل انسانی اور پھر اس کی غذا کے لیے ماکولات و مشروبات
کا سلسلہ جاری کرے جیسا کہ دنیا میں نشاۃ اولیٰ سے لیکر موت تک انتظام کیا گیا تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ نشاۃ ثانیہ میں
بدن انسانی کو دوسری صفت پر بنائے گا جو نشاۃ اولیٰ میں نہ تھی جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔ وَنُنْشِئَكُمْ
فِيْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ٥ کہ ہم تم لوگوں کو نشاۃ ثانیہ میں اس انداز سے پیدا کریں گے جس کو تم لوگ نہیں جانتے ہو۔
لیکن مٹی میں تحلیل شدہ جسم کے اعضا نشاۃ ثانیہ میں بعینہٖ وہی ہوں گے جو نشاۃ اولیٰ میں تھے کیونکہ شے کے اعادے سے
یہ لازم نہیں آتا کہ اس کی حقیقت بھی بدل جائے اس لیے کہ سب جانتے اور مانتے ہیں کہ تم نے مثلاً خالد کو کبھی بچپن میں
دیکھا تھا پھر جوانی کی حالت میں اس سے ملاقات کی پھر بڑھاپے میں تم نے اس کو دیکھا۔ خالد پر یہ تین دور آئے اور
خالد کی یہ تینوں حالتیں جداگانہ شان رکھتی ہیں، مگر بایں ہمہ خالد کی حقیقت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اب اگر کوئی یہ دعویٰ
کرے کہ نشاۃ ثانیہ کا جسد خاکی بعینہٖ نشاۃ اولیٰ کا جسد خاکی نہیں ہو سکتا بلکہ حقیقت کے اعتبار سے دونوں جسد
مختلف ہیں اور چونکہ نشاۃ ثانیہ کا مقصود یہ ہے کہ نفس انسانی کو اچھے اور برے اعمال کی جزاء اور سزا دی جائے لہذا
نشاۃ ثانیہ کے دوسرے جسد کو جزا و سزا دینے سے یہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے خواہ کوئی بھی بدن ہو تو اس کا یہ خیال
باطل ہے۔ کتاب و سنت اور اجماع امت کے خلاف ہے سلفِ صالحین کے بھی مخالف ہے اور خود لفظ اعادہ
اس خیال کی تردید کرتا ہے۔ کیونکہ عقلاء یہی کہتے ہیں کہ یہ جوان گھوڑا حقیقتاً وہی ہے جو کبھی بچہ تھا اور جسیم درخت

وہی ہے جو کسی زمانے میں ننھے پودے کی شکل میں تھا، گھوڑے کے جوان ہونے اور درخت کے تناور ہونے سے اس کی حقیقت میں کوئی فرق نہیں ہوتا، جو کچھ بھی ان دونوں میں تبدیلی ہوئی ہے وہ ظاہری اور خارجی ہے۔ عقلاء کے علم و تحقیق میں یہ امر آچکا ہے کہ پودے کے اندر کوئی نفس ناطقہ نہیں ہے جو پودے سے علیحدہ ہو، ممتاز ہو اور بالکل یہی تحقیق حیوان و انسان کے متعلق بھی ہے کیونکہ حیوان اور انسان کے بارے میں بھی یہ وہم و گمان نہیں ہوتا کہ بچپن کا حیوان یا انسان جوانی کے حدود میں آکر حقیقت نفس الامری کے اعتبار سے مختلف اور متغائر ہو جاتا ہے اس سے یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ جسم کے اندر تغیرات اور انقلابات سے حقیقت بدنی میں کوئی فرق نہیں آتا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ زندگی بعد موت میں نشاۃ ثانیہ کا بدن حقیقتاً وہی بدن ہوگا جو نشاۃ اولیٰ میں تھا، رہ گیا وجہ ہے کہ بعث بعد الموت کا جسد خود انسان کے خلاف خدا کی عدالت میں احتجاج کرے گا۔

اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓی اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَیْدِیْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ۝

آج ہم ان کے منہ پر مہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے بات کریں گے ان کے پاؤں اس کی گواہی دیں گے جو وہ کرتے تھے۔

حَتّٰٓی اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ
عَلَیْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ
وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ۝
وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ
عَلَیْنَا قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِیْٓ
اَنْطَقَ كُلَّ شَیْءٍ۔

یہاں تک کہ جب قیامت میں آئیں گے تو ان کے
خلاف ان کے کان اُن کی آنکھیں ان کی کھالیں ان
کی گواہی دیں گے جو وہ کیا کرتے تھے اور وہ اپنی
کھالوں سے کہیں گے تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی
دی تو وہ کہیں گی کہ ہمیں اس اللہ نے قوت گویائی دی
جس نے ہر چیز کو گویا کر دیا۔

اسی طرح اگر کوئی شخص کسی کو کوئی کام کرتے دیکھے یا کوئی بات کہتے سنے پھر تیس سال بعد اس کے خلاف اسی کے قول و عمل سے شہادت پیش کرے تو یہ شہادت مشہود علیہ کے خلاف یقیناً مسموع اور مقبول ہوگی اگرچہ اس کے مشاہدے اور شہادت کے درمیان ایک مدت طویل حائل ہے اور اتنے دنوں میں مشہود علیہ کی عمر، صحت اور بدن میں بہت کچھ تغیرات رونما ہو گئے ہوں گے لیکن ان تغیرات اور انقلاب سے نفس شہادت میں کوئی سقم اور خرابی نہیں آئے گی اور اس صورت حال میں کوئی بھی قائل یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ شہادت ذات مشہود علیہ کے خلاف نہیں ہوئی بلکہ ذات مشہود علیہ کے مثل یا اس کے غیر پر ہوئی۔

خالد یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس حیوان کو میں نے قاسم سے لیا ہے اور اس درخت کو عاقل نے عابد کو دے دیا ہے

تو اس کا یہ دعویٰ معقول اور مقبول ہوگا اگرچہ حیوان و درخت میں درازی مدت سے بہت تغیرات اور اضافے ہو چکے ہوں اور جب ان تغیرات سے نفس دعوی پر کوئی اثر نہیں ہوتا تو اگر حیات بعد موت کے بارے میں کوئی یہ کہے کہ نشأۃ ثانیہ میں حقیقتاً نشأۃ اولیٰ کا بدن نہیں ہے بلکہ اس کے مثل ہے تو اس کا یہ خیال جہالت پر مبنی ہوگا اس لیے کہ نشأۃ ثانیہ کے بدن کی صفت نشأۃ اولیٰ کے بدن سے ایسی مماثل نہیں ہوگی کہ کوئی یہ تمیز کر ڈالے کہ یہ بدن نشأۃ اولے کے بدن سے مختلف ہے کیونکہ وہاں حقیقتاً کوئی تبدیلی خواہ کمی یا زیادتی قوت وضعف کے اعتبار سے ہوگی ہی نہیں۔

یہ اہل جنت جنت میں پیشاب و پاخانہ سے مبرا ہوں گے اور نہ تھوکیں گے نہ ناک جھاڑیں۔

متضاد اور مخالف خلطوں سے مل کر منصۂ شہود پر نہیں آئی ہو کہ ایک نشأۃ کو دوسرے کے خلا

یہ بھی لازم نہیں آتا کہ اہل جنت کے ماکولات ومشروبات مٹی ہوا پانی سے بنے ہوں گے جیسا کہ د

وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان بزرگ[1] کے کھانے اور پانی کو ایک سو سال تک صحیح وسالم رکھا جو بزر

سے گذرے تھے۔ اس سے معلوم ہوا فنا اور فساد قبول کرنے والے عالم میں انگور اور کھجور جیسی چیز ایک سو سال رہکر بھی بے مزہ اور متغیر جب نہیں ہو سکتی تو اللہ تعالے بطریق اولیٰ اس بات پر قادر ہے کہ نشأۃ ثانیہ میں بھی کھانے اور پانی کو بے مزہ اور متغیر نہ ہونے دے۔

---

[1] مصنف علیہ الرحمۃ کا اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے جو سورۂ بقرہ تیسرے پارے میں مذکور ہے۔ ذیل میں ترجمہ درج کیا جارہا ہے تاکہ قارئین کو سمجھنے میں پوری سہولت ہوجائے۔ مترجم

یا اس شخص کی طرح جو ایک بستی پر گذرا جو اپنی ٹٹی سمیت گری پڑی تھی تو انھوں نے کہا کہ اس کو اللہ کس طرح دوبارہ زندہ کریگا پس اللہ تعالیٰ نے اس پر ایک سو سال تک موت طاری کردیا پھر اس کو زندہ کیا۔ پوچھا کتنے عرصے تک (مُردہ) رہے تو انھوں نے جواب دیا کہ ایک دن یا آدھا دن۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تو (۱۰۰) سو سال تک مردہ پڑا رہا اب تم اپنے کھانے اور پانی کو دیکھو کہ وہ سڑا نہیں ہے اور اپنے گدھے کو دیکھو (اور ہم نے ایسا اس لیے کیا ہے تاکہ لوگوں کے لیے ایک نشانی حیات بعد موت پر ہو) ہڈیوں کو دیکھو کہ کس طرح ہم اس کو جوڑ دیتے ہیں اور پھر اس پر گوشت چڑھا دیتے ہیں جب اس کو (ہماری قدرت) کا مشاہدہ ہوگیا تو وہ کہہ اٹھا کہ میں جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔
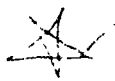
عدمِ تشدد کا عقیدہ، عمل کی کسوٹی پر

(مولانا صدرالدین اصلاحی)

چند مہینوں سے ہندوستان کی شمالی سرحدوں پر جو تلخ واقعات پیش آتے رہے ہیں انھوں نے یہاں کے اصحابِ فکر کو اپنی طرف بڑی شدت سے متوجہ کیا ہے۔ کیونکہ یہ واقعات صرف تلخ ہی نہیں، بلکہ فکر انگیز بھی ہیں۔ انھوں نے متعدد ایسی حقیقتوں کو اجاگر کر کے نظروں کے سامنے رکھ دیا ہے جن کے وجود پر عام طور سے یقین نہیں کیا جا رہا تھا۔ یہ پُرامن بقائے باہم کا نعرہ، یہ پنچ شیل کا غلغلہ، یہ چینی ہندی بھائی بھائی کا نغمہ، یہ روس کی ہند نوازی، یہ کمیونزم کی اصول پسندی — کتنی دھوم تھی ان خوش نما باتوں کی! مگر لداخ اور نیفا کے علاقوں میں چین نے جس دراز دستی کا مظاہرہ کیا ہے اس نے ان ہی سے کتنے ہی تصورات کا طلسم توڑ کر رکھ دیا ہے، اور آج ہم اپنے کو اس بات پر مجبور پا رہے ہیں کہ اپنی اب تک کی خوش فہمیوں پر خود حیرت کریں۔ مگر معلوم نہیں ہماری نظر موجودہ واقعات کے اس فیصلے پر اور اس عملی تجربے پر بھی گئی یا نہیں جس کا تعلق نہ کسی چین سے ہے، نہ کسی روس سے، اور نہ کسی اور کے طرزِ فکر و طریقِ عمل سے۔ بلکہ اس کا تعلق تمام تر خود ہمارے اپنے ملک کے ایک بڑے بنیادی اصول اور عقیدے سے ہے، جس کو "عدمِ تشدد" کہتے ہیں اور جسے ہندوستانی طرزِ حیات کی ایک بڑی اہم اور ممتاز اساس ہونے کا فخر حاصل ہے۔ عدمِ تشدد کے فلسفے کا مطلب یہ ہے کہ کسی حال میں بھی تشدد کی راہ نہ اختیار کی جائے، کسی مسئلے کے حل کے لیے بھی تلوار نہ اٹھائی جائے، کسی برائی کے ازالے کے لیے بھی طاقت نہ استعمال کی جائے۔ 'عدمِ تشدد' کے لفظ نے قدرتی طور پر آپ کا ذہن گاندھی جی کی شخصیت کی طرف پھیر دیا ہوگا۔ کیونکہ نئے ہندوستان کے لیے یہ لفظ یا عقیدہ دراصل انہی کا عطیہ ہے، اسی لیے اب یہ انہی کی ایک مخصوص یادگار بھی بن چکا ہے۔ ہندوستان نے جس دن سے گاندھی جی کو جانا سچائی اور عدمِ تشدد کے علمبردار کی حیثیت سے جانا۔ آج وہ اسی لیے ایک مستقل طرزِ فکر اور فلسفۂ حیات کے داعی مانے جاتے ہیں، اور اسی بنا پر دنیا کے بے شمار 'ازموں' میں ایک اور 'ازم' 'گاندھی ازم' کا اضافہ بھی ہو چکا ہے۔ یہ حقیقت کسی اظہار و بیان کی محتاج نہیں کہ انھوں نے اپنی زندگی کا مشن انہی دونوں اصولوں کی ترویج کو قرار دے لیا تھا۔ وہ اپنے ملک

میں انسانی زندگی کی تعمیر انہی دو بنیادوں پر کرنا چاہتے تھے، اور اسی کے لیے عمر بھر کوشاں رہے۔ انھوں نے برٹش گورنمنٹ کے خلاف آزادی کی جو جنگ لڑی اس کے اصل ہتھیار بھی یہی دو اصول تھے جسے انھوں نے پالیسی کے طور پر نہیں بلکہ عقیدے کے طور پر اپنا رکھا تھا۔ چنانچہ جب کبھی ایسا ہوا کہ آزادی کے پُرجوش اور گرم مزاج سپاہیوں نے تشدد کی طرف ہاتھ بڑھایا، انھوں نے اس کی شدت سے مخالفت کی۔ کچھ بعید نہیں اگر وہ یہ بھی کہتے رہے ہوں کہ اگر مجھے آزادی اور عدم تشدد میں سے ایک کا انتخاب کرنا پڑے تو میں عدم تشدد ہی کو ترجیح دوں گا۔ ان کے اس عقیدے کا [illegible] یہ تھا کہ جب ۱۹۴۰ء میں ہٹلر کے ہوائی جہاز لندن پر بموں کی بارش کر رہے تھے اور اس کی فوج [illegible] کرنے کی فکر میں سوچ رہی تھیں، اس وقت برطانیہ کو بھی انھوں نے یہی مشورہ دیا تھا کہ وہ جرمن حملے [illegible] اور بموں سے نہیں بلکہ اہنسا کے ذریعہ کیے۔

اس ملک کی عظیم اکثریت گاندھی جی کو اپنا عظیم ترین رہنما تسلیم کرتی ہے۔ اس کے دل و دماغ ان [illegible] کے احساس اور عقیدت کے جذبات سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان میں کتنے ہی ایسے ہیں جنھوں نے ان کی خدمت اور معیت میں رہ کر باقاعدہ تربیت حاصل کی ہے، اور اب ان کے طرز فکر و عمل کے باضابطہ پیرو بن کر ان کے مشن کو اپنی زندگی کا مشن قرار دے رکھا ہے۔ ان میں سیاسی اور غیر سیاسی ہر طرح کی بڑی بڑی شخصیتیں شامل ہیں، اور وہ اس وقت ہندوستان کے آفتاب و ماہتاب شمار کیے جاتے ہیں۔ گاندھی جی کے اٹھ جانے کے بعد قدرتی طور پر اب یہی لوگ ان کی جانشینی کا فرض انجام دے رہے ہیں، اور آئے دن دنیا کو تلقین کرتے رہتے ہیں کہ وہ تشدد کو کلیۃً ترک کر دے اور لغت کے صفحات سے جنگ کا لفظ نکال دے۔ یہ تلقین انھوں نے جس طرح دوسروں کو کی ہے بجا طور پر خود اپنے ملک کو بھی کی ہے۔ چنانچہ سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد کے ان الفاظ سے فضا ابھی گونج ہی رہی ہے جن میں انھوں نے ابھی تھوڑے ہی دنوں پیشتر یہ فرمایا تھا کہ ہندوستان کو اس معاملہ میں پہل کرنی چاہیے اور دوسرے ملکوں کا انتظار کیے بغیر اپنے کو بالکل غیر مسلح بنا لینا چاہیے۔ ہر کہنے والا یقیناً یہی کہے گا کہ یہ بڑا ہی جرأت مندانہ مشورہ تھا جو انھوں نے اپنی قوم کو دیا تھا، اور اس کی عظمت کے آگے پوری انسانی تاریخ کو سر جھکا لینا چاہیے۔۔۔ لیکن ذرا تھم کر سوچا جائے اور صداقت آشنا موں میں دیا جائے والا یہ پیغام کیا واقعی ایک عملی پیغام ہے؟ کیا انسانی فطرت کی مسلمہ حقیقتیں اسے ایک عملی فلسفہ ثابت کر سکتی ہیں؟ کیا ہزاروں برس کی طویل انسانی تاریخ میں اس تصور کی کارفرمائیوں کا کوئی سراغ مل سکتا ہے؟ شاید نہیں، بلکہ یقیناً نہیں۔ تو کیا آئندہ اس کی توقع کی جا سکتی ہے؟ اس سوال کا جواب حاصل ہو سکنے کا اس وقت ایک فطری موقع پیدا ہو گیا ہے۔ یہ موقع چین کی جارحیت اور حملے نے پیدا کر دیا ہے۔ اس وقت

ملک میں گاندھی جی کے متعدد شاگرد اور ان کے مشن کے علم بردار موجود ہیں۔ قدرتی طور پر جہاں دوسرے اکابرین ملک نے ملک کے تحفظ کے سلسلے میں اپنی رائیں دی ہیں ان حضرات نے بھی دی ہیں۔ واضح بات ہے کہ ان کے ارشادات کی اس عملی ضرورت کے موقع پر بڑی زبردست اہمیت ہے۔ کیونکہ ان کی حیثیت صرف ملکی تحفظ کے سلسلے میں رائے اور مشورے ہی کی نہیں ہے، بلکہ خود عقیدۂ عدم تشدد کے بارے میں ایک اہم فیصلے کی بھی ہے۔ اس لیے ان کے ان ارشادات کو غور سے سننا چاہیے۔

مسٹر جے پرکاش نرائن نے ۲۵ نومبر کو آل انڈیا سروودے سمیلن کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ:۔

"یہ (یعنی چین کا اعلان جنگ بندی) ہند چین، سرحدی تنازعے کا کوئی حل نہیں ہے کسی ملک کے وقار کی قیمت پر جنگ بندی سے مسائل حل نہیں ہوتے، بلکہ مشکلات میں اضافہ ہوجاتا ہے اور مسئلے کا کوئی مستقل حل نہیں تلاش کیا جاسکتا ...... بڑی خوشی کی بات ہے کہ لوگ بڑے جوش و خروش کے ساتھ قومی دفاعی فنڈ میں چندہ دے رہے ہیں۔ ملک کے دفاع کے لیے امیر غریب سب کو مساوی طور پر قربانی کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

اچاریہ ونوبا بھاوے جی نے ۲۵ اکتوبر کو راج محل گھاٹ میں ایک مجمع کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ:۔

"وقت کا تقاضا ہے کہ دلوں میں اعتماد پیدا ہو اور غیر ملکی حملہ آوروں سے دفاع کے لیے جس سامان کی ضرورت ہے اس کی پیداوار بڑھائی جائے۔"

۲۵ ہی اکتوبر کو ڈاکٹر راجندر پرشاد نے بھی چینی جارحیت کے سلسلے میں ہمیں کچھ نصیحتیں کی ہیں۔ پٹنہ میں دس لاکھ کے بھاری مجمع میں آپ نے قوم سے اپیل کی ہے کہ:

"ہندستان کی روایتی عدم تشدد کی پالیسی اور چینی حملہ کو طاقت کے ذریعے روکنے میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ ہر شخص اس کے لیے آزاد ہے کہ وہ اپنے عقیدے کے مطابق طاقت کا مقابلہ طاقت یا اہنسا سے کرے۔ ...... ہمیں اپنے جوانوں پر بھروسہ رکھنا چاہیے جو دنیا میں بہترین سپاہی مانے گئے ہیں۔ ہم چور کو یہ موقع نہ دیں گے کہ وہ کوتوال کو ڈانٹے۔ اگر کسی وجہ سے کوئی چینی حملہ آور ہمارے ملک میں داخل ہونے میں کامیاب ہوجائے تو ہر مرد اور عورت کا فرض ہے کہ وہ اس بات کو دیکھے کہ وہ ایک بوند پانی کا اور ایک نوالہ روٹی کا نہ پائے، اور جب وہ تڑپ تڑپ کر بھوکوں مرجائے تو اسے یہاں دفن ہونے کے لیے ایک انچ زمین نہ ملے ...... ابھی حکومت نے نوجوانوں کو بھرتی کے لیے نہیں کہا ہے، لیکن جب وہ وقت آئے تو ہر نوجوان

کا فرض ہے کہ وہ عہدہ کا لالچ کیے بغیر فوج میں بھرتی ہو جائے "

یہ اکابر جن کی تقریروں کے اقتباسات ابھی آپ کے سامنے پیش کیے گئے ہیں، فلسفۂ عدم تشدد کے اساطین ہیں۔ اس لیے ان کے ارشادات سن لینے کے بعد اب کسی اور کے خیالات کا جائزہ لینے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ ان ارشادات نے عدم تشدد کے عقیدے کو ایک خالص تصوراتی اور قطعی غیر عملی نظریہ ہونے کا جو فیصلہ دیا ہے وہ کسی بحث و تمحیص کا بالکل محتاج نہیں۔ گویا یہ نظریہ یا عقیدہ لفظوں کی حد تک جتنا ہی جاذب نظر اور مرعوب کن ہے عملی واقعیت کے اعتبار سے اتنا ہی خیالی اور ناقابل عمل ہے۔

اس موقع پر ہمارا ذہن آپ سے آپ اس دین فطرت کی تعلیمات کو یاد کرنے لگتا ہے جس نے ظلم و زیادتی کے جواب میں صبر و تحمل اختیار کرنے کی، اور 'سیئہ' کو 'حسنہ' سے دفع کرنے کی ہدایت کے ساتھ بڑھتے ہوئے شر اور ظلم کے خلاف طاقت استعمال کرنے کی بھی تلقین فرما رکھی ہے۔ جس نے کہا ہے کہ جنگ و جدل اور قتال اگرچہ فی نفسہ بری شے ہے، مگر فتنہ و فساد اور ظلم و بربریت اس سے بھی زیادہ بری چیز ہے۔ اس لیے اگر ضروری افہام و تفہیم سے اس کا سد باب نہ ہو سکتا ہو تو ضروری ہے کہ جنگ اور تشدد کی برائی کو گوارا کر لیا جائے، اور اس بڑی برائی کو مٹا دینے کے لیے اس چھوٹی برائی کو لازماً اختیار کر لیا جائے۔ ایسی حالت میں یہ برائی برائی نہیں رہ جاتی بلکہ بہت بڑی نیکی بن جاتی ہے، انسانیت کا احترام اور حق کا تحفظ قرار پا جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدائی ہدایت اور انسانی افکار میں جو سب سے بنیادی فرق ہوتا ہے، وہ یہی اعتدال اور بے اعتدالی کا، واقعیت پسندی اور حقائق فراموشی ہی کا ہوتا ہے۔ بسا اوقات بعض انسانی افکار و نظریات بڑے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں، لیکن ضرورت پڑنے پر اور امتحان کے وقت، ان کی خوبصورتی کاغذ کے رنگین پھولوں کی خوبصورتی سے زیادہ نہیں ثابت ہوتی۔

تنقید و تبصرہ

کلید باب KEY TO THE DOOR

(انگریزی) ـــــ از کیپٹن طارق سفینہ پیٹرس ـ صفحات ۱۵۸ ـ بڑا کتابی سائز ـ شائع کردہ انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک کلچر ـ کلب روڈ ـ لاہور ـ قیمت :ـ سات روپیہ پچاس نئے پیسے

کتاب کے مصنف کیپٹن ٹی ـ ایس ـ پیٹرس انگلستان کے وکٹورین عہد کے آخری زمانے کے ایک مشہور مسیحی تھے اس کتاب میں انھوں نے بتایا ہے کہ کس طرح زندگی کے مختلف مرحلوں میں وہ "دینِ حق" اسلام کی طرف کھنچتے چلے گئے اور آخر کار مسلمان ہونے کے بعد "ٹی ـ ایس پیٹرس" طارق سفینہ پیٹرس میں تبدیل ہو گئے ـ

موصوف کی پرورش خالص کلیسائی ماحول میں ہوئی ـــ اس ماحول کی اخلاقی خرابیوں اور مذہبی بگاڑ کو دیکھ دیکھ کر مذہب و اخلاق کے متعلق نت نئے سوالات ان کے ذہن کے گوشوں سے ابھرنے شروع ہوئے جن میں سے ایک مسئلہ کلیسا ـــ خدا کے گھر میں طبقاتی امتیاز کا مسئلہ تھا ـ انھوں نے کوشش کی کہ ان سوالات کو اپنے یہاں کے پادری سے حل کریں لیکن سوالات کا تشفی بخش جواب نہ ملا ـ اس لیے ان کی خلش تیز ہوئی اور مسئلہ کی گرفت نے ان کے پورے وجود کو جکڑ لیا ـ اپنے مختلف بحری اسفار کے دوران میں انھوں نے مختلف ممالک کے مختلف انسانوں اور مختلف مذاہب کا مطالعہ کیا اور ان سوالات کو حل کرنے کی کوشش دوسرے مذاہب کی روشنی میں کی ـ عیسائیت کے مختلف فرقوں سے گفتگو کی ـــ غیر مسیحی فرقوں سے تبادلہ خیال کیا ـ دہریت اور لامذہبیت کے نمائندوں سے بحث کی ـ لیکن جب کہیں سے زندگی کے ان عمیق سوالات کا جواب نہ ملا تو ان کا ذہن "عقیدۂ لاادریت" کی سمت میں پسپا ہونے لگا ـ

ایک تاریخی واقعہ کے طور پر ان کی ملاقات ایک چینی مسلمان سے ہوئی جس نے موصوف پر اپنے نظریات کا سکہ بٹھانے کی کسی بھی کوشش کے بجائے صرف یہ کیا کہ قرآن پاک کا انگریزی ترجمہ مطالعہ کے لیے پیش کر دیا ـ اسلام کے اس براہِ راست مطالعہ نے ان کی بصیرت پر لٹکے ہوئے سارے پردے ایک ایک کرکے اٹھا دیے اور وہ آخر کار اسلام قبول کرنے پر

مجبور ہو گئے۔ روحانیت کی دنیا کا یہ بے چین زائر قرآن و حدیث کے اس اعلان کا زندہ ثبوت تھا کہ ہر انسان کو خدا دینِ حق پر ہی پیدا کرتا ہے ـــ کوئی باطل عقیدہ اس حق پسند فطرت کو اپنا نہ سکا اور اسلام کی یہ بھٹکی ہوئی روح اپنی حقیقی منزل جستجو کو پاکر ہی سکون کا سانس لے سکی۔

کتاب کے شروع میں سپریم کورٹ پاکستان کے جج ڈاکٹر جسٹس ایس اے رحمٰن کا پیش لفظ ہے۔ اس میں ڈاکٹر جسٹس رحمٰن نے کیپٹن طارق سفین کے اس روحانی انقلاب کے متعلق اہم اشارے کیے ہیں۔ اس کے بعد خود مصنف کے قلم سے دیباچہ ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ انھوں نے اس کتاب میں اپنی پوری زندگی کی جھلکیاں پیش کر کے متلاشیوں کی رہنمائی کا پورا اہتمام کیا ہے۔ غلط ماحول اور باطل زدہ فضاؤں نے کس طرح حق کی لگن پیدا کی اور پھر کس طرح وہ سچائی کے بابِ عظیم کی کلید حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے پر گردش کرتی ہے۔

کتاب میں سرسری مطالعہ سے ہی چند گوشے محلِ نظر محسوس ہوئے۔

۱۔ تیسرے باب میں "عظیم الشان رسول تشریف لاتے ہیں" کے زیرِ عنوان صفحہ ۱۱۸ پر مصنف کہتے ہیں:۔

"اسی غار کا واقعہ ہے کہ جبرئیل فرشتہ خواب آلود مراقبہ (Vision) کی حالت میں نمودار ہوا اور آگاہ کیا کہ تمہیں خدا نے تمام نوعِ انسان کو حق و صداقت کی تبلیغ کرنے کے لیے منتخب کر لیا ہے .... جبرئیل فرشتے کی بار بار درخواست پر جن کو آپ نے اپنے خوابوں یا مراقبوں کی نیم بیدار حالت میں (in his vision) دیکھا آپ نے مکہ والوں کو اسلام پر ایمان لانے کی تبلیغ شروع کر دی۔

یہاں "وژن" (Vision) کا لفظ سخت محلِ نظر ہے۔ اس لفظ کے معنی ہیں کسی شے کو دیکھنا خصوصاً حالتِ خواب میں ـــ محویت و تصور کی حالت میں ـــ حالانکہ نزولِ وحی کے واقعہ کی جو ٹھوس روایات تاریخ پیش کرتی ہے ان سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت جبرئیلؑ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کامل ہوش و حواس اور بیداری کی حالت میں تشریف لائے ـــ نہ صرف وہ نظر آئے بلکہ انھوں نے حضورؐ کو تین بار اپنے سینے سے چمٹایا اور آپ نے ہوش و حواس کی پوری شدت کے ساتھ اس واقعہ کی جسمانی تکلیف محسوس فرمائی۔ کتاب کے پبلشر اور مرتب کو اس مقام پر ان شبہات کی بیخ کنی کرنی چاہیے تھی جو لفظ (Vision) سے وحی کی یقینی کیفیت پر وارد ہو سکتے ہیں۔

۲۔ صفحہ ۱۲۱ پر مصنف نے اسلامی عبادات کے رکنِ اعظم "حج" کی افادیت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

"یہ حج خشک و تر دونوں پر تجارتی راستے کھولنے کا ذریعہ تھا۔ اور قدرتی طور سے ہمہ گیر طور پر اس کے عظیم فوائد مرتب ہوئے"

اس اقتباس کے اول و آخر چ کی مادی افادیت کا گوشہ اتنی شدت سے ابھارا گیا ہے کہ اس کا اصل مقصد عبادت اور روحانی و اخلاقی پہلو دب کر تقریباً گم ہونے لگتا ہے۔ آگے چل کر باب پنجم میں دنیا اور انسانیت کے لیے مسلمانوں کی جن خدمات کو شرح و بسط سے گنایا گیا ہے وہ تقریباً تمام تر مادی زندگی کے ارتقا سے تعلق رکھتی ہیں حتیٰ کہ شطرنج کو بھی یورپ کے لیے مسلمانوں کی قابل ذکر دریافتوں میں شمار کیا گیا ہے اور بساط شطرنج کے مہروں کے نام لے کر لسانی بنیاد پر اس کا تاریخی ثبوت دیا گیا ہے۔ حالانکہ مسلمانوں کی یہ خدمات اسلام کی اصلی خدمت "اصلاح و ہدایت انسانی" کی روشنی میں قابل تعریف نہیں، قابلِ تنقید ہیں۔

مصنف اپنے اس ذہنی انداز فکر میں کافی حد تک مجبور ہیں۔ اس لیے کہ یورپ کے مادی ارتقا کے ماحول نے ان کو زندگی کا غیر معمولی مادی تصور دیا تھا لیکن پاکستان کے وہ حضرات جن کی نگرانی میں یہ کتاب شائع ہوئی وہ بھی ان مقامات کو نوٹ نہ کر سکے اور فٹ نوٹ میں بھی ان رجحانات کو چک کرنے اور صحیح سمت میں رہنمائی کرنے کی کوئی زحمت گوارا نہیں کی۔

کتاب کے مجموعی مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کے ذہن کو اسلام کی جن خصوصیات نے اپیل کی ان میں توحید خالص کا عقیدہ اور سادہ روش کے ساتھ اعلیٰ خیالی کی زندگی کا مشاہدہ اہم ترین چیزیں ہیں۔ کتاب کی سب سے بڑی افادیت یہ ہے کہ اس میں اس تمام ماحول کی تصویر کشی کی گئی ہے جو ایک صالح ذہن کو باطل سے نفرت اور حق کی جستجو پر اکساتی ہے۔ اور پھر حق کی منزل تک پہنچنے میں تمام تدریجی مراحل کی تفصیل نے حق کے آنے والے متلاشیوں کے لیے نشان راہ کا کام انجام دیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ کوشش قابل صد ستائش اور لائق استفادہ ہے لیکن ناشرین نے کتاب کی قیمت سات روپیہ پچاس نئے پیسے بہت زیادہ رکھی ہے۔ کاش قیمت کے لحاظ سے کتاب سہل الحصول ہوتی تو اس سے کم حیثیت والے بھی فائدہ اٹھا سکتے۔ (ش۔ن۔ حقانی)

جاوید نامہ اقبال
PILGRIMAGE OF ETERNITY
کا منظوم انگریزی ترجمہ

از شیخ محمود احمد۔ (جسٹس ایس۔ اے رحمٰن کے پیش لفظ کے ساتھ) صفحات ۱۲۷۔ بڑا کتابی سائز طباعت پاکیزہ۔ قیمت۔ /۱۵ ۔ ناشر:۔ انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک کلچر۔ کلب روڈ۔ لاہور۔ (مغربی پاکستان)

یہ ڈاکٹر محمد اقبال کی مشہور کتاب "جاوید نامہ" کا منظوم انگریزی ترجمہ ہے۔ شاعر نے اس فارسی کی شاہکار نظم میں عالم تصور

میں اپنے ایک فضائی سفر کی کہانی کہی ہے — اس سفر میں مختلف زمانوں اور مختلف ممالک کی عظیم شخصیتوں سے شاعر ملاقات کرتا ہے اور حیات و کائنات کے بارے میں ان کے خیالات و نظریات کا علم حاصل کرکے ان کو اپنی زبان میں نقل کرتا ہے۔ اس طرح یہ نظم شاعر کی روشن ضمیری، ذکر و فکر، نفسیاتی مہارت اور تخیلی پرواز کا ایک انمول شاہپارہ بن کر دنیا کے سامنے آئی۔ شیخ محمود احمد صاحب نے اقبال کی اس نوائے حق کو انگریزی جیسی بین الاقوامی زبان میں ڈھال کر اس کے پیغام کی افادیت کو ہمہ گیر اور آفاقی بنا دیا ہے۔

ترجمہ — فارسی کی اس حکیمانہ، فلسفیانہ اور عظیم شاعرانہ تصنیف کا انگریزی ترجمہ بجائے خود ایک بڑا — بہت دشوار کام تھا۔ اس پر انگریزی میں اس کا منظوم ترجمہ تو بے شک وشبہ جوئے شیر لانا ہے لیکن انسان اپنے عجز اور خدا کی مدد کا یقین لیے ہوئے جب کسی بھی مہم کو سر کرنے کی ٹھان لیتا ہے تو بہرحال آسان ہو کر رہ جاتی ہے۔ چنانچہ محمود احمد صاحب کو اپنے اس ادبی اور مذہبی معرکہ میں غیر معمولی کامیابی حاصل ہوا۔ ترجمہ اس قدر کامیاب، رواں دواں، مؤثر اور دلکش ہے کہ ترجمہ کی بہترین توقعات سے بہت آگے نکل گیا ہے۔

ترجمہ کا بیشتر حصہ آزاد نظم پر مشتمل ہے لیکن قافیہ و ردیف کی کمی کے باوجود شعریت کی دلکشی اور شاعری کا رچاؤ فنا ہونے نہیں پایا۔ جسٹس اے رحمٰن نے پیش لفظ میں ٹھیک ہی کہا ہے کہ " اقبال کی شاعری کے حسن و جاذبیت کا حق ادا کرنے کے لیے شاید ایک فٹز جیرلڈ کی ضرورت ہوتی۔ لیکن ان نارسائیوں کے باوجود جن سے ان کو سابقہ پیش آنا ہی تھا اور جو اس تصنیف کے مزاج میں رچی بسی تھیں میرے نزدیک پروفیسر محمود احمد نے خود کو اس کار گراں میں حسن و خوبی کے ساتھ سبکدوش کیا ہے " پیش لفظ نگار کی معیاری رائے میں مترجم، ترجمہ کے معیار پر بہت بڑی حد تک پورے اترتے ہیں۔ اور کم سے کم مثالیں ایسی ملتی ہیں جہاں ترجمہ کو اصل سے کسی قدر ہٹ جانا پڑا ہے۔ جسٹس اے رحمٰن کی رائے ہے کہ مترجم کو نہ صرف ترجمہ کا ملکہ حاصل ہے بلکہ وہ اقبال کے فلسفہ و پیغام کی گہرائیوں میں بھی اترے ہوئے ہیں۔ مترجم نے شروع میں اقبال پر جو " تعارف " لکھا ہے وہ اس رائے کا زندہ ثبوت ہے۔ اس " تعارف " میں پروفیسر محمود احمد نے اقبال کی شاعری پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے اور ان اعتراضات کا بھی جواب دیا ہے جو ایک مغربی ذہن کے زاویہ سے شاعر کی اسلام پسندی پر وارد ہوتے ہیں۔

تعارف نامہ کے علاوہ نظم مذکور پر جا بجا فٹ نوٹ کے ذریعہ مخصوص اسلامی اور مشرقی تلمیحات پر تحقیقی مواد دیا گیا ہے۔ اور کوئی شک نہیں کہ اس مقام پر جامعیت کا حق ادا کر دیا ہے۔

لسانی حیثیت سے ترجمہ کی شاندار کامیابی کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اس کو پروفیسر عبدالرشید، پروفیسر غلام احمد زرگر، عثمانیہ یونیورسٹی کے پروفیسر حسین علی خاں، پروفیسر ایف۔ جے۔ فیلڈن۔ ڈاکٹر اثیر۔ مسٹر یوسف بچ اور مسٹر اسپنر جیسے ماہرین انگلش نے لسانی، ادبی معیار پر کس کر دیکھا اور ان کے ضروری مشوروں سے اس کی بار بار اصلاح کی گئی۔

واقعہ یہ ہے کہ پروفیسر محمود احمد صاحب نے جاوید نامہ کا یہ ترجمہ پیش کر کے ایک بہت بڑی ادبی اور مذہبی خدمت انجام دی ہے جس کو ان کے "حسنِ انکسار" نے میری نظر میں کچھ اور حسین و دلکش بنا دیا ہے۔ موصوف "تعارف" کے آخر میں کہتے ہیں کہ ترجمہ میں جو خوبیاں نظر آئیں وہ ان کے مشیرین کی طرف منسوب کی جائیں اور جو نقائص محسوس ہوں ان کو خود ان کی کمزوریاں شمار کیا جائے۔ اتنا بڑا کام کرنے کے ساتھ اتنی انکساری کا یہ مقدس سوز — خدا مترجم کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

آخر میں ناشرین سے یہ دوستانہ شکایت کرنے کو جی چاہتا ہے کہ کتاب کی قیمت ایک درجن روپیہ رکھ کر انھوں نے مترجم کے "جذبۂ خیر" کی کوئی اچھی خدمت انجام نہیں دی! کتاب کی علمی قیمت کا تقاضا تھا کہ اس کی افادیت کو وسیع کرنے کے لیے غیر کاروباری انداز سے قیمت مقرر کی جاتی ہے۔　　ش۔ن۔ عثمانی

اسلام اور جدید مسائل

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی۔ صفحات ۴۸۔ قیمت ۳۷ نئے پیسے — تبلیغی مقاصد کے لیے ۱۲ روپے فی سیکڑہ۔ ناشر:۔ آزاد بکڈپو، سرگودھا، مغربی پاکستان

اسعد گیلانی صاحب نے اس پمفلٹ کے حرفِ اول میں لکھا ہے:۔

ہمارے ایک محب مکرم جناب ایم محی الدین لکھنوی بی اے ایل ایل بی ممبر سرگودھا بار ایسوسی ایشن نے اپنی ایک کتاب "اسلام بیسویں صدی میں" کے لیے ان جدید تقاضوں پر مشتمل ایک سوال نامہ مرتب کر کے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے ان کے جوابات حاصل کیے۔ مولانا محترم اور صاحب تالیف کی اجازت سے ان سوالات و جوابات کو افادۂ عام کی خاطر شائع کیا جا رہا ہے۔

نمونے کے طور پر ہم یہاں ایک سوال اور مولانا کا جواب نقل کرتے ہیں:۔

سوال۔ کیا انسان کو سیکولرزم یا دہریت روحانی و مادی ترقی کی معراج نصیب کرا سکتی ہے۔

جواب:۔ "سیکولرزم یا دہریت درحقیقت نہ کسی روحانی ترقی میں مددگار ہیں اور نہ مادی ترقی میں معراج

نصیب کرنے کا ذکر ہی کیا ہے؟ میں یہ سمجھتا ہوں کہ موجودہ زمانے کے اہل مغرب نے جو ترقی مادی حیثیت سے کی ہے وہ سیکولرزم یا مادہ پرستی یا دہریت کے ذریعہ سے نہیں کی مختصراً میری اس رائے کی دلیل یہ ہے کہ انسان کوئی ترقی اس کے بغیر نہیں کر سکتا کہ وہ کسی بلند مقصد کے لیے اپنی جان و مال، اپنے اوقات اور محنتوں کی اور اپنے ذاتی مفاد کی قربانی دینے کے لیے تیار ہو لیکن سیکولرزم اور دہریت ایسی کوئی بنیاد فراہم کرنے سے قاصر ہیں جن کی بنا پر انسان یہ قربانی دینے کو تیار ہو سکے، اسی طرح کوئی انسانی ترقی اجتماعی کوشش کے بغیر نہیں ہو سکتی اور اجتماعی کوشش لازماً انسانوں کے درمیان ایسی رفاقت چاہتی ہے جس میں ایک دوسرے کے لیے محبت ہو لیکن سیکولرزم اور دہریت میں محبت و ایثار کے لیے کوئی بنیاد نہیں ہے اب یہ ساری چیزیں مغربی قوموں نے مسیحیت سے بغاوت کرنے کے باوجود ان مسیحی اخلاقیات ہی سے لی ہیں جو ان کی سوسائٹی میں رچ بس گئی تھیں۔ ان چیزوں کو سیکولرزم یا دہریت کے حساب میں درج کرنا غلط ہے۔ سیکولرزم اور دہریت نے جو کام کیا ہے وہ یہ کہ مغربی قوموں کو خدا اور آخرت سے بے فکر کر کے خالص مادہ پرستی کا عاشق اور مادی لذائذ و فوائد کا طالب بنا دیا ہے۔"

یہ چھوٹا سا پمفلٹ جدید طبقے کی اسلام کے متعلق بہت سی الجھنوں کے ازالے کے لیے مفید ہے۔ (ع۔ق)

طبی ڈائجسٹ (اجمل نمبر)

ایڈیٹر حکیم محمد صلاح الدین نعمانی۔ صفحات ۹۴۔ قیمت ۱۲ ر ملنے کا پتہ:— دفتر ماہنامہ طبی ڈائجسٹ، مارکیٹ روڈ، حیدرآباد۔ پاکستان۔

زبدۃ الحکماء حکیم محمد صلاح الدین سابق پروفیسر طبیہ کالج لاہور کی ادارت میں طبی ڈائجسٹ کئی سال سے نکل رہا ہے زیر تبصرہ رسالہ اس کا اجمل نمبر ہے۔ مسیح الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں مرحوم و مغفور ہندوستان کی ان شخصیتوں میں ہیں جنھیں اس ملک کی تاریخ کبھی بھلا نہیں سکتی۔ ان کی ذات میں اللہ نے متعدد و متنوع صلاحیتیں جمع کر دی تھیں۔ انھوں نے اپنے علم و فہم کے مطابق اپنے وطن کی مختلف و متعدد میدانوں میں خدمات انجام دی ہیں اور جہاں تک ان کے مخصوص فن طب کا تعلق ہے اس میں تو انہیں مجتہد فن کا مقام حاصل ہے۔ ہند و پاک میں اس فن کی کوئی ترقی ان کے احسانات اور فنی اجتہادات سے بے نیاز نہیں ہو سکتی۔ محاسنِ اخلاق اور ذاتی خوبیوں کے لحاظ سے ان کا درجہ متعین کرنے کے لیے مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم و مغفور (جو خود بڑی خوبیوں کے جامع تھے) کے یہ الفاظ نشانِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:—

ابتدا ہی سے گاندھی جی کے "حکیم جی" میں وہ اوصاف موجود تھے جن کو آگے چل کر عرب و عجم نے اور مشرق و مغرب نے دیکھا اور مانا اور چونکہ یہ اوصاف اس وقت کے ماحول کے بالکل خلاف تھے اس لیے ماننا پڑے گا کہ فطری جوہر تھے وہ جوہر کیا تھے؟ صداقت پروری — ماحول سے متاثر نہ ہونے کی جرأت — بے لاگ صداقت — استقلال و سلامت روی — محبت و ہمدردی —

اس نمبر میں حکیم صاحب مرحوم سے متعلق مشاہیر اہلِ قلم کی تحریریں جمع کی گئی ہیں۔ یہ نمبر ضخامت میں کم ہونے کے باوجود اپنے ٹھوس مواد اور حسن معنی کے لحاظ سے قیمتی نمبر ہے۔ اطبار کو بالخصوص اس نمبر سے استفادہ کرنا چاہیے۔ (ع۔ق)

بقیہ اشارات) سرد ہوگیا۔ د۔ فرق یہ ہوا ہے کہ برطانیہ اور امریکہ کی کوششوں سے ہندوستان و پاکستان گفتگو پر آمادہ ہوگئے ہیں اور یہ گفتگو آخر دسمبر سے شروع ہو جائے گی لیکن جہاں تک ہندوستان کی دفاعی تیاری اور حالت جنگ کا تعلق ہے ابھی تک کوئی حقیقی فرق پیدا نہیں ہوا ہے اس لیے اوپر جو کچھ لکھا گیا تھا وہ اب تک تازہ ہے۔ اور اس تحریر میں جو اصل جوہر ہے وہ تو ہمیشہ تازہ رہے گا۔ چین اپنی جارحیت سے باز آجائے گا۔ اس کی کوئی توقع نہیں ہے اس لیے اس سے مقابلے کی تیاری تو جاری ہی رہنی چاہیے لیکن ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جو کش مکش ہے اگر وہ دور ہو جاتی تو دونوں ملکوں کے لیے یہ فال نیک ہوتا۔ کیونکہ ان دونوں ملکوں کے دوستانہ تعلقات، ان کی سلامتی و ترقی کے ضامن ہیں اور ان دونوں کے درمیان دشمنی و مخاصمت، ان کی تباہی و زوال کا سبب ہو سکتی ہے — ہم دل سے خواہش مند ہیں کہ ان دونوں ملکوں کے درمیان صلح و آشتی پیدا ہو — سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ دونوں ملکوں کے رہبرانِ قوم اور اخبارات اس گفتگو کو کامیاب بنانے میں تعاون کریں — خدا کرے یہ دونوں موجودہ مکارانہ ڈپلومیسی سے الگ ہو کر خلوص اور صفائی کے ساتھ بات چیت کریں۔ محض اخباری اعلان کہ گفتگو دوستانہ ماحول میں ہو رہی ہے یا ہوئی ہے کافی نہیں ہے۔ جب تک ارادتاً حقیقی دوستانہ ماحول پیدا نہ کیا جائے کوئی خاص فائدہ حاصل نہیں ہوتا، اور نہ ہو سکتا ہے۔

دسمبر ۱۹۶۲ء کے شمارے میں "مجلس شوریٰ جماعت اسلامی ہند کا فیصلہ" کے عنوان سے جو رپورٹ شائع ہوئی ہے وہ باجازتِ قیم جماعت اسلامی ہند "دعوت دہلی" سے نقل کی گئی تھی۔ اب اس پر تنبہ ہوا کہ ادارۂ دعوت سے عنوان لگانے میں غلطی ہو گئی تھی۔ مجلس شوریٰ جماعت اسلامی ہند کا کوئی باضابطہ اجلاس ہی منعقد نہیں ہوا۔ رپورٹ کے متن سے ظاہر ہے کہ یہ اجلاس صرف قریبی ارکان شوریٰ پر مشتمل تھا۔ یہ نوٹ اس لیے لکھا جا رہا ہے۔ کہ پڑھنے والوں کو غلط فہمی نہ رہے۔

زندگی
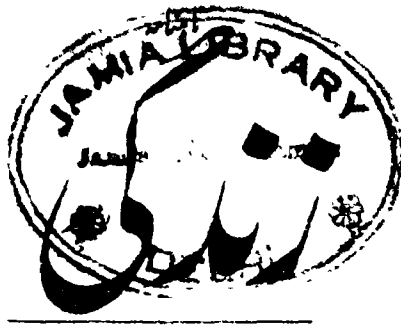
رمضان المبارک ۱۳۸۲ھ
فروری سنہ ۱۹۶۳ء

جلد:- ۳۰
شمارہ:- ۲

مدیر:- سید احمد قادری

● خط و کتابت و ارسال زر کا پتہ — منیجر "زندگی" رامپور۔ یوپی
● زر سالانہ:- صہ - ششش ماہی:- تین روپیہ - فی پرچہ:- پچاس نئے پیسے
● ـــــ ممالک غیر سے: دس شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر

پاکستانی اصحاب مندرجہ ذیل پتہ پر رقوم بھیجیں اور رسید ہمیں ارسال فرمائیں۔
منیجر ہفت روزہ "شہاب" ۱/ ۱۱ شاہ عالم مارکیٹ لاہور

مالک: جماعت اسلامی ہند۔ ایڈیٹر سید احمد عروج قادری۔ پرنٹر پبلشر: احمد حسن۔ مطبع: ناظم پریس بازار نصر اللہ خاں رامپور۔ مقام اشاعت
دفتر زندگی و کانتی، رامپور۔ یوپی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

سید احمد قادری

جنون دو ہیں۔ ایک آخرت کا، ایک دنیا کا۔ آخرت کا جنون یہ ہے کہ وہاں کی ناکامی کا خوف اور کامیابی کی امید انسان کے تمام اقوال و افعال اور افکار و خیالات کا محور و مرکز بن جائے۔ وہ جو کچھ کہے یہ سوچ کر کہے کہ اس کا ہر لفظ نامۂ اعمال میں درج ہوگا وہ جو کچھ کرے یہ جان کر کرے کہ آخرت میں اس کی جواب دہی کرنی ہوگی۔ ہر اس چیز سے بھاگے جو وہاں کے لیے مضر اور ہر اس چیز کی طرف لپکے جو وہاں کے لیے مفید ہو۔ رب کائنات اور آقائے ولی نعمت کی خوشی و ناخوشی کا شعور و احساس اس کے عمل اور ترک عمل کا محرک بن جائے۔ وہ خلوت میں ہو یا جلوت میں، گھر میں ہو یا باہر ہو، مسجد میں ہو یا بازار میں، کورٹ میں ہو یا پارلیمنٹ میں، ہر جگہ یہ احساس اس کے ساتھ ہو کہ اس کا خدا اس کے ساتھ ہے، مسئلہ کوئی بھی ہو تعلیم کا یا تربیت کا، تہذیب کا یا معاشرت کا، معیشت کا یا سیاست کا، جنگ کا یا صلح کا، اس کی نگاہ صرف ایک نقطے پر مرکوز ہو کہ اس میں اس کے مالک کا حکم کیا ہے، اس کی مرضی کیا ہے۔ وہ ہر مسئلے میں سب سے اول یہی سوال کرے کہ خدا کیا کہتا ہے۔ اس کے رسول کیا کہتے ہیں۔ اخلاق پر اور اخروی زندگی پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے، حکم ہو تو چل پڑے اور دنیا کا کوئی نقصان اس کی راہ نہ روک سکے، اس کے قدم نہ پکڑ سکے، اس کی دنیا اس کی آخرت کی کھیتی ہو اور بس۔

اس جنون سے انفرادی زندگی میں ابوبکرؓ و عمرؓ اور عثمانؓ و علیؓ جیسی شخصیتیں ابھرتی ہیں اور اجتماعی زندگی میں خلافت راشدہ جیسی حکومتیں وجود پذیر ہوتی ہیں۔ جنون کی یہی قسم ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے:۔

اُعْبُدُوا اللّٰہَ حَتّٰی یَقُوْلُوْا مَجْنُوْنٌ۝ — اللہ کی بندگی کرو یہاں تک کہ لوگ تمہیں مجنون کہنے لگیں۔

دنیا کا جنون یہ ہے کہ یہاں کا اور صرف یہاں کا آرام و عافیت، صحت و مسرت، نشاط و عشرت، مال و دولت اور اقتدار و حکومت مطمح نظر اور تمام افکار و اعمال کا محور بن جائے۔ انسان جو کچھ سوچے اسی کے لیے سوچے

جو کچھ کرے، اسی کے لیے کرے۔ اس نقطہ نظر کا اونچا سے اونچا معیار یہ ہے کہ انسان قومی سربلندی اور وطنی ارتقاء
کو اپنا معبود بنائے۔ اس کے نزدیک کسی چیز کی افادیت واہمیت نام ہو صرف اس بات کا کہ اس سے ملک وقوم
کی دنیوی زندگی کو کیا فائدہ پہنچتا ہے۔ اس کے نزدیک مسائل زندگی پر سوچنے کے لیے صحیح ترین انداز فکر یہ ہو کہ
اس دنیا کی چلتی پھرتی زندگی کے مادی ارتقاء کو سامنے رکھا جائے۔ باقی رہی دوسری زندگی تو وہ ہے کب،
محض وہم ہے اور اگر کسی درجے میں ہو بھی تو اس لائق یقیناً نہیں ہے کہ مسائل زندگی پر غور وفکر اور فیصلے کے
وقت اس کا تصور بھی کہیں آس پاس پھٹکنے پائے۔ اخروی زندگی کا کھل کر انکار کیا جائے یا نہ [illegible]
کرنے کے لیے اس کا نام لے کر کوئی اپدیش دے دیا جائے ہر اس چیز کی طرف لپکنا چا[illegible]
حاصل ہو رہی ہو۔ اس راہ میں کسی روحانی واخلاقی نقصان کی پروا کرنا پرلے سرے کی [illegible]
سے دور بھاگنا چاہیے جس سے مادی ترقی کو دھکا لگتا ہو۔ اس ترقی کی راہ میں بڑے سے
نقصان کو برداشت کر لینا اونچے درجے کی عقل مندی وہوشیاری ہے۔ یہ دنیا ہی سب کچھ ہے اس سے آگے
کچھ نہیں۔

اس جنون سے انفرادی زندگی میں ابوجہل وابولہب اور ولید وعقبہ جیسی شخصیتیں ابھرتی ہیں اور
اجتماعی زندگی میں قیصر وکسریٰ جیسی حکومتیں جنم لیتی ہیں۔ اسی قسم کے مجنونوں کے بارے میں قرآن نے کہا ہے:۔

الذین یاکلون الربا لا یقومون الا کما یقوم الذی یتخبطہ الشیطان من المس

سود خوار اس شخص کی طرح اٹھتے ہیں جسے شیطان نے چھو کر باؤلا بنا دیا ہو۔

یہ دونوں جنون اختیاری جنون ہیں، اضطراری نہیں۔ ان میں سے ہر ایک کو انسان باختیار خود اپنے دماغ پر مسلط
کرتا ہے۔ یہ انتہا درجے کی خدا پرستی اور انتہا درجہ کی دنیا پرستی کو ظاہر کرنے کے دو عنوان ہیں۔ ہمارے
عقیدے میں وہ جنون جو خدا پرستی وآخرت پسندی کے اظہار کا عنوان ہے انتہائی مبارک ہے۔ کاش ہم اسے اختیار
کرنے کی طرح اختیار کرتے اور اے کاش ہمیں مجنون کہنے والے اپنے قول میں سچے ہوتے اور ہم ان کے اس خطاب
کے واقعی مصداق قرار پاتے۔

آیئے ذرا رک کر یہ غور کر لیں کہ بھارت میں جماعت اسلامی کو برادران وطن کے بعض اخبارات مذہبی جنونیوں
کی جماعت کیوں کہتے ہیں اور اب بعض مشہور اہل علم مسلمان ایسے لوگوں کو "مذہبی دیوانے" کا خطاب کیوں دے

کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ جماعت اسلامی ہند بلا لحاظ مذہب و ملت "خدمت خلق" کے کام کرتی ہے۔ مسلمانوں کے ملی مسائل سے تعرض کرتی ہے۔ مسلمان بچوں کی دینی تعلیم میں دلچسپی لیتی ہے۔ ملک میں رائج نصاب تعلیم کی اصلاح کی طرف حکومت کو متوجہ کرتی ہے۔ لسانی، نسلی، مذہبی، علاقائی اور صوبائی تعصبات کے خلاف آواز بلند کرتی ہے۔ بھارت کے سربراہوں کے سامنے باشندگان ملک کے اخلاقی انحطاط کو دور کرنے کی تدبیریں رکھتی ہے۔ منکرات و فواحش کی کثرت پر تشویش کا اظہار کرتی اور قومی یکجہتی کے لیے منفی و مثبت اصول پیش کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی وجہ "مذہبی دیوانے" کے خطاب کی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ان کاموں میں سے جو کام مسلمانوں کے ساتھ خاص ہیں ان سے کسی مسلمان جماعت یا فرد کو اختلاف نہیں بلکہ مسلمانوں کی تمام جماعتیں کم و بیش یہ کام خود کر رہی ہیں اور ان میں سے جو کام تمام باشندگان ملک سے تعلق رکھتے ہیں ان میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جس کی وجہ سے جماعت اسلامی کو مذہبی جنونیوں کی جماعت کہا جائے تو وہ پھر کون سی ممتاز و منفرد بات ہے جس کی وجہ سے جماعت کو یہ خطاب دیا جا رہا ہے۔ کیا وہ کوئی ڈھکی چھپی بات ہے جس کی سراغ رسانی کی جائے؟ نہیں بلکہ اس کے دستور میں چھپی ہوئی اور تمام ملک میں شائع و ذائع ہے۔ یہ منفرد اور ممتاز بات اس کا نصب العین اور وہ ہمہ گیر اصلاحی و انقلابی دعوت ہے جو وہ اکتیس سال سے اس ملک میں پیش کر رہی ہے۔

وہ مسلمانوں کو اس بات پر متنبہ کرتی ہے کہ وہ اپنے مسائل پر جزو جزو کر کے نگاہ ڈالنے اور نمٹنے کے بجائے ان سب پر ہمہ جہتی اور کلی نگاہ ڈالیں۔ مصائب و آفات کا جو خار دار و تناور درخت اپنی شاخیں پھیلائے کھڑا ہے اس سے نجات پانے کا یہ کوئی معقول طریقہ نہیں ہے کہ اس کی مضبوط اور تر و تازہ جڑوں سے غفلت برت کر صرف شاخوں کی طرف اپنی تمام توجہ مرکوز کر دی جائے۔ اس طریقے کا نتیجہ یہی نکل سکتا ہے اور نکل رہا ہے کہ جو شاخ کٹتی ہے اس کی جگہ پر پہلے سے زیادہ سرسبز اور مضبوط شاخ نکل آتی ہے۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ یہ خار دار درخت چند باطل نظریات زندگی کی جڑوں پر کھڑا ہے۔ جب تک وہ نظریات، خشک، کمزور اور مضمحل نہیں ہوتے۔ یہ درخت آفتیں ڈھاتا رہے گا، مصیبتیں لاتا رہے گا۔ یہ سمجھنا صحیح نہ ہوگا کہ ان باطل نظریات کے کانٹے صرف مسلمانوں کو زخمی کرتے ہیں یا کر رہے ہیں بلکہ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ وہ پوری انسانیت کے دل میں پیوست ہیں اور تمام عالم انسانی تکلیف سے کراہ رہا ہے۔ یہ نظریات جس ملک میں بھی غالب آجاتے ہیں وہاں ٹھیک وہی نتائج سامنے آتے ہیں جو بھارت میں سامنے آرہے ہیں۔ یہ نظریات اپنی عین فطرت کے لحاظ سے ہر ملک میں دین حق کے دشمن ہیں وہ بھارت ہو یا پاکستان یا مصر ——— ایک دردناک صورت حال یہ ہے کہ جس قوم، جس ملت اور جس امت کے

پاس ان باطل نظریات کا تیر بہدف توڑ موجود ہے وہی تمام دنیا میں سب سے زیادہ ان کا شکار بلکہ صید زبوں بنی ہوئی ہے اور بہت سے ملکوں میں تو شکاری اور شکار دونوں ہی مسلمان ہیں۔

یہ ہے وہ اصل سبب جس کی وجہ سے برادران وطن بھی ہمیں "مذہبی دیوانے" کا خطاب دیتے ہیں اور اب بعض علماء کی طرف سے بھی ایسی ہمہ گیر اور خالص اسلامی دعوت کے داعیوں کو اس خطاب سے نوازا گیا ہے۔ ان کی طرف سے یہ خطاب اس لیے دیا گیا ہے کہ وہ باطل کے اس غلبہ و ہجوم میں خلافت کے احیاء سے مایوس ہو گئے ہیں۔ بہرحال جو لوگ اس سے مایوس نہیں ہیں اور اس قربانی کے لیے بھی آمادہ ہیں وہ بلالحاظ مذہب و ملت حق کی دعوت دیتے رہیں گے اور مسلم ناخوش ہوں ہم کہتے رہیں گے کہ امت مسلمہ دین حق کی امین اور نظام عدل کی پاسبان ہے اس۔۔۔ اصول ہیں جو نہ صرف اس کو امن و سلامتی سے ہم کنار کرسکتے بلکہ تمام دنیا میں اس کی بہار لا سکتے ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ مسلمانوں کے ملی مسائل سے صرف نظر کیا جائے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ اسلامی اصولوں کو باشندگانِ ملک کے سامنے پیش کرنے، ان کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھالنے اور اس ملک میں انہیں برپا کرنے کی سعی و جہد کو اولین اہمیت دینی چاہیے۔ اس کے بغیر اپنے آپ کو اور اپنی آئندہ نسل کو دین حق پر کما حقہ برقرار رکھنا دشوار ہی نہیں ناممکن ہے۔ الناس علیٰ دین ملوکھم ایک ایسا کلیہ ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

خدا پرستی اور آخرت کا جنون ہو یا دنیا پرستی کا جنون دونوں ہمیشہ ٹکراتے رہے ہیں اور قیامت تک ٹکراتے رہیں گے۔ اس ٹکراؤ اور تصادم کو نہ کوئی روک سکا ہے اور نہ روک سکے گا۔ قیامت اور آخرت دراصل اسی تصادم کے آخری انجام کا نام ہے۔

دعا ہے کہ قیامت میں ہم اس گروہ کے ساتھ اٹھائے جائیں جسے دنیا میں محض خدا پرستی کی وجہ سے مجنون کہا گیا۔

ارشادات رسول:۔

قتل کرنے میں بھی احسان کا حکم

سید احمد قادری

عَنْ شَدَّادِ بْنِ اَوْسٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ کَتَبَ الْاِحْسَانَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ فَاِذَا قَتَلْتُمْ فَاَحْسِنُوا الْقِتْلَۃَ وَاِذَا ذَبَحْتُمْ فَاَحْسِنُوا الذِّبْحَۃَ وَلْیُحِدَّ اَحَدُکُمْ شَفْرَتَہٗ وَلْیُرِحْ ذَبِیْحَتَہٗ

ترجمہ: ــــ شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ نے انسانوں پر ضروری قرار دیا ہے کہ وہ ہر شے کے ساتھ احسان کریں تو جب تم (حکم الٰہی کے ماتحت) قتل کرو تو بطریق احسن قتل کرو اور جب تم (کسی جانور کو) ذبح کرو تو بطریق احسن ذبح کرو۔ تم میں سے ہر شخص کو چاہیے کہ اپنی چھری کو تیز کر لے اور اپنے ذبیحہ کو آرام پہنچائے (مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ)

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو احسان کا جو حکم دیا ہے اس کی وسعت کا اندازہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہوتا ہے۔ یہ حدیث ان احادیث میں شمار کی جاتی ہے جنہیں "جوامع" کا درجہ حاصل ہے۔ یعنی ایسی احادیث جو اپنی بلاغت وجامعیت اور ایجاز واختصار کے لحاظ سے دریا بکوزہ کے نمونے اور بہترین پارہ ہائے ادب ہیں اس کا پہلا ٹکڑا "اللہ نے انسانوں پر ضروری قرار دیا ہے کہ وہ ہر شے کے ساتھ احسان کریں" ایک کلی قانون ہے جس نے احسان کی حاصل کو بے حد وسیع کر دیا ہے اور اس کے دائرے میں جاندار ہی نہیں مردے تک داخل ہو گئے ہیں۔ مردے کے غسل تکفین نماز جنازہ اور تدفین کے بارے میں جو احکام دیے گئے ہیں ان میں حکم احسان کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے ــــ باقی دو ٹکڑے اس قانون کلی کی دو مثالیں ہیں اور احسان کی اہمیت وحقیقت سمجھانے کے لیے بہترین مثالیں ہیں۔

"جب تم قتل کرو تو بطریق احسن قتل کرو"۔ اس ٹکڑے نے حدود وقصاص اور حرب وضرب کی تاریخ میں ایک عظیم انقلاب پیدا کیا ہے۔ اس کو پوری طرح سمجھنے کے لیے جاہلیت عرب کی جنگی تاریخ پڑھنی چاہیے۔ "حرب" کا لفظ عرب میں قتل وغارت، سلب ونہب، بے عزتی ورسوائی، بہیمیت وسنگدلی اور جان ومال عزت وآبرو کی

تباہی اور بربادی کی ایک ایسی علامت تھی کہ اس کا اعلان سن کر جوان ہی نہیں بچے بوڑھے اور عورتیں بھی لرز اٹھتی تھیں کوئی سنگدلی اور حیوانیت ایسی نہ تھی جو جنگ میں جائز نہ سمجھی جاتی ہو۔ غدر، عہد شکنی اور بے دریغ قتل اس کی خصوصیت تھی، بچے ہوں، بوڑھے ہوں، قاصد و پیام رساں ہوں، عورتیں ہوں، غلام اور نوکر ہوں غرض کوئی بھی ہو عرب جنگ جو کی تیغ تیز سے بچ نہیں سکتا تھا۔ یہ سب کے سب نذر تیغ بے دریغ ہو جاتے تھے۔ دشمنوں کو زندہ جلا دینا، ان کو باندھ کر تیروں، نیزوں اور خنجروں کا نشانہ بنانا، ناک، کان اور دوسرے اعضاء کاٹ کر مُثلہ کرنا قابل فخر کارنامے تھے۔ دشمنوں کے کٹے ہوئے ناک، کان کو ہار بنا کر گلے میں پہننا جواں مردوں کا زیور تھا بلکہ لاشوں کا مُثلہ کرنے میں عورتیں بھی مردوں سے کم نہ تھیں۔ حضرت حمزہؓ ایک عورت ہی نے کیا تھا۔ یہ حالت تھی کہ داعی اسلام، رسول امن و سلام محمد عربی صلی اللہ علیہ جب تم قتل کرو تو بطریق احسن قتل کرو۔" ان مختصر جملوں نے درندگی و بہیمت کے اس شیطانی د کے لیے بند کر دیا۔ اس مفہوم کی دوسری حدیث یہ ہے:۔

عبد اللہ بن یزید عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ نہی عن النُّہْبَۃِ وَالْمُثْلَۃِ (بخاری ج۲، کتاب الصید)	عبد اللہ بن یزید سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہبہ (لوٹ) اور مُثلہ سے منع فرمایا۔
کَانَ یَحُثُّنَا عَلَی الصَّدَقَۃِ وَیَنْہَانَا عَنِ الْمُثْلَۃِ۔ (ابوداؤد، کتاب الجہاد)	نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں صدقے کی ترغیب دیتے تھے اور مُثلہ (انسان کے اعضاء کو کاٹنا) سے منع کرتے تھے

ایک اور حدیث ہے:۔

اَعَفُّ النَّاسِ قِتْلَۃً اَھْلُ الْاِیْمَانِ (ابوداؤد، کتاب الجہاد)	قتل میں درندگی سے سب سے زیادہ بچنے والے اہل ایمان ہیں۔

آگ میں جلانے کی بھی ممانعت فرمائی:۔

لَا یَنْبَغِیْ اَنْ یُّعَذِّبَ بِالنَّارِ اِلَّا رَبُّ النَّارِ۔ (ابوداؤد)	رب النار (خدا) کے سوا کسی کے لائق نہیں کہ وہ کسی کو آگ کا عذاب دے۔

باندھ کر قتل کرنے کی بھی ممانعت کی:۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ نَھٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنْ یُّتَّخَذَ شَیْئٌ	ابن عباس سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر ایسی شے کو باندھ کر ہدف بنانے سے روکا

فِیهِ الرُّوحُ غَرَضًا۔ (ترمذی ابواب الصید)　　جس میں روح ہو۔

ابن عمر قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ینھیٰ ان تصبر بہیمۃ او غیرھا للقتل (۴۹)

ابن عمر کہتے ہیں میں نے سنا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جانور یا کسی دوسرے جاندار کو باندھ کر قتل کرنے سے منع فرماتے ہیں

ابو داؤد کتاب الجہاد میں ذیل کا واقعہ درج ہے :۔

"ہم خالد بن ولید کے بیٹے عبد الرحمٰن کے ساتھ ایک لڑائی میں شریک ہوئے تو دشمن کے فردوں میں سے چار گرفتار کر کے لائے گئے۔ عبد الرحمٰن کے حکم سے وہ چاروں باندھ کر قتل کر دیئے گئے۔ یہ خبر ابو ایوب انصاریؓ کو پہنچی تو انھوں نے کہا میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو باندھ کر قتل کرنے سے روکتے ہوئے سنا ہے۔ خدا کی قسم اگر مرغی بھی ہوتی تو میں اس کو باندھ کر قتل نہ کرتا۔ جب ان کی یہ حدیث عبد الرحمٰن کو پہنچی تو انھوں نے اس غلطی کے کفارے میں چار غلام آزاد کیے۔"

قصاص لینا ہو یا حد لگانی ہو یا میدانِ جنگ میں خدا کے حکم سے انسانیت کے دشمنوں کو قتل کرنا ہو، ہر موقع پر اخلاقِ شائستگی ہی درندگی کے مقابلے میں ایک آہنی دیوار بن کر آ کھڑی ہوتی ہیں اور کوئی مومن متقی اس کی جرأت نہیں کر سکتا کہ خدا کے دشمنوں اور واجب القتل مجرموں تک کو قتل کرنے میں "بطریقِ احسن قتل" کی حد سے تجاوز کرے اور مثلہ یا اذیتیں دے کر قتل کرنے کی صورتیں اختیار کر سکے۔ یہ بات اس احسان کے خلاف ہوگی جس کا حکم خدا و رسول نے دیا ہے۔ حدیث زیرِ شرح کا تیسرا ٹکڑا یہ ہے :۔ "اور جب تم کسی جانور کو ذبح کرو تو بہ طریقِ احسن کرو"۔ یہ حکم فی الواقع محض ذبحِ حیوان سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ یہ احسان کا وہ شاندار درس ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مومن کو دنیا میں کتنی نرمی و لینت اور کس قدر مہربانی و شفقت کے ساتھ زندگی بسر کرنی چاہیے جو دین اس بات کو جائز نہیں رکھتا کہ جانوروں کو ذبح کرنے میں سنگ دلی کا ثبوت دیا جائے۔ وہ بنی نوعِ انسان کے ساتھ سنگ دلی کیسے جائز رکھ سکتا ہے۔ حدیث کے چوتھے جملے میں چھری کو تیز کرنے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ گلا آسانی سے کٹ جائے اور جانور زیادہ اذیت محسوس نہ کرے۔ پانچویں جملے کا مطلب یہ ہے کہ کھال کھینچنے اور اعضاء کی قطع و برید میں جانور کے ٹھنڈا اور ساکن ہونے کا انتظار کیا جائے جب تک وہ تڑپ رہا ہو اس کی کھال نہ کھینچی جائے۔

آج جاہلیت کی سنگ دلی پھر لوٹ آئی ہے اور ضرورت ہے کہ یہ احادیث بار بار لوگوں کے سامنے لائی جائیں اور بالخصوص مسلمان ان کا مطالعہ کرتے رہیں۔

قرآن مجید کے کتابِ الٰہی ہونے کا ثبوت

(۲)

(مولانا صدر الدین اصلاحی)

چھٹا ثبوت اس امر کا چھٹا ثبوت یہ ہے کہ قرآن حکیم میں بہت سے ایسے علمی حقائق بھی ہیں جو اس کے نازل ہونے کے وقت تک پوری دنیا کے لیے عموماً اور عرب کے لیے خصوصاً سربستہ راز تھے، اور سائنس و فلسفے کے اونچے حلقوں میں بھی ان سے کوئی واقف نہ تھا۔ اس کے بعد جب صدیاں گذر گئیں اور علمی و سائنسی تحقیقات نے اپنی ترقی کے متعدد مرحلے طے کر لیے، تب کہیں جا کر انھیں پایا جا سکا۔ مثلاً:۔

(ا) کائنات کی تخلیق کے بارے میں قرآن نے فرمایا تھا:۔

إِنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنَاهُمَا۔ (سورۂ انبیاء۔ ۳۰)

بے شک یہ سارے آسمان اور زمین پہلے سب کے سب باہم ملے ہوئے تھے، تو ہم نے انھیں الگ الگ کیا

'سارے آسمانوں اور زمین' سے مراد قرآن کی زبان میں پوری کائنات ہوا کرتی ہے۔ آیت کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ یہ کائنات اپنی موجودہ ہیئت میں آنے سے پہلے پوری کی پوری، ایک ہی مادے کی شکل میں تھی، ایک ہی قسم کی ایک مخصوص شے تھی جو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ پھر خالقِ حکیم نے اسے مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا، اور ان سے مختلف اجرام کی صورت گری فرما دی۔ یہ مادہ کیا اور کیسا تھا؟ اس کی وضاحت بھی قرآن ہی کی ایک اور آیت (ثُمَّ اسْتَوٰى إِلَى السَّمَاءِ وَهِيَ دُخَانٌ) (حٰمٓ سجدہ) سے یہ ہوتی ہے کہ یہ ایک طرح کا دھواں یعنی گیس تھا۔

(ب) جان دار مخلوقات کے متعلق اس نے بتایا تھا کہ ان سب کی اصل پانی ہے، پانی ہی وہ چیز ہے جس سے ہر ذی حیات کی تخلیق ہوئی ہے۔

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (انبیاء۔ ۳۰)

ہم نے (یعنی خدا نے) ہر جان دار شے کو پانی سے بنایا ہے۔

(ج) جاندار اور غیر جاندار ساری مخلوقات کے بارے میں اس نے ایک بات یہ بیان کی تھی کہ:-

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ (ذاریات) ہم نے ہر چیز کے جوڑے پیدا کیے ہیں۔

یعنی اس عالم وجود میں جو کچھ ہے اس میں کی ہر مخلوق کا، اللہ تعالےٰ نے، جوڑا اور ردِ مقابل بھی پیدا کر رکھا ہے تاکہ ایک دوسرے کی تکمیل کرے اور دونوں مل کر ایک دوسرے سے تعاون کرکے وہ نتائج ظہور میں لائیں جو اس عالم کی مصلحتوں اور ضرورتوں کے لیے مطلوب ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ مختلف اشیاء کے طبعی اختلافات انھیں باہم ٹکراتے رہیں اور اس کے نتیجے میں یہ کارخانۂ ہستی پُرسکون تعمیر و ترقی کے بجائے انتشار، خرابی اور تباہی کی نذر ہو جائے۔

(د) چاند اور سورج وغیرہ کی دائمی حالت اس نے یہ قرار دی تھی کہ:-

وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا	سورج اپنے مستقر کی طرف رواں دواں ہے،
ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ	یہ غالب اور باخبر ذات باری کا ٹھیرا ہوا ضابطہ ہے،
وَالْقَمَرَ قَدَّرْنَاهُ مَنَازِلَ	اور چاند کے لیے ہم نے منزلیں مقرر کر دی ہیں......
..... وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ	اور ہر ایک اپنے خاص دائرے میں برابر تیرتا یعنی گھومتا رہتا ہے۔
(یٰس ۳۹، ۴۰)	

یقیناً یہ ساری باتیں آج ثابت شدہ حقیقتیں ہیں، علمی تحقیقات کہہ رہی ہیں کہ کائنات اپنی ابتدائی حالت میں ایک گیس کے خزانے کی شکل میں تھی، حیات کا سرچشمہ پانی ہے، مخلوقات کے اندر زوجیت کا قانون کارفرما ہے، چاند اور سورج اور سارے کرے اپنے اپنے متعینہ مدار پر گردش کر رہے ہیں ـــــ لیکن جس وقت قرآن حکیم ایسے یقین بھرے لب و لہجہ میں یہ سب کچھ فرما رہا تھا اس وقت کے اہلِ علم و اربابِ تحقیق کو ان حقائق کا تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا، ان کا ثابت شدہ حقائق تسلیم کیا جانا تو دور کی بات ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر قرآن میں صدیوں پہلے ان علمی حقیقتوں کا تذکرہ کیسے آیا؟ اور یہ بات کیسے ممکن ہو سکی کہ عرب کے ایک اُمّی (روحی فداہ) کی زبان سے کائنات کے وہ عظیم حقائق بیان ہو جائیں جو صرف اسی وقت نہیں، بلکہ اس کے بعد بھی ایک طویل زمانے تک علم و تحقیق کی نگاہوں سے بالکل مخفی رہے ہوں؟ ظاہر ہے کہ اس کا ایک ہی جواب ہو سکتا ہے، اور وہ یہ کہ جس قرآن نے ان حقائق کی نشان دہی کی تھی وہ کسی انسان کی طرف سے تھا ہی نہیں، بلکہ اس خدا کی طرف سے تھا جو ساری کائنات کا خالق ہے اور جس نے خود ان حقائق کو اپنی کائنات کے اندر وجود بخشا ہے۔

ساتواں ثبوت | اس حقیقت کا ساتواں ثبوت قرآنِ حکیم کا اچھوتا اندازِ بیان، اور اس کی غیر معمولی بلاغت ہے

و قوتِ تاثیر ہے۔

قرآن اگرچہ انسانی الفاظ ہی سے ترتیب پانے والا کلام ہے، اور اس میں بھی قدرتی طور پر وہ اصول و ضوابط کارفرما ہیں جو عربی زبان و ادب سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود اس کا نظم کلام اور اسلوب بیان ایسا ہے جو عربی ادب کے ذخیروں میں کہیں بھی نہیں پایا جاتا۔ وہ ایک عجیب شانِ انفرادیت رکھتا ہے، جو اپنی مثال آپ ہی ہے۔ اس کی صحیح نوعیت کا اندازہ کرنے کے لیے قرآن اور اسلام کے کسی عقیدت مند کے پرجوش مخالفوں کی بعض شہادتیں سنیے:۔ مشہور قریشی سردار، ولید بن مغیرہ آں حضرت صلی ... میں آیا۔ آپؐ نے حسبِ دستور اسے بھی قرآن پڑھ کر سنایا۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ کلام ... دل کی سختی مات کھا چکی ہے۔ خاموشی سے گھر واپس چلا آیا۔ یہ خبر ابوجہل تک پہنچی تو گھبرایا ہوا اس ...

"چچا جان! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں (اپنی پوزیشن صاف کر دیجیے اور) کچھ ایسے الفاظ فرما دیجیے جن کو سن کر آپ کی قوم کو اس بات کا اطمینان ہو جائے کہ آپ اس شخص کے دعوے کی صداقت تسلیم نہیں کرتے۔" ولید نے جواب دیا۔ "آخر کیا کہوں؟ بخدا شعر ہو یا رجز، قصائد ہوں یا حتیٰ اشعار، غرض عربی کلام کی ایک ایک صنف کو میں تم سے زیادہ بہتر جانتا ہوں۔ خدا کی قسم یہ شخص جو کلام پیش کر رہا ہے، وہ ان میں سے کسی چیز کے بھی مشابہ نہیں۔ بخدا اس کے کلام میں ایک عجیب حلاوت، اور ایک خاص طرح کا حسن ہے، اس کی شاخیں پھلوں سے لدی ہوئی ہیں اور اس کی جڑیں بڑی شاداب ہیں، یقیناً وہ ہر کلام سے بلند ہے اور کوئی دوسرا کلام اسے نیچا نہیں دکھا سکتا۔ کوئی شک نہیں کہ وہ ہر اس چیز کو توڑ کر رکھ دے گا جو اس کے نیچے آجائے گی۔" (حاکم و بیہقی)

بلاغتِ کلام نام اس بات کا ہے کہ وہ سننے والے کے دل میں اتر جائے اور اس انداز سے اتر جائے کہ کلام سنانے کا جو اصل مقصد ہو وہ سننے والے کی عقل کو اطمینان اور دل کو سکون بخشتا ہوا پوری طرح حاصل ہو جائے ۔۔۔ بلاغت کی اس حقیقت کو سامنے رکھ کر اگر جائزہ لیا جائے تو پوری انسانی تاریخ میں کوئی ایسا کلام نہیں مل سکتا جو اپنی قوتِ تاثیر میں، اور دلوں اور دماغوں کو جیت لینے میں قرآن کے برابر پہنچ سکا ہو۔ قرآن کی اس بلاغت کا، اس کی اس قوتِ تاثیر کا اور اس کی اس صفتِ تسخیر کا حال واقعات کی روشنی میں دیکھیے۔

قریش کے سرداروں نے دعوتِ اسلامی کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے عوام کو جو ہدایتیں دے رکھی تھیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ:۔

لَا تَسْمَعُوا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ○ (حٰمٓ سجدہ - ۲۶)

اس قرآن کو نہ سنو اور اس کے سنائے جانے کے وقت شور و غل کے ذریعہ اس میں گڑبڑ ڈال دیا کرو۔ توقع ہے کہ اس طرح تم غالب ہو گے۔

اہل شرک کی یہ تدبیر و ہدایت واضح طور پر اس حقیقت کا اعتراف تھی کہ اگر عوام توجہ سے اس قرآن کو سنتے رہے تو وہ اپنے آپ کو اس کے سپرد کیے بغیر نہ رہ سکیں گے۔

مکے میں ایمان لانے والے: جب کفار کی ستم رانیاں اپنی حد کو پہنچ گئیں تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے بھی ایک بار ہجرت کا ارادہ کر لیا، اور گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ راستے میں ابن دغنہ نامی ایک شخص ملا، اور آپ کو اپنی امان کا وعدہ کر کے مکہ واپس لایا۔ جب یہاں کے لوگوں کو اس امان دہی کی خبر ملی تو انھوں نے ابن دغنہ سے کہا ہم ابو بکر کو صرف اس شکل میں یہاں رہنے دیں گے کہ وہ قرآن زور سے نہ پڑھیں، اور ہماری عورتوں اور بچوں کو سننے کا موقع نہ دیں (ابن ہشام ج ۱) ابوجہل اور اخنس بن شریق سے بڑھ کر قرآن سے نفرت رکھنے والے اور اسلام کے مخالف اور کون رہے ہوں گے۔ مگر اپنی تمام تر نفرتوں اور مخالفتوں کے باوجود ان کا بھی حال یہ تھا کہ ایک بار قرآن سن لینے کے بعد اس کی غیر معمولی حلاوت اور اس کی پرکشش بلاغت کو کبھی فراموش نہ کر سکے۔ دن کو عناد و مخالفت کا بازار گرم کرتے، مگر راتوں کو جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے قرآن سن پاتے تو بڑھتے ہوئے قدم آپ سے آپ رک جاتے اور چھپ چھپا کر دیر تک اسے سنتے رہتے۔ (ابن ہشام جلد اول)

حضرت عبداللہ بن مسعود کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار خانہ کعبہ میں سورۂ النجم کی تلاوت فرمائی۔ حاضرین میں اہل ایمان اور اہل کفر ہر طرح کے لوگ موجود تھے۔ جب آپ آیت سجدہ پر پہنچے تو حکم خداوندی کے مطابق سر سجدے میں ڈال دیا۔ آپ کو سربسجدہ ہوتے دیکھ کر (صرف ایک شخص ابولہب کے علاوہ) سارے حاضرین بھی سجدے میں گر گئے (بخاری) غور کیجیے، مسلمانوں سے تو یہ سجدہ حکم شریعت نے کرایا تھا، مگر یہ اہل کفر کی پیشانیاں کیوں جھک پڑیں؟ کوئی شک نہیں کہ یہ کلام الٰہی کی مسحور کر دینے والی بلاغت تھی جس کی حیرت انگیزیوں اور لذتوں میں وہ کھو گئے تھے اور انھیں اس کا کوئی احساس نہ تھا کہ وہ کیا کرنے جا رہے ہیں؟

طفیل بن عمرو دوسی اپنے قبیلے کا سردار اور ایک بڑا شاعر تھا۔ ایک روز مکہ آیا، تو قریش کے کچھ لوگ اس کے پاس پہنچے، اور اسے خبردار کرتے ہوئے بولے، دیکھیے، اس شخص محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس ہرگز نہ جائیے گا، اور نہ اس کی باتیں سنیے گا۔ کیونکہ اس کے کلام میں بلا کا جادو ہے۔ اسے سنکر آدمی اپنے حواس پر قابو نہیں رکھ پاتا۔ لیکن طفیل نے ان کا کہنا نہ مانا، اور تحقیق حال کے فطری تقاضے نے اسے آپ کی خدمت میں پہنچا دیا۔ آپ نے اسے قرآن پڑھ کر سنایا۔ تو وہ بے اختیار بول اٹھا "بخدا اس سے اچھا کلام میں نے کبھی نہیں سنا" اور یہ کہہ کر اپنے ایمان لانے کا اعلان کر دیا۔ (ایضاً)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام لانے سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کٹر دشمنوں میں سے تھے۔ ایک دن

جوشِ غضب میں تلوار اٹھا کر اس عزم کے ساتھ نکلے کہ آج اس فتنے کا خاتمہ ہی کر دوں گا۔ مگر راستے ہی میں اپنی بہن کے گھر سورۂ طٰہٰ سننے کا اتفاق پیش آ گیا۔ اس کا سننا تھا کہ اسلام اور پیغمبرِ اسلام کی دشمنی ایمان و عقیدت سے بدل گئی۔ (ابن ہشام ج ۱)

جبیرؓ بن مطعم راستہ چلے جا رہے تھے۔ آں حضرتؐ مغرب کی نماز میں سورۂ طور پڑھ رہے تھے۔ ٹھہر کر سننے لگے اور سورہ کے الفاظ تیر بن کر دل میں اترتے گئے۔ بالآخر وہیں حلقۂ اسلام میں داخل ہو رہے۔

قرآن کی مسحور کن بلاغت کا یہ کمال اس حال میں ہے کہ وہ کوئی شعر و ادب کی کتاب نہیں، بلکہ اخلاقیات، مواعظ اور احکام و ہدایات کی کتاب ہے۔ فصاحت و بلاغت کے کمالات کا اصل میدان شعر و ادب ہے۔ چنانچہ تاریخِ عالم میں جن لوگوں نے اپنے کمالِ بلاغت کا سکہ بٹھایا ہے انھوں نے ادبی صنف ہی کے ذریعہ بٹھایا ہے۔ ایسی کوئی مثال نہیں پیش کی جا سکتی کہ کسی نے اخلاق اور مذہب جیسے پر بولتے یا لکھتے ہوئے بلاغت کا کوئی اچھوتا معیار قائم کیا ہو۔ پھر ادبی مضامین اور جذبات میں کسی اونچی سے اونچی تخلیق میں بھی شروع سے آخر تک زورِ بلاغت کا رنگ یکساں طور پر قائم نہیں رہتا۔ اس کے کچھ حصے اگر معیاری حد تک بلیغ ہوں گے، تو بہت سے اجزا عام سطح کے بھی ہوں گے۔ مگر قرآن کا حال بالکل مختلف ہے۔ وہ دینی ہدایات اور شرعی احکام کی کتاب ہوتے ہوئے بھی بے نظیر بلاغت کا حامل ہے، اور اس بلاغت کی خلعتِ زیبا اس کی پوری قامت پر پڑی ہوئی ہے — عقلِ انسانی کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ صورتِ واقعہ وجود میں نہیں آ سکتی تھی اگر قرآن انسانی کلام ہوتا، اس لیے یہ نہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کلام ہے نہ کسی اور بشر کا، یہ قطعاً اس خدا کا کلام ہے جو سارے اہلِ بلاغت کی طرح خود کمالِ بلاغت کا بھی خالق ہے۔

آٹھواں ثبوت

قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے کا آٹھواں ثبوت اس کی تعلیمات ہیں۔ کیونکہ ان تعلیمات کا اگر جائزہ لیجیے تو معلوم ہوگا کہ ایک طرف تو ان میں غایت درجے کا اعتدال اور فطری عقلیت پائی جاتی ہے، دوسری طرف وہ انسانیت کے لیے ایک جامع ترین ہدایت نامہ ہیں۔ ان میں الٰہیات کے ضروری حقائق اور دین کے اصول و عقائد کی تفصیل بھی ہے اور انسانی اخلاق و آداب کی تشریح بھی ہے۔ معبودِ برحق کی پرستش کے متعلق جامع ہدایات بھی ہیں اور اس کے حقوق کے متعلق مفصل تلقینات بھی ہیں، فرد کی تربیت کے خطوط بھی ہیں اور معاشرے کی تعمیر کے اصول بھی ہیں، خاندانی، معاشرتی، تمدنی، معاشی اور سیاسی احکام بھی ہیں اور صلح و جنگ کے آداب و قوانین بھی ہیں۔ ان تعلیمات میں سے جہاں تک اجتماعی احکام کا تعلق ہے، ان کی نوعیت دنیا کے سارے نظاموں سے الگ ہے، اور وہ ہر قوم، ہر زمانے اور ہر ملک کے لیے یکساں طور پر موزوں ہیں، صدیوں تک موزوں ثابت ہو چکے

ہیں، اور آئندہ بھی جب کبھی انھیں اپنایا جائے گا موزوں ہی ثابت ہوں گے۔ پھر یہ تعلیمات اپنی معقولیت اور صداقت پر اور اپنے عملی نتائج کی خوبی پر مضبوط دلائل اور ناطق شہادتیں رکھتی ہیں۔ ان کی بنیاد پر انسانی زندگی کی جب بھی تعمیر کی گئی اسے مسرت ہی مسرت ملی —— سوچیے، کیا یہ بے نظیر تعلیمات حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اپنے ذہن کی پیداوار تھیں؟ یہ سوچتے وقت دو بدیہی حقیقتوں کو لازماً سامنے رکھیے: ایک تو یہ کہ مابعد الطبیعی، یہ دینی، یہ اخلاقی، یہ تمدنی اور یہ سیاسی علوم ومباحث، جن کے سلسلے میں قرآن حکیم نے اتنی کامیابی سے کلام فرمایا ہے، معمولی درجے کے علوم ومباحث نہیں ہیں، بلکہ ایسے اونچے علوم ہیں جن میں گفتگو کا حق اور بصیرت کا مقام حاصل کرنے کے لیے عمریں کھپا دی جاتی ہیں، تب کہیں جاکر اکّے دکّے افراد کو یہ حق اور مقام حاصل ہوپاتا ہے۔ دوسری یہ کہ جس شخص نے قرآن کو پیش کیا تھا اس کے حالات زندگی یہ ہیں کہ وہ عرب جیسے پس ماندہ ملک میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا بچپن یتیمی میں گذرا تھا۔ نوجوانی گلہ بانی میں اور جوانی کاروبار تجارت میں بسر ہوئی تھی — وہ اُمّی (اَن پڑھ) تھا۔ اسے تعلیم وتدریس کی ہوا بھی نہ لگی تھی۔ وہ اہل علم وفن کے ناموں سے بھی واقف نہ تھا۔ اسے مکّے کے لوگ ایک خاموش، بااخلاق، امن پسند، راست باز اور شریف شہری کی حیثیت سے تو ضرور جانتے تھے، مگر چالیس سال کی عمر تک کسی نے اس کو کبھی علم وحکمت کی باتیں کرتے نہ سنا تھا، کسی نے اسے الٰہیات اور فلسفۂ اخلاق پر، زندگی کے اجتماعی مسائل پر، قانون اور سیاست پر ایک دن بھی بحث کرتے نہ پایا تھا، کسی نے اسے وجود باری، توحید الوہیت، وحی ورسالت، آخرت اور جزاوسزا، جنت اور دوزخ، آسمانی کتابوں اور پچھلی نبوتوں پر کبھی ایک لفظ کہتے نہ سنا تھا، لیکن اپنی چالیس سالہ زندگی کے اس بے رنگ اور سادہ پس منظر کے بعد اس نے یکایک دنیا کو وہ کلام سنانا شروع کردیا جو ان بے نظیر تعلیمات پر مشتمل تھا —— کوئی شک نہیں کہ ان دونوں حقیقتوں کو، جو دوپہر کے سورج کی طرح ناقابلِ انکار ہیں، سامنے رکھ کر غور کرنے والا کوئی بھی شخص کبھی یہ باور نہیں کرسکتا کہ یہ تعلیمات آں حضرتؐ کے اپنے ذہن کی پیداوار تھیں۔ اس کے بخلاف اس کا فیصلہ صرف یہ ہوگا کہ یہ تعلیمات وحی الٰہی کا نتیجہ تھیں، جیسا کہ ان کے پیش کرنے والے نے بار بار زور دے دے کر اور پوری صراحت سے فرمایا ہے۔

نواں ثبوت | اس دعوے کا نواں ثبوت وہ نتائج ہیں جو قرآن کی پیروی نے دنیا کے سامنے پیش کیے حضرت مسیح علیہ السلام نے سچے انبیاء کی پہچان یہ بتائی ہے کہ "تم انھیں ان کے پھلوں سے پہچانو گے"۔ یہی بات خود قرآن نے بھی ایک اور انداز میں اس طرح فرمائی ہے "کہ کلمۂ طیبہ (یعنی دعوت قرآنی) کی مثال ایک اچھی ذات کے درخت کی سی ہے جس کی جڑیں زمین میں مضبوط جمی ہوئی ہیں اور آسمان میں پھیلی ہوئی ہیں اور جو ہر وقت اپنے رب کے اذن سے اچھے پھل دیتا رہتا ہے" (ابراہیم ۲۴) گویا کسی کتاب کے کتاب الٰہی

ہونے کی واضح ترین علامت یہ ہے کہ وہ نظری اور عملی ہر حیثیت سے انسان کو کتنا راست رو، صالح اور بامراد بناتی
ہے۔ اگر کسی نبی اور کتاب کی صداقت ناپنے کے لیے یہ ایک صحیح اور کامیاب کسوٹی ہے —— اور کوئی شک نہیں
کہ بات یوں ہی ہے —— تو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نبی اور قرآن کا کتاب الٰہی ہونا ایک
ناقابلِ انکار حقیقت ہے، کیونکہ انسانیت کی معلوم تاریخ میں کوئی اور کتاب نہیں جو اس معیار پر قرآن سے زیادہ کامیاب
ثابت ہوئی ہو۔ اس کتاب کے ذریعہ جو انقلاب وجود میں آیا، اس سے زیادہ عظیم، زیادہ مکمل اور زیادہ صالح
انقلاب کی کوئی مثال نہیں مل سکتی۔ بارہ لاکھ مربع میل کے وسیع علاقوں میں پھیلے ہوئے جنگ جو سرکش
کو اس کتاب نے دنیا کی سب سے زیادہ انسانیت نواز، منظم، نرم خو اور خیر پسند قوم بنا دیا
ایسے افراد تیار کیے جن کا وجود کمالِ انسانیت کی شرح تھا، ایسا معاشرہ بنایا جو سراپا عدل و احسان
قائم کی جو اس زمین پر صحیح معنوں میں آسمانی بادشاہت تھی۔ قرآن کے پیدا کیے ہوئے ان پھلوں کو دیکھ کر
ہے کہ اس نے اپنے بارے میں جو دعویٰ کیا تھا وہ غلط اور جھوٹا تھا؟ برائی کی بیل سے بھلائی کا اور جھوٹ کی شاخ سے
سچائی کا پھول آج تک کبھی نہیں کھلا ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ جس کتاب اور دعوت کی بنیاد ہی جھوٹ اور فریب پر
ہو اس سے دنیا میں راست بازی اور دیانت کی بہاریں آگئی ہوں۔

دسواں ثبوت

اس کا دسواں ثبوت عجز کی وہ مکمل خاموشی ہے جو قرآن کی تحدّی (چیلنج) کے جواب میں اختیار
کی گئی۔ قرآن کے منکروں نے جب ہر دلیل کی طرف سے اپنے کان بند کر لیے، اور اسے اللہ کی
کتاب نہ تسلیم کرنے پر پیہم اصرار کرتے رہے تو اس نے اپنے نازل کرنے والے کی طرف سے انھیں چیلنج دیا کہ :-

وَاِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا	اگر تمھیں اس کتاب کے بارے میں جسے ہم نے
عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ	اپنے بندے (محمد) پر اتارا ہے، (ہماری جانب سے
مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ	ہوتے میں) کوئی شک ہو تو اس جیسی کوئی ایک ہی سورہ
مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ	بنا لاؤ، اور اس غرض کے لیے اللہ کو چھوڑ کر اپنے سارے
صٰدِقِيْنَ ۝ (بقرہ - ۲۳)	نمائندوں کو بھی بلا لو، اگر تم اپنے خیال میں سچے ہو۔

یعنی اگر تم اپنے اس خیال کو صحیح سمجھتے ہو کہ یہ قرآن اللہ کا کلام نہیں بلکہ ایک انسان کا کلام ہے تو یہ بحث تمھارے
حق میں ابھی ختم ہو جا سکتی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ تم بھی لفظی اور معنوی صفات کی حامل ایسی ہی ایک کتاب، جیسا کہ یہ
قرآن ہے، تصنیف کر لاؤ۔ بلکہ اس کی جیسی کوئی ایک ہی سورہ بنا کر پیش کر دو۔ پھر اس سلسلے میں تم پر یہ بھی کوئی قید نہیں

کہ تم میں سے کوئی ایک ہی فرد یہ کام کر دکھائے، اس کے بخلاف تم کو اس معاملے میں پوری آزادی دی جاتی ہے۔ تم سب مل کر، اور جس کسی کو بھی اپنی مدد کے لیے تم بلانا چاہو سب کو بلا کر کوشش کر ڈالو حتیٰ کہ پوری نوعِ انسانی کو اس کام کے لیے اکٹھا کر لینے کی تمہیں پوری چھوٹ حاصل ہے۔ اگر تم نے اس طرح اس چیلنج کا کامیاب جواب دے دیا تو قرآن کا انسانی کلام ہونا مسلّم ہو جائے گا، اور پھر وہ اپنے کو کلامِ الٰہی کہنا ترک کر دے گا۔ ظاہر بات ہے کہ اگر تن تنہا صرف ایک شخص (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) یہ قرآن تصنیف کر لے سکتا ہے — جو اُمّی بھی ہے، اور جس کی خطابت یا شاعری کا آج تک کوئی شہرہ بھی نہیں سنا جا سکا ہے — تو تمہارے پورے گروہ کے لیے، جس میں بڑے بڑے شاعر اور نامور خطیب موجود ہیں، اس کا جواب مرتب کر کے پیش کر دینا ذرا دشوار نہ ہوگا، تم بڑی آسانی سے اس چیلنج کو قبول کر کے اس شخص کا منہ بند کر سکتے ہو — یہ چیلنج ان عربوں کو دیا گیا تھا جن کو اپنے حسنِ بلاغت کی یکتائی پر ناز تھا، اور جو اپنے کمالِ خطابت کے پندار میں بجا طور پر باقی ساری دنیا کو 'عجم' (گونگا) کہا کرتے تھے۔ مگر پورا عرب اس چیلنج کو سن کر خود گونگا بن گیا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ان لوگوں کے اندر قرآن مجید کو انسانی کلام ثابت کر دینے کی کتنی بے پناہ خواہش تھی۔ یہ قطعی ناممکن تھا کہ اپنی اس خواہش کے پورا کر لینے کی کوئی شکل اور تدبیر ان کے بس میں ہوتی اور وہ اسے اختیار کرنے میں ایک لمحہ کی بھی دیر لگاتے۔ انھوں نے قرآن کو کتابِ الٰہی نہ مان کر کون سا زیاں تھا جو برداشت نہیں کیا؟ سیادت اُن کی چھنی، قید و بند کی ذلتیں انھوں نے اُٹھائیں، خانۂ کعبہ سے اپنے آبائی معبودوں کی 'جلا وطنی' اور نگوں ساری کا 'روزِ بد' انھیں دیکھنا پڑا، خاک و خون میں وہ نہائے۔ مگر ان خطرناک اور بدترین انجاموں سے بچنے کے لیے جو ایک 'آسان' سی تدبیر ان کے سامنے رکھ دی گئی تھی اسے انھوں نے کبھی نہیں استعمال کیا، حالانکہ اس کے لیے انھیں بار بار متوجہ کیا گیا۔ مکہ میں بھی کئی بار اُن کے سامنے یہ چیلنج رکھا گیا، اور پھر مدینے میں بھی اسے دُہرایا گیا۔ مگر انھوں نے کبھی اسے قبول نہیں کیا۔ کیا عقل مان سکتی ہے کہ قبول کر لینے کی طاقت رکھنے کے باوجود انھوں نے از خود ایسا نہیں کیا؟

یہ چیلنج آج بھی اپنی جگہ بدستور موجود ہے۔ دنیا کی دوسری آسمانی کتابوں کی طرح قرآن کریم کی زبان مُردہ بھی نہیں ہو چکی ہے۔ بلکہ اپنے تاریخ اور جدید ہر طرح کے سرمایوں کے ساتھ زندہ ہے۔ اور اس کے بولنے اور جاننے والوں میں بڑے بڑے نامور ادیب اور عالم موجود ہیں۔ جن کے اندر اسلام کے کٹر مخالفوں کی بھی کوئی کمی نہیں۔ چاہیں تو اس چیلنج کو قبول کر لیں۔ مگر پونے چودہ سو برسوں کی خاموشی لبوں کو حرکت دیتی نظر نہیں آتی۔

یاد رہے کہ دنیا کے مختلف گوشوں میں مسلمانوں کے پھیل جانے اور ان کے ہمراہ قرآن مجید کے لاکھوں کروڑوں

نسخوں کے پہنچ جانے کے باعث یہ چیلنج پہلی صدی ہجری ہی سے اشاعتِ عام پا چکا ہے اگر اسے کبھی بھی اور کہیں بھی قبول کیا جا سکا ہوتا تو یہ ایک ایسا واقعہ ہوتا جو قدرتی طور پر پوری دنیا میں مشہور ہو گیا ہوتا۔ کیونکہ اسلام اور قرآن کے مخالفوں کے لیے یہ 'فتح مبین' ایک عظیم ترین نعمت ہوتی۔ وہ اس کی خبر کو، بلکہ قرآن کے اس جواب کو بھی اس کی تردید میں پورے جوش و انہماک سے ہر طرف پھیلا دیتے، اور اس کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ غیر مسلم دنیا قرآن سے اپنے انکار پر دلیل و برہان کا اطمینان پا لیتی، بلکہ یہ واقعہ خود مسلمانوں کے لیے بھی ارتداد کا ذریعہ بن جاتا۔ لیکن اس حقیقت کا، مسلم اور غیر مسلم، سبھی کو اقرار ہے کہ تاریخ اس قسم کے کسی بھی واقعہ کے ذکر سے خالی ہے۔

گیارھواں ثبوت

قرآن کے کتاب الٰہی ہونے کا آخری ثبوت اس کے 'عینی شاہد' قرآن کے پیش کرنے والے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں جنہوں نے اسے اپنی جانب سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے پیش کیا ہے۔ یعنی آپ کا کہنا ہے، اور بار بار کا کہنا ہے کہ یہ کلام جو میں پیش کر رہا ہوں، مجھ پر اللہ رب العالمین کی طرف سے اُترا ہے۔ وہ اپنے بزرگ فرشتہ (جبریل امین) کو میرے پاس بھیجتا ہے، اور وہ مجھے یہ کلام سنایا کرتا ہے ـــــ پوچھا جائے گا کہ آخر کیا ضرور ہے کہ آپؐ کی اس بات اور آپؐ کی اس گواہی کو سچ ہی باور کیا جائے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کی شخصیت وہ شخصیت ہے جس کی راست گوئی ہمیشہ شک و شبہہ سے بالاتر رہی ہے، صرف اپنوں ہی کے نزدیک نہیں بلکہ غیروں کے نزدیک بھی۔ چنانچہ دنیا جانتی ہے کہ آپ کی مخالفت میں عرب کے لوگوں نے وہ سب کچھ کہا اور کر ڈالا جو ان کے بس میں تھا، مگر انھوں نے اس اعتراف سے کبھی انکار نہیں کیا کہ آپؐ ایک سچے اور امانت دار انسان ہیں۔ نبوت سے پہلے اہل مکہ نے ان کے عوام اور خواص دونوں نے، آپ کو "صادق" اور "امین" کا لقب دے رکھا تھا۔ اعلانِ نبوت کے بعد اگرچہ انھوں نے خاص اس دعوے کی حد تک آپؐ کی تصدیق نہیں کی، اور آپؐ کے بار بار کہنے کے باوجود قرآن کو کلامِ الٰہی تسلیم نہیں کیا، مگر جہاں تک اس خاص معاملے کے سوا دوسرے امور و معاملات کا تعلق تھا وہ آپؐ کی راست گوئی اور دیانت کے اب بھی پوری طرح معترف تھے۔ ابوسفیان جیسے جانی دشمن سے جب قیصر نے اپنے دربار میں پوچھا کہ "کیا نبوت کا دعویٰ کرنے سے پہلے اس شخص پر تم لوگوں نے کبھی جھوٹ بولنے کا الزام لگایا تھا؟" تو انھوں نے اپنے انتہائی جذبۂ عداوت کے باوجود 'ہاں' کہنے کی کوئی گنجائش نہیں پائی۔ اس نے پھر پوچھا کہ "کیا یہ شخص وعدہ خلافی کر جاتا ہے؟" تو انھیں پھر کہنا پڑا کہ 'نہیں' ابھی تک تو اس نے ایسا کبھی نہیں کیا ہے، اس وقت ہمارے اور اس کے درمیان ایک معاہدۂ صلح (صلح حدیبیہ) نافذ ہے، نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے بارے میں اس کا رویہ کیا رہے گا" (بخاری۔ باب بدءُ الوحی)۔ اسی طرح

دشمنانِ اسلام کے سرگروہ، ابوجہل نے ایک بار آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کے دوران خود کہا کہ "ہم آپ کو جھوٹا نہیں کہتے، لیکن جو باتیں آپ پیش کر رہے ہیں ہم انھیں جھوٹ ہی سمجھتے ہیں۔" (حاکم) غزوۂ بدر کے موقع پر اس کے ایک ساتھی، اخنس بن شریق، نے تنہائی میں اس سے پوچھا "ٹھیک ٹھیک بتاؤ، تم محمد کو سچا سمجھتے ہو یا جھوٹا؟" اس نے جواب دیا، "بخدا محمد ایک سچا آدمی ہے، عمر بھر کبھی جھوٹ نہیں بولا ہے۔" (ابن جریر) ——— ان حقائق کو سامنے رکھیے، پھر فیصلہ کیجیے کہ قرآن کے کتاب الٰہی ہونے کی جو شہادت آپؐ نے دی ہے اسے سچا ماننا ضروری ہے یا نہیں یعنی کیا عقلاً یہ ممکن ہے کہ جو شخص راست گوئی اور صداقت شعاری اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوا ہو، اور جس نے کسی انسان سے کسی معاملہ میں کبھی جھوٹ نہ بولا ہو، وہ اپنے خدا کے نام پر ایسا دھڑلے سے جھوٹ بول دے گا؟ اس خدا کے نام پر، جو سب کچھ جانتا رہتا اور سنتا رہتا ہے، جس کی قدرت سے کوئی چیز بھی باہر نہیں ہو سکتی اور جو دونوں جہان کا فرماں روائے مطلق ہے۔ پھر جھوٹ بھی ایسا جو ایک دو بار نہیں، بلکہ مسلسل تئیس برس بولا گیا ہو۔ اپنے کسی دشمن پر بھی کبھی افترا نہ کرنے والا اپنے پروردگار پر ہمیشہ افترا کرتا رہا! انسانی معاملات میں ایک بار بھی جھوٹ نہ بولنے والا خدا کے معاملے میں ایک بار بھی سچ نہ بول پایا! کیا نفسیات کا مطالعہ، تجربات کی گواہی، عقل کا جائزہ، کوئی چیز بھی اس عجیب و غریب بات کی تائید کر سکتی ہے؟ نہیں اور یقیناً نہیں۔ اس لیے حق تو یہ ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت، قرآن کے کتاب الٰہی ہونے کا ایک ایسا ثبوت ہے جس کے بعد کسی سلیم الطبع انسان کے لیے کسی اور ثبوت کی مطلق ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ (ختم)

ماہِ صیام

وہ لوگ بڑے خوش نصیب ہیں جو رمضان المبارک کی رحمتوں، برکتوں اور نعمتوں سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ یہ مہینہ اللہ رب العالمین کی رحمتوں کا ایک ایسا گل کدہ ہے جس میں ہزار طرح کے خوش رنگ و خوشبودار پھول کھلتے ہیں، اور ان کی فراوانی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ وسیع سے وسیع دامن بھی تنگ ہو جاتا ہے۔ آخر بندے کا دامن تنگ اور خدا کی رحمتِ بے کراں میں کوئی حسابی نسبت کب ممکن ہے کہ اس کا ذکر کیا جائے۔ لینے والا جس قدر لینا چاہے لے لے۔ دینے والے کے خزانے میں کمی کا کوئی سوال نہیں۔

قرآن کی انقلابی دعوت

(مولانا سید جلال الدین عمری)

کوئی شخص قرآن مجید کو خدا کی کتاب مانے یا نہ مانے کم از کم اس واقعہ کا انکار نہیں
کتاب ہے، جس نے لاکھوں کروڑوں انسانوں میں زبردست انقلاب پیدا کر دیا، ان
بدل دیا، ان کے کردار و عمل کا رخ بدل دیا، اُن کے آداب تہذیب و معاشرت بدل د
سیاست بدل دیے۔ اس کتاب کو جنھوں نے تھاما وہ قوموں کے امام بن گئے حالانکہ کبھی وہ اس [illegible]
اور جنھوں نے اس کی مخالفت کی ان کو محکومیت کا منہ دیکھنا پڑا جب کہ تخت و تاج اور حکومت و سلطنت کا تصور
ان کے ساتھ وابستہ تھا۔ یہ ایک بے مثال انقلاب تھا جس نے وقت کے دھارے کو بالکل ایک دوسری طرف موڑ دیا۔
اس کتاب کے ذریعہ دنیا کو نئے نظریات و افکار ملے، نئی اخلاقی قدریں ملیں، انفرادی زندگی کے لیے نئے آداب اور
اجتماعی زندگی کے لیے نئے اصول و آئین ملے۔ غرض یہ کہ انسانیت کو ایک نئی زندگی ملی۔ آپ نہیں بتا سکتے کہ اتنی عظیم
تبدیلی دنیا کی کسی کتاب نے انسانوں میں پیدا کی ہو۔

آپ ماضی کی طرف پلٹ کر اس دور کا تصور کیجیے جب کہ حضرت مسیحؑ کو دنیا سے رخصت ہوئے پانچ سو سال
سے زیادہ گزر چکے تھے، انبیاء کی تعلیمات مٹ چکی تھیں، دنیا سے خدا پرستی ختم ہو گئی تھی اور انسان خدا کو بھولا ہوا تھا۔
اسے حکم صرف ایک خدا کی غلامی کا ملا تھا لیکن وہ بے شمار خداؤں کا غلام تھا، خدا نے اسے اپنی غلامی کے سوا ہر غلامی
سے آزاد پیدا کیا تھا لیکن اس کے پاؤں میں بادشاہوں، پروہتوں اور سرمایہ داروں کی محکومیت کی زنجیر پڑی ہوئی
تھی، خدا نے اسے سب سے اونچا مقام عطا کیا تھا لیکن وہ پستی کی آخری حد کو پہنچ چکا تھا اور اسے اپنے مرتبہ و مقام کا کچھ
بھی احساس نہیں تھا۔ زمین، آسمان، چاند، سورج، درخت، پہاڑ، آگ، پانی، ہوا ہر چیز اس کی مسجود تھی اور وہ ہر ایک کے
سامنے سر جھکانے کے لیے تیار رہتا۔ ان حالات میں قرآن نازل ہوا اور اس نے اپنا انقلابی کارنامہ انجام دیا۔ انسان اپنے
آپ سے غافل تھا، قرآن نے اسے بتایا کہ اس کا صحیح مقام کیا ہے۔ وہ مدتوں سے سویا ہوا تھا قرآن نے اسے جگایا۔

وہ اپنی حیثیت سے بے خبر تھا، قرآن نے اسے اس کی صحیح حیثیت سے آگاہ کیا۔ اس کے چاروں طرف خداؤں کا ہجوم تھا، قرآن نے اسے بتایا کہ اس کا خدا صرف ایک ہے، اور اسے صرف اسی ایک خدا کی بندگی کرنی چاہیے۔ خدا کی مخلوق میں کچھ تو خدائی کے دعویدار رہیں اور کچھ کو انسانوں نے خدا بنا رکھا ہے۔ حالانکہ خدائی کا ہر دعویدار جھوٹا دعویدار ہے۔ خدائی کا مقام یہاں سوائے ایک خالق ارض و سما کے کسی کو حاصل نہیں ہے۔ اسی طرح انسان نے جس چیز کو بھی خدا بنا رکھا ہے اسے ناجائز مقام دے رکھا ہے۔ جب تک انسان ان جھوٹے خداؤں سے بغاوت نہ کرے نجات نہیں پا سکتا۔ جب انسان اس خدائے حقیقی کی بندگی چھوڑ دیتا ہے جس نے یہ عظیم کائنات پیدا کی ہے، جو ہر چیز کا مالک ہے، جس کے ہاتھ میں نفع و نقصان اور موت و حیات ہے، اور ایسے خداؤں کی غلامی کرنے لگتا ہے جو کسی بھی حیثیت سے خدائی کے حق دار نہیں ہیں تو وہ زندگی کے میدان میں ایک غلط مقام پر کھڑا ہو جاتا ہے، اور اس کا ہر قدم غلط سمت میں اٹھنے لگتا ہے۔ جو شخص زندگی بھر غلط راہ پر دوڑ رہا ہو اس کے بارے میں یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اچھے انجام سے دوچار ہوگا۔ انسان کے لیے صحیح روش یہ ہے کہ وہ اس کائنات پر سوائے خدا کے کسی کے اقتدار کو نہ مانے، نہ کسی کو خالق و مالک سمجھے اور نہ کسی کو حاکم و معبود خیال کرے، نہ کسی کو رازق باور کرے اور نہ کسی کو نقصان رساں اور نفع بخش تصور کرے اور ہر غلامی سے دست کش ہو کر صرف خدائے واحد کی غلامی اختیار کرے۔ کائنات کی ہر چیز خدا کی مخلوق ہے اسے خدائی کا مقام دینا ایک جرم عظیم ہے جو کبھی معاف نہیں ہو سکتا۔

قرآن کی یہ دعوت وقت کی روش کے خلاف اعلان جنگ تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جو خدا بنے بیٹھے ہیں وہ خدائی کا مقام چھوڑ دیں اور جو لوگ خود ساختہ خداؤں کی پرستش میں لگے ہوئے ہیں وہ ان کی پرستش سے توبہ کریں۔ تمام خداؤں کی خدائی ختم کر کے صرف ایک خدا کی حکومت قائم ہو جائے۔ اسی کی بندگی ہو، اس کی پرستش کی جائے، اسی کا قانون چلے، اسی سے خوف کھایا جائے، اسی سے امید لگائی جائے، اسی کا حکم مانا جائے، اسی کی اطاعت کی جائے، اسی کو خوش کیا جائے اور اسی کی ناخوشی سے بچا جائے۔ اس دعوت کو سنتے ہی بے شمار خداؤں کے سامنے جھکنے والی دنیا چلا اٹھی أَجَعَلَ الْآلِهَةَ إِلَٰهًا وَاحِدًا إِنَّ هَٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ۝ صٓ (کیا اس نے بہت سے خداؤں کو ایک خدا بنا دیا یقیناً یہ بڑی ہی عجیب بات ہے۔)

قرآن کی یہ دعوت بجلی بن کر اپنے ماحول پر گری اور اس کی کڑک سے انکار و خیالات کی وہ عمارت ہلنے لگی جس کے اندر تمام جھوٹے خداوند اور ان کے پرستار پناہ لیے ہوئے تھے، اس دعوت کو جس نے بھی سنا وہ اسے نظر انداز نہیں کر سکا۔ اس نے محسوس کیا کہ یہ ایک زبردست پیغام ہے جس کے اثرات بہت ہی دور رس اور بہت ہی

گھرے ہیں۔ یہ اس کے 'دین' پر حملہ ہے، اس کے خیالات کی موت ہے، اس کی تہذیب و معاشرت پر یلغار ہے اور اس کی غلط سیرت اور بگڑے ہوئے اخلاق پر تنقید ہے۔ اس دعوت کے آگے بڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ 'پرانی دنیا' کو آگ لگا دی جائے اور ایک 'نئی دنیا' کی تعمیر کی جائے۔ چنانچہ قرآن کی دعوت کے مخالفین پوری قوت کے ساتھ اس کے مقابلہ کے لیے میدان میں آگئے، ہر جھوٹا خدا اپنی خدائی کی حفاظت کے لیے کھڑا ہو گیا، ہر بت کے پجاری نے اپنے بت کی حمایت میں کمر کس لی اور ہر طرف سے آواز آنے لگی ۔

اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰٓی	کہ تم چلو اور اپنے معبودوں (کی حمایت)
اٰلِهَتِكُمْ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ ۝	پر جم جاؤ یقیناً (یہ دعوت بے وجہ نہیں۔
مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِی الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ	اس میں کوئی نہ کوئی غرض ضرور ہے۔ یہ تو
اِنْ هٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ ۝ (ص: ۶،۷)	پچھلے دین میں بھی نہیں سنا۔ یقیناً یہ گھڑی ہوئی

قرآن کی دعوت کے نتیجے میں اب وہ 'مقدس جنگ' شروع ہوئی جو بالآخر تاریخ میں ایک عظیم انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ یہ افراد کے درمیان مال و دولت کا جھگڑا نہیں تھا۔ یہ کسی جائیداد کا مقدمہ نہیں تھا۔ یہ قبیلوں کی باہمی چپقلش اور نزاع نہیں تھی اور نہ یہاں کسی گروہ کے اقتدار پانے اور کسی دوسرے گروہ کے اقتدار سے محروم ہونے کی بحث تھی بلکہ یہ جنگ انسانیت کی بھلائی کے لیے لڑی جا رہی تھی، یہ جنگ اس لیے چھڑی تھی کہ انسان خدائے واحد کی 'عبادت' قبول کرلے اور دل و جان سے اس کے سامنے جھک جائے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان خدا کا بندہ ہے اور اسے خدا ہی کی بندگی کرنی چاہیے۔ قرآن اس حقیقت کا اعتراف کر رہا تھا اور دنیا اس حقیقت کو جھٹلا رہی تھی۔ یہ سچائی اور جھوٹ کی جنگ تھی اور ایک ثابت شدہ دعویٰ اور بے اصل بات کا مقابلہ تھا۔ قرآن کی دعوت دلوں کو اپیل کرنے والی تھی، اس کا نظریہ جاندار تھا اور جو نظریات اس کا مقابلہ کر رہے تھے ان میں کوئی جان نہیں تھی چنانچہ سخت مخالفت کے باوجود قرآن کی دعوت پھیلنے لگی۔ لوگ ہر طرف سے کھنچ کر اس کی طرف آتے رہے، حتیٰ کہ دشمن کے گھروں سے اس کے حامی پیدا ہونے شروع ہوئے اور خدا کا کلمہ بلند کرنے کے لیے باطل کی صفوں سے سپاہی ملنے لگے ۔

خدا پرستی کی اس دعوت سے حالات میں زبردست تلاطم پیدا ہوا، جو لوگ اس دعوت کا ساتھ دے رہے تھے ان پر ہر طرف سے مصیبت کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ دوست دشمن بن گئے، محبت نفرت میں بدل گئی، جن لبوں پر مسکراہٹ تھی ان پر خشونت کے آثار ظاہر ہونے لگے، اور کفر کی طاقتیں پوری طرح ان کے خلاف صف آرا ہو گئیں۔ بھائی کے ہاتھ سے بہن چوٹ کھا رہی تھی، ماں باپ بچہ کے درپئے آزار تھے، بیوی شوہر کے ظلم کا نشانہ بنی ہوئی تھی۔ ایک عزیز دوسرے

عزیز کے شکنجے میں کسا ہوا تھا، لیکن قرآن کی دعوت جن کے دلوں میں اتر چکی تھی وہ زخم پر زخم کھا رہے تھے اور مسکرا رہے تھے، دشمن تیر آزما رہا تھا اور وہ اپنا سینہ آزما رہے تھے، تپتی ہوئی ریت پر انھیں گھسیٹا جاتا، جلتے ہوئے کوئلوں پر انہیں لٹایا جاتا لیکن اُن کے پائے ثبات میں لغزش نہ آتی۔ پرندے ٹھنڈے سایہ میں پناہ لے سکتے تھے لیکن ان کے لیے کوئی سایہ نہیں تھا، جنگل کے جانور آزادی سے گھومتے تھے لیکن ان کے پاؤں میں بیڑیاں تھیں۔ یہ حق پرست تھے اور دنیا انہیں جرمِ حق پرستی کی سزا دے رہی تھی۔ انھوں نے یہ سمجھ کر قرآن کی دعوت کو قبول کیا تھا کہ کوئی چیز اب ان کی اپنی نہیں رہی بلکہ خدا کی ہوگئی اور جہاں خدا کا حکم ہوگا وہاں وہ اسے بے دریغ صرف کریں گے۔ خدا کو خوش کرنے کے لیے انھوں نے اپنے آپ کو بیچ دیا تھا، وہ اپنی جان کی قیمت وصول کر چکے تھے، اس لیے انہیں اس کی کوئی پروا نہیں تھی کہ موت کس وقت آتی ہے اور کس حالت میں آتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی دعوت کا ساتھ وہی شخص دے سکتا ہے جسے زندگی سے زیادہ موت پیاری ہو، جسے بیوی بچوں سے زیادہ خدا سے اور اس کے دین سے محبت ہو، جو حق کی خاطر رشتوں پر چھری چلا سکتا ہو، جو اپنے چلتے ہوئے کاروبار کو نقصان پہنچا سکتا ہو، اور جو اپنے چین اور سکون کو قربان کرنے کے لیے تیار ہو۔ لیکن جس شخص کو جان و دل عزیز ہوں، جو تعلقات میں گرفتار ہو، جو سلامتی کا طالب اور سکون کا جویا ہو اور جسے اپنے کاروبار اور مال و دولت سے محبت ہو وہ کبھی قرآنی دعوت کے تقاضے پورے نہیں کر سکتا۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ	(اے محمدؐ) ان سے کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ
وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَ	اور تمہارے لڑکے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں
عَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ اقْتَرَفْتُمُوْهَا	اور تمہارے خاندان و قبیلے کے لوگ اور وہ مال و دولت
وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ	جسے تم نے حاصل کیا ہے اور وہ تجارت جس کے ماند
مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ	پڑ جانے کا تمہیں خوف ہے اور وہ مکانات جن کو تم
مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ	پسند کرتے ہو۔ اگر اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ
سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ	میں جہاد سے زیادہ تمہیں محبوب ہیں تو اس بات کا انتظار
اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى	کرو کہ خدائے تعالیٰ اپنا فیصلہ تم پر نافذ کر دے
الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ؀	اور یہ واقعہ ہے کہ اللہ فاسق انسانوں کو سیدھی راہ
(التوبۃ: ۲۴)	نہیں دکھاتا۔

قرآن نے اپنے ماننے والوں سے کہا کہ حق کی راہ کوئی نئی راہ نہیں ہے۔ اس راہ پر تمہیں پیغمبروں اور ان کے جانشینوں کے نقوشِ قدم ملیں گے یہی نقوش تمہارے لیے اسوہ ہیں۔ انھوں نے اپنا سب کچھ لٹا دیا لیکن حق کی راہ سے پیچھے نہ ہٹے۔ جب اسی راہ پر تمہیں چلنا ہے اور اس کے سوا کوئی دوسری راہ تمہارے لیے نہیں ہے تو پھر راہ کی مسافت کے بارے میں کیوں پوچھتے ہو۔ جب تمہاری راہ ہی سنگلاخ ہے تو آبلہ پائی کی شکایت کیوں کرتے ہو۔ جب خار دار وادی میں قدم رکھا ہے تو کس لیے کانٹوں کا شمار کرتے ہو؟ جب تم نے ایمان کا دعویٰ کیا ہے تو تمہیں زبان پر حرفِ شکایت لانے کی اجازت نہیں ہے۔ اس راہ میں منزل تک پہنچنے کے لیے بے پایاں اور انتہائی ایثار و قربانی کی ضرورت ہے۔ جس شخص کو دنیا کی ہر دل کشی اور نفس کی ہر تمنا اپنی طرف کھینچتی ہو وہ منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔ حق تم سے جاں نثاری کا مطالبہ کرتا ہے اور تم ٹھوکروں سے گھبراتے ہو۔ بس نہ تو اس کے نفس کی خواہشات رکاوٹ بن سکتی ہیں، نہ بیوی بچے، نہ مال و دولت اور نہ جاہ و اقتدار۔ یہ سب کے ایمان کے منافی ہے اور رہروانِ حق کے طریقے کے خلاف ہے۔ موت کا ایک وقت معین ہے اور اس وقتِ معین پر موت آکر رہے گی، تو پھر کیوں نہ انسان خدا کی راہ میں مرے۔ زندگی ایک سرمایہ ہے۔ اس سے انسان 'ثوابِ دنیا' بھی خرید سکتا ہے اور 'ثوابِ آخرت' بھی۔ زہے نصیب جو آخرت کی طلب میں اپنی دنیا کو برباد کر دے کہ کل اسی کے حصے میں خدا کی تمام نعمتیں آنے والی ہیں۔

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ	کوئی نفس اللہ کے حکم کے بغیر مر نہیں سکتا۔ موت
اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا	کا وقت مقرر لکھا ہوا ہے پس جو شخص ثوابِ دنیا کا
وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ	خواہشمند ہوگا اسے ہم اسی میں سے دیں گے اور جو شخص
مِنْهَا وَسَنَجْزِى الشّٰكِرِيْنَ ۝ وَ	ثوابِ آخرت چاہے گا اسے آخرت کا ثواب دیں گے اور
كَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ	شکر کرنے والوں کو یقیناً ان کے شکر کا بدلہ عطا کریں گے۔
رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ فَمَا وَهَنُوْا	کتنے ہی ایسے نبی گزرے ہیں کہ اللہ والوں نے ان کے
لِمَا اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	ساتھ دشمنوں سے جنگ کی اور خدا کی راہ میں انہیں
وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا	جو کچھ تکلیف پہنچی اس سے نہ وہ کم ہمت ہوئے اور نہ
وَاللّٰهُ يُحِبُّ	ضعف و ناتوانی کا مظاہرہ کیا اور نہ انھوں نے دشمن
الصّٰبِرِيْنَ ۝	کے مقابلہ میں عاجزی اختیار کی اور اللہ صبر کرنے والوں

کو پسند کرتا ہے ۔ (آلعمران: ۱۴۶)

جن لوگوں نے قرآن کی دعوت قبول کی تھی انھوں نے اس یقین کے ساتھ اسے قبول کیا تھا کہ دنیا و آخرت کی کامیابی قرآن کی دعوت کے ساتھ وابستہ ہے۔ حق وہ ہے جسے قرآن حق کہے اور جسے قرآن باطل کہے وہ باطل ہے۔ نجات اس راہ میں ہے جو قرآن پیش کرتا ہے اس کے خلاف جتنی راہیں ہیں سب منزل سے بھٹکانے والی ہیں۔ یہ یقین ان کا اصل سرمایہ تھا، اسی یقین کے ذریعہ وہ باطل کا مقابلہ کر رہے تھے۔ آزمائشیں اپنی حد کو پہنچ گئیں لیکن ان کے یقین کو بدل نہ سکیں، باطل نے اپنی پوری قوت صرف کر دی لیکن انہیں اپنے سامنے جھکا نہ سکا۔ ان کے سامنے خدا کے وفادار بندوں کے پُرعزم حالات تھے، ان کی سرفروشی و جاں نثاری کے کارنامے تھے، اور ان کی وفاداری اور عزیمت کی تاریخ تھی، چنانچہ وہ اپنا سب کچھ اس دعوت کے لیے لٹا رہے تھے لیکن اس کے باوجود انہیں یہ احساس ستا رہا تھا کہ ابھی وفاداری کا حق ادا نہیں ہوا ہے۔

قرآن کے ماننے والوں کے سامنے ایک عظیم مقصد تھا۔ وہ بہت بڑا کام کرنے اٹھے تھے، ان پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی تھی کہ وہ اس دین کی گواہی دیں جس دین کو انھوں نے دینِ حق سمجھ کر قبول کیا ہے، اور اس دعوت کو عام کریں جو خدا کی طرف سے انہیں ملی ہے۔ ان سے کہا گیا کہ دنیا خدا کو بھولی ہوئی ہے جاؤ اسے خدا کی یاد دلاؤ، لوگ اپنے انجام سے بے خبر ہیں اٹھو انہیں اپنے انجام سے آگاہ کرو، انسان ہلاکت کی طرف بڑھ رہا ہے لپکو اسے ہلاکت سے بچاؤ، دنیا سے عدل و انصاف مٹ رہا ہے دوڑو اسے زندہ کرو، معروف ختم ہو رہا ہے اور منکر پھیل رہا ہے، تمہاری ذمہ داری ہے کہ معروف کو قائم کرو اور منکر کو بدل دو۔

یہ سارے انسان ایک امت اور ایک گروہ تھے، اس امت کا ہر فرد وہی کام کر رہا تھا جو پوری امت کر رہی تھی اور امت وہی کام انجام دے رہی تھی جو فرد انجام دے رہا تھا۔ یہ تاجروں کا گروہ نہیں تھا جو اپنی تجارت کو فروغ دینے کی کوشش کرتا، یہ سرمایہ داروں کا گروہ نہیں تھا کہ اسے اپنا سرمایہ بڑھانے کی فکر ہوتی، یہ وقت کے اقتدار سے اپنے 'حقوق' نہیں چاہ رہا تھا، یا اپنے 'مفادات' کے تحفظ میں نہیں لگا ہوا تھا۔ یہ خدا کے دشمنوں سے کسی مصالحت کا خواہشمند نہیں تھا۔ بلکہ یہ خدا کے وفاداروں کا گروہ تھا، مومن و مسلم انسانوں کا گروہ تھا یہ خدا پرستوں اور خدا کو چاہنے والوں کا گروہ تھا جو دنیا کو خدا پرستی کی دعوت دینے اٹھا تھا، اس کے سامنے سوائے اس کے اور کوئی مسئلہ نہیں تھا کہ خدا کے بندوں تک خدا کا دین پہنچانے۔ وہ اپنی جد و جہد میں اسسے کم پر تیار نہ تھا کہ انسان غیر اللہ کی بندگی کو چھوڑ کر خدا کی بندگی قبول کرلے۔ اس گروہ کا ہر فرد خدا کا سپاہی تھا جو خدا کے دین کو غالب و سربلند کرنے کے جذبے

سے سرشار تھا، وہ اسی مقصد کے لیے جی رہا تھا اور اسی مقصد پر جان دے رہا تھا۔ اس کے بارے میں خدا کا فیصلہ تھا

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ (آل عمران: ۱۱۰)	تم بہترین امت ہو جسے لوگوں (کی ہدایت و رہنمائی) کے لیے وجود میں لایا گیا ہے۔ تم معروف کا حکم دیتے ہو اور منکر سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

قرآن کی دعوت کو شروع ہوئے تیرہ سال کی مدت گزر چکی تھی، خدا کا نام لینے والے چوٹ کھائے ہوئے جسم اور زخمی دست و بازو کے ساتھ حق کی گواہی دے رہے تھے، وہ سراپا مظلوم تھے۔ انھوں نے کسی پر ظلم نہیں کیا تھا، کسی کا مال نہیں چھینا تھا، کسی کے ساتھ بدسلوکی نہیں کی تھی، کسی کی عزت و آبرو پر حملہ نہیں کیا تھا، کسی کو اذیت نہیں پہنچی تھی، وہ خدا کے بندے تھے اور ان کا 'گناہ' صرف یہ تھا کہ وہ اپنے بندۂ خدا ہونے کا اعلان کر رہے تھے، اور دوسروں کو بندگی کی دعوت دے رہے تھے۔ خدا نے انہیں حکم دیا کہ اب ظالموں کی بستی چھوڑ دیں، چنانچہ انھوں نے اپنی وہ بستی چھوڑ دی۔ جس کے در و دیوار سے انہیں محبت تھی، جس کے پہاڑوں اور چشموں سے انہیں محبت تھی، جس کے گلی کوچوں سے محبت تھی، جس کی خاک کے ذروں اور ہوا کے جھونکوں سے محبت تھی۔ انھوں نے ایک نئی بستی کو اپنا وطن بنایا اور نئے انسانوں کے درمیان خدا کے دین کو پھیلانے لگے۔ وہ آزمائش کی بھٹی سے گزار کر کندن بنائے گئے تھے۔ خدا کے دین کو سربلند کرنے کے لیے جس قسم کے انسانوں کی ضرورت تھی وہ اس قسم کے انسان تھے، ان کے سینے خدا کی یاد سے بھرے ہوئے تھے اور ان کے چہروں پر آثارِ عبودیت نمایاں تھے۔ وہ اپنے خیالات میں دوسروں کے خیالات سے، اپنے اخلاق میں دوسروں کے اخلاق سے، اپنی سیرت میں دوسروں کی سیرت سے اور اپنے اعمال میں دوسروں کے اعمال سے بالکل مختلف تھے۔ قرآن نے ان برگزیدہ نفوس سے کہا کہ اب وقت آگیا ہے کہ زمانہ کی رفتار بدل دی جائے، ظالم کے ہاتھ سے تلوار چھین لی جائے اور عدل و انصاف کی حکومت قائم کی جائے۔ اب خدا کا نام لینا جرم نہ ہوگا۔ اب اس کے غلام ستائے نہ جائیں گے، اب وہ اپنے گھر سے بے گھر نہ ہوں گے۔ اب ان پر خوف و ہراس کا عالم نہ رہے گا۔ اب حق کی مظلومیت باقی نہ رہے گی اور اب دینِ حق کی فتح و نصرت کا کارنامہ انجام پائے گا۔ اٹھو اپنے ہاتھوں سے یہ کارنامہ انجام دو۔ دنیا تمہاری منتظر ہے اور خدا تمہاری مدد کے لیے تیار ہے۔

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ	وہ اہلِ حق جن سے کافر لڑ رہے ہیں انہیں اجازت

بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ ۝ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ (الحج: ۳۹، ۴۰)

دے دی گئی کہ وہ بھی کافروں سے جنگ کریں کیونکہ ان پر ظلم کیا گیا ہے اور یقیناً اللہ ان کی مدد کی قدرت رکھتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیے گئے۔ ان کا جرم بجز اس کے کچھ نہیں ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ اللہ ہمارا رب ہے۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْیَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِیْرًا (النساء: ۷۵)

اور تم خدا کی راہ میں کیوں نہیں لڑتے جب کہ بے بس اور کمزور مرد، عورتیں اور بچے کہہ رہے ہیں کہ خدایا ہمیں اس بستی سے نکال دے جس کے باشندے ہم پر ظلم کر رہے ہیں اور اپنی طرف سے ہمیں کوئی سرپرست عطا فرما اور اپنی (ہی) طرف سے ہمارا کوئی مددگار پیدا کر دے۔

یہاں سے ایک نئی جنگ کا آغاز ہوا۔ اب ان لوگوں کو تلوار اٹھانے کی اجازت دی گئی جو رات کے راہب اور دن کے شہسوار تھے، جو خدا کا کلمہ بلند کرنے کے لیے میدان میں آئے تھے اور جو اس کے دین کی حمایت کے لیے اٹھے تھے۔ دنیا صرف یہی جانتی تھی کہ مال و دولت کے لیے لڑائی ہوتی ہے، حقوق منوانے کے لیے جھگڑے ہوتے ہیں، عداوت اور دشمنی کی وجہ سے خوں ریزیاں ہوتی ہیں، ملکوں کے فتح کرنے کے لیے جنگ کی جاتی ہے لیکن وہ خدا پرستی کی خاطر جنگ سے ناآشنا تھی، وہ نہیں جانتی تھی کہ خدا کا دین قائم کرنے کے لیے بھی جنگ کی جاتی ہے، کفر و شرک کو مٹانے اور فتنہ و فساد کو ختم کرنے کے لیے بھی جنگ کی جاتی ہے۔ اب یہی جنگ لڑی جا رہی تھی۔ یہ پاک مقصد کے لیے پاک سیرت انسانوں کی جنگ تھی، یہ خدا کا نام لینے والوں اور شیطان کے داعیوں کے درمیان جنگ تھی۔ اس جنگ میں ایک طرف خدا کے دوست تھے اور دوسری طرف خدا کے دشمن، ایک طرف حق کا غلبہ چاہنے والے تھے اور دوسری طرف باطل کا غلبہ چاہنے والے۔ ایک طرف اخلاق کے علم بردار تھے اور دوسری طرف بداخلاقی پھیلانے والے۔ ایک طرف آخرت کے طالب تھے اور دوسری طرف دنیا کے پرستار۔ خدائے تعالیٰ کا وعدہ تھا کہ اس جنگ میں اس کے دوست کامیاب ہوں گے اور اس کے دشمن ناکام۔ چنانچہ خدا کا وعدہ پورا ہوا اور دنیا کی کوئی طاقت اس کی راہ میں مزاحم نہ ہو سکی۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْا اَوْلِيَاءَ الشَّيْطٰنِ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا (النساء: ۷۶)

جو لوگ ایمان رکھتے ہیں وہ خدا کی راہ میں لڑتے ہیں اور خدا کا انکار کرنے والوں کی لڑائی طاغوت کی راہ میں ہوتی ہے تو اے ایمان والو تم شیطان کے ساتھیوں سے جنگ کرو (یقیناً تم کامیاب رہوگے) کیونکہ شیطان کی تدبیر بہت کمزور ہے۔

اس طرح دعوتِ حق کا کمزور پودا پوری تیز رفتاری کے ساتھ ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر گیا جس کے سایے میں بے شمار انسانوں کو پاکیزہ زندگی ملی، سکون اور چین ملا، اور حق پرستی و تقویٰ سے حق کی جو آواز بلند ہوئی وہ آہستہ آہستہ پورے جزیرہ نمائے عرب میں گونجنے لگی۔ آزمائش کا دور ختم ہوا، حکومت و اقتدار کا دور آیا، خوف کی حالت ختم ہوئی اور امن کی زندگی نصیب ہوئی۔ باطل کا زور ٹوٹ گیا اور خدا کے دین پر عمل کرنا آسان ہو گیا۔ دعوتِ حق کا یہ کام تئیس سال کی مدت میں خدا کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہاتھوں انجام پایا۔ اور جب بھی یہ کام انجام پا سکتا ہے تو ایسے ہی انسانوں کے ذریعہ انجام پا سکتا ہے۔ جب یہ کام ختم ہو چکا تو خدا کی طرف سے تکمیلِ دین اور اتمامِ نعمت کا اعلان ہو گیا اور حقیقت یہ ہے کہ انسان کے لیے اس سے بڑی نعمت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔ المائدہ (آج کافر تمہارے دین سے مایوس ہو چکے ہیں تو تم ان سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین کو مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کیا ہے۔)

احتساب

عبادت کوئی بھی ہو، اگر روحِ عبادت سے خالی ہے تو بے جان ڈھانچہ ہے۔ روزوں کی روح ' احتساب ' ہے۔ یعنی اس بات کی کڑی نگرانی کہ روزے ٹھیک ٹھیک اس طریقے پر ادا ہوں جس× کی تعلیم رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔ نیت سے لے کر افطار تک اور افطار سے لے کر سحر تک، ہر اس چیز پر عمل کیا جائے جس کی ممانعت ہے۔ جن روزوں میں احتساب کی روح دوڑتی ہے انہیں سے وہ تقویٰ حاصل ہوتا ہے جو روزوں کی غرض و غایت ہے۔

× کا خلاصہ یہ ہے اور وہ ہر اس چیز سے اجتناب کیا جائے [illegible]

نماز اور خشوع و خضوع

(مولانا مجیب اللہ ندوی)

نماز کے صحیح اور عند اللہ مقبول ہونے کے یوں تو بہت سے ارکان و شرائط اور آداب و اصول ہیں مگر ان سب کی حیثیت یکساں نہیں ہے۔ بعض کی حیثیت اصل کی ہے اور بعض کی فرع کی، بعض ان میں جڑ کی حیثیت رکھتے ہیں اور بعض برگ و بار کی، لیکن نماز میں جس چیز کو سب سے زیادہ مرکزی حیثیت حاصل ہے اور جس کے گرد دوسرے سارے ارکان گردش کرتے ہیں وہ "کیفیتِ خشوع" ہے۔ اس کو نماز سے وہی تعلق و نسبت ہے جو روح کو جسم سے اور غذا کو زندگی سے ہے۔ جس طرح ایک جسم روح کے بغیر مٹی کا ڈھیر اور غذا کے بغیر کمزور و بے قوت ہو جاتا ہے اسی طرح جو نماز "کیفیتِ خشوع" سے خالی ہو بارگاہِ قدوس میں اس کی کوئی قیمت اور اہمیت نہیں

پھر اس حیثیت سے غور فرمایئے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کو دین کا ستون فرمایا ہے۔ یعنی یہ ستون جتنا مضبوط، عمدہ، اور خوشنما ہوگا دین کی عمارت اتنی ہی مضبوط اور مستحکم ہوگی اور یہ ستون جتنا کمزور اور بودا ہوگا اسی اعتبار سے دین کمزور رہوگا جس طرح کاغذ یا دفتی کے بہت خوبصورت ستونوں پر کوئی پختہ عمارت اٹھائی نہیں جا سکتی اسی طرح وہ نماز جو بغیر خشوع کے پڑھی گئی ہے اس پر نہ تو دین کی کوئی مضبوط عمارت تعمیر ہو سکتی ہے اور نہ دنیا و آخرت میں وہ ثمرات مل سکتے ہیں جن کا وعدہ خدائے لم یزل نے فرمایا ہے۔ کاغذ کے ستون پر کاغذ ہی کی عمارت بنے گی اور گارا اور اینٹ سے بنے ہوئے ستونوں پر پختہ اور پائیدار اور بلند عمارت تعمیر ہوگی۔

ہم کو قرآن و حدیث اور فقہ و تصوف کی روشنی میں اس کی حقیقت، ماہیت، اہمیت و فضیلت اور اس کے حصول کے ذرائع معلوم کرنا چاہئیں، اس کے بعد یہ دیکھنا چاہیے کہ اس صفت سے متصف ہونے والوں کے اللہ تعالیٰ کے نزدیک کیا کیا مقامات و درجات ہیں۔

خشوع کے معنی خشوع کے معنی بدن کا جھکنا، آواز پست ہونا، نظر کا نیچی ہونا اور قلب میں خوف کا پیدا ہونا۔ (لسان العرب) یعنی ہر عضو سے عجز و انکسار کا اظہار ہو۔ قرآن نے خشوع کو ان تمام

میں استعمال کیا ہے۔

لَوْ أَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْآنَ عَلٰى	اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو تو
جَبَلٍ لَّرَأَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا	اس کو دیکھتا کہ وہ خدا کے خوف سے دب جاتا۔
وَخَشَعَتِ الْأَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ	اور تمام آوازیں اللہ کے سامنے (اس کے ہیبت کے)
فَلَا تَسْمَعُ إِلَّا هَمْسًا	پست ہو جائیں گی پس تو بجز پاؤں کے آہٹ کے کچھ نہ سنے گا

مگر یہ سب خشوع کے مظاہر ہیں، خشوع کا اصلی مقام قلب ہے اعضاء و جوارح سے اس کا تعلق قدر ہے کہ قلب کی اس کیفیت کا اظہار انہی کے ذریعہ ہوتا ہے۔ قلب میں خشوع وخضوع، جلال کی جو کیفیت پیدا ہوگی اعضاء سے لامحالہ اس کا اظہار ضرور ہوگا۔ ایک شخص نماز کھیل رہا تھا۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو فرمایا:-

لَوْ خَشَعَ قَلْبُهٗ لَخَشَعَتْ	اگر اس کے دل میں خوف ہوتا تو اس کے
جَوَارِحُهٗ	اعضاء سے خشیت ظاہر ہوتی۔

بعض علماء نے خشوع کی تعریف میں لکھا ہے:-

(اَلْخُشُوْعُ) هو معنًى يقوم	خشوع ایک ایسی کیفیت ہے کہ جو دل میں قائم ہو جاتی
بالنفس يظهر عنه سكون	ہے تو اس کی وجہ سے اعضاء سے بھی سکون و طمانینت
فی الاطراف	ظاہر ہونے لگتی ہے۔

حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:-

اَلْخُشُوْعُ قيام القَلْب بين	خشوع یہ ہے کہ بارگاہ قدس میں دل کو عجز و نیاز
يدى الرب بالخضوع والذل والجمعية عليه	اور جمعیت و سکون سے حاضر رکھا جائے۔

حافظ ابن رجب حنبلی فرماتے ہیں:-

اصلُ الخشوع هو لين القلب	خشوع اصل میں قلب کی نرمی، اس کی رقت،
ورقته وخضوعه وانكساره وحرقته	اس کے جھکاؤ اور انکسار اور اس کی سوزش کا نام ہے
فاذا خشع القلب تبعه خشوع جميع	جب قلب خاشع ہوتا ہے تو تمام اعضاء و جوارح پر
الجوارح والاعضاء لانها تابعة	اس کا اثر ہوتا ہے اس لیے کہ اعضاء قلب کے تابع ہوتے

لھا کما قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم " الا و ان فی الجسد مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کلہ واذا فسدت فسد الجسد کلہ الا وھی القلب "

ہیں جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "خبردار جسم میں ایک گوشت کا ٹکڑا ہوتا ہے جب وہ درست رہتا ہے تو سارا جسم درست رہتا ہے اور جب وہ خراب ہو جاتا ہے تو سارے جسم پر اس کا اثر پڑتا ہے۔ خبردار کہ یہ قلب ہے۔

خشوع کا پورا مفہوم کسی ایک لفظ سے ادا نہیں کیا جا سکتا اس کو اس طرح سمجھیے کہ اگر آپ کسی پُرہیبت و پُرجلال شخص کے سامنے کھڑے ہو جائیں تو اس وقت آپ کے ذہن و دماغ پر جو اثر مرتب ہوگا، یا جو کیفیت طاری ہوگی اسی کو عربی میں خشوع کہتے ہیں۔ نماز میں بندہ اپنے سب سے بڑے مالک الملک کے سامنے کھڑا ہوتا ہے اس سے زیادہ پُرہیبت و باجبروت ہستی کون سی ہو سکتی ہے اس لیے اس کے ذہن و جسم، قلب و دماغ پر اس وقت اس کیفیت کا طاری ہونا یا طاری کرنا لازمی ہے۔ عبادت کا سب سے بڑا مقصد یہی ہے کہ جب عبد اپنے معبود کے سامنے کھڑا ہو تو اس کی ہر ادا سے عبدیت کا اظہار ہو اور اس عبدیت کا سب سے بڑا مظہر اور تقاضا قلب و دماغ کا عجز و نیاز اور تواضع اور خاکساری ہی ہے

نماز میں جن لوگوں پر یہ کیفیت طاری ہوتی ہے اور جو اس صفت سے متصف ہوتے ہیں خدا نے انھیں کے لیے دین و دنیا کی فلاح و کامیابی اور جنت الفردوس کا وعدہ فرمایا ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلٰوتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ٥ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ الَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ٥

یقیناً ان مسلمانوں نے فلاح پائی جو اپنی نماز میں خشوع و خضوع رکھتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ وارث ہونے والے ہیں جو جنت الفردوس کے وارث ہوں گے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

اس آیت کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں:۔

خاشعون خائفون ساکنون

خاشعین فی الصلوٰۃ وہ لوگ ہیں جن کا دل خشیت الہی سے لبریز اور جسم پر سکون و طمانینت طاری ہو۔

حضرت ابوالدرداء اس کی تفسیر کے سلسلے میں فرماتے ہیں:۔

اعظام المقام واخلاص المقال	جب اس کے سامنے کھڑا ہوا جائے تو اس کی
والیقین التام وجمع الاہتمام	عظمت سے دل معمور ہو، جو اس سے کہا جا رہا ہو اس میں
یتبع ذالک ترک	اخلاص ہو، دل الیقین کی دولت سے مالا مال ہو، جمعیت
الالتفات ۔	خاطر، اور اہتمام ہو۔ پھر اسی کے ضمن میں ترکِ التفات ہو

ایک دوسری جگہ قرآن میں جہاں مومنین کی بہت سی صفات بیان کی گئی ہیں اور جن سے متصف ہونے والوں
ے لیے جنت کا وعدہ کیا گیا ہے۔ ایک صفتِ خشوع بھی ہے۔

وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ	صبر کرنے والے مردوں اور صبر کرنے وا
وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ اَعَدَّ	عورتوں اور خشوع رکھنے والے مردوں اور خشوع رکھنے
اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝	عورتوں کے لیے اللہ نے مغفرت اور اجرِ عظیم تیار کر

بعض لوگوں پر یہ کیفیت صرف نماز ہی میں طاری نہیں رہتی بلکہ ہر وقت طاری رہتی ہے، جہاں محبوب ...
ٹرا اُن کا دل خشیت سے بھر گیا، جہاں اس کا کلام پڑھا گیا وہ سن کر لرزہ براندام ہو گئے اور آنکھیں بھر آئیں
ٹد تعالیٰ انھیں کے بارے میں فرماتا ہے۔

اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ	جب ان کے سامنے خدا کا کلام پڑھا جاتا ہے تو
لِلْاَذْقَانِ وَيَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ	وہ ٹھوڑیوں کے بل پر گر پڑتے ہیں اور سجدہ ریز ہو کر
خُشُوْعًا ۔	روتے و گڑگڑاتے ہیں اور قرآن اُن کا خشوع اور
	بڑھا دیتا ہے۔

سورۂ انبیاء میں متعدد انبیاء کے ذکر کے بعد اُن کے متعلق بھی یہی ارشاد ہے کہ

يَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّ رَهَبًا	اور وہ لوگ یعنی انبیاء امید و بیم کے ساتھ ہماری
وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ۝	عبادت کرتے ہیں اور ہمارے سامنے خاشع رہتے ہیں

شوع پیدا کرنے کے لیے کوشش و مجاہدہ مگر یہ کیفیت خود بخود پیدا نہیں ہو جاتی بلکہ اس کے لیے مسلسل مجاہدہ و ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب ذہن و جسم
ب و دماغ پر پورے طور پر اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی عظمت و جلال کا تصور چھا جائے گا اس وقت یہ مقام حاصل
گا چنانچہ صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کو اس کیفیت کی کمی پر عتاب کے انداز میں اس کے حاصل کرنے کی ترغیب

گئی ہے۔

اَلَمْ یَأْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ
کیا ایمان لانے والوں کے لیے اس بات کا موقع نہیں آیا کہ ان کے دل خدا کی خشیت اور وجود دین حق نازل ہوا ہے اس کے لیے جھک جائیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جس خشوع و خضوع کے ساتھ نماز پڑھتے تھے اس کا تصور بھی ہمارے لیے مشکل ہے، مگر اس کے باوجود ان کو کیفیت خشوع کے زیادہ سے زیادہ نہ بڑھانے پر عتاب کے انداز میں خطاب کیا گیا اس آئینہ میں ہم اپنی نمازوں کے ایک ایک خط و خال کو دیکھ سکتے ہیں

حضرت ابن مسعود اس آیت کی تفسیر کے سلسلے میں فرماتے ہیں :۔

ماکان بین اسلامنا و بین عتابنا اللہ تعالیٰ بھذہ الآیۃ الا اربع سنین
یعنی ہمارے قبول اسلام اور اس آیت کے ذریعہ خشوع نہ پیدا کرنے والوں کے بارے میں عتاب کے درمیان چار سال کا فصل ہوا۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں :۔

ان اللہ استبطأ قلوب المومنین فعاتبھم علی راس ثلاث عشرۃ سنین من نزول القرآن
پہلے اللہ نے مومنین کے قلوب کو اس کے لیے آہستہ آہستہ تیار کر دیا۔ پھر نزول قرآن کے تیرھویں برس یہ وعید فرمائی

برائیوں کے زہر سے بچنے کے لیے سب سے بڑا تریاق نماز ہے، انسان دنیا کے کاروبار میں لگا ہوتا ہے۔ اس کے خیالات پراگندہ ہوتے ہیں انہیں حالات میں جب وہ نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو اس کے دل و دماغ اور جسم و اعضا پر اچانک ایک قسم کی پابندی عائد ہو جاتی ہے۔ اس لیے نماز کی ادائیگی اس پر بڑی شاق ہو جاتی ہے لیکن جو لوگ اس کیفیت خشوع سے سرشار ہوتے ہیں تو ان کے لیے تمام دشواریاں آسان ہو جاتی ہیں

وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ وَاِنَّهَا لَكَبِیْرَۃٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِیْنَ الَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَیْهِ
اور مدد حاصل کرو صبر اور نماز سے اور بے شک وہ نماز دشوار ضرور ہے مگر جن کے قلوب میں خشوع ہو ان پر کچھ دشوار نہیں، خاشعین وہ لوگ ہیں جو یقین رکھتے ہیں اس کا کہ وہ بے شک اپنے رب

رَاجِعُوْنَ ○ ملنے والے ہیں اور اسی کی طرف وہ واپس جانے والے ہیں۔

اس آیت میں یہ بات قابل غور ہے کہ خاشعین کی صفت اَلَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُلٰقُوْ رَبِّهِمْ لائی گئی ہے جس سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نماز میں خشوع پیدا کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ بندے کے ذہن پر جزائے اعمال اور قیامت کی ہولناکیوں کا پورا تصور چھایا ہوا ہو اور اسے اس بات پر پورا یقین ہو کہ ایک دن اسے مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ جب تک یہ تصور اس کے ذہن پر چھایا ہوا نہ ہوگا۔ اس خشوع کی کیفیت کا پیدا ہونا مشکل ہے اس لیے کہ جب اس بات کا پورا اذعان و یقین ہو کہ اعمال صادر ہوتے ہیں ایک دن اُن کا محاسبہ ہوگا اور ہمیں اس کی جزا یا سزا ملے گی تو اس ہوگا کہ ہمارے ذہن پر عجز و نیاز خوف و خشیت کی کیفیت طاری ہوگی اور ہماری ساری اسی عمل کی طرف مبذول ہو جائے گی اور ہم کو محسوس ہوگا کہ ہم اپنے مالک الملک کے سامنے کھڑے ہیں اور اس کی روح یہی ہے کہ بندہ بالکل ماسوا سے کٹ کر پوری عبدیت کے ساتھ خدائے وحدہٗ لاشریک کے سامنے جھک جا

حدیث و آثار میں خشوع کی اہمیت

اوپر حدیث گزر چکی ہے کہ ایک شخص ایک مرتبہ نماز میں اپنی داڑھی سے کھیل رہا تھا تو یہ فعل چونکہ خشوع کے منافی تھا اس لیے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

لَوْ خَشَعَ قَلْبُهٗ لَخَشَعَتْ جَوَارِحُهٗ۔ اگر اس کا قلب خشوع سے متاثر ہوتا تو اس کے اعضاء پر بھی اس کے آثار نمایاں ہوتے۔

ایک مرتبہ جماعت کے ساتھ آپؐ نماز ادا فرما رہے تھے کہ کچھ لوگوں سے نماز میں ایسے افعال سرزد ہوئے جو خشوع کے منافی تھے۔ آپ نے نماز کے بعد ارشاد فرمایا۔

وَاللّٰهِ لَا یَخْفٰی عَلَیَّ رُكُوْعُكُمْ وَخُشُوْعُكُمْ[1] خدا کی قسم! مجھ سے تمہارا رکوع و خشوع پوشیدہ نہیں رہتا۔

مسند احمد میں فضیل بن عباس سے ایک روایت ہے جس سے خشوع کی پوری تفصیل سامنے آجاتی ہے آپؐ نے ارشاد فرمایا:۔

اَلصَّلٰوةُ مَثْنٰی مَثْنٰی تَشَهُّدٌ رات کی نماز دو دو رکعت پڑھو اور پھر چاہیے

---

[1] بخاری باب الخشوع فی الصلوٰۃ

فِي كُلِّ رَكْعَتَيْنِ وَتَضَرَّعٌ وَتَخَشَّعٌ وَتَمَسْكَنٌ ثُمَّ تُقْنِعُ يَدَيْكَ إِلَى رَبِّكَ تَقُولُ يَا رَبِّ يَا رَبِّ فَمَنْ لَمْ يَفْعَلْ ذَالِكَ فَقَالَ فِيهِ قَوْلًا شَدِيدًا[1]

کہ ہر دو رکعت پر تشہد پڑھو اور گریہ وزاری اور خشوع وخضوع کے ساتھ اپنے رب سے ہاتھ اٹھا کر کہو "اے میرے پروردگار! اے میرے پروردگار!" اور جو شخص ایسا نہیں کرتا رسول اکرمؐ نے ان کے بارے میں بڑی سخت وعید فرمائی ہے۔

اس حدیث کی تشریح میں ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ لفظ "تخشع" سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی کے اندر یہ کیفیت پیدا نہ ہو تو بہ تکلف اسے یہ کیفیت پیدا کرنی چاہیئے[2]۔ ایک حدیث میں ہے:۔

لَا صَلٰوةَ لِمَنْ لَمْ يَتَخَشَّعْ[3]

جو شخص نماز میں خشوع پیدا کرنے کی کوشش نہ کرے تو اس کی نماز نہیں ہوتی۔

دوسری روایت میں ہے کہ قیامت کے قریب جو چیز دلوں سے سب سے پہلے اٹھالی جائے گی وہ "خشوع" ہے۔

أَوَّلُ شَيْءٍ يُرْفَعُ مِنْ هٰذِهِ الْأُمَّةِ الْخُشُوعُ حَتّٰى لَا تَرٰى فِيهَا خَاشِعًا

اس امت کے دلوں سے جو پہلی چیز اٹھالی جائے گی وہ خشوع ہے۔ یہاں تک کہ تم لوگوں میں کوئی خاشع نہ دیکھو گے

اب انتہائی شرمندگی کی بات ہے کہ یہ کیفیت عوام کا کیا ذکر خواص کی نمازوں سے بھی مفقود ہوتی جا رہی ہے آج واقعی قلب خاشع سے نماز پڑھنے والے کم ہی نظر آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی کوئی نعمت امت سے اسی وقت سلب کرتا ہے جب اس کی قدر کرنے والے باقی نہیں رہتے خدا نہ کرے کہ ہماری نمازیں اس سلب ورفع کا سبب بنیں۔ خشوع کی اسی اہمیت کی بنا پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قلب غیر خاشع سے ہمیشہ پناہ طلب فرمایا کرتے تھے۔

اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ قَلْبٍ لَا يَخْشَعُ وَعَيْنٍ لَا تَدْمَعُ

اے اللہ میں غیر خاشع قلب سے پناہ چاہتا ہوں اور اس آنکھ سے پناہ چاہتا ہوں جو یاد خدا میں پرنم نہ ہو۔

ذہن میں اس کیفیت کو بار بار تازہ رکھنے کے لیے آپ رکوع میں اکثر یہ الفاظ فرمایا کرتے تھے۔

خَشَعَ لَكَ سَمْعِي وَبَصَرِي وَمُخِّي وَعَظْمِي

اے اللہ! تیرے لیے میرے کان، آنکھیں دماغ اور ہڈیاں سب جھک گئے۔

---

[1] مسند فضیل بن عباس و ترمذی باب التخشع [2] الفتح الربانی [3] مسند الفردوس و الجامع الصغیر

ان روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں خود سراپا خشوع و خضوع ہوتے تھے اور صحابہ کرام کو بار بار اس کی ترغیب و تاکید فرمایا کرتے تھے اور ان کو اس کے سلب ہو جانے سے خوف دلایا کرتے تھے اور جو نماز خشوعِ قلب سے خالی ہو اس سے پناہ مانگا کرتے تھے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور خشوع

قرآن و حدیث کے احکام کے سامنے سرِ نیاز جھکا دینا کمالِ ایمان کی دلیل اور زندگی کی سب سے بڑی سعادت ہے۔ صحابہ کرام کی سب سے بڑی خصوصیت اور فضیلت یہی ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی زبان جس طرح سنتے تھے اپنی زندگی کو اسی کے مطابق ڈھال لیتے تھے۔ ادھر کوئی آیت نازل ہوئی ادھر سے اس کی تفسیر ہونے لگی۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ ارشاد فرمایا صحابہ نے اس کو عملی جامہ پہنا دیا۔ کوئی حکم صادر ہوا اور صحابہ اس کا نمونہ بن گئے اب ہم کو صحابہ کرام کی عملی زندگی میں اس کو ڈھونڈنا چاہیے ... چاہیے کہ ان کی نمازوں میں اس صفت خشوع کی کہاں تک کارفرمائی تھی اور ان کی پوری زندگی پر اس کا کیسا اثر تھا اور پھر غور کریں کہ اس سلسلے میں عملی تعلیمات کے علاوہ انھوں نے نظری تعلیمات کے کیا کیا نقوش چھوڑے ہیں۔

مجاہد روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لکڑی کا ایک ٹکڑا یا ستون ہے جو بے حس و حرکت کھڑا ہے۔ اس حالت کو دیکھ کر کہا کرتے تھے

وکان یقال ذالک الخشوع — اسی کو خشوع کہا جاتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے متعلق روایت ہے کہ جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ ایک کپڑا ہے جو زمین پر ڈال دیا گیا ہے۔ کانہ ثوب ملقیٰ۔ انھیں کے متعلق ایک دوسری روایت ہے

کان اذا قام الی الصلوٰۃ — جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تھے تو بدن آواز

فغض فیہا صوتہ ویدہ و بصرہ — آنکھ ہر چیز سے تواضع و خشوع و خضوع کا اظہار ہوتا تھا

حضرت عامر بن عبداللہ کے متعلق مروی ہے کہ وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے تھے اور لڑکیاں دف بجایا کرتی تھیں مگر ان کو بالکل خبر نہیں ہوتی تھی۔ حضرت عبداللہ بن سلام کے متعلق مشہور ہے کہ اُن پر ہر وقت آثارِ خشوع طاری رہتے تھے۔ علیہ آثار الخشوع حضرت حذیفہ فرمایا کرتے تھے۔

اول ما تفقدون من دینکم — تم اپنے دین کی سب سے پہلی جو چیز ضائع

الخشوع واٰخر ما تفقدون الصلوٰۃ تنقض الاسلام عروۃ عروۃ[1]

کروگے وہ خشوع ہے اور سب سے آخر میں نماز کی ظاہری صورت اسی طرح آہستہ آہستہ اسلام کی تمام بنیادی چیزیں ترک ہوجائیں گی۔

ایک دوسری روایت ہے:۔

وَرُبَّ مُصَلٍّ لَا خَیْرَ فِیْہِ اَوْشَکَ اَنْ تَدْخُلَ مسجدَ الجماعۃِ فَلَا تَرَیٰ فِیْہَا خَاشِعًا۔

بہت سے نمازیوں میں کوئی بھلائی نہیں ہوتی اور قریب ہی ایک زمانہ آئے گا کہ تم مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھوگے اور پوری جماعت میں ایک شخص خشوع رکھنے والا نہ ہوگا۔

حضرت عبادہ بن صامتؓ سے بھی اسی قسم کی ایک روایت ہے۔ حضرت عمرؓ نے ایک دن منبر پر کھڑے ہوکر فرمایا کہ ایک شخص ہے کہ اسلام کی حالت میں اس کے بال سفید ہوگئے ہیں مگر ایک وقت کی نماز بھی اس نے اللہ کے لیے مکمل نہیں پڑھی لوگوں نے پوچھا یہ کیسے؟ آپ نے فرمایا:۔

لا یتم خشوعھا و تواضعھا و اقبالہ علی اللہ عز وجل

وہ نماز میں پورے طور پر خشوع و خضوع پیدا نہیں کرتا اور نہ اپنی پوری توجہ اللہ کی طرف مبذول رکھتا ہے

صاحب اسرار نبوی حضرت حذیفہ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے ان ارشادات کی روشنی میں ہمیں اپنی نمازوں کا جائزہ لینا چاہیے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ہماری نمازوں کی تصویر کشی کی ہے۔

آخر میں ہم حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا ایک قیمتی قول نقل کرتے ہیں۔ جو وعدہ و وعید دونوں سے پُر ہے۔ حضرت سلمانؓ نے ایک بار فرمایا:۔

الصلوٰۃ مکیال فمن اوفی اوفی بہ ومن طفف فقد علمتم ما للمطففین

نماز ایک پیمانہ ہے جس نے اس سے پورا پورا ناپا اس کو پورا ناپ کر دیا جائے گا اور جس نے کم ناپا تو کم ناپنے والوں کی سزا تمہیں معلوم ہے۔

خشوع کا تعلق قلب سے ہے

اوپر عرض کیا گیا ہے کہ خشوع قلب کی ایک کیفیت کا نام ہے جسم و اعضا سے اس کا تعلق صرف اسی قدر ہے کہ وہ اس کیفیت کے مظاہر ہیں۔

حضرت عمرؓ نے ایک شخص کو دیکھا کہ گردن جھکائے نماز پڑھ رہا ہے آپ نے فرمایا :۔

یا صاحب الرقبۃ ارفع رقبتک — اے گردن نیچی کرنے والے اپنی گردن کو اٹھا

لیس الخشوع فی الرقاب انما الخشوع فی القلب — خشوع گردن کے اندر نہیں ہے، بلکہ وہ دل میں ہوتا ہے

یعنی خشوع کا تعلق قلب سے ہے اس میں تواضع و خاکساری اور عاجزی و مسکینی ہونی چاہیے محض گردن و جسم کے جھکانے اور توڑنے مروڑنے سے اس کا تعلق نہیں ہے ۔

حضرت عائشہؓ نے چند نوجوانوں کو دیکھا کہ وہ بیماروں کی طرح جھک کر چل رہے ہیں۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ یہ کون لوگ ہیں لوگوں نے کہا "نُسّاک" اور "زہاد" کہے جاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا :۔

کان عمر بن الخطاب اذا مشی — عمر بن خطابؓ جب چلتے تو تیز چلتے

اسرع واذا قال اسمع واذا ضرب — بولتے تھے تو بلند آواز سے کہ سامع سن

اوجع واذا اطعم اشبع وکان — سزا دیتے تو سخت سزا دیتے تھے اگر کھانا کھلاتے تھے

ھو الناسك حقا[1] — تو پیٹ بھر کھانا کھلاتے تھے اور وہ یقیناً ناسک (عابد) تھے

اگر کسی کے قلب میں خشوع وخضوع کی کیفیت نہ ہو محض اس کے اعضاء و جوارح حرکت کر رہے ہوں یا اس نے اپنے جسم کو خاشع بنا رکھا ہے مگر قلب میں اس کیفیت کا کوئی اثر نہیں ہے تو احادیث و آثار میں ایسے خشوع کو "خشوع نفاق" سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس سے پناہ مانگی گئی ہے ۔ ایک مرتبہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ۔

تَعَوَّذُوا بِاللهِ مِنْ خُشُوْعِ النِّفَاقِ — خشوع نفاق سے اللہ کی پناہ مانگو۔

صحابہ کرام نے پوچھا۔ یا رسول اللہ! خشوع نفاق کیا چیز ہے ۔ آپ نے ارشاد فرمایا :۔

خُشُوْعُ الْبَدَنِ وَنِفَاقُ الْقَلْبِ — بدن کا جھکا ہونا اور قلب کا اس کیفیت سے خالی ہونا

حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ خشوعِ نفاق سے بچو۔ لوگوں نے آپ سے دریافت کیا کہ "خشوع نفاق کیا ہے"؟ آپ نے فرمایا :۔

اَنْ تریٰ الجسد خاشعًا و — تم دیکھو کہ بدن سے تو خشوع کا اظہار ہو رہا ہو

القلبُ لیس بخاشعٍ[2] — مگر قلب میں خشوع نہ ہو تو سمجھ لو کہ یہ خشوع نفاق ہے

حضرت ابو درداءؓ سے بھی اسی قسم کی ایک روایت ہے کہ آپ نے ایک مرتبہ لوگوں سے کہا :۔

---

[1] مدارج السالکین ابن قیم [2] ایضاً

اِسْتَعِیْذُوْا بِاللّٰہِ مِنْ خُشُوْعِ النِّفَاقِ — خشوع نفاق سے اللہ کی پناہ مانگو۔

اس کا اندازہ نمازی کی پوری زندگی کے طرز عمل سے ہو جاتا ہے کہ اس کے قلب میں خشوع کی کیفیت پیدا ہوئی ہے یا نہیں لیکن ہمیں قطعی طور پر اس کے فیصلہ کا حق نہیں ہے اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔

حافظ ابن رجبؒ خشوع نفاق کی توضیح ان الفاظ میں فرماتے ہیں:۔

متی تکلف الانسان تعاطی	جب آدمی محض اعضاء وجوارح میں خشوع پیدا کرنے
الخشوع فی جوارحہ واطرافہ مع	کی کوشش کرے اور اس کا قلب اس سے خالی اور عاری
فراغ قلبہ من الخشوع وخلوّہ منہ کان ذالک خشوع	ہو تو یہ خشوع نفاق ہے جس سے سلف پناہ مانگا
نفاق وھو الذی کان السلف یستعیذون منہ	کرتے تھے۔

خشوع کے منافی افعال

اوپر بار بار ذکر آچکا ہے کہ خشوع وخضوع ایک قلبی کیفیت کا نام ہے، مگر اس قلبی کیفیت کے کچھ ایسے مظاہر بھی ہیں جن پر نمازی کی نگاہ ہونی چاہیئے اور اگر ان ظاہری باتوں کا خیال نہ کیا گیا تو خشوع وخضوع کی پوری کیفیت پیدا نہیں ہو سکتی ہے۔

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ انھوں نے مرض الموت میں نزع سے کچھ پہلے لوگوں سے کہا "مجھے بٹھاؤ" میرے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک امانت ہے میں اسے تم لوگوں تک پہنچا دینا چاہتا ہوں۔ پھر آپ نے یہ الفاظ فرمائے:

لا یلتفت احدکم فی صلوٰتہ فان	نمازی کو چاہیے کہ وہ نماز میں ادھر ادھر
کان لابد بہ فاعلا ففی غیر ما	متوجہ نہ ہو اگر اسے مجبوراً ایسا کرنا پڑے تو غیر فرض
افترض اللہ تعالیٰ علیہ ترک العبث	میں ایسا کر سکتا ہے اور کپڑے یا بدن سے نہ کھیلے
ثوبا او شیئا من جسدہ وانکلہا	اور اس کے علاوہ جتنی چیزیں خشوع کے منافی ہیں ان
منافاتہ للخشوع	سے گریز کرے۔

مستدرک حاکم میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام ابتدا میں نماز میں آسمان کی طرف نظریں اٹھایا کرتے تھے لیکن جب یہ آیت نازل ہوئی اَلَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ صَلٰوتِھِمْ خَاشِعُوْنَ جو اپنی نماز میں خشوع کرنے والے ہیں۔ تو اس کے بعد آپؐ اور صحابہ کرام نظریں سجدہ گاہ کی طرف رکھنے لگے اور سر کو اوپر اٹھانا، کمر وغیرہ پر ہاتھ رکھنا بھی چھوڑ دیا۔

مستدرک حاکم اور بیہقی کی ایک دوسری روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت خشوع

کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا :۔

الخشوع فی القلب وان تلین	خشوع کا مقام قلب ہے اور خشوع کا مظہر
کنفك للمرء المسلم و لا تلتفت فی	بھی ہو کہ مسلمانوں کے ساتھ تمہارا برتاؤ اچھا ہو اور
صلوٰتك	نماز میں ادھر ادھر نہ دیکھو ۔

اس سے معلوم ہوا کہ نماز میں ادھر اُدھر دیکھنا، کسی چیز سے شغل کرنا، اور اپنی توجہ کو دوسری طرف منعطف کرنا یہ سب خشوع کے منافی افعال ہیں اور اسی کے برعکس نگاہ نیچی رکھنا اپنی توجہ اللہ کی جانب کرنا، اعضاء پر طمانینت کی کیفیت طاری کرنا یہ سب اس کے مظاہر ہیں ۔

حضرت ام رومان فرماتی ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ نے ایک روز مجھے نماز میں ادھر اُدھر مائل ہو زور سے ایک کونچا دیا اور ڈانٹا کہ قریب تھا کہ میں اپنی نماز توڑ دیتی پھر انھوں نے کہا ۔

سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ	میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے
وسلم اذا قام احدکم فی الصلوٰۃ فلیسکن	کہ آپ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی نماز کے لیے کھڑا ہو تو
اطرافه ولا یتمیل تمیل الیهود فان	چاہیے کہ اپنے اعضاء کو پُر سکون رکھے ۔ یہود کی طرح نماز
سکون الاطراف فی الصلوٰۃ من	میں ادھر ادھر مائل نہ ہو اس لیے کہ اعضاء جوارح کا
تمام الصلوٰۃ	سکون ہی نماز کو مکمل بناتا ہے ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز حضرت علیؓ سے فرمایا :۔

انی احب لك ما احب لنفسی	میں جو اپنے لیے پسند کرتا ہوں وہ تمہارے لیے
لا تفرقع اصابعك وانت تصلی	بھی پسند کرتا ہوں ۔ نماز میں اپنی انگلیاں نہ چٹخایا کرو

صاحب بدائع و صنائع اس حدیث کے متعلق فرماتے ہیں : ۔ ان فیہ ترك الخشوع ۔ اس لیے کہ یہ فعل خشوع کے منافی ہے ۔

اس سے پہلے کہا جا چکا ہے کہ خشوع کا تعلق دل سے ہے ۔ مگر چونکہ اعضاء و جوارح سے اس قلبی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے اس لیے اعضاء و جوارح سے بھی کوئی ایسا فعل سرزد نہیں ہونا چاہیے جو اس قلبی کیفیت کے خلاف ہو بلکہ نماز میں سارے اعضاء پر وہی کیفیت طاری ہونی چاہیے جو ایک غلام پر آقا کے حضور میں عرضِ حاجت کے وقت ہوتی ہے قلب میں خدا کا خوف، ذہن حاضر، نظریں نیچی، اعضاء پُر سکون و پُر سکوت غرضیکہ سارے اعضاء سے ذلت و مسکنت، عاجزی و خاکساری

کے آثار نمایاں ہوں۔ حاجت اور دعا کے وقت تضرع وزاری اور افتقار والتجا کا پیکر بن جائے۔ بارگاہِ قدس میں آ کر روئے، گڑگڑائے جس طرح بچہ ماں سے جدا ہونے کے بعد روتا اور مچلتا ہے۔ اگر کسی شخص پر یہ کیفیت نہ طاری ہو تو بہ تکلف اس کے پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ انشاء اللہ کچھ دنوں کے بعد اس میں یہ صفت پیدا ہو جائے گی۔

خشوع کا تعلق پوری زندگی سے

"کیفیتِ خشوع" اپنی عبدیت کے اظہار اور خدائے تعالیٰ کی عظمت و برتری اور آخرت کی بازپرس کے شدید احساس سے پیدا ہوتی ہے مگر چونکہ اس کیفیت کا نشو ونما اور اس کی تازگی و بالیدگی نماز ہی کے ذریعہ ہوتی ہے اس لیے نماز میں اس کیفیت کے پیدا کرنے کی بار بار تاکید کی گئی ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے یہ کوئی لباس ہے جسے آدمی نماز کے وقت تو پہن لے اور نماز کے بعد اسے اتار کر پھینک دے بلکہ یہ ایک ایسی کیفیت ہے اور حالت کا نام ہے جس سے قلب کو کسی وقت خالی نہ ہونا چاہیے اسے زندگی کے ایک گوشے میں نہیں بلکہ پوری زندگی میں پھیلنا چاہیے تسلیم و رضا، انابت و خشیت عاجزی وانکساری، تواضع اور تذلل کی جو کیفیت نماز کے وقت مطلوب ہے وہی اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے کھاتے پیتے اور سوتے جاگتے ہونی چاہیے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی نشست کے بارے میں ایک صحابیہ بیان کرتی ہیں کہ:

رایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المتخشع فی الجلسۃ ارعدت من الفرق	میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خشوع اور عاجزی کے ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھا تو رعب سے کانپ اٹھی

قلب سے کسی آن اس کیفیت کے نکل جانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی عبدیت اور خدا کی معبودیت کے احساس سے خالی ہو گیا اور یہ صورت ایک مومن صادق کے لیے بڑی خطرناک ہے اسی لیے حدیث میں اس حالت سے ہمہ وقت پناہ مانگنے کی ترغیب دی گئی ہے۔

اللھم انی اعوذ بک من قلب لا یخشع	اے اللہ غیر خاشع قلب سے تیری پناہ چاہتا ہوں

صحابہ کرام کے بارے میں احادیث و آثار میں فلان کان خاشعاً، علیہ یری اثر الخشوع وغیرہ کے جو الفاظ مذکور ہیں اس سے خشوع کی اسی عمومی کیفیت کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن سلام کے متعلق حضرت ابو ہریرہ بیان فرماتے ہیں کہ میں مدینہ آیا تو عبداللہ بن سلام کو دیکھا کہ وہ مجلس میں بہت ہی تخشع کے ساتھ بیٹھے ہوتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ کے اصل الفاظ یہ ہیں:۔ جالسا فی حلقۃ متخشعا علیہ الخبر ایک مجلس میں انتہائی خشوع کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے اور ان سے نیکی ٹپک رہی تھی۔

حضرت علیؓ ھم فی صلوٰتھم خاشعون کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

هو الخشوع فی القلب وان تلین للمرء المسلم وان لا تلتفت فی الصلوٰۃ

خشوع یہ ہے کہ قلب میں خوف خشیت اور مسلمانوں سے نرم خوئی رکھے (اور اس کا ایک گوشہ یہ ہے) نماز میں ادھر ادھر نہ دیکھے۔

علماء و صوفیاء کے نزدیک خشوع کی تعبیر

اوپر قرآن و حدیث اور آثار صحابہ سے خشوع کے مفہوم کی وضاحت کی گئی ہے۔ آئندہ صفحات میں اس کی مزید وضاحت کے لیے محققین صوفیا اور علماء کے اقوال و افعال نقل کیے جاتے ہیں۔

ائمۂ امت اور صوفیائے کرام نے جو اس کیفیت کے عملی نمونہ ہیں قرآن و سنت کی انہی تعلیمات اور آثار میں اس کی ایسی تعبیر کی ہے کہ اس کے دائرے میں زندگی کا ہر کام حقوق اللہ کے متعلق ہو خواہ حقوق... لیکن چونکہ اس کا اصلی محور نماز ہے اور اس کی پوری مشق دربار الٰہی کی حاضری کے بعد ہی ہوتی۔ تشریح وہ اسی کے ضمن میں کرتے ہیں ـــــ اس لیے یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اگر کوئی اس عام تشریح سے دھوکا کھا کر بغیر نماز ادا کیے ہوئے اس کو پیدا کرنے کی کوشش کرے گا تو وہ اس صفت سے متصف نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے نمازوں میں یہ کیفیت پیدا کی جائے اس کے بعد آگے قدم بڑھایا جائے ورنہ اس کی مثال اس شخص کی ہوگی جو بغیر کسی زینے اور سہارے کے مکان کے اوپری منزل پر جانے کی کوشش کرتا ہے۔

یہاں چند علماء، صوفیہ اور ائمہ کے اقوال اور ان کی عملی زندگی کے نمونے پیش کیے جاتے ہیں:۔

امام احمد بن حنبل اپنے رسالہ "الصلوٰۃ و ما یلزم فیہا" میں تحریر فرماتے ہیں۔

ویستحب للرجل اذا اقبل الی المسجد ان یقبل بخوف ووجل وخشوع وخضوع

جب کوئی شخص مسجد میں آنے کا ارادہ کرے تو اسے چاہیے کہ خوف و خشیت، خشوع و خضوع کے ساتھ آئے

پھر اسی رسالہ میں دوسری جگہ اس کی مزید تشریح کرتے ہیں۔

"جب کوئی بندہ اپنے گھر سے مسجد آنے لگے تو اسے سمجھنا چاہیے کہ وہ خدائے وحدہ لاشریک کے سامنے آرہا ہے اور یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ جہاں بھی ہوگا خدا سے پوشیدہ نہیں ہو سکتا اور نہ آسمان و زمین کا کوئی ذرہ یا اس سے بڑی یا چھوٹی چیز اس کی قدرت و علم سے باہر ہے۔ .... اس وقت وہ اللہ کے گھروں میں سے ایک ایسے گھر میں آرہا ہے جس میں ضروری ہے کہ اس کا ذکر اور اس کا چرچا کیا جائے .... (جب وہ ایسے پُرعظمت مقام

جا رہا ہے تو) اسے اپنے گھر سے نکلتے ہی اپنے دل و دماغ کو دنیاوی تفکرات سے جس میں وہ اس سے پہلے پڑا تھا ہٹا لینا چاہیے۔ اور اپنے تمام ارادوں اور اپنی توجہات کو اسی ذات قدسی کے صفات کمال میں لگا دینا چاہیے اس لیے کہ نبی اکرم نے اس کا حکم دیا ہے ..... ارشاد نبوی کے مطابق پورے وقار و سنجیدگی کے ساتھ وہاں پہنچنا چاہیے۔ اس لیے جو جتنا ہی خشوع و خضوع کے ساتھ بارگاہ قدس میں حاضر ہوگا اس کی نماز اتنی ہی پاکیزہ بہتر اور قبولیت سے قریب ہوگی۔ اور وہ جب نماز کے لیے کھڑا ہو تو اسے سمجھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے احسان واکرام سے اسے سرتاپا ڈھانک لیا ہے اور اس نے ہر نعمت سے اسے نوازا ہے۔ گو اس نے گناہوں سے اپنے نفس کو نہایت کثیف اور بوجھل کر دیا ہے۔ پس ان دونوں پہلوؤں پر نظر ڈال کر اسے خشوع و خضوع تواضع و انکسار کا پیکر بن جانا چاہیے۔

حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ جب تم میرے سامنے عبادت کے لیے کھڑے ہو تو اپنے نفس کو پورے طور پر حقیر و ذلیل سمجھو اور جب مجھ سے دعا کے لیے ہاتھ اٹھاؤ تو اس وقت سارے اعضا تواضع کی وجہ سے گویا بے حس و حرکت ہو جائیں اسی طرح موسیٰ علیہ السلام کے متعلق بھی ایک حدیث میں آیا ہے۔

(باقی آئندہ)

پراویڈنٹ فنڈ کی زکوٰۃ کا مسئلہ

(سید احمد قادری)

فاضل مدیر تجلی نے اگست کے شمارے میں پراویڈنٹ فنڈ کی زکوٰۃ کے مسئلے پر اظہار خیال کیا تھا کو انہیں ایک نجی خط لکھا اور اس میں انہیں چند نکتوں کی طرف توجہ دلائی، اس خط کا کوئی جواب نہ آیا۔ اکتوبر کے "تجلی" سے معلوم ہوا کہ موصوف کو میرا خط مل گیا تھا، انھوں نے لکھا تھا کہ اگر مجھے اعتراض "تجلی" میں شائع کر کے جواب لکھیں گے، اسی وقت میں نے موصوف کو دوسرا خط لکھا کہ ہر چیز کو پریس میں لانا کیا ضروری ہے پہلے خط و کتابت سے یہ مسئلہ منقح ہو لے تو پھر اشاعت بھی زیادہ مناسب ہوگی۔ عنایت فرما کر انھوں نے میرے دوسرے خط کا فوراً جواب دیا اور پہلے خط کا جواب نہ بھیجنے کی معذرت کرتے ہوئے لکھا کہ وہ میری اجازت کے بغیر اس خط کو "تجلی" میں شائع نہ کریں گے اور خط ہی سے اس کا جواب دیں گے لیکن دو ہی دن کے بعد موصوف نے دوسرا خط لکھا جس میں انھوں نے اپنی اس مشکل کا اظہار کیا تھا کہ میرے خط کا جواب لمبا ہو گا انہیں اگلا پرچہ جلد مرتب کرنا ہے اور وہ کسی ایسی تحریر پر زیادہ وقت صرف نہیں کر سکتے جس کو "تجلی" میں نہ آنا ہو۔ اپنی اس آفت کا اظہار کر کے انھوں نے مجھ سے خط اور جواب خط کی تجلی ہی میں اشاعت کی اجازت طلب کی تھی۔ میں نے انہیں جواب دیا کہ بات تو مجھے وہی پسند ہے جو میں نے پہلے لکھی تھی لیکن اگر آپ مجبور ہیں تو شائع کر سکتے ہیں۔ پھر اتفاق ایسا ہوا کہ اگلے پرچے یعنی نومبر کے شمارے میں وہ میرا خط اور جواب شائع نہ کر سکے۔ تجلی دسمبر ۶۲ء کے شمارے میں انھوں نے میرا خط اور جواب شائع کیا ہے۔ زکوٰۃ کا مسئلہ بہر حال ایک اہم مسئلہ ہے اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ میں اپنے خیالات تفصیل سے ظاہر کر دوں۔ ذیل میں پہلے وہ نکتے درج کیے جا رہے ہیں جو ۶ اگست ۶۲ء کے خط میں لکھے گئے تھے۔ اس کے بعد نمبر وار ان کے جوابات پر اظہار خیال ہوگا۔ یہ بات ظاہر ہے کہ اگر موصوف نے میرے نکات تسلیم نہیں کیے تو کبیدگی کا کوئی سوال ہی نہیں ہوتا اور اس تحریر کے بعد بھی وہ اپنے موقف ہی کو صحیح سمجھیں جب بھی کبیدگی کا کیا سوال پیدا ہوگا۔ پہلے بھی جو کچھ لکھا گیا تھا اور اب بھی جو کچھ لکھا جا رہا ہے وہ منوانے کے لیے نہیں بلکہ زیر بحث مسئلے کی تنقیح کے لیے ہے۔

میں نے ۶ اگست کے خط میں جن نکات کی طرف توجہ دلائی تھی وہ یہ ہیں:۔

(۱) شمس صاحب نے سوال میں لکھا ہے :۔ "وہ رقم ختم ملازمت کے بغیر ملازم کی ملکیت میں منتقل نہیں ہوتی" آپ نے بھی جواب میں لکھا ہے کہ "جب تک فنڈ ملکیت میں نہیں آجاتا" گویا آپ دونوں نے ملکیت کو قبضے کے معنی میں استعمال کیا ہے حالانکہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ ملکیت الگ شے ہے اور قبضہ الگ شے ہے۔ اردو زبان میں بھی دونوں میں فرق کیا جاتا ہے اور جہاں تک قانونی اور فقہی زبان کا تعلق ہے دونوں میں بالیقین فرق ہے اور اس فرق پر بہت سے مسائل متفرع ہوتے ہیں —— اگر فنڈ پر قبضے سے پہلے ملازم کی ملکیت ہی ثابت نہ ہو تو سرے سے زکوٰۃ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(۲) آپ نے لکھا ہے :۔ "یہ تو ظاہر ہے کہ جب تک فنڈ ملکیت میں نہیں آجاتا اسے محکمے کے ذمے قرض ہی تصور کیا جائے گا"۔ آپ کے جواب کی اساس اسی فقرے پر قائم ہے۔ آپ نے جس قطعیت کے ساتھ یہ فقرہ لکھا ہے اسے پڑھ کر تعجب ہوا —— پراویڈنٹ فنڈ کے نام سے ملازمین کی جو رقم ان کی تنخواہ سے کاٹی جاتی ہے اس کی نوعیت یہ ہے کہ ایک حصہ ملازم کی تنخواہ سے لیا جاتا ہے اور اسی کے بقدر محکمہ کی طرف سے ملا کر مجموعی رقم اس ملازم کے نام پر جمع کر دی جاتی ہے۔ اس کا کھاتہ الگ ہوتا ہے، حساب الگ ہوتا ہے۔ اس کے نام کی پاس بک ہوتی ہے۔ وہ رقم محکمے کے افسر اعلیٰ کے پاس بھی نہیں رہتی بلکہ ملازم کے نام پر بینک میں یا ڈاک خانہ میں جمع کر دی جاتی ہے۔ محکمہ کے کسی شخص کو اس میں تصرف کا حق نہیں ہوتا۔ خود ملازم کے سوا کسی دوسرے شخص کو اس فنڈ سے کوئی رقم بطور قرض بھی نہیں دی جا سکتی۔ ایک ایسی نوعیت کے فنڈ کو محکمے کے ذمہ قرض سے کونسی مشابہت ہے؟ —— اس کے علاوہ آپ نے اس پر بھی غور نہیں فرمایا کہ تنخواہ سے جو رقم کاٹی جاتی ہے، محکمہ کی طرف سے اس پر اتنا ہی اضافہ بھی کیا جاتا ہے۔ اب اگر آپ تنخواہ سے لی ہوئی رقم کو قرض قرار دیتے ہیں تو یہ اضافہ 'ربوٰ' ہوگا اور مسلمان ملازم کے لیے اس کا لینا جائز نہیں رہے گا۔ چونکہ اس خط کی غرض آپ کو چند نکتوں کی طرف متوجہ کرنا ہے اس لیے اس فنڈ کے سلسلے میں اپنی رائے درج نہیں کر رہا ہوں۔

(۳) آپ نے لفظ "قرض" کو لفظ "دین" کے مترادف کے طور پر استعمال کیا ہے۔ یہ بات بھی صحیح نہیں ہے قرض، دین سے اخص ہے۔ دین کا مترادف بالکل نہیں۔ قرض کے لیے فقہا اپنی کتابوں میں علیحدہ فصلیں لکھتے ہیں اور بہت سارے احکام اس کے ساتھ مخصوص ہیں۔ خود اسی مسئلے میں فقہاء دین قوی کی مثال میں قرض دیے ہوئے مال کو پیش کرتے ہیں۔ اگر ملازم کے فنڈ کو بالفرض محکمے کے ذمہ قرض مان بھی لیا جائے تو یہ دین قوی کی قسم میں داخل ہوگا

فاضل مدیر "تجلّی" کے جواب پر میری گزارشات

مذکورہ بالا نکات کے جو جوابات فاضل مدیر نے دیے ہیں۔ راقم الحروف نمبروار ان پر اپنی گزارشات پیش کرتا ہے

(۱) میں نے پہلی بات یہ کہی تھی کہ ملکیت کو قبضے کے معنی میں استعمال کرنا صحیح نہیں ہے اس کے ساتھ ضمناً میں نے یہ بھی لکھا تھا کہ اگر فنڈ پر ملازم کی ملکیت ہی ثابت نہ ہو تو سرے سے زکوٰۃ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس کے جواب میں فاضل مدیر نے عربی کی درج ذیل عبارت لکھی ہے :۔

الحنفية قالوا الملك التام ان	حنفیہ کہتے ہیں۔ ملک تام یہ ہے کہ مال اپنے
يكون المال مملوكا في اليد فلو	ہاتھ میں مملوک ہو پس اگر ایک شخص کسی
ملك شيئا لم يقبضه فلا تجب فيه	مگر اس پر قبضہ نہ پاسکا تو اس مال پر
الزكوٰة	نہ ہوگی ۔

اس عبارت سے انھوں نے جو استدلال کیا ہے وہ یہ ہے :۔

"اس سے ظاہر ہوگیا کہ ملکیت کو قبضے کے معنی میں استعمال کر کے ہم نے کوئی غلطی نہیں کی ہے بلکہ یہ تو احناف کا مسلمہ مسلک ہے ۔"

میری عرض یہ ہے کہ اس عبارت سے یہ استدلال صحیح نہیں ہے اس کے کسی لفظ سے بھی یہ بات نہیں نکلتی کہ ملکیت کو قبضے کے معنی میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس سے جو کچھ ظاہر ہو رہا ہے وہ صرف یہ ہے کہ قبضہ، ملکیت کو مکمل کرنے والی شے ہے نہ یہ کہ وہ ملکیت کے ہم معنی ہے ۔ شاید موصوف کو اس بات کا احساس ہوگیا اس لیے آگے بڑھ کر انھوں نے تحریر فرمایا :۔

"لہٰذا ہم نے زکوٰۃ کی بحث میں لفظ ملکیت کو ملکیتِ تامہ کے معنی میں بول کر غلطی نہیں کی ہے ۔"

پہلے فرمایا کہ میں نے ملکیت کو قبضے کے معنی میں استعمال کر کے غلطی نہیں کی اور اب فرما رہے ہیں کہ میں نے لفظ ملکیت کو ملکیتِ تامہ کے معنی میں بول کر غلطی نہیں کی۔ گویا راقم کا اعتراض یوں دور ہوا کہ ملکیت کے معنی ہیں ملکیتِ تامہ اور ملکیت تامہ کے معنی ہیں قبضہ ۔

چلیے میں نے برادر موصوف کی اس منطق کو تسلیم کرلیا لیکن کیا اس سے ان کا مقصد بھی حاصل ہوگیا ؟ موصوف کو اس بات سے ناواقف نہ ہونا چاہیے کہ فقہائے احناف کے نزدیک ملکیت تامہ کے حصول کے لیے قبضۂ حقیقی شرط نہیں ہے، قبضہ حکمی کافی ہے ۔ ان کے نزدیک ایسے اموال جو بالفعل مالک کے قبضے میں نہ ہوں لیکن ان پر اس کا

قبضہ ممکن ہو، مال مقبوض کے حکم میں داخل ہیں۔ یہ حکمی قبضہ دو طرح حاصل ہوتا ہے۔ دائن کے پاس بینہ موجود ہو یا مدیون خود دین کا مقر ہو۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بعض دیون ہیں اور صاحبین کے نزدیک ہر سہ دیون پر قوی ہو یا متوسط یا ضعیف زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اگر ملکیت تامہ کے لیے قبضۂ حقیقی شرط ہوتا تو پھر ان کے نزدیک کسی دَین پر زکوٰۃ واجب نہ ہونی چاہیے تھی۔ یہی نہیں بلکہ بعض جلیل القدر ائمۂ احناف کے نزدیک ملکیت تامہ کے لیے قبضہ بالکل ضروری نہیں حقیقی ہو یا حکمی جیسا کہ آگے آ رہا ہے ــــ اتنی ہی تفصیل سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ فنڈ پر ملازم کی ملکیت تامہ کا انکار صحیح نہیں ہے۔ حکماً اس کو بہت ہی مؤکد و موثق قبضہ حاصل ہوتا ہے۔

اوپر جو عربی عبارت درج کی گئی ہے وہ موصوف نے حوالہ کے بغیر "الفقہ علی المذاہب الاربعہ" سے نقل کی ہے اور آگے مالکیہ اور حنبلیہ کی جو عبارتیں نقل کی ہیں وہ بھی اسی کتاب کی ہیں، لیکن ان عبارتوں کا تعلق قبضے سے بالکل نہیں ہے۔ اس مقام کی مختصر توضیح ضروری معلوم ہوتی ہے۔ طوالت کے خوف سے میں عربی عبارتیں نہیں پیش کر رہا ہوں، صرف ترجمہ و مفہوم پیش کر رہا ہوں۔ اہل علم کتاب کھول کر دیکھ لیں کہ میں نے مفہوم صحیح بیان کیا ہے یا غلط۔ الجزیری نے "کیا عورت کے مہر میں زکوٰۃ واجب ہے؟" کے عنوان کے تحت لکھا ہے:۔

"وجوب زکوٰۃ کے لیے ملکِ تام شرط ہے اور کیا عورت کو اپنے مہر پر قبضہ سے پہلے ملکیت تامہ حاصل ہے یا نہیں؟ اس مسئلے میں مذاہبِ فقہ میں تفصیل ہے لہٰذا اس کو خط کے نیچے حاشیے میں دیکھو۔"

خود متن کی یہ عبارت بتا رہی ہے کہ وجوب زکوٰۃ کے لیے ملک تام تمام ائمہ کے نزدیک شرط ہے لیکن اس کے باوجود ائمہ کے درمیان اس بات میں اختلاف ہے کہ عورت کو قبضے سے پہلے اپنے مہر پر ملکیت تامہ حاصل ہوتی ہے یا نہیں؟ اگر تمام ائمہ کے نزدیک ملکیتِ تامہ کے لیے قبضہ ضروری ہوتا تو پھر اس اختلاف کا کیا مطلب ہوگا؟ حاشیے میں مصنف نے ملکیت تامہ کی تعریف و تعیین میں چاروں مذاہبِ فقہ کے اختلاف کا ذکر کیا ہے۔ ان چاروں میں صرف حنفیہ کی تعریف و تعیین میں ملکیت تامہ کے لیے قبضہ کو ضروری قرار دیا گیا ہے ان کے علاوہ کسی مذہبِ فقہ کی تعریف و تعیین میں قبضہ کا ذکر نہیں ہے۔ فاضل مدیر نے اپنے جواب میں مالکیہ اور حنبلیہ کی جو عبارتیں نقل کی ہیں ان میں بھی قبضے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ مالکیہ کے نزدیک ملک تام کی تعیین یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے مملوکہ مال میں صاحب تصرف ہو۔ عام ازیں کہ وہ مال اس کے قبضے میں ہو یا نہ ہو۔ یہ بات ان دو مثالوں سے واضح ہے جو کتاب میں دی گئی ہیں۔

پہلی مثال میں کہا گیا ہے کہ غلام پر چاہے وہ جس نوع کا بھی ہو اس کے مملوکہ مال میں زکوٰۃ نہیں ہے اس لیے

لہٰ اس کا ملک تام نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ قبضے کے باوجود اسے ملک تام اس لیے حاصل نہیں ہے کہ وہ اس
میں صاحب تصرف نہیں ہے۔ دوسری مثال میں کہا گیا ہے کہ عورت کو اپنے مہر پر ملکیت تامہ حاصل ہے
لیکن اس کے باوجود جب تک مہر شوہر کے قبضہ میں ہے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ یہ براہ راست اس سوال
کا جواب ہے جو متن میں قائم کیا گیا ہے۔ معلوم ہوا کہ مالکیہ کے نزدیک ملکیت تامہ کے لیے قبضہ ضروری نہیں ہے
دوسری بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ ان کے نزدیک ملکیت تامہ ہوتے ہوئے بھی یہ لازم نہیں کہ زکوٰۃ واجب ہو۔

حنابلہ نے ملک تام کی جو تعریف و تشریح کی ہے اس میں بھی قبضے کی شرط نہیں ہے۔ اس کی ایک بلا
ہ مثالیں ہیں جو ان کی طرف سے الجزیری نے دی ہیں۔ مثلاً ملک تام کی تعریف کے بعد وہ لکھتے
بن کتابت میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ نیز کسی ایسے مال پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے جو غیر معین لوگوں
کسی مسجد و مدرسہ پر وقف کیا گیا ہو اس لیے کہ انھوں نے ملک تام کی جو تعریف کی ہے وہ ان
میں آتی۔ دوسری دلیل وہی عورت کے مہر کا مسئلہ ہے۔ ان کے نزدیک قبضے سے پہلے بھی اس پر زکوٰۃ واجب ہے
کیونکہ اس پر ملک تام کی تعریف صادق آتی ہے۔ مصنف نے باب زکوٰۃ الدین میں حنبلیہ کا جو مسلک نقل کیا ہے
اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ فاضل مدیر نے مالکیہ اور حنبلیہ کی طرف یہ بات جو
منسوب کی ہے کہ ان کے نزدیک ملکیت تامہ کے لیے قبضہ شرط ہے صحیح نہیں ہے ——

اب آئیے شوافع کا مسلک دیکھیں جن کے بارے میں مدیر موصوف نے لکھا ہے:۔

"شوافع بھی ملک تام کو وجوب زکوٰۃ کی شرط مانتے ہیں اور ان کی کوئی تصریح ہماری نظر سے ایسی
نہیں گزری جس میں انھوں نے قبضے کو ملک تام کی تعریف سے خارج کیا ہو۔"

فاضل مدیر کی یہ عبارت پڑھ کر اس لیے حیرت ہوئی کہ مال ضمار میں احناف اور شوافع کا اختلاف فقہ حنفی کا
مشہور مسئلہ ہے اور اس اختلاف کی بنیاد یہی ہے کہ احناف کے نزدیک وجوب زکوٰۃ کے لیے مال مملوک پر قبضہ
(حقیقی ہو یا حکمی) ضروری ہے اور شوافع کے نزدیک قبضہ سرے سے شرط نہیں، اور اس مسئلے میں امام ابوحنیفہ کے ایک
جلیل القدر شاگرد امام زفرؒ بھی ان کے ساتھ ہیں —— مال ضمار ہر ایسے مال کو کہتے ہیں جو اپنے مالک کی ملکیت میں
تو باقی رہتا ہے لیکن اس کو اس سے نفع حاصل کرنے پر قدرت نہیں رہتی۔ جیسے بھاگا ہوا غلام، گم شدہ جانور، مفقود مال
وہ مال جو دریا میں گر گیا ہو، وہ مال جو حکومت نے ظلماً چھین لیا ہو، وہ دین جس کا انکار کر دیا گیا ہو اور دائن کے پاس
بینہ موجود نہ ہو۔ صاحب بدائع الصنائع مال مملوک پر قبضہ کی شرط کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

وقال زفر الید لیست بشرط وھو قول الشافعی فلا تجب الزکوٰۃ فی المال الضمار عندنا خلافا لھما۔	اور امام زفر کہتے ہیں کہ قبضہ وجوب زکوٰۃ کے لیے شرط نہیں ہے اور یہی امام شافعی کا قول ہے لہذا مالِ ضمار میں ہمارے نزدیک زکوٰۃ واجب نہیں اور وہ دونوں اس میں زکوٰۃ واجب مانتے ہیں

ان دونوں کی جو دلیل صاحب بدائع نے نقل کی ہے اس میں اختلاف کی بنیاد یہ بتائی ہے کہ ان دونوں کے نزدیک وجوب زکوٰۃ کے لیے صرف ملکیت کافی ہے قبضہ شرط نہیں۔ اس اختلاف کا ذکر صاحب ہدایہ اور دوسرے فقہاء نے بھی کیا ہے۔ یہ بات بھی نہیں ہے کہ فقہائے احناف نے یہ بات بلاتحقیق لکھ دی ہو بلکہ یہ بات ثابت ہے کہ امام شافعی کا مشہور اور صحیح ترین قول یہی ہے۔ کتاب الام میں موجود ہے کہ مالِ مغصوب، غرق شدہ مال اور مدفون مال (جس کی جگہ صاحبِ مال بھول گیا ہو) پر زکوٰۃ کا وجوب امام شافعی کا قول ہے ان کے شاگرد امام ربیع نے جو دلیل دی ہے وہ یہ ہے:۔

لان من غصب مالہ او غرق لم یزل ملکہ عنہ۔	اس لیے کہ جس کا مال غصب کرلیا گیا یا ڈوب گیا اس کی ملکیت اس سے زائل نہیں ہوتی۔

اس عبارت سے بوضاحت معلوم ہوتا ہے کہ امام شافعی کے نزدیک وجوب زکوٰۃ کے لیے صرف ملکیت کافی ہے اور فقہائے احناف نے ان کی طرف غلط انتساب نہیں کیا ہے۔ اگر ڈوبا ہوا مال مثال کے طور پر تین سال کے بعد کسی طرح مالک کو مل جائے تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک جب تک اس پر حولانِ حول نہ ہوجائے زکوٰۃ واجب نہیں ہے اور امام شافعی و زفر کے نزدیک اس کو گزشتہ برسوں کی زکوٰۃ بھی دینی پڑے گی۔ اس تفصیل کے بعد برادرِ موصوف کی درج ذیل عبارت پڑھیے

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ احناف ہی نہیں چاروں مکاتبِ فقہیہ نے قبضہ اور تصرف کے کلی اختیار کو وجوب زکوٰۃ کی شرط لازم قرار دیا ہے لہذا ہم نے زکوٰۃ کی بحث میں لفظ ملکیت کو ملکیت تامہ کے معنی میں بول کر غلطی نہیں کی بلکہ خود آنجناب یہ گمان کرنے میں جلدی کر گئے ہیں کہ قبضے سے محروم ملکیت یعنی ملکیت ناقصہ بھی وجوب زکوٰۃ میں مؤثر ہوسکتی ہے۔"

اب یہ حقیر فاضل مدیر کے اس ادعا کے بارے میں کیا عرض کرے لیکن یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ میرے خط میں اس بات کا شائبہ بھی موجود نہیں ہے کہ میں وجوب زکوٰۃ میں ملکیت ناقصہ کو بھی مؤثر مانتا ہوں۔ یہ بات مجھے برادرِ موصوف نے اپنی طرف سے تحفۃً عنایت فرمائی ہے۔ میری پہلی بات کا جواب ختم کرتے ہوئے انھوں نے اپنے قلم کا زور ذیل کے جملوں پر ختم کیا ہے۔

"ہمیں اس بات میں ذرہ برابر شک نہیں ہے کہ ملکیت تامہ کے بغیر زکوٰۃ کا وجوب نہیں ہوتا، اور ملکیت تامہ بغیر قبضے کے متصور نہیں۔"

عرض ہے کہ قبضے کے بغیر ملکیت تامہ آپ کے نزدیک متصور نہ سہی امام شافعی و زفر کے نزدیک عالم تصور سے باہر خارج کی عملی دنیا میں موجود ہے اور جہاں تک ملکیت تامہ کے لیے قبضۂ حقیقی کا تعلق ہے مکاتب اربعہ میں کوئی مکتبِ فقہ اس کا قائل نہیں ہے۔

(۲) میں نے دوسرے نکتے کے آخر میں لکھا تھا کہ ملازم کی تنخواہ سے کاٹی ہوئی رقم کو اگر "قرض" قرار دیا جائے تو جو رقم محکمے کی طرف سے بڑھائی جاتی ہے وہ ربا ہوگی۔ فاضل مدیر نے پہلے اسی کا جواب دیا ہے پہلے اسی جواب کے بارے میں اپنی معروضات پیش کرتا ہوں۔ موصوف نے لکھا ہے:-

"یہاں اتنا عرض کر دیں کہ جو رقم محکمے کی طرف سے ملائی جاتی ہے اس کی حیثیت عطیے اور ہبہ کی ہے اور ہبہ میں قبضہ کے بغیر ملکیت ــــ کم از کم اسلامی قانون میں تسلیم نہیں کی گئی لہذا اس حصے کو "قرض" نہ بھی مانا جائے تو اس پر عدم ملکیت کے باعث زکوٰۃ کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔"

میں نے اپنے خط میں محکمے کی طرف سے اضافہ کی جانے والی رقم کے بارے میں "بطور عطیہ وہبہ" کے الفاظ اس لیے نہیں لکھے تھے کہ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ وہ اضافہ بطور عطیہ وہبہ ہی ہوتا ہے اور برادر موصوف بھی سمجھ گئے تھے کہ میں اسے ہبہ ہی سمجھتا ہوں اس لیے کہ آگے انھوں نے مجھ پر ربا اور ہبہ میں فرق نہ کرنے کا الزام عائد کیا ہے۔ بہرحال موصوف نے صراحت فرما دی تو اچھا کیا لیکن اس کے باوجود اگر ملازم کی رقم کو قرض کہا جائے تو اس اضافے کی حیثیت شرعاً ربا ہی کی ہوگی۔ اس کی وجہ میں آگے پیش کروں گا۔ پہلے یہ عرض کر دوں کہ ہبہ میں قبضہ کے بغیر، عدم ملکیت کا قول، تمام ائمہ کا متفق علیہ قول نہیں ہے۔ اس لیے اس کے بارے میں یہ لکھنا کہ "ہبہ میں قبضے کے بغیر ملکیت ــ کم از کم اسلامی قانون میں تسلیم نہیں کی گئی" صحیح نہیں ہے۔ کسی امام کے نزدیک یا کسی مستند مذہب فقہ میں بھی اگر کوئی چیز تسلیم کی گئی ہو تو آپ اسے قانونِ اسلامی سے خارج نہیں کر سکتے۔ الجزیری مالکیہ کا مسلک بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

اما قبضها فليس بشرط فی تمليك الموهوب علی المشهور

مالکیہ کے مشہور قول میں ہبہ کی ہوئی شے کی تملیک کے لیے قبضہ شرط نہیں ہے۔

امام احمد کا مسلک حافظ ابن حجرؒ نے یہ بیان کیا ہے:-

وعن احمد تصح بدون القبض فی العین المعینۃ دون الشائعۃ "

امام احمد سے روایت ہے کہ معین شے میں بغیر قبضے کے ہبہ صحیح ہوتا ہے اور غیر معین شے میں صحیح نہیں ہوتا۔

صاحب بدایۃ المجتہد لکھتے ہیں :۔

وقال احمد وابو ثور تصح الھبۃ بالعقد ولیس القبض من شروطھا اصلا لا من شرط تمامھا ولا من شرط صحتہ وھو قول اھل الظاھر

امام احمد اور امام ابو ثور کہتے ہیں کہ ہبہ صرف عقد سے صحیح ہو جاتا ہے۔ قبضہ اس کے شروط میں بالکل نہیں ہے نہ تمام عقد کی شرط ہے اور نہ صحت عقد کی شرط ہے اور یہی اہل ظاہر کا قول ہے۔

اب پھر یہ دعویٰ پڑھیے کہ "ہبہ میں قبضے کے بغیر ملکیت ـــــ کم از کم اسلامی قانون میں تسلیم نہیں کی گئی"۔ واقعہ یہ ہے کہ برادر موصوف کے اس طرح کے دعوے راقم الحروف کو بڑی حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔

شوافع اور احناف کے مذہب میں بے شک ہبہ کی ہوئی چیز قبضے کے بغیر اس شخص کی ملکیت میں داخل نہیں ہوتی جسے وہ ہبہ کی گئی ہو لیکن اب دیکھنا یہ ہے کیا شے موہوب پر حقیقی قبضہ شرط ہے یا حکمی قبضہ بھی کافی ہے؟

اس سوال کا جواب فقہ حنفی یہ دیتی ہے۔

والتمکن من القبض کالقبض ولھذا قال فی الاختیار ولو وھب من رجل ثوبا فقال قبضتہ صار قابضا عند ابی حنیفۃ وجعل تمکنہ من القبض کالقبض کالتخلیۃ فی البیع البحر الرائق ج ۷ ص ۲۸۵

قبضے پر قابو پالینا قبضہ ہی کی طرح ہے اور اسی لیے اختیار میں کہا ہے کہ اگر کسی شخص کو کوئی کپڑا ہبہ کیا جائے اور وہ کہہ دے کہ میں نے قبضہ کر لیا تو ابو حنیفہؒ کے نزدیک وہ شخص قابض ہو جائے گا۔ انھوں نے قبضے کے تمکن کو قبضے کے حکم میں داخل کیا ہے جیسے کہ بیع و فروخت میں بکی ہوئی چیز کو خالی کر دینا۔

اس عبارت کی شرح حاشیے میں یہ کی گئی ہے :۔

قال فی التتارخانیہ قد ذکرنا ان الھبۃ لا تتم الا بالقبض والقبض نوعان حقیقی وحکمی و ذالک بالتخلیۃ

تتارخانیہ میں کہا ہے کہ ہم نے ذکر کیا ہے کہ ہبہ قبضے کے بغیر تمام نہیں ہوتا اور قبضے کی دو قسمیں ہیں حقیقی اور حکمی۔ حکمی قبضہ تخلیہ سے حاصل ہو جاتا ہے

ان عبارتوں میں جو کچھ کہا گیا ہے اسے ایک مثال سے سمجھ لینا چاہیے۔ فرض کیجیے کسی شخص نے زید کو ایک گھر ہبہ کیا اور اس میں سے اپنا سامان نکال کر اس کو اس کے لیے خالی کر دیا اور اپنا قبضہ اٹھا لیا۔ اس صورت میں امام ابوحنیفہ کے نزدیک وہ گھر زید کا مقبوضہ سمجھا جائے گا۔ چاہے وہ کسی مانع کی وجہ سے مہینوں اور برسوں اس گھر میں داخل ہو کر ایک سکنڈ کے لیے بھی حقیقی قبضہ نہ کر سکا ہو۔ اب مسئلہ زیر بحث پر اسے منطبق کیجیے۔ جب ہبہ کی ہوئی رقم موہوب لہ کے نام پر جمع کر دی جاتی ہے تو کیا اسے اس رقم پر قبضہ حکمی حاصل نہیں ہو جاتا اور کیا وہ محکمہ کی طرف سے اس رقم کا مالک نہیں قرار دے دیا جاتا؟ واقعہ یہی ہے کہ اس کو اس رقم پر قبضے کا تمکن بھی حاصل ہو جاتا ہے اور وہ اس رقم کا مالک بھی قرار دے دیا جاتا ہے اور یہ بات اتنی پختہ ہو جاتی ہے کہ محکمہ کو اس سے رجوع کا حق باقی نہیں رہتا۔ تنخواہ کی رقم اور ہبہ کی رقم دونوں رقمیں مل کر ملازم کا مملوکہ و مقبوضہ ہیں۔ قاعدے کے مطابق پابندی صرف اتنی ہوتی ہے کہ جب تک وہ ملازمت کر رہا ہے اسے برآمد نہیں کر سکتا۔ اس سے یہ سمجھنا کہ ہبہ کی ہوئی رقم ملازم کے قبضے میں نہ آئی صحیح نہیں ہے۔ ہبہ کے مسئلے میں بھی امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک قبضے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ رقم موہوب لہ کے ہاتھ میں موجود ہو یا اس کے صندوق میں بند ہو جس کی کنجی اس کی جیب میں ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مدیر کو قبضے کی دوسری قسم قبضہ حکمی پر غور کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ اس کے علاوہ شئے موہوبہ پر جس طرح اصالۃً بذات خود قبضہ کیا جا سکتا ہے اسی طرح وکالۃً بھی قبضہ صحیح ہے۔ مسئلہ زیر بحث میں محکمے کے ہیڈ کی حیثیت ملازم کے وکیل کی ہوتی ہے جو اس کی طرف سے رقم پر قبضہ کرتا اور پھر اس کے نام پر اسے جمع کر دیتا ہے۔ اس پہلو سے بھی موہوبہ رقم ملازم کے قبضے میں آجاتی ہے۔

اب ہم اس مسئلے پر غور کرتے ہیں کہ یہ اضافہ شرعاً ربا کیوں ہے؟ فاضل مدیر "تجلی" لکھتے ہیں:-

"رہا یہ معارضہ کہ فنڈ کو قرض قرار دیں تو محکمہ کی دی ہوئی رقم ربوٰ بن جائے گی تو یہ ربوٰ اور ہبہ میں فرق نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔"

عرض ہے کہ ربا اور ہبہ میں اتنا موٹا فرق ہے کہ قدوری پڑھنے والا ذہین طالب علم بھی اس سے واقف ہوتا ہے مجھے اپنی بے بضاعتی کا اعتراف ہے لیکن ربا اور ہبہ کا فرق بفضلہ مجھے معلوم ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا فاضل مدیر کے نزدیک کوئی عطیہ و ہبہ ربا نہیں بن سکتا؟ اگر کوئی قرض لینے والا قرض لیتے ہی وقت یہ کہے کہ میں تمہیں دس روپیہ قرض کے عوض میں دس روپیہ واپس کروں گا اور دس روپیہ مزید لازماً بطور ہبہ و عطیہ دوں گا تو فاضل مدیر کے نزدیک یہ ہبہ ربا ہو گا یا نہیں؟ ان کے نزدیک ہو یا نہ ہو تمام فقہاء کے نزدیک یہ ربا ہی ہوگا۔ اس اضافے کا نام ہبہ

رکھ دینے سے اس صورت میں ہبہ باقی نہیں رہے گا۔ شرعاً ربا ہو جائے گا۔ قرض کی صورت میں بطور ہبہ اضافہ، صرف اور صرف وہاں جائز ہوتا ہے جہاں وہ اضافہ نہ مشروط ہو نہ معروف ہو۔ کیونکہ المعروف کالمشروط کا فقہی قاعدہ بہت معروف ہے۔ جس شریعت میں کل قرض جر نفعا حرام (ہر وہ قرض جو نفع کھینچ لائے حرام ہے) اور فاتقوا الربا والریبۃ (سود اور شبہۂ سود سے بچو) کے احکام نافذ ہوں اس کی رو سے قرض پر مشروط اضافے کے ربا ہونے میں کیا شبہہ ہے کہ اس کے لیے احادیث اور فقہ کی عبارتیں پیش کی جائیں۔ انہیں بینات کی وجہ سے میں کہتا ہوں کہ اگر آپ تنخواہ سے کٹی ہوئی رقم کو "قرض" قرار دیں گے تو محکمہ کی طرف سے اس پر معروف بلکہ محکمانی قاعدے میں مکتوب ہبہ، ربا بن جائے گا۔ اب اس لحاظ سے صورت یہ بنتی ہے کہ ہر ماہ ملازم کی جس قدر رقم محکمہ بطور قرض لیتا ہے اسی کے بقدر اس کے کھاتے میں ربا بنام ہبہ جمع کرتا ہے اور پھر اس مجموعی رقم پر ڈاک خانہ یا بنیک جو سود دیتا ہے وہ علاوہ ازیں ہے۔

(۳) راقم الحروف نے فاضل مدیر کو توجہ دلائی کہ "قرض" اور "دین" مترادف نہیں ہیں۔ اس کے جواب میں انھوں نے فرمایا ہے کہ دونوں میں لطیف فرق ہونے کے باوجود اردو میں چونکہ دَین اور قرض ایک ہی مفہوم میں بولے جاتے ہیں اس لیے انھوں نے ان دونوں کو مترادف کے طور پر استعمال کیا ہے بلکہ بڑے بڑے مفتی اردو زبان کی فتاویٰ کی کتابوں میں دونوں کو مترادف استعمال کرتے ہیں لیکن خود یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ جہاں اس فرق پر کوئی خاص مسئلہ متفرع کرنا ہو وہاں دَین اور قرض کے فرق کا ذکر آئے گا۔ میں نے موصوف کو اسی جہت سے توجہ دلائی تھی یہی وجہ ہے کہ میں نے قرض اور دَین کے فرق کے سلسلے میں اردو بول چال کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ جو مسئلہ زیر بحث ہے اس میں ان دونوں کے درمیان اس لیے فرق کرنا ضروری تھا کہ اگر ملازم کی رقم کو محکمے کے ذمے فقہی اصطلاح کے لحاظ سے "قرض" سمجھ لیا جائے تو وہ بات پیدا ہوتی ہے جس کا ذکر میں نے اپنے نکات کے نمبر ۲ میں کیا ہے اور جس پر اظہار خیال آگے آ رہا ہے۔ میری عبارت میں "خود اسی مسئلے میں" کا اشارہ اسی بات کی طرف ہے کہ اگر اس رقم کو اصطلاحی قرض سمجھ لیا جائے تو اسے دین ضعیف کہنا صحیح نہ ہوگا۔ نکتہ ۳ درحاصل اسی عبارت کی فرع ہے جس کے بارے میں موصوف نے لکھا ہے کہ سمجھ میں نہ آئی۔

(۴) فاضل مدیر تجلی لکھتے ہیں:۔

"آپ جو فنڈ کے روپیہ کو قرض تسلیم کرنے کی صورت میں اسے "دین قوی" قرار دے رہے ہیں اس کے لیے آخر کیا دلیل ہے؟"

پہلے تو یہ بات صاف کرنی ہے کہ فنڈ کو "قرض" سمجھنا میری رائے نہیں ہے کیونکہ فنڈ کے بارے میں ابھی میں نے اپنی رائے ظاہر نہیں کی۔ نکتہ ۲ میں صراحۃً میں یہ لکھ چکا ہوں۔

"چونکہ اس خط کی غرض آپ کو چند نکتوں کی طرف متوجہ کرنا ہے اس لیے اس فنڈ کے سلسلے میں اپنی رائے درج نہیں کر رہا ہوں۔"

اس کے علاوہ نکتہ ۲ میں تفصیل سے میں نے یہ دکھایا ہے کہ فنڈ کی رقم کو قرض کے ساتھ مشابہت نہیں ہے کم سے کم اتنا تو ظاہر ہی ہو رہا ہے کہ میں اس رقم کو "قرض" نہیں سمجھتا لیکن ان تمام باتوں کے باوجود برادر موصوف تحریر فرماتے ہیں:۔

"ہمارا خیال ہے کہ فنڈ کی رقم کو "دین قوی" کی قسم میں داخل کرتے ہوئے آپ نے محض بے تکلفی سے کام لیا ہے اور اس تحقیق کی زحمت گوارا نہیں فرمائی کہ فقہاء کی اصطلاح میں "دین قوی" کس چیز کا نام ہے۔"

اب میں ان کی اس عنایت مزید کا کیا جواب دوں۔ بہرحال اب یہ دیکھیے کہ اس شخص سے جو اس فنڈ کو "قرض" (دین نہیں) سمجھتا ہے۔ موصوف اس کے دین قوی ہونے کی دلیل کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ یہ مطالبہ عجیب ہے یا نہیں؟ لطف یہ ہے کہ انھوں نے خود دین قوی کی جو تعریف نقل کی ہے اس میں سب سے پہلے قرض ہی کا ذکر ہے اور قرض کا دین قوی ہونا امام ابوحنیفہ کے مسلک میں تسلیم شدہ ہے۔ کوئی شخص یہ تو کہہ سکتا ہے کہ اس فنڈ کو قرض سمجھنا صحیح نہیں ہے اور مدعی سے اس کے قرض ہونے کی دلیل بھی مانگ سکتا ہے لیکن قرض تسلیم کر لینے کے بعد اس کے دین قوی ہونے کی دلیل مانگنا ایسا ہی جیسے کوئی شخص کسی دین کو دین قوی تسلیم کر لینے کے بعد مدعی سے اس کے دین قوی ہونے کی دلیل طلب کرے۔ برادر موصوف معلوم نہیں کیوں اس مطالبے کی ندرت پر غور نہیں کر سکے، یا قرض ہونے کی دلیل مانگنے کی بجائے غلطی سے قرض کے دین قوی ہونے کی دلیل طلب کر لی۔ اس غلطی سے قطع نظر کرتے ہوئے میں اس شخص کی طرف سے جو اسے قرض سمجھتا ہے دلیل دے سکتا ہوں لیکن یہ طولِ عمل کیوں اختیار کیا جائے جب میں اسے قرض نہیں سمجھتا پھر بھی فقہی اصطلاح میں فنڈ کو قرض نہ قرار دیے جانے کی جو وجہ فاضل مدیر نے لکھی ہے اس پر اظہار خیال ضروری ہے اس لیے کہ یہ چیز فنڈ کو دین ضعیف کہنے والوں کے لیے بڑے اشتباہ کا سبب بنی ہوئی ہے۔ فاضل مدیر لکھتے ہیں:۔

"یہ بھی ظاہر ہے کہ تنخواہ کسی مال تجارت کا معاوضہ نہیں ہوتی خدمت کا عوض ہوتی ہے اور مردِ آزاد (شرعی اصطلاح میں) کی خدمت کو فقہاء "مال" نہیں مانتے پھر کیونکر اسے "دین قوی" کہہ سکیں گے۔"

اس سے پہلے بھی تجلی اگست ۶۲ء میں موصوف یہ دعویٰ اور زیادہ زور کے ساتھ کر چکے ہیں اس میں انھوں

نے لکھا تھا :۔

"لیکن مرد آزاد کی حیثیت مال کی نہیں ہے لہٰذا اس کی خدمت و محنت کو بھی فقہاء نے بالاتفاق مال کے زمرے سے خارج مانا ہے"

لیکن یہ "بالاتفاق" کا دعویٰ کیا تحقیق کے بعد کیا گیا ہے؟ نہیں بلکہ اس کا بھی وہی حال ہے جو پہلے دعوے کا تھا۔ دیگر ائمہ کو چھوڑیے خود ائمۂ احناف کے درمیان مرد آزاد کی خدمت کے "مال" نہ ہونے پر اتفاق نہیں ہے۔ امام محمد جیسی شخصیت مرد آزاد کی خدمت کو مال سمجھتی ہے۔ صاحب بدائع الصنائع لکھتے ہیں :۔

ولو تزوج حرا امرأة على	اور اگر کسی آزاد مرد نے کسی عورت سے نکاح کا
ان يخدمها سنة فالتسمية فاسدة	مہر یہ مقرر کیا کہ وہ ایک سال اس کی خدمت کرے گا
ولها مهر مثلها فی قول ابی حنيفة	تو تعیین فاسد ہوگا اور امام ابوحنیفہ وابو یوسف کے
وابی یوسف وعند محمد التسمية	قول میں اس عورت کو مہر مثل ملے گا اور امام محمد کے
صحيحة ولها قيمة خدمته	نزدیک یہ تعیین صحیح ہے اور عورت کو اس مرد آزاد کی
سنة	ایک سال خدمت کی قیمت ملے گی ۔

اس کے بعد صاحب بدائع نے ان کی دلیل نقل کرکے تصریح کر دی کہ ان کے نزدیک مرد آزاد کی خدمت "مال" ہے۔ لکھتے ہیں :۔

نوجه قول محمد ان منافع	امام محمد کے قول کی وجہ یہ ہے کہ مرد آزاد
الحر مال لانها مال فی سائر العقود	کے منافع مال ہیں اس لیے کہ وہ بقیہ تمام عقود و معاملات
حتى يجوز اخذ العوض عنها	میں مال ہیں یہاں تک کہ ان منافع کا عوض لینا جائز
فكذا فی النكاح ۔	ہے تو اسی طرح نکاح میں بھی اس کے منافع مال ہوں گے

معلوم ہوا کہ مرد آزاد کی خدمت کا مال نہ ہونا فقہائے احناف کے درمیان بھی متفق علیہ نہیں ہے۔ یہ بات آگے آرہی ہے کہ خدمت کو مال نہ مانا جائے جب بھی فنڈ کو دین ضعیف کہنا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

میں نے موصوف کو جن نکتوں کی طرف توجہ دلائی تھی ان کے جوابات ختم کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"آپ کی پیش فرمودہ چاروں شقوں کی گفتگو تمام ہوئی"

عرض ہے کہ میری پیش کی ہوئی باتوں پر آپ کی گفتگو نا تمام ہے۔ میں نے نکتہ ۲ میں فنڈ کی نوعیت پر تھوڑی

تفصیل سے گفتگو کر کے یہ سوال کیا تھا کہ ایک ایسی نوعیت کے فنڈ کو محکمے کے ذمہ قرض سے کون سی مشابہت ہے؟ آپ نے اپنے جواب کے ۲؎ میں وعدہ فرمایا تھا کہ "یہ بحالت موجودہ بھی محکمہ کے ذمہ قرض کیسے رہی اس پر ہم بعد میں گفتگو کریں گے" شاید یہ وعدہ یاد نہ رہا کیونکہ جواب میں کہیں آپ نے یہ نہیں بتایا کہ اس نوعیت کے فنڈ کو قرض یا دین (چاہے وہ قوی ہو یا متوسط یا ضعیف) کے ساتھ کون سی مشابہت ہے اور اسے دین کہنے کی آخر وجہ کیا ہے؟ حالانکہ مسئلہ زیر بحث میں یہی بنیادی سوال تھا۔ آپ نے حدیہ کی کہ اپنے موقف کی تائید میں جو دو فتوے نقل کیے تو ان کے دلائل بھی نقل نہیں کیے۔ افسوس کہ مجھے ان دو کتابوں میں کوئی کتاب مطالعہ کے لیے نہ مل سکی جن سے آپ نے فتوے نقل کیے ہیں۔

فنڈ کے دین نہ ہونے کی توضیح مزید

میں نے فاضل مدیر تجلی کو جن نکتوں کی طرف توجہ دلائی تھی ان کے جوابات پر اظہار خیال ختم ہوا۔ اب میں

ساتھ عرض کرتا ہوں کہ میرے نزدیک پراویڈنٹ فنڈ "دین" کیوں نہیں ہے۔ پہلے مثالوں کے ساتھ یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ کسی شخص پر دین عائد ہونے کی صورتیں کیا ہوتی ہیں۔ دین قوی قرض دیے ہوئے روپیہ اور مال تجارت کے اس معاوضے کو کہتے ہیں جو خریدار کے ذمہ باقی ہو مثلاً زید نے بکر کو سو روپیہ بطور قرض دیے تو بکر پر زید کا یہ دین دین قوی ہے یا بکر نے زید سے اپنا مالِ تجارت مثلاً گھڑی دو سو روپیہ میں ادھار فروخت کی تو زید پر بکر کا یہ دین، دین قوی ہے۔ دین متوسط اس ادھار معاوضے کو کہتے ہیں جو مالِ تجارت کا معاوضہ نہ ہو۔ مثلاً زید نے بکر سے اپنی ضرورت کے گیہوں میں سے پانچ من گیہوں ادھار فروخت کیا تو بکر پر زید کا یہ دین، دین متوسط ہے —— دین ضعیف اس دین کو کہتے ہیں جو کسی مال کا معاوضہ نہ ہو جیسے عورت کا مہر۔ زید نے ہندہ سے ایک ہزار روپیہ مہر مؤجل پر نکاح کیا اور خلوت صحیحہ ہو گئی تو زید پر ہندہ کا یہ دین، دین ضعیف ہے اس لیے کہ زید پر جو دین عائد ہوا ہے وہ کسی مال کا معاوضہ نہیں ہے —— اب دیکھیے کہ ملازم کے فنڈ پر ان ہر سہ دیون میں سے کوئی دین بھی صادق آتا ہے؟ ایک ایڈڈ انٹر کالج کے ذمہ دار شخص سے جو اس کے تمام مالی حسابات خود مرتب کرتے ہیں۔ میں نے اس فنڈ کے بارے میں تحقیق کی ان سے جو معلومات حاصل ہوئیں وہ یہ ہیں:۔

انھوں نے بتایا کہ ان کے کالج کی رقم بینک میں جمع ہوتی ہے اور کالج کے اخراجات کے لیے حسب ضرورت ہر ماہ روپے برآمد کیے جاتے ہیں۔ اساتذہ کا وہ رجسٹر جس پر وہ اپنی تنخواہوں کی وصولیابی کے دستخط کرتے ہیں متعدد خانوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس میں ایک خانہ اس فنڈ کا بھی ہوتا ہے جو ان کی تنخواہ سے کاٹا جاتا ہے اور میرے کالج میں سہولت

کے لیے رجسٹر میں ایک خانہ اس عطیے کا بھی بڑھا دیا گیا ہے جو کالج فنڈ پر دیتا ہے۔ ملازم دستخط کرکے اس پورے حساب اور ان تمام خانوں کی تصدیق کرتا ہے جو اس رجسٹر میں موجود ہیں۔ فنڈ (اور دوسرے مدات اگر ہوں) کاٹ کر جو رقم بچتی ہے وہ ملازم کو دے دی جاتی ہے اور اس کے بعد اس کے فنڈ کی رقم اور کالج کے عطیے کی رقم بینک سے برآمد کرکے اس ملازم کے پاس بک کے ساتھ ڈاک خانہ میں جمع کر دی جاتی ہے۔ ڈاک خانہ اس رقم کو پاس بک پر چڑھا کر کالج کو واپس کر دیتا ہے اور اس کے ساتھ ایک رسید ملازم کے نام ارسال کرتا ہے جس میں وہ رقم درج ہوتی ہے جو اس کے حساب میں جمع کی گئی ہے وہ رسید ملازم کے حوالے کر دی جاتی ہے تاکہ اسے اطمینان حاصل ہو جائے کہ اس کی رقم کالج یا کسی اور کے تصرف میں نہیں ہے بلکہ اس کے نام پر ڈاک خانے میں جمع کی جا چکی ہے —— ایک دوسرے صاحب جو میرے محلے میں رہتے ہیں اور ایک کارخانے میں کام کرتے ہیں، معلوم ہوا کہ ان کا کارخانہ جو فنڈ کاٹتا ہے اس میں اپنا عطیہ جوڑ کر ایک بینک میں ان کے نام جمع کر دیتا ہے اور ہر سال ان کے پاس بینک سے رسید آتی ہے جس میں وہ تمام رقمیں درج ہوتی ہیں جو سال بھر ان کے نام جمع کی گئیں۔ اس رسید میں تین خانے ہوتے ہیں۔ ایک میں ان کی تنخواہ سے لی ہوئی رقموں کا مجموعہ ہوتا ہے دوسرے میں کارخانے کے عطیے کی رقموں کا مجموعہ ہوتا ہے اور تیسرے میں وہ سود درج ہوتا ہے جو بینک نے اس رقم پر دے گا —— میں نے اور بھی کئی افراد سے تحقیق کی سب کا قدر مشترک یہ ہے کہ فنڈ اور عطیے کی رقم بڑی دیکھ بھال کے ساتھ ملازم کے نام پر جمع کر دی جاتی ہے۔

ایسی نوعیت کے فنڈ کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ محکمہ کے ذمہ "دین" ہے ایک ایسا دعویٰ ہے جو دلیل سے بے نیاز ہے۔ میرا خیال ہے کہ جن لوگوں نے اسے دین ضعیف کہا ہے ان کی نگاہ اس بات پر مرکوز ہو گئی کہ یہ فنڈ ملازم کی خدمت کا معاوضہ ہے اور خدمت چونکہ مال نہیں ہے اس لیے یہ دین ضعیف ہے۔ ان کی نگاہ سے یہ بات اوجھل ہو گئی کہ یہ معاوضہ دین کب بن رہا ہے اور محکمے کے ذمہ باقی کہاں رہ رہا ہے۔ یہاں تو صورت حال یہ ہے کہ محکمہ اپنے ملازم کی رقم میں اتنی ہی اور رقم بطور عطیہ اضافہ کرکے اس کے نام پر ڈاک خانے میں جمع کر رہا ہے اور ملازم کے اطمینان کے لیے جمع شدہ رقم کی رسید تک مہیا کر رہا ہے۔ اس قسم کے فنڈ کو دین کس طرح کہہ سکتے ہیں۔ کیا لغت اور اصطلاح میں اس لفظ کے معنی کچھ اور ہو گئے ہیں؟

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ فنڈ کو مذکورہ بالا ہر سہ دیون میں سے کسی دین کے ساتھ مشابہت نہیں ہے۔

فاضل مدیر تجلی کے دو دعوے

انھوں نے فنڈ پر زکوٰۃ واجب ہونے کے لیے دو دعوے کیے ہیں اور اس زور و شور کے ساتھ جیسے وہ ناقابل تردید ہوں۔ پہلا دعویٰ

یہ ہے کہ فنڈ پر ملازم کو ملکیت تامہ حاصل نہیں ہوتی کیونکہ اس کی کٹی ہوئی رقم ایک سکنڈ کے لیے بھی اس کے قبضے میں نہیں آتی اور دوسرا دعویٰ یہ ہے کہ ملازم اپنی تنخواہ سے رقم بخوشی نہیں کٹواتا بلکہ محکمہ زبردستی اور اجبار کے ساتھ کاٹ لیتا ہے -

راقم الحروف اپنی اسی تحریر کی شق ۲ میں ابھی تفصیل سے لکھ چکا ہے کہ ائمۂ اربعہ کے نزدیک ملکیت تامہ کے معنی کیا ہیں تفصیل شق ۲ میں دیکھ لی جائے۔ خلاصہ یہ ہے کہ فقہ حنفی میں بھی وجوب زکوٰۃ کے لیے قبضۂ حقیقی ہرگز شرط نہیں ہے بلکہ قبضۂ حکمی کافی ہے اور فنڈ کے معاملے میں ملازم کا قبضۂ حکمی اتنا مؤکد ہے انکار کی گنجائش بھی باقی نہیں رہتی۔ اس لیے فاضل مدیر کو اپنے دعوے پر نظر ثانی کرنی چاہیے صورت میں جب اس فنڈ کو محکمے کے ذمہ دین مانا جائے اور میں ابھی اوپر تفصیل سے یہ خیال میرے نزدیک محکمے کے ذمہ دین نہیں ہے -

ان کا دوسرا دعویٰ بھی حقیقتِ واقعہ کے بالکل خلاف ہے۔ میری واقفیت تو یہ ہے کہ پراویڈنٹ فنڈ دینے والے محکموں اور اداروں کے کم سے کم پچانوے فی صدی ملازمین بخوشی فنڈ کٹواتے ہیں، بلکہ جہاں یہ فنڈ نہیں کٹتا وہاں کے ملازمین جدوجہد کر کے اور حقوق کی تحریک چلا کر فنڈ کا قاعدہ نافذ کراتے ہیں۔ فاضل مدیر نے اجبار کے ساتھ زبردستی کے لفظ کا اضافہ بھی کیا ہے۔ گویا محکموں کا اپنے ملازمین پر بڑا بھاری ظلم ہے کہ وہ تنخواہوں سے مقرر رقم کاٹتے ہیں اور اپنی طرف سے اتنی ہی رقم بطور ہبہ وعطیہ جوڑ کر ان کے ناموں پر جمع کرا دیتے ہیں تاکہ جب ان کی ملازمتیں ختم ہوں تو وہ مالی حیثیت سے بے سہارا نہ رہ جائیں۔ یہ کتنا عجیب وغریب ظلم ہے۔ اور سنا ہے کہ دارالعلوم دیوبند میں بھی ملازمین کی تنخواہ سے فنڈ کٹتا ہے تفصیل مجھے نہیں معلوم۔ اگر ملازمین کا فنڈ دارالعلوم کی طرف سے لازماً کاٹا جاتا ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہاں یہ اجبار کس طرح جائز سمجھا جا رہا ہے اور اگر فنڈ کٹوانا ملازمین کی مرضی پر موقوف ہے تو یہ بات بہرحال ثابت ہوئی کہ ملازمین بخوشی بھی یہ فنڈ کٹواتے ہیں۔ برادر موصوف کے اس دعوے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر واقعۃً محکمہ بجبر ملازمین کی مرضی کے بغیر ان کی تنخواہوں سے رقم کاٹ لیتا ہے تو پھر یہ رقم محکمہ کے ذمہ دین ضعیف کس طرح بن جاتی ہے؟ یہ تو تقریباً غصب کی شکل ہے پھر تو فنڈ کی نوعیت مال مغصوب کی ہوئی۔ اور اب میں تیسرے پہلو کی طرف ان کی توجہ مبذول کراتا ہوں کہ اگر بیّنہ موجود ہو تو فقہ حنفی میں مال مغصوب پر بھی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے ــــ تنویر الابصار میں ہے

و مغصوب لا بینۃ علیہ ــــ اور اس مال مغصوب پر بھی زکوٰۃ نہیں ہے جس پر بینہ (گواہی) نہ ہو

فلولہ بینۃ تجب لما مضی۔ — پس اگر مغصوب منہ کے پاس بینہ موجود ہو تو مال مغصوب پر گزشتہ برسوں کی زکوٰۃ بھی واجب ہوگی۔

اس لیے فاضل مدیر نے عدم وجوب زکوٰۃ کے لیے اجبار و زبردستی پر جو زورِ قلم صرف کیا ہے وہ بے کار ہے اور اسی سے ان کو سمجھ لینا چاہیے کہ قرض اور مال تجارت کے معاوضہ پر وجوبِ زکوٰۃ کی جو علت انھوں نے بیان کی ہے اس کا وزن کیا ہے؟ وجوب زکوٰۃ کے لیے یہ بالکل ضروری نہیں ہے کہ کسی نے اپنا مال کسی کو بخوشی دیا ہو اس لیے دوسرے دعوے پر بھی ان کو نظر ثانی کرنی چاہیے۔ اگر ملازمین نے غیر مدلل فتوے کی وجہ سے فنڈ کی زکوٰۃ ادا نہ کی تو ذمہ داری کس پر عائد ہوگی؟

فنڈ کے بارے میں میری رائے

راقم الحروف کے نزدیک پراویڈنٹ فنڈ چاہے وہ کسی ڈاک خانہ میں جمع ہو یا کسی بینک میں یا خود محکمے کی اپنی تجوری میں وہ ملازم کا مملوکہ اور حکماً مقبوضہ مال ہے جس پر زکوٰۃ واجب ہے حقیقی قبضہ نہ ہونے کا وجوب زکوٰۃ کے مسئلے پر اثر نہیں پڑتا۔ جب بھی فنڈ ملازم کے پاس پہنچ جائے گا اس کو گزشتہ برسوں کی زکوٰۃ بھی دینی ہوگی۔ چونکہ وہ فنڈ محکمے کے زیر حفاظت ہوتا ہے اس لیے اس کو "ودیعت" کے ساتھ مشابہت ہے، "دین" کے ساتھ نہیں۔

اس رائے کے وجوہ و دلائل اوپر مفصل تحریر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ میں یہاں انہیں چند نمبروں میں یک جا کر دیتا ہوں:۔

(۱) فقہ حنفی میں ملکیت تامہ کے لیے حکماً قبضہ کافی ہے۔ قبضۂ حکمی کا مطلب یہ ہے کہ مالک کو اپنے مال پر قبضہ حاصل کر لینے کی قدرت حاصل ہو۔ اکثر یہ قدرت بینہ و شہادت کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے۔ اگر کسی کے پاس کسی کا مال ہو اور اس پر گواہ بھی موجود ہوں تو اس مال پر اس شخص کا حکماً قبضہ تسلیم کیا جائے گا۔

فنڈ پر ملازم کی ملکیت مستحکم بنیادوں پر ہوتی ہے اس لیے اس کو اپنے مال پر قبضۂ حکمی حاصل ہوتا ہے۔

(۲) ہبہ کی تکمیل کے لیے بھی فقہ حنفی میں قبضۂ حکمی کافی ہے ـــــ ملازم کو ہبہ کی ہوئی رقم پر بھی ٹھیک اسی طرح حکماً قبضہ حاصل ہوتا ہے جس طرح تنخواہ سے اخذ کی ہوئی رقم پر، اس لیے موہوبہ رقم بھی ملازم کی مملوکہ و مقبوضہ رقم ہوتی ہے۔

(۳) فقہ حنفی میں وجوب زکوٰۃ کے لیے مال مملوک پر قبضۂ حقیقی شرط نہیں، قبضۂ حکمی کافی ہے اس لیے ملازم کے فنڈ پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

(۴) پچانوے فی صدی ملازمین اپنی تنخواہوں سے فنڈ بخوشی کٹواتے ہیں اور اس علم کے باوجود کٹواتے ہیں

کہ ان کی رقم ختم ملازمت سے پہلے نہیں مل سکتی ۔

(۵) جن لوگوں کی رقم ان کی مرضی کے خلاف بجبر کاٹی جاتی ہے اس پر بھی زکوٰۃ واجب ہے اس لیے کہ بیّنہ و شہادت کی موجودگی میں زبردستی چھینے ہوئے مال پر بھی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے ۔

(۶) ملازم کی رقم محکمے کے ذمے باقی نہیں رہتی اس لیے اسے دین کہنا صحیح نہیں ہے ۔

تنقید و تبصرہ

گلدستۂ قرآن و حدیث

جناب ڈاکٹر قاری سید کلیم اللہ حسینی، صفحات ۹۸، کاغذ، کتابت، طباعت بہتر، ہدیہ ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ: معتمد مکتبہ کلیمیہ، بازار نور الامراء حیدرآباد، دکن ۲۴ (آندھرا پردیش)۔

فاضل مرتب نے یہ چھوٹی سی کتاب جس غرض سے مرتب کی ہے، وہ ان کے الفاظ میں یہ ہے:-

"یوں تو کئی آیات قرآنی اور چہل حدیث کے مجموعے مرتب کیے گئے جو متداول ہیں لیکن خاکسار نے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ جو بچے اور کم سن بچیاں دار القرآت والدینیات الکلیمیہ بازار نور الامراء میں ابتدائی دینی تعلیم حاصل کرنے کے لیے روزانہ صبح میں جمع ہوتے ہیں ان کے لیے قرآن مجید اور حدیث شریف کی ایسی مختصر اور ضروری آیتیں اور حدیثیں جمع کی جائیں جو ان کی نفسیات، ماحول اور موجودہ ضروریات زمانہ کے مطابق ہوں۔"

میں نے پوری کتاب تو نہیں پڑھی ہے لیکن ادھر اُدھر سے جو کچھ دیکھا ہے اس کی بنا پر میری رائے یہ ہے کہ ابتدائی تعلیم پانے والے بچوں اور بچیوں کے لیے یہ کتاب مفید نہ ہوگی۔ اگر مقصد آیات اور احادیث کا یاد کرا دینا ہے تو ٹھیک ہے لیکن اگر مقصد یہ ہے کہ وہ آیات اور احادیث کا مطلب بھی سمجھ لیں تو اس لحاظ سے یہ کتاب ان کے لیے بالکل مناسب نہیں ہے۔ اگر آیات و احادیث کی تشریح میں اتنا اختصار اختیار نہ کیا جاتا جتنا کیا گیا ہے تو یہ کتاب بڑوں کے لیے مفید ہوسکتی تھی لیکن موجودہ تشریحات کے ساتھ تو وہ بڑوں کے لیے بھی شاید ہی قابل فہم ہو۔ یہ بات ہر ہر آیت اور ہر ہر حدیث کے لحاظ سے نہیں بحیثیت مجموعی کہی جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی محسوس ہوئی کہ فاضل مرتب نے آیات کے تراجم میں بھی بعض جگہ جدت اختیار کی ہے جو صحیح نہیں ہے۔ مثال کے طور پر انھوں نے لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ ۝ کا ترجمہ کیا ہے "تم کو تمہارا بدلہ ملے گا اور مجھ کو میرا بدلہ ملے گا" یہ ترجمہ صحیح نہیں ہے۔ یہاں پر دین کا لفظ بدلے کے معنی میں استعمال

نہیں ہوا ہے بلکہ دین و مذہب کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح سورۂ الکافرون کے نیچے قوسین میں جو عبارت لکھی گئی ہے وہ بھی اپنی جگہ صحیح ہونے کے باوجود اس سورہ سے غیر متعلق ہے۔ سورۂ الفلق کی تشریح میں یہ دکھایا گیا ہے کہ حسد کا نقصان صرف حسد کرنے والے کو ہوتا ہے۔ اگر بات یہی ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر حاسد کے حسد کے شر سے پناہ مانگنے کی ضرورت کیا ہے۔

صفحہ ۶ پر آیت ۱۱۲ میں آیۃ فَتَمَسَّکُمُ النَّارُ کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ "پھر تم کو بھی (ان کی) آگ لگ جائے گی۔ قوسین میں "ان کی" کا اضافہ غلط ہے۔ معلوم نہیں مرتب کا اس سے کیا مقصد ہے۔

احادیث میں مَنْ تَرَکَ اَرْبَعِیْنَ الی آخرہ والی حدیث کا مرتب نے کوئی حوالہ نہیں دیا۔ اس کے علاوہ احا[illegible] کے انتخاب میں انھوں نے صحیح حدیثوں کا التزام نہیں کیا ہے یہ بات نامناسب ہے۔ یہ پوری کتاب نظر[illegible]

(ع۔ ق)

ترتیل القرآن

مؤلفہ خدیجہ بنت سیدنا طاہر سیف الدین۔ صفحات ۶۴۔ کاغذ، کتابت قیمت درج نہیں ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ جےجے اسپتال بمبئی

اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک ایسی خاتون کی تصنیف ہے جس کا خاندان، دولت و امارت اور ایک خاص فرقے کی دینی سیادت میں ہندوستان کا بہت مشہور خاندان ہے۔ دولت اور جاہ و منزلت کے باوجود، دین و مذہب کی طرف توجہ قابلِ قدر ہے۔ یہ رسالہ بہت آسان زبان میں اسباق کے قاعدے پر بچوں کے لیے لکھا گیا ہے اور تمام مدارس دینیہ کو صلائے عام دی گئی ہے۔ اس کا موضوع نام سے ظاہر ہے قرآن کو تجوید کے ساتھ پڑھنے کے موٹے موٹے قاعدے اس میں واضح کیے گئے ہیں۔ یہ رسالہ چونکہ افادۂ عام کے لیے لکھا گیا ہے اس لیے اس میں اپنے خاص عقیدے کی طرف اشارات نہ ہوتے تو مناسب تھا، لیکن اس خالص تجویدی قواعد کی کتاب میں بھی اس کے اشارات ضروری سمجھے گئے ہیں۔ میں پہلے بلا تبصرہ وہ القاب نقل کرتا ہوں جو مصنفہ نے اپنے والد ماجد کے لیے لکھے ہیں :۔

"صاحب الفضائل والمناقب اعلیٰ حضرت داعی اللہ الامین نائب امام المتقین شمس الدعاۃ المطلقین والدی و والد الجمیع سیدنا و مولانا ابو محمد طاہر سیف الدین خلد اللہ سلطانہ الی یوم الدین وادام ظلہ الظلیل الابوی الی ابد الآبدین "

اس کے علاوہ "قرآن کیا ہے؟" کے عنوان کے تحت ذیل کی عبارت بھی موجود ہے۔

"یہ کتاب (قرآن) اسرار و رموز کا انمول خزانہ ہے جس کو حاصل کرنا لازم ہے، مگر حصول اسی وقت ہو سکتا ہے جب انسان خود کو فنا فی العلم کے مرتبۂ عُلیا کا اہل بنائے۔"

ایک جگہ اور لکھا گیا ہے۔

"ترتیل کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ قرآن کے اسرار و حقایق کو سمجھ کر پڑھے اور فہم اسرار میں اس قدر انہماک کرے کہ اسی میں کھو جائے در اصل مدعا تنزیل کا یہی ہے۔"

یہ عبارتیں اس پمفلٹ میں نامناسب ہیں اس لحاظ سے بھی کہ یہ تمام مسلمان بچوں کے لیے مرتب کیا گیا ہے اور اس پہلو سے بھی کہ یہ بچوں کی استعداد سے بلند ہیں۔ (ع - ق)

ادب اور اسلامی قدریں

اسرار احمد خاں سہاروی۔ ایم اے، ایل ایل بی۔ صفحات ۱۰۸۔ مجلد مع گرد پوش۔ کاغذ، کتابت، طباعت معمولی۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنے

ناشر۔ مکتبۂ چراغ راہ ۳۴۲ اسٹریچن روڈ، کراچی ۱

جو لوگ ادب اسلامی کے ترجمان رسالے پڑھتے رہے ہیں وہ پروفیسر اسرار احمد خاں صاحب سے ناواقف نہیں ہیں انھوں نے ادب اسلامی کی خدمت کی ہے اور کر رہے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب بھی اسی ادب کی ایک خدمت ہے۔ مصنف نے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ اب تک ادب اسلامی کے مختلف موضوعات پر جو کچھ لکھا گیا ہے اسے انھوں نے پڑھا ہے اور اس میں سے کام کی باتیں نکالی ہیں اور بہت سے پہلو اپنی طرف سے اضافہ کر کے یہ کتاب مرتب کی ہے۔ اس طرح اس ادب سے متعلق منتشر باتیں اس کتاب میں یک جا ہوگئی ہیں۔ جو لوگ تحریک ادب اسلامی سے ناواقف ہیں ان کے لیے یہ کتاب بہت مفید ہوگی۔ وہ اس کتاب سے اس تحریک کے بارے میں بہت کچھ جان سکیں گے۔ ناواقف لوگوں کے علاوہ خود اس تحریک کے حامی ادیب و شاعر بھی اس کتاب سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ تبصرہ نگار کی نظر میں "اسلامی ادب کے موضوعات قرآن کی روشنی میں" از صفحہ ۳۳ تا ۴۹ اس کتاب کا بہت مفید حصہ ہے۔ ادب اسلامی کی تخلیق و تنقید کے اصول کیا ہوں؟ اس موضوع پر مصنف کی رائے میرے نزدیک خاص طور پر نگاہ میں رکھنے کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

اب یہ معلوم کرنے کے بعد کہ ہر قسم کا ادب جس کو ہم پڑھتے ہیں ہمارے تصورات زندگی اور عقائد پر اثر انداز ہوتا ہے ہمیں چاہیے کہ ہم اس بات کا پورا طرح خیال رکھیں کہ ہم کس قسم کا ادب پڑھ رہے ہیں اور کس قسم کا ادب تخلیق کر رہے ہیں۔ اسی خیال اور حقیقت کی روشنی میں ہمیں اپنی تنقید و تبصرے کے اصول مرتب کرنے چاہئیں اور ہمارے

نقد و نظر کا معیار اسی اصول کی رہنمائی میں قائم ہونا چاہیے .... ہمیں ہر قسم کے اصول تنقید و تبصرہ کو قبول نہ کرنا چاہیے کیونکہ خدا کو نہ ماننے والوں کی تنقید کا معیار دوسرا ہے ان کی نیکی و بدی پسند و ناپسند کے پیمانے دوسرے ہیں وہ دوسری قسم کا معاشرہ پیدا کرنا چاہتے ہیں ہم اور قسم کا ــــ اس لیے ہمارے اور ان کے ادب اور تنقید ادب میں بنیادی فرق پیدا ہو گیا ہے۔

افسوس ہے کہ ہمارے وہ ناقدین جنھوں نے صرف انگریزی زبان میں تنقید کی کتابیں پڑھی ہیں اب تک اس خیال کی اہمیت سے واقف نہیں ہو سکے ہیں۔ سرسری مطالعہ میں چند جزوی باتیں جو تبصرہ نگار کو کھٹکی ہیں ان کی نشان دہی بھی کر دینی چاہیے۔

صفحہ ۱ پر فاضل مصنف نے دینی معاملات میں غلو اور مبالغہ سے پرہیز ثابت کرنے کے لیے:
"یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا" پیش کیا ہے۔ دینی غلو کی ممانعت سے اس آیت کا تعلق نہیں ہے "لا تغلوا فِیْ دِیْنِکُمْ" کا جملہ لکھنا چاہیے تھا۔ صفحہ ۵ "بلکہ خداوند تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں خود فرمایا ہے ... طرف بڑھتا ہے تو میں بھی اس کی طرف بڑھتا ہوں" غالباً قرآن میں اس مفہوم کی کوئی آیت نہیں ہے۔ شاید مصنف کو ایک حدیث سے اشتباہ ہوا ہے ــــ اسی صفحہ پر "بلکہ حسن معاشرت کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا ہے" اس جملہ کا سباق و سیاق سے کوئی ربط نہیں ہے۔ حسن مجازی سے لطف اندوز ہونے کو حسن معاشرت کی پسندیدگی سے کیا تعلق؟ حسن معاشرت میں حسن کا لفظ حسن و جمال کے معنی میں استعمال نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کے معنی وہ ہیں جو ایک دوسرے لفظ "حسن سلوک" سے سمجھا جاتا ہے۔ صفحہ ۹ تہمت کو مصنف نے مذکر لکھا ہے حالانکہ یہ لفظ مونث ہے۔ اس کتاب کی مطبعی غلطیوں میں آیات قرآن کی غلط طباعت سخت تکلیف دہ ہے اور یہ غلطیاں دو ایک جملوں میں نہیں بہت سے جملوں میں ہیں۔ مکتبہ چراغ راہ سے اس غفلت کی توقع نہ تھی۔ (ع۔ ق)

"ادارۂ شہادتِ حق کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ اردو اور ہندی میں ایسی دینی کتابیں شائع کی جائیں جو مستند، عام فہم اور مؤثر ہونے کے ساتھ عمومی غربت کے پیش نظر زیادہ سے زیادہ ارزاں بھی ہوں"

معلوم و معروف حقیقتوں میں سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ یہ کائنات بے خدا نہیں ہے، ایک حکیم و علیم خدا نے اس کی تخلیق کی ہے، وہی اس پوری کائنات کا حکمراں ہے اور وہی اس کو چلا رہا ہے۔ ان پانچ کتابوں سے ہمیں اس حقیقت کا مفصل اور مدلل علم حاصل ہوتا ہے۔ زبان اتنی آسان اور انداز بیان اتنا دل نشین ہے کہ ہر ذہین اردو داں اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ فاضل مصنف نے ایک ترتیب کے ساتھ اس حقیقت کو واضح فرمایا ہے۔ پہلی کتاب میں دلائل کے ساتھ یہ بات واضح کی گئی ہے کہ منکرین خدا کے پاس انکار خدا کی کوئی دلیل نہیں، بلکہ اس کی بنیاد احمقانہ ہٹ دھرمی پر قائم ہے۔ معمولی سے معمولی عقل رکھنے والا انسان بھی عقلی و علمی بنیاد پر خدا کا انکار نہیں کرتا، نہیں کر سکتا۔ دوسری کتاب میں ناقابل انکار دلیلوں سے ثابت کیا گیا ہے کہ خدا ہے کیونکہ اس کا انکار کر دینے کے بعد کوئی شخص اس کائنات کی معقول توجیہ پیش نہیں کر سکتا۔ تیسری کتاب میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ انسان کسی حال میں خدا سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ خدا کی اطاعت کے بغیر انسانی مسائل حل نہیں ہو سکتے اور خدا کو ماننا انسان کی سب سے بڑی علمی اور عملی ضرورت ہے۔ چوتھی کتاب میں ان شبہات کو مفصل طور پر بیان کیا گیا ہے جو ملحدین وجود خدا کے بارے میں پیش کرتے ہیں اور پھر ان کا کھوکھلا پن واضح کیا گیا ہے۔ پانچویں کتاب میں دلیلوں کے ساتھ یہ ثابت کیا گیا ہے کہ سچی خدا پرستی خرابیوں کی جڑ نہیں ہے، بلکہ ان کی جڑ یا تو جھوٹی مذہبیت رہی ہے یا موجودہ دور میں فساد کی جڑ لادینیت (سیکولرزم) ہے۔

میرا مشورہ یہ ہے کہ اسکول کالج اور مدرسوں کے طلبہ ان کتابوں کا براہ راست منگوا کر مطالعہ کریں۔ یہ کتابیں بہرحال ان کے لیے مفید ثابت ہوں گی۔ مصنف کی خدمت میں دو باتیں عرض کرنی ہیں۔ ایک یہ کہ چوتھی کتاب میں "کیا خدا کے لیے خالق چاہیے" کے عنوان کے تحت جو کچھ لکھا ہے اس میں تکرار بھی بہت ہے اور الجھاؤ بھی محسوس ہوتا ہے۔ آئندہ اشاعت میں اس حصے پر خصوصیت کے ساتھ نظر ثانی کر لیں تو اچھا ہے۔ پانچویں کتاب میں "عیسائیت کی تاریخ" اس کا سب سے بڑا حصہ ہے۔ بلاشبہہ یہ بہت قیمتی اور معلومات افزا ہے لیکن راقم کا خیال یہ ہے کہ اس بحث کے لیے علیحدہ کتاب ہو تو بہتر ہے۔ اس کتاب میں اگر ایسا کیا جاتا کہ سچی خدا پرستی نے انسانی زندگی کو سنوارنے میں جو حصہ لیا ہے اس کے کچھ نمونے پیش کیے جاتے اور انسانوں کی گھڑی ہوئی جھوٹی مذہبیت نے جو فساد اور خرابیاں پیدا کیں ان کے کچھ تاریخی نمونے دیے جاتے تو زیادہ مفید ہوتا۔ عیسائیت کی تاریخ پر اجمالی گفتگو اس کتاب میں کافی ہوتی۔

(ع - ق)

ماہنامہ

زندگی رامپور

شوال ۱۳۸۲ھ
مارچ ۱۹۶۳ء

جلد:۔ ۳۰
شمارہ:۔ ۳

مدیر:۔ سید احمد قادری

● خط وکتابت وارسال زر کا پتہ — منیجر "زندگی" رامپور۔ یوپی

● زر سالانہ:۔ صہ ششماہی:۔ تین روپیہ — فی پرچہ:۔ پچاس نئے پیسے

● ممالک غیر سے: دس شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر

پاکستانی اصحاب مندرجہ ذیل پتہ پر رقوم بھیجیں اور رسید ہمیں ارسال فرمائیں

منیجر ہفت روزہ "شہاب" ۱۱/C شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

مالک: جماعت اسلامی ہند۔ اڈیٹر:۔ سید احمد عروج قادری۔ پرنٹر پبلشر:۔ احمد حسین۔ مطبع:۔ دہلی پرنٹنگ پریس بنگلا آنا خاں رامپور یوپی

مقام اشاعت:۔ دفتر زندگی دکانتی رامپور۔ یوپی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

سید احمد قادری

"زمانہ با تو نسازد، تو با زمانہ بساز" اور "زمانہ با تو نسازد، تو با زمانہ ستیز" "زمانہ اگر تیرے موافق نہ ہو تو، تو زمانے کے موافق ہو جا" اور "زمانہ اگر تیرے موافق نہ ہو تو لڑ کر اسے اپنے موافق بنا"۔ یہ دو جملے محض لطیفے کے طور پر نہیں کہے گئے ہیں اور نہ ان کی حیثیت کسی پر لطف کہاوت کی ہے، بلکہ ان دو جملوں میں زندگی کے دو نظریے اور دو طرز عمل سمائے ہوئے ہیں، اور آج مسلمان معاشرے میں، ہر جگہ ــــ دنیا کے ہر خطے میں جہاں مسلمان بستے ہیں چاہے وہ اکثریت میں ہوں یا اقلیت میں ــــ زندگی کے یہ دو نظریے اور طرز عمل آپس میں ٹکرا رہے ہیں۔ دنیا میں اسلام کی موجودہ مغلوبیت اور مسلم معاشرے کی بے وزنی و بے وقری کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ مسلمانوں کا اونچا طبقہ جس کے ہاتھ میں قیادت کی باگ ہے۔ "با زمانہ بساز" کے نظریے پر عمل پیرا ہے اور صرف عمل پیرا ہی نہیں ہے بلکہ ہر اس تحریک کو کچل دینا چاہتا ہے جو "با زمانہ ستیز" کی انقلابی دعوت لے کر اٹھی ہو۔ کہیں دنیا کی محبت اور مغربی تہذیب کا استیلا ان کے ذہن کو شکست خوردہ بنا رہا ہے اور کہیں غیر مسلم معاشرے کا دباؤ، انہیں اس درس و تدریس پر ابھار رہا ہے۔ ہم چونکہ ایک ایسے ملک کے باشندے ہیں جہاں ہماری تعداد دوسروں کے مقابلے میں کم ہے اس لیے ہم یہیں کے حالات سے بحث کرنا چاہتے ہیں۔

ان افراد اور جماعتوں کو چھوڑیے جن کے نزدیک، دین و اخلاق اور سربلندیٔ اسلام کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ مسلمانوں کے ان رہبران قوم کے قول و عمل اور ان کی جد و جہد کو دیکھیے جو اسلامی تہذیب و اقدار سے محبت کرتے اور اس کی سربلندی کا جذبہ بھی رکھتے ہیں۔ آپ پائیں گے کہ ان کی بھی بہت بڑی اکثریت، حالات کی ناسازگاری کا رونا رو رہی ہوگی اور کسی ایسی تحریک کے نام سے بھی کانوں پر ہاتھ رکھ رہی ہوگی جو "با زمانہ ستیز" کا علم بلند کر رہی ہو ــــ مسلمانوں کی رگوں میں "با زمانہ بساز" کی افیون دوڑانے والے سبھی لوگ مفاد پرست اور خود غرض نہیں ہیں بلکہ

ان میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کے خلوص اور درد ملت کی قسم کھائی جاسکتی ہے، وہ حالات کے ساتھ سازگاری کی جو نصیحت کرتے ہیں اس میں بڑا خلوص ہوتا ہے۔ وہ شاید اپنے آپ کو اس بات پر مجبور پاتے ہیں کہ ملت کو حالات کی سنگینی کا احساس دلائیں اور اسے یہ سبق پڑھائیں کہ اگر حالات تیرے لیے سازگار نہیں ہیں تو اپنے کو حالات کے چوکھٹے میں فٹ کرلے۔ ابھی اعلائے کلمۃ اللہ کا نام نہ لے۔ ابھی اسلام کی حکمرانی کا خیال بالائے طاق رکھ دے۔ کوئی شک نہیں کہ اسلام دین برحق ہے اور تمام انسانوں کے لیے ہے۔ لاریب کہ قرآن کا قانون بے عیب ہے اور پوری دنیا کے لیے نازل ہوا ہے۔ کوئی شبہہ نہیں کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و نبوت عالم گیر ہے اور قیامت تک یہ بھی قطعی ہے کہ آخرت آنے والی ہے اور وہاں اپنی زندگی کا حساب بھی دینا ہوگا لیکن یہ باتیں ہیں اور یہ سب ٹھنڈے اور لچلچے سے کہنے کی ہیں تاکہ مشاعروں کی طرح واہ واہ، سبحان اللہ کے نعرے بلند ہوں۔ ان عقائد و نظریات کو غیر مسلموں کے سامنے اس لیے پیش کرنا کہ وہ اسے قبول کریں ورنہ ہوجائے گی اور مسلمانوں کے سامنے اس لیے پیش کرنا کہ وہ انہیں کی سربلندی کو اپنی جدوجہد کا محور بنائیں، بے وقت کی راگنی ہے، صریح خام خیالی ہے، حکمت دعوت کے منافی ہے ــــ ابھی تو ملت اسلامیہ ہندیہ اور امت مرحومہ بھارتیہ کا وجود خطرے میں ہے اس کی جان و مال خطرے میں ہے، اس کی عزت و آبرو خطرے میں ہے اور اس کے حقوق پامال ہیں۔ ابھی مسلمانوں کی جدوجہد کا رخ یہ ہونا چاہیے کہ وقت کی حکومت اور غالب اکثریت ان کی بقائے وجود کی گارنٹی دے، ان کی جان و مال کی حفاظت کا بندوبست کرے، ان کی عزت و آبرو پر حملہ بند کرے ان کو آبادی کے تناسب سے حکومتی محکموں سے لے کر اسمبلیوں اور پارلیمینٹوں تک میں حصہ رسدی عطا کرے۔ جب یہ سب کچھ ہولے گا تو اسلام کی خدمت بھی کرلیں گے ابھی جلدی کیا ہے، حالات تو سازگار ہولیں، جو تحریکیں زمانے کا ساتھ نہیں دیتیں، زمانہ انہیں اپنے قدموں تلے روند کر آگے بڑھ جاتا ہے ــ

اسلام کو سربلند کرنے کی جدوجہد سے دامن بچانے کے لیے یہ کوئی نیا استدلال نہیں ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے جب آزادیِ وطن کی جنگ چھڑی ہوئی تھی تو کبھی کبھی من چلے نوجوان ایک مشہور مذہبی و سیاسی جماعت کے محترم رہبروں سے کہتے تھے کہ جنگ آزادی کے بجائے ہندستان میں اسلام کو سربلند کرنے کی جدوجہد کیوں نہ کی جائے؟ اس کا جواب اب تک راقم الحروف کے کانوں میں گونج رہا ہے۔ ہمارے محترم بزرگ جواب میں فرماتے تھے: میاں یہ جنگ آزادی اعلائے کلمۃ اللہ کی جدوجہد کی تمہید ہے۔ تم انگریزوں کی طاقت سے واقف نہیں ہو۔ اس طاقت نے نہ صرف ہندستان کو بلکہ تمام ممالک اسلامیہ کو اپنے شکنجے میں کس رکھا ہے۔ اسلام کا علم بلند کرنے کا وقت وہ ہوگا جب ہم اس شکنجے کو

توڑ دیں گے تب براہ راست احیائے دین اور غلبۂ اسلام کی جدوجہد شروع کی جاسکے گی ـــــ انگریزی کی طاقت کا شکنجہ ٹوٹ گیا، ہندوستان آزاد ہو گیا، ممالک اسلامیہ آزاد ہو گئے لیکن پندرہ سولہ سال گزر جانے کے باوجود سربلندیِ اسلام کی جدوجہد کے لیے حالات اب تک سازگار نہیں ہوئے۔

دوسری طرف سے صدا بلند ہوتی ہے کہ انگریز بھارت سے دور دفع ہو چکا، غیر ملکی سامراج ختم ہوا، غلامی کا اندھیرا چھنٹ گیا، آزادی کی روشنی چمک اٹھی، کل ہم غلام تھے، آج آزاد ہیں۔ ملک ہمارا، ملک کی دولت ہماری، ملک کا اقتدار ہمارا، اسمبلی ہماری، پارلیمنٹ ہماری، تمام قانون ساز ادارے ہمارے۔ ہم مختارِ مطلق ہیں جو چاہیں کریں۔ ہمارے جی میں آئے تو ملک میں قرآن کا قانون نافذ کریں۔ ہماری مرضی ہو تو وید اور منوسمرتی کے قوانین نافذ کریں۔ ہماری خوشی ہو تو یورپ و امریکہ کے دستور اپنا لیں یا دنیا کے دساتیر کو سامنے رکھ کر ایک مرکب دستور بنا لیں۔ کس کی مجال ہے جو ہماری مرضیات پر قدغن لگائے، کس کی ہمت ہے جو ہمیں کسی قانون کی تنفیذ پر ٹوکے ملک کی نوعیت بدل گئی، حاکمیت کا مفہوم بدل گیا، سیکولرزم کا مطلب بدل گیا۔ یہ کیا جمود ہے کہ الفاظ کے انہیں لغوی اصطلاحی مفاہیم و مطالب پر اصرار کیا جائے جو زمانۂ سابق کے لوگ لکھ گئے ہیں۔ یہ کیا رقیانوسیت ہے کہ عصری تقاضوں سے آنکھیں بند کر لی جائیں، اور پونے چودہ سو برس پرانی خلافت کے احیاء کا خواب دیکھا جائے۔ یہ جمہوریت عوام کا زمانہ ہے، قبائلی دور نہیں ہے۔ اور پھر یہ کہ اسلامی حکومت کی تعریف کیا ہے؟ اس کا مقصد دیکھو، جوہر دیکھو، روح دیکھو، لفظوں میں کیا رکھا ہے۔ چھلکوں کی کیا اہمیت ہے، جسم کی کیا حیثیت ہے، مقصد ہے عدل و انصاف کا قیام، لہٰذا یہ دیکھو کہ ہمارے دستور میں اس کو قائم کیا گیا ہے یا نہیں؟ کیا اس میں تم کسی ظلم کی نشان دہی کر سکتے ہو؟ کیا اس میں بھارت کے تمام باشندوں کو یکساں حقوق نہیں دیے گئے ہیں؟ اور کیا اس پر کچھ نہ کچھ عمل نہیں ہو رہا ہے؟ کیا تم اس حقیقت کا انکار کر سکتے ہو؟ نہیں کر سکتے، ہزار برس نہیں کر سکتے۔ پھر یہ اقامتِ دین، خلافتِ راشدہ، حکومتِ الٰہیہ، خلافت علیٰ منہاج النبوۃ اور اسلامی حکومت کی صدائے بے ہنگام کا کیا مطلب؟ کیا تم مجنون ہو گئے ہو؟ کیا تمہارے دماغ میں سودا اچھل رہا ہے؟ ہوش کے ناخن لو، دیوانے نہ بنو۔

تیسری طرف سے آواز آتی ہے کہ دین کی اقامت کا مقصد برحق۔ دوسری حکومتوں پر اسلامی حکومت کی برتری برحق، احیائے اسلام کی تمنا برحق، لیکن اسے جماعتی نعرہ بنانا غلط، اس کے لیے براہ راست جدوجہد غلط۔ اس مقصد کے حصول کے لیے تنظیم غلط، تحریک غلط، حالات تو دیکھو، زمانے پر تو نظر ڈالو۔ ان صداؤں کا منبع وہ زور دار اور

پرشور ہنگامہ ہے جو وقت کی حکومت اور غالب اکثریت کے طاقتور پلیٹ فارموں سے بلند ہو رہا ہے کہ بھارت کی پوتر زمین اور اسلامی حکومت کا قیام؟ ایں خیال است و محال است و جنوں ــــــ یہ فرقہ پرستی ہے، ناقابل برداشت فرقہ پرستی ہے ـ مسلمانو! حالات دیکھو، زمانے پر نظر ڈالو، اپنی عہد کا تصور باندھو، تمہاری خیریت اس میں ہے کہ اپنے آپ کو زمانے کے سانچے میں ڈھال لو ـ

اندازہ لگائیے کہ "بازمانہ بساز" کے اس چوطرفہ ہنگامہ رستخیز میں محض اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے بازماند… نحیف و کمزور آواز بلند کرنا کس قدر صبر آزما کام ہے ـ کیا سر کو ہتھیلی پر رکھے بغیر یہ کام کیا جا سکتا… قربانی سے آنکھیں چرا کر یہ مہم سر کی جا سکتی ہے؟

حالات کی ناسازگاری کا "ہوا" کھڑا کرنے والوں سے یہ نحیف و کمزور آواز پوچھتی ہے کہ جب… بندے اور جلیل القدر پیغمبر نوح (علیہ السلام) نے اپنی نافرمان اور سرکش قوم کو پکارا تھا تو کیا ان کی اس پکار کے لیے حالات سازگار تھے؟ زمانہ ان کے موافق تھا؟ روحِ عصر ان کی دعوت سے ہم آہنگ تھی؟ یا حالات سو فی صدی ناسازگار زمانہ سو فی صدی ناموافق اور روحِ عصر سو فی صدی مخالف تھی؟ پھر یہ بھی بتائیے کہ اس پکار میں "بازمانہ بساز" کا آہنگ تھا یا "بازمانہ ستیز" کی کڑک تھی؟ اس میں صلح کا اہتزاز تھا یا جنگ کا زلزلہ؟ ساتھ ہی ساتھ اس سوال کا جواب بھی ارشاد ہو کہ انھوں نے اپنی دعوت پر لبیک کہنے والوں کے حقوق کے لیے، تحفظ جان و مال کے لیے، سوسائٹی میں عزت و وقار کے لیے کونسی مہم چلائی تھی حالانکہ اس وقت کی مغرور سوسائٹی ان مومنوں کو "اراذل" کے خطاب سے نواز رہی تھی ـ

جب خدا کے برگزیدہ بندے ابراہیم (علیہ السلام) نے صدائے توحید بلند کی تھی تو حالات کتنے فی صدی موافق تھے؟ نمرود کی خدائی مسرت سے کھل اٹھی تھی یا غصے سے بھڑک اٹھی تھی؟ نمرود کی حکومت نے ان کے سامنے پھول پیش کیے تھے یا انگارے؟ ان کے حلقوم سے بازمانہ بساز کی لے نکل رہی تھی یا بازمانہ ستیز کا نعرہ ـ

جب خدا سے ہم کلامی کا شرف پانے والے موسیٰ (علیہ السلام) نے فرعون کو بر سر دربار پکارا تھا تو صورت حال کیا تھی؟ اور اس صورت حال میں ان کی جد و جہد کا مرکز کیا تھا؟ بنی اسرائیل مصر کی آبادی میں دس فی صدی تھے تو بتائیے کہ حضرت موسیٰؑ نے اس دس فی صدی کے لیے دربار فرعون میں کتنی نمائندگی کا مطالبہ کیا تھا ـ اس کی حکومت میں حقوق حاصل کرنے کے لیے کونسی فہرست پیش کی تھی؟

جب روح اللہ کا لقب پانے والے عیسیٰ (علیہ السلام) نے بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کو راہ راست پر لانا چاہا تھا تو حالات کیا تھے؟ قوم نے ان کی دعوت کا کیا جواب دیا؟ اور پھر انھوں نے اور ان کے حواریوں نے کیا روش اختیار کیا؟ پھر اس سوال کا بھی جواب ملنا چاہیے کہ جب انھوں نے اپنی قوم کے آخری انکار کو محسوس کر لیا تو اپنے حواریوں کے سامنے من انصاری الی اللہ کی دعوت رکھی یا من انصاری الی طلب الحقوق کی؟

اب آیئے آخر میں دنیا کے آخری رسول کی تاریخ پڑھیے، بتایئے، ان کی انقلابی دعوت کے لیے مکہ ہی نہیں، حجاز ہی نہیں، عرب ہی نہیں، پوری دنیا میں حالات کی سازگاری کا تناسب کیا تھا؟ کیا ان کی دعوت میں، ان کے رویے میں، ان کی جدوجہد میں باز مانہ بسازی کی کوئی رمق، کوئی شمہ یا کوئی اثر موجود تھا؟ کیا انھوں نے اپنے ماننے والوں کے لیے مکہ کے دارالندوہ میں کسی نمائندگی کا مطالبہ کیا؟ کیا انھوں نے اس وقت کی قبائلی پارلیمنٹ میں اپنے حقوق کی کوئی فہرست بھیجی بلکہ یہ کیا بات ہے کہ جب ان کے سامنے مکہ کی ریاست پیش کی گئی تو انھوں نے اسے پائے استحقار سے ٹھکرا دیا۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ اس دور میں جب مکہ کے مومنوں پر خود ان کے وطن کی زمین تنگ کی جا رہی تھی اور ان کا جینا دوبھر کر دیا گیا تھا خدائے ذوالجلال کی پُرجلال آواز یوں گونجی :-

"اے محمد، تم اور تمہارے ساتھی جو (کفر و بغاوت سے ایمان و طاعت کی طرف) پلٹ آئے ہیں۔ ٹھیک ٹھیک راہ راست پر ثابت قدم رہو، جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے اور بندگی کی حد سے تجاوز نہ کرو۔ جو کچھ تم کر رہے ہو اس پر تمہارا رب نگاہ رکھتا ہے۔ ان ظالموں کی طرف ذرا نہ جھکنا ورنہ جہنم کی لپیٹ میں آجاؤ گے اور تمہیں کوئی ایسا ولی و سرپرست نہ ملے گا جو خدا کے عذاب سے بچا سکے اور نہ کہیں سے تمہیں مدد پہنچے گی۔　　　(ہود ر ۱۰)

خدائے ذوالجلال نے جس کی بے کراں رحمت پر ہمارا ایمان ہے۔ حالات کی ذرہ برابر رعایت نہیں فرمائی اور ان جاں گسل حالات میں باطل سے ایک ایسی نفرت اور حق پر ایک ایسی استقامت کا مطالبہ کیا جس سے پتھر کا جگر بھی شق ہوتا ہے اس پر بس نہیں کیا گیا بلکہ اللہ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنے فضل و کرم کا ذکر کرتے ہوئے کہا:-

اور بعید نہ تھا کہ اگر ہم تمہیں مضبوط نہ رکھتے تو تم ان کی طرف کچھ نہ کچھ جھک جاتے لیکن اگر تم ایسا کرتے تو ہم تمہیں دنیا میں بھی دوہرے عذاب کا مزہ چکھاتے اور آخرت میں بھی دوہرے عذاب کا ــ پھر ہمارے مقابلے میں تم کوئی مددگار نہ پاتے۔　　　(بنی اسرائیل ر ۸)

ایک طرف آخری رسول اور ان کے ساتھیوں کو یہ تنبیہات کی جا رہی تھیں اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ باغیوں کو جتھہ بندی کے گھمنڈ پر دل شگاف الفاظ میں سنا رہا تھا:-

سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ ۝　　　　عنقریب یہ جتھہ شکست کھا جائے گا اور یہ لوگ دُم دبا کر بھاگیں گے

اور اسی کے ساتھ مسلمانوں کو سنایا جا رہا تھا:۔

وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ ۝　　　　اور ہم پر یہ حق ہے کہ مومنوں کی مدد کریں۔

سوال یہ ہے کہ ان تمام حقیقتوں میں مسلمانوں کے لیے با زمانہ بساز کا سبق ہے یا با زمانہ ستیز کا؟ اس کے علاوہ کسی بھی انقلابی دعوت کی کامیابی کے لیے اگر حالات کی سازگاری شرط ہوتی تو دنیا میں کوئی انقلابی دعوت کامیاب نہ ہوتی۔

ہمارا تخاطب جن لوگوں سے ہے وہ یہ کہنے کی شاید جرأت نہیں کرسکتے کہ قطعی نامساعد و ناسازگار حالا[ت میں انبیاء] علیہم السلام نے بندگی رب کی جو ہمہ گیر انقلاب انگیز دعوت پیش کی اور اس دعوت کو اپنی تمام توجہات ا[و]ر[کوششوں کا] مرکز و محور بنایا تو اس میں انھوں نے کوئی غلطی کی۔ یہ بات بھی کسی کے منہ سے نہیں نکل سکتی کہ باطل پرستوں [سے بیزاری] حکمت دعوت کے منافی تھا۔ کوئی شخص یہ کہنے کی جرأت بھی نہیں کرسکتا کہ باطل سے نفرت اور حق پر استقامت کا [جو ح]کم اللہ تعالیٰ نے دیا تھا وہ صرف اس دور کے مسلمانوں کے لیے تھا اور انہیں حالات کے ساتھ خاص تھا جن میں [وہ] گرفتار تھے۔ یہ بات بھی نہیں کہی جاسکتی کہ اللہ نے اپنی مدد کا وعدہ صرف اسی دور کے مسلمانوں سے کیا تھا۔ یہ دعویٰ [بھ]ی عجیب و غریب ہوگا کہ بھارت میں دعوت اسلامی اور مسلمانوں کے لیے حالات اس سے زیادہ ناسازگار ہیں جتنے بنی اسرائیل [کے] لیے مصر میں اور عرب کے مسلمانوں کے لیے مکہ میں تھے۔ پھر معلوم نہیں کس دلیل کی بنیاد پر وہ مسلمانوں کو با زمانہ بساز کی [د]عوت دیتے اور انہیں حقوق طلبی کی راہ پر دوڑاتے ہیں۔ یہ بھی ایک طرفہ تماشا ہی ہے کہ لوگ حالات کی ناسازگاری کو [ت]حریک اقامت دین کے خلاف دلیل بناتے ہیں حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ حالات کی ناسازگاری اور باطل کے غلبے ہی کا تقاضا یہ ہے کہ حق کو سربلند کرنے کی جدوجہد کی جائے۔

گستاخی معاف ہو تو کہوں کہ جو رہنما حالات کی ناسازگاری کا عذر پیش کرکے اقامت دین کی جدوجہد سے دامن بچانے اور مسلمانوں کے لیے حقوق طلب کرنے کو جدوجہد کا مرکز بنانا چاہتے ہیں وہ اپنے اور مسلمانوں کے مقصد وجود سے یا تو غافل ہیں یا اس سخت قسم کی غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ دعوت اسلامی کی کامیابی کے لیے یا اسے پیش کرنے کے لیے حالات کی سازگاری ضروری ہے۔ یہ بات ایسی ہے جیسے کوئی اندھیرے میں چراغ جلانے والے سے کہے کہ چراغ نہ جلاؤ، ابھی تاریکی ہے۔

ایمان و اسلام کے دنیوی صلے کی پیشکش

سید احمد قادری

عن ابن عباس قال مرض ابو طالب فجاءته قریش وجاءه النبی صلی اللہ علیہ وسلم وعند ابی طالب مجلس رجل فقام ابو جهل کی یمنعه قال و شکوه الی ابی طالب فقال یا ابن اخی ما ترید من قومك قال ارید منهم کلمة تدین لهم بها العرب وتؤدی الیهم العجم الجزیة قال کلمة واحدة قال کلمة واحدة فقال یا عم قولوا لا اله الا الله فقالوا الها واحدا ما سمعنا بهذا فی الملة الآخرة ان هذا الا اختلاق قال فنزل فیهم القرآن ص والقرآن ذی الذکر بل الذین کفروا فی عزة وشقاق الی قوله ما سمعنا بهذا فی الملة الآخرة ان هذا الا اختلاق ۵ هذا حدیث حسن صحیح

(ترمذی شریف جلد ۲)

ترجمہ :- ابن عباس کہتے ہیں کہ ابو طالب بیمار ہوئے تو قریش کے لوگ ان کے پاس آئے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی تشریف لائے۔ ابو طالب کے قریب ایک شخص کے بیٹھنے کی جگہ خالی تھی۔ ابو جہل کھڑا ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وہاں پر بیٹھنے سے روک دے۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ پھر قریش کے لوگوں نے ابو طالب سے آپ کی شکایت کی۔ انھوں نے حضور سے کہا "اے میرے بھتیجے، تم اپنی قوم سے کیا چاہتے ہو؟" آپ نے فرمایا میں صرف ایک کلمہ چاہتا ہوں جو پورے عرب کو ان کا تابع فرمان بنا دے گا اور عجم ان کے پاس جزیہ بھیجنے لگیں گے۔ ابو طالب نے کہا۔ صرف ایک کلمہ؟ آپ نے فرمایا ہاں صرف ایک کلمہ۔ پھر آپ نے فرمایا اے چچا آپ سب مل کر کہیے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ، یہ سنتے ہی سرداران قریش کہنے لگے۔ صرف ایک الٰہ؟ ہم نے تو اپنی ملت میں یہ بات کبھی نہیں سنی۔ یہ تو یقیناً

(باقی صفحہ ۵۹ پر ملاحظہ ہو)

منزل اور نشانِ منزل

مولانا سید جلال الدین عمری

انسانیت کی نجات امت مسلمہ کے ہاتھ میں ہے لیکن اس دَور کا سب سے بڑا سانحہ کا احساس تک نہیں ہے۔ وہ موت کی نیند سو رہی ہے اور اس کے ساتھ ساری انسانیت پر موت ہے۔ موجودہ دَور علوم و فنون کا دَور ہے۔ آج اس میدان میں وہ سب کچھ ہو رہا ہے جو شاید اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ سائنس کی حیرت انگیز ایجادات مسلسل سامنے آ رہی ہیں۔ انسان آسمان پر کمندیں ڈال رہا ہے اور جن چیزوں کو ناممکن سمجھا جاتا تھا وہ نہ صرف یہ کہ ممکن بن گئی ہیں بلکہ تجربے کے مراحل سے گزر چکی ہیں لیکن یہ سب کام جس بڑے پیمانے پر ہو رہے ہیں اتنے ہی بڑے پیمانے پر خدا سے انسان کی غفلت بھی بڑھی ہوئی ہے۔ وہ خدا کو بھول چکا ہے اور اپنے انجام سے بے خبر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آج انسان کا خدا سے غافل ہونا تاریخ کا کوئی نیا واقعہ نہیں ہے بلکہ یہ اس کا بہت پرانا مرض ہے۔ وہ بارہا خدا سے غافل ہوا ہے لیکن یہ اس کی خوش بختی تھی کہ جب کبھی وہ غفلت میں پایا گیا خدا کے نیک بندوں نے اسے جگانے کی کوشش کی اور اسے خدا کی بندگی کی طرف متوجہ کیا اور اب اس کی بدنصیبی کا دور ہے کہ جس امت کو اسے جگانے اور خدا کے عذاب سے ڈرانے پر مامور کیا گیا تھا وہ اپنا فرض بھولے ہوئے ہے۔ خدا نے اسے جس کام پر لگایا تھا اس کام کو اس نے چھوڑ دیا ہے، اور اس کے برعکس کاموں میں لگی ہوئی ہے۔ اس کا کام 'خیر' کی طرف دعوت دینا تھا لیکن بجائے 'خیر' کے وہ شر کی طرف بلا رہی ہے۔ اسے دنیا میں 'عدل و قسط' قائم کرنا تھا لیکن وہ جور و ظلم کی علمبردار ہے۔ وہ ایک عظیم مقصد کے لیے وجود میں لائی گئی تھی اور یہ مقصد سوائے اس کے دنیا کی کوئی دوسری جماعت پورا نہیں کر سکتی، لیکن افسوس کہ وہ اس مقصد ہی سے غافل ہو چکی ہے۔

امتِ مسلمہ پر تین دَور گزر چکے ہیں۔ پہلا دور جب کہ وہ خود بھی خدا کے دین پر قائم ہوتی اور دنیا میں

اس دین کو قائم کرنے کی جدوجہد بھی کر رہی تھی۔ وہ 'دعوت الی الخیر' کے لیے وجود میں لائی گئی تھی اور پوری قوت کے ساتھ دنیا کو 'خیر' کی طرف بلا رہی تھی۔ باطل نے ہر طرح اسے دبانے کی کوشش کی اور ہر پہلو سے اس کا مقابلہ کیا لیکن وہ اس فیصلے کے ساتھ میدان میں جمی رہی کہ یا تو دعوتِ خیر غالب ہوگی یا وہ اس راہ میں فنا ہو جائے گی۔ چنانچہ اس کے ہاتھوں یہ دعوت غالب ہوئی۔ دنیا سے کفر و باطل مٹا اور خدا کا دین زمین پر قائم ہوا۔ یہ اس امت کی صحیح ترین حالت تھی۔

اس امت کا دوسرا دَور وہ تھا جبکہ وہ دعوتِ خیر کا کام ایک مدت دراز تک انجام دینے کے بعد چھوڑ چکی تھی۔ اس دور میں وہ خود تو دین پر قائم تھی لیکن دوسروں پر دین قائم کرنے کی کوشش نہیں کر رہی تھی، اس سے تعلق رکھنے والے افراد اپنی جگہ نیک اور اعلیٰ اخلاقیات کے حامل تھے، اپنی نجی زندگی میں خداترس اور اس کے احکام کے پابند تھے لیکن ان میں دوسروں کی اصلاح کا جذبہ سرد پڑ چکا تھا۔ انھوں نے اس بات کو کافی سمجھا کہ خدا کا دین ان کی زندگیوں میں باقی رہے اور اپنے اس فرض کی طرف توجہ نہیں کی کہ اسے دوسروں کے درمیان پھیلائیں۔ دنیا ایمان کی حقیقت سے ناواقف تھی لیکن وہ مطمئن تھے کہ ایمان کی دولت سے وہ محروم نہیں ہیں۔ وہ خدا کے دین کو محض اپنی ذاتی اصلاح و تربیت کا ذریعہ سمجھنے لگے اور اس کی انقلابی حیثیت کو بھول گئے۔ یہی دور تھا جب کہ ذہنوں میں یہ تصور ابھرنے لگا کہ 'تزکیہ ذات' دین کی آخری منزل ہے اور دوسروں کا تزکیہ اس کے حدود سے خارج ہے۔ یہ اس امت کے زوال کی ابتدا تھی۔

امت مسلمہ پر تیسرا دور وہ آیا جب کہ وہ نہ تو خود دین پر قائم تھی اور نہ دوسروں پر دین قائم کرنے کی جدوجہد کر رہی تھی لیکن اس کے باوجود دین کا صحیح تصور اس کے اندر زندہ تھا۔ امت کا مزاج مجموعی حیثیت میں ابھی اتنا صالح اور تندرست تھا کہ وہ کسی غلط تصورِ دین کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھی۔ دین کی فرماں روائی اس کے اندر سے ختم ہو چکی تھی لیکن وہ اس حقیقت کو مان رہی تھی کہ زندگی پر حکومت کا حق دین ہی کو حاصل ہے۔ یقیناً وہ دین کی انقلابی حیثیت کو بھلا چکی تھی لیکن اس کی منکر نہیں تھی۔ وہ عملی لحاظ سے اپنا حقیقی مقام چھوڑ چکی تھی لیکن نظریاتی زوال اس پر نہیں آیا تھا۔

اس وقت امت چوتھے دور سے گزر رہی ہے۔ یہ اس کے نظریاتی زوال کا دور ہے۔ آج نہ صرف یہ کہ اس کے عمل کی قوتیں مضمحل ہو چکی ہیں بلکہ وہ فکر و تدبر کی صلاحیت بھی کھو چکی ہے۔ خدا کی طرف سے اسے جس کارِ عظیم پر مامور کیا گیا تھا اب وہ اس کے سمجھنے سے بھی قاصر ہے۔ اسے 'دعوتِ خیر' کا حکم ملا تھا لیکن اس کا

ذہن 'خیر' کے تصور ہی سے خالی ہے ۔ اسے خدا کے دین کو دنیا میں قائم کرنا تھا لیکن اپنے افکار و اعمال سے وہ
دین کو مٹا رہی ہے ۔ خدائے تعالیٰ اس سے بہت بڑا کام لینا چاہتا ہے لیکن وہ چھوٹے چھوٹے کاموں میں پھنسی ہوئی
ہے ۔ اس کے مقاصد محدود ہیں اور اس کی دلچسپیوں کا دائرہ تنگ ہے ۔ خدا کے دین کی طرف دعوت دینا
اور اسے قائم کرنے کی جد و جہد کرنا اس کے نزدیک ایک مجنونانہ عمل ہے ۔ باطل کو چھیڑنا اور اس سے جنگ کرنا
اس کے اصول کے خلاف ہے ۔ وہ ان مسائل پر تنقید کرنا نہیں چاہتی جو کفر کو محبوب ہیں ۔ وہ ہر اس کام سے دور بھاگتی
ہے جس سے اقتدارِ وقت کے ماتھے پر شکن پڑتی ہے ۔ وہ پستی کے اس مقام کو پہنچ چکی ہے کہ اس کا جو فرض تھا اسے
اپنا فرض ماننے کے لیے بھی تیار نہیں ہے ۔ اگر آپ اسے اپنے مقصدِ حیات کی طرف بازگشت!
اس میں ایسے 'صالحین' زندہ و سلامت موجود ہیں جو آپ کو حقیقتِ دین سے بے خبر کہیں
بتاتے ہیں کہ اس کا نصب العین خدا کے دین کی طرف دعوت دینا اور اسے قائم کرنے کی
میں ایسے 'اربابِ فکر' پرورش پا رہے ہیں جو آپ پر تحریفِ دین کا الزام لگائیں گے ۔ خدا کا دین
میں ایک زبردست انقلاب چاہتا ہے لیکن اس امت میں ایسے 'محققین' کی کمی نہیں ہے جن کے نزدیک قرآن
کی ہر اس آیت کی تاویل موجود ہے جو دین کے انقلابی پہلو کو پیش کرتی ہے ۔ طرفہ تماشا یہ کہ ان محققین کو اپنی
تمام تاویلات الہامی معلوم ہوتی ہیں اور انہیں ان پر شرحِ صدر حاصل ہے ۔ ان کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے مدتوں
قرآن کی تعلیمات پر غور کیا ہے اور اس کے اسرار و معانی کو سمجھنے کی کوشش کی ہے جس کے نتیجے میں خدا نے ان پر
قرآنی علوم کی راہیں کھول دی ہیں ۔ حالانکہ یہ سب کچھ ایک نفسیاتی فریب ہے ۔ انہیں اس کی کوئی پروا نہیں ہے کہ
ان کا الہام وحیِ صریح سے ٹکرا رہا ہے اور ان کی تحقیقات علمِ نبوت سے متصادم ہیں ۔ وہ لوگوں کو خدا کے دین
سے پھیر رہے ہیں لیکن دعویٰ ہے کہ راہِ ہدایت دکھا رہے ہیں ۔ ان کی ساری جد و جہد تخریبِ دین کی راہ میں
ہو رہی ہے لیکن وہ اس خیالِ خام میں گرفتار ہیں کہ دین کی گرتی ہوئی دیوار کو تھام رہے ہیں ۔ انہیں اپنے بارے
میں یقین ہے کہ وہ خدمتِ دین کا ایسا کارنامہ انجام دے رہے ہیں جو صدیوں میں انجام پاتا ہے حالانکہ اس
کارنامہ کی نوعیت اس سے زیادہ نہیں ہے کہ وہ صدیوں کے کارنامے کو مٹانے والا ہے ۔ یہ ایک حقیقت ہے
کہ اس وقت خدا کا دین ہر چیز سے زیادہ مظلوم ہے اور اس پر ظلم کرنے والے صرف وہی لوگ نہیں ہیں جو اس
کا انکار کرتے ہیں بلکہ اس کے ماننے والے بھی اس پر زیادتی کر رہے ہیں ۔

امت مسلمہ کا اس مقام تک پہنچنا افسوسناک ضرور ہے لیکن تعجب خیز ہرگز نہیں ہے ۔ کیونکہ قوموں کے

عروج و زوال کا یہی قانون ہے کسی بھی جماعت کو اس کا مقصدِ حیات زندہ رکھتا ہے، اس کی ترقی کے دن وہ ہوتے ہیں جب کہ وہ اس مقصد کی خاطر مرنے مٹنے کے لیے تیار ہوتی ہے۔ اور جب وہ اپنے مقصدِ حیات سے کنارہ کش ہو جاتی ہے تو اس کی پستی کا دَور شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ پستی کی کسی خاص حد پر پہنچ کر رک نہیں جاتی بلکہ بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک وقت آتا ہے جب کہ اسے اس بات کا احساس تک باقی نہیں رہتا کہ وہ کہاں سے چلی تھی اور کہاں پہنچ گئی اور پھر ہوتا یہ ہے کہ بلندی کا تصور بھی اس کے لیے دشوار ہو جاتا ہے اور وہ پستی ہی کو اپنی معراج سمجھنے لگتی ہے۔

امت مسلمہ کا نصب العین پیغمبرانہ نصب العین ہے۔ اسے وہ کام انجام دینا ہے جو خدا کے رسول ہر دَور میں انجام دیتے تھے۔ اسی مقصد کے لیے وہ وجود میں آئی ہے اور اسی کے ساتھ اس کی کامیابی وابستہ ہے۔ اگر وہ اس نصب العین کو خلوص دل کے ساتھ اختیار کرلے تو قوموں کی امامت اسے سونپی جائے گی اور وہ خدا کی محبوب ہوگی لیکن اگر وہ اسے اپنانے کے لیے تیار نہیں ہے تو تاقیامت اپنی موجودہ پستی سے نکل نہیں سکتی اور ہر آنے والا دن اس کی مزید تباہی کا سبب ہوگا۔

خدا کے رسول ہمارے سامنے دو حیثیتوں سے آتے ہیں۔ ان کی ایک حیثیت یہ ہے کہ خدا سے ان کا تعلق انتہائی مضبوط ہوتا ہے، ان کی زندگی سراپا عبدیت کی تصویر ہوتی ہے وہ خدا کے ہر حکم کے سامنے سر جھکانے کے لیے تیار ہوتے ہیں خدا کی یاد ان کے لیے ہر چیز سے زیادہ پرکشش ہوتی ہے، ان کو ایسا دل نصیب ہوتا ہے جو خدا سے ہر وقت جڑا ہوتا ہے۔ وہ سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے والے اور سب سے زیادہ خدا سے محبت کرنے والے ہوتے ہیں۔ قرآن نے ان کو خشوع و خضوع، زہد و عبادت، تقویٰ و اسلام اور انابت و رجوع الی اللہ سے متصف بتایا ہے۔ یہ صفات ان کی اسی حیثیت کا اظہار کرتی ہیں۔

خدا کے رسولوں کی دوسری حیثیت یہ ہے کہ وہ داعیِ دین ہوتے ہیں، وہ خدا کا دین اس کے بندوں تک پہنچاتے ہیں، اسے قائم و غالب کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس راہ میں ہر طرح کی مشکلات برداشت کرتے ہیں۔ وہ اس زبردست دعوے کے ساتھ دنیا کو دعوت دیتے ہیں کہ انجام خیر صرف اسی کے لیے ہے جو ان کا ساتھ دے اور جو شخص ان کا ساتھ نہ دے اسے انجام بد سے کوئی چیز بچا نہیں سکتی۔ ان کے اس دعوتی کام کے لیے قرآن نے مختلف تعبیرات اختیار کی ہیں۔ دعوت الی اللہ، اقامتِ دین، دعوت الی الخیر، نصح و ابلاغ، امر بالقسط امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔ یہ تمام تعبیرات اس کام کی نوعیت کو ظاہر کرتی ہیں جو خدا کے پیغمبر اس دنیا میں انجام

دیتے تھے۔ ان تعبیرات کے درمیان معمولی فرق و اختلاف ضرور موجود ہے۔ کسی تعبیر میں دعوت کا کوئی خاص پہلو نمایاں کیا گیا ہے اور کسی میں کوئی دوسرا پہلو پیش ہوا ہے لیکن یہ سب ایک ہی حقیقت کو ظاہر کر رہی ہیں اور ان میں ایک ہی مقصد کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ان تعبیرات کا سمجھنا حقیقت میں اس کارِ عظیم کا سمجھنا ہے جس پر خدا کے پیغمبر مامور کیے گئے تھے۔ یہ اس منزل کے نشانات ہیں جس کی طرف امتِ مسلمہ کو بڑھنا ہے۔

امتِ مسلمہ کو یہی دو کام کرنے ہیں۔ ایک یہ کہ خدا سے وہ اپنا تعلق جوڑے اس کی غلامی میں چلی آئے، اس کے احکام کی تابع ہو جائے، اپنی زندگی کو اس کے دین کے سانچے میں ڈھال دے، اس کی دی ہوئی روشنی میں غور کرے اور اسی کی ہدایت کے مطابق عمل کرے۔ اس امت کا دوسرا کام یہ ہے کہ خدا کے دین کو دنیا میں غالب و سربلند کرنے کی کوشش کرے یعنی یہ کہ وہ خود بھی خدا کے دین کی پیرو بن جائے اور دوسروں کو پیروی کی دعوت دے۔ یہ دونوں کام بظاہر دو الگ الگ کام ہیں لیکن حقیقت میں یہ ایک ہی ہیں۔ یہ ایک دوسرے کے ساتھ گہرا تعلق رکھتے ہیں، ان کو کسی بھی حال میں آپ جدا نہیں کر سکتے۔ جب تک آپ دین پر عمل نہیں کریں گے صحیح معنی میں داعیِ دین نہیں ہوں گے اور دین پر آپ کا عمل اس وقت مکمل ہو گا جب کہ آپ دنیا کو اس کی طرف دعوت دیں۔ یہ دو طرفہ کام ہے جسے انجام دینے کے بعد ہی امتِ مسلمہ کار نبوت میں پیغمبروں کی جانشین ہو گی۔

قرآن نے امتِ مسلمہ کا مقصدِ حیات جن آیتوں میں بیان کیا ہے ان میں سورۂ آلِ عمران کی یہ دو آیتیں بھی ہیں۔ ایک آیت یہ ہے:۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (آلِ عمران ۱۰۴)	تم میں ایک جماعت ضرور ایسی ہونی چاہیے جو 'خیر' کی طرف بلائے۔ معروف کا حکم دے اور 'منکر' سے روکے۔ ایسے ہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں'

دوسری آیت یہ ہے:۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (آلِ عمران۔۱۱۰)	تم بہترین امت ہو جسے انسانوں کی اصلاح کے لیے وجود میں لایا گیا ہے۔ تم 'معروف' کا حکم دیتے ہو اور 'منکر' سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو

یہ دونوں آیتیں ایک ہی سلسلۂ بیان میں آئی ہیں۔ ان آیات سے پہلے یہود کا تذکرہ ہے کہ وہ خود بھی خدا کے دین کو چھوڑ چکے ہیں اور دوسروں کو بھی اس سے باز رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس وجہ سے وہ ہدایت

سے محروم ہو گئے اور خدا کی محبت کے مستحق نہیں رہے۔ اس کے بعد مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ "وہ پوری طرح خدا کا تقویٰ اختیار کریں، زندگی کے آخری لمحات تک اسلام پر قائم رہیں، اہلِ باطل کے مقابلے کے لیے متحد و متفق ہو جائیں، مل جل کر خدا کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑ لیں اور گروہ بندی و افتراق سے بچیں" ان صفات کا تعلق ان کی داخلی زندگی سے تھا اس کے بعد انہیں خارج کا پروگرام دیا گیا کہ وہ دنیا کو خیر کی طرف دعوت دیں، معروف کا حکم دیں اور منکر سے منع کریں۔

امام رازیؒ فرماتے ہیں:-

امرھم اولًا بالتقوی والایمان	اللہ نے انہیں پہلے تقوی اور ایمان کا حکم دیا
.... ثم امرھم بالسعی فی	.... پھر اس نے انہیں حکم دیا کہ وہ دوسروں
القاء الغیر فی الایمان	کو ایمان و اطاعت کے دائرے میں لانے کی
والطاعة[1]	کوشش کریں۔

سیاق و سباق سے قطع نظر ان ہی آیتوں میں اس بات کا ذکر موجود ہے کہ امت مسلمہ خود بھی صلاح و تقویٰ پر قائم ہو گی اور دوسروں کو بھی صلاح و تقویٰ کی دعوت دے گی۔ چنانچہ اہلِ ایمان کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ "اللہ پر ایمان رکھتے ہیں" اللہ پر ایمان ایک جامع اصطلاح ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اللہ کو اپنا معبود حاکم مانے اور اس کے تمام احکام کو بے چون و چرا تسلیم کرے۔ ایمان یقینِ قلب اور کامل اتباع کا دوسرا نام ہے چنانچہ مفسر خازن نے اس موقع پر ایمان باللہ کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے:-

(وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللهِ) ای وتصدقون	تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو" یعنی تم اس کے وجود
باللہ وتخلصون لہ التوحید	کی تصدیق کرتے ہو اس کو ایک مانتے ہو اور اسی
والعبادة[2]	کی بندگی کرتے ہو۔

اہلِ ایمان کو جو دوسرا کام انجام دینا ہے اسے یہاں 'دعوتِ خیر' اور 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' کے الفاظ میں پیش کیا گیا ہے۔

ان آیتوں پر ایک دوسرے پہلو سے غور کیجیے تو یہ بات اور زیادہ واضح ہوتی ہے۔ پہلی آیت میں کہا گیا ہے کہ "تم میں لازماً ایک ایسا گروہ ہونا چاہیے جو خیر کی طرف دعوت دے" اور دوسری آیت میں کہا گیا "تم خیرِ امت

---

[1] التفسیر الکبیر ج ۳ ص ۱۹
[2] لباب التاویل فی معانی التنزیل ج ۱ ص ۳۳۹

ہو جسے لوگوں کی ہدایت کے لیے وجود میں لایا گیا ہے۔" یہ الفاظ اس حقیقت کو ظاہر کر رہے ہیں کہ 'دعوتِ خیر' کے لیے اس امت کا 'خیرِ امت' بننا ضروری ہے۔ جب تک یہ امت 'خیرِ امت' نہیں بن جاتی 'دعوتِ خیر' کا کام نہیں کر سکتی۔

امتِ مسلمہ کو جو دعوتی کام انجام دینا ہے اس کے لیے ان آیتوں میں تین اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں۔

۱۔ دعوت الی الخیر

۲۔ امر بالمعروف ـــ اور

۳۔ نہی عن المنکر

دعوت الی الخیر

سب سے پہلے 'دعوت الی الخیر' کو لیجیے۔ خیر سے مراد یہاں خدا کا دین ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ امتِ مسلمہ کو ملا ہے۔ خدا نے جو نظامِ زندگی عطا کیا ہے، جو عقائد و نظریات دیے ہیں، جو قوانینِ سیاست بنائے ہیں، جو ضابطۂ اخلاق دیا ہے اور جن اصولِ عبادت کی تعلیم دی ہے وہی 'خیر' ہے اور دنیا کو اس 'خیر' کی طرف بلانا امتِ مسلمہ کا فرض ہے۔ اس کے لیے خیر و شر کا پیمانہ خدا کا دین ہے۔ جو کچھ خدا کے دین میں ہے وہ خیر ہے اور جو خدا کے دین سے باہر ہے وہ 'شر' ہے۔ خدا کے دین کے سوا نہ تو کسی تصورِ حیات سے اسے دل چسپی ہو سکتی ہے اور نہ وہ دنیا کو اس کی دعوت دے سکتی ہے۔ دنیا کے جتنے دین، جتنے نظامِ حیات اور جتنے قوانینِ زندگی ہیں وہ سب کے سب اس کی نگاہ میں شر کی مختلف شکلیں ہیں، وہ ان کو مٹانے اور ان کی جگہ خدا کے دین کو قائم کرنے کے لیے وجود میں آئی ہے۔

'دعوت الی الخیر' کا مطلب دین کے کسی جزو کی طرف دعوت دینا نہیں ہے بلکہ کُل دین کی طرف دعوت دینا ہے۔ امتِ مسلمہ جب تک پورے دین کی دعوت لے کر نہ اٹھے وہ 'دعوت الی الخیر' کے فرض سے سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ اگر وہ اصلاحِ اخلاق کی مہم چلاتی ہے، یا اس کے سامنے محض سیاسی انقلاب ہے، یا وہ صرف عبادات کی اصلاح چاہتی ہے، یا اس کا مطلوب معاملاتی زندگی کو درست کرنا ہے تو اس سے دعوتِ خیر کا حق کبھی بھی ادا نہ ہو گا۔ اس میں شک نہیں ان میں سے ہر کام دین کا کام ہے اور اس میں خیر کا جز یقیناً موجود ہے لیکن امتِ مسلمہ 'جزئی خیر' کی دعوت پر مامور نہیں ہے بلکہ اسے 'خیرِ کل' کی دعوت کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ جو کچھ کہا گیا ہے محض ظن و قیاس یا جوشِ بیان نہیں ہے بلکہ قرآن کی تعلیم کے عین مطابق ہے۔ لیکن افسوس کہ جس امت کو دعوتِ خیر کا حکم ملا تھا آج وہ اس کے معنی و مفہوم

بھی نا آشنا ہے۔ دعوتِ خیر کو سمجھنے کے لیے آپ کو سورۂ انبیاء کی حسب ذیل آیت پیشِ نظر رکھنی چاہیے۔ قرآن نے
رت ابراہیمؑ حضرت اسحٰقؑ اور حضرت یعقوبؑ کے ذکر کے بعد کہا:۔

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَا اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ (الانبیاء: ۷۳)	ہم نے ان کو امام بنایا اور وہ ہمارے حکم سے لوگوں کی ہدایت کرتے تھے اور ہم نے ان کو وحی کی 'خیرات' (بھلائیوں) کے کرنے کی اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کی اور وہ ہمارے عبادت گزار تھے۔

یہاں 'خیرات' کا لفظ ان اعمال کے لیے استعمال ہوا ہے جن کے کرنے کا خدا نے اپنے پیغمبروں کو حکم دیا تھا۔ ظاہر ہے پیغمبروں کو جن اعمالِ خیر کی وحی کی جاتی تھی ان کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ اس میں عبادات، اخلاقیات اور معاملات سب ہی شامل تھے اسی کا نام دین اور شریعت ہے۔ اس سے بالکل واضح ہو کہ 'خیرات' کا لفظ کل شریعت کی جگہ دلا گیا ہے جو خدا کی طرف سے پیغمبروں کو ملتی تھی اور جس کے تحت وہ زندگی گزارتے تھے۔ چنانچہ علامہ بغوی نے اس ایت کی جو تشریح کی ہے اسے دیکھیے۔

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا يقتدى بهم فى الخيرات (يَهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا) يدعون الناس الى ديننا (واوحينا اليهم فِعْلَ الْخَيْرٰتِ) يعنى العمل بالشرائع[1]	"ہم نے انہیں امام بنایا کہ وہ ہمارے حکم سے ہدایت کرتے ہیں" یعنی امورِ خیر میں ان کی پیروی کی جاتی ہے۔ "وہ ہمارے حکم سے ہدایت کرتے ہیں" کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگوں کو ہمارے دین کی دعوت دیتے ہیں۔ "اور ہم نے ان کی طرف اعمالِ خیر کی وحی کی" یعنی شریعتوں پر عمل کا حکم دیا۔

مفسر خازن نے بھی 'فعل الخیرات' کی تشریح 'العمل بالشرائع' کے جملے ہی سے کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ 'خیر' خدا کی شریعت کا دوسرا نام ہے۔ پیغمبروں کو اسی خیر پر عمل کا حکم دیا جاتا تھا' ان کی زندگی اسی کا نمونہ ہوتی تھی اور وہ دوسروں کو اسی کی دعوت دیتے تھے۔ اسی چیز نے انہیں 'عبدیت' کے مقام بلند تک پہنچایا اور وہ خدا کے نزدیک عابد قرار پائے۔

'خیر' کا مفہوم سمجھنے کے لیے ایک اور آیت لیجیے جو سورۂ مائدہ میں ہے۔ یہ آیت اختلافِ شرائع کا ذکر کرتی

---

[1] معالم التنزیل المطبوع علیٰ ھامش الخازن جلد ۴ ص ۲۴۵

ہے۔ خدا کا دین اپنی حقیقت اور روح کے اعتبار سے ہمیشہ ایک ہی رہا، اس میں کبھی کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ لیکن مختلف ادوار میں احکامِ شریعت مختلف رہے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کو ایک خاص شریعت دی گئی تھی اور جب حضرت عیسیٰؑ پیغمبر بنائے گئے تو شریعت بدل گئی۔ اس کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو آپ کو ایک نئی شریعت ملی۔ یہ اختلافِ شریعت اصل دین میں اختلاف کے ہم معنی ہرگز نہیں ہے۔ اس لیے خدا پرستی کا تقاضا یہ ہے کہ جس دور میں جو احکامِ شریعت نازل ہوں ان کے سامنے سر جھکانے کے لیے انسان تیار ہو جائے۔ جو شخص نئی شریعت کے آنے کے بعد بھی پچھلی شریعت کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہے وہ خدا کا نافرمان ہے۔

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ...... فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ (المائدہ: ۴۸)	ہم نے تم میں سے ہر گروہ کے شریعت اور ایک راہ متعین کی ہے تو اب تم 'خیرات' (بھلائیوں) میں سے آگے بڑھو۔

یہاں 'خیرات' میں آگے بڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ اس شریعت پر عمل کیا جائے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی ہے۔ کیونکہ اب نجات اسی شریعت کی اتباع میں ہے۔ علامہ ابن کثیرؒ نے 'خیرات' کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے:۔

وهی طاعة الله واتباع شرعه الذی جعله ناسخا لما قبله والتصدیق بكتابه القرآن الذی هو آخر كتاب انزله[۱]	اس سے مراد ہے اللہ کی اطاعت، اس کی شریعت کی اتباع جسے اس نے پچھلی شریعتوں کی ناسخ بنایا ہے اور اس کی کتاب قرآن مجید کی تصدیق جو اس نے سب سے آخر میں نازل کی ہے۔

علامہ سید محمود آلوسی فرماتے ہیں:۔

فسارعوا الی ما هو خیر لكم فی الدارین من العقائد الحقة والاعمال الصالحة المندرجة فی القرآن الكریم[۲]	جلدی کرو ان صحیح ترین عقائد اور اعمال صالحہ کے اختیار کرنے میں جو قرآن کریم میں درج ہیں۔ کیونکہ یہی تمہارے لیے دنیا و آخرت میں بہتر ہیں۔

علامہ نظام الدین قمی نیساپوری لکھتے ہیں:۔

یعنی بالخیرات ههنا ما هو الحق	یہاں 'خیرات' سے اللہ تعالیٰ کی مراد ہے صحیح ترین

۱۔ تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۶۶　۲۔ روح المعانی جزء ۶ ص ۱۵۵

من الاعتقادات والمحقق من التکالیف[1]	عقائد اور ثابت شدہ اعمال جن کے کرنے کا انسانوں کو حکم دیا گیا ہے۔

ان تشریحات سے واضح ہے کہ 'خیر' سے مراد خدا کی بندگی اور اس کے رسول کی اطاعت ہے' احکامِ شریعت کی پیروی ہے اور وہ پورا نظامِ عقائد و اعمال ہے جو قرآن کی شکل میں امت مسلمہ کو ملا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسے اسی 'خیر' کی طرف دنیا کو دعوت دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ اب آپ براہ راست اس آیت کو لیجیے جس میں 'دعوتِ خیر' کا حکم موجود ہے' اور دیکھیے کہ اس کی تشریح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے' صحابہ و تابعین نے' اور قرآنی علوم کے محققین نے کیا کی ہے؟

ابو جعفر باقرؒ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ (تم میں ایک گروہ ایسا ضرور ہونا چاہیے جو خیر کی طرف دعوت دے) اور فرمایا اَلْخَيْرُ اِتِّبَاعُ الْقُرْآنِ وَسُنَّتِيْ[2] (قرآن اور میری سنت کی اتباع کا نام خیر ہے) 'دعوتِ خیر' کا مطلب یہ ہے کہ قرآن و سنت کی طرف دعوت دی جائے۔ قرآن و سنت کی دعوت کے سوا کوئی دوسری دعوت لے کر امت مسلمہ اٹھتی ہے تو وہ نہ دعوتِ خیر ہوگی اور نہ اس کا کام دعوتِ خیر کا کام ہوگا۔

ابو حیان اندلسی نے 'خیر' کے بارے میں بعض تابعین کے اقوال نقل کیے ہیں:۔

الخیر ھو الاسلام قالہ مقاتل	'خیر' سے مراد اسلام ہے۔ یہ مقاتل کا قول ہے
او العمل بطاعۃ اللہ قالہ ابو سلیمان	یا اس سے مراد اللہ کی اطاعت ہے۔ یہ ابو سلیمان دمشقی
الدمشقی والجہاد والاسلام[3]	نے کہا ہے۔ یا اس سے مراد جہاد اور اسلام ہے۔

علامہ بغوی نے 'خیر' کی تشریح اسلام سے کی ہے[4]۔ اور یہی تشریح 'جلالین' میں موجود ہے لیکن یہ نہ بھولیے کہ اسلام سے اس کا کوئی ایک جز یا کسی خاص معاملے میں خدا کی اطاعت' نہیں ہے بلکہ اس سے مراد خدا کا پورا دین اور زندگی کے تمام معاملات میں اس کی اطاعت ہے' اور اسی مکمل دین کی دعوت کا امتِ مسلمہ کو حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ علامہ صاوی جلالین کی شرح میں فرماتے ہیں:۔

انما قصرہ	جلالین نے 'خیر' کو اسلام کے لفظ سے محدود

---

[1] غرائب القرآن و رغائب الفرقان المطبوع علی ھامش ابن جریر ج ۴ ص ۱۳۵ [2] فتح القدیر للشوکانی ج ۱ ص ۳۳۸
[3] البحر المحیط ج ۳ ص ۲۰ [4] معالم التنزیل المطبوع علی ھامش الخازن ج ۱ ص

عليه لانه راس الامور[1]

کیا ہے (حالانکہ وہ عام ہے) کیونکہ اسلام تمام معاملات کی اساس ہے۔

ہمارے قدیم ترین مفسر امام ابن جریر طبری نے اسے اور واضح کیا ہے:۔

ولتكن منكم ايها المومنون امة يقول جماعة يدعون الناس الى الخير يعني الى الاسلام وشرائعه التي شرعها الله لعباده[2]

اے اہل ایمان تم میں ایک ایسی امت یعنی جماعت ضرور ہونی چاہیے جو لوگوں کو خیر کی طرف دعوت دے۔ 'خیر' کا مطلب ہے اسلام اور اس کی شریعت جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے جاری کیا۔

علامہ ابوحیان اندلسی فرماتے ہیں:۔

الدعاء الى الخير وهو عام في التكاليف من الافعال والتروك[3]

'دعوت الی الخیر' عام ہے اس میں شامل ہیں جن کے کرنے کا شریعت نے حکم دیا ہے یا جن سے اس نے منع کیا ہے۔

قاضی بیضاوی لکھتے ہیں:۔

الدعاء الى الخير يعم الدعاء الى مافيه صلاح ديني اودنيوي[4]

'دعوت الی الخیر' عام ہے اس کا مطلب ہے ان تمام چیزوں کی طرف دعوت دینا جن میں دین و دنیا کی صلاح ہے

یہی تفسیر شیخ ابوالسعود اور علامہ سید محمود آلوسی نے کی ہے۔ یہ صلاحِ دین و دنیا جس کی طرف امت مسلمہ کو دعوت دینا ہے وہ خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت میں موجود ہے۔ جو عقائد و اعمال ان دو ذرائع سے ثابت ہیں وہی صلاح کے ضامن ہیں۔ باقی ہر مسلک و خیال اور ہر نظریہ و عمل فساد اور ضلالت ہے۔ یہی مطلب ان مفسرین کا بھی ہے۔ شیخ اسمٰعیل حقی نے صلاحِ دین و دنیا کو 'تکلیف شرعی' کا نام دیا ہے جو کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے ثابت ہوتی ہے۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ) جماعة داعية الى الخير

(تم میں ایک ایسی امت ضرور ہونی چاہیے جو خیر کی طرف دعوت دے) یعنی ایسی جماعت جو خیر کی داعی ہو

---

[1] حاشیۃ الصاوی علی تفسیر الجلالین ج ۱ ص ۱۵۲ [2] جامع البیان فی تفسیر القرآن ج ۴ ص ۲۲ [3] البحر المحیط ج ۳ ص ۲۰ [4] انوار التنزیل واسرار التاویل

ای الی ما فیہ صلاح دینی و دنیوی فالدعاء الی الخیر عام فی التکلیف من الافعال والتروک[1]

ہو۔ خیر کا مطلب ہے جس میں دین و دنیا کی صلاح پائی جائے۔ کیونکہ 'دعوت الی الخیر' میں وہ تمام امور شامل ہیں جن کے کرنے یا نہ کرنے کا اللہ نے بندوں کو حکم دیا ہے۔

قرآن سے یہی ثابت ہے اور ہر مفسر نے یہی کہا ہے کہ 'دعوت خیر' 'دعوتِ اسلام' کے ہم معنی لفظ ہے لیکن امتِ مسلمہ کو 'دعوتِ خیر' پر مامور کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ دنیا کے سامنے اسلام کی تعریف کرتی رہے یا اس کی حقانیت پر کوئی کتاب لکھوا دے بلکہ اس دعوت کا حق ادا نہ ہوگا جب تک کہ وہ اس کے لیے وقف نہ ہو جائے اور اپنی تمام قوتیں دنیا میں اسے قائم کرنے کے لیے صرف نہ کر دے۔ اس کی ساری جد و جہد اسی مقصد کے لیے ہو، وہ اپنا سرمایہ حیات اسی میں لگا دے، اس کی صلح و جنگ اسی راہ میں ہو اور وہ اسی کے لیے جیے اور مرے۔

عن ابی ھریرۃ رضؓ کُنتُم خیر امۃ اخرجت للناس قال خیر الناس للناس تأتون بھم فی السلاسل فی اعناقھم حتی یدخلوا فی الاسلام[2]

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ "تم بہترین امت ہو جو لوگوں کی اصلاح کے لیے وجود میں لائی گئی ہے۔" اس کا مطلب ہے کہ تم لوگوں کے حق میں بہترین انسان ہو کہ انہیں گردنوں میں زنجیریں ڈال کر لاتے ہو یہاں تک کہ وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہو جاتے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضؓ کے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ جس 'خیر' کے لیے امت مسلمہ دنیا سے جنگ کرتی ہے، اس 'خیر' کا اسے عملی نمونہ ہونا چاہیے۔ وہ 'خیر' کی طرف دعوت دے اور ساتھ ہی دنیا کے لیے 'اسوۂ خیر' بن جائے، یہاں تک کہ جن دلوں میں اس کے خلاف بغض و نفرت کے جذبات ہو سکتے ہیں وہ بھی 'خیر' کی طرف کھنچ پڑیں۔ امت جب اس حیثیت میں ہوگی تو ان لوگوں کے سینے بھی اسلام کے لیے کھل جائیں گے جن کو اس نے 'خیر' سے بغاوت کی بنا پر گرفتار کیا ہے اور وہ خدا کی رحمت کے مستحق ہوں گے۔

یہ ہے دعوتِ خیر کا وہ کارِ عظیم جس کا اس امت کو حکم دیا گیا ہے اور جسے انجام دینے کے بعد وہ 'خیر امت' کا مقام پا سکتی ہے۔

---

[1] روح البیان ج ۱ ص ۳۵۲

[2] بخاری کتاب التفسیر (سورۂ آل عمران) باب کنتم خیر امۃ اخرجت للناس

نماز اور خشوع و خضوع

قسط (۲)

مولانا مجیب اللہ ندوی

ابو اسمٰعیل ہروی (متوفی ۴۸۱ھ) نے منازل السائرین میں اور حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ متوفی نے شرح مدارج السالکین میں خشوع کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔ حافظ ابن قیمؒ کی خشوع سے متعلق ایک عبارت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ قلب میں جس کی عظمت و ہیبت ہوتی ہے اس کے سامنے طبیعت کی ہر خواہش ختم اور نفس کا ہر انبساط اسی میں فنا ہو جاتا ہے۔ بس خشوع اسی کا نام ہے۔ کہ بندہ کی ہر خواہش اللہ کی عظمت اور اس کی مرضی کے تابع ہو جائے۔

"اس خشوع کے تین درجے ہیں۔ پہلا درجہ یہ ہے کہ بندہ ہر وقت اپنے کو عاجز و مسکین سمجھے اور حکم الٰہی خواہ شرعی ہو یا قدری اس کے سامنے سر نیاز ختم کر دے اور وہ یہ بھی محسوس کرتا رہے کہ قلب کی ہر کیفیت اور اعضاء کی ہر حرکت کو اللہ دیکھ رہا ہے۔ اس استحضاری کیفیت کو وہ جتنا ہی زیادہ کرے گا صفت خشوع سے متصف ہوتا جائے گا۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ بندہ ہر وقت اپنے نفس کے عیوب اور اعمال کے نقائص پر نگاہ رکھے اور اس بات کی پرواہ نہ کرے کہ لوگ اس کے ساتھ کیسا سلوک کر رہے ہیں وہ لوگوں کے ساتھ نیک برتاؤ اور ان کے حقوق ادا کرتا رہے۔ یہی کیفیت اسے درجۂ فنا تک لے جانے کا سبب بن جائے گی۔

تیسرا درجہ یہ ہے کہ بندے کو جب مکاشفہ وغیرہ کی کیفیت حاصل ہو جاتی ہے تو اس کی طبیعت میں بڑا انبساط اور بعض وقت عجب پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسے وقت میں اسے پورے طور پر نفس کی دیکھ بھال رکھنی چاہیے۔ تاکہ اس کا آئینۂ دل عجب و ریا کے گرد و غبار سے میلا نہ ہونے پائے۔ اس لیے کہ ایسے موقع پر ان عیوب کے پیدا ہو جانے کا بڑا خطرہ ہوتا ہے۔ پھر اس تصور کو بھی ذہن میں رکھے کہ فضل و کرم اور بخشش و مغفرت سب اسی ذات قدوسی کے دست قدرت

میں ہے وہ بندوں پر بغیر کسی سبب بھی فضل وکرم کی بارش کر سکتا ہے[۱]

حکیم الامت امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں خشوع پر بہت تفصیل سے بحث کی ہے اور اس کے شرائط وارکان اس کے پیدا کرنے کی صورتیں اور اس کے باطنی اثرات ومظاہر علیحدہ علیحدہ بہت واضح طور سے بیان کیے ہیں۔ ہم اس کا خلاصہ ذیل میں درج کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

اللہ تعالیٰ کے لیے خشوع کی تعبیر تعظیم سے کی جاتی ہے لیکن جب تک جلالِ الٰہی کی معرفت کے ساتھ اپنے نفس کی حقارت کی معرفت بھی شامل نہ ہو اس وقت تک خشوع وتعظیم کی حالت پیدا نہیں ہوتی[۲]

اللہ تعالیٰ نے اس آیت قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ اَلَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ صَلَاتِھِمْ خَاشِعُوْنَ میں ایمان کے بعد ایک مخصوص نماز کی وجہ سے مومنین کی مدح کی ہے۔ اور یہ مخصوص نماز وہ ہے جو خشوع کے ساتھ پڑھی گئی ہو۔ پھر ان فلاح یافتہ مومنین کے اوصاف گنانے کے بعد بھی ایک مخصوص کیفیت نماز کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا: وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَلٰی صَلٰوتِھِمْ یُحَافِظُوْنَ۔ پھر ان صفات کے نتیجے میں فرمایا کہ وہی لوگ ہیں جو جنت الفردوس کے وارث و مالک ہوں گے ۔ غرضیکہ کہ نماز میں خشوع رکھنے والے مومنین کو پہلے فلاح یافتہ بتایا پھر اس کے نتیجے میں جنت الفردوس کے وارث بنانے کا وعدہ فرمایا ہے۔

پھر ایک دوسری جگہ خشوع کی عمومی تشریح کرنے کے بعد صوفیاء وائمہ کے اقوال واعمال سے اس پر استدلال کرتے ہیں

جاننا چاہیے کہ خشوع ایمان کا ثمرہ اور جلالِ الٰہی کے تصور سے جو یقین حاصل ہوتا ہے اس کا نتیجہ ہے۔ جو شخص اس کیفیت سے لطف اندوز ہوتا ہے وہ نماز میں ہو خواہ نماز سے باہر ہر وقت اس پر خشوع وخضوع کی حالت طاری رہتی ہے۔ بلکہ وہ تنہائی اور رفع حاجت کے وقت بھی اس حالت سے علیحدہ نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ خشوع کا اصلی سبب خدا کی عظمت وتوقیر کی معرفت اور اپنی ذلت وتقصیر کا علم ہے اور اسی علم ومعرفت کے تصور سے خشوع کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور ظاہر بات ہے کہ یہ چیز صرف نماز کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر وقت اور ہر آن اس کا حصول ممکن ہے۔ چنانچہ مشہور تابعی ربیع بن خثیم متوفی ۶۳ھ کے بارے میں مذکور ہے کہ غضِ بصر اور اعضاء کی تواضع کی وجہ سے لوگ ان کو اندھا سمجھتے تھے۔ وہ چالیس برس تک حضرت ابن مسعود کے مکان پر آتے جاتے رہے لیکن جب وہ آتے تو ابن مسعودؓ کی لونڈی ان سے کہتی کہ آپ کا اندھا دوست آگیا۔ حضرت ابن مسعودؓ جب ان کی

---

[۱] مدارج السالکین ج ۱ ص ۲۹۶ [۲] احیاء العلوم ج ۱ ص ۱۱۱

طرف دیکھتے تو آیت کا یہ ٹکڑا پڑھتے وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ (احکام الٰہی کے سامنے سرنیاز خم کرنے والوں کو بشارت دیجیے) اے ربیع خدا کی قسم اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم کو دیکھتے تو خوش ہوتے۔ دوسری روایت میں ہے کہ وہ تم سے محبت کرتے۔

ایک روز وہ حضرت ابن مسعودؓ کے ساتھ لوہاروں کے محلہ میں گئے، جب انھوں نے بھٹی کو بھڑکتے اور آگ کو جلتے دیکھا تو دوزخ کی یاد آگئی اسی وقت لرزہ براندام ہوگئے اور غش کھا کر وہیں گر پڑے۔

عامر بن عبداللہ بھی ان لوگوں میں سے تھے جو نہایت ہی خشوع و خضوع، توجہ الی اللہ کے ساتھ نماز پڑھتے تھے ان پر خشوع کے غلبے کا یہ حال تھا کہ جب وہ نماز پڑھنے لگتے تو بسا اوقات ان کی لڑکی دف بجایا کرتی تھی اور عورتیں بے تکلفی سے گھریلو باتیں کرتی رہتیں اور انھیں خبر تک نہ ہوتی۔[1]

ان سے لوگوں نے کہا کہ کیا آپ کو بھی نماز میں وسوسہ و پراگندہ خیالی ہوتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ پے در پے بارش مجھے اس بات سے زیادہ محبوب ہے کہ جس طرح تم لوگ نماز کے وقت پراگندہ میں بھی رہوں۔ مشہور تبع تابعی مسلم بن یسار بھی انھیں لوگوں میں تھے کہ مسجد کا ایک ستون گر پڑا اور وہ نماز پڑھتے رہے انھیں اس کی خبر تک نہ ہوئی۔ بعض صوفیہ کا قول ہے کہ نماز کا تعلق آخرت سے ہے جب تم اس میں داخل ہو گئے تو دنیا کی باتوں سے علیحدہ ہونا چاہیے۔

پھر چند حکایات نقل کرنے کے بعد امام غزالی آخر میں فرماتے ہیں کہ

اوپر جس کیفیت کے ساتھ نماز پڑھنے کا ذکر کیا ہے خاشعین فی الصلوٰۃ کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ یہ تمام حکایات اور روایات اور اس سلسلے میں جو کچھ بیان کیا گیا اس بات کی دلیل ہے کہ نماز میں اصل چیز خشوع اور حضور قلب ہے۔ حضور قلب کے بغیر غفلت قلب کے ساتھ محض اعضا کی حرکت سے نماز پڑھنے کا آخرت میں اجر و ثواب بہت ہی کم ہے۔

شیخ عبدالقادر جیلانی (۴۷۰ھ ۵۶۱ھ) نے غنیۃ الطالبین میں ابو حازم تابعی سے ایک روایت نقل کی ہے جس سے خشوع کی پوری کیفیت سامنے آجاتی ہے۔

ابو حازم فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مجھ سے ایک صحابی سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے مجھ سے اور چیزوں کے علاوہ نماز کے بارے میں بہت سے سوال کیے اور میں ان کو جواب دیتا گیا آخر میں انھوں نے پوچھا کہ عبادت کے وقت تمہاری نیت کیا ہوتی ہے؟ میں نے کہا کہ عبودیت۔ انھوں نے کہا کہ کس چیز سے نماز کی

---

[1] یہ بے خبری غلبۂ حال کا نتیجہ ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نمازوں میں اس طرح بے خبر نہیں ہوتے تھے۔ (مدیر زندگی)

ابتدا کرتے ہو۔ کہا تکبیر سے۔ انھوں نے کہا۔ نماز کی دلیل و برہان کیا ہے؟ میں نے کہا کہ اس کی قرأت۔ انھوں نے کہا۔ نماز کو زندہ کرنے والی کون سی چیز ہے؟ میں نے کہا خشوع وخضوع۔ انھوں نے پوچھا اس کا وقار کیا ہے۔ میں نے کہا سکون وطمانینت۔ تمام سوالات کے بعد ان صحابی نے فرمایا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح نماز ادا فرماتے تھے[1]

ابوالقاسم قشیریؒ (متوفی ۴۶۵ھ) اپنے رسالہ قشیریہ میں خشوع کے متعلق لکھتے ہیں:۔

خشوع نام ہے اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرماں برداری کا .... بعض صوفیہ سے خشوع کے متعلق سوال کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ اللہ تعالےٰ سے دل لگے رہنے کو خشوع کہتے ہیں۔ سہل بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ جس کا دل خشوع سے لبریز ہوجائے اس کے قریب شیطان نہیں آسکتا۔ خشوع کی علامتوں سے ایک علامت یہ ہے کہ جب اس پر غصہ کیا جائے یا اس کی مخالفت کی جائے یا اس کی کسی بات کو رد کیا جائے تو اس وقت وہ خندہ پیشانی اور حلم وضبط کے ساتھ اس کا خیر مقدم کرے۔ بعض صوفیہ نے کہا ہے کہ نگاہ کو ادھر ادھر جانے سے روک دینا خشوع ہے۔ محمد بن علی الترمذی فرماتے ہیں کہ خاشع وہ شخص ہے جس کے خواہشات کا آتش کدہ ٹھنڈا اور اس کے قلب کا دھواں (بے جا تمنا وولولہ) سرد ہوجائے اور اس کے دل میں تعظیم کا نور چمک جائے۔ جب یہ کیفیت پیدا ہوجائے گی تو اس کی خواہش مردہ اور اس کا دل زندہ ہوجائے گا اور پھر اس کے نتیجے میں اس کے اعضاء پر بھی تواضع وخاکساری طاری ہوجائے گی۔ حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ دل میں پورے طور پر اللہ تعالےٰ کے خوف کے بیٹھ جانے کو خشوع کہتے ہیں۔

ابن رجب حنبلی (متوفی ۷۹۵ھ) نے ایک چھوٹا رسالہ "الخشوع فی الصلوٰۃ" لکھا ہے اس کی ایک عبارت اوپر آچکی ہے۔ کچھ یہاں نقل کی جاتی ہے۔

"وہ خشوع جو قلب میں پیدا ہوتا ہے اس کا ذریعہ ذات الٰہی کی معرفت، اس کی عظمت اور اس کے جلال وکمال کا عرفان ہے۔ بس جیسے یہ معرفت جتنی ہی حاصل ہوگی وہ اللہ تعالےٰ سے اتنا ہی خاشع ہوگا۔

"لیکن جن لوگوں کو یہ کیفیت حاصل ہوجاتی ہے یہ ضروری نہیں کہ ان میں سے ہر ایک شخص کا حال یکساں ہو اس لیے کہ خدا کے جن صفات کے تصور سے قلب میں خشوع وخضوع کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ وہ صفتیں مختلف ہیں اب ان میں سے قلب کو جس صفت کا مشاہدہ اور عرفان زیادہ ہوگا اس کے اوپر اسی صفت کا عکس زیادہ نمایاں ہوگا۔ چنانچہ اس تمہید کے بعد وہ لکھتے ہیں:۔

بعض لوگوں میں خشوع اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ وہ یہ قوت مطالعہ رکھتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ ا

---

[1] غنیہ جلد ۲ صفحہ ۱

بندوں سے بالکل قریب ہے اور اس کے ہر بھید اور راز کی اطلاع رکھتا ہے (اللہ تعالیٰ کی اس صفت کا مطالعہ اس سے شرم وحیا اور (بندہ کے) تمام حرکات و سکنات میں اس کی دیکھ بھال رکھنے (کے تصور پیدا کرنے) کا باعث ہوتا ہے، اور بعضوں میں خشوع اس کی صفتِ کمال وجمال کے مشاہدے سے پیدا ہوتا ہے جس کا تقاضا ہے کہ اس کی محبت میں محویت اور اس کی ملاقات و دیدار کا شوق پیدا ہو۔ بعضوں میں خشوع کا باعث اس کے قہر و غضب اور جزا وسزا کا تصور ہوتا ہے جس کا تقاضا ہوتا ہے کہ اس سے خوف و دہشت پیدا ہو۔

اسی اختلاف حال کی وجہ سے مختلف علماء و صوفیہ نے خشوع کی مختلف تعبیریں کی ہیں ورنہ [illegible] اعتبار سے سب کی تعبیرات کا مقصد ایک ہی ہے۔

نماز اور نماز کے علاوہ ہر شرعی کام میں کیفیت خشوع کی موجودگی اور اس کی اہمیت [illegible] محدثین، فقہاء، صوفیہ کا اتفاق ہے لیکن نماز کی فقہی تقسیم فرض واجب اور مستحب کے لحاظ [illegible] درجہ حاصل ہے اور بغیر خشوع کے پڑھی ہوئی نماز کا دین میں کیا مقام ہے؟ اس بارے میں ان کے درمیان [illegible] اختلاف ہے۔

نماز میں خشوع مستحب ہے یا واجب

عام فقہاء و محدثین تو خشوع کے استحباب ہی کے قائل ہیں۔ لیکن بعض علماء اور متکلمین کا رجحان اس کے وجوب کی طرف ہے۔ ہم دونوں کے بیانات و دلائل نقل کرتے ہیں۔

جو لوگ استحباب کے قائل ہیں ان کے دلائل یہ ہیں۔

(۱) جس طرح ہم منافق و ریاکار کی نماز کو باطل قرار نہیں دیتے بلکہ سب متفق طور سے کہتے ہیں کہ اس کے ذمہ سے فرض ادا ہو گیا۔ اور وہ شرعی تعزیر کا مورد نہیں رہا۔ اسی طرح کوئی مسلمان خشوع و خضوع اور حضور قلب کے بغیر نماز پڑھے تو بدرجۂ اولیٰ اس کی نماز کو فاسد قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اور نہ اس کو تارک صلوٰۃ قرار دے کر سزا دی جا سکتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ نماز عند اللہ مقبول ہوگی یا نہیں، ہم اس کے مکلف نہیں۔

(۲) حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب کوئی آدمی نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو شیطان اس کے دل میں مختلف قسم کے وسوسے اور برے خیالات ڈالتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس آدمی کو یہ یاد نہیں رہتا کہ اس نے کتنی رکعتیں پڑھیں جب ایسا محسوس ہو تو اسے سجدۂ سہو کر لینا چاہیے۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ خشوع اور حضور قلب نماز میں مستحب ہے۔ شرط اور واجب نہیں ورنہ اگر

یا واجب ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس نماز کے اعادہ کا حکم دیتے نہ کہ صرف سجدۂ سہو کا۔

جو لوگ وجوب کے قائل ہیں، مثلاً ابو طالب مکیؒ سفیان ثوریؒ حسن بصریؒ امام غزالیؒ امام رازی وغیرہ ان کے دلائل حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ قرآن نے اس آیت اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ میں امر (حکم) کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ نماز ذکر الٰہی ہی کے لیے پڑھنی چاہیے اور ذکر الٰہی کے لیے حضور قلب ایک ضروری شرط ہے۔ اب جو غفلت سے نماز پڑھتا ہے وہ حکم الٰہی کی خلاف ورزی کرتا ہے۔

۲۔ قرآن نے اس آیت وَلَا تَکُنْ مِنَ الْغَافِلِیْنَ (غافلین میں سے نہ ہو) اور وَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ الَّذِیْنَ ھُمْ عَنْ صَلَاتِھِمْ سَاھُوْنَ (ان لوگوں کے لیے ہلاکت ہے جو نماز کے بارے میں سستی اور غفلت سے کام لیتے ہیں) میں نماز کے اندر سستی و غفلت سے روکا ہے اور ایسا کرنے والے کے لیے وعید فرمائی ہے کیونکہ یہ چیزیں خشوع کے منافی ہیں۔

۳۔ اس آیت اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ (کیا اس کا وقت نہیں آیا کہ مومنوں کے دل اللہ کے ذکر کے لیے جھک جائیں) میں ان لوگوں پر مزید وعید کی گئی ہے۔ جو خشوع و خضوع کے بغیر نماز پڑھتے ہیں اس آیت کے شان نزول کے بارے میں مفسرین لکھتے ہیں۔ منجملہ اور اسباب کے ایک سبب یہ بھی تھا کہ صحابہ کرام سے خشوع کے خلاف کچھ افعال سرزد ہو گئے تھے۔ اس پر یہ آیت اتری۔ اگر خشوع نماز میں کوئی ضروری شرط نہ ہوتی تو یہ وعیدیں کیوں کی جاتیں

۴۔ حدیث لا صلوٰۃ لمن لم یخشع (جس کی نماز خشوع سے خالی ہے اس کی نماز نہیں ہے) میں صاف طور سے اس نماز کو جو خشوع سے خالی ہو بے حقیقت بتلایا گیا ہے۔ سفیان ثوری سے منقول ہے من لم یخشع فسدت صلوٰتہ (جو نماز خشوع کے ساتھ نہ پڑھے اس کی نماز فاسد ہے) حسن بصریؒ سے مروی ہے۔

کل صلوٰۃ لا یحضر فیھا	ہر وہ نماز جو حضور قلب کے بغیر پڑھی گئی ہو (وہ
القلب فھی الی العقوبۃ	انعام و اکرام کے بجائے) سزا و عقوبت کی طرف زیادہ
اسرع۔	تیزی سے جانے والی ہے۔

نقلی دلائل کے علاوہ ان کے پاس عقلی و ذوقی دلائل بھی ہیں وہ کہتے ہیں

اعضاء کی ظاہری حرکت نماز کا جسم اور خشوع اس کی روح ہے اور یہ بات ظاہر ہے کہ بغیر روح کے جسم

کا قیام ناممکن ہے ۔

۲ ۔ حافظ ابن قیم فرماتے ہیں کہ نماز بندے کی طرف سے ایک نیاز و تحفہ ہے جسے وہ بارگاہ رب العزت میں پیش کرتا ہے ۔ اس لیے اسے چاہیے کہ وہ بہتر سے بہتر صورت میں پیش کرے ورنہ اس کی نماز اعزاز و اکرام کے بجائے عتاب و عقاب کا سبب بن جائے گی ۔

۳ ۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ o میں مومنین کی فلاح اور وراثت جنت کو جن صفات پر معلق و مشروط رکھا ہے ۔ ان میں سے ایک خشوع بھی ہے ۔ اگر یہ کوئی بہت ہی اہم صفت نہ ہوتی تو فلاح و صلاح کو اس کے ساتھ مشروط کیا ۔

(۴) امام غزالی فرماتے ہیں کہ تمام عبادات میں نماز ہی ایک ایسی عبادت ہے جس میں ذہن اور طمانیت و سکون ایک ضروری و لازمی شرط ہے ۔ مثلاً اگر کوئی شخص حضور قلب کے بغیر زکوٰۃ دے تو اس کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی اور اس میں کوئی خرابی نہیں آئے گی ۔ اسی طرح روزہ و حج بھی ۔ لیکن نماز بغیر اس صفت کے ادا نہیں ہو سکتی ۔ اس لیے کہ نماز میں عبد اپنے معبود سے ہم کلام ہوتا ہے اور ہم کلامی قلب و ذہن کے حضور و شہود (جس کا دوسرا نام خشوع و خضوع ہے) کے بغیر ناممکن ہے لیکن یہ وجوب و استحباب کا اختلاف قانونی و ذوقی ہے جو فقہاء و محدثین بغیر خشوع نماز کے جواز کے قائل ہیں اس سے ان کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص جس نے بغیر خشوع نماز پڑھی ہے وہ قانون کی گرفت سے بری ہو گیا ۔ اب ہم اسے تارک صلوٰۃ نہیں کہہ سکتے یہ اور بات ہے کہ اس کی نماز مقبول ہوئی یا نہیں یا اسے اس کا اجر و ثواب ملے گا یا نہیں اور جو لوگ اس کے وجوب کے قائل ہیں ان کا مقصد یہ ہے کہ خشوع روح صلوٰۃ ہے ۔ اگر نماز میں وہ روح ہی مفقود ہے تو گو وہ قانون کی زد سے نکل جائے لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں کسی اجر و ثواب کا مستحق کیسے ٹھہر سکتا ہے اور اس بے روح عبادت کو عبادت کیسے کہا جا سکتا ہے ؟ ان کا مقصد یہ ہے کہ نماز صرف قانونی گرفت یا ملامت سے بچنے کے لیے نہ پڑھی جائے بلکہ اسے آخرت کی کامیابی اور خدا کی رضا کا وسیلہ بنایا جائے ۔ تو دونوں گروہ استحباب و وجوب کے قائل دو حیثیتوں سے ہیں ایک کے پیش نظر صحت عند العباد ہے اور دوسرے کے پیش نظر صحت عند اللہ یا مختصر الفاظ میں یہ کہنا چاہیے کہ خشوع شرط قبولیت ہے شرط جواز نہیں

امام ابن قیم فرماتے ہیں کہ اگر یہ سوال کیا جائے کہ خشوع کے بغیر پڑھی ہوئی نماز کا کچھ اعتبار ہے یا نہیں تو اس سوال کا جواب اما الاعتداد فی الثواب فلا یعتد له فیها الا بما عقل فیه وخشع فیه (یہ

نماز کا ثواب تو حضورِ قلب اور خشوع ہی کے بقدر ملے گا۔

خشوع پیدا کرنے کا طریقہ جس طرح نماز کی کمیت یعنی اس ظاہری آداب و شرائط کو سیکھنے اور اس کی حفاظت کرتے رہنے کے لیے محنت و کوشش کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح اس کی کیفیت باطنی یعنی خشوع و خضوع پیدا کرنے کے لیے بھی اس سے زیادہ کوشش اور مجاہدے کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ کمیت کی حفاظت آسان ہوتی ہے اور کیفیت کی حفاظت و نگرانی بہت مشکل سے ہو پاتی ہے کمیت پر آدمی کا قابو چلتا ہے۔ مگر کیفیتیں اس کی گرفت میں مشکل سے آتی ہیں۔ غرضیکہ نماز کے ظاہری ارکان کی ادائگی اور بجا آوری قدرے آسان ہے۔ مگر نماز میں حضورِ قلب اور خشوع و خضوع بڑی مشکل سے پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اس مشکل پر قابو پانا اس لیے ضروری ہے کہ اس کے بغیر نماز جسد بے روح ہے۔ قرآن مجید اور اسوۂ نبوی کے مطالعہ سے جو چیزیں اس صفت کے پیدا کرنے میں معاون بنتی ہیں۔ وہ یہ ہیں:۔

(۱) اس صفت کے پیدا کرنے میں جو چیز سب سے زیادہ معاون بنتی ہے وہ اپنی عبدیت، حقارت اور بیچارگی اور خدا کی عظمت و جلال اور اس کی محبت کا احساس ہے۔ یہ احساس جتنا شدید ہوگا اسی قدر اس میں یہ صفت پیدا ہوگی۔ اسوہ نبوی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا قلب ایک لمحہ کے لیے بھی اس احساس سے خالی نہیں ہوتا اور آپ ہمہ آن خاشع و خاضع رہا کرتے تھے۔ خود صحابہ کا بھی حال یہی تھا۔ حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت اوپر نقل کی گئی ہے۔ اس سے اس کی پوری وضاحت ہو جاتی ہے ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں والحق ان الخشوع معنی یلتئم من التعظیم والمحبۃ والذل والانکسار حقیقت یہ ہے کہ خشوع سراسر عظمت و محبت اور ذل و انکسار کا نام ہے۔

(۲) دوسری چیز جو اس کیفیت کے پیدا کرنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ وہ خدا کا خوف و خشیت اور آخرت کی بازپرس کا احساس ہے۔ قرآن کی آیت اوپر گذر چکی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ نماز کی ادائگی شاق گزرتی ہے مگر جو لوگ خاشع ہوتے ہیں ان کے لیے آسان اور محبوب ہوتی ہے۔ پھر خاشعین کی صفت الذین یظنون انھم ملٰقوا ربھم وانھم الیہ راجعون بتائی گئی ہے۔ یعنی جن کے دلوں میں خدا کے سامنے حاضر ہونے کا احساس اور اس کی بازپرس کا تصور بیٹھ جائے گا ان کے لیے نماز شاق و گراں نہیں بلکہ لطف و لذت کی چیز بن جائے گی۔ چنانچہ اگر آپ اسوہ نبوی پر ایک سرسری نظر بھی ڈالیں گے تو آپ کو یہ نظر آئے گا کہ آپ پر خوف و خشیت اور آخرت طلبی کی یہ کیفیت ہمہ وقت طاری رہتی تھی۔ آپ کے بارے میں حدیث میں آتا ہے متواصل الاحزان، دائم الفکر ہمہ وقت

غمگین اور فکر مند رہا کرتے تھے۔ اگر بادل کا کوئی ٹکڑا نظر آ جاتا یا بجلی چمک جاتی یا تیز ہوا چلنے لگتی تو آپ لرزاں و ترساں ہو جاتے اور فوراً مسجد پہنچکر خدا کے سامنے سجدے میں گر پڑتے تھے۔ یہی حال صحابہ کرام اور بزرگان ملت کا بھی تھا۔ اسی احساس کے نتیجے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرمایا کرتے تھے "کاش میں ایک تنکا ہوتا کہ مجھ سے باز پرس نہ ہوتی"۔

ان دونوں باتوں کے احساس کے نتیجے میں آدمی کا قلب ان رذائل اخلاق سے ضرور پاک ہو جائے گا جن سے آدمی کی ساری نیکیاں برباد ہو جاتی ہیں۔ مثلاً حسد، ریا، کبر و غرور، نظر بد وغیرہ۔

(۳) تیسری چیز مداومت عمل اور اخلاص ہے یعنی تمام احکام اسلامی کی مداومت، استقامت، صبر اور اخلاص کے ساتھ پیروی کی جائے۔ مداومت عمل اور اخلاص سے قلب میں روشنی اور ... ہوتی ہے اور قلب و دماغ کی یہی روشنی اور جلا خشوع و خضوع کا پیش خیمہ بنتی ہے۔ حضور اکرم صلی ... فرمایا ہے۔ احب الاعمال ما دیم علیہ سب سے محبوب عمل وہ ہے جو ہمیشہ کیا جائے

(۴) چوتھی یہ کوشش یہ ہونی چاہیے کہ نماز اور دعا کا پورا اہتمام کیا جائے نہ صرف فرض نمازوں کا اہتمام بلکہ نفل نمازوں کا بھی ذوق شوق پیدا کیا جائے، خاص طور پر تہجد کی نماز اور پچھلے پہر کی دعا کی عادت ڈالی جائے اس سلسلے میں قرآن کی ہدایات اور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ اپنے سامنے رکھا جائے اس کی کچھ تفصیل "خاصان خدا کی نماز" والے مضمون میں آگئی ہے۔ نماز تہجد کو حدیث میں داب الصالحین کہا گیا ہے دعا کو عبادت کا جوہر کہا گیا ہے فرض نمازوں کے بعد اور خاص طور پر رات کے پچھلے پہر گریہ و زاری کے ساتھ دعا کرنا کسی کو نصیب ہو جائے تو آپ سمجھ لیں کہ اس کو دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہاتھ آگئی

عطّار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو　　　کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی

قرآن میں جہاں مومن کی صفات گنائی گئی ہیں وہاں ایک صفت وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ بھی ہے یعنی مومنین رات کے پچھلے پہر اللہ تعالےٰ سے مغفرت مانگا کرتے ہیں۔

پچھلے پہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف خود تہجد اور دعا و مناجات میں مشغول رہتے تھے۔ بلکہ صحابہ کرام اور اہل و عیال کو بھی اس کی ترغیب فرمایا کرتے تھے۔ قرآن پاک میں رات کے اٹھنے کو اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلاً نفس کی پامالی اور یکسوئی کے ساتھ بارگاہ قدس تک اپنی بات کو پہنچانے میں یہ بہت مؤثر ہے کہا گیا ہے۔ دوسری جگہ ہے کہ آپ رات کو اس بات کی نگرانی فرمایا کرتے تھے کہ کون لوگ خدا کے حضور نماز و دعا و مناجات میں مشغول ہیں اور کون

لوگ غافل ہیں ۔ وتوکل علی العزیز الرحیم الذی یراک حین تقوم وتقلبک فی الساجدین آپ توکل کیجیے اس عزیز ورحیم پر جو آپ کو نماز کے لیے اٹھتے ہوئے اور نمازیوں میں بھاگ دوڑ کرتے ہوئے دیکھتا ہے حین تقوم وتقلبک فی الساجدین کی کئی تفسیریں کی گئی ہیں جن میں ایک یہ ہے کہ آپ جب تنہا اور جماعت کے ساتھ نماز پڑھتے اور نمازیوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں تو اس حالت کو اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے ۔ دوسری تفسیر یہ کی گئی ہے کہ آپ کی نماز کو اور دوسرے انبیاء کی طرح دعوت واصلاح میں آپ جو کچھ کوشش اور بھاگ دوڑ کر رہے ہیں اس کو دیکھ رہا ہے [1]

اور اس کے ساتھ ساتھ صاحب کشاف اور بعض دوسرے محقق مفسرین نے اس کی تفسیر یہ کی ہے ۔

وهو ذكر ما كان يفعله في جوف الليل من قيامه للتهجد وتقلبه في تفحص احوال المتهجدين من اصحابه ليطلع عليهم من حيث لا يشعرون ويستبطن سرائرهم وكيف يعبدون الله وكيف يعملون لآخرتهم كما يحكى انه حين نسخ فرض قيام الليل طاف تلك الليلة ببيوت اصحابه لينظر ما يصنعون لحرصه عليهم وعلى ما يوجد منهم من فعل الطاعات وتكثير الحسنات فوجدها كبيوت الزنابير لما سمع فيها من دندنتهم بذكر

یہ ذکر ہے آپ کے اس اسوہ اور طرز عمل کا جو درمیان رات میں آپؐ اختیار فرمایا کرتے تھے یعنی بہ نفس نفیس تہجد کے لیے اٹھنا اور رات کی تنہائیوں میں تہجد پڑھنے والے دوستوں کے حالات معلوم کرنے کے لیے آپؐ کا اس طور پر آنا جانا کہ ان کو محسوس بھی نہ ہو اور یہ دریافت کرنے کی کوشش کرنا کہ ان کی خلوت کی زندگی کی کیا کیفیت ہے ۔ اس میں کس طور پر وہ خدا کی عبادت کرتے ہیں اور آخرت کی کامیابی کے لیے وہ کیا کام کرتے ہیں جیسا کہ منقول ہے کہ (نماز پنجگانہ کی فرضیت کے بعد) جب نماز تہجد کی فرضیت ختم کر دی گئی تو آپؐ نے رات کو صحابہ کرام کے گھروں کا گشت فرمایا کہ ان کی راتیں کن مشاغل میں گزرتی ہیں یہ زحمت آپؐ نے اس لیے اٹھائی کہ آپؐ کی خیر طلبی کے حریص اور ان سے زیادہ سے زیادہ نیکیاں اور فرماں داریوں کے خواہاں تھے ۔ چنانچہ آپؐ نے

[1] البحر المحیط

اللہ وتلاوتہ ۔ (تفسیر کشاف)

ان کے گھروں کو بھڑوں کی چھتوں کی طرح پایا کہ ان سے ذکر اللہ اور تلاوت قرآن پاک کی بھنبھناہٹ آرہی تھی

مولانا شاہ عبدالقادر صاحبؒ اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں :" جب تو تہجد کو اٹھتا ہے اور تو سلین کی خبر لیتا ہے کہ خدا کی یاد میں ہیں یا غافل۔ صاحب فتح البیان نے اس تفسیر کو مشہور مفسر قرآن حضرت مجاہد کی طرف منسوب کیا ہے اس تفسیر کی تائید اس حدیث[1] سے بھی ہوتی ہے جس میں ہے کہ ایک بار رات میں گشت فرما رہے تھے تو دیکھا کہ حضرت صدیق بہت دھیمی آواز سے نماز میں قرأت کر رہے ہیں اور حضرت فاروق بلند آواز سے قرأت کر رہے ہیں ۔ دونوں حضرات صبح مجلس میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا ۔ ابوبکر! رات میں تمہارے پاس سے گزرا آواز سے نماز پڑھ رہے تھے ۔ حضرت صدیق بولے کہ قد اسمعت من ناجیت میں اس کو سنا نماز میں سرگوشی کر رہا تھا یعنی خدائے قدوس مخاطب تھا اور اس لیے جس آواز میں نماز پڑھوں وہ سن لے سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ تم بہت بلند آواز سے نماز پڑھ رہے تھے تو آپ جواب میں بولے کہ اوقظ الوسنان واطرد الشیطان سونے والوں کو بیدار کرنے اور شیطان کو بھگانے کے لیے ایسا کرتا ہوں ۔ آپ نے حضرت صدیق سے فرمایا کہ تم کچھ اور بلند آواز سے پڑھو اور حضرت فاروق سے کہا کہ تم کچھ آواز دھیمی کرو ۔ (ابوداؤد، ترمذی)

(۵) پانچویں چیز صدق مقال اور اکل حلال ہے یعنی آدمی کو اپنی زبان پر قابو اور ذریعہ معاش پر نظر رکھنی چاہیے۔ یعنی اس کی زبان سے وہی بات نکلے جو اس کے لیے یا دوسروں کے لیے مفید ہو اور اس کی روزی کم از کم حرام سے ضرور محفوظ ہو۔ ورنہ قرآن و حدیث میں جیسا کہ آیا ہے کہ اس کی بڑی سے بڑی عبادت بھی خدا کے یہاں بے قیمت ہو جاتی ہے ۔ قرآن میں اکل باطل کو ایک جگہ قتل نفس سے تعبیر کیا گیا ہے اور دوسری جگہ " سحت " کہا گیا ہے ۔ سحت کے معنی مٹ جانے اور ختم ہو جانے کے معنی ہیں یعنی حرام مال کھانے والے کی تمام نیکیوں کو مٹا دیتا ہے ۔ امام راغبؒ لکھتے ہیں :۔

السحت للمحظور الذی	سحت اس حرام اور ممنوع چیز کے لیے بولا جاتا ہے
یلزم صاحبہ العار کانہ یسحت	جو اس کے کھانے والے کے لیے ننگ و رسوائی کا سبب
دینہ ومروءتہ قال تعالیٰ	ہو گویا وہ کھانے والے کے دین کو ختم کر دیتا ہے
اکالون للسحت ای لما یسحت	اللہ تعالیٰ نے حرام کھانے والوں کو اکالون للسحت
دینھم وقال علیہ السلام	اس لیے کہا ہے کہ حرام مال نے اس کے دین کو ختم کر دیا ہے

[1] واقعہ مدینہ منورہ کا ہے اور آیت مکی ہے ۔ (مدیر)

کل لحم نبت من سحت فالنار اولی به وسمی الرشوۃ سحتا۔	اور نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ وہ گوشت جو حرام سے پلا ہو وہ دوزخ کا زیادہ مستحق ہے اور رشوت کو بھی اسی وجہ سے سحت کہتے ہیں۔

ایک اور حدیث بھی ہے کہ ایک بندہ پورے تضرع کے ساتھ دعا کرتا ہے مگر اس کی دعا اس لیے مقبول نہیں ہوتی ہے کہ حرام خور ہے

ذکر الرجل یطیل السفر اشعث اغبر یمد یدیہ الی السماء یارب یارب ومطعمہ حرام ومشربہ حرام وعلیہ ملبس حرام وغذی بالحرام۔ (مشکوٰۃ)	ایک ایسے شخص کا آپ نے ذکر کیا جو طویل سفر میں پراگندہ حال ہے (اس حال میں چونکہ دعا مقبول ہوتی ہے) اس لیے وہ دعا کے لیے آسمان کی طرف اپنا ہاتھ پھیلا تاہے اور اے پروردگار، اے پروردگار کہہ کر عرض حاجت کرتا ہے اور صورت یہ ہے کہ اس کا کھانا پینا ہی حرام ہے اور لباس بھی حرام سے بنا ہے اور حرام خوری سے اس کا جسم پلا ہے تو ایسے شخص کی دعا کیسے قبول ہو سکتی ہے۔

زبان کی حفاظت کا ذکر بھی بے شمار آیات و احادیث میں ہے۔ آپ نے فرمایا کہ بہت سے لوگ صرف اپنی زبان کی وجہ سے جہنم میں جائیں گے۔ ایک بار صحابہ نے سوال کیا کہ سب سے افضل کون شخص ہے آپ نے فرمایا کہ

مخموم القلب صدوق اللسان	پاکیزہ دل اور زبان کا سچا۔

صدق مقال کا تقاضا ہے کہ لایعنی باتوں، غیبت اور طنز و تعریض سے گریز کیا جائے۔ یہ خوف و خشیت کے لیے حجاب بنتی ہیں۔

(۶) ایک اور چیز اس سلسلے میں نہایت مفید ہے وہ ہے خاشعین فی الصلوٰۃ کی صحبت۔ یہ صحبت قرآن و حدیث سے گہرے مطالعہ سے بھی حاصل ہوتی ہے اور بزرگان ملت کی سوانح حیات کے مطالعہ سے بھی مگر یہ چیز خاص خواص ہی کے لیے مفید ہے تو ہو اور عام لوگوں کے لیے زندوں کی صحبت صد درجہ ضروری ہے۔ سلف میں یہ عام رواج تھا صحابۂ کرام آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح کیفیاتِ نماز معلوم کرنے کی فکر میں آستانۂ نبوی پر پوری رات گزار دیتے تھے اسی طرح تابعین صحابہ سے جہاں علم و فضل حاصل کرنے جاتے تھے وہیں ان کیفیات کو بھی حاصل کرتے تھے جو انھوں نے صحبت نبوی سے حاصل کی تھیں۔ اسی طرح یہ سلسلہ ہمیشہ قائم رہا اس لیے اس کی طرف شدید توجہ کی ضرورت ہے۔ اس کی طرف سے استغنا آدمی کو بہت سی سعادتوں سے محروم کر دیتا ہے۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔ (ختم شد)

مدیر "تجلّی" کا مکتوبِ گرامی

اخی فی الدین! تحیات مسنونہ

ابھی جنوری ۱۹۶۳ء کے "زندگی" میں "زکوٰۃ کا ایک جزئیہ" کے زیرِ عنوان جو کچھ آپ نے سپرد قلم فرمایا ہے اس پر مطول بحث تو مقصود نہیں لیکن چند دوستانہ معروضات ضرور پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اگر یہ بھی قارئین کے سامنے آجائیں تو زیرِ بحث مسئلہ کا فیصلہ وہ علیٰ وجہ البصیرت کر سکیں گے۔ وما التوفیق الا باللہ

اولاً میں چند شکوے بھی آپ سے کروں گا، شکوہ تعلق کا ثبوت ہے۔ یہ فیصلہ خود آپ پر اور قارئین پر چھوڑتا ہوں کہ شکوے بجا ہیں یا بے جا۔ بے جا ٹھیرے تو مجھے اپنے دوست سے معافی طلب کرنے میں بھی عار نہ ہوگا۔

پہلی بات تو یہ ہے ـــــ جو بجائے خود شکوہ نہیں ـــــ کہ میں نے زیرِ بحث مسئلہ میں جو کچھ تجلّی نومبر ۶۲ء میں لکھا تھا اس سے یہ خطرہ محسوس کرنا کہ کسی کو آپ کے مسلک و موقف کے بارے میں غلط فہمی ہو جائے گی غیر ضروری ذکاوتِ حس کا ثمرہ معلوم ہوتا ہے ورنہ کسی ہوشمند کے دماغ میں یہ تصور بھی آسکتا ہے کہ عروج صاحب یا کوئی بھی عالم نصاب کی قید اٹھا کر سونے چاندی کی قلیل سے قلیل مقدار پر بھی زکوٰۃ لازم کر دے گا۔

تاہم آپ کا اندیشہ معقول بھی ہو تو شکوے کا پہلو یہ ہے کہ اس کو دفع کرنے کا انداز آپ نے ایسا اختیار کیا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عاجز نے قصداً ایسے نامکمل فتوے نقل کیے جو غلط فہمی پیدا کرنے کے موجب ہوں۔ حاشا ثم حاشا۔ میرے دوست ارادۃً ایسی گھٹیا حرکت تو میں دشمن کے ساتھ بھی نہیں کر سکتا۔ چہ جائیکہ اپنے مخلص دوست کے ساتھ۔ علمی مباحث میں ایسی عیاری متعصب اور بد دیانت ہی لوگ کر سکتے ہیں میں اس سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔

اگر آپ سچ مچ یہی سمجھتے ہیں کہ رائے زنی کے دوران جو عبارتیں میں نے آپ کی نقل کی تھیں ان میں قابلِ اعتراض قصر و اختصار ہے تو اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ غیر ضروری طوالت سے بچنے کے لیے ہر ناقد و مبصر کو جزوی اقتباس پر ہی قناعت کرنی پڑتی ہے اور آپ کی تحریر چونکہ تازہ تھی اس لیے میں قدرتاً یہی تصور رکھتا تھا کہ جسے اس بحث سے دلچسپی ہوگی

رہ بآسانی "زندگی" بھی دیکھ لے گا۔ پھر بھی اگر میری کوتاہی سے کہیں اقتباس قصیر رہ ہی گیا ہو تو اسے میری نیت کا نہیں سمجھ کا فتور خیال کرتے ہوئے دل کے آئینے کو غبار کدورت سے صاف کرلیں۔

دوسرا پہلو شکایت کا یہ ہے کہ آپ کا تازہ مضمون بحیثیت مجموعی بھی اس دوستانہ اسپرٹ اور خندہ جبینی کا احساس نہیں پیدا کرتا جس کی مجھے آپ سے توقع تھی اور جو علمی مباحث میں ہر بے لوث اور فراخ دل عالم کا طرۂ امتیاز ہونا چاہیے ہلکی ہلکی شکر رنجی اور میٹھے میٹھے خروش کی جھلکیاں صرف بین السطور ہی میں نہیں آپ کے بعض الفاظ میں بھی ملتی ہیں حالانکہ فدوی نے تجلی میں جو انداز گفتگو اختیار کیا تھا اس کا صحت مند ردعمل یہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ آپ اپنے اور میرے قلم پارہ کو ایک بار پھر ذرا ٹھنڈے دل سے پڑھ کر دیکھیں انشاء اللہ اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ میرے اور آپ کے ٹمپریچر میں مطابقت نہیں رہی ہے۔ میں ایک غیر جذباتی انداز میں خالص علمی مذاکرے کا جویا تھا مگر آپ نے اپنے اسلوب میں جذبات کی چاشنی بھی شامل فرمادی

تیسرا پہلو شکایت کا یہ ہے کہ اپنے مضمون کی پہلی قسط میں بھی آپ نے ایک دو جگہ تجہیل و تحمیق کا انداز اختیار کیا تھا اور اس دوسری قسط میں بھی یہ پیرایہ موجود ہے۔ مثلاً آپ لکھتے ہیں:۔

"فاضل مدیر (یعنی عامر عثمانی) نے تردید کرتے ہوئے احتیاط کی جو مثالیں دی ہیں انھیں پڑھ کر حیرت ہوئی"

صفحہ ۳۸ سطر ۶

یا مثلاً آپ کے الفاظ ہیں:۔

"میں موصوف کی (عامر عثمانی کی) یہ عبارت پڑھ کر ششدر رہ گیا اور فقہ حنفی سے واقف ہر شخص حیران رہ جائے گا اگر موصوف نے الفقہ علی مذاہب الاربعۃ کے علاوہ دوسری کتابیں نہیں پڑھی تھیں تو کم سے کم فتح القدیر کی وہ عبارت ان کی نظر سے ضرور گذری ہوگی جو میں نے اپنے مضمون میں نقل کی تھی" صفحہ ۴۲ سطر ۱۳ تا ۱۶

یہ باتیں ظاہر ہے یہی مفہوم رکھتی ہیں کہ عامر عثمانی فقہ میں کورا ہے اور قلت علم کے باعث ایسی بے تکی باتیں کہتا ہے جن پر اہل علم کو حیران و ششدر رہے بغیر چارہ نہیں۔ میرے دوست! اصلاً تو یہ درست ہے کہ عامر عثمانی کا سرمایہ علم کچھ بھی نہیں لیکن خود آپ کے حسن تعلق اور اخلاق کریمانہ کا یہ تقاضا ضرور ہونا چاہیے تھا کہ اس کی ہانڈی چوراہے پر نہ پھوڑیں۔ وہ اور آپ حریف نہیں دوست ہیں۔ ایک ہی فقہ کے پیرو اور ایک ہی آئیڈیالوجی کے حامل ہیں۔ آپ دونوں کو ایک دوسرے

کی خامیوں اور کوتاہیوں پر اس حد تک نگاہِ شفقت ضرور ڈالنی چاہیے جس حد تک علم و تفقہ اور عدل و دیانت کے تقاضے مجروح نہ ہوتے ہوں۔ یہ کیا ضروری ہے کہ عامر عثمانی کی رائے سے متفق نہ ہونے کی صورت میں آپ استعجاب کا وہ اسلوب اختیار کریں جو کوئی ایک عالم ایک عامی کی باتوں پر اختیار کرتا ہے۔

دوستانہ شکوہ سنجی کا باب تو تمام ہوا۔ اب میں یہ بتا دینا بھی مناسب خیال کرتا ہوں کہ آپ کے تحیر اور قدرے غیر دوستانہ رویے کے عقب میں میرے نزدیک کیا چیز کارفرما ہے۔ میرا خیال ہے آپ کے تفقہ کا قدم... مجتہدین کے فکری مدارک و مناہج تک پہنچنا پسند نہیں کرتا بلکہ پانچویں یا چوتھے طبقے پر جاکر رک گیا۔ کو کلی یقین ہے کہ عامر عثمانی چھٹے اور ساتویں طبقے کے فقہاء سے بھی آشنا نہیں، نہ ہدایہ اور شرح وقایہ کتب پر ہی اس کی نظر ہے اسی لیے وہ اگر کوئی ایسی نکتہ سنجی کرتا ہے جو بالکل سامنے کے فقہی متون و شروح... تو آپ قدرتاً اسے بے علمی و بے خبری پر محمول کرتے ہیں اور اس کے نتائج میں متحیر بھی ہوتے ہیں اور چیں بہ جبیں بھی۔

حالانکہ میرے دوست! عامر عثمانی نے جب سے دینی موضوعات کی دراست و تفکیر کو اپنا مقصدِ حیات بنایا ہے وہ اپنے جہل کو علم سے اور بے بصری کو تفقہ سے بدلنے میں دن رات کوشاں ہے۔ آپ فتح القدیر اور شامی وغیرہ کی بات کرتے ہیں حالانکہ ان کے عالی قدر جامعین و مولفین صرف اصحاب ترجیح و تخریج ہیں اس ناکارہ نے تو مجتہدین فی المذہب اور ان سے متصل طبقہ ثالث کے فقہاء کے دراسات پر بھی اپنی بینائی اور قوت فہم کا بہت سا سرمایہ صرف کیا ہے اور برابر کرتا رہتا ہے۔ بجا کہ وہ مقلد ہے لیکن تقلید کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہدایہ اور شامی و عالمگیری تک محدود رہ کر سرخسیؒ بزدویؒ علوائیؒ کرخیؒ اور طحاویؒ جیسے متقدمین کے اصولی افاضات سے اپنے ذہن کو جلا نہ دی جائے۔ وہ تو اس سے ایک قدم بڑھ کر ابو یوسف، امام محمد، زفر اور ابو حنیفہ رحمہم اللہ کے دسترخوانوں سے بھی براہ راست ریزہ چینی کو منصبِ تقلید کے معارض نہیں سمجھتا۔

میرا گمان ہے کہ موجودہ بحث میں آنجناب نے ائمہ احناف کی ان باریک بینیوں اور دقیقہ سنجیوں کو ملحوظ نہیں رکھا ہے جو انھوں نے مناط کی تنقیح و تحقیق اور وصف و علت کی تعیین اور تخریج میں کی ہیں اور اسی دقت نظر نے انھیں دوسرے مکاتب و مذاہب کے مقابلے میں ممتاز کیا ہے۔ میں اور آپ دونوں نے فقہ کی متداول کتابوں میں وہ مخصوص جزئیہ ڈھونڈا جس پر گفتگو ہو رہی ہے مگر وہ نہیں ملا تو ہمیں رائے قائم کرنے میں ابن الہمام اور ابن عابدین ہی پر اکتفا نہیں کر لینا چاہیے تھا بلکہ احناف کی معروف ژرف نگاہی کے ساتھ ائمہ اصول اور فقہائے متقدمین کے دراسات سے بھی بقدرِ فہم فائدہ اٹھانا چاہیے

ما، آپ کا مسلک و مشرب کچھ بھی ہو لیکن بندہ تو اپنی بے بضاعتی کے باوجود اس جمود و تساہل کو کفران نعمت تصور کرتا ہے کہ جن معاملات میں ہمیں فکر و تدبر کی اجازت ہے ان میں بھی ہم اللہ کی دی ہوئی عقل و بصیرت کو ان فقہائے مابعد کا تابع مہمل نادیں جو حق تک پہنچنے کا صرف ایک ذریعہ ہیں خود مطاع و منقاد نہیں ہیں۔

اس تمہید کے بعد بندہ عرض کرتا ہے کہ یہ جو آپ عبادات میں احتیاط کو واجب قرار دینے کی بات بار بار کہے جا رہے ہیں یہ ادھوری ہے علمائے اصول نے اس باب میں جو کچھ کہا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ عند تعارض المعارضۃ وانعدام الترجیح یجب الاخذ بالاحتیاط گویا احتیاط پر عمل کا وجوب اس وقت ہے جب متقابل دلیلوں میں برابر کی ٹکر ہو اور کسی ایک جانب کو ترجیح دینے کے لیے معقول وجہ ہاتھ نہ آئے چنانچہ اس بار خود آپ نے بھی بایں الفاظ اس کا ذکر کیا ہے کہ

"کسی چیز کے بارے میں کوئی حتمی و یقینی فیصلہ دشوار ہو" (صفحہ ۴۸ سطر ۱۱)

گو کہ آپ نے جس پرواز میں یہ بات کہی ہے وہ بھی ایک لطیف تسامح سے خالی نہیں۔ فیصلہ دشوار ہونے کو آپ نے احتیاط کی وضع اور تعریف میں داخل کر دیا حالانکہ اصول فقہ میں اس کا ذکر ایک شرط کی حیثیت سے ہے۔ یعنی احتیاط پر عمل اس وقت واجب ہے جب دلائل متضارب ہوں اور کسی جانب کا تعین دشوار ہو جائے۔ شرط شی خود شی سے جدا گانہ ہوا کرتی ہے مگر آپ تسامحاً شرط ہی کو عین شے قرار دے رہے ہیں۔ دوسرے حتمی و یقینی کے الفاظ بھی مبالغہ سے خالی نہیں۔ جزم و یقین تو نصوص سے حاصل ہوا کرتا ہے۔ ذیلی قوانین کی بنیاد ظن غالب پر ہے اور ظن غالب ہی کا دوسرا نام ترجیح ہے۔ احتیاط پر عمل ہرگز واجب نہیں ہوتا اگر مسئلہ کی ایک جانب متعین کرنے کے لیے ظن غالب میسر آ جائے۔

مگر ان باریکیوں سے قطع نظر کر لیجیے تب بھی یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ عمل بالاحتیاط کے لزوم کی جو تین مثالیں آپ نے فیصلہ دشوار ہونے کے ذیل میں پیش کی ہیں وہ میرے کسی دعوے کی تردید نہیں کرتیں نہ خود آپ کے دعوے کے مؤید ہیں۔ میں نے اپنے مضمون میں یہ کہا تھا کہ احتیاط پر عمل واجب ہونے کا فقہی اصول اتنا غیر محدود نہیں ہے کہ قانونی بحث میں بھی کارآمد ہو سکے۔ اس معروضے کو یا تو آپ نے پوری طرح سمجھا نہیں یا سمجھنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ اس سے بلا ریب یہ واضح ہے کہ بعض حدود و قیود کے ساتھ میں بھی احتیاط پر عمل کرنے کو واجب تسلیم کرتا ہوں لیکن بلا قید ہمیشہ احتیاط پر عمل واجب ہونا درست نہیں۔ اب آپ جو مثالیں پیش فرما رہے ہیں ان میں عمل بالاحتیاط کا لزوم اس شرط کے پائے جانے کی وجہ سے ہے جسے میں اوپر فقہاء کے الفاظ میں بیان کر آیا ہوں یعنی دلیل ترجیح کا معدوم ہونا حالانکہ امثلہ آپ

بھی پیش کرنی چاہیے تھیں جن میں دلیل ترجیح پائے جانے کے باوجود احتیاط پر عمل واجب ہو رہا ہو۔

ذرا غور کیجیے۔ ایک زیور میں ایک تولہ سونا ہے اور سوا تولہ کھوٹ۔ اب احتیاط کا تقاضا تو یہ ہے کہ اس ایک تولہ سونے کو سونا ہی مانا جائے لیکن چونکہ کھوٹ کا غالب ہونا دلیل ترجیح ہے اس لیے شرعی قانون احتیاط کو نظر انداز کر کے فیصلہ دیتا ہے کہ یہ زیور سونے کا نہیں ہے اور اس کے مغلوب سونے کو زکوٰۃ کا پابند نہیں کیا جائے گا۔ لیکن ایک صورت وہ ہے جسے آپ نے مثال میں پیش کیا یعنی سونا اور کھوٹ بالکل برابر برابر ہوں۔ تو اس وقت کوئی قانونی دلیل ترجیح کی نہیں پائی جاتی اس لیے احتیاط پر عمل واجب ہوگا اور زیور کو سونے کا شمار کیا جائے گا۔ اسی طرح آپ کی پیش فرمودہ دوسری امثلہ میں مجرد احتیاط فیصلے کی بنیاد نہیں ہے بلکہ وجہ ترجیح مفقود ہونے کی بنا پر وجوب احتیا ہے۔ تعجب ہے آپ ان لطیف فروق کو نہیں محسوس فرماتے حالانکہ فقہ تو تمام تر اسی دقتِ نظر کا ثمرہ ہے۔ نصوص موجود ہوں وہاں تفقہ کی کیا ضرورت پیش آئے گی۔ ذرا سوچیے تو قرآن نے حکم دیا وَامْسَحُوْا کا کھلا تقاضا یہ تھا کہ جب اللہ سر کے مسح کا حکم دے رہا ہے تو وضو میں پورے ہی سر کا مسح کیا جائے لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ احناف اس احتیاط کو واجب نہیں مانتے بلکہ دلائل ترجیح مل جانے کے باعث محض چوتھائی سر کے مسح کو ضروری قرار دیتے ہیں حالانکہ قرآن نے رُبع یا نصف سر کا ذکر نہیں کیا۔ اس سے واضح ہوا کہ معتد بہ وجہ ترجیح مل جانے کے بعد احتیاط پر عمل واجب نہیں ہوتا بلکہ ایک واضح قانون طے پا جاتا ہے۔ طول کے خوف سے مزید مثالیں نہیں دیتا ورنہ آپ جانتے ہیں ایسی مثالوں کی کمی نہیں۔ ایک دلچسپ تخالف آپ کے رشحات میں اور بھی ہے۔ آپ نے فرمایا:۔

"میں تو یہ جانتا ہوں کہ عبادات میں احتیاط کا لفظ دو موقعوں پر استعمال کیا جاتا ہے ایک یہ کہ کسی چیز کے بارے میں کوئی حتمی و یقینی فیصلہ دشوار ہو" اور دوسرا یہ کہ اختلاف فقہاء سے بچ کر عمل کرنا بہتر سمجھا جائے"

(صفحہ ۳۸ سطر ۱۵)

پہلے "موقع" پر تو ابھی میں نے گفتگو کی۔ دوسرے موقع کے بارے میں عرض ہے کہ "بہتر" اور "واجب" میں بہت فرق ہے یہ تو آپ نے خود ہی اپنے دعوے کی تردید کر دی۔ آپ دعویٰ یہ کر رہے ہیں کہ عبادات میں احتیاط پر عمل بلاقید واجب ہے۔ پھر اختلاف فقہا سے بچ کر عمل کرنے کو احتیاط بھی مان رہے ہیں تب تو یہ عمل واجب ہونا چاہیے تھا نہ کہ صرف بہتر۔ وقت ظہر کی جو مثال آپ نے پیش فرمائی ہے اس کا بھی یہی معاملہ ہے۔ آپ نے کہا:۔

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک فئے زوال کے سوا دو مثل تک ظہر کا وقت ہے اور دیگر ائمہ کے نزدیک ایک مثل تک۔ علماء فرماتے ہیں کہ احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ ایک مثل کے اندر ظہر کی نماز ادا کر لی جائے" (صفحہ ۳۹۔ سطر ۶ و ۷)

بجا لیکن کیا ائمہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ یہ احتیاط واجب ہے؟ بحرالرائق اور شامی وغیرہ میں تو وجوب کا فیصلہ نہیں دیا گیا۔ خود آنجناب بھی واجب کی بجائے "بہتر" فرما رہے ہیں۔ تو صریحاً یہ دعویٰ ٹوٹ گیا کہ احتیاط پر ہر حال میں عمل واجب ہے۔

اور میں کہتا ہوں کہ اگر ایک مثل کے اندر ظہر پڑھ لینے کا وجوب مان بھی لیں تو اس کی بنا اس اصول پر نہیں ہوگی کہ مطلقاً احتیاط پر عمل واجب ہے بلکہ اس پر ہوگی کہ دلائل کے ٹکراؤ نے اسباب ترجیح غائب کر دیے ہیں۔ ٹکراؤ کی تفصیل یہ ہے کہ ایک طرف تو کتب مشہورہ میں امام صاحب کا مذہب دو مثل کا پایا جاتا ہے مگر دوسری طرف ایک مثل کی بھی روایت ان کی طرف منسوب ہے اور اس روایت کو قیاسی تقویت یوں پہنچتی ہے کہ ان کے خصوصی تلامذہ قاضی ابو یوسف اور امام محمد دونوں اسی روایت کے مطابق رائے رکھتے ہیں اور زیلعی نے ـــــ جو فقہائے احناف میں خاصے ممتاز ہیں اسی کا قول کیا ہے لہذا اگر اس تصادم کے باعث جو فقہا ترجیح سے عاجز ہوں وہ بشوق کہہ سکتے ہیں کہ یہاں احتیاط پر عمل واجب ہے۔

ایک اور بات دیکھیے ـــ وضو میں پورے سر کا مسح آیتِ قرآنی کے پیش نظر تو احتیاط میں داخل تھا ہی اختلاف ائمہ سے بچنے کے لیے بھی احوط ہے۔ مالکیہ اور حنابلہ پورے ہی سر کے مسح کو واجب قرار دیتے ہیں۔ پھر آخر کیوں احناف اس دوہری احتیاط کو بھی واجب نہیں مانتے جبکہ آپ مجرد احتیاط کو ہر حال میں واجب قرار دے رہے ہیں۔ میرے پاس تو اس کا صاف سا جواب موجود ہے یہی کہ دلائل ترجیح مل جانے کے بعد قانون بنانے میں احتیاط کا لحاظ نہیں ہوا کرتا مگر آنجناب کے پاس کیا جواب ہے جب کہ آپ احتیاط کو ہر حال میں واجب العمل ماننے پر مصر ہیں

میری دی ہوئی احتیاط کی مثالوں پر آپ کو حیرت ہوئی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ زیادہ گہرے جانا پسند نہیں کرتے۔ شاید اسی لیے آپ نے یہ بھی فرمایا کہ:

"یہ بات پہلی دفعہ معلوم ہوئی ...." صفحہ ۳۸ سطر ۱

مکرم دوست! ذرا یکسو ہو کر سوچیے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اعضائے وضو کو تین بار سے زائد دھونا احتیاط کے دائرے میں نہیں آتا خصوصاً گھنی داڑھی والے چہرے اور خاک آلود پیروں کو دھونے میں تو صریحاً احتیاط ہی کہلائے گی کہ گنتی کا لحاظ کیے بغیر انھیں اتنی بار دھویا جائے کہ اچھی طرح دھل جانے پر طبیعت مطمئن ہو جائے۔ لیکن جب سنت سے تعیین و ترجیح کی مضبوط وجہ فقہا کو مل گئی تو انھوں نے اس احتیاط کو واجب تو کیا مستحسن بھی نہیں مانا بلکہ کراہت کے خانے میں لکھ دیا (گو کہ عاجز کو کراہت کے اطلاق میں بھی کلام ہے مگر یہ جداگانہ بحث ہے۔)

اور آگے بڑھیے۔ مجھے تعجب اس پر ہوا ہے کہ جب آپ نے اپنے پچھلے مضمون میں فتح القدیر اور درمختار کی وہ عبارتیں خود ہی نقل فرمادی تھیں جن میں کھوٹے سکوں کے سونے چاندی کو دوسرے موجود سونے میں ضم کرنے کی تصریح ہے اور اس کے باوجود آپ کے مضمون کا تعقب کرتے ہوئے میں نے یہ دعویٰ کیا کہ گوٹے پٹھے کی مغلوب چاندی سونے کو دوسرے قلیل از نصاب سونے چاندی میں ضم کرنے کا اشارہ تک مسلکِ حنفیہ میں نہیں ملتا۔ تو آپ کو قدرتاً یہ سمجھ لینا چاہیے تھا کہ میں ایک مخصوص ترین صورت کی بات کر رہا ہوں اور اس سمجھنے کے لیے میری وہ تفصیلی گفتگو بھی راہ نما تھی جس میں میں نے بتایا تھا کہ کھوٹے سکوں میں پائے جانے والے چاندی سونے یا ظروف اور کتابوں پر بصورت نقش پائے جانے والے سونے چاندی میں اور ایک غریب گھرانے کے تھوڑے سے گوٹے پٹھے میں پائے جانے چاندی میں لطیف فرق ہے۔ مگر افسوس آپ نے نزاکتوں کو نظر انداز کر کے ایک سطحی نظر میری معروضات آمیز تحیر کا اظہار کرتے ہوئے پھر سے فتح القدیر اور درمختار کی وہی پہلی عبارتیں نقل کر دیں۔ یہاں تک الفاظ بھی آپ بلا تکلف لکھ گئے۔

"نیتوں کا حال تو خدا جانتا ہے لیکن حیرت ضرور ہوتی ہے"۔ صفحہ ۳۴ س ۱۹

اس طرزِ عمل سے مترشح ہوتا ہے کہ آپ اس تعمق، ژرف نگاہی اور امعان کو نظر انداز کر رہے ہیں جو فقہائے مجتہدین فقہ کی دراست و تفکیر میں اختیار کرتے تھے۔ خصوصاً امام اعظم اور ان کے تلامذہ کا تو طرۂ امتیاز ہی دقیقہ سنجی اور باریک بینی رہا ہے۔ پھر اس کی طرف بھی آپ کی توجہ مبذول نہیں ہوئی کہ فقہ کے اصول و مصادر میں ایک عظیم اصل و مصدر استحسان بھی ہے۔ میں اپنی تحریروں میں مکتبی مباحث اور درسی اصطلاحات سے عموماً پرہیز کرتا ہوں کیونکہ انھیں ہضم کرنا اکثر قارئین کے لیے دشوار ہے اسی لیے تجلی والے رشحات میں استحسان کا ذکر نہیں چھیڑا لیکن اب جبکہ آنجناب میری معروضات سے مطمئن نہیں ہوسکے ہیں مجبوراً اس رخ سے بھی کچھ کہنے کی اجازت چاہوں گا۔

آپ نے پہلے ظروف اور کتابوں کے نقش و نگار کو بطور نظیر پیش کیا تھا اور اب بہشتی زیور سے دو نظیریں نقل کی ہیں۔ اس کے بعد آپ عامر کے اس طرزِ عمل کو "عجیب و غریب" (صفحہ ۴۰) قرار دیتے ہیں کہ وہ زیرِ بحث جزئیے میں ان نظائر کے خلاف فیصلہ دے رہا ہے۔ آپ کی یہ روش بداہتہً اس حقیقت کی طرف مشیر ہے کہ تا نونِ شریعت کے ایک اہم بالشان سرچشمے استحسان کو آپ مستحضر نہیں رکھ سکے ہیں ورنہ استحسان تو نام ہی اس کا ہے کہ قیاس جلی کو چھوڑ کر قیاس خفی یا مصالح مرسلہ کے تحت کسی مسئلے کے حکم کو اس کے نظائر سے کاٹ دینا۔ اصول فقہ کی تمام کتابوں میں اس طرح کی عبارتیں موجود ہیں،

العدول فی مسئلۃ عن مثل ما حکم بہ فی نظائرھا ـــــ یا قطع المسئلۃ عن نظائرھا

بما ھو اقوی ـــ یا ـــ العدول عن قیاس الیٰ قیاس اقوی ـــ یا الاستحسان ترک القیاس والاخذ بما ھو اوفق للناس - علمائے احناف کے یہاں امام کرخی کی تعریف زیادہ مقبول ہے جو یہی تو ہے کہ کسی خاص مسئلے میں اس کے امثال و نظائر کے مطابق فیصلہ نہ کرنا بلکہ کسی سبب قوی کی بنا پر خواہ وہ صورتاً کتنا ہی خفی اور مکنون ہو امثال و نظائر سے مختلف حکم لگانا - اگر یہ سب کو مستحضر ہوتا تو عامر کی اس حرکت کو "عجیب و غریب" نہ قرار دیتے کہ وہ ایک مسئلہ میں اس کی نظیروں کے خلاف حکم لگا رہا ہے -

آپ کو یاد ہونا چاہیے کہ امام مالکؒ استحسان کو علم کے دس درجوں میں سے نو درجوں کے مساوی قرار دیتے ہیں اور ہمارے امام عالی مقام تو اس باب میں نمایاں امتیاز کے مالک ہیں ہی حتیٰ کہ ان کے جو شاگرد قیاسی مسائل میں ان سے برملا اختلاف کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے وہ بھی اس مسئلے میں اختلاف سے دست کش ہو جاتے تھے جس کے بارے میں امام صاحب فرما دیں کہ یہ میں استحساناً کہہ رہا ہوں -

پھر یہ بھی آپ جیسے صاحب بصیرت کو معلوم ہوگا کہ استحسان معاذ اللہ کوئی خلاف دین چیز نہیں ہے جیسا کہ امام شافعی اور بعض دیگر علماء نے تسامحاً ایسا سمجھ لیا ہے بلکہ وہ تو ایک قوی اور مقدس اصل ہے جو قرآن و سنت ہی سے مستفاد ہے - يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (البقرۃ) وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ (الحج) خیر دینکم الیسر (الحدیث) يَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا (الحدیث) یہ استحسان ہی تو ہے کہ بلی اور چھوٹے شکاری پرندے کا جھوٹا ناپاک نہیں ہوتا - حالانکہ اصولاً یہ درندے ہیں اور قیاس جلی ان کے جھوٹے کو ناپاک قرار دینے کے حق میں ہے - یہ استحسان ہی تو ہے کہ دو روٹیاں قرض لینے کے بعد آپ انھیں ایسی دو روٹیوں سے ادا کر دیں جو وزن میں کچھ زائد ہوں اور ربوٰ لازم نہ آئے حالانکہ قیاس جلی اس معاملہ کو ربوٰ کے خانے میں رکھتا ہے - یہ استحسان ہی تو ہے کہ بیع سلم جائز مان لی گئی اور صناعوں کو سائی دے کر ایسی چیز کا سودا مباح قرار پایا جس کا ابھی وجود ہی نہیں حالانکہ قیاس جلی اسے بیع فاسد گردانے کا متقاضی ہے - یہ استحسان ہی تو ہے کہ بھولے سے کھا لینے پر روزہ نہیں ٹوٹتا حالانکہ قیاس جلی ٹوٹنے کا طالب ہے - یہ استحسان ہی تو ہے کہ حوض اور کنوئیں ناپاک ہونے کے بعد پانی کی ایک جزوی مقدار نکال دینے سے پاک ہو جاتے ہیں حالانکہ قیاس چاہتا ہے کہ وہ ہرگز پاک نہ ہوں - یہ استحسان ہی تو ہے کہ کبوتروں کی بیٹ بر از کے عام حکم سے جدا حکم رکھتی ہے حالانکہ قیاس اس امتیاز کا مؤید نہیں -

تو میرے محترم اس غریب گھرانے کے حق میں ہم استحسان کا برتاؤ کیوں نہیں کر سکتے جس کے پاس نصاب سے کم زیور ہے اور تھوڑا سا سچا گوٹہ - زکوٰۃ مالی مسئلہ ہے لہذا غربت و امارت کے فرق کو اس کے گوناگوں معاملات میں ملحوظ رکھنا ہی

ہوگا۔ عاجز اپنے تجلی والے مضمون میں کھول کر بتا چکا ہے کہ برتنوں یا کتابوں یا کھوٹے سکوں میں پائے جانے والے سونے چاندی کے مقابلے میں سچے گہنے کی حیثیت کیوں جداگانہ ہے اور یہ کہ جو "نقدیت" سونے اور چاندی میں مناط حکم مانی گئی ہے وہ بھی اس میں اتنی کمزور ہے کہ اسے اگر عملاً "نقد بنایا جائے تو قیمتِ خرید کا نصف بھی وصول نہیں ہوتا۔ ایسی حالت میں کون سا شرعی مانع ہے کہ ہم استحسان سے کام نہ لیں اور اس خاص جزئیے کے حکم کو اس کے نظائر سے کاٹ نہ دیں۔

بعض فقہاء استصلاح (مصالح مرسلہ کی بنیاد پر فیصلے دینے) اور استحسان کو دو جداگانہ معیاروں کی حیثیت سے ذکر کرتے ہیں لیکن میں جہاں تک سمجھا ہوں یہ ایک ہی سرچشمے کے دو سوت اور ایک ہی دو دروازے ہیں۔ بہر حالت میں زیر بحث جزئیے کو اس زاویۂ نظر سے دیکھنا جس سے میں دیکھ رہا ہوں استحسان واستصلاح دونوں سے ہم آہنگ ہے۔ استصلاح کے لیے علمائے اصول نے جو حدود وشرائط بیان کی ہیں اپنے مقدور بھر نظر ڈال چکا ہوں مجھے تو کوئی قید وشرط ایسی نظر نہیں آئی جس کی رو سے اس بحث سے فائدہ اٹھانا مردود قرار پائے۔ اگر یہ میری کوتاہ نظری ہے تو آپ بلا تکلف اس پر رد وقدح کر سکتے ہیں اور غلط فہمی نہ رہے کہ ان نکتہ سنجیوں کا مقصود اپنے مجتہد ہونے کا ادعا ہرگز نہیں ہے۔ اگر فقہائے عظام اس خاص جزئیے میں کوئی فیصلہ دے گئے ہوتے تو اور بات تھی لیکن جب مجھے اور آپ کو ایسا کوئی فیصلہ نہیں ملا تو کیوں نہ ہم اپنے ائمۂ جلیل کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے دقتِ نظر اور عرق ریزی سے کام لیں اور کس لیے سخت گیر ومتشدد بن جائیں۔ مان لیجیے آپ اس باریک بینی سے متفق نہیں تو آپ کو حق ہے کہ اپنے فیصلے پر جمے رہیں اور اسی کے مطابق فتویٰ دیا کریں لیکن یہ آپ کو حق نہیں کہ آپ ان لوگوں کا سا رویہ اختیار کریں جنھوں نے ائمہ کرام کو تعریفاً نہیں بلکہ طنزاً اہل الرائے کہہ کہہ کر مطعون کیا تھا اور آج بھی کرتے ہیں۔

تفصیلات سے پرہیز کرتے ہوئے یہ چند صفحات کا عریضہ پیش کر دیا ہے زندگی میں شائع فرمادیں اور آپ کو اختیار ہے کہ تردید یا تائید میں جو چاہیں لکھیں بس اتنا ملحوظ رہنا چاہیے کہ لہجہ طیش اور خفگی کا نہ ہو۔ دقیق علمی مباحث ٹھنڈے دل ودماغ کے متقاضی ہیں۔

خدا کرے آنجناب بہمہ وجوہ خیریت سے ہوں۔ فقط والسلام

آپ کا مخلص عامر عثمانی

نوٹ: - قارئین زندگی واقف ہیں کہ گہنے پاتے کی زکوٰۃ کے مسئلے پر زندگی ماہ جنوری ۱۹۶۳ء میں

مدیر تجلی کا مکتوب گرامی

اپنی دوسری تحریر کو ختم کرتے ہوئے اس بحث کو میں نے درج ذیل جملہ لکھ کر بند کر دیا تھا:۔

"جہاں تک افہام و تفہیم کا تعلق ہے میرے نزدیک بات واضح ہو چکی اس لیے اب راقم الحروف اپنی طرف سے یہ بات ختم کرتا ہے"

اس دوسری تحریر کے بارے میں برادر محترم مولانا عامر عثمانی نے تجلی کے بجائے زندگی کے صفحات میں کچھ ارشاد فرمانا مناسب سمجھا چنانچہ موصوف کا مکتوب گرامی جوں کا توں شائع کر دیا گیا ہے۔ میں زیر بحث مسئلے میں اپنا موقف واضح کر چکا ہوں اس لیے اس مکتوب کے جواب میں کوئی مضمون نہیں لکھنا ہے۔ اس کی ضرورت اب یوں بھی ختم ہو گئی ہے کہ اس مکتوب میں موصوف نے یہ تسلیم فرما لیا ہے کہ زیر بحث مسئلے میں راقم جو کچھ کہہ رہا ہے قواعد فقہ حنفی کے قیاس کا تقاضا وہی ہے۔ راقم نے اپنی دو تحریروں میں یہی بات تو ثابت کی ہے اور کیا کیا ہے ——— موصوف نے اب جو اصول استحسان کا سہارا لے کر اپنے موقف کو صحیح قرار دیا ہے تو میں اس کے بارے میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ البتہ ایک بات تو برادر موصوف کی خدمت میں یہ عرض کرنی ہے کہ آپ نے میرے مضمون کا جواب تجلی میں شائع کیا تھا اس لیے میرے بارے میں اور نفس مضمون کے بارے میں غلط فہمیاں قارئین تجلی کو ہوئی ہوں گی اس لیے اپنے اس مکتوب کو جوں کا توں تجلی میں بھی شائع فرما دیں۔ کیونکہ تجلی کے بہت سے قارئین نے میرا مضمون نہیں پڑھا ہو گا اور وہ غلط فہمیوں میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ آپ کی ایک ضمنی بات پر چند لفظ اور عرض کرنا چاہتا ہوں ——— آپ نے زیر بحث مسئلے کے ذیل میں اپنے فقہی مطالعہ کی وسعت کا جو اظہار فرمایا ہے اور تقلیدی جمود کی جو نفی کی ہے وہ اپنی جگہ صحیح ہو گی لیکن پراویڈنٹ فنڈ کی زکوٰۃ کے مسئلے میں موجودہ دور کے دو علماء اور موجودہ دور کی ایک کتاب فتاویٰ کی شہادتیں پیش کرتے ہوئے آپ نے تحریر فرمایا ہے:۔

> ہم نہیں جانتے کہ ان شہادتوں کے بعد ہم مقلدین کے لیے نزاع و اختلاف کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے لیکن اگر آپ تقلید کو پسند نہ کریں تب بھی ہم جتنا کچھ عرض کر آئے ہیں وہ آزاد بحث کی سطح پر ہمارے موقف کی تائید کے لیے کافی ہے۔
>
> تجلی دسمبر ۱۹۶۲ء ص ۴۷

بڑے ادب سے عرض ہے کہ مکتوب گرامی کی بلند پروازی اور اس عبارت میں حقیر کو کوئی مناسبت نظر نہ آئی بہر حال اتنا عرض کرنا شاید نامناسب نہ ہو کہ یہ بات راقم الحروف کی افتاد مزاج سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتی کہ کہیں وہ ابن الہمام اور ابن عابدین کو بھی غیر صحیح سمجھے اور کہیں موجودہ دور کے عالموں کو یہ درجہ دے دے کہ کسی مسئلے میں ان کے

فتوے کے بعد نزاع واختلاف کی گنجائش بھی باقی نہ رہے۔

آخر میں ایک بات قارئین زندگی کی خدمت میں عرض کرنی ہے۔ میں نے جنوری ۶۳ء میں "زکوٰۃ کا ایک جزئیہ" کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے اس کی شق (۳) میں "احتیاط" کے سلسلے میں جو کچھ لکھا گیا ہے اسے ایک بار پھر پڑھ لیں اور اس کے بعد دیکھیں کہ میں نے وہاں کیا بات کہی ہے، کس ذیل میں کہی ہے اور موصوف اس کے جواب میں کیا کچھ ارشاد فرما رہے ہیں۔ نیز وہ یہ بھی تلاش کریں کہ میں نے کس جگہ یہ دعویٰ کیا ہے کہ "عبادات میں احتیاط پر عمل کرنا بلا قید واجب ہے" دعویٰ ہی نہیں کیا بلکہ "میں اس کو ماننے پر مصر بھی ہوں"۔ میں نے خود تلاش کیا لیکن مجھے اپنا یہ دعویٰ کہیں نہ ملا۔ برادر موصوف نے میری طرف جو بات منسوب کی ہے اس پر میں
تھا لیکن اب یہ بھی نہیں کر سکتا کیونکہ وہ اس کو اپنی تحمیق وتجہیل پر محمول فرماتے ہیں۔

(سید احمد قادری)

عملی رویہ

اچھے اصولوں اور بلند نظریوں کو اپنا لینا نہ کسی فرد کے لیے دشوار ہے نہ کسی گروہ کے لیے، اصل دشواری ان کے حقوق کے ادا کرنے میں ہوتی ہے۔ عموماً دنیا پر جب بھی بدقسمتی کے دور آئے تو اس لیے نہیں آئے کہ وہ اس وقت تمام انسانی قدروں سے، یکسر ناواقف ہو چکی تھی بلکہ اس لیے آئے کہ وہ ان سے واقف ہوتے ہوئے بھی، ان کا حق نہ پہچان سکی جہاں تک زبانی اظہار رواداری کا تعلق ہے خدا پرست تو خدا پرست، ملحد اور دہریے بھی انسانیت، راستی اور انصاف کا دم بھرتے دیکھے جا سکتے ہیں، مگر عملی رویے میں "خدا پرستی" کے دعوے دار بھی ان اعلیٰ اصولوں کی حرمت کا پاس ولحاظ رکھتے بس خال خال ہی نظر آ سکتے ہیں۔ خاص طور سے اجتماعی معاملات میں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خلاف گویا سبھی نے ایکا کر لیا ہے۔ قول اور فعل کے اس افسوسناک تضاد کی وجہ ہر جگہ یہی نہیں ہوتی کہ لوگ ان اصول خیر سے اپنی وابستگی ظاہر کرنے میں سرتاسر جھوٹ اور نمائش سے کام لیتے ہیں بلکہ اس کے برعکس، اکثر لوگوں کا حال یہ ہے کہ ان قدروں کی عملی خلاف ورزی کے باوجود وہ ان کو دل سے پسند کرتے اور ان سے عقیدت رکھتے ہوتے ہیں، البتہ یہ عقیدت خالص اور "لاشریک" نہیں ہوتی بلکہ کچھ ایسی چیزوں کی "عقیدتیں" بھی اس کی حریف ہوتی ہیں جن کے بہت سے مفادات حق وصداقت کو کچل کر ہی حاصل ہوا کرتے ہیں

سیاسی مسئلہ

مولانا سید حامد علی صاحب

اخلاقی مسئلہ کے بعد انسان کا دوسرا اہم اور بنیادی مسئلہ، سیاسی مسئلہ ہے۔ حکومت و سیاست نے ہر دور میں سوسائٹی کے بناؤ بگاڑ اور قوموں کے عروج و زوال میں نمایاں اور مؤثر پارٹ ادا کیا ہے لیکن موجودہ زمانے میں تو اس کی اہمیت و طاقت پہلے سے کئی گنا بڑھ گئی ہے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ حکومت کے ذرائع و وسائل پہلے کی نسبت بہت زیادہ ہو گئے ہیں اور وہ اس نوعیت کے ہیں کہ افراد کو ان پر دسترس نہیں ہے ــــ اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ حکومت کے مقابلے میں افراد کی اب کوئی حیثیت نہیں رہی ہے۔ دوسرے اس لیے کہ حکومت نے زندگی کے تقریباً تمام شعبوں پر قبضہ کر لیا ہے اور اگر ایک دو شعبوں کو بظاہر چھوڑ بھی دیا ہے تو اپنے وسیع ذرائع نشر و اشاعت اور اپنی سیاسی و معاشی چال بازیوں سے ان پر بھی اثر انداز ہوتی رہتی ہے۔ پھر یہ سیاست ہی ہے جس کا بین الاقوامی اور عالمی صورت پر براہِ راست اثر پڑتا ہے۔ اس لیے اگر سیاسی مسئلہ حل ہو جاتا ہے تو اس سے صرف سیاست کے مسائل حل نہیں ہوتے بلکہ قوموں کے تمام داخلی و خارجی مسائل کے سلجھنے کی راہیں پیدا ہو جاتی ہیں اور بین الاقوامی صورت حال کے ٹھیک ہونے کے امکانات بھی روشن ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اگر سیاسی مسئلہ الجھ جاتا ہے تو قوموں کے تمام داخلی و خارجی مسائل الجھ کر رہ جاتے ہیں اور بین الاقوامی فضا بھیانک اور خطرناک ہو جاتی ہے جس کا انجام موجودہ دور میں یہ ہے کہ عالم انسانی ایٹمی جنگ کا شکار ہو کر تباہی و بربادی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ جائے۔

سیاست اپنے دائرۂ کار کی وسعت کے لحاظ سے اپنے ذیل میں گوناگوں نوعیت کے بے شمار مسائل رکھتی ہے لیکن ان میں سے چار مسئلے بنیادی نوعیت کے حامل ہیں۔ ایک یہ کہ مقتدرِ اعلیٰ (SOVEREIGN) کون ہو؟ دوسرے یہ کہ قانونِ زندگی کس نوعیت کا ہو اور وہ کہاں سے ملے؟ تیسرے یہ کہ قانون کو نافذ اور حکومت کو چلانے والے افراد کن اوصاف کے مالک ہوں؟ چوتھے یہ کہ قانون کی پیروی اور اس کے احترام کا جذبہ عوام اور حکمراں گروہ میں

کیونکر پیدا کیا جائے؟ آج کل لادین سیاست (SECULARISM) کا دور دورہ ہے اور دورِ حاضر کے علمائے سیاست کو اس سیکولرزم پر اس قدر ناز اور اس کے مفید اور سیاسی مسائل کے کارگر حل ہونے پر اس قدر یقین ہے کہ وہ خدائی سیاست یا حکومتِ الٰہیہ کے بارے میں کچھ سننے کے روادار بھی نہیں ہیں۔ آیئے دیکھیں کیا خدا سے بے نیاز ہو کر مذکورہ بالا سوالات کا اطمینان بخش جواب، علمائے سیاست پیش کر سکے ہیں۔ اگر پیش کر سکے ہیں تو وہ کیا ہیں؟

مقتدرِ اعلیٰ کون ہو؟

سیاست کا سنگِ اساس، جس پر پورے نظامِ سیاست کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ مقتدرِ اعلیٰ کیونکہ جب تک فائنل اتھارٹی اور مقتدرِ اعلیٰ (SOVEREIGN) کی بات طے نہیں ہو جاتی نہ (STATE) وجود میں آسکتی ہے، نہ قانون اور دستورِ حکومت کے تشکیل پانے کا سوال پیدا ہو۔ انتظامیہ وجود پذیر ہو سکتی ہے، نہ قانون کی پیروی اور اس کے احترام کے پیدا ہونے کا امکان رونما ہوتا ہے۔ لیکن یہ بات یہ ہے کہ بے خدا نظامِ سیاست کے صدیوں سے جاری و نافذ ہونے کے باوجود، علمائے سیاست سے آج تک یہی مسئلہ ـــ جو پورے نظامِ سیاست میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے ـــ حل نہ ہو سکا اور نہ خدا کا انکار کر کے ـــ جو کائنات اور نوعِ انسانی کا حقیقی مقتدرِ اعلیٰ ہے ـ اس گتھی کو کبھی سلجھایا جا سکتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ نظری طور پر اس سوال کو حل کیے بغیر محض طاقت کے بل بوتے پر حکومتوں، قانون سازاداروں اور عاملہ و انتظامیہ کی تشکیل کر لی جائے، جیسا کہ اس وقت ہو رہا ہے، مگر یہ دھاندلی ہے، مسئلہ کا حل نہیں ہے، اور نہ اس طرح کے جبری، غیر معقول، غیر فطری اور غیر آئینی حل سے انسانی مسائل سلجھ سکتے ہیں۔

مقتدرِ اعلیٰ کون ہو؟ یہ سوال اسی وقت طے ہو سکتا ہے جب ان صفات کا تعین کیا جائے جن کا مقتدرِ اعلیٰ میں پایا جانا ناگزیر ہو۔ عقلِ عام اور علمِ سیاست دونوں کا فیصلہ یہ ہے کہ یہ اوصاف حسبِ ذیل ہیں:۔

۱ اقتدار ذاتی ہو۔ ۲ اقتدار ناقابلِ انتقال ہو۔ ۳ اقتدار غیر محدود ہو۔ ۴ اس کا علم محیط اور دانش بے خطا ہو اور وہ غلطی نہ کر سکتا ہو۔

اگر اقتدار ذاتی نہیں، کسی کا عطا کردہ ہو تو مقتدرِ اعلیٰ وہ ہو گا جس نے اقتدار عطا کیا ہے، نہ کہ وہ جس نے اقتدار پایا ہے، پھر وہ دیئے ہوئے اقتدار کو چھین بھی سکتا ہے، ایسا اقتدار نہ اپنے پیچھے کوئی طاقت رکھتا ہے اور نہ وہ باقی رہنے والی چیز ہے۔ انسانی اقتدار کے سلسلے میں ہم دن رات یہ تماشا دیکھتے ہیں کہ جو افراد کو سِ لِمَنِ الْمُلْک بجاتے

ہوتے ہیں، اچانک ان کا اقتدار ان سے رخصت ہو جاتا ہے اور پھر کوئی انہیں دو کوڑی میں بھی نہیں پوچھتا، بلکہ وہ اپنی زندگی اور اپنے اہل و عیال کی سلامتی کے لیے دوسروں کے رحم و کرم کے محتاج ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح اقتدار اگر قابلِ انتقال ہو تو اس کے صاف و صریح معنی یہ ہیں کہ اقتدار ذاتی تھا، نہ حقیقی، اقتدار کی محض نمائش تھی، ایسا اقتدار کس طرح مستحکم ہو سکتا ہے اور ایسے اقتدار کو اطاعت کرانے کا کیا حق ہے؟

یہی بات اس ہستی کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے جس کا اقتدار کچھ حدود کے اندر محدود ہو، اس صورت میں مقتدر اعلیٰ یہ نہیں، بلکہ وہ ہستی ہے جس نے اس اقتدار کو حدود کا پابند بنا دیا ہے۔ پھر یہ بھی ایک کھلی حقیقت ہے کہ ایسا اقتدار حدود و قیود کا پابند ہونے کے باعث نہ صحیح قانون دے سکتا ہے اور نہ قانون کو صحیح شکل میں نافذ کر سکتا یا نافذ کرا سکتا ہے ـــ جمہوری حکومتوں کی ناقص قانون سازی اور ان کی انتظامی نا اہلی اس کا واضح ثبوت ہیں۔ اسی طرح اگر اقتدار کا علم محیط اور اس کی دانش بے خطا نہ ہو اور وہ غلطیاں کر سکتا ہو تو نہ ایسی ہستی صحیح قانون بنا سکتی ہے، نہ اسے قانون بنانے اور اطاعت کرانے کا حق ہے اور نہ ایسی ہستی کو مقتدر اعلیٰ بنا کر نوعِ انسانی یا کوئی قوم فلاح و کامرانی سے ہمکنار ہو سکتی ہے۔

پھر وہ ہستی کون ہے جو ان اوصاف سے متصف ہے؟ کون ہے جس کا اقتدار ذاتی، ناقابلِ انتقال اور غیر محدود ہے، جس کا علم کامل اور حکمت بے خطا ہے اور جو غلطیوں سے پاک ہے؟ لادین سیاست کے علماء ایسی کسی ہستی کی نشان دہی نہ کر سکے جو حقیقۃً ان صفات کی حامل ہو۔ ان صفات کا حامل نہ بادشاہ ہے، نہ شاہی خاندان، نہ ڈکٹیٹر اور اس کے ساتھی، نہ عوام کے نمائندے، نہ کوئی مخصوص طبقہ یا پارٹی، نہ کوئی قوم، نہ پوری نوعِ انسانی ـــ یہ صفات ان میں سے کسی میں نہیں ہیں یہ صفات صرف خدا میں ہیں اور خدا میں یہ تمام صفات بے کم و کاست موجود ہیں، خدا کا اقتدار ذاتی ہے، ناقابلِ انتقال ہے، غیر محدود ہے، اس کا علم کامل، اس کی حکمت بے خطا اور وہ غلطی اور عیب و نقص سے پاک ہے اس لیے اس کا اقتدار اقتدار ہے، اس کا قانون قانون اور وہی کائنات اور نوعِ انسانی کا مقتدر اعلیٰ ہے۔

ان صفات سے متصف کسی مقتدر اعلیٰ کو مانے بغیر سیاست کی گاڑی نہیں چلتی لیکن لادین سیاست کے امام اس واحد ہستی کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے جو حقیقۃً ان صفات سے متصف ہے۔ ان دونوں باتوں کے امتزاج نے ایک ایسے "شاہکار" کو جنم دیا جس کی نظیر علمی دنیا میں ملنی مشکل ہے یعنی ان ہستیوں کو مقتدر اعلیٰ مان لیا گیا جو ان صفات کی حامل نہ تھیں اور سیاست کی گاڑی چلانے کے لیے بالکل غلط طور پر یہ فرض کر لیا گیا کہ مذکورہ بالا صفات ان

ہستیوں میں موجود ہیں۔ علمائے سیاست کی اس حماقت و جہالت کا خمیازہ عوام کو بھگتنا پڑا۔ بادشاہ یا ڈکٹیٹر کو مقتدر اعلیٰ مانا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مطلق العنانی اور ظلم و جور کا طوفان امنڈ آیا، عوام جور و استبداد کی اس چکی میں کب تک پستے، بالآخر انھوں نے ملوکیت و آمریت کا جوا اپنے کندھوں سے اتار پھینکا۔

آمریت و شہنشاہی کے خاتمے کے بعد عوام کے اقتدار اعلیٰ کا نظریہ سامنے آیا، اس نظریے کو قبول عام حاصل ہوا اور اسے اب تک معقول ترین نظریہ خیال کیا جاتا ہے لیکن عوام کو مقتدر اعلیٰ ماننے کا لازمی مطلب یہ ہے کہ ان کے سروں پر کوئی نظام حکومت نہ ہو یعنی حکومت کے بجائے انارکی اور لاقانونیت کا دور دورہ ہو۔ مگر ارباب سیاست نہ تو عوام کے اقتدار اعلیٰ کا انکار کرنا چاہتے تھے اور نہ انارکی کا خیر مقدم کرنے کو تیار تھے چنانچہ ایک "نظام" کیا گیا۔ عوام سے کہا گیا کہ وہ اپنا اقتدار اپنے نمائندوں کے حوالے کر دیں ــــ اگرچہ جیسا کہ جمہ نے کہا تھا نمائندگی بے معنی اور ناممکن شے ہے۔ اس شعبدہ بازی کا نتیجہ یہ نکلا کہ عوام جو مقتدر قرار پائے اور چند ہوشیار افراد پوری قوم کے مقتدر اعلیٰ بن گئے اور شہنشاہی نے پھر جنم لیا۔

ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام جس کے پردے میں نہیں غیر از نوائے قیصری

جب عوام کو اس بات کا احساس ہوا کہ عوامی حکومت کے پردے میں فی الواقع چند سرمایہ داروں کی حکومت ہے تو انھوں نے اشتراکیت کے دامن میں پناہ لی لیکن انھیں بہت جلد محسوس ہو گیا کہ پرولتاریہ ــــ مزدور طبقہ ــــ کی یہ نام نہاد ڈکٹیٹر شپ فی الواقع چند آہنی اور متشدد افراد کی ڈکٹیٹر شپ ہے جو سرمایہ داروں کی حکومت سے کسی طرح مختلف نہیں، بلکہ وسائل حکومت اور ذرائع پیداوار دونوں کے چند ہاتھوں میں یک جا ہونے سے ظلم و استبداد کے مواقع کئی گنا ہو گئے اور عوام کی رہی سہی آزادی بھی موت کے گھاٹ اتر گئی ہے۔ اشتراکیت کے امام حاضر ــــ خروشچیف ــــ نے اشتراکیوں کے سابق امام اور اشتراکیت کے اہم ستون ــــ اسٹالن ــــ کے مظالم کا جو بھیانک نقشہ کھینچا ہے اس نے اس امر میں شک و شبہہ کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی کہ اشتراکی حکومت بدترین ڈکٹیٹر شپ ہوتی ہے۔

جمہوریت و اشتراکیت دونوں سے گھبرا کر بہت سی قوموں نے فوجی آمریت کے مہیب دیو کو اپنے سروں پر مسلط کر لیا ہے لیکن یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص پریشانیوں سے عاجز آ کر ٹرین کے سامنے لیٹ جائے۔ ظلم و استبداد اور حماقت و جہالت کا یہ چکر لادین سیاست کا لازوال تحفہ ہے ؎

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اور اس چکر سے اسی وقت نجات مل سکتی ہے جبکہ غلط اور فرضی باتوں پر زندگی کی عمارت تعمیر کرنے کے بجائے آپ حقیقی صورت حال کو جوں کا توں قبول کرلیں۔ خدا کائنات اور نوعِ انسانی کا فرماں روا اور مقتدرِ اعلیٰ ہے، اسے مقتدرِ اعلیٰ تسلیم کیجیے۔ انسان اس کا بندہ اور نائب ہے۔ اس لیے اس کے بندہ اور نائب بن کر رہیے۔ اپنے اقتدار اور اپنے قانون کو نافذ کرنے کے بجائے اس کے اقتدار اور اس کے قانون کو دنیا میں نافذ کیجیے، اور جو لوگ خدا کی اطاعت اور نیکی و اخلاق میں سب سے بہتر ہوں، نظمِ حکومت چلانے کے لیے انھیں اپنا سربراہ چنیے، نظری طور پر بھی یہی بات صحیح ہے اور اسی راہ پر چل کر انسان کو امن اور عدل و انصاف کی نعمت نصیب ہوئی ہے۔

صحیح قانون کہاں ہے؟

انسان کو اپنی زندگی گزارنے کے لیے ایک قانون چاہیے۔ یہ قانون کیسا ہو؟ معمولی سے غور و فکر کے بعد آپ اس نتیجے پر پہنچ جائیں گے کہ قانون میں حسب ذیل خصوصیات ہونی چاہییں۔

۱۔ اس کی بنیاد صحیح علم اور بے خطا فکر پر ہو۔ ۲۔ اس میں تمام انسانوں کے ہمہ جہتی ارتقا کا سامان ہو۔ ۳۔ ہر فرد، ہر گروہ، ہر فرقہ، ہر صنف اور ہر طبقہ کو اس سے عدل و انصاف کی نعمت ملے۔ ۴۔ وہ اس ہستی کی طرف سے ہو جو اقتدار اور قانون سازی کی مستحق ہو۔

کیا اس طرح کا قانون کوئی ڈکٹیٹر یا کوئی شہنشاہ دے سکتا ہے؟ یقیناً نہیں، نہ اس کے پاس ایسا علم ہے اور نہ وہ اس طرح کا قانون بنانے کی کوشش کرکے اپنی آمریت یا شہنشاہی کو خطرے میں ڈالنا گوارا کرے گا۔ تو کیا عوامی نمائندے اس طرح کا قانون بنا سکتے ہیں؟ یقیناً نہیں، کیونکہ وہ بھی صحیح علم اور بے خطا فکر سے محروم ہیں۔ اور ان کے اندر بھی ایسا ظرف نہیں ہے کہ وہ سب انسانوں کے ساتھ یکساں انصاف اور سب کے لیے یکساں ارتقا کی بات سوچ سکیں، نہ انہیں اقتدار جمانے یا قانون بنانے کا حق ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کا قانون بنانا کسی بھی انسان یا انسانوں کے کسی بھی چھوٹے بڑے مجمعے کے بس کی بات نہیں، انسان کا علم سخت ناقص ہے، اس کی فکر بہت زیادہ غلطیاں کرتی ہے، پھر خدا اور اخلاق سے بے نیاز ہونے کے باعث وہ حد درجہ تنگ نظر، ظالم اور متعصب ہو گیا ہے اس لیے اس سے کسی صحیح اور عادلانہ قانونِ حیات کی توقع رکھنا حد درجہ حماقت کی بات ہے، اور انسان کا پورا سرمایۂ علم، اس کی دستوری و قانونی کاوشیں، اور اس کے ہاتھوں تشکیل پائے ہوئے نظام — بادشاہت، آمریت، نازی ازم — جمہوریت اور کمیونزم —

اس حقیقت کے شاہد عدل ہیں۔ انسان کو ان میں سے کسی نظام اور کسی دستور میں عدل، امن، سکون اور ارتقاء کی نعمت نہ مل سکی ـــــ صحیح قانون صرف اس ہستی کا ہے، جو کائنات اور نوعِ انسانی کا مقتدرِ اعلیٰ ہے، جس کا قانون پوری کائنات میں نافذ ہے، جس کا علم فطرت انسانی اور نظام کائنات کے مخفی سے مخفی گوشوں کو محیط ہے اور جو سب انسانوں کا خالق و پروردگار ہونے کے باعث سب کے ساتھ انصاف اور سب کے لیے ارتقاء کے مواقع فراہم کرنا چاہتا ہے ـــــ حقیقت یہ ہے کہ قانون سازی کا اقتدار اعلیٰ سے بہت گہرا رشتہ ہے۔ اگر انسان مقتدر اعلیٰ نہیں بن سکتا تو وہ قانون بنانے کا بھی حق دار نہیں، نہ وہ صحیح قانون بنا سکتا ہے۔ خدا کائنات اور انسان کا مقتدر اعلیٰ ہے اس لیے وہی قانون بنانے کا اہل ہے اور اسی کا بنایا ہوا قانون صحیح قانون ہو سکتا ہے۔

حکمراں گروہ کے اوصاف

یہ ایک کھلی ہوئی عملی حقیقت ہے کہ سیاست کا نظریہ اور حکومت کا دستور خواہ کچھ ہو اگر والا گروہ عدل و انسانیت کے اوصاف سے متصف ہے تو ناقص سے ناقص دستور میں انسان کو کچھ نہ کچھ امن و سکون مل سکتا ہے لیکن اگر حکمراں گروہ بد دیانت، خائن اور ظالم و متعصب ہو تو اچھے سے اچھے دستور کے ہوتے ہوئے بھی ظلم و استبداد کا دور دورہ رہے گا۔ حکومتوں کے کاغذی دستور کے مقابلے میں حکمراں پارٹی اور انتظامیہ کا عملی رویہ وہ حقیقی قانون ہوتا ہے جس سے افراد اور قوموں کی زندگیاں بنتی اور بگڑتی ہیں ـــــ لیکن خدا اور مذہب کو سیاست سے خارج کرنے کے بعد اخلاقی قدریں خود بخود رخصت ہو جاتی ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لادین سیاست میں ایسے افراد آگے آتے اور پارٹیوں اور قوموں کے سربراہ بنتے ہیں جو اخلاق و کردار سے عاری اور مکر و فن اور دروغ گوئی و فریب دہی میں طاق ہوتے ہیں۔ ان بے اخلاق بلکہ اخلاق باختہ افراد سے دیانت و امانت اور عدل و انسانیت کی توقع کی ہی نہیں جا سکتی لادینی سیاست کی اسی فطرت کی بدولت عدل، امن، مساوات اور انسانیت کے بلند بانگ دعووں کے باوجود عالم انسان انصاف، آشتی اور انسانیت کو ترس رہا ہے۔

اس المناک صورت حال کا اس کے سوا کوئی حل نہیں کہ انسان دین و اخلاق کو پھر سے زندگی کی اساس بنائے۔ خدا کو مقتدر اعلیٰ تسلیم کر کے پوری انفرادی و اجتماعی زندگی کو اس کی بندگی میں دے دے اور سیاست میں ایسے افراد کو آگے بڑھنے کا موقع دے جو خدا ترسی کا پیکر، انسانیت کا نمونہ اور اخلاق کا مجسمہ ہوں ـــــ ایسے ہی افراد کے سایۂ حکومت میں انسان عدل، آشتی، انسانیت اور ارتقاء کی نعمتیں پا سکتا ہے اور پاتا رہا ہے۔

قانون کا احترام

اگر قانون کسی ایسی ہستی کا بنایا ہوا ہے جو حقیقی مقتدرِ اعلیٰ ہے۔ اگر قانون صحیح علم اور بے خطا حکمت پر مبنی ہو، اور اگر قانون میں سب کے لیے عدل اور ارتقار کی ضمانت ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کی پیروی اور اس کے احترام کا جذبہ لوگوں کے دلوں میں پیدا نہ ہو — جیسا کہ خدائی قانون کے سلسلے میں ہر اس شخص کے دل میں پیدا ہوتا ہے جو خدا کو تسلیم کرتا ہے — اور اگر قانون اِن صفات سے تہی دامن ہوگا — جیسا کہ ہر انسانی قانون ہوتا ہے — تو اس قانون کے احترام کا جذبہ پیدا کرنے کی ہر کوشش ناکام ہوگی اور عوام اور حکمراں گروہ دونوں قانون شکنی کا ارتکاب کرتے رہیں گے۔ جیسا کہ آج پوری دنیا میں ہو رہا ہے۔

خدا اور اس کے قانون کو تسلیم کیے بغیر انسانی مسائل حل نہیں ہوسکتے۔ ("کیا خدا کی ضرورت نہیں" سے ماخوذ)

اعلان ملکیت ماہ نامہ "زندگی" رام پور

و دیگر تفصیلات (فارم IV) رول نمبر ۸

(۱) مقامِ اشاعت :- دفتر زندگی رامپور۔ یوپی

(۲) مدتِ اشاعت :- ماہانہ

(۳ و ۴) طابع و ناشر :- احمد حسن

وطنیت :- ہندوستان

پتہ :- بازار کلاں رام پور۔ یوپی

(۵) ایڈیٹر :- سید احمد عروج قادری

وطنیت :- ہندوستان

پتہ :- مرکز جماعت اسلامی ہند رامپور۔ یوپی

(۶) مالک کا نام و پتہ :- جماعت اسلامی ہند رامپور۔ یوپی

میں تصدیق کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے بہترین علم و یقین کے حد تک صحیح ہیں

احمد حسن

تنقید و تبصرہ

بیّنات

مرتب: مولانا محمد عبدالرشید نعمانی - چندہ سالانہ - چھ روپے - قیمت فی پرچہ ۶۰ نئے پیسے

مدرسہ عربیہ اسلامیہ کراچی کا یہ دینی و علمی ماہنامہ ہمارا تازہ معاصر ہے۔ ان سطروں کی تحریر کے وقت تک اس کے چار شمارے نکل چکے ہیں۔ اس کے مرتب ایک وسیع النظر عالم دین ہیں جن کی شخصیت کے دینی و علمی حلقوں میں بھی اجنبی نہیں ہے۔ یہ رسالہ جن مقاصد کے لیے جاری کیا گیا ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ اسلام کے اساسی مسائل کی حفاظت کے سلسلے میں عصر حاضر کے علمی فتنوں کی نشان دہی۔

۲۔ جدید فقہی مسائل کا حل قدیم فقہ اسلامی کی روشنی میں۔

۳۔ عصری تقاضوں کے مطابق فقہ اور اصول فقہ پر مقالات کی تدوین و اشاعت۔

۴۔ جدید تعلیم یافتہ اصحاب کی دینی و علمی ضروریات کے لیے مضامین کی فراہمی۔

۵۔ عام مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے اصلاحی مضامین کی اشاعت۔

اس دور میں جب مغربی و اسلامی تہذیبوں اور خدا پرستی و الحاد کے درمیان ہند و پاک میں ایک زوردار کش مکش جاری ہے کسی ایسے ماہنامہ کا اجرا ہمارے لیے بہت خوش آیند ہے۔ ہمیں پوری توقع ہے کہ مولانا عبدالرشید صاحب کی ادارت میں یہ رسالہ ترقی کرے گا اور ہر ماہ اہل علم کے لیے ایک علمی تحفہ مہیا کرتا رہے گا۔ ان چار شماروں میں علمی، دینی اور اخلاقی مضامین کے علاوہ ایک مستقل مقالہ "ناصبیت تحقیق کے بھیس میں" فاضل مرتب رسالہ کے قلم سے شائع ہو رہا ہے۔ یہ طویل مقالہ محمود احمد صاحب عباسی کی کتاب "خلافت معاویہ و یزید" پر تنقید ہے۔ اس سلسلے کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب تک جو تنقیدیں اس فتنہ انگیز کتاب پر شائع ہو چکی ہیں ان میں یہ تنقید ایک قیمتی اضافہ ہوگی ــــــ بغیر کسی تذبذب کے تبصرہ نگار کی یہ رائے ہے کہ یہ رسالہ ہر طرح اہل علم کے تعاون کا مستحق ہے۔ (ع۔ق)

تنقید و تبصرہ

مکمل تفسیر بیان القرآن عکسی اردو جلد نمبر ا

ازافادات حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نور اللہ مرقدہٗ۔ ناشر:- ادارۂ تفسیر دیوبند یوپی ۔ بڑی تقطیع صفحات ۹۶ قیمت تین روپے محصول ڈاک ایک روپیہ

حکیم الامۃ مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کو ابھی زیادہ دن نہیں گزرے ہیں۔ حضرت مولانا علم تقویٰ، ذہانت، تفقہ اور ارشاد کے اس بلند مقام پر فائز تھے جہاں تک پہنچنا آسان کام نہیں ہے اور ایسے لوگ ہر دور میں اتنے قلیل ہوتے ہیں جنھیں انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ راقم الحروف نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں (اور حقیقی معنی میں یہ زمانہ موت تک قائم رہتا ہے) مولانا کے کئی ایک رسالے اور دعوات عبدیت کے متعدد حصے پڑھے ہیں اور وہ کیف آج تک دل میں موجود ہے جو انہیں پڑھکر پیدا ہوتا تھا۔ راقم نے مولانا کی تصانیف کو ہرچہ دل از خیزد، بر دل ریزد کی بہترین مثال پایا ہے۔ زیر تبصرہ تفسیر ان کی تصانیف میں متعدد جہتوں سے بہت اونچا مقام رکھتی ہے۔ جو لوگ عربی علوم و فنون اور علوم دین سے براہ راست واقفیت رکھتے ہیں وہ ان لوگوں کے مقابلے میں اس سے بہت زیادہ استفادہ کر سکتے ہیں جو براہ راست واقف نہیں ہیں۔ یہ تفسیر علماء اور مدارس عربیہ کے اونچے درجوں کے طلبہ کے لیے قیمتی ذخیرہ ہے۔ عام اردو خواں بھی اپنے فہم کے مطابق اس سے استفادہ کر سکتے ہیں اور کر سکنے کی کیا بات ہے، علماء، طلبہ اور عوام عرصۂ دراز سے استفادہ کر رہے ہیں۔ مولانا نے اپنی اس تفسیر میں جن باتوں کی رعایت فرمائی ہے اور جن باتوں کا التزام کیا ہے انہیں تفصیل سے ابتدا میں بیان فرما دیا ہے۔ اس تفصیل کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس قدر بے نفس عالم دین تھے کہ علم کا غرور شاید ان کو چھو بھی نہ سکا تھا ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"ترجمہ میں خالص محاورات استعمال نہیں کیے گئے دو وجہ سے اول تو میں قصباتی ہوں، محاورات پر عبور نہیں۔ دوسرے یہ کہ محاورات ہر جگہ کے جدا جدا ہوتے ہیں .... اس لیے کتابی زبان لی ہے کہ فصاحت کے ساتھ اس میں سلاست بھی ہے۔" صفحہ ۴

دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

"چونکہ احقر کو مباحث متعلقہ کتب سماویہ سابقہ پر بالکل نظر نہیں ہے اس لیے ایسے مضامین میں تفسیر حقانی سے نقل کیا گیا ہے۔" صفحہ ۶

راقم کے نزدیک علم کے غرور سے ذہن دل کو بچائے جانا کبریت احمر ہے۔ اس تفسیر کے متعلق خود مولانا کا

اس بات کا احساس تھا کہ اس کے بہت سے مقامات عوام کی سطح سے بلند ہیں چنانچہ اس کا اظہار بھی انھوں نے ضروری سمجھا ہے اور کم استعداد لوگوں کو مشورہ دیا ہے کہ اس تفسیر کو اول سے آخر تک کسی عالم سے سبق کے طور پر پڑھ لیا جائے۔ یہ اظہار بھی، فی الواقع مولانا کی بے لوثی کی دلیل ہے ——— ادارۂ تفسیر دیوبند، اصل نسخہ مطبوعہ تھانہ بھون کو فوٹو آفسٹ کے ذریعہ شائع کر رہا ہے اور زیر تبصرہ حصہ اسی کی جلد نمبر ا ہے جو سوا پارہ پر مشتمل ہے۔ تمام حصے ماہانہ پروگرام کی شکل میں طبع ہوں گے۔ اس نے طریق اشاعت کی وضاحت اس طرح کی ہے:۔

۱۔ اس اشاعتی پروگرام میں شریک ہونے کے لیے صرف ایک روپیہ فیس ممبری ارسال کرکے اپنا نام و پتہ خریداروں کے رجسٹر میں درج کرالیں۔ (۲) قیمت فی جلد تین روپیہ، محصول ڈاک عہ ر (۳) ممبران کو ہر ماہ ایک جلد تین روپیہ میں بذریعہ وی پی ارسال کی جائے گی، محصول ڈاک معاف ہوگا۔ (۴) مکمل تفسیر ۲۴ جلدوں ایک جلد میں تقریباً سوا پارہ کی تفسیر ہوگی۔ (۵) پانچ احباب مل کر ایک پتہ پر پانچ جلدیں طلب کریں پیش کی جائیں گی۔ (۶) ایجنٹ حضرات اور تاجران کتب کو معقول کمیشن دیا جائے گا۔ معاملات طے فرمالیں۔

زیر تبصرہ جلد صاف چھپی ہے البتہ ص۲۹ کے حاشیے میں "مسائل سلوک" کے سلسلے میں بعض حروف اڑ گئے ہیں۔ امید ہے کہ اہل علم اس کی اشاعت میں تعاون کریں گے۔ (ع۔ ق)

بین الاقوامی سیاست نمبر

مرتبہ جناب اصغر علی عابدی، جناب احمد نسیم مینا نگری۔ صفحات ۲۷۲۔ قیمت:۔ دو روپے۔ ملنے کا پتہ:۔ دفتر ہفت روزہ طلوع ۱۰۷/۱ مولانا آزاد روڈ بمبئی ۱۱

ہفت روزہ طلوع بمبئی پر زندگی میں تبصرہ شائع ہو چکا ہے۔ اب اس نے اپنا سب سے پہلا نمبر بین الاقوامی سیاست کے عنوان پر شائع کیا ہے۔ اس کی آمد آمد کی خبر دیر سے تھی، کچھ حرج نہیں اس لیے کہ اب دیر آید، درست آید کا مصداق بن کر طلوع ہوا ہے۔ سنجیدہ، ٹھوس اور علمی موضوعات پر اسلام کی روشنی میں مقالے لکھنا آسان کام نہیں ہے ابھی ملک میں ایسے لکھنے والوں کی بڑی کمی ہے۔ ماہنامہ زندگی کو بھی اس کا تجربہ ہے۔ اس تجربے سے گزرتے ہوئے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ طلوع کا ادارہ بین الاقوامی سیاست پر نمبر نکالنے میں کامیاب ہوا۔ تبصرہ نگار تمام مضامین تو نہیں پڑھ سکا لیکن جو کچھ پڑھ سکا ہے اس کا تاثر یہ ہے کہ نمبر پڑھنے کی چیز ہے۔ جن لوگوں کو عالمی سیاست اور اسی کے ایک جزو مسلم ممالک کی سیاست سے دلچسپی ہو انہیں یہ نمبر ضرور پڑھنا چاہیے۔ فاضل مدیر طلوع نے ابتدا میں

"اسلام اور بین الاقوامی مسئلہ" کے عنوان سے جو مقالہ لکھا ہے وہ فکر انگیز ہے اور پتہ دیتا ہے کہ اس مقالے کے پیچھے ایک سنجیدہ فکر کام کر رہی ہے۔ خدا ـــ انسان ـــ کائنات ـــ تمدن ـــ ان چار اہم موضوعات یا اجزاء پر ان کا مقالہ مشتمل ہے۔ ان چاروں کے بارے میں دنیا کی غلط فکری اسے تباہی کی طرف ہانک رہی ہے۔ سلامتی کے لیے ضروری ہے کہ فکر غلط کو فکر صحیح سے بدلا جائے۔ ابتدائیہ کے بعد۔ ہندوستان کے مسائل۔ افریشیائی ملکوں کے مسائل مسلم دنیا کے مسائل۔ مغربی دنیا کے مسائل۔ اقوام عالم کدھر؟۔ یہ بڑے بڑے عنوانات ہیں جن کے تحت محنت سے لکھے ہوئے یا ترجمہ کیے ہوئے متعدد مقالے اس نمبر کی زینت ہیں۔ آخر میں ادبیات کا حصہ ہے۔ اس حصے میں نظمیں غزلیں اور افسانے ہیں۔ طباعت کی غلطیاں اچھی خاصی موجود ہیں۔

امید ہے کہ اہل علم اس نمبر سے استفادہ کریں گے۔ (ع۔ ق)

راہِ عمل

ایڈیٹر سید عبدالرزاق قادری۔ چندہ سالانہ:۔ پانچ روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ دفتر راہ عمل ۹۷۲ محلہ کشن گنج۔ دہلی۔

یہ رسالہ پندرہ روزہ ہے لیکن ابھی بعض معذوریوں کی وجہ سے مہینے میں ایک بار شائع ہو رہا ہے۔ اس زمانے میں جب کہ ہر طرف الحادِ بے دینی اور بد اخلاقی پھیلانے والے رسائل، اخبارات اور کتابیں بکثرت پھیل رہی ہیں اگر کوئی شخص ہمت کر کے ایسا رسالہ نکالتا ہے جو صحیح دین داری اور اسلامی و انسانی اخلاق کے پھیلنے اور پھیلانے کا ذریعہ بنے تو دین و اخلاق سے محبت رکھنے والا ہر شخص اسے خوش آمدید کہے گا۔ اس رسالے میں بچوں اور عورتوں کے لیے بھی صفحات ہوتے ہیں۔ تبصرہ نگار بھی اپنے اس معاصر کو خوش آمدید کہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو قولی تبلیغ کے ساتھ عملی تبلیغ کی توفیق بھی عطا فرمائے۔ اگر یہ رسالہ اسی محنت اور لگن سے مرتب کیا جاتا رہا تو امید ہے کہ مالی حیثیت سے اس قابل ہو جائے کہ اس کی اشاعت میں پیسوں کی رکاوٹ باقی نہ رہے۔

ہفت روزہ منادی

ایڈیٹر عبداللہ عاطف۔ چندہ سالانہ چھ روپے۔ ششماہی۔ تین روپے
ملنے کا پتہ:۔ دفتر ہفت روزہ منادی ناگراں۔ بدایوں۔

بدایوں، علم و فن اور ادب و شعر کی دنیا میں ایک مشہور و معروف مقام ہے اور اس کے ایڈیٹر عبداللہ عاطف ایک پُرحوصلہ اور علم و ادب سے دلچسپی رکھنے والے نوجوان ہیں۔ ان کی ادارت میں ہفت روزہ منادی کئی ماہ سے

...ہندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اس میں خبروں کے علاوہ مفید مضامین اور ادبیات کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ ہم اپنے
...ن معاصر کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ دو ماہ کے بعد ہی یہ اخبار اپنا ایک نمبر "دفاع" نمبر کے عنوان سے شائع کرنے والا
ہے۔ امید ہے کہ عبداللہ عاطف صاحب محنت کر کے اس کے معیار کو بلند کرنے کی کوشش کرتے رہیں گے۔ بدایوں جیسے
...ہر میں ایک ہفت روزہ کو کامیاب بنا لینا بہت زیادہ دشوار نہ ہونا چاہیے۔

نوٹ:۔ دفاع نمبر شائع ہو گیا اور لائق مطالعہ ہے۔ (ع۔ق)

چوکھٹ کے اندر از ام فاروق، صفحات ۹۶۔ قیمت مع گرد پوش ایک روپیہ۔ ناشر آ...
بلاک نمبر ۲۔ سرگودھا۔ مغربی پاکستان۔

اکثر مسلم ممالک کی طرح پاکستان میں بھی جو طبقہ برسر اقتدار ہے وہ مغربی تہذیب کا پرور...
...ل سے پسند کرتا ہے۔ ان برسر اقتدار لوگوں کے گھر مغربی تہذیب کی پناہ گاہ بنے ہوئے ہیں۔ ان کی عورتیں بھی
بیشتر اسی مغربی تہذیب کی دلدادہ ہیں۔ اس تہذیب کے استیلاء کو برقرار رکھنے کے لیے یہ طبقہ اپنی خواتین کے ساتھ
پوراز ور لگا رہا ہے۔ اس صورت حال میں وہاں کے جو مرد اور عورتیں اسلام اور اسلامی تہذیب کے تحفظ اور اس
کے بقاء و ارتقا کے لیے متحرک ہیں وہ لائق صد مبارک باد ہیں۔ اگرچہ باشندگان ملک کی اکثریت اسلامی تہذیب ہی کو
پسند کرتی ہے لیکن متعدد وجوہ سے وہ مغربی تہذیب کے استیلاء کو روکنے میں کامیاب نہیں ہو رہی ہے۔ ان وجوہ میں
ایک بڑی وجہ اسلام اور اسلامی تہذیب سے ناواقفیت بھی ہے اس ناواقفیت کو دور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ
وہاں کی اسلام پسند خواتین اسلام کی تعلیم اور تہذیب اسلامی کی خوبیاں گھر گھر پھیلا دیں۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ ہماری
مسلمان بہنیں اس سے بالکل غافل نہیں ہیں اور وہ تحریر و تقریر کے ذریعہ اسلام کو روشناس کرانے کی سعی کر رہی
ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب بھی اسی کوشش کی ایک کڑی ہے۔ یہ کتاب دو حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلے حصے کا عنوان "چوکھٹ
کے اندر" اور دوسرے کا عنوان "آویزے" ہے پہلے حصے میں ہلکے پھلکے مضامین ہیں اور دوسرے حصے میں افسانوی
انداز کی تحریریں۔ یہ دونوں ہی حصے عام فہم، دل چسپ اور موثر ہیں۔ کتاب کی قیمت بھی مناسب ہے۔ تبصرہ نگار
تمام مضامین اور افسانے پڑھ نہیں سکا ہے لیکن جتنا حصہ پڑھا ہے اس سے وہی رائے بنی ہے جس کا ذکر اوپر گزرا
افسانوں میں ایک افسانہ "حادثہ" اس مجموعے میں نہ ہوتا تو اچھا تھا۔ بحیثیت مجموعی کتاب اس لائق ہے کہ اسے خواتین
کے حلقے میں پھیلایا جائے۔ (ع۔ق)

اونچی دکانیں

مصنف صدیق الحسن گیلانی۔ صفحات ۱۱۲۔ ناشر:۔ آزاد بک ڈپو۔ بلاک نمبر ۲ سرگودھا مغربی پاکستان۔

اس کتاب کے مصنف صدیق الحسن گیلانی اور اس کے مرتب اسعد گیلانی ہیں۔ اس میں زیادہ تر ۴۸ء سے لے کر ۵۳ء تک کی تحریریں جمع کی گئی ہیں صرف "مسٹر پرویز کا اصلی روپ" ان کا تازہ مضمون ہے۔ اسعد گیلانی نے دیباچے میں لکھا ہے کہ یہ مجموعہ دو حصوں پر مشتمل ہے مضامین کا ایک حصہ "ٹیڑھے ترچھے چہرے" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اس میں سوسائٹی کے بعض کرداروں کے چہرے ہیں، مصنف نے صرف یہ کیا ہے کہ چہرے کے ظاہری خول کا فوٹو لینے کے بجائے ان کا معنوی ایکسرے لیا ہے۔ مضامین کا دوسرا حصہ زیادہ تر سیاسی طنز و مزاح پر مشتمل ہے جو "چوب نیم سوز" کے نام سے موسوم ہے۔ یہ نگارشات بیشتر حلقہ ادب اسلامی کراچی میں پڑھی گئیں اور ہفت روزہ جہانِ نو کراچی میں شائع ہوتی رہیں اور حلقہ احباب میں بہت پسند کی گئیں۔ اسلام پسند ادیبوں نے جو ادبی کارنامے انجام دیے ہیں ان میں طنز و مزاح کا حصہ ابھی بہت کم ہے۔ یہ کتاب اس کا نمونہ پیش کر کے اسلامی ادیبوں کو اس صنف ادب کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ جو لوگ اسلام سے محبت کرتے ہیں وہ اس مجموعے کو پڑھ کر محظوظ ہوں گے

(ع۔ ق)

آئینہ حیرت

از حیرت شملوی۔ صفحات ۱۳۶۔ کاغذ، کتابت، طباعت اوسط۔ قیمت دو روپے۔ شائع کردہ:۔ مکتبہ "الحسنات" رامپور۔ یوپی

جناب عبدالمجید حیرت شملوی کے نام سے واقفیت تو پندرہ بیس سال پہلے سے ہے اور نام کی واقفیت ان کے کلام سے حاصل ہوئی تھی، ان کے کلام کی سادگی اور زبان کی صحت و سلاست نے ان کی غزلوں کی طرف متوجہ کیا تھا۔ پھر میں جب رامپور آیا تو یہاں ان سے ملاقات بھی ہوئی اور محض نام کی واقفیت شخصی تعارف میں بدل گئی، ان کی سلامتی طبع، شرافت اور صحتِ فکر و نظر نے ملاقاتوں کا سلسلہ اس وقت تک جاری رکھا کہ ابھی چند ماہ ہوئے وہ پاکستان چلے گئے۔

زیر تبصرہ کتاب ان کے کلام کا حصہ اول ہے۔ اس حصے میں ان کی ابتدائی ایک سو بیس غزلوں کا انتخاب شامل کیا گیا ہے۔ موجودہ غزل گو شعراء میں وہ اپنا ایک مقام رکھتے ہیں اور ان کا حلقہ تعارف بھی وسیع ہے اس لیے توقع ہے کہ ان کی غزلوں کا یہ مختصر مجموعہ جلد نکل جائے گا اور ہمارے ہاتھوں میں دوسرا حصہ پہنچ جائے گا۔ غزلوں پر تنقید و تبصرہ ایک بہت مشکل کام ہے یا پھر بہت آسان کام ہے۔ آسان یوں ہے کہ تبصرہ

اپنے ذوق کو کسوٹی بنائے، اس کسوٹی پر جو شعر پورا اترے اس کی تعریف کرے۔ اپنے پسندیدہ اشعار چھانٹ کر قارئین کے سامنے پیش کر دے اور پھر ناپسندیدہ اشعار کی بھی ایک فہرست پیش کرے اور ہر شعر کے بعد مختلف انداز میں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتا جائے اور کہیں کہنے کی کوئی بات نہ ہو تو لکھ دے کہ یہ شعر سپاٹ ہے۔ گویا یہ "سپاٹ" اتنا مشہور و معروف اور اتنا متعین و متیقن عیب ہے کہ اس کے بعد اس شعر کو دیوان میں باقی رہنے دینے کے لیے کوئی وجہ جواز ہے ہی نہیں۔ اب ایک طرف قاری اس شعر کو پڑھ کر مزے لے رہا ہو اور دوسری طرف اس کے سامنے ناقد کا جملہ "بے مزہ" ہے "سپاٹ ہے" دھرا ہوا ہو اور وہ سوچنے لگے: یا اللہ اب میں کیا کروں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے ناقدین، دنیا بھر کے ذوق کو اپنے ذوق کا چیرہ کیوں سمجھ لیتے ہیں۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ جس شعر میں کسی کو کوئی شعریت نظر نہیں آتی وہی شعر کسی دوسرے شخص کے دل میں اتر جائے۔ پیش پا افتادہ حقیقتیں بھی موزوں ہو کر دل نشین ہو جاتی ہیں۔

راقم الحروف نے "آئینۂ حیرت" میں زبان، محاورے اور فن کے لحاظ سے ایسی غلطیاں نہیں پائیں۔ نشان دہی کرے، اس کے بہت سے اشعار پسند بھی آئے لیکن پسندیدگی کی وجہ بتائے بغیر انہیں نقل کرنا تبصرہ نگار اس لیے بے کار سمجھتا ہے کہ اس کی پسند سند کا درجہ نہیں رکھتی۔ تاثر صرف یہ ہے کہ صاحب ذوق لوگوں کو اس مجموعے سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

(ع۔ق)

سیرت بتول

مولانا اعجاز الحق قدوسی صفحات ۸۰ قیمت ۱۲ر ملنے کا پتہ :- اسلامک پبلشرز چنچل گوڑہ۔ حیدرآباد دکن

مصنف نے نظر ثانی کے بعد اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا ہے۔ چونکہ کتاب بچوں کے لیے لکھی گئی ہے اس لیے زبان آسان ہے اس کے باوجود جو مشکل الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان کے لیے آخر میں ایک فرہنگ بھی موجود ہے۔ اس کتاب کا تعارف مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے لکھا تھا، اس تعارف میں مولانا لکھتے ہیں:-

> مولوی اعجاز الحق قدوسی کی کتاب سیرت بتولؓ ان خاتون پاک کے حالات پر مشتمل ہے جن کو مسلمان عورتیں بجا طور پر خاتون جنت کے نام سے یاد کرتی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لخت جگر امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شریک حیات اور حضرت حسنین رضی اللہ عنہما کی والدہ ماجدہ سے بڑھ کر کون عورت ایسی ہو سکتی ہے کہ جس کی سیرت کو ایک مسلمان عورت کی زندگی کا ایک مکمل نمونہ کہا جا سکتا ہو ـــــ ضرورت تھی کہ آپ کے

حالات عام فہم اور سادہ زبان میں لکھے جاتے۔ مولوی اعجاز الحق صاحب نے اس ضرورت کو پورا کیا ہے اور فی الواقع مسلمان عورتوں کی ایک بڑی خدمت انجام دی ہے۔

مولانا کا یہ تعارف اس کتاب کا ایک اچھا تبصرہ ہے — میں نے پوری کتاب نہیں پڑھی ہے۔ شروع میں مصنف نے لکھا ہے کہ آپ کا نام فاطمہ اس وجہ سے ہے کہ اللہ نے آپ پر دوزخ کو حرام کیا ہے۔ معلوم نہیں انھوں نے یہ بات کہاں سے لکھی ہے حالانکہ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ نام حضورؐ کی نبوت سے پہلے ہی رکھا گیا تھا۔

ع۔ ق

رسومات محرم اور تعزیہ

مرتبہ سلام اللہ صدیقی۔ قیمت ۲ ر ملنے کا پتہ: مکتبہ اسلامی ادب للہ پورہ۔ بنارس۔ مفت تقسیم کے لیے دس روپے سیکڑہ۔

جہاں تک عقیدہ و خیال کا تعلق ہے تعزیہ داری اور محرم کے شیعی مراسم کو کوئی بھی مستند اور قابل اعتماد سنی عالم جائز نہیں کہتا۔ حد یہ ہے کہ بریلوی خیال کے علماء بھی اسے ناجائز کہتے ہیں لیکن اس کے باوجود سنیوں میں تعزیہ داری اور محرم کے شیعی مراسم جاری ہیں اس کی وجہ کیا ہے؟ دوسرے بدعات و منکرات کی طرح اس بدعت کے رائج رہنے کی وجہ بھی قول و عمل کا تضاد ہے۔ علماء و مشائخ ایک طرف تو اسے ناجائز اور حرام کہتے ہیں اور دوسری طرف ان کی ایک بڑی تعداد عملاً سخت قسم کی مداہنت برتتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تعزیہ داری اور دوسرے مراسم اپنی جگہ قائم ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام علماء و مشائخ عملاً بھی شدت کے ساتھ ان سے اجتناب کریں اور عوام کی ناراضی کا خوف کیے بغیر ان چیزوں کا انکار کریں۔ جب تک ایسا نہ ہوگا ان بدعات کا ختم ہونا ممکن نہیں ہے — زیر تبصرہ پمفلٹ میں تعزیہ داری اور مراسم محرم سے متعلق بزرگان دین اور علماء کے فتوے جمع کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ شیعوں نے سنی علماء کے ساتھ جو زیادتیاں کی ہیں ان میں سے چند اس پمفلٹ میں پیش کی گئی ہیں اور آخر میں خلفائے راشدین اور دوسرے صحابہ کے فضائل بیان کیے گئے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث لَیْسَ مِنَّا مَنْ لَطَمَ الْخُدُوْدَ الخ وغیرہ سے محرم کے نوحوں کی ممانعت بھی نکلتی ہے لیکن ان حدیثوں کو رسومات محرم کے خلاف آپؐ کی پیشین گوئی قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ ضرورت ہے کہ مسلمان عوام میں اس پمفلٹ کو پھیلایا جائے۔

(ع۔ ق)

ارشادات رسول کا بقیہ

دل سے گھڑی ہوئی بات ہے۔ اس واقعہ کے بعد ص والقرآن ذی الذکر سے لے کر اِنْ ھٰذا اِلَّا اختلاقٌ تک کی آیتیں نازل ہوئیں۔

روایت حدیث یہ حدیث امام احمد، نسائی، حاکم، بیہقی، ابن ابی شیبہ، ابن ابی حاتم، ابن جریر اور ابن منذر نے بھی روایت کی ہے۔ ابن جریر کی روایت میں ترمذی کی روایت سے تھوڑا سا اختلاف ہے۔ ان کی روایت کا حاصل یہ ہے:-

جب ابوطالب بیمار ہوئے تو قریش کی ایک جماعت — جس میں ابوجہل بھی تھا۔ ان کے پاس گئی نے کہا کہ تمہارا بھتیجا ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہتا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے کام کرتا اور کہتا ہے۔ اگر تم اسے یہاں بلا کر ہمارے سامنے ان باتوں سے روک دو تو اچھا ہے۔ انھوں نے حضورؐ کو آپ تشریف لائے۔ ابوطالب کے قریب ایک شخص کے بیٹھنے کی جگہ خالی تھی۔ آپ کو دیکھتے ہی ابوجہل اچک کر اس جگہ پر بیٹھ گیا، اسے اندیشہ ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اگر اس موقع پر اپنے چچا کے پہلو میں بیٹھیں گے تو وہ شاید سرزنش نہ کر سکیں ان کا قرب ان کی شفقت و محبت کو بڑھا دے گا۔ اس اندیشے کے پیش نظر اس نے آپ کو ابوطالب کے قریب بیٹھنے نہ دیا۔ مجبوراً آپ کو دروازے کے قریب بیٹھنا پڑا۔ اس کے بعد ابوطالب نے کہا اے میرے بھتیجے، تمہاری قوم تمہاری شکایت لے کر آئی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ تم اس کے معبودوں کو برا بھلا کہتے ہو اس کے علاوہ بھی بہت سی تکلیف دہ باتیں کہتے ہو۔ الزامات کی ایک لمبی فہرست انھوں نے پیش کی۔ یہ سب سنکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اے میرے چچا! میں تو ان سے صرف ایک کلمہ کا مطالبہ کرتا ہوں۔ اگر وہ کلمہ یہ لوگ پڑھ لیں تو اس کے ذریعہ تمام عرب ان کا تابع ہو جائے گا اور عجم کے لوگ انہیں جزیہ بھیجنے لگیں گے۔ آپ کی یہ بات سنکر پورے مجمع پر تعجب کی کیفیت چھا گئی۔ لوگوں نے کہا تم صرف ایک کلمہ کہتے ہو ہم تو دس کلمات ادا کرنے کو تیار ہیں۔ بتاؤ وہ کلمہ کیا ہے؟ ابوطالب نے بھی پوچھا" بھتیجے! وہ کون سا کلمہ ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ کلمہ ہے لا الٰہ الا اللہ۔ یہ سنتے ہی سب کے سب اپنے کپڑے جھاڑتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے وہاں سے چل دیے کہ اس نے تو بہت سے معبودوں کو ایک معبود بنا دیا۔

دو نکتے یہ حدیث اپنے مضمرات و مشتملات کے لحاظ سے بڑی وسعت رکھتی ہے۔ یہ ہمارے سامنے حق و باطل کی اس کش مکش اور توحید و شرک کے اس تصادم کا ایک نقشہ پیش کرتی ہے جو مکہ میں مسلسل

یرہ سال تک جاری رہا۔ ایک طرف خدا کے آخری رسول سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے جو اہل مکہ کے سامنے یہ اضح ترین حقیقت پیش فرما رہے تھے کہ الوہیت و ربوبیت صرف ایک ذات میں مرتکز ہے اس کائنات میں اس کے سوا نہ کوئی الٰہ ہے نہ کوئی رب، وہی ذات واحد اس کائنات کی الٰہ بھی ہے اور رب بھی۔ دوسری طرف سرداران قریش تھے جو اس حقیقت کو جھٹلانے پر کمربستہ اور اس دعوت کو بیخ و بن سے اکھیڑ پھینکنے پر تلے ہوئے تھے لیکن یہاں اس پوری کشمکش کی تفصیل مقصود نہیں ہے بلکہ صرف ان نکتوں کی تشریح مقصود ہے جو اس حدیث میں بالکل نمایاں ہیں: لا الٰہ الا اللہ کی وسعت و عظمت اور اس کلمہ توحید پر ایمان کے دنیوی نتیجے کا ذکر ہے۔ ذیل میں انہیں دو نکتوں کی تشریح کروں گا۔

لا الٰہ الا اللہ کی وسعت و عظمت

یہ چھوٹا سا کلمہ اپنی معنوی وسعت کے لحاظ سے پورے دین اسلام کو محیط ہے۔ یہ ایک ذرہ ہے جس میں صحرا چھپا ہوا ہے، ایک قطرہ ہے جس میں دریا بند ہے، ایک کوزہ ہے جس میں سمندر سما گیا ہے، ایک بیج ہے جس میں دین و ایمان کا تناور درخت پوشیدہ ہے۔ یہ دین کا وہ اصل الاصول ہے جس سے دوسرے تمام عقائد کی شاخیں پھوٹتی ہیں، اور پھر ان شاخوں سے اعمال و اخلاق کے برگ و بار پیدا ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوم کے سامنے ایک اور صرف ایک کلمہ کا مطالبہ رکھا اور ان کی قوم نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ ایک کلمہ نہیں ہے بلکہ ایک ہزار کلمے اس میں چھپے ہوئے ہیں۔ اس پر ایمان لے آنے کے معنی یہ ہیں کہ پوری زندگی اللہ کی عبادت اور رسول کی اطاعت کے حوالے کر دی جائے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ زندگی کا وہ پورا نظام درہم برہم ہو جائے جو شرک پر تعمیر ہوا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ خواہشات نفس کے منہ میں خوف خدا اور خوف آخرت کی لگام ڈال دی جائے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس قومی و قبائلی اقتدار کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے جو نسل و نسب کے چونے اور گارے سے مضبوط ہوا ہے ـــــ انھوں نے یہ بحث کبھی نہیں چھیڑی کہ اس کلمے سے خدا کی حاکمیت، اقتدار اعلیٰ اور قانون سازی کا مفہوم کہاں نکلتا ہے۔ اس کلمے میں یہ مطالبہ کہاں چھپا ہوا ہے کہ ہم اپنے سیاست و معیشت کے نظام سے دست بردار ہو جائیں۔ مطالبہ کرنے والے بھی خوب واقف تھے کہ وہ اس کلمہ کو پیش کر کے کس چیز کا مطالبہ کر رہے ہیں اور مخاطب بھی جانتے تھے کہ اس کو قبول کر لینے کے معنی کیا ہیں اور اس کلمے میں کون سے مطالبات پوشیدہ ہیں۔

یہ بات نہیں ہے کہ صرف آخری رسول نے اپنی قوم کے سامنے یہ مطالبہ رکھا تھا بلکہ آپ سے پہلے جب

انبیاء تشریف لائے وہ اپنے اپنے وقتوں میں قوم کے سامنے یہی مطالبہ رکھتے آئے۔ پورا قرآن اس روداد سے بھرا ہوا ہے، اس کی تمام تعلیمات کا حاصل ہی یہ ہے کہ الوہیت و ربوبیت اور اس کے تمام مقتضیات کو خدا کے لیے خاص کر دیا جائے اور انسان صرف اسی کا بندہ بن کر رہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جب کبھی عقیدۂ توحید میں بگاڑ آیا پوری زندگی بگڑ کر رہ گئی اور جب کبھی یہ سدھر گیا پوری زندگی بن گئی اور سنور گئی۔ انسانی زندگی کے بناؤ اور بگاڑ کا دار و مدار صرف اسی عقیدے کے بناؤ اور بگاڑ پر ہے۔ خالص کفر و شرک تو دور کی چیز ہے آج لاکھوں اور کروڑوں مسلمانوں کی زندگیاں بگاڑ کی آخری حد پر صرف اس لیے پہنچی ہوئی ہیں کہ ان کا عقیدۂ توحید بگڑ گیا ہے توحید بگڑ گیا ہے۔

اسلام کی دعوت پیش کرنے کا ایک اسلوب

اس حدیث کا دوسرا نمایاں نکتہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کلمہ توحید دنیوی نتیجے کا ذکر اس انداز میں فرمایا ہے کہ سننے والوں کے دلوں میں ایمان لانے کی ترغیب سردارانِ قریش کے سامنے چچا کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:۔

"میں ان سے ایک ایسے کلمہ کا مطالبہ کرتا ہوں کہ اگر یہ اس کو مان لیں تو تمام عرب ان کا تابع فرمان ہو جائے اور عجم کے لوگ انہیں جزیہ بھیجنے لگیں۔"

اس موقع کی جتنی روایتیں آئی ہیں ان سب میں کلمہ توحید کے صرف اسی دنیوی نتیجے کا ذکر ہے۔ یہ جملہ دراصل حاکمانہ اقتدار کا ایک مژدہ ہے جو سردارانِ قریش کو سنایا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کلمۂ توحید کو رد کرنے کی ایک بڑی وجہ ان کے نزدیک، یہ تھی کہ اگر اسے مان لیا جائے تو ان کی دنیا تباہ ہو کر رہ جائے گی۔ جزیرۃ العرب میں انہیں جو مذہبی وقار حاصل ہے وہ بھی جاتا رہے گا انہیں اپنے قبیلوں پر جو تھوڑا سا اقتدار حاصل ہے وہ بھی غائب ہو جائے گا ان کا تجارتی کاروبار ٹھپ ہو جائے گا وہ اچک لیے جائیں گے وہ تباہ و برباد کر دیے جائیں گے ان کے ان تمام اندیشوں کو قرآن نے ایک جملے میں ادا کیا ہے

وَقَالُوٓا إِن نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ أَرْضِنَا (القصص ر ۶)

وہ کہتے ہیں اگر ہم تمہارے ساتھ اس ہدایت کی پیروی اختیار کر لیں تو اپنی زمین سے اچک لیے جائیں

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسلوبِ دعوت نے ان کے تمام اندیشوں کی جڑ کاٹ دی۔ آپ کے جملوں کا مطلب یہ ہے کہ تم یہ غلط سمجھتے ہو کہ توحید کے اقرار اور خالص بندگیٔ رب سے دنیا تباہ ہو جاتی ہے۔ ایمان و اسلام انسان کو کمزور، تباہ حال، زیر دست اور زبردستوں کا لقمۂ تر بنا دیتا ہے۔ تم اپنی معمولی سی مذہبی پیشوائی، بے حقیقت تجارتی کاروبار اور رُبع وزن

قبائلی اقتدار چھن جانے کے اندیشے سے مرے جا رہے ہو حالانکہ یہ کلمۂ توحید وہ کلمہ ہے جو صرف عرب ہی نہیں عجم کی حکومت بھی تمہیں بخش دے گا۔ آج دنیا کی قوموں میں تمہارا کوئی وزن نہیں اور کل ان کی زمام قیادت تمہارے ہاتھوں میں ہوگی۔ آج تم تجارتی کاروبار کے نقصان کا عذر پیش کرتے ہو اور کل قیصر و کسریٰ کے خزانے تمہارے قدموں میں ہوں گے۔ آج تمہاری اندھی بصیرت اس کلمہ کی انقلابی رو اور اس کی طاقت نہیں دیکھ رہی ہے۔ مجھ سے سنو۔ میں تمہیں اطمینان دلاتا ہوں کہ یہ تمہاری دنیوی زندگی کو بھی اس بلندی پر پہنچا دے گا جس کا آج تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔

ابھی اوپر سورۂ قصص میں اہل مکہ کے جس عذر کا ذکر گزرا اس کے بعد ہی اللہ نے صیغۂ استفہام میں جو کچھ کہہ دیا ہے وہ ان کے عذر کی بے وزنی کا پردہ چاک کر دیتا ہے۔ فرمایا گیا:۔

اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا	کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے ایک پر امن حرم
يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا	کو ان کے لیے جائے قیام بنا دیا جس کی طرف ہر طرح
مِّنْ لَّدُنَّا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ	کے ثمرات کھچے چلے آ رہے ہیں ہماری طرف سے رزق
لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (ر ۶)	کے طور پر مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

اس جواب میں جو بات کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ جس حرم کے احترام کی وجہ سے یہ لوگ پر امن زندگی بسر کر رہے ہیں، جس کی مرکزیت و مقبولیت کی وجہ سے دنیا بھر کے پھل ان کی طرف کھچے چلے آ رہے ہیں اور جس کے مذہبی وقار کی وجہ سے پورا جزیرۃ العرب ان کی عزت کرتا ہے۔ یہ امن و امان، یہ احترام، یہ مرکزیت و مقبولیت اور یہ مذہبی وقار کس نے عطا کیا ہے اور کیوں عطا کیا ہے؟ کیا ان چیزوں کے حصول میں ان کی کوششوں کا کوئی دخل ہے؟ کیا ان کی موجودہ بغاوت اس کا سبب ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ سب کچھ ہم نے اور صرف ہم نے عطا کیا ہے اور اپنے ان بندوں کی بے مثل فدائیت و قربانی اور خالص بندگی و حنیفیت کے صلے میں عطا کیا ہے جن کی طرف نسل و نسب کا انتساب ان کا تمام سرمایۂ فخر ہے۔ یہ ابراہیم و اسماعیل پر ہمارے کرم کی بارش ہے جس سے یہ اپنی بغاوت کے باوجود فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اب اگر ان میں کا ایک بندۂ حق پرست اس دین کی طرف بلا رہا ہے جو ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کا دین بھی تھا تو یہ ہم سے بدگمان کیوں ہیں کہ اس دین کو اختیار کرتے ہی یہ اچک لیے جائیں گے اور عرب کے قبائل ان کی عزت خاک میں ملا دیں گے۔ ان کا یہ عذر نادانی، لاعلمی اور جہالت کے سوا اور کیا ہے۔ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ ان کی بغاوت کے باوجود جب ہم نے انہیں یہ سب کچھ دے رکھا ہے تو وفاداری و فرماں برداری کے بعد ہم انہیں کیا کچھ نہیں دے سکتے۔

سرداران قریش کی اسی ذہنیت کو سامنے رکھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کلمۂ توحید پر ایمان کے اس نتیجے اور اس صلے کا

ذکر فرمایا جس کا تعلق اسی دنیا کی زندگی سے ہے۔

ایک اور پہلو سے ایمان و اسلام کی اس دنیوی جزا اور پیشکش پر غور کیجیے۔ انسان جب تک سانس لیتا رہتا ہے وہ اپنی حیات دنیا کی کامیابی و ناکامی کے سوال سے نہ پیچھا چھڑا سکتا ہے اور نہ بے نیاز ہو سکتا ہے۔ جب کبھی اس کے سامنے ایمان و اسلام اور بندگیِ رب کی دعوت آتی ہے تو وہ یہ جاننا چاہتا ہے کہ اس کا اثر اس کی دنیوی زندگی پر کیا پڑے گا۔ یہ بھی اپنے سامنے رکھیے کہ بہت قدیم زمانے سے شیطان نے حق و صداقت کے خلاف لوگوں کے ذہن میں یہ بدگمانی ڈال رکھی ہے کہ اگر تم نے خالص حق پرستی اختیار کی تو تمہاری آخرت بنے یا بگڑے لیکن تمہاری دنیا تو یقیناً برباد ہو کر رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے خالص حق پرستی اور صرف اپنی بندگی کی دعوت رکھا گیا ہے تو ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی پورے جزم و یقین سے سمجھائی گئی ہے کہ فرماں برداری میں تمہاری اخروی زندگی تو کامیاب ہوگی ہی، تمہاری دنیوی زندگی بھی ناکام نہ ہوگی بلکہ اس کے بدلے دارین کی دولت عطا کریں گے، اور دنیا کی سربلندی بھی تمہارے ہی حصے میں آئے گی۔ وانتم الاعلون مومنین کا مژدہ اگر نہ سنایا جاتا تو شاید خدا کی حجت اس کے بندوں پر پوری نہ ہوتی۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قحط زدہ قوم سے فرمایا تھا۔

> اپنے رب سے مغفرت طلب کرو، بلاشبہہ وہ بہت بخشنے والا ہے۔ وہ تم پر موسلا دھار پانی برسائے گا تمہارے مال اور تمہاری اولاد میں اضافہ کرے گا تمہیں گھنے باغ عطا کرے گا اور تمہارے لیے نہریں جاری فرمائے گا (نوح)

ٹھیک اسی طرح حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا تھا:۔

> اور اے میری قوم کے لوگو! اپنے رب سے مغفرت طلب کرو پھر اس کی طرف رجوع کرو وہ تم پر آسمان کے دہانے کھول دے گا اور تمہاری موجودہ قوت میں مزید قوت کا اضافہ کرے گا۔ مجرموں کی طرح منہ نہ پھیرو۔ (ہود ۵)

یہی بات قرآن نے اپنے مخاطبین سے کہی ہے:۔

> تم صرف اللہ کی بندگی کرو میں اس کی طرف سے تمہارے لیے نذیر و بشیر ہوں اور یہ کہ تم اپنے رب سے معافی چاہو اور اس کی طرف پلٹ آؤ تو وہ ایک مدت تک تم کو اچھا سامان زندگی دے گا اور صاحب فضل کو اس کا فضل عطا کرے گا۔ (ہود ۱)

ان تمام وعدوں اور ترغیبات کا تعلق دنیوی زندگی ہی سے ہے۔ معلوم ہوا کہ اسلام کی طرف دعوت دینے

کے سلسلے میں دنیوی زندگی کی کامیابی و کامرانی کو پیش کرنا نہ صرف یہ کہ صحیح ہے بلکہ انبیاء کرام علیہم السلام کے طریق دعوت کی پیروی بھی ہے۔ ہم جب لوگوں سے یہ کہتے ہیں کہ اسلام اور صرف اسلام تمہارے مسائل زندگی کا حل ہے۔ یہی تمہیں امن و سلام کی نعمت عطا کر سکتا اور یہی تمہاری زندگی کو کامیاب و کامراں بنا سکتا ہے تو ہمارے اس طریق دعوت میں کوئی جدت نہیں ہوتی بلکہ اس طریق دعوت کی پیروی ہوتی ہے جسے انبیاء نے اختیار فرمایا تھا — اللہ نے دین اسلام بھیجا ہی اس لیے ہے کہ وہ حیات و کائنات کے مسائل حل کرے اور اس کی تعلیمات کے مطابق زندگی بسر کرکے انسان دنیوی و اخروی دونوں ہی زندگیوں کو کامیاب بنائے — اسلام جن عقائد کی تعلیم دیتا ہے ان میں عقیدۂ توحید کے بعد سب سے زیادہ زور وہ عقیدۂ آخرت پر ڈالتا ہے اور اس کی تفصیل سے قرآن کی آئتیں اور احادیث دونوں بھری ہوئی ہیں۔ اس لیے جب کسی کو اسلام کی طرف دعوت دی جائے گی تو اس دعوت میں عقیدۂ آخرت لازماً شامل ہوگا یہ بات کسی طرح صحیح نہیں کہ کوئی شخص خلوص کے ساتھ دعوتِ اسلامی کو عقیدۂ آخرت کے بغیر یا اس سے غافل ہو کر قبول کر سکتا ہے، منافقت کی بات اور ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی صحیح نہیں کہ کوئی شخص اسلامی نظم مملکت کو اس عقیدے کے بغیر قبول کر سکتا ہے کیونکہ اسلامی حکومت آخرت کی بازپرس ہی پر استوار ہوتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ فلاح دنیا و فلاح آخرت میں نسبت تضاد کی نہیں توافق کی ہے۔ اسی لیے مومن کو جو دعا سکھائی گئی ہے وہ رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً ہے۔ خدا کا باغی صرف دنیا کی نعمت اور بھلائی چاہتا ہے اور خدا کا فرماں بردار دنیا اور آخرت دونوں ہی کی نعمت و عافیت اور بھلائی کا طلب گار رہتا ہے۔ مومن مخلص کے لیے سامانِ دنیا، متاعِ حسن کی حیثیت رکھتا ہے اور کافر و منافق کے لیے متاعِ غرور کی۔ متاعِ حسن اور متاعِ غرور میں فرق نہ کرنا بہت سی غلط فہمیوں کا سبب بن جاتا ہے۔

شرائط ایجنسی

ماہنامہ

زندگی رامپور

جلد:- ۳۰
شمارہ:- ۴

ذیقعدہ ۱۳۸۲ھ
اپریل ۱۹۶۳ء

مدیر:- سید احمد قادری

• خط وکتابت وارسال زر کا پتہ — **منیجر "زندگی" رامپور۔ یوپی**

• زر سالانہ :- صہ ششماہی : تین روپیہ — فی پرچہ :- پچاس نئے پیسے

• ممالکِ غیر سے — دس شلنگ انٹرنیشنل پوسٹل آرڈر

پاکستانی اصحاب مندرجہ ذیل پتہ پر رقوم بھیجیں اور رسید ہمیں ارسال فرمائیں

منیجر ہفت روزہ "شہاب" C/۱۱ شاہ عالم مارکیٹ، لاہور

مالک:- جماعت اسلامی ہند۔ اڈیٹر:- سید احمد عروج قادری۔ پرنٹر پبلشر احمد حسن۔ مطبع۔ دلی پرنٹنگ پریس محلہ بنگلہ آزاد خاں، رامپور یوپی
مقام اشاعت:- دفتر زندگی دکانتی رامپور یوپی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

(سید احمد قادری)

"مولانا عمری کا مضمون "ہندستان کیسے متحد ہو" دیکھا، چونکہ زندگی کے مدیر ہونے کی حیثیت سے آپ ہماری
جماعت کے ترجمان ہیں اس لیے جی چاہا کہ آپ سے کچھ عرض کروں۔ میرے اندر ایسی ہی تحریک وحید الدین خاں صاحب
کا مضمون دیکھ کر بھی ہوئی تھی جس کا عنوان کچھ اس قسم کا تھا کہ مسلمانوں کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے لیکن آپ کو لکھا نہیں
کہ اپنے یہاں تنقیدی خیالات کے متعلق کچھ خوش گوار ذہن نہیں پایا جاتا .... پھر بھی دل نے کہا کہ مختصر
طور پر اظہار خیال کر دینا ہی چاہیے۔

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اپنے یہاں تحریک و دعوت اور وعظ و تذکیر میں چنداں فرق محسوس نہیں کیا
جاتا، اس کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ تذکیر و موعظت اور مقالہ نگاری اور تحریک و دعوت کو ایک سمجھ لیا گیا ہے ۔
حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے۔ تذکیر و موعظت اور مقالہ نگاری کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اپنی اپنی استعداد و مہارت کے
مطابق انسان اونچی سے اونچی بات کہہ اور لکھ سکتا ہے لیکن تحریک و دعوت کا میدان اور اس کی فضا اتنی
وسیع اور بلند نہیں۔ بات کتنی ہی اونچی ہو، کتنی ہی پختہ اور مدلل ہو لیکن وہ تحریک و دعوت کے اعتبار سے بے سود
ہے اگر وہ حالت اور وقت کے مطابق نہیں۔ مثال کے لیے مولانا عمری کے مضمون "ہندوستان کیسے متحد ہو" کو
لیجیے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہندستان کے اتحاد کے لیے ذمہ داران ملک اور اکابر جو طریقے اختیار کرتے ہیں وہ
ایسے ہی ہیں جیسا مولانا نے بتایا ہے اور خود جو طریقہ پیش کیا ہے وہ حق بھی ہے اور اس پر ہمارا ایمان بھی ہے
لیکن اگر مولانا نے اس مضمون کو محض موعظت کے نقطہ نظر سے نہیں لکھا ہے، ایک تحریک کے کارکن کی حیثیت سے
لکھا ہے اور ہمیں اور آپ کو بھی اسی حیثیت کے پیش نظر اس مضمون کو پڑھنا چاہیے تو سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب
صورت حال یہ ہے کہ ہندستان میں مختلف گروہ ہیں جو مختلف مذاہب اور مختلف تہذیب وغیرہ رکھتے ہیں اور

کوئی گروہ اپنی انفرادیت کو ترک کرنے پر آمادہ نہیں تو مولانا کے پیش کردہ اسلام کے نسخۂ اتحاد کو یہ ملک کیسے تسلیم کرلے گا جس کی ہندوازم کے احیاء کی امنگ سے نہ مولانا عمری واقف ہیں اور نہ ہم اور آپ۔ پھر مولانا کا مضمون خواہ کتنا ہی حقیقت افروز ہو ہم یہ کیسے مان لیں کہ ملک کے اتحاد کا عملی طریقہ بھی ہے اگر دوسروں کے نسخے بے اثر ہیں تو یہ نسخہ بے محل ہے۔ تحریک کے کارکنوں کو اپنا ہی طریقہ مگر اس رنگ میں پیش کرنا ضروری ہے جس کی قبولیت بھی یقینی نہیں تو متوقع تو ہو، اور مولانا کا پیش کردہ طریقہ عملی اعتبار سے بالکل غیر عملی ہے ہم کیا توقع کریں کہ بحالت موجودہ اتحاد کے لیے ملک اسلام قبول کرلے گا؟ اور جب یہ نہیں تو پھر مولانا کے مضمون کی حیثیت ایک وعظ سے زیادہ نہیں۔ مولانا نے لکھا۔ قارئین زندگی نے پڑھ لیا اور ... کا عکس نہیں پڑ سکتا۔

مولانا وحیدالدین خاں کے مضمون کو لیجیے۔ مسلمان آج مسائل سے دوچار ہیں اور اس اعتبار سے بالکل بے سود ہے وہ سرے سے مسائل کا کوئی عملی حل نہیں ہے .... الخ۔ عدالتی طریقے اور پارلیمنٹری راہ کو چلتی ہوئی مثالیں دے کر چٹکیوں میں اڑا دیا۔ طرز بیان اتنا چست ہے کہ مشکل ہی سے اس کی خامیوں کو محسوس کرسکتا ہے مگر اس میں خامیاں ہیں۔ عدالتوں سے متعلق مثالیں ناکامیوں ہی کی نہیں ہیں کامیابیوں کی بھی ہیں۔ ناکامیابیاں ہندوؤں کو بھی ہوتی ہیں اس لیے اس طریقے کو کلیتہً بے نتیجہ کہنا مغالطہ ہے۔ اسی طرح پارلیمنٹری طریقے کو بھی سرے سے بے سود کہنا درست نہیں۔ سید بدرالدجیٰ صدر لیگ اور مولانا حفظ الرحمٰن کی تقریروں نے پارلیمنٹ میں ہلچل ڈال دی تھی۔ یہ صورت بھی کچھ بے حقیقت نہیں کہ پارلیمنٹ میں دس آزاد خیال بھی ہوں اور وہ صدائے حق بلند کریں تو دنیا پر حق و ناحق واضح ہو جائے۔ یہ بھی مسائل کے حل کا اولین قدم ہے لیکن ہم ان دونوں کو بے سود بھی مان لیں تو وحیدالدین خاں صاحب کا حل بجائے خود حق ہونے کے بھی کوئی حل نہیں ہے۔ تاتریاق از عراق کا مضمون ہے بلکہ اس سے بھی بعید۔ مسلمان نہ صحابہ جیسے بن سکیں گے اور نہ مسئلہ حل ہوگا۔ ہم میں کون ہے جو لکھنے سے آگے بڑھ کر خود اس ایمان و یقین اور سیرت و کردار کا حامل ہے پھر ہم میں وہ روح کیسے پیدا ہوگی اور سو پچاس برس میں پیدا ہونے کی توقع بھی ہو تو ملت کو تو مسائل ختم کر چکے ہوں گے۔ والسلام

اوپر کی تحریر جماعت اسلامی ہند کے ایک رکن کا خط ہے۔ اس خط میں "زندگی" کے دو مضامین کو بنیاد بنا کر جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے انہیں پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مکتوب نگار کے ذہن سے جماعت اسلامی کا

ریچر' اس کی تاسیس کی ضرورت' اس کا نصب العین' طریقہ کار اور تحریک اسلامی کی گزشتہ بیس سالہ تاریخ گویا سب کچھ اوجھل ہو چکا ہے۔ اگر اپنے مکتوب میں بار بار وہ اس جماعت سے اپنے تعلق کا اظہار نہ کرتے تو جماعت اسلامی سے واقف کوئی شخص نہیں سمجھ سکتا تھا کہ یہ جماعت کے کسی رکن کا خط ہو سکتا ہے۔ جن دو مضامین پر اظہار خیال کیا گیا ہے ان کی بعض باتوں سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ مجھے اس وقت ان دو مضامین پر گفتگو نہیں کرنی ہے بلکہ اس خط کو پڑھنے کے بعد راقم الحروف' اپنے مکتوب نگار کی اور پوری تحریک اسلامی کی خیرخواہی کے نقطۂ نظر سے ضروری سمجھتا ہے کہ ان صفحات میں جماعت کی بائیس سالہ تاریخ کا ایک مختصر جائزہ پیش کرے تاکہ از سر نو ہمارے ذہنوں میں نصب العین' طریقہ کار اور جماعت کی خصوصیات و امتیازات تازہ ہو جائیں اور یہ بات بھی یاد آجائے کہ متعدد مسلم جماعتوں کی موجودگی میں ایک علیٰحدہ جماعت کیوں بنی تھی؟

جہاں تک میں نے جائزہ لیا ہے جماعت اسلامی ہند دو سخت مرحلوں سے گزر کر ایک تیسرے سخت مرحلے میں داخل ہو چکی ہے اور آج وہ ایک نازک موڑ پر کھڑی ہے۔ ان تینوں مرحلوں کی تھوڑی سی تفصیل آگے آرہی ہے۔ ان کو بیان کرنے سے پہلے اپنی یادداشت میں یہ بات تازہ کر لینی چاہیے کہ جماعت اسلامی کی تشکیل و تاسیس کیوں اور کس نظریے کے ماتحت ہوئی تھی۔

جماعت اسلامی کس غرض سے منظم ہوئی ہے

یہ بات ہم سب کو معلوم ہے کہ مسلمانوں میں مختلف جزوی مقاصد کے لیے کام کرنے والی جماعتیں ہمیشہ موجود رہی ہیں اور آج بھی پائی جاتی ہیں کسی نے مسلمان قوم کے دنیوی مفاد و حقوق کے حصول کو اپنی کوششوں کا مرکز بنا رکھا ہے۔ کسی نے محدود مذہبی امور و مسائل کے لیے اپنی توانائی وقف کر رکھی ہے اور کسی کی انتہائی معراج یہ ہے کہ بھارت میں امت مسلمہ کے پرسنل لا محفوظ رہ جائیں اور اسے مذہبی و معاشی تحفظ حاصل ہو جائے ۔۔۔ ۱۹۴۱ء میں جس وقت جماعت اسلامی کی تشکیل ہوئی تھی اس وقت بھی کام کرنے والی جماعتیں موجود تھیں اور یہ بات دوسرے لوگ تسلیم کریں یا نہ کریں ہم لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جماعت اسلامی کی تنظیم محض اس لیے نہیں کی گئی تھی کہ جماعتوں میں ایک اور جماعت کا اضافہ کر دیا جائے۔ جماعت سازی کا شوق اس کی تنظیم و تشکیل کا محرک نہ تھا بلکہ ایک نئی جماعت کی تشکیل کی وجہ صرف یہ تھی کہ مسلمانوں کی کوئی جماعت اس نصب العین کے لیے کام نہیں کر رہی تھی جسے جماعت اسلامی نے اختیار کیا ہے اور جس کے بارے میں اس کو یقین ہے کہ خدا کی طرف سے یہی پوری امت مسلمہ کا مقصود

صب العین مقرر کیا گیا ہے۔ جب تک یہ امت مسلمہ اس نصب العین کے لیے اپنی تمام توانائیاں وقف نہیں کرے گی
اپنے مقصد وجود کو حاصل نہیں کر سکے گی، اس کو اس بات کا بھی یقین حاصل ہے کہ اسی نصب العین کے لیے جدوجہد
کے تمام پیچیدہ مسائل کا بھی صحیح اور پائیدار حل ہے۔ یہ بات جماعت اسلامی کے دائرے میں ہمیشہ عجیب
سمجھی جاتی رہی ہے کہ مسلمان ایک طرف تو دین اسلام کو دنیا کے تمام مسائل کا حل کہتے ہیں اور دوسری طرف
کی اقامت کے لیے اجتماعی جدوجہد پر آمادہ نہیں ہوتے بلکہ جب اپنے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کی تدبیریں
چتے ہیں تو اس دین کی بتائی ہوئی تعلیمات سے صرف نظر کر کے کچھ دوسری ہی تدبیریں اختیار کر لیتے ہیں۔ یعنی
بات کا اپنے قول سے اقرار کرتے ہیں اسی کی اپنے عمل سے تردید کر دیتے ہیں، ان کے عمل سے جو خیال
ہے کہ ان کے مسائل تو دوسری ہی تدبیروں سے حل ہوں گے اور جب وہ حل ہو جائیں گے تو اسلام
کے ساتھ تشریف لے آئے گا۔ مسلمانوں میں عام طور پر جماعت اسلامی کے مطعون ہونے کی
یہ کہ وہ مسلمانوں کو ایک اصولی جماعت کی حیثیت دے کر اسلام کے مفاد کو ہر دوسرے مفاد پر
اور دوسری یہ کہ زندگی کے ہر مسئلے میں اسلام سے فتویٰ طلب کرتی ہے وہ مسئلہ مسجد و مدرسہ سے متعلق ہو یا عدالت
یا پارلیمنٹ سے۔

جماعت اسلامی ہند کا نصب العین جماعت اسلامی ہند نے جو نصب العین اختیار کیا ہے وہ یہ ہے:۔

"جماعت اسلامی ہند کا نصب العین اقامت دین ہے جس کا حقیقی محرک صرف رضائے الٰہی اور فلاح آخرت کا حصول ہے۔"

تشریح:۔ اقامت دین میں لفظ "دین" سے مراد وہ دین حق ہے جسے اللہ رب العالمین اپنے تمام انبیاء
کے ذریعہ مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں میں بھیجتا رہا ہے اور جسے آخری اور مکمل صورت میں تمام انسانوں کی
ہدایت کے لیے اپنے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ نازل فرمایا اور جو اب دنیا میں ایک ہی مستند
محفوظ اور عند اللہ مقبول دین ہے اور جس کا نام اسلام ہے۔

یہ دین انسان کے ظاہر و باطن اور اس کی زندگی کے تمام انفرادی و اجتماعی گوشوں کو محیط ہے۔ عقائد عبادات
اور اخلاق سے لے کر معیشت، معاشرت اور سیاست تک انسانی زندگی کا کوئی ایک شعبہ بھی ایسا نہیں ہے جو اس کے
دائرے سے خارج ہو۔

یہ دین جس طرح رضائے الٰہی اور فلاح آخرت کا ضامن ہے اسی طرح دنیوی مسائل کے موزوں حل کے لیے بہترین

نظام زندگی بھی ہے اور انفرادی و اجتماعی زندگی کی صالح اور ترقی پذیر تعمیر صرف اسی کی تعمیر سے ممکن ہے۔

اس دین کی "اقامت" کا مطلب یہ ہے کہ کسی تفریق و تقسیم کے بغیر اس پورے دین کی مخلصانہ پیروی کی جائے اور ہر طرف سے یکسو ہوکر کی جائے اور انسانی زندگی کے انفرادی و اجتماعی تمام گوشوں میں اسے اس طرح جاری و نافذ کیا جائے کہ فرد کا ارتقاء معاشرے کی تعمیر اور ریاست کی تشکیل سب کچھ اسی دین کے مطابق ہو۔

اس دین کی اقامت کا مثالی اور بہترین عملی نمونہ وہ ہے جسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین نے قائم فرمایا۔" (دستور جماعت اسلامی ہند دفعہ ۴)

یہ ہے ہمارے سفر کی ابتدا جہاں سے ہم چلے ہیں اور یہ ہے وہ مقصد جس کے لیے جماعت اسلامی وجود میں آئی ہے۔ یہ ہے وہ نصب العین جس نے ہمیں جوڑ کر ایک جماعت بنایا ہے۔ یہ ہے وہ محور جس کے گرد ہماری جدوجہد گھومتی رہی ہے۔ یہ ہے وہ منزل مقصود جس پر پہنچنے کی آرزو میں ہزاروں دل دھڑک رہے ہیں اور سیکڑوں قدم اپنے گوشۂ عافیت سے نکل آئے ہیں۔ کسی نے خانقاہوں کے پرسکون ماحول کو چھوڑا ہے، کسی نے قیمتی ملازمتوں پر لات ماری ہے۔ کسی نے تجارتی کاروبار کو ٹھپ کیا ہے اور کسی نے مستقبل کے چمکیلے اور بھڑکیلے مناصب کی قربانی دی ہے۔ اسی محبوب و مطلوب کے لیے رشتے منقطع ہوئے ہیں اور نسبی رشتوں کے تعلقات متاثر ہوئے ہیں۔

اس نصب العین کے حصول کے لیے جو تحریک برسرکار ہو اس کے بنیادی اصول مولانا ابواللیث ندوی اصلاحی امیر جماعت اسلامی ہند نے اپنے رسالہ "جماعت اسلامی اس کا مقصد اور طریقہ کار" میں تفصیل کے ساتھ لکھے ہیں۔ میں یہاں اختصار کے ساتھ انہیں نقل کرتا ہوں:۔

پہلا اصول ۔ پہلا اصول اس طرح کی تحریک کے لیے یہ ہونا چاہیے کہ وہ دین کو اس کی اصلی شکل میں قائم کرنے کی کوشش کرے۔ نہ اس میں اپنی طرف سے کسی بات کا اضافہ کرے اور نہ اس میں کسی طرح کی کمی کرے کیونکہ اضافہ اور کمی کا مطلب یہ ہوگا کہ دین اپنی اصل شکل میں باقی نہیں رہا اور ہم نے خود اپنے لیے ایک نیا دین ایجاد کرلیا یہ دونوں باتیں گمراہی کی باتیں ہیں۔ خواہ وہ بظاہر کسی دینی جذبے ہی کے تحت کیوں نہ عمل میں آئیں۔ یہود و نصاریٰ کی اصل گمراہی اسی طرح کی افراط و تفریط کا نتیجہ تھی اسی بنا پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی شدت کے ساتھ نئی بات پیدا کرنے سے روکا ہے۔

دوسرا اصول ۔ دوسرا اصول اس تحریک کے لیے یہ ہونا چاہیے کہ وہ دین کے پورے مجموعہ کو جو اس کے مستند ذرائع علم

سے ثابت ہو، اپنے سامنے رکھے، نہ کہ اس کے کسی خاص جز کو۔ بالفاظ دیگر اس کی جد وجہد کا منشاء یہ ہونا چاہیے کہ پورا دین اپنی مجموعی اور کلی شکل میں قائم ہو نہ یہ کہ وہ اس مجموعہ میں سے کچھ خاص خاص باتوں کو چھانٹ لے اور پھر ان ہی باتوں پر اپنی سعی وعمل کو مرکوز کر دے۔

تیسرا اصول ۔ تیسرا اصول اس تحریک کا یہ ہونا چاہیے کہ اس میں جس طرح اس بات کا لحاظ ضروری ہے کہ دین میں کوئی کمی بیشی نہ ہو اسی طرح اس بات کا بھی لحاظ کیا جائے کہ دین کے مجموعے میں جس چیز کو جس قدر کم یا زیادہ اہمیت حاصل ہے اس کو پوری شدت کے ساتھ برقرار رکھا جائے اس میں کسی طرح کا رد و بدل نہ ہونے دیا جائے کیونکہ اہمیت کے لحاظ سے کمی بیشی بھی دین میں تحریف ہی کا ہم معنی ہے۔ تحریف صرف یہی نہیں ہے کہ شریعت کے کسی حکم کو بدل دیں بلکہ یہ بھی تحریف ہی کی ایک قسم ہے کہ شریعت میں جس چیز کا اہمیت ۔ جو مقام ہے اس میں ہم اپنی طرف سے کوئی تبدیلی کریں۔

چوتھا اصول ۔ چوتھی چیز جو اس تحریک کے لیے ضروری ہے وہ یہ کہ جس طرح ہم اس کے اجزاء میں ان کی ا... کے اعتبار سے کوئی رد و بدل نہ کریں اسی طرح ان اجزاء میں جو تقدیم و تاخیر یا ترتیب ملحوظ رکھی گئی ہے اس میں بھی کسی طرح کا فرق واقع نہ ہونے دیں ورنہ اس کا نتیجہ بھی یہی ہو گا کہ شریعت کا صحیح ڈھانچہ اپنی اصل شکل میں برقرار نہیں رہ سکے گا۔ مثال کے طور پر شریعت میں سب سے مقدم چیز عقائد ہیں جن پر تمام احکام و اعمال کی دیوار کھڑی ہوتی ہے۔ اگر عقائد کو ان کی جگہ سے ہٹا دیا جائے تو اس کے بعد اعمال کی جو عمارت تعمیر ہو گی وہ کوئی صحیح شرعی عمارت نہ ہو گی یا مثلاً اسلام کا جو اقتصادی یا معاشی نظام ہے وہ اپنے آگے پیچھے عقائد و اعمال کا ایک پورا سلسلہ رکھتا ہے اگر اس نظام کو اس کی اصل جگہ سے ہٹا کر کوئی اپنانے کی کوشش کرے تو وہ اپنی ظاہری ہیئت کے لحاظ سے ممکن ہے اسلامی کہا جا سکے لیکن حقیقۃً وہ اس کا مستحق نہیں ہو گا اور نہ اس سے وہ خیر و برکات ظاہر ہو سکیں گی جن کی توقع صحیح اسلامی نظام معاشرت سے بجا طور پر وابستہ کی جا سکتی ہے۔

پانچواں اصول ۔ پانچواں اصول جس کا اس طرح کی تحریک میں لحاظ رکھنا ضروری ہے یہ ہے کہ اس کو ہر طرح کی قومی اور وطنی تعصبات اور دلچسپیوں سے بالکل پاک رکھنا چاہیے۔

یہ اصول بیان کرنے کے بعد امیر جماعت اسلامی ہند نے تفصیل سے بتایا ہے کہ جماعت اسلامی ہند انہیں اصولوں کو لے کر چلنا چاہتی ہے۔ قوم پرستی اور وطن پرستی سے جماعت کی علیحدگی کی تشریح کرتے ہوئے انھوں نے اس جماعت

کی تشکیل کے زمانے کا بھی حوالہ دیا ہے وہ لکھتے ہیں:-

"چنانچہ اسی بنا پر ہم نے اب تک اپنے کو قومی اور وطنی تعصبات سے ہر طرح علیحدہ رکھنے کی کوشش کی ہے جماعت کی تشکیل کا زمانہ عین وہ زمانہ ہے جب ملک میں اسی طرح کی تحریکیں اپنے شباب پر تھیں، ایک طرف استخلاص وطن کی جدوجہد جاری تھی اور دوسری طرف قومی حقوق کے تحفظ کی، لیکن ہم نے ان سے اپنے کو جان بوجھ کر الگ رکھا اگرچہ اس کے نتیجے میں ہمیں طرح طرح کی مخالفتوں اور طعن و تشنیع سے دوچار ہونا پڑا۔ کیونکہ یہ تحریکات کلی طور سے ہمارے اصولوں سے مطابقت نہیں رکھتی تھیں۔ ہمارے نزدیک آزادی صرف یہ نہیں ہے کہ ایک قوم کے افراد دوسری قوم کی غلامی سے نجات پا جائیں بلکہ اصلی آزادی یہ ہے کہ ایک طرف وہ اپنے ہی جیسے انسانوں اور خود اپنے نفس کی غلامی سے آزاد ہو جائیں اور دوسری طرف اپنے حقیقی آقا کے غلام بن جائیں اسی طرح ہمارے نزدیک مسلمانوں کا یہ مقام نہیں ہے کہ وہ دنیا کی اور قوموں کی طرح اپنے کو بھی ایک قوم فرض کر لیں اور پھر انہیں قوموں کی طرح قومی عزت و سربلندی کی فکر میں لگ جائیں اور اس طرح دنیا کے مفسد گروہوں میں ایک اور مفسد گروہ کا اضافہ کریں بلکہ ان کا اصلی مقام یہ ہے کہ وہ ایک اصولی جماعت اور پارٹی بن کر دنیا کے سامنے آئیں اور اپنے اصولوں کی عزت اور سربلندی کے لیے کوشاں ہوں جن پر قوم و ملک کی حقیقی سعادتوں کا دارومدار ہے۔ افسوس اس حقیقت کو بھلایا جاتا ہے کہ اسلام کا مفاد اور مسلم قوم کا ہر طرح کا مفاد دونوں ہر حال میں ایک نہیں ہیں اور جب دونوں میں مطابقت ممکن نہ ہو تو ایک حقیقی مسلم کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ وہ اسلام کے مفاد کو ترجیح دے اور مسلمانوں کے جھوٹے مفاد قومی کو ترک اور نظر انداز کر دے ورنہ اس کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہوگا کہ اس کی اسلامی حیثیت مجروح ہو جائے گی بلکہ اس طرز عمل کی بنا پر خود اسلام بھی بدنام ہو جائے گا اور اس کی ترقی کی راہیں مسدود ہو جائیں گی جیسا کہ آج فی الواقع مسلمانوں کے اس قسم کے طرز عمل سے ہندوستان میں ہو رہا ہے کیونکہ قومی مفاد کے لیے جدوجہد کرتے ہوئے کسی فرد یا جماعت کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ وہ عالمگیر اصولوں کی علم بردار ہے اور اگر ایسا کرتے ہوئے کوئی یہ کہنے کی جرأت کرتا ہے تو ایسے شخص یا جماعت کی بات سننے کے لیے کوئی شخص بھی آمادہ نہیں ہو سکتا۔"

یہ لمبا اقتباس اس لائق ہے کہ تحریک اقامت دین کے کارکن اپنا کوئی بھی رویہ متعین کرتے وقت پیش نظر رکھیں جماعت اسلامی جو نظام پیش کرتی ہے اس میں اور اس نظام زندگی میں جس پر آج دنیا کی طاقتور حکومتیں چل رہی ہیں سب سے بڑا اور سب سے بنیادی فرق یہ ہے کہ ان میں سے ایک کی اساس دین پر قائم ہے اور دوسرے

(باقی صفحہ ۵۴ پر)

امر بالمعروف ونہی عن المنکر[1]

(مولانا سید جلال الدین عمری)

'معروف' کا حکم دینا اور 'منکر' سے روکنا پیغمبرانہ کام ہے۔ قرآن نے پیغمبروں اور ان کے کام کو جن اصطلاحات میں بیان کیا ہے ان میں ایک اصطلاح 'امر بالمعروف ونہی عن المنکر' کی
اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ارشاد ہوا :-

يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ ۔ (الاعراف: ۱۵۷)	کہ وہ ان (اہل کتاب) کو معروف کا حکم دیتے ہیں اور منکر سے روکتے ہیں۔

حضرت لقمان اپنے بیٹے کو نصیحت فرماتے ہیں کہ معروف کا حکم دو اور منکر سے روکو اور اس راہ میں جو مصیبت آئے اسے برداشت کرو۔ یہ کام بے پناہ صبر و ہمت چاہتا ہے اور اس پر ارباب عزیمت ہی جم سکتے ہیں :-

يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (لقمان: ۱۷)	اے میرے بیٹے نماز قائم کر، معروف کا حکم دے اور منکر سے منع کر اور اس راہ میں جو تکلیف پہنچے اس پر صبر کر۔ یقیناً یہ بڑی عزیمت کا کام ہے۔

حضرت لقمان خدا کے پیغمبر نہیں تھے لیکن صالح اور خدا ترس انسان تھے۔ قرآن نے ان کی نصیحت اسی لیے نقل کی ہے کہ اس کی اتباع کی جائے۔ جصاص فرماتے ہیں :-

انما حکی اللہ تعالیٰ لنا ذالک عن عبدہ لنقتدی به وننتهی	اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کی یہ نصیحت ہمیں اس لیے سنائی ہے کہ ہم اس کی اتباع کریں اور اس

---

[1] اس مضمون کی ایک قسط "منزل اور نشان منزل" کے عنوان سے "زندگی" کے پچھلے شمارے (مارچ ۶۳ء) میں شائع ہو چکی ہے۔

الیہ۔ تک پہنچیں

نزولِ قرآن کے وقت اہلِ کتاب کے اندر زبردست فساد اور بگاڑ پیدا ہو چکا تھا اور وہ خدا کے دین کو چھوڑ چکے تھے۔ لیکن اس کے باوجود ان میں ایک گروہ راہ راست پر قائم تھا اور "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کا فرض انجام دے رہا تھا۔ قرآن نے اس کی تعریف کی ہے۔

لَيْسُوا سَوَآءً مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ	اہل کتاب سب کے سب ایک سے نہیں ہیں۔
اُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ	ان میں ایک جماعت راہِ راست پر قائم ہے۔ یہ لوگ
الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ٥ يُؤْمِنُوْنَ	رات کے اوقات میں اللہ کی آیتوں کی تلاوت کرتے ہیں
بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ	اور اس کے سامنے سجدہ کرتے ہیں۔ اللہ پر اور آخرت
بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ	کے دن پر یقین رکھتے ہیں، معروف کا حکم دیتے ہیں
وَيُسَارِعُوْنَ فِى الْخَيْرٰتِ وَاُولٰٓئِكَ	اور منکر سے روکتے ہیں اور بھلائی کے کاموں میں
مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ٥ (آل عمران: ۱۱۳-۱۱۴)	جلدی کرتے ہیں۔ ان لوگوں کا شمار صالحین میں ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کارِ نبوت کے لیے "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کی تعبیر ٹھیک قرآنی تعبیر ہے۔ یہ کوئی محدود تعبیر نہیں ہے جو انبیاءؑ کے کام کے کسی ایک حصے کو ظاہر کرتی ہو، بلکہ یہ اس جدوجہد کو پوری طرح نمایاں کرتی ہے جو انبیاءؑ خدا کے دین کی راہ میں کرتے تھے۔ ان کی تمام تعلیمات امر و نہی پر مشتمل تھیں۔ وہ یا تو معروف کا حکم دیتے تھے یا منکر سے روکتے تھے۔ اس تعبیر کے ذریعہ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ کیا کام ہے جو ہر نبی نے اپنے دور میں انجام دیا اور جس کے کرنے پر آج آپ مامور ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تعبیر بظاہر چند الفاظ کا مجموعہ ہے لیکن ان ہی چند الفاظ میں انبیاء کا مقصدِ بعثت بیان کر دیا گیا ہے۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں:۔

ان الامر بالمعروف والنھی عن المنکر	معروف کا حکم دینا اور منکر سے روکنا پچھلی امتوں
کان واجبا فی الامم المتقدمۃ وھو	کے لیے واجب تھا۔ یہی رسالت کا فائدہ ہے اور یہی
فائدۃ الرسالۃ وخلافۃ النبوۃ ؎	نبوت کی جانشینی ہے۔

علامہ سیف الدین آمدی فرماتے ہیں:۔

؎ احکام القرآن جلد ۲ صـ۵۹۲ ؎ الجامع الاحکام القرآن جلد ۴ صفحہ ۴۷

مامن امة الا وقد امرت بالمعروف کاتباع انبیائهم وشرائعهم ونهت عن المنکر تنهیهم عن الالحاد وتکذیب انبیائهم[1]

جتنی بھی امتیں گزری ہیں ان میں سے ہر امت نے معروف کا حکم دیا ہے مثال کے طور پر ان کا اپنے نبیوں اور ان کی شریعتوں کی اتباع کا حکم دینا اسی طرح انھوں نے منکر سے منع کیا ہے مثلاً ان کا الحاد اور تکذیب انبیاء سے منع کرنا۔

امام رازی فرماتے ہیں:۔

الامر بالمعروف والنهی عن المنکر والایمان باللہ ان هذه الصفات الثلثة کانت حاصلة فی سائر الامم[2]

'امر بالمعروف ونہی عن المنکر' اور ایمان باللہ یہ تینوں صفتیں تمام امتوں میں موجود تھیں۔

علامہ رشید رضا مصری لکھتے ہیں:۔

قد جرت سنة الانبیاء والمرسلین والسلف الصالحین علی الدعوة الی الخیر والامر بالمعروف والنهی عن المنکر وان کان محفوفا بالمکاره والمخاوف[3]

انبیاء و مرسلین اور سلف صالحین کی یہ سنت رہی ہے کہ انھوں نے 'خیر کی دعوت دی' معروف کا حکم دیا اور منکر سے منع کیا۔ حالانکہ یہ کام مشقتوں اور تکالیف سے گھرا ہوا ہے۔

اہل علم کی یہ چند تصریحات ہیں کہ 'امر بالمعروف ونہی عن المنکر' ہر دور میں خدا کے پیغمبروں اور ان کی امتوں کا کام رہا ہے۔ اسی کام کے لیے امت مسلمہ پیدا کی گئی ہے۔ اس کا مقام یہ نہیں ہے کہ وہ اپنی حد تک صلاح وتقویٰ کی زندگی گزارتی رہے بلکہ اسے دنیا کی امامت کا کام انجام دینا ہے۔ وہ عابد وزاہد بھی ہے اور ہادی ورہنما بھی۔ خدا کی بندگی اور مخلوق کی ہدایت اس کے کام کے دو جزء ہیں۔ آج اگر وہ ان میں سے کسی بھی جزء کو چھوڑ بیٹھے تو کل قیامت کے روز مجرموں کی صف میں کھڑی ہوگی۔ اسے 'خیر امت' کا لقب اسی لیے ملا ہے کہ وہ شر سے بھری ہوئی اس دنیا کے لیے خیر ثابت ہوگی۔ دنیا کی قوموں اور امتوں کے درمیان اس کا وجود اس لیے ہے کہ وہ انہیں سیدھی راہ دکھائے۔ معروف کا حکم دینا اور منکر سے روکنا اس کا امتیازی نشان ہے۔ اگر وہ اپنا یہ امتیاز کھو دے تو اس کا عظمت اس سے چھن جائے گی اور اس میں اور دنیا کی دوسری قوموں میں کوئی فرق نہ ہوگا۔ حضرت عمرؓ نے ایک حج کے موقع پر یہ آیت پڑھی:۔

---

[1] الاحکام فی اصول الاحکام جلد ا ص۳۰ [2] التفسیر الکبیر جلد ۳ ص۲۷ [3] تفسیر المنار جلد ۴ ص۳۲

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ

تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کی ہدایت کے لیے نکالا گیا ہے۔ تم معروف کا حکم دیتے ہو اور منکر سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

اس کے بعد فرمایا:-

يا ايها الناس من سره ان يكون من تلك الامة فليؤد شرط الله منها[1]

اے لوگو! تم میں سے جو شخص اس خیر امت میں شامل ہونا چاہے تو اس کے لیے اللہ نے جو شرط رکھی ہے وہ پوری کرے۔

مجاہدؒ اس آیت کی تشریح میں فرماتے ہیں:-

كنتم خير الناس للناس على هذا الشرط ان تامروا بالمعروف وتنهوا عن المنكر وتومنوا بالله[2]

تم انسانوں کے حق میں بہترین انسان ہو اس شرط کے ساتھ کہ تم معروف کا حکم دیتے ہو، منکر سے روکتے ہو اور خدا پر ایمان رکھتے ہو۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں:-

(تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ) مدح لهذه الامة ما اقاموا ذالك واتصفوا به فاذا تركوا التغيير وتواطئوا على المنكر زال عنهم اسم المدح ولحقهم اسم الذم وكان ذالك سببا لهلاكهم[3]

خدائے تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ "تم معروف کا حکم دیتے ہو اور منکر سے روکتے ہو" اس امت کی تعریف ہے جب تک وہ اس پر قائم رہے اور یہ صفت اس کے اندر پائی جائے لیکن اگر وہ منکر کو بدلنے کا کام چھوڑ دے اور منکر پر اتفاق کرے تو خدا نے اسے جو تعریفی نام دیا ہے وہ اس سے چھن جائے گا اور اس کے ساتھ مذمت چپک جائے گی اور یہی چیز اس کی ہلاکت کا سبب ہوگی۔

"امر بالمعروف ونہی عن المنکر" اہل ایمان کی ایسی صفت ہے، جو ان سے کسی بھی حال میں جدا نہیں ہو سکتی۔ مومن کی تصویر جب کبھی سامنے آئے گی تو اس میں یہ خوبی ضرور شامل ہوگی، اس کے بغیر مومن کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔

---

[1] جامع البیان فی تفسیر القرآن (ابن جریر طبری) ج ۴ ص ۲۳ ۔ [2] ایضاً ص ۲ ۔ [3] الجامع لاحکام القرآن ج ۴ ص ۱۷۳

لئے تعالیٰ اہل ایمان کو جس حالت میں دیکھنا چاہتا ہے اس حالت میں وہ اسی وقت موجود ہوں گے جب کہ وہ امر
معروف ونہی عن المنکر، کا فریضہ انجام دے رہے ہوں۔ ایمان کا معیار مطلوب یہ نہیں ہے کہ آدمی اپنے دامن کو
معصیت سے بچائے رکھے بلکہ حقیقی ایمان وہ ہے جو ڈوبتی ہوئی انسانیت کو سہارا دیتا ہے اور کفر وشرک کے خلاف
کی بے تابی پیدا کرتا ہے۔ جو ایمان دنیا کو محروم ہدایت دیکھ کر نہ تڑپ اٹھے وہ اپنی حقیقت کھو چکا ہے اور اس
ایمان کی شان باقی نہیں ہے۔

قرآن نے امت مسلمہ کو 'خیر امت' کہا ہے۔ کیونکہ وہ معروف کا حکم دیتی اور منکر سے روکتی ہے اور خدا پر ایمان
رکھتی ہے۔ اسی طرح اہل کتاب کے حق پرست گروہ کو 'امۃ قائمۃ' (راہ راست پر قائم رہنے والی
کیونکہ اس گروہ سے تعلق رکھنے والے اللہ کی کتاب کی تلاوت کرتے ہیں، اس کے عبادت گزار
آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔

وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ اور معروف کا حکم دیتے ہیں اور منکر سے روکتے

اس سے معلوم ہوا کہ 'خیر امت' بننے اور راہ راست پر قائم رہنے کے لیے صرف ذاتی حسنات مطلوب نہیں
بلکہ اس کے لیے دوسروں کی ہدایت و راہنمائی کے اوصاف بھی ضروری ہیں۔

علامہ ابوالسعود نے اس فقرہ کی شرح ان الفاظ میں کی ہے:۔

وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ	"معروف کا حکم دیتے ہیں اور منکر سے روکتے ہیں"
عَنِ الْمُنْكَرِ) صفتان اخريان لامة	راہ راست پر قائم رہنے والی امت کی یہ مزید دو
اجريتا عليهم تحقيقا لمخالفتهم اليهود	صفتیں بیان ہوئی ہیں۔ پہلے بیان کیا گیا کہ وہ ان
في الفضائل المتعلقة بتكميل	'خصائص' میں جو 'تکمیل نفس' سے متعلق ہیں عام یہود
الغير اثر بيان مباينتهم لهم	سے مختلف ہیں۔ اس کے بعد یہ ثابت کیا جا رہا ہے
في الخصائص المتعلقة بتكميل	کہ ان خصائص میں بھی جو 'تکمیل غیر' سے متعلق ہیں ان
النفس وتعريضا بمداهنتهم	کی روش جدا ہے۔ اس میں یہود پر تعریض ہے کہ
في الاحتساب بل بتعكيسهم	وہ لوگوں کے احتساب میں سستی دکھا رہے ہیں بلکہ الٹے
في الامر باضلال الناس وصدهم	لوگوں کو گمراہ کر رہے ہیں اور انہیں خدا کی راہ سے
عن سبيل الله فانه امر بالمنكر و	روک رہے ہیں اسی کا نام منکر کا حکم دینا اور

نہی عن المعروف[1] معروف سے روکنا ہے ۔

ابوحیان اندلسی فرماتے ہیں : ۔

لما کملوا فی انفسھم سعوا فی تکمیل غیرھم بھذین الوصفین[2]	جب وہ اپنی ذات میں مکمل ہو چکے تو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے اوصاف کے ذریعہ انھوں نے دوسروں کی تکمیل کی کوشش کی ۔

حضرت لقمٰن کی نصیحت میں اقامتِ صلوٰۃ کے ساتھ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا ذکر موجود ہے ۔ یہ حقیقت میں تکمیلِ ذات، و تکمیلِ غیر کے دو عنوانات ہیں ۔ علامہ سید محمود آلوسی اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں : ۔

(یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ) تکمیلا لنفسك .... (وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْہَ عَنِ الْمُنْکَرِ) تکمیلا لغیرك و الظاھر انه لیس المراد معروفا و منکرا معینین[3]	"اے میرے بیٹے نماز قائم کرو" اپنی ذات کی تکمیل کے لیے .... "اور معروف کا حکم دو اور منکر سے منع کرو" دوسروں کی تکمیل کے لیے ۔ بظاہر اس سے مراد کوئی متعین معروف و منکر نہیں ہے بلکہ یہ ایک عام حکم ہے

سورۂ توبہ کی ایک آیت اس حقیقت کو اور واضح کرتی ہے جس میں اہلِ ایمان کی صفات بیان کی گئی ہیں : ۔

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰکِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاھُوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰہِ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ○ (التوبۃ : ۔ ۱۱۲)	وہ خدا سے توبہ کرنے والے، اس کی عبادت کرنے والے، اس کی حمد و ثنا کرنے والے، اس کی راہ میں زمین میں گھومنے والے، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، معروف کا حکم دینے والے اور منکر سے روکنے والے اور اللہ کے حدود کی حفاظت کرنے والے ہیں اور تم مومنوں کو خوش خبری دے دو ۔

اس آیت میں جو صفات بیان ہوئی ہیں، ان میں کچھ تو وہ ہیں جن کا تعلق اہلِ ایمان کی اپنی ذات سے ہے اور کچھ وہ ہیں جو دوسروں کے درمیان ان کے کام کو بتاتی ہیں ۔ توبہ، عبادت، خدا کی حمد و ثنا، اس کی راہ میں

---

[1] ارشاد العقل السلیم الی مزایا الکتاب الکریم المعروف بتفسیر ابی السعود، بر حاشیہ تفسیر الکبیر ج ۲ ص ۶۰۵ [2] البحر المحیط ج ۳ ص ۶

[3] روح المعانی جز ۲۱ ص ۸۹

ر، سیاحت اور رکوع وسجدہ ایسی صفات ہیں جن کے اثرات ان کی ذات تک محدود ہیں اور دوسروں کے لیے وہ
پھ کرتے ہیں اسے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے الفاظ میں پیش کیا گیا ہے۔

حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں:۔

ینفعون خلق اللہ ویرشدونہم الیٰ طاعۃ اللہِ بامرہم بالمعروف ونہیہم عن المنکر مع العلم بما ینبغی فعلہ ویجب ترکہ وھو حفظ حدود اللہ فی تحلیلہ وتحریمہ علما وعملا فقاموا بعبادۃ الحق ونصح الخلق ولھٰذا قال وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ لان الایمان یشمل ھذا کلہ والسعادۃ کل السعادۃ لمن اتصف بہ[1]

وہ مخلوق کو فائدہ پہنچاتے ہیں اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے ذریعہ انہیں خدا کی بندگی کی راہ دکھاتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ جانتے ہیں کہ کون سا کام کرنا چاہیے اور کونسا کام نہیں کرنا چاہیے۔ اسی کو حدود اللہ کی حفاظت کہتے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے حلال وحرام کی حدود مقرر کر دیے ہیں علم وعمل دونوں پہلو[ؤں سے] ان کی حفاظت کی جائے پس اس طرح اہل ایما[ن اللہ] کی عبادت اور مخلوق کی خیرخواہی کا فرض انجام دیتے ہیں۔ اسی لیے کہا کہ "مومنوں کو خوش خبری دو" کیونکہ ایمان ان تمام باتوں کو شامل ہے اور سعادت پوری کی پوری اسی کے لیے ہے جو اس سے متصف ہو۔

علامہ سید محمود آلوسی نے اس حقیقت کو صرف ایک جملہ میں ادا کر دیا ہے:۔

کانہ قیل الکاملون فی انفسہم المکملون لغیرہم[2]

گویا آیت میں یہ بات کہی گئی ہے کہ وہ اپنی ذات میں کامل ہوتے ہیں اور دوسری کی تکمیل کرتے ہیں

امام رازی اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ 'امر بالمعروف ونہی عن المنکر' نہ صرف یہ کہ عبادت ہے بلکہ سخت ترین
ادت ہے ۔

کل ماسبق من الصفات عبادات یأتی بہا الانسان لنفسہ ولا تعلق لشیئ منہا بالغیر

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے ذکر سے پہلے جن صفات کا تذکرہ آیا ہے وہ ایسی عبادتیں ہیں جن کو انسان اپنی ذات کے لیے انجام دیتا ہے ان میں سے کسی صفت کا دوسروں

---

[1] تفسیر ابن کثیرؒ ج ۲ ص ۳۹۲۔ [2] روح المعانی جزء ۱۱ ص ۳۲

اما النھی عن المنکر فعبادۃ متعلقۃ	سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن منکر سے روکنا ایسی عبادت
بالغیر...... النھی عن المنکر	ہے جو دوسروں سے متعلق ہے .... منکر سے
اصعب اقسام العبادات[1]	روکنا سخت ترین عبادت ہے ۔

امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں :-

ومن عبادتہ وطاعتہ امرہ	خدائے تعالیٰ کی عبادت اور اس کی اطاعت
الامر بالمعروف والنھی عن المنکر	میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اپنے امکان کی حد تک معروف
بحسب الامکان[2]	کا حکم دیا جائے اور منکر سے روکا جائے ۔

حقیقت یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ امت مسلمہ سے دنیا کی اصلاح کا کام لینا چاہتا ہے۔ اسی کام کو انجام دینے کا نام 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' ہے۔ اس کے دین و ایمان کا تقاضا ہے کہ معروف کا حکم دے اور منکر سے روکے۔ یہ کام اصلاً پیغمبرانہ کام ہے اور امت مسلمہ کو اسی میں پیغمبروں کی نیابت کرنی ہے، اگر وہ اس کام کو چھوڑ دے تو اپنے صحیح مقام پر باقی نہیں رہ سکتی۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں :-

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من	نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص معروف کا
امر بالمعروف ونھی عن المنکر فھو خلیفۃ	حکم دے اور منکر سے روکے وہ خدا کی زمین میں خدا
اللہ فی ارضہ وخلیفۃ رسولہ و	کا نائب ہے خدا کے رسول کا نائب ہے اور خدا کی
خلیفۃ کتابہ[3]	کتاب کا نائب ہے ۔

درۃ بنت ابی لہب فرماتی ہیں ۔

قام رجل الی النبی صلی اللہ علیہ	نبی صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر وعظ فرما رہے تھے
وسلم وھو علی المنبر فقال یا رسول	کہ ایک شخص کھڑا ہوا اور سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول
اللہ ای الناس خیر؟ فقال صلی اللہ	انسانوں میں سب سے بہتر انسان کون ہے؟ آپ نے
علیہ وسلم خیر الناس اقرأھم	فرمایا جو ان میں سب سے زیادہ خدا کی کتاب پڑھے
واتقاھم وأمرھم بالمعروف وانھاھم	جو ان میں سب سے زیادہ متقی ہو اور جو ان میں سب

---

[1] التفسیر الکبیر ج ۴ ص ۵۲۳ ۔ [2] رسالۃ العبودیۃ، صفحہ ۹ ۔ [3] الجامع لاحکام القرآن لابی عبد اللہ القرطبی جلد ۴، صفحہ ۴۷ ۔

عن المنکر وا وصلهم	سے زیادہ معروف کا حکم دے اور منکر سے روکے
للرحم[1]	اور جو سب سے زیادہ رشتوں کو ملائے رکھے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

الاسلام ان تعبد الله لا تشرك	اسلام یہ ہے کہ تم اللہ کی بندگی کرو، اس کے ساتھ
به شيئا وتقيم الصلوٰة وتؤتي الزكوٰة و	کسی چیز کو شریک نہ کرو، نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو،
تصوم رمضان وتحج البيت والامر بالمعروف	رمضان کے روزے رکھو، بیت اللہ کا حج کرو، معروف
والنهي عن المنكر وتسليمك على اهلك	کا حکم دو اور منکر سے روکو اور اپنے گھر والوں کو سلام
فمن انتقص شيئا منهن فهو سهم من	کرو۔ ان میں سے کسی بھی چیز کو جو شخص کم کرتا ہے۔۔
الاسلام يدعه ومن تركهن كلهن	اسلام کا ایک اصول چھوڑتا ہے اور جس
فقد ولى الاسلام ظهره[2]	چیزوں کو چھوڑ دیا تو اس نے اسلام ہی سے

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:۔

ليس منا من لم يرحم صغيرنا	وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جو ہمارے چھوٹوں
ويوقر كبيرنا ويأمر بالمعروف وينه	پر رحم نہ کھائے اور ہمارے بڑوں کی تعظیم نہ کرے۔
عن المنكر[3]	معروف کا حکم نہ دے اور منکر سے منع نہ کرے۔

حضرت حذیفہؓ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

والذي نفسي بيده لتامرنّ	قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان
بالمعروف ولتنهونّ عن المنكر او	ہے تم ضرور معروف کا حکم دو اور منکر سے روکو، ورنہ
ليوشكنّ الله ان يبعث عليكم عذابا	وہ وقت دور نہیں کہ خدائے تعالیٰ تم پر اپنا عذاب
منه ثم تدعونه فلا يستجيب	نازل کردے اس وقت تم اس سے دعا کروگے لیکن
لكم[4]	تمہاری دعا سنی نہیں جائے گی۔

---

[1] مسند احمد جلد ۶ صفحہ ۴۳۲ قال الحافظ المنذری فی الترغیب والترہیب جلد ۳ ص ۹ رواہ ابو الشیخ فی کتاب الثواب والبیہقی فی الزہد الکبیر وغیرہ
[2] رواہ الحاکم ج ۱ ص ۲۱ والمنذری بمعناہ عن البزار فی الترغیب والترہیب ج ۴ ص ۱۱۔ [3] المنذری فی الترغیب والترہیب قال
رواہ احمد والترمذی واللفظ لہ وابن حبان فی صحیحہ ج ۴ ص ۱۲۔ [4] ترمذی، ابواب الفتن، باب ما جاء فی الامر بالمعروف والنہی عن المنکر

حضرت ابوبکرؓ فرماتے ہیں:۔

انا سمعنا النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول ان الناس اذا رأوا الظالم فلم یاخذوا علی یدیہ اوشک ان یعمھم اللہ بعقاب[1]

ہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جب لوگ ظالم کو دیکھیں اور اس کے ہاتھ نہ پکڑ لیں تو کچھ بعید نہیں کہ اللہ ان پر اپنا عذاب عام نازل کرے۔

حضرت جابرؓ فرماتے ہیں:۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اَوحی اللہُ عزّوجلّ اِلیٰ جبرئیل علیہ السّلامُ اَن اقلب مدینۃ کذا وکذا باھلھا فقال یارب اِنّ فیھم عبدک فلانا لم یعصک طرفۃ عین قال فقال اقلبھا علیہ وعلیھم فان وجھہ لم یتمعّر فیّ ساعۃ قطّ[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیلؑ کو وحی کی کہ فلاں شہر کو اس کے باشندوں کے ساتھ الٹ دو۔ اس پر حضرت جبرئیلؑ نے کہا خدایا اس میں تیرا فلاں بندہ بھی تو ہے جس نے ایک لمحہ کے لیے تیری معصیت نہیں کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے حضرت جبرئیل سے کہا اس شہر کو بشمول اس شخص کے اور سارے لوگوں کے الٹ دو کیونکہ (شہر میں نافرمانی ہوتی رہی لیکن) میری نافرمانی پر ایک گھڑی کے لیے بھی اس کا چہرہ سرخ نہیں ہوا۔

سلف سے خلف تک آپ کو کوئی بھی صاحب علم ایسا نہیں ملے گا جس نے ’امر بالمعروف ونہی عن المنکر‘ کو اساسِ دین کی حیثیت سے نہ پیش کیا ہو اور اسے امت مسلمہ کا اہم فرض نہ قرار دیا ہو۔

ضحاک فرماتے ہیں:۔

الامر بالمعروف والنھی عن المنکر فریضۃ من فرائض اللہ کتبھا اللہ علی المومنین[3]

امر بالمعروف ونہی عن المنکر اللہ تعالیٰ کے متعین کردہ فرائض میں سے ایک فرض ہے جسے اللہ نے مومنوں کے لیے لازم کر دیا ہے۔

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں ’امر بالمعروف ونہی عن المنکر‘ کی بحث کا آغاز ان الفاظ میں کیا ہے:۔

---

[1] رواہ ابوداؤد والترمذی وابن ماجہ والنسائی وغیرہ واللفظ لابی داؤد۔ کتاب الملاحم باب الامر والنہی۔ [2] رواہ البیہقی فی شعب الایمان انظر مشکوٰۃ المصابیح کتاب الآداب، باب فی الامر بالمعروف۔ [3] فتح القدیر للشوکانی ج ۲ ص ۳۶۳

الامر بالمعروف والنهي عن المنكر هو
القطب الاعظم في الدين وهو
المهم الذي ابتعث الله له النبيين
اجمعين ولو طوى بساطه و
اهمل علمه وعمله لتعطلت النبوة و
اضمحلت الديانة وعمت الفترة و
فشت الضلالة وشاعت الجهالة
واستشرى الفساد واتسع الخرق
وخربت البلاد وهلك العباد ولم
يشعروا بالهلاك الا يوم التناد
قد كان الذي خفنا ان يكون
فانا لله وانا اليه راجعون اذ قد
اندرس من هذا القطب عمله وعلمه
وانمحق بالكلية حقيقته ورسمه فاستولت
على القلوب مداهنة الخلق وانمحت
عنها مراقبة الخالق واسترسل
الناس في اتباع الهوى والشهوات
استرسال البهائم وعز على بساط الارض
مومن صادق لا تاخذه في الله لومة
لائم فمن سعى في تلافي هذه الفترة
وسد هذه الثلمة اما متكفلا بعملها
او متقلدا لتنفيذها مجددا لهذه السنة
الداثرة ناهضا باعبائها ومتشمرا

امر بالمعروف و نہی عن المنکر دین کا بہت بڑا ستون
ہے۔ یہ وہ مہم ہے جس کے برپا کرنے کے لیے اللہ نے
تمام انبیاء کو بھیجا ہے۔ اگر اس کی بساط لپیٹ کر رکھ دی
جائے، اس کا علم اور اس پر عمل چھوڑ دیا جائے تو
کارِ نبوت معطل ہو جائے گا اور دین کمزور پڑ جائے گا۔
(اس سے) دورِ جہالت عام ہوگا، گمراہی پھیلے گی،
لاعلمی بڑھے گی، فساد گھس پڑے گا، بگاڑ وسیع ہوگا
بستیاں ویران ہوں گی، انسان ہلاک ہوں گے اور
قیامت سے پہلے انہیں اپنی ہلاکت کا احساس تک نہ
ہوگا۔ لیکن افسوس کہ جس کا ہمیں خطرہ تھا وہ اب
واقع ہو چکا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون
کیونکہ دین کی اس بنیاد کا علم و عمل ختم ہو گیا ہے
اور اس کی ظاہری صورت اور حقیقت بالکلیہ مٹ چکی
ہے۔ دلوں پر مخلوق کی (طبعی) غفلت چھا گئی ہے اور
خالق کی یاد دلوں سے مٹ گئی ہے۔ لوگ خواہشات
کی پیروی میں جانوروں کی طرح آزاد چھوڑ دیے گئے ہیں اور
صفحۂ زمین پر کسی ایسے مومن صادق کا وجود دشوار ہو گیا
ہے جسے خدا کے معاملے میں کسی ملامت گر کی ملامت کی
پروا نہ ہو۔ جو شخص اس جہالت کی حالت کو دور کرنے
اور اس تنگنائے کو بند کرنے کی کوشش کرے ــــ خواہ
وہ یہ کام خود انجام دے یا کسی دوسرے کی طرف سے
اس کی تنفیذ کا بار اٹھائے ــــ اس طرح اس مٹتی ہوئی
سنت کی تجدید کرے، اس کارِ عظیم کا بوجھ اٹھائے اور

فی احیائہا کان مستاثراً من	اس کے زندہ کرنے کے لیے کمر کس لے تو خدا کی مخلوق
بین الخلق باحیاء السنۃ افضی	میں اس کا مقام ان لوگوں میں ہوگا جو کسی سنت کو جسے
الزمان الی اماتتہا ومستبدا	زمانے نے مٹا دیا ہو زندہ کرتے ہیں اور اسے خدا کے
بقربۃ تتضاءل درجات القرب	دربار میں ایسی قربت نصیب ہوگی کہ قربت کا کوئی بھی
دون ذروتہا ۔	درجہ اس کی بلندی کو پا نہیں سکتا ۔

اس کے بعد پہلا باب اس صراحت کے ساتھ شروع کرتے ہیں :۔

الباب الاول فی وجوب	پہلا باب اس بیان میں کہ "امر بالمعروف ونہی عن
الامر بالمعروف والنہی عن المنکر و	المنکر" واجب ہے اور اسی میں اس کی فضیلت، اسے
فضیلتہ والمذمۃ فی اہمالہ واضاعتہ	ترک کرنے اور ضائع کرنے کی مذمت کا ذکر بھی ہوگا۔
ویدل علی ذالک بعد اجماع	ان تمام باتوں پر اجماعِ امت اور عقلِ سلیم کے اشارات
الامۃ علیہ واشارات العقول	کے بعد قرآن کی آیتیں، رسول اکرمؐ کی احادیث اور
السلیمۃ الیہ الآیات والاخبار والآثار[1]	آثارِ صحابہ دلالت کرتے ہیں ۔

ابوبکر جصاص فرماتے ہیں :۔

اکد اللہ تعالیٰ فرض الامر بالمعروف	اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کے بہت سے مقامات
والنہی عن المنکر فی مواضع من کتابہ	میں "امر بالمعروف ونہی عن المنکر" کے فرض کو تاکید کے
وبینہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	ساتھ بیان کیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
فی اخبار متواترۃ عنہ فیہ واجمع	نے اپنی متواتر حدیثوں میں پوری تفصیل سے اس کا ذکر
السلف وفقہاء الامصار	کیا ہے۔ اسلافِ امت اور مختلف علاقوں کے فقہاء
علی وجوبہ[2]	اس کے وجوب پر متفق ہیں ۔

علامہ ابن حزمؒ فرماتے ہیں :۔

اتفقت الامۃ کلہا علی وجوب	امت ساری کی ساری اس بات پر متفق ہے کہ
الامر بالمعروف والنہی عن المنکر	"امر بالمعروف ونہی عن المنکر" واجب ہے اور اس میں

---

[1] احیاء علوم الدین ج ۲ ص ۲۶۹ ۔ [2] احکام القرآن جلد ۲ ص ۴۹۲

بلا خلاف من احد منهم[1]

کسی ایک کا بھی اختلاف نہیں ہے۔

امام نووی لکھتے ہیں :۔

قد تطابق علی وجوب الامر بالمعروف والنهی عن المنکر الکتاب والسنة واجماع الامة وهو ایضاً من النصیحة التی هی الدین[2]

"امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے واجب ہونے پر کتاب وسنت اور اجماع امت سب ہی متحد ہیں۔ دین کو خیر خواہی کہا گیا ہے اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر اسی خیر خواہی کا نام ہے۔

امام شوکانی اپنے ایک رسالہ میں لکھتے ہیں :۔

من کان اقدر علی الامر بالمعروف والنهی عن المنکر کان ذنبه اشد وعقوبته اعظم ومعصیته افظع بهذا جاءت حجج الله وقامت براهینه ونطقت به کتبه وابلغته الی عباده رسله .... وکان ذالک من قطعیات الشریعة وضروریات الدین[3]

جو شخص امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی طاقت رکھتا ہو اور یہ فرض انجام نہ دے تو اس کا گناہ بڑا سخت، اس کی سزا بہت بڑی اور اس کی معصیت بہت گھناؤنی ہے۔ (یہ محض دعویٰ نہیں بلکہ) اس پر خدا کی طرف سے دلیلیں آئی ہیں اور اس کے براہین موجود ہیں، یہی بات اس کی کتابیں کہتی ہیں اور یہی پیغام اس کے رسولوں نے بندوں تک پہنچایا ہے۔۔ .... امر بالمعروف ونہی عن المنکر شریعت کا قطعی اصول اور دین کا واضح حکم ہے۔

اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں :۔

وجوبه ثابت بالکتاب والسنة وهو من اعظم واجبات الشریعة واصل عظیم من اصولها ورکن مشید من ارکانها

"امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا واجب ہونا کتاب وسنت سے ثابت ہے۔ یہ شریعت کے واجبات میں بہت بڑا واجب، اس کے اصولوں میں بہت بڑی اصل اور اس کے ارکان میں ایک مضبوط رکن ہے۔

---

[1] الفصل فی الملل والاہواء والنحل جلد ۴ صفحہ ۱۷۱ ۔ [2] شرح مسلم مطبوعہ ہند جلد ۱ صفحہ ۵۱ ۔ [3] مجموعۃ الرسائل المنیریۃ الجزء الثانی (الرسالۃ الاولیٰ الدواء العاجل فی دفع العدو الصائل صفحہ ۴)

وبہ یکمل نظامہا ویرتفع سنامہا[1]

اسی سے شریعت کا نظام مکمل ہوتا ہے اور اس کی چوٹی اونچی ہوتی ہے۔

معروف کا حکم دینا اور منکر سے روکنا امت مسلمہ کا فرض ہے۔ جو حکومت صحیح معنی میں اسلامی حکومت ہوگی وہ پوری طرح نگہداشت کرے گی کہ امت اس فرض سے غافل نہ ہونے پائے۔ امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر شریعت کا واضح ترین اور متواتر حکم ہے۔ اگر امت کا کوئی طبقہ اسے ترک کر دے تو اسلامی حکومت اس کے خلاف جنگ کرے گی۔

کل طائفۃ خرجت عن شریعۃ من شرائع الاسلام الظاہرۃ المتواترۃ فانہ یجب قتالہا باتفاق ائمۃ المسلمین وان تکلمت بالشہادتین فاذا اقروا بالشہادتین وامتنعوا عن الصلوات الخمس وجب قتالہم حتی یصلوا .... وکذالک ان امتنعوا عن الامر بالمعروف والنہی عن المنکر وجہاد الکفار الی ان یسلموا او یؤدوا الجزیۃ عن ید وہم صاغرون[2]

جو گروہ اسلامی شریعت کے کسی بھی واضح اور متواتر حکم سے خروج کر دے تو مسلمانوں کے تمام ائمہ کا اتفاق ہے کہ اس سے جنگ کی جائے گی مثال کے طور پر توحید و رسالت کے اقرار کے ساتھ اگر وہ پانچ وقت کی نماز چھوڑ دے تو اس سے جنگ ضروری ہے تاآنکہ وہ نماز پڑھنے لگے .... اسی طرح اگر وہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر، اور کفار سے اس شرط پر جہاد ترک کر دے کہ وہ یا تو اسلام لائیں یا چھوٹے بن کر اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا کریں، تو اس سے جنگ کی جائے گی۔

قرآن وحدیث میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو دین کے ایک اہم فرض کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اور آج تک کسی بھی صاحب علم نے اس کی اس حیثیت کا انکار نہیں کیا ہے۔ اگر ہم اپنے اندر خدا کے دین کو صحیح حالت میں دیکھنا چاہتے ہیں اور دنیا میں اسے غالب و سربلند کرنے کے آرزومند ہیں تو اس کی صورت سوائے اس کے کچھ نہیں ہے کہ معروف کا حکم دیں اور منکر سے روکیں۔ خدائے تعالیٰ کا ہم سے یہی مطالبہ ہے اور یہی اس کے پیغمبروں کا راستہ ہے۔ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا۔

---

[1] فتح القدیر جلد ۱ صفحہ ۲۳۷۔ [2] مجموعہ فتاویٰ ابن تیمیہ جلد ۴ صفحہ ۲۸۱

ڈاڑھی کی مقدار کا مسئلہ

امید ہے کہ جناب بخیریت ہوں گے۔ ایک دو پرچے زندگی کے اس جگہ لکھتے ہیں جو بندہ کے لیے جناب کے تعارف کا ذریعہ ہیں ڈاڑھی کے مسئلہ کی تحقیق کے لیے جناب سے التماس کر رہا ہوں، امید ہے کہ توجہ فرما کر شکریے کا موقع عنایت فرمائیں گے۔ آج تک دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث حضرات، ہر طبقہ کے بزرگوں سے یہی سنا گیا ہے کہ داڑھی رکھنا بہت اہم ہے، سنت مؤکدہ اور واجب کا درجہ ہے بلکہ اب تو ایک شعار کی حیثیت رکھتی ہے اور داڑھی کی مقدار جو مسنون ہے وہ ایک قبضہ سے زائد ہے۔ قبضہ سے کم جائز نہیں ہے، کم از کم ایک قبضہ ہونی چاہیے۔ صاحب درمختار اور شیخ ابن ہمام اس پر اجماع کا دعویٰ کرتے ہیں بلکہ یہ بھی سنا گیا ہے کہ شیخ ابن ہمام نے تحریر فرمایا ہے کہ ایک قبضہ سے کم داڑھی مخنثوں کا طریقہ ہے برخلاف اس کے جماعت اسلامی کے رفیق داڑھی کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ بڑے بڑے سرگرم ارکان کے لیے داڑھی رکھنا بڑا ہی بوجھ ہے بالکل ذرا ذرا سی داڑھی وہ بھی بڑے مجبور ہو کر، امراء تک کا یہ حال ہے کہ اگر کہا جائے تو فرماتے ہیں کہ داڑھی کی کوئی خاص مقدار متعین نہیں ہے جتنی کسی نے داڑھی رکھ لی، وہی مسنون ہے۔ اس سلسلے میں ترجمان القرآن دسمبر کا تازہ پرچہ جناب نے ملاحظہ فرمایا ہوگا داڑھی کے متعلق جناب غلام علی صاحب کا مضمون ہے انھوں نے اجماع وغیرہ کو غلط قرار دیا ہے۔ جناب سے گزارش ہے کہ اس مسئلہ میں رہنمائی فرمائیں۔

اوپر کی سطریں ایک خط کا اقتباس ہے جو مغربی پاکستان سے راقم الحروف کے نام آیا ہے۔ جن صاحب کا یہ اقتباس ہے ان کا ایک دوسرا خط بھی آیا ہے جس میں انھوں نے اپنے اس احساس کا اظہار کیا ہے کہ خود اپنی تمام عظمتوں کے باوجود داڑھی کو اہمیت نہیں دیتے اور انہیں کا اثر پوری جماعت اسلامی پر ہے، اپنے بارے میں لکھا ہے کہ وہ جماعت اسلامی کے عقیدتمندوں اور اس کے حلقہ متفقین سے متعلق ہیں ——

علماء وعوام کی ایک بھیڑ تو وہ ہے جو اصلاً کچھ دوسرے وجوہ سے مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کی مخالفت کرتی ہے لیکن وہ لوگ اصل وجوہ مخفی رکھتے اور داڑھی اور اس طرح کی دوسری چیزوں کو آڑ بنا کر حملہ آور ہوتے ہیں۔ اگر اس گروہ کے کسی فرد کا خط آتا تو میں اسے پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیتا، لیکن بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو جماعت اسلامی سے اتفاق رکھتے اور سنجیدگی سے اس مسئلے کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ مکتوب نگار بھی اسی سنجیدہ گروہ میں داخل ہیں۔ ان کے خط میں ایک بات غلط فہمی پر مبنی ہے اس لیے راقم الحروف پہلے اسی کا ازالہ مناسب سمجھتا ہے۔ یہ بات جو انھوں نے لکھی ہے کہ جماعت اسلامی کے رفقاء یا خود مولانا مودودی داڑھی کو کوئی اہمیت نہیں دیتے، بالکل خلاف واقعہ ہے۔ مولانا مودودی مدظلہ نے اب تک اس مسئلے پر جو کچھ لکھا ہے اس کا مقصد یہ بالکل نہیں ہے کہ داڑھی رکھنے کی کوئی اہمیت نہیں ہے بلکہ اس کے برخلاف اس کی اہمیت کے سلسلے میں ان کی بعض تحریریں بڑی ایمان افروز ہیں۔ معلوم نہیں مکتوب نگار نے رسائل ومسائل حصہ اول میں مولانا کی تمام تحریریں پڑھی ہیں یا نہیں۔ اس کتاب میں "داڑھی کے متعلق ایک سوال" کے عنوان سے جو سوال وجواب درج ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ مکتوب نگار اسے ضرور پڑھ لیں اور اگر پڑھ چکے ہوں تو دوبارہ پڑھ لیں۔ مولانا کی اس تحریر کو پڑھ کر کوئی منصف مزاج یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ داڑھی کو غیر اہم سی چیز سمجھتے ہیں۔ ان کی جن تحریروں سے یہ شبہہ ہوتا ہے کہ وہ اس کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے وہ ان علماء ومشائخ کے مقابلے میں لکھی گئی ہیں جنھوں نے داڑھی کے طول وعرض کو پورے دین کے طول وعرض کا پیمانہ سمجھ رکھا ہے۔ اس مسئلے میں ان کی جو انفرادی رائے ہے وہ یہ ہے کہ شرعاً اس کی کوئی مقدار متعین نہیں ہے اس لیے کم از کم ایک قبضے کی مقدار کو سنت مؤکدہ یا واجب کہنا صحیح نہیں ہے۔ اور جہاں تک مجھے معلوم ہے جماعت اسلامی کا کوئی رکن ایسا نہیں ہے جو داڑھی رکھنے ہی کو غیر اہم سمجھتا ہو۔ مکتوب نگار نے اس بات کی طرف بھی توجہ نہیں کی کہ اگر مولانا مودودی کے نزدیک داڑھی رکھنا غیر اہم ہوتا تو پھر ان سے متاثر ارکان کو ذرا ذرا سی داڑھی رکھنے پر بھی کون سی چیز مجبور کرتی اور سیکڑوں جدید تعلیم یافتہ لوگ جو پہلے داڑھیاں منڈواتے تھے، اب داڑھیاں کیوں رکھنے لگے۔ یہ میں بھی تسلیم کرتا ہوں کہ مقدار کے مسئلے میں بہت سے ارکان مولانا کی رائے سے متاثر ہیں، لیکن یہ سمجھنا کہ اس مسئلے میں تمام ارکان ان کی رائے سے اتفاق رکھتے ہیں، صحیح نہیں ہے۔ پاکستان کا حال تو مجھے نہیں معلوم لیکن جماعت اسلامی ہند جو اب ایک مستقل بالذات تنظیم ہے اس کے متعدد ارکان مولانا کی تحریریں پڑھنے کے باوجود ان کی رائے سے اتفاق نہیں رکھتے۔ راقم الحروف کو بھی مولانا کی اس رائے سے اختلاف ہے۔ مکتوب نگار چونکہ سنجیدگی کے ساتھ اس مسئلے پر غور کرنا چاہتے ہیں اس لیے

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں اس مسئلے میں اپنی رائے تفصیل سے عرض کروں۔ اس مسئلے پر غور کرنے کے لیے ذیل میں چند نکات درج کیے جا رہے ہیں انہیں کے تحت اظہار خیال ہوگا۔

۱۔ اعفاء لحیہ کا حکم کیوں دیا گیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کا منشا کیا ہے؟

۲۔ اعفاء کے معنی کیا ہیں اور اس کے ہم معنی دوسرے کون سے الفاظ مروی ہیں؟

۳۔ مقدار لحیہ کے مسئلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

۴۔ اعفوا اللحی کا حکم اپنے عموم پر ہے یا اس میں تخصیص بھی ہوئی ہے

۵۔ کیا تخصیص کے قائل فقہاء میں سے کوئی فقیہ ایک مشت سے کم مقدار کو بھی مباح قرار دیتا ہے؟

۶۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مدظلہ کی رائے پر اظہار خیال۔

---

(۱) لحیہ اور مقدار لحیہ کے مسئلے پر غور کرتے وقت یہ بات سامنے آتی ہے کہ جس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اعفاء لحیہ کا حکم دیا اس وقت آپ خود ڈاڑھی رکھتے تھے، تمام صحابہ کرام ڈاڑھی رکھتے تھے۔ پورے جزیرۃ العرب کے باشندے داڑھی رکھتے تھے، بلکہ عرب کے قریبی ممالک میں بھی ڈاڑھی مونڈنے کا رواج نہ تھا۔ تمام کے تمام لوگ اس کو مرد اور عورت کے چہروں کے درمیان مابہ الامتیاز سمجھتے تھے اور مردانگی و مردانہ حسن کی علامت قرار دیتے تھے طبعی طور پر کسی کے چہرے پر ڈاڑھی نہ نکلنے یا بالقصد اسے مونڈ دینے کو عیب سمجھا جاتا تھا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک ایسے ماحول میں ڈاڑھی بڑھانے کا حکم کیوں دیا گیا اور اس کا منشا کیا ہے؟

اس سوال کا جواب ایک حدیث دیتی ہے جو لحیہ اور مقدار لحیہ دونوں ہی کی شرعی حیثیت جاننے کے لیے ایک بنیادی اور اہم حدیث ہے۔

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ جُزُّوا الشَّوَارِبَ وَاَرْخُوا اللُّحٰی خَالِفُوا الْمَجُوْسَ (مسلم شریف)	حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مونچھیں کاٹو اور ڈاڑھیاں لمبی کرو (اور اس طرح) مجوس کی مخالفت کرو۔

یہی حدیث حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے ان الفاظ میں مروی ہے:۔

عَنْ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ خَالِفُوا الْمُشْرِکِیْنَ وَفِّرُوْا	حضرت عبداللہ بن عمرؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں آپ نے فرمایا مشرکین کی

اللحیٰ وَاحفوا الشوارب — مخالفت کرو، ڈاڑھیاں خوب بڑھاؤ اور مونچھوں کے بال کاٹ کر کم کرو۔
بخاری شریف کتاب اللباس

اس حدیث میں مشرکین کا لفظ مجوس ہی کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ علامہ عینی لکھتے ہیں:۔

خَالِفُوا المُشْرِكِينَ اَرَادَ بِهِمِ المَجُوسَ يَدُلُّ عَلَيْهِ رِوَايَةُ المسلم خالفوا المجوس — مشرکین سے مراد مجوس ہیں اس بات پر مسلم کی روایت خالفوا المجوس دلیل ہے

اس حدیث سے وہ وجہ معلوم ہو گئی جس کی بنا پر اعفاء لحیہ کا حکم دیا گیا۔ عرب کے پڑوسی ممالک میں سب سے پہلے فارس کے مجوسیوں نے اس سرمایۂ حسن — ڈاڑھی — پر حملہ کیا، چونکہ اس وقت تک ڈاڑھی مونڈنے کو عیب شمار کیا جاتا تھا اس لیے مجوسیوں نے اپنے اندر یکایک ڈاڑھیاں مونڈنے کی ہمت نہ پائی اور ابتداءً وہ اپنی ڈاڑھیاں چھوٹی کرنے لگے اور رفتہ رفتہ ان میں کچھ لوگ اپنی ڈاڑھیاں مونڈنے بھی لگے۔ عین ممکن ہے کہ مجوسیوں سے متاثر ہو کر جزیرۃ العرب کے کچھ مشرکین بھی ڈاڑھیاں چھوٹی کرانے یا مونڈنے لگے ہوں اگرچہ اس وقت مسلمان ڈاڑھی رکھ رہے تھے لیکن ان پر اس کی دینی و شرعی حیثیت واضح نہ تھی، خطرہ تھا کہ کہیں آگے چل کر ان میں کچھ لوگ مجوسی تہذیب سے متاثر نہ ہو جائیں۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حکم سے اس کی شرعی حیثیت واضح فرما دی اور مسلمانوں کو حکم دیا کہ اس معاملہ میں مجوس کی مخالفت کرنا تم پر لازم ہے۔ ڈاڑھی کا معاملہ محض رواج اور عادت سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ یہ اسلامی معاشرے کا ایک شعار اور اسلامی تہذیب کا ایک نشان ہے۔

یہ بات تمام محدثین لکھتے ہیں کہ اس وقت مجوسی عام طور پر داڑھیاں مونڈتے نہ تھے بلکہ چھوٹی کراتے تھے۔

ابو شامہ کے وقت میں جب کچھ لوگوں نے ڈاڑھیاں مونڈیں تو انھوں نے بڑے رنج و غم کے ساتھ کہا:۔

اب کچھ لوگ ایسے پیدا ہو رہے ہیں جو اپنی ڈاڑھیاں منڈوا دیتے ہیں۔ یہ فعل اس سے بھی زیادہ شدید ہے جو مجوسیوں کے بارے میں منقول ہے کیونکہ وہ اپنی ڈاڑھیاں چھوٹی کراتے تھے۔ (فتح الباری، جلد ۱۰)

امام نووی لکھتے ہیں:۔

وکان من عادۃ الفرس قص اللحیۃ فنھی الشرع عن ذالك (شرح مسلم) — فارسیوں (مجوسیوں) کی عادت تھی کہ وہ ڈاڑھی کے بال کاٹ کر کم کرتے تھے لہٰذا شریعت نے اس سے منع کیا۔

ان میں کچھ لوگ اپنی ڈاڑھیاں منڈوانے بھی لگے تھے جیسا کہ علامہ عینی نے لکھا ہے:۔

لانہم کانوا یقصرون لحاہم — اس لیے کہ وہ لوگ اپنی داڑھیاں چھوٹی کراتے
ومنہم من کان یحلقہا — تھے اور ان میں کچھ لوگ مونڈ ڈالتے تھے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اس حدیث نے اعفاء لحیہ کے حکم کی علت کے ساتھ یہ واضح اشارہ بھی دیا ہے کہ داڑھی کی مقدار کتنی ہونی چاہیے اور اعفاء لحیہ کے حکم کا منشا کب پورا ہوگا۔ مجوسی جب اپنی ڈاڑھیاں چھوٹی کراتے تھے اور مسلمانوں کو ان کی مخالفت کا حکم دیا گیا تو اتنی بات تو معلوم ہی ہوگئی کہ ان کی ڈاڑھیاں مجوسیوں کی داڑھیوں سے لمبی ہونی چاہییں لیکن بات پھر بھی مجمل ہے اس اجمال کی تبیین نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے عمل سے ہوئی۔ آگے اس کی تفصیل آ رہی ہے۔ ابھی قولِ رسول کی تفصیل جان لینی چاہیے۔

(۲) ڈاڑھی بڑھانے کے حکم میں جو الفاظ احادیث میں مروی ہیں ان سے بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا ظاہر ہوتا ہے۔ احادیث میں پانچ الفاظ ملتے ہیں۔ اعفاء۔ ایفاء۔ ارجاء۔ ارخاء۔ توفیر۔ کسی حدیث میں اعفوا ہے کسی میں اوفوا، کہیں ارجوا کسی میں ارخوا اور کہیں وفروا۔

ان سب الفاظ کے بارے میں نووی لکھتے ہیں:۔ ومعناها كلها تركها على حالها (اور ان سب الفاظ کے معنی یہ ہیں:۔ کہ ڈاڑھی کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے۔)

حافظ ابن حجر وفروا کے معنی بیان کرتے ہیں اترکوها وافرة (ڈاڑھی چھوڑو بایں حال کہ وہ وافر ہو) اوفوا کے معنی بیان کرتے ہیں اترکوها وافية (اسے چھوڑ دو بایں حال کہ وہ پوری ہو) ارخوا کے معنی بتاتے ہیں اطیلوها (ڈاڑھی لمبی کرو) اعفاء کے معنی امام بخاری اور دوسرے محدثین نے تکثیر کے بیان کیے ہیں۔ اس سلسلے میں ابن دقیق العید کہتے ہیں:۔

تفسير الاعفاء بالتكثير من — اعفاء کی تفسیر تکثیر سے کرنا اس اصول کے تحت
اقامة السبب مقام المسبب لان حقيقة — ہے کہ سبب کو مسبب کی جگہ پر رکھا گیا ہے کیونکہ اعفاء
الاعفاء الترك وترك التعرض للحية — کی حقیقت ترک کرنا ہے اور جب داڑھی سے
يستلزم تكثيرها (فتح الباری ج ۱۰) — تعرض ترک کیا جائے گا تو لازماً اس میں تکثیر ہوگی۔

یہ تمام الفاظ اور ان کی تشریحات صاف بتا رہی ہیں کہ حدیث کا منشا محض ڈاڑھی رکھ لینا نہیں ہے بلکہ اس کو بڑھانا اور لمبا کرنا ہے۔

(۳) اب آیئے اس پر غور کریں کہ مقدار لحیہ کے مسئلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کی شرعی حیثیت کیا ہے

علمائے اصول نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال کی متعدد قسمیں بیان کی ہیں اور تفصیل سے ان پر لکھا ہے ویسے اجمالی طور پر آپ کے افعال کی دو قسمیں بنتی ہیں ایک وہ افعال جن کا قربت وعبادت سے تعلق نہیں بلکہ وہ عادت وجبلت سے متعلق ہیں جیسے کھانا پینا، بیٹھنا، اٹھنا، پہننا اوڑھنا، ایسے افعال کا شرعی حکم اباحت ہے یعنی ان سے کسی چیز کا مباح ہونا ثابت ہوتا ہے۔ دوسری قسم کے افعال وہ ہیں جن کا تعلق عادت وجبلت سے نہیں بلکہ قربت وعبادت سے ہے۔ اس قسم کے افعال کی متعدد قسمیں ہیں ان میں ایک قسم وہ ہے جس کا مسئلہ زیر بحث سے براہ راست تعلق ہے۔ یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ افعال جو کتاب اللہ میں مذکور احکام یا خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اوامر کی تبیین کرتے ہیں۔ اس قسم کے افعال کا حکم وہی ہوتا ہے جو ان احکام اور اوامر کا جن کی تبیین ان افعال سے ہوئی ہے۔ ان افعال کی حیثیت بیان کی ہوتی ہے۔ اگر مُبَیَّن (وہ امر جس کی تبیین وتوضیح کی گئی) واجب ہو تو بیان (وہ فعل جس سے توضیح وتبیین ہوئی) بھی واجب ہوگا اور اگر وہ مندوب ہو تو فعل بھی مندوب ہوگا۔ یہ بات بھی مسلمہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے بیان کے تمام انواع واقسام ثابت ہوتے ہیں، اس سے مجمل کی توضیح بھی ہوتی ہے۔ عموم کی تخصیص بھی ہوتی ہے، ظاہر کی تاویل بھی ہوتی ہے اور کسی امر سابق کا نسخ بھی ثابت ہوتا ہے۔

اس متفقہ ومسلمہ اصول شرعی کو مسئلہ زیر بحث پر منطبق کیجیے۔ یہ بات ہر شبہے سے بالاتر ہے کہ اعفوا اللحی (داڑھی کو بڑھنے کے لیے چھوڑ دو) کے حکم کی تبیین حضور کے عمل نے کی ہے اور آپ کے فعل وعمل کو اس حکم کے بیان کی حیثیت حاصل ہے۔ اب اگر اعفاء لحیہ کا حکم واجب ہے تو حضور کا فعل بھی واجب ہوگا اور اگر مندوب ہے تو فعل بھی مندوب ہوگا۔ تمام علمائے حق اس بات پر متفق ہیں کہ اعفائے لحیہ سنت مؤکدہ ہے اور داڑھی اسلامی شعار میں داخل ہے۔

احادیث: سیر میں ریش مبارک کے بارے میں جو تفصیل ملتی ہے اس سے یہ بات بالیقین معلوم ہوتی ہے کہ اس کی مقدار ایک مشت سے زیادہ تھی، کم ہرگز نہ تھی۔ کسی روایت میں آتا ہے کہ آپ کثیر شعر اللحیۃ تھے۔ یعنی آپ کی ریش مبارک میں بال بہت تھے۔ کسی روایت میں کہا گیا ہے کہ آپ کث اللحیۃ تھے۔ یعنی آپ کی ریش مبارک گھنی تھی۔ اور کسی روایت میں ہے کہ آپ کی گھنی داڑھی آپ کے منور سینے کو بھرے ہوئے تھی اور کسی روایت میں آپ کو عظیم اللحیۃ کہا گیا ہے یعنی آپ کی داڑھی بڑی تھی۔ یہی بات سیرۃ وسوانح کی کتابوں میں خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کی داڑھیوں کے بارے میں بھی ملتی ہے۔ مدارج النبوۃ میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں:-

لحیۃ امیر المومنین علی بری کرد سینہ را دبچنیں	امیر المومنین علیؓ کی ڈاڑھی ان کے سینہ کو بھر دیتی
لحیۃ امیر المومنین عمر و عثمان رضی اللہ تعالیٰ	تھی۔ اسی طرح امیر المومنین عمر و عثمان رضی اللہ عنہما کی
عنہم اجمعین۔	ڈاڑھیاں ان کے سینوں کو بھر دیتی تھیں

حضرت عمر کے بارے میں کہا گیا ہے:۔ کان کث اللحیۃ (استیعاب) حضرت عثمان کے بارے میں ہے کان عظیم اللحیۃ (اصابہ)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کی عملی توضیح مقدار لحیہ کے بارے میں یہ تھی کہ اتنی وافر ہو کہ اس پر عظیم و کثیر کا لفظ صادق آسکے۔

(۴) اعفوا اللحی کا حکم اپنے عموم پر ہے یا اس میں تخصیص بھی ہوئی ہے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ فقہاء کی ایک جماعت اس حکم کو عام رکھتی ہے اور اس میں تخصیص کی قائل نہیں ہے۔

طبری نے کہا ہے کہ فقہاء کی ایک جماعت ظاہر حدیث کی طرف گئی ہے اور اس کے نزدیک ڈاڑھی کے طول و عرض سے کچھ حصہ کٹوانا بھی مکروہ ہے۔ (فتح الباری جلد ۱۰)

امام نووی نے شرح مسلم میں دو جگہ اس پر گفتگو کی ہے ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

ھذا ھو الظاھر من الحدیث الذی	حدیث سے یہی ظاہر ہے اور یہی اس کے الفاظ کا
تقتضیہ الفاظہ وھو الذی قالہ جماعۃ	اقتضا ہے اور یہی ہمارے اصحاب کی ایک جماعت
من اصحابنا وغیرھم من العلماء	اور دوسرے علماء کا قول ہے۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

والمختار ترک اللحیۃ علی حالھا	مختار قول یہ ہے کہ ڈاڑھی کو اس کے حال پر
وان لا یتعرض لھا بتقصیر شیئ اصلا	چھوڑ دیا جائے اور اس میں سے کچھ بھی کم نہ کیا جائے

صاحب تحفۃ الاحوذی تخصیص کے قائلین کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

فاسلم الاقوال ھو قول من قال بظاھر	ان لوگوں کا قول محفوظ ترین قول ہے جو احادیث
احادیث الاعفاء وکرہ ان یوخذ	اعفاء کے ظاہر کی وجہ سے ڈاڑھی کے طول و عرض میں
شیئ من طول اللحیۃ وعرضھا	سے کچھ حصہ کٹوانے کو بھی مکروہ کہتے ہیں۔

علامہ شوکانی کا مسلک بھی وہی ہے جو امام نووی کا ہے وہ بھی حدیث کے عموم کے قائل ہیں وہ حضرت ابن عمر کے عمل کو مخصص نہیں مانتے اور نہ عمرو بن شعیب کی حدیث کو قابل احتجاج سمجھتے ہیں۔ (نیل ج ۱ ص ۱۴۲)

اس جماعت کی دلیل یہ ہے کہ حدیث کے عموم کو خاص کرنے والی کوئی چیز نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے ثابت ہے اور نہ فعل سے، قولی حدیث تو موجود ہی نہیں ہے اور فعلی حدیث ضعیف ہے

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ تخصیص کا قول اس درجہ ثابت شدہ نہیں ہے کہ تمام فقہاء اس پر متفق ہو گئے ہوں بلکہ فقہاء کی ایک جماعت جس میں نووی جیسے اساطین علم داخل ہیں تخصیص کا انکار کرتی ہے۔

فقہاء کی دوسری جماعت حدیث کو عام نہیں رکھتی بلکہ اس حکم میں تخصیص کی قائل ہے تخصیص کے قائلین متعدد جماعتوں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔ حافظ ابن حجر امام طبری کے حوالے سے لکھتے ہیں:-

اور ایک جماعت کا قول یہ ہے کہ ڈاڑھی جب ایک مشت سے زیادہ ہو جائے تو زائد حصے کو کٹوا دیا جائے اس رائے کے لیے طبری نے اپنی سند سے تین حدیثیں پیش کی ہیں۔ ۱۔ عبداللہ ابن عمر نے ایسا کیا ہے ۲۔ حضرت عمر نے ایک شخص کے ساتھ یہ معاملہ کیا کہ اس کی ایک مشت سے زائد ڈاڑھی کو کٹوا دیا۔ ۳۔ حضرت ابو ہریرہ نے بھی ایسا کیا ہے۔ اس کے علاوہ ابو داؤد نے سند حسن کے ساتھ حضرت جابر کی یہ حدیث روایت کی ہے:- وہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ ڈاڑھی کو اپنے حال پر چھوڑے رکھتے تھے الا یہ کہ حج یا عمرہ کے موقع پر اس کا کچھ حصہ ترشوا دیتے تھے۔

حضرت جابر کی حدیث سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام صرف حج یا عمرے کے موقع پر اپنی ڈاڑھیاں کچھ چھوٹی کراتے تھے پھر طبری نے اس اختلاف کا ذکر کیا ہے کہ ڈاڑھی کے بال کٹوانے کی کوئی حد ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں انھوں نے تین مسلکوں کا ذکر کیا ہے۔ ۱۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ ایک مشت سے زیادہ جو بال بڑھ جائیں صرف انہیں کو کٹوایا جائے۔ ۲۔ حسن بصری کا قول یہ ہے کہ ڈاڑھی طول و عرض سے اس حد تک کٹوائی جائے کہ قطع و برید بہت نہ بڑھ جائے اور عطاء نے بھی اسی طرح کی بات کہی ہے۔ ڈاڑھی کٹوانے کی ممانعت کو ان لوگوں نے اس بات پر محمول کیا ہے کہ جس مقدار میں عجمی لوگ کٹواتے اور اسے ہلکی کر دیتے ہیں اس مقدار میں اسے نہ کٹوایا جائے ——

۳۔ ایک جماعت کے نزدیک حج یا عمرے کے علاوہ کسی وقت بھی ڈاڑھی کے بال کٹوانا ناپسندیدہ اور مکروہ فعل ہے امام طبری نے خود حضرت عطاء کے قول کو اختیار کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنی ڈاڑھی کو بڑھنے کے لیے چھوڑ دے اور اس سے مطلق تعرض نہ کرے یہاں تک کہ اس کا طول و عرض فاحش (بہت زیادہ) ہو جائے تو وہ اپنے آپ کو لوگوں کے تمسخر کا ہدف بنائے گا طبری نے اس مسئلے میں عمرو بن شعیب کی اس حدیث سے استدلال کیا

ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ریشِ مبارک کے طول و عرض سے کچھ بال کٹوا دیتے تھے ۔ یہ حدیث ترمذی نے نقل کی ہے لیکن بخاری نے کہا ہے کہ یہ حدیث مُنکَر ہے اس لیے کہ اس حدیث کے ایک راوی عمر بن ہارون ہیں اور ان کو محدثین کی ایک جماعت نے ضعیف قرار دیا ہے ۔ قاضی عیاض کہتے ہیں کہ ڈاڑھی کو مونڈنا، کٹوانا اور کم کرانا ناجائز ہے، ہاں اگر طول و عرض بہت بڑھ جائے تو اطراف سے کچھ حصہ کٹوا دینا چاہیے بلکہ جس طرح تقصیر (بہت چھوٹا کرانا) مکروہ ہے اسی طرح تعظیم (بہت بڑھا دینا) بھی مکروہ ہے لیکن نووی نے قاضی عیاض کی یہ بات رد کر دی ہے اور کہا ہے کہ یہ قول ظاہر حدیث کے خلاف ہے اس لیے کہ حدیث میں توفیر لحیہ (ڈاڑھی بڑھانے) کا حکم ہے۔ مختار مسلک یہ ہے کہ ڈاڑھی کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور اس سے کوئی تعرض نہ کیا جائے نووی کی مراد یہ ہے کہ حج یا عمرے کے علاوہ، دوسرے اوقات میں تعرض نہ کیا جائے اس لیے کہ امام شافعیؒ نے حج یا عمرے میں داڑھی کے کچھ بال کٹانے کو مستحب کہا ہے ۔

(فتح الباری جلد ۱۰ باب تقلیم الاظفار)

میں نے فتح الباری کا یہ لمبا حوالہ یہاں اس لیے دیا ہے کہ اس میں تخصیص کے قائلین کے تمام اقوال اور ان کے مشہور دلائل سمیٹ لیے گئے ہیں ۔ ان اقوال میں سب سے پہلے میں حسن بصری و عطاء رحمہما اللہ کے قول کی توضیح کرنا چاہتا ہوں ۔ اسی قول کو امام طبری نے بھی اختیار کیا ہے بعض لوگوں نے یاخذ من طولھا وعرضھا مالم یفحش کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ ڈاڑھی ایک مشت سے بھی کم کی جا سکتی ہے ۔ راقم الحروف کے نزدیک اس قول کا یہ مطلب نکالنا صحیح نہیں ہے ۔ اس کی دو بڑی وجہیں ہیں ایک یہ کہ امام طبری نے خود اس مسلک کو واضح کر دیا ہے ۔ انھوں نے اس مسلک کو اختیار کرنے کے لیے دو دلیلیں دی ہیں ۔ ایک دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی ڈاڑھی سے بالکل تعرض نہ کرے اور بڑھنے کے لیے چھوڑ دے تو اس کا طول و عرض بہت بڑھ جائے گا اور چہرہ مضحکہ انگیز بن جائے گا ۔ معلوم ہوا کہ حسن بصری و عطاء کے قول کا مطلب بھی یہی ہے کہ ڈاڑھی کو اس قدر نہ بڑھنے دیا جائے کہ وہ لوگوں کے تمسخر کا سبب بن جائے ۔ ظاہر ہے کہ طول و عرض ایک مشت سے بڑھ کر ہی سبب تمسخر بن سکتا ہے نہ کہ ایک مشت کی صورت میں ۔ دوسری دلیل طبری نے ترمذی کی حدیث سے پیش کی ہے وہ اس بات کے لیے اور زیادہ مضبوط دلیل ہے کہ ان کے قول کا مطلب ایک مشت سے کم کا جواز نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ریش مبارک ہرگز اتنی کم نہیں کراتے تھے کہ وہ ایک مشت سے بھی کم رہ جائے ۔ دوسری بڑی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ ان کے قول کا مطلب اگر یہ لیا جائے کہ داڑھی ایک مشت سے کم رکھی جا سکتی ہے تو پھر یہ قول خالفوا المجوس

کے صریح حکم کے خلاف ہوگا۔ اس کے علاوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کی عملی توضیح کے خلاف بھی ہوگا بقدر یکمشت والے قول سے حضرت عطاء کے قول کا اختلاف اس جہت سے نہیں ہے کہ ان کے نزدیک ڈاڑھی یکمشت سے کم بھی کی جاسکتی ہے بلکہ اس کے برعکس وہ ڈاڑھی کے طول کو ایک مشت تک محدود کرنے کو صحیح نہیں سمجھتے۔ ان کی رائے یہ ہے کہ وہ ایک مشت سے بھی زیادہ رکھی جاسکتی ہے شرط یہ ہے کہ اتنی نہ بڑھادی جائے کہ سبب مضحکہ بن جائے۔ صاحب تحفۃ الاحوذی نے بھی حسن بصری وعطاء کے قول کا مطلب یہی سمجھا ہے وہ لکھتے ہیں:۔

قلت لو ثبت حديث عمرو بن شعيب لكان قول الحسن وعطاء أحسن الأقوال وأعدلها لكنه حديث ضعيف لا يصلح للاحتجاج به (تحفة الاحوذی)	میں کہتا ہوں کہ اگر عمرو بن شعیب کی حدیث ثابت ہوتی تو حسن وعطا کا قول سب سے زیادہ بہتر اور معتدل قول ہوتا لیکن وہ حدیث ضعیف ہے اور اس سے احتجاج درست نہیں۔

اس سے بھی معلوم ہوا کہ حسن بصری وعطاء کے قول کا ماخذ عمرو بن شعیب کی حدیث ہے۔ اگر ان کے قول کا مطلب یہ ہوتا کہ ڈاڑھی ایک مٹھی سے بھی کم رکھی جاسکتی ہے تو صاحب تحفہ کبھی اس کو احسن الاقوال نہ کہتے۔ جہاں تک میرا مطالعہ ہے کسی فقیہ نے بھی حسن بصری وعطاء کے قول کو ایک مٹھی سے کم مقدار کو جائز قرار دینے کے لیے بطور دلیل پیش نہیں کیا ہے اور نہ ان کے قول کی یہ توضیح کی ہے۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس کی ایک دلیل قاضی عیاض کی وہ عبارت بھی ہے جس میں انھوں نے مذاہب سلف بیان کیے ہیں۔ امام نووی قاضی عیاض کے حوالہ سے لکھتے ہیں:۔

قال القاضي عياض وقد اختلف السلف هل لذلك حد فمنهم من لم يحد شيئا في ذلك إلا أنه لا يتركها لحد الشهرة ويأخذ منها وكره مالك طولها جدا ومنهم من حدد بما زاد على القبضة فيزال ومنهم من كره الأخذ منها إلا في حج أو عمرة (شرح مسلم)	قاضی عیاض نے کہا سلف کا اس میں اختلاف ہے کہ ڈاڑھی کی لمبائی کی کوئی حد ہے یا نہیں تو ان میں سے کچھ لوگوں نے اس کی کوئی حد مقرر نہیں کی الا یہ کہ کوئی شخص حد شہرت تک ڈاڑھی نہ چھوڑے بلکہ اس میں سے کچھ حصہ کتروا دے۔ امام مالکؒ ڈاڑھی کے بہت لمبا ہونے کو مکروہ سمجھتے تھے اور ان میں کچھ لوگوں نے طول کی حد ایک قبضہ مقرر کی ہے اس سے زیادہ کتروا دیا جائے اور ان میں کچھ لوگوں نے حج یا عمرے کے سوا کسی اور وقت ڈاڑھی کے بال کتروانے کو مکروہ کہا ہے

قاضی عیاض نے پہلی جس جماعت کا ذکر کیا ہے حسن بصری اور عطاء بھی اسی میں داخل ہیں۔ اسی جماعت کے مسلک کو حافظ ابن حجر نے طبری کے حوالے سے حسن بصری وعطاء کی طرف منسوب کیا ہے اور علامہ عینی نے طبری ہی کے حوالے سے

حضرت عطار کی طرف منسوب کیا ہو۔ اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ فقہا ر سلف میں اختلاف تھا کہ طول لحیہ کی کوئی حد ہے یا نہیں، اور اس مسئلے میں صرف دو ہی قول ہیں ایک یہ کہ طول لحیہ کی حد ایک مشت ہونی چاہیے اور دوسرا یہ کہ ایک مشت پر اقتصار صحیح نہیں داڑھی اس سے بھی لمبی ہو سکتی ہے لیکن اتنی لمبی نہ ہو جائے کہ حد شہرت تک پہنچ کر مضحکہ خیز بن جائے۔

سلف میں سے کسی کے خیال میں بھی شاید یہ بات نہ ہوگی کہ داڑھی کی مقدار ایک مشت سے بھی کم جائز قرار پا سکتی ہے۔ ان میں سے کسی کی صراحت کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے

دو جماعتوں کے مسلک کی توضیح ہو چکی۔ ایک جماعت تو وہ جو حدیث کے عموم میں کسی تخصیص کی قائل ہی نہیں ہے دوسری وہ جو حد شہرت تک داڑھی کے طول و عرض کو بڑھا دینے کی مخالف ہے تیسری جماعت وہ ہے جو داڑھی کے طول کو ایک مشت تک محدود کرتی ہے اس کا خیال ہے کہ ایک مشت سے زائد جو مقدار ہو اسے کاٹ دینا چاہیے۔ اس مسلک کی بھی تھوڑی تفصیل ضروری معلوم ہوتی ہے کیونکہ عام طور پر فقہائے احناف بھی ایک مشت کی مقدار کو مقدار مسنون کہتے ہیں۔ میرے مطالعہ سے جو کتابیں اب تک گزری ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک مشت کے قائلین دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔ ان میں کا چھوٹا گروہ اس بات کا قائل ہے کہ ایک مشت سے زائد مقدار کو کٹوا دینا ضروری اور واجب ہے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ ایک مشت مقدار مسنون کی آخری حد ہے۔ اس سے کم کرنا جائز نہیں۔ اس سے زیادہ صرف یہی نہیں کہ جائز ہے بلکہ اولیٰ بھی ہے۔ ان میں سے پہلے گروہ کے قول کی کوئی شرعی دلیل موجود نہیں اس لیے اس پر گفتگو بے کار ہے البتہ دوسرے گروہ کا قول مدلل بھی ہے اور مناسب بھی۔

جیسا کہ اوپر گزر چکا بقدر یک قبضہ والے قول کے استدلال میں طبری نے تین صحابیوں کے آثار پیش کیے ہیں لیکن ان میں اعلیٰ درجے کی سند سے صرف حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا عمل ثابت ہے اس لیے اسی کو اصل مستدل قرار دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ امام بخاری نے کتاب اللباس باب تقلیم الاظفار میں لکھا ہے:۔

كَانَ ابْنُ عُمَرَ إِذَا حَجَّ أَوِ اعْتَمَرَ قَبَضَ عَلَى لِحْيَتِهِ فَمَا فَضَلَ أَخَذَهُ	ابن عمر جب حج یا عمرہ کرتے تو داڑھی کا جو حصہ ایک قبضہ سے زیادہ ہوتا اسے کٹوا دیتے۔

حافظ ابن حجر نے موطا امام مالک کی روایت ان الفاظ میں نقل کی ہے:۔

كَانَ ابْنُ عُمَرَ إِذَا حَلَقَ رَأْسَهُ	ابن عمر جب حج یا عمرے میں اپنا سر منڈواتے تو

آخَذَ مِنْ لِحْيَتِہٖ وَشَارِبِہٖ اپنی ڈاڑھی اور مونچھ کے بھی کچھ بال ترشواتے۔

بخاری کی روایت نے وہ مقدار واضح کردی ہے جسے حج یا عمرے کے وقت حضرت عبداللہ بن عمر کٹوا دیتے ...ے۔ اوپر یہ بات گزر چکی ہے کہ فقہاء کی ایک جماعت ابن عمرؓ کے اس عمل کو یہ درجہ نہیں دیتی کہ اس سے حدیث ...وع اعفوا اللحیٰ کے عموم میں تخصیص پیدا کی جا سکے لیکن فقہاء کی دوسری دو جماعتیں ان کے اس فعل کو مخصص مانتی ...ں۔ ایک جماعت نے ایک مشت تک ڈاڑھی کے بال کٹوانے کو صرف حج اور عمرے کے ساتھ مخصوص کیا ہے جیسا کہ ...اری اور موطا امام مالک کی صحیح تر روایت سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کسی اور حالت میں اس جماعت ...ے نزدیک اس حد تک بھی ڈاڑھی کٹوانا جائز نہیں ہے۔ اور دوسری جماعت اس تخصیص کو حج یا عمرے کے ساتھ ...حدود نہیں مانتی بلکہ عام حالات میں بھی اس حد تک داڑھی کے بال کٹوانے کو جائز قرار دیتی ہے۔ جیسا کہ اوپر گزر چکا ...س کے لیے یہ جماعت متعدد حدیثیں پیش کرتی ہے۔ جو لوگ حضرت ابن عمر اور دوسرے صحابہ کے عمل کو بالکل نظر انداز کرتے ہیں ان کا نقطہ نظر صحیح نہیں معلوم ہوتا صحابہ کے عمل کو کم سے کم جواز پر محمول کرنا تو لازمی ہے۔ فقہاء احناف نے اگر متعدد صحابہ کے عمل سے یہ سمجھا کہ ایک مشت، مقدار مسنون کی آخری حد ہے تو غلط نہیں سمجھا۔

فقہاء و محدثین نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے عمل کی متعدد توجیہیں کی ہیں اور متعدد محمل نکالے ہیں۔ راقم الحروف کے نزدیک، سب سے بہتر محمل وہ ہے جو صاحب فتح القدیر نے پیش کیا ہے۔ یہ بات اوپر گزر چکی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اعفاء لحیہ کا حکم نہیں دیا تھا بلکہ اس کے ساتھ مخالفت مجوس کا حکم بھی دیا تھا۔ یہ بات بھی گزر چکی کہ اس وقت کے مجوسی ڈاڑھیاں چھوٹی کراتے تھے ان میں منڈوانے کا رواج عام نہ ہوا تھا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا اور مشکل یہ پیش آتی تھی کہ داڑھی کی وہ کم سے کم مقدار کیا ہو جو مجوسیوں کی ڈاڑھیوں سے مختلف بھی ہو اور اس کو اعفاء لحیہ کے حکم نبوی کے موافق بھی قرار دیا جائے۔ اس سوال اور مشکل کو ابن عمر رضی اللہ عنہ کے عمل نے حل کر دیا، انھوں نے اپنے عمل سے بتا دیا کہ مقدار مسنون کی آخری حد ایک مشت ہے۔ صحابۂ کرام میں سے کسی نے بھی ان کے عمل پر اعتراض نہیں کیا۔ معلوم ہوا کہ وہ اس مقدار کے مسنون اور مخالف مجوس ہونے پر متفق تھے ورنہ ممکن نہ تھا کہ وہ اس پر اعتراض نہ کرتے ——— اس محمل سے تمام روایتوں میں تطبیق بھی ہو جاتی ہے اور ذہنی اطمینان بھی پیدا ہوتا ہے

(۵) کیا تخصیص کے قائل فقہاء میں سے کوئی فقیہ ایک مشت سے کم مقدار کو بھی مباح قرار دیتا ہے؟

اوپر کے صفحات میں اس سوال کا جواب آگیا ہے اور وہ یہ ہے کہ کسی امام فقہ نے بھی مباح قرار نہیں دیا ہے

لیکن اس سوال کے تحت یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک جلیل القدر فقیہ کی تصریح نقل کر دی جائے۔
صاحب فتح القدیر امام ابن الہمام المتوفی ۸۶۱ھ لکھتے ہیں:۔

واما الاخذ منها وهي دون ذالك	لیکن ڈاڑھی ترشوانا جبکہ وہ ایک مٹھی سے کم
كما يفعله بعض المغاربة ومخنثة الرجال	ہو جیسا کہ بعض مغربی اور مخنث قسم کے مردوں کا فعل
فلم يبحه احد (فتح القدیر مطبوعہ مصر ج ۲ ص ۷۷)	ہے تو اس کو کسی نے بھی مباح قرار نہیں دیا ہے۔

"کسی نے اس کو مباح قرار نہیں دیا ہے" کا دعویٰ اپنی جگہ مسلم ہے اور اس کو ثبوت کے ساتھ رد کرنا آسان نہیں ہے۔ ابن الہمام کے اس دعوے کو ان کے بعد کے ائمہ احناف اپنی کتابوں میں نقل کرتے آئے ہیں اور کسی نے بھی اس کے خلاف کوئی قول پیش نہیں کیا یہاں تک کہ متاخرین میں علامہ ابن عابدین شامی نے بھی اس کی تصدیق کی ہے۔

(۶) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مدظلہ العالی نے ڈاڑھی کی مقدار کے مسئلے پر جو کچھ لکھا ہے، اس کو میں اظہار خیال کی سہولت کے لیے نکات ذیل میں یکجا کر رہا ہوں۔

(۱) ڈاڑھی کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی مقدار مقرر نہیں کی ہے۔ ص۲۴۱ (۲) آپ نے کم سے کم یہ بھی نہیں فرمایا کہ ڈاڑھی اور مونچھ کی ٹھیک ٹھیک وہی وضع رکھو جو میری ہے جس طرح نماز کے متعلق حضورؐ نے فرما دیا کہ اسی طرح پڑھو جس طرح میں پڑھتا ہوں۔ ص۲۴۲ (۳) مجمل حکم دینے پر اکتفا کرنا اور تعین سے اجتناب کرنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ شریعت اس معاملے میں لوگوں کو آزادی دینا چاہتی ہے کہ وہ اعفاء لحیہ اور قص شارب کی جو صورت اپنے مذاق اور صورتوں کے تناسب کے لحاظ سے مناسب سمجھیں، اختیار کریں۔ ص۲۴۵ (۴) نبی صلی اللہ علیہ وسلم جتنی بڑی ڈاڑھی رکھتے تھے اس کا تعلق "عادات رسول" سے ہے۔ ص۲۳۶ ایضاً ص۲۴۲ اسی کی توضیح کے لیے ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:۔ "رہا یہ سوال کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈاڑھی رکھنے کا حکم دیا اور اس حکم پر خود ایک خاص طرز کی داڑھی رکھ کر اس کی عملی صورت بتا دی لہذا احادیث میں حضورؐ کی جتنی داڑھی مذکور ہے اتنی ہی اور ویسی ہی ڈاڑھی رکھنا سنت ہے تو یہ ویسا ہی استدلال ہے جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ حضورؐ نے ستر عورت کا حکم دیا اور ستر چھپانے کے لیے ایک خاص طرز کا لباس استعمال کر کے بتا دیا لہذا اسی طرز کے لباس سے تن پوشی کرنا سنت ہے۔ ص۲۴۹-۲۴۳ (۵) صرف یہ ہدایت فرمائی ہے کہ رکھی جائے (ص۲۴۱) (۶) داڑھی کی حد مقدار بہرحال علماء کی ایک استنباطی چیز ہے (ص۲۴۱)

یہ تمام حوالے میں نے رسائل و مسائل حصہ اول سے لیے ہیں جسے مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند نے شائع کیا ہے۔ اب میں نمبروار ان پر اظہار خیال کرتا ہوں

(۱) یہ بات کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے داڑھی کی کوئی مقدار متعین نہیں کی ہے۔ مولانا مدظلہٗ نے اپنی تحریر ں اس طرح بار بار دہرائی ہے کہ پڑھنے والا یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ کسی شے کی مقدار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کے بغیر شرعاً متعین ہو ہی نہیں سکتی، حالانکہ یہ اصول کسی اختلاف کے بغیر مسلم ہے کہ مقدار کی تعیین اور اجمال کی تبیین جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے ہوتی ہے اسی طرح آپ کے فعل سے بھی ہوتی ہے اور بیسیوں مجمل احکام کے بیان ور متعدد مقادیر کی تعیین کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف افعال کو دلیل و حجت بنایا گیا ہے اور بعض کے لیے تو آپ کے فعل کے سوا کوئی قول سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ مثال کے طور پر حد خمر کے لیے کوئی نص شرعی موجود نہیں ہے۔ چور کا ہاتھ کس جگہ سے کاٹا جائے؟ اس کے لیے کوئی قول رسول موجود نہیں ہے۔ تراویح میں کتنی رکعتیں ہوں؟ س کے لیے کوئی نص موجود نہیں ہے۔ تو کیا داڑھی کی مقدار کی طرح ان احکام میں بھی اب مسلمانوں کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ وہ اپنی پسند کے مطابق جو کچھ چاہیں اختیار کرلیں؟ اگر ان تمام حدود و مقادیر میں حضورؐ کا فعل واجب العمل ہے تو پھر مقدار لحیہ کیوں اس سے خارج ہو جائے گی؟

(۲) نمبر ۲ میں جو بات کہی گئی ہے وہ نمبر ۱ کی توضیح ہے اور واقعہ یہ ہے کہ میں مولانا کی یہ توضیح پڑھ کر حیران رہ گیا س لیے کہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي کو صرف نماز تک محدود کردیا ہے یعنی اس قول سے کوئی ایسا قاعدہ نہیں نکلتا جسے کسی دوسرے حکم میں رہنما بنایا جاسکے، حالانکہ تمام علمائے اصول نے بالاتفاق حضورؐ کے اس ارشاد سے نیز عبادت حج کے رہنما ارشاد خُذُوا عَنِّي مَنَاسِكَكُمْ سے یہ قاعدہ اخذ کیا ہے کہ حضورؐ کا فعل تمام مجمل احکام کی تبیین کے لیے برہان کی حیثیت رکھتا ہے اور امت کے لیے وہی کچھ واجب العمل ہے جو آپ کے فعل سے ثابت ہو۔ اس کے علاوہ سوچنے کی بات یہ بھی ہے کہ عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ (تم پر میری اور خلفاء راشدین کی سنت پر عمل کرنا لازم ہے) کا ارشاد نبوی بھی کیا سنن ہُدیٰ کی کسی خاص سنت کے ساتھ مخصوص و محدود ہے؟

(۳) اس نمبر کی عبارت پڑھ کر بھی اصول فقہ کا طالب علم حیران ہوتا ہے، اس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل کسی حکم مجمل کا بیان بھی نہیں ہوسکتا اور اس سے کسی ابہام کی تعیین بھی نہیں ہوسکتی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مولانا مودودی جیسے وسیع المطالعہ، دیدہ ور عالم دین کے قلم سے ایسی بات کیوں نکلی۔ اس سوال کا

کا جواب مئے میں آ رہا ہے۔

(۴) یہ ہے وہ اصل اشتباہ جس کی وجہ سے مقدارِ لحیہ کے مسئلے میں فعلِ رسول کی شرعی حیثیت مولانا مدظلہٗ کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ مقدار لحیہ کے مسئلے کو سترِ عورت کے مسئلے پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق کی ایک مثال ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ سترِ عورت کا تعلق لباس سے ہے اور استعمالِ لباس میں حضورؐ کے فعل کو کسی نے بھی سنتِ واجب الاطاعت قرار نہیں دیا۔ تمام علماء اسے عادت وجبلت سے متعلق مانتے ہیں نہ کہ اس فعل سے جس کا تعلق سننِ ہدیٰ اور قربت و عبادت سے ہے۔ کیا داڑھی اور اس کی مقدار کا معاملہ بھی یہی ہے؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے کسی امام فقہ نے بھی مقدار لحیہ کے مسئلے میں حضورؐ کے فعل کو محض عادت و جبلت سے متعلق نہیں مانا' اس لیے اس مسئلے کو مسئلہ لباس پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے۔ اس کے علاوہ دوسرا بڑا فرق یہ ہے کہ حد و مقدار کے لحاظ سے سترِ عورت کا حکم سرے سے مجمل حکم ہے ہی نہیں جس کے لیے بیان کی ضرورت ہو مثال کے طور پر جس عضو کو ڈھانکنا شرعاً واجب ہے وہاں یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا کہ اس کے کتنے حصے کو چھپایا جائے اور کتنے حصے کو کھلا چھوڑا جائے اور واعفوا اللحی کے حکم کو حد و مقدار کے لحاظ سے مولانا خود مجمل تسلیم کرتے ہیں پھر اس مسئلے کو سترِ عورت کے مسئلے پر قیاس کرنا کیونکر صحیح ہوگا

ان وجوہ سے اس حقیر کا خیال یہ ہے کہ مقدار لحیہ کو سترِ عورت پر قیاس کرنے میں تسامح ہوا ہے اور اس تسامح کی وجہ سے اس مسئلے میں حضورؐ کے عمل کی اصولی حیثیت مولانا کی نگاہ سے اوجھل ہوگئی ہے۔

(۵) اعفاء لحیہ کے حکم کی یہ تعبیر کہ حضور نے صرف یہ ہدایت فرمائی ہے کہ ڈاڑھی رکھی جائے۔ اس حکم کو بہت ہلکا کر دیتی ہے۔ احادیث میں اس کے لیے جو الفاظ آئے ہیں ان میں کا کوئی لفظ اس تعبیر کا ساتھ نہیں دیتا بلکہ تمام الفاظ سے حضور کی یہ ہدایت نکلتی ہے کہ ڈاڑھی بڑھائی جائے' لمبی کی جائے اور مجوس کی مخالفت کی جائے۔ اعفاء لحیہ کے جو معنی محدثین نے بیان کیے ہیں اس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ میں یہاں لغت کی چند تصریحات نقل کرتا ہوں۔

ابن درید کی جمہرۃ اللغۃ میں ہے:۔ عفا شعرہ اذا کثر۔ لسان العرب میں ہے:۔ عفی النبت والشعر وغیرہ: کثر وطال وفی الحدیث انہ صلی اللہ علیہ وسلم امر باعفاء اللحی وھو ان یوفر شعرھا ویکثر ولا یقص کالشوارب۔ العافی الطویل الشعر۔ ویقال للشعر اذا طال و دفی عفاء۔

قاموس میں ہے: عفی شعر البعیر۔ کثر وطال فغطی دبرہ۔ اعفی اللحیۃ: وفرھا

ان تصریحات سے بھی معلوم ہوا کہ عفی اور اعفی کے صیغے جب بالوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں تو ان کا کثیر

ہونا وافر ہونا اور طویل ہونا ان جمیعوں کی لغوی حقیقت میں داخل ہے اس لیے اعفوا اللحی کے ارشاد نبوی سے یہ سمجھنا کہ اس میں صرف داڑھی رکھ لینے کی ہدایت ہے لغوی معنی کے اعتبار سے بھی صحیح نہیں ہے۔

(۶) اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے اس کو سامنے رکھ کر اگر کوئی شخص مولانا کا یہ ارشاد پڑھے گا کہ مقدار لحیہ محض علماء کی ایک استنباطی چیز ہے تو اسے اس بات پر یقین کرنے میں سخت دشواریاں پیش آئیں گی۔ جو چیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل، نیز خلفاء راشدین اور دیگر صحابہ کرام کے عمل سے ثابت ہو آخر کس طرح کوئی شخص اس کو محض علماء کا استنباط سمجھ لے۔ ما یک مشت سے اوپر داڑھی کے بال کٹوانے کو علماء جو ناجائز کہتے ہیں تو اس کی وجہ محض استنباط نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ اس کے لیے کوئی دلیل شرعی موجود نہیں ہے ——— اس کے علاوہ ائمہ فقہ کے استنباطی احکام کے بارے میں عموم و اطلاق کے ساتھ یہ کہنا کہ ان کی حیثیت منصوص احکام کی نہیں ہے۔ صحیح نہیں ہے۔ ایسے استنباطی احکام کی متعدد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جن کی حیثیت منصوص احکام سے کم نہیں ہے۔

مغربی پاکستان کے خط میں چونکہ ماہنامہ ترجمان القرآن کی ایک تحریر کا ذکر بھی کیا گیا ہے اس لیے آخر میں اس پر بھی اظہار خیال مناسب معلوم ہوتا ہے ——— ترجمان القرآن دسمبر ۱۹۶۲ء میں محترمی ملک غلام علی صاحب کی تحریر کے اس حصے کو پڑھ کر افسوس ہوا جس میں انھوں نے عینی کا حوالہ دیا ہے۔ یہ افسوس تین وجوہ سے ہوا۔ ایک یہ کہ عینی کا حوالہ جس انداز میں انھوں نے دیا ہے اور اس کو پڑھ کر جو تاثر پیدا ہوتا ہے وہ اس تاثر سے مختلف ہے جو عینی کی پوری بحث پڑھ کر پیدا ہوتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ انھوں نے جس قول کو مولانا مودودی کی حمایت میں پیش کیا ہے اس کے بارے میں یہ تحقیق نہیں کی کہ اس کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ تیسری یہ کہ انھوں نے عربی عبارت غیر ان معنی ذالک عندی ما لم یخرج من عرف الناس میں "عرف الناس" کے ٹکڑے کی تحقیق نہیں کی۔ راقم اب ان تین وجوہ کی مختصر تشریح کرتا ہے:-

(۱) سب سے پہلے اس کی تشریح ضروری ہے کہ برادرم ملک غلام علی صاحب نے فتح الباری سے جو عبارت نقل کی ہے وہ اس طرح نقل کی ہے جیسے وہ بات خود امام طبری کہہ رہے ہیں اور ان کے حوالے سے علامہ عینی نے بھی اس کو قبول کر لیا ہے حالانکہ واقعہ یہ نہیں ہے۔ انھوں نے جو عبارت نقل کی ہے اس سے پہلے کی عبارت یہ ہے:

وقال الطبری فما وجہ قولہ اعفوا اللحی وقد علمت ان الاعفاء الاکثار	اور طبری نے کہا آپ کے قول اعفوا اللحی کا محمل کیا ہے جب تم یہ جان چکے کہ اعفاء کے معنی زیادہ کرنے

وان من الناس من اذا ترك شعر لحيته اتباعا منه لظاهر قوله اعفوا اللحى فيتفاحش طولا وعرضا ويسمج حتى يصير للناس حديثا ومثلا قيل قد ثبت الحجة

ڈاڑھی کے بال بڑھائے جائیں اور کوئی شخص ایسا ہو سکتا ہے کہ جب وہ آپ کے ظاہر قول کی پیروی کرتے ہوئے اپنی ڈاڑھی کے بال چھوڑ دے پھر وہ طول وعرض میں بہت بڑھ جائے، شکلاً قبیح ہو جائے اور لوگوں کے لیے مضحکہ خیز بن جائے (اس اعتراض کو دور کرنے کے لیے) کہا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ثابت ہے (الیٰ آخرہ)

(عمدۃ القاری ج ۱۰۲ باب تقلیم الاظفار)

اب دیکھیے کہ بات کیا ہو گئی، بات یہ ہوئی کہ امام طبری نے اعفوا اللحی کے عموم پر ایک سوال وارد کیا اور وہ یہ کہ اگر کوئی شخص ظاہر حدیث پر عمل کر کے اپنی ڈاڑھی کو طول وعرض میں بڑھنے کے لیے چھوڑ دے اور اس سے بالکل تعرض نہ کرے تو وہ اتنی بڑھ سکتی ہے کہ شکلاً قبیح اور لوگوں کے لیے مضحکہ خیز بن جائے اس سوال کا جواب کچھ لوگوں نے وہ دیا ہے جس کا ذکر طبری نے قیل قد ثبت الحجۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم الیٰ آخرہ میں کیا ہے۔ یہ دعویٰ کہ "ڈاڑھی کا اعفاء ممنوع اور اس کا کچھ حصہ کٹوانا واجب ہے" نہ امام طبری نے کیا ہے اور نہ علامہ عینی نے بلکہ کچھ دوسرے لوگوں نے اور وہ دوسرے لوگ بھی اس درجے کے ہیں کہ ان کے اس قول کو "قیل" کے صیغے سے ذکر کیا گیا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ قول ضعیف ہے۔ طبری کے قائم کردہ سوال اور "قیل" کے لفظ کو حذف کر دینا کیا ملک صاحب کے لیے کوئی مناسبت تھی؟ واقعہ بھی یہی ہے کہ اوپر جو دعویٰ مذکور ہوا وہ انتہائی کمزور دعویٰ ہے۔ عمرو بن شعیب کی ضعیف حدیث سے ڈاڑھی کے کچھ بال کٹوانے کا جواز ہی ثابت ہو جائے تو غنیمت ہے۔ وجوب کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ فقہاء و محدثین کی ایک جماعت جس میں امام نووی جیسے لوگ شریک ہیں عمرو بن شعیب کی حدیث کو تسلیم نہیں کرتی اور اعفوا اللحی کے عموم کی قائل ہے اور اگر کوئی شخص وجوب کا قول حضرت ابن عمر کے عمل کی دلیل پر اختیار کرتا ہے تو یہ اور طرفہ تماشا ہے

(۲) "وقال آخرون" میں طبری نے جس مسلک کا ذکر کیا ہے وہ حضرت حسن بصری کا ہے جیسا کہ فتح الباری کے حوالے سے اوپر گزر چکا ہے اور وہاں دو باتیں اور مذکور ہیں ایک یہ کہ حضرت عطاء کا قول بھی اسی طرح کا ہے جیسا حضرت حسن بصری کا ہے اور دوسری بات یہ کہ امام طبری نے حضرت عطاء کے قول کو اختیار کیا ہے۔ ان دونوں کے مسلک کا صحیح مفہوم کیا ہے میں اوپر تفصیل سے لکھ آیا ہوں اس لیے یہاں اعادہ بے کار ہے۔ ہاں اس کا ذکر ضروری ہے کہ علامہ عینی

نے حضرت عطاء کا جو مسلک نقل کیا ہے اس میں اور "قال آخرون" والے مسلک میں کوئی قابلِ ذکر فرق نہیں ہے۔ فتح الباری میں حضرت حسن بصری کا قول نقل کرنے کے بعد کہا گیا ہے:۔ وقال عطاء نحوہ (اور عطاء نے بھی اسی طرح کی بات کہی ہے جیسی حسن بصری نے) حضرت عطاء کا مسلک عینی نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے:۔

وقال عطاء لاباس ان یاخذ من لحیتہ الشیٔ القلیل من طولہا وعرضہا اذا کبرت وعلت کراھۃ الشھرۃ وفیہ تعریض نفسہ لمن یسخر بہ واستدل بحدیث عمر بن ھارون	اور عطاء نے کہا۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ کوئی شخص اپنی ڈاڑھی کے طول وعرض سے اس وقت کچھ تھوڑا سا حصہ کٹوا دے جب وہ بہت بڑھ جائے کیونکہ شہرت ایک کراہت ہے اور اس میں اپنے آپ کو اضحوکہ بنانا بھی ہے اور انھوں نے عمر بن ہارون کی حدیث سے استدلال کیا ہے۔

اگر کوئی کہے کہ تم یہ کس دلیل کی بنا پر کہتے ہو کہ دونوں قول مختلف نہیں ہیں تو میں اس کے جواب میں کہوں گا کہ اس کی ایک دلیل حافظ ابن حجر کا بیان ہے۔ فتح الباری اور عمدۃ القاری دونوں میں طبری کا حوالہ ہے۔ ہر صاحب علم دونوں کو پڑھ کر دیکھ سکتا ہے کہ فتح کا حوالہ کامل اور عمدہ کا حوالہ ناقص ہے۔ عمدہ میں تو اس جماعت کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے جو اعفاء لحیہ کے حکم میں تخصیص کی قائل نہیں، حالانکہ طبری نے سب سے پہلے اسی جماعت کا ذکر کیا ہے اس کے علاوہ عمدہ میں یہ بھی موجود نہیں ہے کہ امام طبری نے خود کس قول کو اختیار کیا ہے اور فتح میں اس کی تصریح موجود ہے۔ راقم الحروف نے اس مقالے کی شق ۱۲ میں یاخذ من طولہا وعرضہا مالم یفحش کے مسلک پر تفصیل سے گفتگو کی ہے وہاں دیکھ لی جائے ـــــ اور اگر کوئی شخص اصرار کرے کہ "قال الآخرون" میں جس قول کا ذکر ہے وہ عطاء کے قول سے علیحدہ ہے دونوں ایک نہیں ہیں تو اسے اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ وہ اس مبہم اور محتمل قول سے کیا فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔ اس قول میں ایک قوی احتمال اس کا بھی موجود ہے کہ ایک قبضے سے اوپر ڈاڑھی کٹوانے کو فحش کی حد میں داخل کیا جائے تو پھر اس محتمل قول کو اس کے جواز کے لیے بطور دلیل پیش کرنا کس طرح صحیح ہوگا

(۳) غیر ان معنی ذالک عندی مالم یخرج من عرف الناس کے سلسلے میں عرض ہے کہ برادرم ملک غلام علی نے یہ بات نظر انداز کر دی ہے کہ اس میں ہمارے زمانے کے لوگوں کا عرف نہیں بیان کیا گیا ہے۔ بلکہ اس زمانے کا عرف بیان کیا گیا ہے جب علماء و مشائخ بالخصوص اور مسلمان عوام بالعموم ڈاڑھی کی مقدار میں بھی اسوۂ نبوی کی پیروی کرتے تھے اور جیسا کہ ابن الہمام کے حوالے سے گزر چکا نویں صدی ہجری تک ایک مشت سے اوپر ڈاڑھی

کٹوانا صرف عرف عام ہی کے خلاف نہ تھا بلکہ اس کو جائز ہی نہیں سمجھا جاتا تھا اس لیے عمدۃ القاری میں مذکور "عرف الناس" اور مولانا مودودی مدظلہ کے بیان کیے ہوئے عرف عام میں بون بعید ہے۔

آخر میں ملک صاحب کی خدمت میں ایک بات اور عرض کرنی ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ چونکہ ایک جلیل القدر صحابی رسول اور اعفار لحیہ کی حدیث کے راوی بھی ہیں اس لیے اصولی طور پر فقہاء کی ایک جماعت نے ان کے عمل کی وجہ سے ایک قبضے سے زیادہ مقدار لحیہ کو کٹوانا جائز اور اس کو قدر مسنون کی آخری حد قرار دیا ہے۔ اگر صحابی رسول کے علاوہ کوئی دوسرا ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل اور خلفاء راشدین کی سنت کی روشنی میں اس کا عمل رد کر دیا جاتا۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ حضرت ابن عمر کے عمل کو قدر مسنون کی آخری حد ہی تسلیم کیا جا سکتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ایک قبضے سے کم مقدار کو کسی امام فقہ نے جائز قرار نہیں دیا اور یہ بات اوپر کئی جگہ آ چکی ہے کہ فقہاء و محدثین کی ایک جماعت نے حضرت ابن عمر کے عمل کو بھی تسلیم نہیں کیا اور حدیث رسول کے عموم ہی کی قائل رہی ۔۔۔ پھر ہم اور آپ، اب کس اصول کے تحت یہ استنباط کر سکتے ہیں کہ گالوں سے لگی ہوئی یا اک ذرا سی مختصر ڈاڑھی بھی مسنون ڈاڑھی ہے۔ کیا واضح دلائل کو چھوڑ کر مالم یفحش اور مالم یتشبہ باھل الشرك جیسے مبہم اقوال سے اس طرح کا استنباط کوئی صحیح استنباط ہوگا؟

چونکہ مغربی تہذیب کے استیلاء نے مسلمان معاشرے میں بھی حلق لحیہ کی وبا پھیلا دی ہے اس لیے حلق لحیہ ترک کر کے اک ذرا سی ڈاڑھی بھی رکھ لینا بڑا کام ہے اور ایسے شخص کا جذبۂ دینی قابل قدر ہے لیکن یہ کہنا کہ اس نے ارشاد نبوی کا منشا پورا کر دیا صحیح نہیں ہے۔ ایسے شخص کا عمل ناقص ہے اسے اپنے آپ کو اس بات پر آمادہ کرنا چاہیے کہ اس کا یہ عمل سنت نبوی کے مطابق ہو جائے۔

سید احمد قادری

شرائط ایجنسی

(۱) ایجنسی کم سے کم پانچ رسائل پر دی جائے گی۔ (۲) رسائل حسب ضرورت طلب کیے جائیں اگر فروخت نہ ہوئے تو واپس نہیں لیے جائیں گے۔ (۳) کمیشن ۲۵ فی صدی دیا جائے گا۔ البتہ پچاس یا زائد رسالوں کی خریداری پر کمیشن ۳۳ فی صدی ہوگا ۔۔۔ (۴) رسائل کی روانگی کا صرفہ ہمارے ذمے ہوگا اور رجسٹری یا وی پی کا خرچ ایجنٹ صاحبان کے ذمے ہوگا۔ (۵) رقم ہر حال میں پیشگی آنی چاہیے یا پھر وی پی بھیجنے کی اجازت دی جائے۔ وی پی کے مصارف زیادہ ہوں گے۔

(منیجر رسالہ زندگی رام پور)

بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ اور اسلام

(جناب عبدالباری، ایم اے)

انسانی آبادی کا بڑھنا بھی کوئی مسئلہ ہو سکتا ہے؟ اگر اسے مسئلہ بننا ہی تھا تو پھر اس دنیا میں انسانوں کی
[تع]داد ہی کیوں بڑھی؟ پھر بڑھی بھی تو اتنی کہ ایک نفس آدم سے آج پوری دنیا میں تقریباً تین ارب کی آبادی ہو گئی
[ا]س سے سراغ ملتا ہے کہ دنیا کے بنانے والے ہی کی مرضی و مشیت تھی کہ آبادی بڑھے

مسئلہ یا مشیتِ ایزدی

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔ يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً (النساء) لوگو اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک نفس سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت مرد و عورت پھیلا دیے۔

دوسرے مقام پر اس طرح فرمایا ہے:۔

جَعَلَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا وَمِنَ الْأَنْعَامِ أَزْوَاجًا يَذْرَؤُكُمْ فِيهِ (الشوریٰ) اسی سے تمہارے لیے تمہارے جنس کے جوڑے بنائے اور جانوروں میں بھی جوڑے پیدا کیے۔ اس طرح تم کو روئے زمین پر پھیلاتا ہے۔

پھر قوم شعیب کو مخاطب کرکے آبادی بڑھانے اور نسل بڑھانے کو کس طرح احسان میں شمار کرا رہا ہے۔

وَاذْكُرُوا إِذْ كُنتُمْ قَلِيلًا فَكَثَّرَكُمْ (الاعراف) اور اللہ کا وہ احسان یاد کرو کہ جب تم شمار میں کم تھے تو خدا نے تمہاری نسل میں برکت دے کر تم کو دنیا [میں] کثیر کر[دیا]

بائبل کے عہدِ عتیق سے بھی اس کی تائید ملتی ہے۔

"اور خداوند نے ان کو برکت دی اور کہا کہ پھلو اور بڑھو اور زمین کو معمور و محکوم کرو اور سمندر

کی مچھلیوں اور ہوا کے پرندوں اور کل جانوروں پر جو زمین پر چلتے ہیں اختیار رکھو اور خدا نے کہا کہ دیکھو میں تمام روئے زمین کی کل بیج دار سبزی اور ہر درخت جس میں اس کا بیج دار پھل ہو تم کو دیتا ہوں۔ یہ تمہارے کھانے کو ہوں اور زمین کے کل جانوروں کے لیے اور ہوا کے کل پرندوں کے لیے اور ان سب کے لیے جو زمین پر رینگنے والے ہیں جن میں زندگی کا دم ہے کل ہری بوٹیاں کھانے کو دیتا ہوں اور ایسا ہی ہوا۔"

(پیدائش ۱: ۲۸-۳۰)

طوفانِ نوح کے بعد ہدایت ملتی ہے :-

"اور خدا نے نوح اور اس کے بیٹوں کو برکت دی اور ان کو کہا کہ بارور ہو اور بڑھو اور زمین کو معمور کرو اور زمین کے کل جانداروں اور ہوا کے کل پرندوں پر تمہاری دہشت اور تمہارا رعب ہوگا اور تمام کیڑے جن سے زمین بھری پڑی ہے اور سمندر کی کل مچھلیاں تمہارے ہاتھ میں کی گئیں۔" (پیدائش ۹: ۱-۲)

ویدوں کی دعائیں بالعموم اولاد، دولت، بیوی، خدمتگار اور مویشیوں کی یافت کے لیے کی گئی ہیں۔ ہر ہندی آرین کے لیے بچہ پیدا کرنا لازمی تھا۔ لاولد کے لیے جنت کا دروازہ بند تھا۔ پھر اولاد ایک سے زائد مطلوب آرین کثرتِ اولاد پر فخر کرتے تھے۔ اسی لیے پرانوں میں سو سو ہزار تو کیا لاکھوں اولاد تک کا ذکر ملتا ہے۔

ان حقائق سے صاف پتہ چلتا ہے کہ آبادی کی کثرت پہلے کبھی تشویشناک مسئلہ نہیں بنی پھر آج بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ کیسے سامنے آیا؟

مسئلہ کس طرح سامنے آیا؟

انگلینڈ کے ایک مشہور ماہرِ اقتصادیات مالتھس (MALTHUS) (۱۷۶۶ء تا ۱۸۳۴ء) کا دماغ غالباً پہلی بار بڑھتی ہوئی آبادی کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے اپنے ملک میں دیکھا کہ آبادی تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے اور زمین پر قابلِ سکونت جگہ محدود ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ نسل کی رفتار سے زمین اور معیشت کے سامان اس کے لیے تنگ ہو جائیں اور یہ کہ افزائشِ نسل کے ساتھ معیارِ زندگی پست ہوتا چلا جائے۔ اپنے ان خیالات کو اس نے ۱۷۹۸ء میں اپنے مشہور رسالہ (اصول آبادی پر مضمون) ESSAY ON THE PRINCIPLE OF POPULATION لکھ کر پیش کیا۔ اس کے خیال میں آبادی کی رفتار سامانِ معیشت کی رفتار سے کہیں تیز ہوتی ہے۔ اس لیے اس نے اپنا یہ قیاسی نتیجہ پیش کیا کہ ہر پچیس سال میں موجودہ آبادی دوگنی کے قریب ہو جایا کرتی ہے یعنی اس میں رفتار جیومیٹری کے اعتبار سے اس طور پر اضافہ ہوتا ہے جیسے ۱ : ۲ : ۴ : ۸ : ۱۶ : ۳۲ اور علیٰ ہذا القیاس جب کہ سامانِ معیشت میں صرف

رفتارِ ارتھمیٹک کے اعتبار سے اس طرح اضافہ ہوتا ہے جیسے ۱ : ۲ : ۳ : ۴ : ۵ : ۶ اور علیٰ ہذالقیاس۔ اور اگر ایسا ہوتا چلا گیا تو دو صدی میں آبادی اور سامان معیشت کا تناسب ۲۵۶ : ۹ کا ہو جائے گا اور تین صدیوں میں ۴۰۹۶ : ۱۳ کا اور دو ہزار برس میں تناسب کا فرق اتنا ہو جائے گا جس کا تخمینہ لگانا بھی محال ہے۔ ایسے حالات میں آبادی کی خوش حالی و فلاح کے مدِ نظر آبادی کی رفتار کو گھٹانے کے لیے اس نے ضبط نفس اور بڑی عمر میں شادی کرنے Moral Restraint کا مشورہ دیا۔

۱۸۷۶ء میں نیو مالتھوسی تحریک New Malthusian-movement اٹھی جو ضبطِ ولادت کی تحریک تھی۔ جس کے پروپیگنڈے میں ۱۸۷۹ء میں مسز اینی بسنٹ کی کتاب 'قانونِ آبادی' Law of Population شائع ہوئی جس کے ایک لاکھ پچھتر ہزار نسخے پہلے ہی سال فروخت ہو گئے ہو گئے۔ ہندوستان میں ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے کمشنر ڈاکٹر ہٹن (Dr. Hutton) نے اپنی رپورٹ کو پیش کرتے ہوئے ہندوستان کی بڑھتی ہوئی آبادی کو خطرناک بتایا اور ضبطِ ولادت ( ) کی ترویج پر زور دیا۔ کچھ دنوں کے بعد کونسل آف اسٹیٹ کے ایک مسلمان ممبر نے حکومت ہند کو توجہ دلائی تھی کہ وہ ہندوستان کی بڑھتی ہوئی آبادی کو روکنے کے لیے عملی تدابیر اختیار کرے۔ حکومت ہند نے اس وقت تو اس تجویز کو رد کر دیا تھا لیکن جب سے پبلسٹی کا زمانہ آیا انسانوں میں یہ کمزوری آ گئی کہ دنیا میں جس چیز کا چرچا زیادہ ہو جائے اسے بلا غور کیے حق سمجھنے لگے۔ چنانچہ مغربی تمدن سے متاثر ہو کر یہاں بھی ضبطِ ولادت کی تحریک زور پکڑتی گئی اور اب آزاد ہندوستان نے اس پر آزادی کے ساتھ عملی اقدام شروع کر دیا ہے اور باضابطہ اپنے پنج سالہ منصوبے میں 'خاندانی منصوبہ بندی' (Family Planning) کے نام سے اسے رائج کر دیا ہے۔

مغربی حامیانِ ضبطِ ولادت کا طریق استدلال یہ تھا کہ "زمین میں ایک اچھے معیار کی زندگی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار ملین (پانچ ارب) آدمی سما سکتے ہیں۔ اس وقت (انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں) زمین کی آبادی ۲ ہزار ملین (۲ ارب) تک پہنچ چکی ہے اور اگر حالات مناسب ہوں تو ۴۰ سال کے اندر یہ آبادی دوگنی ہو سکتی ہے۔ لہٰذا یہ اندیشہ بالکل بجا ہے کہ ۵۰ سال کے اندر زمین آدمیوں سے بھر جائے گی اور اس کے بعد نسلوں میں جو اضافہ ہوگا وہ اولادِ آدم کے معیارِ زندگی کو گراتا چلا جائے گا۔ یہاں تک کہ ان کے لیے بھلے آدمیوں کی طرح زندگی گزارنا مشکل ہو جائے گا۔ پس انسانیت کو اس خطرے سے بچانے کے لیے ضروری ہے کہ تحدیدِ نسل (Birth limitation) کے طریقے اختیار کر کے نسلوں کی افزائش کو ایک حدِ مناسب کے اندر محدود

کر دیا جائے۔" (بحوالہ ضبط ولادت اور اسلام، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی)

ان تخیلات کی بنا پر یہ مسئلہ سامنے آیا۔ دیکھنا یہ ہے کہ جس انوکھے تخیل نے یہ راہ دکھائی اس میں کتنا وزن ہے؟

انوکھے تخیل کا وزن مالتھوس کا تخیل قیاس پر مبنی تھا۔ اعداد و شمار سے آبادی کی رفتار کا اندازہ تو وہ کسی قدر کر سکتا تھا لیکن سامان معیشت کی مقدار اور اس میں صحیح اضافہ کے اندازہ کرنے کا اس کے پاس کوئی پیمانہ نہ تھا۔ اس کے حساب سے اگر ہر پچیس سال میں موجودہ آبادی دوگنی ہو جانے کا اصول صحیح ہوتا تو آدمؑ کی پیدائش سے لے کر آج تک آبادی بے شمار ہو جاتی جس کا کوئی تخمینہ بھی نہ کر سکتا۔ دنیا کی صحیح پیدائش کب ہوئی اور نوع انسانی کی ابتدا کب؟ ان کے تسلی بخش جواب علمی تحقیقات ابھی تک نہیں دے سکیں۔ لیکن جدید ترین تحقیق یہ ہے کہ "اٹلی کے ایک کوئلہ کی کان میں ۶۰۰ فیٹ گہرائی پر ایک انسانی ڈھانچہ برآمد ہوا ہے جس کے بارے میں ماہر سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ یہ ایک کروڑ سال پہلے کا ہے۔" (دعوت دہلی، ۹ اگست ۱۹۵۸ء) حالانکہ اس انسانی ڈھانچے سے کہیں پہلے آدمؑ کی پیدائش ہوئی ہوگی لیکن تخمینہ کے لیے اگر آدمؑ کی پیدائش کو ایک ہی کروڑ سال پہلے مان لیا جائے تو مالتھوس کے حساب سے آج دنیا میں انسانوں کے رہنے کے لیے بھی جگہ نہ باقی رہتی لیکن واقعتہً نہ ایسا ہوا نہ ہونے کی امید ہے۔ پھر آبادی کی رفتار اور سامانِ معیشت کے اضافہ کی رفتار کے تناسب کا جو نقشہ اس نے کھینچا ہے تجربات کی روشنی میں نہ صرف غلط ثابت ہو جاتا ہے بلکہ اکثر اُلٹا نظر آتا ہے۔ اناج اور پھل کے دانوں پر غور کیجیے کہ صرف ایک دانہ سے ایک ہی پودے اور درخت میں کتنی بالیاں اور پھل لگتے ہیں جو پہلے ہی سال ایک بیج سے کتنے گنا زیادہ ہوتے ہیں اور ہر پچیس سال میں ان کے اضافے کی کیا حالت ہوگی! کیا بجائے آبادی کی رفتار کے انسانی غذا کے اضافہ کی رفتار باعتبار جیومیٹری نہیں معلوم ہوتی؟ سمندر میں انسانی غذا کے لیے "لَحْمًا طَرِيًّا" کی صورت میں انواع و اقسام کی مچھلیوں میں بعض بعض کروڑوں انڈے دے دیتی ہے جس کی نسل کس رفتار سے بڑھتی ہوگی! ہندوستان کے اقتصادیات کے پروفیسروں (جتھار اور بیری) نے لکھا تھا کہ "مالتھوس کے اس ریاضی فارمولا کی جس میں اس نے غذائی اضافہ اور تعداد کے تناسب کا اظہار کیا ہے آج کل کوئی وقعت نہیں ہے۔"

حامیان ضبط ولادت کے استدلال کے مطابق "اچھے معیار" کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ اور اگر اچھے معیارِ زندگی کے ساتھ اس زمین میں ۵ ہزار ملین (۵ ارب) تک آدمی سما سکتے ہیں تو پھر ابھی تک تو کسی اندیشے کی بات نہ ہونی

تقریباً دس بارہ لاکھ بنی اسرائیلیوں کو لے کر موسیٰؑ مصر سے آدھی رات کو نکل پڑے اور ان کے ساتھ ان کے جانور بھی تھے۔ نہ کھانے کا انتظام تھا اور نہ پانی کا۔ مصر سے نکل کر ان کا گذر بیابان سینا سے ہوا جس کی آبادی موجودہ زمانے میں بھی ایک لاکھ سے کم ہی ہے۔ اگر آج وہاں یکایک پانچ چھ لاکھ کا قافلہ ٹھہر جائے تو ان کے لیے پانی خوراک اور سایے کا انتظام کرنا دشوار ہو جائے۔ لیکن اللہ نے اتنی بڑی تعداد کے لیے ان تینوں اہم ترین ضروریات زندگی کا بندوبست نہایت خوبی سے کر دیا تھا جن کا ذکر بائبل و قرآن میں موجود ہے۔

قرآن کریم کے ان حوالوں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اللہ پر مذکورہ بالا تنقید نہ صرف بے جا اور غلط ہے بلکہ ایک بہتان عظیم ہے۔ وہ انسان کے سارے حالات سے باخبر ہے۔ کیا روسں کے نامور ادیب لیو ٹالسٹائے ([illegible]) کا کہنا قابل اعتبار تھا کہ "زمین اتنی مختصر ہی ہے کہ ایک چوہے کے لیے دوڑنے کی جگہ بھی نہیں"۔ (تعلیم کی برکت) انسان کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے زمین تنگ نہیں ہے۔ بلکہ " اَرۡضُ اللّٰہِ وَاسِعَۃٌ " ــــ "جرأت ہو نمو کی تو فضا تنگ نہیں ہے۔ اے مردِ خدا ملکِ خدا تنگ نہیں ہے" خدا نے تو انسان کو ایسی "احسنِ تقویم" میں پیدا کیا ہے کہ آج زمین کے علاوہ سماوی کروں میں سکونت کی راہیں نکال رہا ہے! اس طرح سامان معیشت میں بھی کسی طرح کمی لاحق نہیں ہو سکتی جب کہ اس نے نہ صرف زندوں کے رزق کا ذمہ لیا ہے بلکہ اس کی راہ میں مرنے والوں کو بھی روزی ملنے کا سراغ ملتا ہے۔

وَلَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ قُتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ اَمۡوَاتًا ؕ بَلۡ اَحۡیَآءٌ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ یُرۡزَقُوۡنَ ۙ فَرِحِیۡنَ بِمَاۤ اٰتٰہُمُ اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ (آل عمران)	اور اے پیغمبر جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے ہیں ان کو مرا ہوا خیال نہ کرو بلکہ یہ اپنے پروردگار کے نزدیک جی رہے ہیں۔ ان کو روزی ملتی ہے۔ جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے ان کو دے رکھا ہے اس میں مگن ہیں۔

اگر ہم اپنے ملک ہندوستان کے قدیم زمانہ کی طرف نظر ڈالیں تو تاریخ کے اوراق (جن میں مہابھارت پوران اور منوسمرتی بھی شامل ہیں) اور آثار قدیمہ اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ یہاں سامانِ معیشت کی کس قدر فراوانی تھی۔ جانوروں اور پرندوں کے گوشت کے علاوہ غذا میں شہد، دودھ، دہی، مکھن، گھی، غلہ، دال، تل، گنا وغیرہ کا سراغ ملتا ہے۔ مختلف قسم کی سواریاں اور باربرداری کے جانور تھے۔ جن کو کسان حرفہ کار استعمال کرتے تھے۔ آلات و ہتھیار بنانے کے پوشیدہ معدنی خزانے بھی تھے۔ رہنے کے لیے مٹی کی دیواروں کی جھونپڑ

سے لیکر محل اور قلعے تک پائے جاتے ہیں ۔ یہی وجہ تھی کہ یہاں کی سبزی و شادابی کی قدرتی فراوانی دیکھ دیکھ کر اور حسن منکر سارے ایشیا اور مغربی ممالک کو چھوڑ کر آرین نسل کی قومیں اس ملک پر حملے کرتی رہیں ۔

یہاں کی اکثریت یعنی ہندو آبادی جن کے ہاتھ میں دراصل آج اس ملک کی باگ ڈور ہے خود اپنی مقدس کتابوں سے واقف ہیں ۔ "مہا بھارت کی لڑائی سے پہلے کسی غیر ملکی کال جون نامی نے ایک ہزار کروڑ (یعنی دس ارب) ملیچھ سینا لے کر متھرا پر چڑھائی کر دی تو شری کرشن اپنے کو کمزور سمجھ کر دوارکا چلے گئے اور وہیں اُن کے جادونس پھلے اور پھیلے (وشنو پوران ادھیائے ۱۲۔ اشلوک: ۶-۷) کہتے ہیں کہ جادونسی (شری کرشن کے خاندان والے) جنگِ مہا بھارت کے وقت ۵۶ کوٹی (کروڑ) کی تعداد میں تھے ۔ اس بیان کی تائید مختلف پہلوؤں سے بھی ہوتی ہے ۔ مثلاً پریم ساگر (جس میں شری کرشن کے حالات ہیں) کے آخر میں مندرج ہے کہ شری کرشن کی ۱۶۰۰۸ رانیاں تھیں اور ہر ایک ایک کے دس دس پُتر اور ایک ایک کنیا ۔ اس طرح لڑکے اور لڑکیاں ملا کر کل اولاد ایک لاکھ چھہتر ہزار اٹھاسی (۱,۷۶۰۸۸) ہوگئی پھر ان کی اولاد تو اَن گنت ہوگئی ۔ لیکن ان کی اولاد کے پڑھنے کے لیے ۳ کروڑ ۸ ہزار ایک سو پاٹھ شالائیں تھیں" ۔ اسی طرح کا دوسرا بیان وشنو پوران ادھیائے ۱۵۔ اشلوک: ۴۵ میں ہے کہ " جادونس کے لڑکوں کو دھنش و دیا (یعنی ملٹری ٹریننگ) کی تعلیم کے لیے ۳ کروڑ ۸۸ لاکھ گرو تھے" مہا بھارت کی جنگ کے بعد ہی اپنے جنگی تبصرے میں شری کرشن فرماتے ہیں کہ " اس جنگ میں تو ۱۸ اچھاؤنی سینا مارے گئے ۔ (شری مدبھاگوت پوران پہلا اسکند ۔ ادھیائے ۸ ۔ اشلوک: ۴۸ کی رو سے ایک اچھاؤنی سینا = ۶۵۶۱۰ گھوڑسوار ۔ ۱۰۹۳۵۰ پیدل ۔ ۲۱۸۷۰ ہاتھی اور ۲۱۸۷۰ رتھ ۔ مجموعی تعداد ۲۱۸۶۹۰ ہوئی ۔ اس لیے ۱۸ اچھاؤنی سینا تقریباً ۳۷ لاکھ سے زائد) میرا اوتار تو اس لیے ہوا تھا کہ دھرتی سے پاپ و فساد کا بوجھ اتاروں ۔ ان ۱۸ اچھاؤنی سینا کے مر جانے سے بھی کیا ہوتا ہے؟ البتہ اگر صرف میرے جادونس ہی لوگ پوری تیاری کے ساتھ نکلیں گے ۔ تب ہی دھرتی کا بوجھ ہلکا ہو سکے گا" (شری مدبھاگوت ۔ اسکند ۳ ۔ ادھیائے ۳) ۔۔۔۔ ان بیانات میں اگر بالفرض قدیم ہندوستان کے اعداد و شمار (کوٹی ۔ کروڑ ۔ لاکھ ۔ ہزار ۔ اچھاؤنی سینا) آج کے اعداد و شمار سے مختلف بھی رہے ہوں تب بھی اتنی بات تو ضرور واضح ہو جاتی ہے کہ آج کے مقابلے میں اس وقت بڑی سے بڑی ناقابلِ شمار تعداد آبادی کے لیے بھی غذا و سامانِ معیشت کی کمی نہ محسوس ہوئی ۔ نہ اُن کے سامنے رزق کی تنگی کا کوئی اہم مسئلہ پیش آیا ۔

لہٰذا اگر حقیقی رازق رزق کے مکمل انتظام سے قاصر نہیں ہے تو پھر کیوں رزق میں کمی محسوس ہونے لگی؟ مسئلہ رزق کا درپیش ہے یا بڑھتی ہوئی آبادی کا؟

مسئلہ کی اصل نوعیت آج دنیا کے چپے چپے میں ایسے غیر فطری نقشے نظر آئیں گے کہ چند افراد تو کھانے پینے کی زیادتی سے بیمار ہوں اور دوسری طرف ہزاروں آدمی فاقہ کشی سے جان دے رہے ہوں۔ چند افراد یا چند خاندان تو مال و دولت سے کھیلتے ہوں اور دوسروں کو زندہ رہنے کے لیے ایک وقت کا کھانا اور ستر پوشی کے لیے کپڑا تک نصیب نہ ہو۔ ایک طبقہ (جو اکثریت میں ہو) تو پیداوار بڑھانے میں صبح سے شام تک بیلوں کی طرح جُتا رہے اور گنتی کے چند افراد کا طبقہ ان کی محنتوں کا ثمرہ کھائے۔ اہل صنعت وحرفت ارباب کمال اور مختلف صلاحیتیں رکھنے والے لوگ تو ہمیشہ تکلیف ہی اٹھاتے رہیں اور مُسرف و فضول خرچ، فاسق و فاجر عیش کی رنگ رلیاں منائیں۔ اہلیت رکھنے والے دیانتداروں کے ساتھ تو اچھوتوں کا برتاؤ کیا جائے اور اُمراء و رؤساء کے ارد گرد دبے دماغ ضمیر فروشوں کی ٹولی جمع ہو — ان نقشوں کے تفصیلی جائزے سے معلوم ہوگا کہ دراصل آج پوری انسانیت کا جسم اخلاقی حیثیت سے سڑ گیا ہے۔ فی الواقع اسی کا علاج اصل مسئلہ ہے! نوعِ انسانی کی جو صلاحیتیں ضائع ہو رہی ہیں انھیں بچانا اصل مسئلہ ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادی کے لوگ خیر و شر کی تمیز کھو چکے ہیں اور صحیح شعور سے خالی ہو رہے ہیں۔ ان میں صحیح شعور بیدار کرنے کی ضرورت ہے۔

اپنی بدانتظامی اور بدکرداری کی وجہ سے اگر ہم انسانوں کے لیے روزی کا سامان فراہم نہیں کر سکتے تو کیا یہ صحیح روش ہوگی کہ ان انسانوں ہی کو قتل کر دیا جائے جن کے لیے ہمیں سامان فراہم کرنا ہے؟ جب یہ معلوم ہے کہ کائنات کی ساری چیزیں انسان کے لیے ہیں اور انسان ہی کائنات کا شاہکار ہے تو پھر کیا سوچنے کا یہ انداز کہ غذا کی کمی محسوس ہو رہی ہے اس لیے پیدا ہونے والے انسانوں ہی کو ختم کر دیا جائے کسی طرح صحیح و جائز ہو سکتا ہے؟ مسئلہ دراصل یہ ہونا چاہیے کہ کیوں سامان معیشت کی کمی محسوس ہو رہی ہے؟ کیا مشہور عالم معاشیات مسٹر ٹاسگ (Mr. Tausig) کا بھی یہی رونا نہ تھا کہ "بدقسمتی سے جذبۂ ہمدردی اور بھائی چارگی بہت کمیاب ہے۔ اگر وہ عام ہو جائے تو معاشی دنیا کا رُخ بدل جائے گا"

معاشی اصلاح کی راہ یہ ہے کہ نوعِ انسانی کے ایک ایک فرد میں از سر نو احساس ذمہ داری ابھر جائے۔ بالشت بھر پیٹ نے زندگی کی ساری وسعت گھیر لی ہے۔ ہر مسئلے کو پیٹ یا جیب کے نقطۂ نظر سے دیکھا اور جانچا جا رہا ہے۔ اکبر مرحوم کی نصیحت کے مطابق "نقشوں سے تم نہ جانچو لوگوں سے مل کے دیکھو۔ کیا چیز جی رہی ہے کیا چیز مر رہی ہے" اصل مسئلہ بڑھتی ہوئی آبادی کا نہیں ہے بلکہ بڑھتی ہوئی آبادی کے دھڑکتے ہوئے دلوں کا۔ سارے جسم میں گوشت کا یہی لوتھڑا "دل" ہے جس میں سب کچھ ہے! یہی خراب ہے تو سارا جسم خراب ہوگا اور یہی سدھر جائے تو سارا جسم سدھر جائے گا

یہ نہیں دیکھنا ہے کہ آبادی بڑھ رہی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ بڑھتی ہوئی آبادی کے افراد کیسے ہیں؟ بالفرض ضبط ولادت کے ذریعہ آبادی بڑھنے سے روک بھی دی جائے تب بھی دوسری برائیاں دور نہیں ہو سکتیں جب تک کہ لوگوں کے نفس کا تزکیہ نہ ہو۔

آغاز آفرینش ہی سے دو نقطۂ نگاہ چلے آرہے ہیں۔ مادی تصور حیات اور اخلاقی تصور حیات محض مادی تصور سے جارحانہ خود غرضی کا ذہن تیار ہوتا ہے جس سے نوع انسانی میں کش مکش پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کش مکش کو دور کرنے اور انسان کی پوری زندگی کو فلاح و سعادت سے ہمکنار کرنے کے لیے اخلاقی تصور حیات کا نسخہ ہے جس کی نشان دہی قرآن کریم نے کی ہے :۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا — اس شخص نے فلاح پائی جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کر لیا اور وہ نامراد ہوا جس نے اسے خراب و برباد کیا

اس لیے ناگزیر ہے کہ زندگی کے سارے مسائل کو حل کرنے کی خاطر (جس میں معاش و روزی اور بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ بھی آجاتا ہے) نامناسب باتوں سے نفس انسانی کو پاک کرکے اس کی صحیح نشو و نما کی جائے اور اخلاقی تربیت کے ذریعہ اسے صحیح رخ پر لگایا جائے۔

ماہرین معاشیات نے 'اقتصادیات' (Economics) کی یہ تعریف کی ہے کہ سائنس اقتصادیات یہ ہے کہ ایک انسان 'کیسے' پیدا کرتا ہے اور پیداوار 'کیسے' خرچ کرتا ہے۔ لفظ 'How' (کیسے) کیا صاف نشان دہی نہیں کر رہا ہے کہ پیداوار (Produce) خاص چیز نہیں بلکہ 'man' (انسان) ہی اقتصادیات کا مرکزی عنوان ہے اور اہمیت کے لائق یہ بات ہے کہ وہ پیداوار 'کیسے' حاصل کرتا ہے اور حاصل کرنے کے بعد اسے 'کیسے' صرف کرتا ہے۔ 'How' (کیسے) کا سوال ہمیں اس بات کی طرف فوراً متوجہ کر دیتا ہے کہ اس دنیا میں تمدنی ارتقاء کی منزلیں طے کرتے وقت انسان کا اجتماعی برتاؤ کیا ہے؟ اور یہی برتاؤ اس کی ساری جد و جہد کی جان ہے۔ اس طرح یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ مسئلہ نہ رزق کا درپیش ہے نہ بڑھتی ہوئی آبادی کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ تمدن کی فطری رفتار ترقی کو قائم رکھتے ہوئے کس طرح تمام انسانوں کو فطرت کے منشا کے مطابق ان کی ضروریات زندگی بہم پہنچنے کا انتظام ہو؟ کس طرح سوسائٹی میں ہر شخص کو اپنی استعداد اور قابلیت کے مطابق ترقی کرنے اور اپنی شخصیت کو نشو و نما دینے اور اپنے کمال تک پہنچنے کے مواقع حاصل رہیں؟ اور کس طرح اس راہ کے اجتماعی ظلم و ناانصافی کو روکا جائے اور دیگر رکاوٹوں کو دور کیا جائے؟ کیا خالق کائنات نے اپنے شاہکار کو صحیح طریق کار اور صحیح راہ کی نشان دہی نہیں کی؟ اور خطرات سے اسے آگاہ

نہیں کیا؟ اس کی کتاب سے سراغ لگایا جائے۔

صحیح راہ کے لیے تنبیہات

بنی اسرائیل کو مخاطب کرکے اللہ نے فرمایا: "وَنَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى كُلُوا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى ۝ (طٰہٰ) (اور ہم نے تم پر من وسلویٰ اتارا عمدہ روزی جو ہم نے تم کو دی ہے کھاؤ اور ہمارے حکم سے اس کے بارے میں سرمو تجاوز نہ کرنا تو تم پر ہمارا غضب نازل ہوگا۔ اور جس پر ہمارا غضب آ نازل ہوا تو سمجھو وہ گڑھے میں جا گرا)

بائبل (پیدائش ۱۸: ۱۸-۱۹) کا بیان ہے کہ "ابرہام سے تو یقیناً ایک بڑی اور زبردست قوم پیدا ہوگی اور زمین کی سب قومیں اس کے وسیلے سے برکت پائیں گی۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ وہ اپنے بیٹوں اور گھرانے کو جو اس کے پیچھے رہ جائیں گے وصیت کرے گا کہ وہ خداوندکی راہ میں قائم رہکر عدل وانصاف کریں تاکہ جو کچھ خداوند نے ابرہام کے حق میں فرمایا ہے اسے پورا کرے گا۔" ابراہیم کے متعلق یہی بات زیادہ واضح طور پر قرآن کریم میں ملتی ہے۔ رزق کی کمی تو پھر بھی کوئی بات ہوئی حضرت ابراہیمؑ نے تو صرف اللہ پر بھروسہ رکھ کر اپنی اولاد کو ایک بالکل بے آب وگیاہ وادی میں لے جاکر چھوڑا اور ایک بنجر خطہ کو آباد کرنا چاہا۔ لیکن جس دعا کے ساتھ انھیں چھوڑا اس سے سراغ ملتا ہے کہ کسی عظیم مقصد کی خاطر چھوڑا تھا نہ کہ صرف کھانے کپڑے کی غرض سے۔ رَبَّنَا اِنِّيْ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ (ابراھیم) اے ہمارے پروردگار! میں نے تیرے معزز گھر کے پاس اس بیابان میں جہاں کھیتی نہیں اپنی کچھ اولاد کو نماز قائم کرنے کے لیے بسایا ہے۔

تنبیہات کا ایک طویل سلسلہ ہے کہاں تک گنایا جائے۔ البتہ انسان کی اولیں پیدائش کے وقت سب سے پہلی تنبیہ جو ساری تنبیہات کی جان ہے قابل غور ہے۔ انسان جسم و روح کا مجموعہ ہے۔ اس لیے انسانی زندگی کے لیے اللہ نے دو طرح کا انتظام کیا تھا۔ ایک جسم کے لیے مادی ضروریات کا جس کی طرف بار بار اشارہ قرآن کریم میں آیا ہے اور دوسرا روح کی بالیدگی کے لیے تقویٰ وتزکیہ نفس کا پروگرام اور لباس تقویٰ کو بہتر بتلاتے ہوئے اتباع نفس وشیطان سے جو عریانیت آتی ہے اس کا مظاہرہ آدم وحوا کے قصے میں بیان کر دیا:-

يَآدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ اور اے آدم! تم اور تمہاری زوجہ جنت میں

الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظّٰلِمِينَ (الاعراف)
رہو اور جہاں سے چاہو کھاؤ مگر اس شجر کے پاس نہ پھٹکنا کہ تم ظالموں میں شمار ہو۔

اس مذکورہ جنت میں اگر اللہ کی ہدایت کے مطابق رہا جائے تو اس میں نہ صرف پیٹ، لباس اور مکان کا مسئلہ حل شدہ ہے بلکہ اس میں روحانی تسکین کا پورا سامان ہے۔

فَقُلْنَا يَا آدَمُ إِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقَىٰ ○ إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ ○ وَأَنَّكَ لَا تَظْمَأُ فِيهَا وَلَا تَضْحَىٰ ○ (طٰہٰ)

تو ہم نے کہا کہ آدم یہ تمہارا اور تمہاری زوجہ کا دشمن ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تم دونوں کو جنت سے نکلوا باہر کرے تو تم مشقت میں پڑجاؤ اور جنت میں تو تم کو ایسے مزے ہیں کہ نہ تم بھوکے رہتے ہو اور نہ ننگے۔ نیز یہ کہ یہاں نہ تم پیاسے ہوتے ہو اور نہ دھوپ میں رہتے ہو۔

اس عظیم تنبیہ کے علاوہ انسان کی ارضی زندگی کی ہدایت کے لیے اللہ نے پیغمبروں کا سلسلہ قائم کر دیا تھا جن کا کام ہی یہ تھا کہ انسان کو ظلمات سے نکال کر نور کی طرف لائیں جبکہ شیطانی کوشش ہمیشہ اس کے برخلاف رہی۔ جب جب آبادی بڑھی اور خرابیاں پیدا ہوئیں تو پیغمبر آئے، ہدایات دیں، ماننے والے محفوظ ہوئے۔ منھ موڑنے والوں کا جو انجام ہونا تھا ہوا۔ یہ سلسلہ چلتا رہا یہاں تک کہ ساری ہدایات مکمل شکل میں آخری پیغمبر کے ذریعہ قرآن کریم میں قیامت تک کے لیے محفوظ ہوگئیں اور آپؐ کا عملی نمونہ اور طریق کار (Conduct) بھی احادیث کی شکل میں۔ ہدایت کے دونوں سرچشمے دنیا کی مشترک جائداد ہیں۔

وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِنَ اللّٰهِ (القصص)

اس سے زیادہ گمراہ اور کون ہوگا جس نے اللہ کی رہنمائی کے بغیر اپنی خواہش نفس کی پیروی کی

(باقی)

اشارات کا بقیہ

لادینیت (سکولرزم) پر۔ جب تک دنیا سے اس تصورِ زندگی کو بیخ و بُن سے اکھاڑ نہ پھینکا جائے۔ اسلامی زندگی کے نفاذ و قیام کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ جماعت اسلامی ہمیشہ لادینیت کے تصورِ زندگی کو تمام خرابیوں کی جڑ سمجھتی اور کہتی آئی ہے۔ امیر جماعت اسلامی ہند اپنے رسالہ "بھارت کی نئی تعمیر اور ہم" میں ملک کے سربراہوں کی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

• اگر فی الواقع یہ سمجھا جا رہا ہے کہ ملک کی اصلاح و ترقی کے لیے ایسے اشخاص درکار ہیں جو نہایت اعلیٰ جذبات و صفات سے متصف ہوں اور اس کے لیے کسی درجے میں اس بات کی بھی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے کہ ملک میں اس غرض کے لیے کوئی سازگار ماحول پیدا کرنے کا انتظام کیا جائے تو رہنماؤں کو یہ بھی بتانا چاہیے کہ آخر انھوں نے ایسے لوگ اور ایسا ماحول پیدا کرنے کا کیا انتظام کیا ہے؟ کیا اس کے جواب میں وہ سیکولرزم کا نام لیں گے جس کو سب ہی رہنما بڑے شوق اور پیار سے پروان چڑھانے میں مشغول ہیں؟ حالانکہ جیسا کہ آپ سنیں گے سیکولرزم ہی درحقیقت جملہ خرابیوں کی جڑ ہے کیا اس کے جواب میں ان کوششوں کو سامنے لایا جائے گا جو قوم میں قوم پرستی کی روح پھونکنے کے لیے کی جا رہی ہیں لیکن قوم پرستی تو خود ایک طرح کی خود غرضی ہی کا نام ہے اس میں اور ذاتی خود غرضی میں فرق چھوٹے بڑے درجے ہی کا تو ہے ورنہ روح اور حقیقت کے لحاظ سے دونوں ایک ہی ہیں۔ پھر یہ صفت محمود کس طرح ہو جائے گی؟ حالانکہ یہ خود غرضی بڑی ہونے کی وجہ سے اور زیادہ قابلِ مذمت ہونی چاہیے اور جب قوم پرستی بھی خود غرضی ہی کا دوسرا نام ہے تو جو شخص قوم و ملک کے فائدے کے لیے خود غرضی کا مرتکب ہو سکتا ہے وہ آخر ذاتی اغراض کے لیے کیوں اس سے باز رہے گا؟ کیا چیز اس سے مانع ہو سکتی ہے؟

پھر محترم امیر جماعت "خرابیوں کی جڑ" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:۔

• اگر یہ بات صحیح ہے کہ انسان کے اعمال و اخلاق اس کے فکر و عقیدے کی پیداوار ہیں، افکار و عقائد تخم کی حیثیت رکھتے ہیں اور اعمال و اخلاق اس کے برگ و بار کی، تو آپ ہی سوچیں کہ مغربی تہذیب و تمدن اور لادینی نظامِ زندگی کے ثمرات و نتائج کیا ہو سکتے ہیں؟ اگر اس دنیا کا کوئی خالق و مالک نہیں ہے جس کی رضا کا حصول ہماری جملہ انفرادی و اجتماعی کوششوں کا مقصود ٹھہرے اور جب اس کا عطا کیا ہوا کوئی ضابطۂ اخلاق نہیں ہے جس کو سامنے رکھ کر افراد و اقوام اچھائی یا برائی کا فیصلہ کر سکیں اور جب اپنے اعمال کی کسی دانا و بینا ہستی کے سامنے

کوئی جواب دہی کرنی نہیں ہے، جس کا اندیشہ ہمیں با اخلاق بنا سکے تو پھر آپ ہی بتائیں کہ ہر فرد و قوم کیوں نہ زیادہ سے زیادہ اس دنیا کے مزے لوٹنے کی کوشش کرے کیوں نہ وہ اخلاقی ضابطے اپنی پسند و مرضی کے مطابق بنائے اور کیوں نہ وہ اپنے اغراض کے لیے دوسروں کی حق تلفیاں کرے؟ اور کون نہیں جانتا کہ انہیں افکار و تصورات پر مغربی تہذیب و تمدن کی پوری عمارت قائم ہوئی ہے۔"

آگے وہ محدود مذہبیت کے تحت لکھتے ہیں :-

دوسری بات جو اس موقع پر عرض کرنی ہے وہ یہ ہے کہ آپ اس بات سے اطمینان محسوس کریں کہ چونکہ ہندوستان نے ابھی دین کو بالکلیہ خیر باد نہیں کہہ دیا ہے بلکہ یہاں کے لوگ مسجد و مندر کے ساتھ اب بھی اپنا رشتہ قائم کیے ہوئے ہیں۔ اس لیے یہاں لادینیت کی وہ خرابیاں رونما نہ ہو سکیں گی جو دوسرے ملکوں میں رونما ہو چکی ہیں۔ یہ اطمینان سراسر ناواقفیت کا نتیجہ ہوگا، لادینیت کا مطلب ہر صورت میں یہ نہیں ہے کہ مذہب کے لیے کوئی گنجائش ہی نہ چھوڑی جائے۔ جن ملکوں میں لادینیت رائج ہے وہاں بھی مذہب کو صرف عام کاروبار زندگی سے نکالا گیا ہے لیکن انسان کی پرائیوٹ زندگی کی حد تک اس کو باقی رہنے کی اجازت دی گئی ہے۔ اور اس میں شبہہ نہیں کہ کثرت سے لوگ مذہب کو مان رہے ہیں اور اس کے اس محدود تصور کے ماتحت اب بھی ایک حد تک مذہبی زندگی گزار رہے ہیں لیکن یہ مذہبیت خرابیوں کی لیے کسی درجے میں روک نہیں بن سکی اس لیے آپ یہ دیکھ کر کہ لوگ اپنی پرائیوٹ زندگی میں رسمی عبادت یا پوجا پاٹ کرتے رہتے ہیں۔ یہ اطمینان ہرگز محسوس نہ کریں کہ اس کی وجہ سے وہ خرابیاں پیدا نہ ہو سکیں گی جو لادینیت کے ساتھ وابستہ ہیں۔ یہ سوال کہ اس قسم کی مذہبیت کو کہاں تک مذہبیت کا نام دیا جا سکتا ہے ایک علیحدہ سوال ہے۔ یہاں موضوع کی مناسبت سے صرف اس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ جب ہماری زندگی کے تمام کاروبار خدا سے بے نیاز ہو کر انجام پائیں اور اسی کا پرچار بھی ہو، تو مذہب کے ساتھ یہ پرائیوٹ تعلق زندگی پر کس درجہ اثر انداز ہو سکتا ہے اور باقی بھی رہ سکتا ہے یا نہیں؟ ہم چاہتے ہیں کہ اس سوال پر محض نظری حیثیت سے غور کرنے کے بجائے آپ واقعات کی روشنی میں غور کریں۔ کیا واقعہ نہیں ہے کہ مذہب کے ساتھ یہ پرائیوٹ تعلق بھی روز بروز مضمحل ہوتا جا رہا ہے۔ اور جو لوگ اس وقت مذہب کے علمبردار ہیں وہ خود اسی لادینیت کے سیلاب میں بہتے نہیں چلے جا رہے ہیں؟"

وہ اسلامی نظام حیات کی توضیح کرتے ہوئے ایک جگہ پھر لکھتے ہیں :-

"آپ کو معلوم ہے کہ لادینیت صرف ایک نظریہ ہی نہیں ہے اور نہ اس کے اثرات زندگی کے کسی خاص گوشے تک محدود

ہیں بلکہ یہ زندگی کے ہر ہر شعبے پر حاوی ہو چکی ہے اور اس کی بنیاد پر ہر شعبۂ زندگی کے متعلق مستقل نظام فکر بن چکے ہیں۔ یہ جمہوریت، یہ قوم پرستانہ ڈکٹیر شپ اور آخر میں یہ اشتراکیت، یہ سب اسی لادینی تصور حیات کے پیدا کردہ سیاسی معاشی نظام ہیں اور یہ آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ ان نظاموں نے دنیا کو کس قسم کے پھل دیے ہیں؟"

آگے ایک جگہ وہ بطور خلاصہ تحریر فرماتے ہیں :۔

"خلاصہ یہ کہ اس وقت دنیا کو جس قسم کے بھی اندرونی و بیرونی مسائل درپیش ہیں ان کا صحیح حل درحقیقت اس بات پر موقوف ہے کہ دنیا مغرب کے لادینی اثرات سے اپنے کو پاک کرکے پھر سے اپنی اصل کی طرف رجوع کرے۔ اپنے خالق و مالک کو پہچانے، اپنے کو اس کا محکوم و غلام سمجھے اور پوری زندگی اس کی دی ہوئی ہدایات کے سانچے میں ڈھال کر اس کی حقیقی رضا حاصل کرنے کی کوشش کرے۔"

لادینیت پر اگر مگر سے خالی یہ واشگاف تنقید، جماعت اسلامی کے ان امتیازات میں سے ایک ہے جن کی وجہ سے یہ دوسری جماعتوں سے الگ پہچانی جاتی ہے اور یہ تنقید اس کے نصب العین کا بالکل فطری تقاضا ہے۔ جماعت اسلامی کو جو خصوصیات حاصل ہیں ان کا تذکرہ بھی امیر جماعت اسلامی ہند کی زبان سے سنیے۔ "بھارت کی نئی تعمیر اور ہم" میں طریق کار کے تحت فرماتے ہیں :۔

پہلی یہ کہ یہ خدا پرستی کی دعوت ہے۔ اس لیے اس میں کسی دنیاوی غرض کا شائبہ نہیں پایا جاسکتا اور اگر ہو تو یہ اس کا نقص ہے جو خود اس کے لیے تباہ کن ہو سکتا ہے۔

دوسری یہ کہ خدا پرستی کا مفہوم اس کے نزدیک نہایت وسیع ہے اس کے دائرے میں انسان کی صرف نجی زندگی ہی نہیں آتی بلکہ اجتماعی زندگی بھی اپنے جملہ شعبوں سمیت اس کے مفہوم میں داخل ہے۔

تیسری یہ کہ خدا پرستی کے ساتھ جس میں لامحالہ وحدت الٰہ اور وحدت انسانیت کا تصور شامل ہے۔ قوم پرستی وطن پرستی اور نسل پرستی وغیرہ پرستیوں کا کوئی جوڑ نہیں لگ سکتا اس لیے جماعت کی دعوت بھی کسی خاص قوم و ملک کے ساتھ مخصوص نہیں ہے اس کا تعلق ہر قوم و ملک سے ہے۔ سبھی اس کے مخاطب ہیں اور سبھی کا مفاد اس کے پیش نظر ہے۔ ان خصوصیات کو نگاہ میں رکھ کر آپ غور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ جماعت کا طریق کار ان سیاسی اور مذہبی طریق کار سے قطعاً مختلف ہونا چاہیے جو یا تو مذہب کے محدود تصور کے ساتھ کام کر رہی ہیں یا اپنے سامنے صرف دنیاوی یا کسی خاص ملک و قوم کے قومی و ملکی مفاد کو پیش نظر رکھتی ہیں۔ اس اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جماعت اسلامی نہ محدود معنوں میں کوئی مذہبی جماعت ہے اور نہ رائج الوقت معنوں میں سیاسی جماعت اور اسی

بنا پر ہمارا اب تک طریق کار یہ رہا ہے کہ ہم نے اپنے کو نہ صرف ہر اس تحریک سے علیحدہ رکھا بلکہ اس سے علیحدہ رکھنے کی دعوت دی ہے جس کا مدعا محض کوئی دنیاوی و مادی غرض ہو اور اسی بنا پر ہمیں اب بھی ایسی تحریکات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے جو کسی دنیاوی غرض کے لیے ہوں۔

ان تینوں خصوصیات کے علاوہ ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ ہم دوسری جماعتوں کی طرح اپنے گرد کوئی بھیڑ جمع کرنا نہیں چاہتے جس سے وقتی طور سے جوش دلا کر کچھ کام لینا مقصود ہو بلکہ اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ سب سے پہلے لوگ فکری طور سے ہماری دعوت پر متفق ہوں اور اس کے بعد جب وہ اسے حق سمجھ لیں تو اس کو اپنی پوری وسعت و استطاعت کے مطابق اپنی زندگی کی خصوصیت بنائیں اور اس کے خلاف کسی بات کو ارادی طور پر اختیار نہ کریں اور آخر یہ کہ اپنے اندر فکر و عمل کی ضروری تبدیلی پیدا کر کے اس بات کے لیے تیار ہو جائیں کہ سب مل کر حق کے علمبردار بنیں اور اپنے نمونے سے بھی اس کے حق ہونے کا ثبوت پیش کریں۔

جماعت اسلامی جس نصب العین کے لیے قائم ہوئی اور جن خیالات و نظریات کے ساتھ قائم ہوئی ان کا یہ بہت ہی مختصر خاکہ ہے جو میں نے اپنے الفاظ میں پیش کرنے کے بجائے محترم امیر جماعت اسلامی ہند کے الفاظ میں پیش کرنا پسند کیا ہے کیونکہ ان کے الفاظ میرے الفاظ سے زیادہ مستند ہیں۔ اس خاکے کو سامنے رکھ کر اب ان تین مرحلوں کی تھوڑی سی تفصیل سنیے جن کا ذکر اوپر گزرا ہے۔

پہلا مرحلہ ایک ایسی عظیم انقلابی دعوت لے کر اٹھنے والی جماعت کا استقبال جس طرح اس ملک میں ہوا ہوگا اس کو عقل و قیاس کی نگاہ بھی دیکھ سکتی ہے لیکن اس کی ضرورت نہیں اس لیے کہ ابھی اس جماعت کے السابقون الاولون موجود ہیں اور جو کچھ گزری ہے وہ خود ان پر گزری ہے۔ جماعت اسلامی ہند کے لیے پہلا سخت مرحلہ تقسیم ہند کا مرحلہ تھا۔ تقسیم کے بعد بھارت اور پاکستان دونوں ہی ملکوں پر جو قیامت ٹوٹی اور انسانی شکل و صورت رکھنے والی مخلوق نے جس حیوانیت بہیمیت اور درندگی کا ثبوت دیا اس پر ابھی زیادہ مدت نہیں گزری ہے' اور بھارت میں رہنے والے مسلمانوں پر آفتوں کا جو کالا بادل ٹوٹ کر برسا اسے بھی ہم بھولے نہیں ہیں۔ اس خطرناک دور کی یاد آج بھی ہمیں سہما دیتی ہے اور جہاں تک جماعت اسلامی کا تعلق ہے اس کا تو ایسا تیا پانچہ ہوا کہ بھارت میں اس کے پھر اٹھ کھڑے ہونے کی بہت مشکل سے توقع کی جا سکتی تھی' اس کے ارکان کی نہ صرف اکثریت پاکستان کے حصے میں جا چکی تھی بلکہ اس وقت کے کل ہند امیر قیم' شعبۂ تنظیم' مکتبہ' جماعت کا آرگن اور مرکزی دفتر غرض سب کچھ پاکستان منتقل ہو چکا تھا اور یہاں بھارت میں ۔۴۰ ۔ ۴۲ عملاً منتشر ارکان کے سوا کچھ نہ بچا تھا۔ ملک کی حالت یہ تھی کہ پبلک مقامات پر اسلام

کا نام لینا بھی ایک جہاد سے کم نہ تھا اور خوف وہراس کی وہ کیفیت طاری تھی جس سے پناہ مانگنی چاہیے۔ اس وقت جو حالت تھی اس کا مختصر نقشہ قیم جماعت اسلامی ہند نے بھی اپنی اس مرکزی رپورٹ میں کھینچا ہے جسے انھوں نے ۱۹۵۱ء کے کل ہند اجتماع رامپور میں پڑھا تھا وہ لکھتے ہیں :۔

"جس وقت جماعت اسلامی ہند کی تشکیل ہوئی وہ ہمارے لیے ایک نازک دور تھا ایک طرف تو غیر مسلموں میں اشتعال، انتقام، عصبیت اور تعصب کے جذبات بھڑک رہے تھے اور دوسری طرف مسلمانوں پر خوف، ہراس اور انتشار کی حالت طاری تھی مسلمان ایک طرف اکثریت سے اور دوسری طرف نئے نظام حکومت سے خائف و مرعوب تھے۔ دن رات فرقہ پرستی سے بے زاری خود سیاست سے بے زاری اور شاذونادر نعوذ باللہ اسلام سے بے زاری مسلمانوں کا اور ان کی انجمنوں کا عام دستور بنا ہوا تھا' ایسے حالات میں مسلم قوم کے چند افراد کا مل کر ملک اور قوم کے مسائل پر غور وفکر کرنا اور سدھار و اصلاح حال کا کوئی کام کرنا ایک بڑا مشکل اور صبر آزما معاملہ تھا۔

(روداد اجتماع رامپور)

ان تاریک حالات میں امید کا صرف ایک چراغ روشن تھا۔ وہ یہ کہ بفضل الٰہی کوئی رکن خدا کو نہ بھولا تھا جس سے اس نے عہد کیا تھا' کسی کے دل سے اس کی حمایت ونصرت کا عقیدہ گم نہ ہوا تھا جس پر اسے بھروسہ تھا۔ ان ارکان کو متحد کرنے والی چیز کوئی شخصیت نہ تھی جس کے ہٹ جانے سے یہ اتحاد پاش پاش ہوجاتا بلکہ اللہ پر ایمان، نصب العین، مقصد حیات اور اسلام کے اصولوں نے انہیں متحد کیا تھا اور یہ سب کے سب جوں کے توں موجود تھے وہ حی وقیوم خدا جو تمام کائنات کو تھامے ہوئے ہے اپنی پوری شانِ جلال وجمال کے ساتھ موجود تھا' موجود ہے' موجود رہے گا ۔
وسط اپریل ۱۹۴۸ء میں بمقام الٰہ آباد' بھارت کے ارکان جماعت اسلامی کا ایک نمائندہ اجتماع منعقد ہوا جس میں راقم الحروف بھی موجود تھا۔ حالات کے دباؤ کی وجہ سے جماعت اسلامی ہی کے نام سے از سر نو سابق غیر منقسم جماعت اسلامی کی تنظیم ایک نازک مرحلے میں داخل ہوچکی تھی لیکن اللہ کی نصرت وحمایت کے بھروسے پر ارکان کی غالب اکثریت نے نام' نصب العین اور طریقۂ کار میں کسی معمولی ترمیم وتبدیلی کے بغیر اس جماعت کے احیاء کا فیصلہ کرکے متفقہ طور پر مولانا ابواللیث ندوی اصلاحی کو اپنا امیر منتخب کرلیا۔ جماعت اسلامی پاکستان سے اس کے تمام مالی' مشاورتی اور تنظیمی تعلقات باضابطہ توڑ لیے گئے اور ہندستان میں ایک مستقل بالذات جماعت اسلامی وجود میں آگئی جس خدا کے بھروسے پر اس کی تنظیم نو عمل میں آئی تھی اس نے اسے اپنی مدد سے محروم نہ رکھا اور خزانۂ غیب سے اس کے لیے تمام ساز وبرگ مہیا کردیے اس نے نہ صرف ارکان جماعت کے دلوں کو تقویت بخشی بلکہ اس جماعت کے ذریعہ دوسرے مسلمانوں کے دلوں سے بھی خوف

ہراس دور کرنے کی خدمت لی۔ ان حالات میں یہاں کے دہشت زدہ مسلمانوں نے جب حکومت الٰہیہ، اسلامی ریاست، اقامتِ دین اور خلافت علیٰ منہاج النبوہ کی آوازیں سنیں تو ان کے دلوں کو اس سے بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ ان نازک حالات میں جماعت اسلامی نے صرف قول سے نہیں اپنے عمل سے بھی یہ بات ثابت کی کہ وہ جس تحریک کی علمبردار ہے وہ قومی تعصبات اور مسلم قوم پرستی سے دور کا تعلق بھی نہیں رکھتی وہ جن اصولوں پر یقین رکھتی ہے اور جنہیں بلالحاظ قوم و ملت پورے ملک کے سامنے پیش کر رہی ہے وہ بادِ سحر کے نرم جھونکوں اور سورج کی سنہری کرنوں کی طرح تمام انسانوں کے لیے عام ہیں۔ اس طرح جماعت اسلامی ہند اپنے پہلے سخت مرحلے سے بخیریت گزر گئی۔

دوسرا مرحلہ

میرے نزدیک جماعت اسلامی ہند کو ۱۹۵۱ء میں دوسرا سخت مرحلہ اس وقت پیش آیا جب مختلف مذہبی حلقوں کے علماء نے اس کے خلاف اجتماعی فتاویٰ کے دہانے بیک وقت کھول دیے۔ انفرادی طور پر الگ الگ مضامین اور چھوٹے بڑے پمفلٹ کی شکل میں تو یہ خدمت غیر منقسم ہندستان ہی کے وقت سے انجام دی جارہی تھی لیکن اجتماعی طور پر چہار طرف سے یہ حملہ ۱۹۵۱ء میں کیا گیا اور خالص مذہبی رنگ میں کیا گیا تاکہ مسلمانوں کے درمیان اس جماعت کی ہوا بالکل اکھاڑ دی جائے اور یہ ٹھٹھر کر رہ جائے۔ اگرچہ خود جماعت میں مختلف طبقوں کے علماء کی نمائندگی موجود تھی اور باہر بھی ہر طبقے میں انصاف پسند علماء موجود تھے اور ان کی اخلاقی تائید بھی جماعت کو حاصل تھی لیکن اس کے باوجود ان علماء کے اثرات مسلم عوام و خواص پر بہت زیادہ تھے جو جماعت اسلامی کو بالکل گردن زدنی قرار دے رہے تھے۔ ہندستان کی بہت بڑی علمی دینی اور سیاسی شخصیت کی طرف سے الزامات کی ایک لمبی فہرست پیش کی گئی تھی جس کا حاصل یہ تھا کہ مسلمانوں کے تمام گمراہ فرقے ایک طرف اور جماعت اسلامی تنہا ایک طرف یعنی اس میں تمام گمراہ فرقوں کی گمراہیاں اور خرابیاں یکجا ہوگئی ہیں۔ ان شدید حملوں کے دواعی و اسباب کیا تھے ان پر اس مختصر مقالے میں بحث بے کار ہے۔ اگر کبھی جماعت اسلامی ہند کی مفصل تاریخ مرتب ہوئی تو اس میں ان پر تفصیلی بحث ہوگی۔ یہاں صرف یہ واضح کرنا ہے کہ اس سخت مرحلے سے جماعت اسلامی کا بخیریت گزر جانا تین وجوہ سے ممکن ہوا۔ ایک یہ کہ فی الواقع ان الزامات کی کوئی حقیقت نہ تھی، وہ جھوٹ کا طومار تھے یا غلط فہمیوں کا انبار۔ جماعت کے ارکان کہیں خلا میں معلق نہ تھے بلکہ عام مسلمانوں کے درمیان زندگی بسر کر رہے تھے۔ مسلمان اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ جن لوگوں پر الزامات لگائے جارہے ہیں، ان کی زندگیاں ان سے پاک ہیں۔ دوسری وجہ صبر و ضبط اور استقامت کی وہ کیفیت تھی جو ارکان پر پورے ہندستان میں چھائی ہوئی تھی اور تیسری وجہ یہ تھی کہ امیر جماعت اسلامی ہند اور دوسرے ذمہ داران جماعت نے پوری جرأت ایمانی کے ساتھ اپنے بیانات و

تصریحات میں جماعتی نصب العین اور جماعتی موقف کی نمائندگی کی اور کسی بڑی سے بڑی شخصیت کی خواہش کی بنیاد پر بھی اپنے عقائد و نظریات، اپنے نصب العین، اپنے طریقۂ کار اور اپنے موقف میں کوئی تبدیلی پیدا کی بلکہ کسی مداہنت کو بھی گوارا نہ کیا۔ اس استقامت اور اتحاد فکر و عمل نے ہر حملے کو ناکام بنا دیا۔ اس وقت امیر جماعت اسلامی ہند نے جو تحریریں لکھی تھیں ان میں کا ایک پیراگراف بڑا مؤثر اور قیمتی ہے۔ انھوں نے ماہنامہ زندگی جون، جولائی، اگست ۱۹۵۱ء کے مشترک شمارے کے اشارات میں لکھا تھا:۔

"جماعت اسلامی جو دعوت لیکر کھڑی ہوئی ہے وہ ایک ہمہ گیر انقلابی، اصلاحی دعوت ہے جو زندگی کی پوری عمارت کو اسلام کی بنیاد پر تعمیر کرنا چاہتی ہے اور چونکہ بدقسمتی سے صدیوں سے ہمارا حال یہ رہا ہے کہ ہم اسلام کی اس جامعیت کو عملاً فراموش کر چکے ہیں اور بہت سے لوگ تو اس کی اس حیثیت سے اعتقادی طور سے بھی بے تعلق ہو چکے ہیں۔ اس لیے دعوت اور اس کی سرگرمیوں سے بہت سے لوگوں کا بِدکنا اور پھر اس کی مخالفت پر آمادہ ہو جانا کوئی عجیب بات نہیں ہے جس وقت اس راہ میں ہم نے قدم اٹھایا تھا اسی وقت اس کا اچھی طرح اندازہ کر لیا تھا کہ ہم ایک ایسے کام کا بیڑا اٹھا رہے ہیں جس کی صحیح نوعیت اور اہمیت کا اگر لوگ اعتراف کریں گے تو ایک عرصے کے بعد ـــــ اور اس سے پہلے ہمارے خلاف غلط فہمیوں، بدگمانیوں، اعتراضوں، بہتان طرازیوں اور انتہائی مخالفتوں کا ایک طویل دور گزرے گا جس سے بچنے کی اگر کوئی صورت ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ ہم اپنی دعوت میں لوگوں کی خواہش کے مطابق بنیادی تبدیلیاں کر لیں اور اس سے کم پر راضی ہو جائیں جتنا کہ فی الواقع اسلام کا مطالبہ ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ ایسا کرنا ہمارے اختیار کی بات نہیں ہے۔ ہماری حیثیت دین کے پیرو اور داعی کی ہے نہ کہ اس میں اصلاح و ترمیم کرنے والوں کی اس لیے اگر ہمیں اپنا کام جاری رکھنا ہے اور اس کے لیے ہم شرعاً اپنی ذمہ داری محسوس کرتے ہیں تو پھر قدرتی طور پر ہمیں اس کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے کہ ہماری مخالفتیں کی جائیں ہم پر لعن و طعن کی بوچھار ہو، ہمارا مقاطعہ کیا جائے اور ہمیں قتل تک کی دھمکیاں دی جائیں چنانچہ آج یہی سب کچھ ہو رہا ہے۔"

یہ تھا اپنے موقف پر وہ یقین جس نے ہر شیطانی اغوا اور ہر شیطانی خواہش کو ہمارے اندر گھس آنے سے روک دیا اور ہم اپنے عقائد و نظریات اور اپنے نصب العین پر پہاڑ کی طرح جمے رہے۔ کاش استقامت و یقین کی وہی کیفیت آج بھی ہمیں حاصل ہوتی اور ہر غلط دباؤ کے مقابلے میں آج بھی ہم سینہ تان کر کھڑے ہو سکتے۔

تیسرا مرحلہ تیسرے مرحلے پر گفتگو سے پہلے مناسب ہے کہ ارکان جماعت اسلامی پر جو فرائض اور ذمہ داریاں ہ

ہوتی ہیں ان میں سے اسی ذمہ داری اور اس فرض کی یاد دہانی کرلی جائے جو ہم میں سے ہر ایک پر خود جماعت، نصب العین اور دستور کے تعلق سے عائد ہوتی ہے۔ تشکیل جماعت کی بالکل ابتدا میں یہ فرض ان الفاظ میں ارکان کے سامنے رکھا گیا تھا۔

"اللہ تعالیٰ کی طرف سے جماعت کی خیر خواہی کا جو فرض آپ پر عائد ہوتا ہے اس کے معنی صرف یہی نہیں ہیں کہ بیرونی حملوں سے آپ اس کی حفاظت کریں بلکہ یہ بھی ہیں کہ اندرونی امراض سے بھی اس کی حفاظت کے لیے ہر وقت مستعد رہیں جو نظام جماعت کو خراب کرنے والے ہیں۔ جماعت کی سب سے بڑی خیر خواہی یہ ہے کہ اس کو راہِ راست سے نہ ہٹنے دیا جائے۔ اس میں غلط مقاصد اور غلط خیالات اور غلط طریقوں کے پھیلنے کو روکا جائے۔ اس میں نفسانی دھڑے بندیاں نہ پیدا ہونے دی جائیں۔ اس میں کسی کا استبداد نہ چلنے دیا جائے۔ اس میں کسی دنیوی غرض یا کسی شخصیت کو بت نہ بننے دیا جائے اور اس کے دستور کو بگڑنے سے بچایا جائے۔"

(روداد حصہ اول، صفحہ ۱۵)

آگے جو کچھ لکھا جائے گا اس میں اس جذبۂ خیر خواہی کے سوا اور کوئی چیز شامل نہیں ہے۔ میرے نزدیک جماعت اسلامی ہند آج ۱۹۶۳ء میں جہاں کھڑی ہے وہ اس کے لیے تیسرا مرحلہ ہے جو پہلے دو مرحلوں سے زیادہ سخت ہے۔

اوپر جماعت اسلامی کی دعوت، اس کے نصب العین، اس کے خیالات و افکار اور اس کے امتیازات و خصوصیات کا جو مختصر خاکہ پیش کیا گیا ہے اور پھر دو مرحلوں کی سرگذشت میں اس کے نظم و ضبط، نصب العین پر استقامت، جذبۂ ایثار و قربانی، نظامِ حق سے محبت اور نظامِ باطل سے بے زاری و نفرت، اپنے مسلک و موقف پر پختہ یقین اور اس معاملے میں لوگوں کی خواہشات کے قبول نہ کرنے کے عزم کا جو مختصر نقشہ گزر رہا ہے اس کو معیار بنا کر جائزہ لیجیے۔ کیا ہم ۱۹۶۳ء میں بھی اسی اونچے مقام پر کھڑے ہیں جہاں ۱۹۵۲ء میں کھڑے تھے۔ حالانکہ ملک کے امن و امان کی کیفیت اور خارجی حالات آج اس خطرناک دور کے مقابلے میں جو گزر گیا کہیں زیادہ بہتر ہیں۔

کیا آج بھی ہم اتحادِ فکر و عمل کی اسی منزل میں ہیں جہاں آج سے دس سال پہلے تھے۔ کیا آج بھی ہماری توانائیوں کا بڑا حصہ اقامت دین کے نصب العین پر صرف ہو رہا ہے۔ کیا آج بھی واقعی یہی نصب العین ہماری تمام جد و جہد کا محور و مرکز بنا ہوا ہے؟ ابھی حال میں ایک دینی حلقے کی طرف سے چھپے چھپے لفظوں میں ہم پر اپنے نصب العین سے عملاً ہٹ جانے اور قوم پرستانہ رخ اختیار کر لینے کا الزام لگایا گیا ہے کیا واقعی وہ سو فی صدی غلط ہے؟ آج ہمارے کانوں سے بعض لوگوں کی یہ بات ٹکرا رہی ہے کہ "جماعت اسلامی والے ٹھوکریں کھا کر اسی راہ پر آئے ہیں جس پر ہم چل رہے ہیں" تو کیا ان کی یہ بات بالکل بے اصل ہے خود ایک رکن جماعت نے اپنے مکتوب میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے کیا وہ

"فکری زوال" کی علامت نہیں ہیں ؟ میری خیر خواہی کا تقاضا تھا کہ میں ان سوالات کی طرف توجہ مبذول کراؤں ان سوالات کو نظر انداز کرنا اور ان سے جان چرانا جماعت کے لیے کسی حال میں بھی مفید نہیں ہے۔ ہم میں سے ہر شخص پر جماعت کے دستور و نصب العین کی خیر خواہی فرض ہے اور ہر شخص کو یہ فرض انجام دینا چاہیے۔ میں جماعت اور دستور کی خیر خواہی سے منہ موڑنے کا مجرم ہوں گا اگر اپنا یہ احساس ظاہر نہ کروں کہ او پر جس معیار کا ذکر کیا گیا ہے اس کے لحاظ سے ہم ۱۹۵۲ء کے مقابلے میں بہت پست مقام پر کھڑے ہیں حالانکہ ۱۹۵۲ء کا مقام بھی معیارِ مطلوب سے نیچے ہی تھا۔

خدا کرے یہ اندیشہ کبھی صحیح ثابت نہ ہو کہ ہم دستور کی عبارتیں پڑھتے پڑھاتے ہوئے عملاً اس سے بالکل بدل چکے ہوں۔ میں گڑ گڑا کر قرآن نازل کرنے والے اللہ رب العلمین کی بارگاہ میں دعا کرتا ہوں کہ اے اللہ! جماعت اسلامی ہند کو اس سخت مرحلے سے بھی بخیریت گزار دے۔ مسلم حقوق و مفاد کے تحفظ کے لیے یہاں پہلے بھی جماعتیں موجود تھیں اور آج بھی موجود ہیں لیکن تیرے بھیجے ہوئے دین کی اقامت و تنفیذ کے لیے اس ایک جماعت کے سوا کوئی دوسری جماعت کام کرنے والی نہیں ہے۔ تو اسے بگڑنے سے بچالے۔

(بقیہ تنقید)

جائزہ

جماعت اسلامی حلقۂ حیدر آباد نے حکومت آندھرا پردیش کے مروّجہ نصاب تعلیم کا جائزہ لینے کے لیے ایک کمیٹی بنائی تھی جس کے داعی سید جمال احمد ابن آبادی مقرر کیے گئے تھے۔ انھوں نے جائزہ لیا وہی جائزہ پمفلٹ کی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ اس جائزے کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح ہندستان میں تعلیم کے ذریعہ شرک و بت پرستی پھیلانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس جائزے کے چند ذیلی عنوانات یہ ہیں :-

مشرکانہ عقائد کی تعلیم ــــ غیر اسلامی تصورات ــــ رسالت کا غلط تعارف ــــ عقیدہ تناسخ ــــ پہاڑوں اور دریاؤں کا تقدس ــــ موسیقی کی تقدیس۔

یہ جائزہ شعبۂ دینی تعلیم جماعت اسلامی حیدر آباد دکن نے شائع کیا ہے اور وہاں سے منگوایا جا سکتا ہے۔

(ع۔ق)

تنقید و تبصرہ

نگار اڈیٹر:۔ اکبر علی خاں۔ قیمت سالانہ:۔ دس روپے۔ فی پرچہ:۔ ۷۵ نئے پیسے۔ مقام اشاعت:۔ دفتر نگار، گھیر سنجی۔ رام پور۔ یوپی۔

دینی اور ادبی دونوں ہی نقطۂ نظر سے یہ خوشی کی بات ہے کہ نیاز فتح پوری کا "نگار" اب ایسے ہاتھوں میں منتقل ہو گیا ہے جنہیں دین و مذہب کا چہرہ بگاڑنے سے نہیں، علم و ادب کی زلفیں سنوارنے سے دلچسپی ہے۔ جہاں تک صورت کا تعلق ہے جناب اکبر علی خاں نے اس کی سابقہ روایت کو اس طرح برقرار رکھا ہے کہ ٹائٹل دیکھ کر کوئی شخص یہ نہیں سمجھ سکتا کہ یہ لکھنؤ کا نگار نہیں ہے۔ وہی سائز، ہیئت، ٹائٹل اور کتابت کا انداز سب کچھ وہی ہے۔ اس کے اب تک دو شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ دوسرا شمارہ تو ایک چھوٹا سا غالب نمبر ہی ہے۔ پہلے شمارے میں متعدد موضوعات پر مضامین ہیں۔ ان مضامین میں تبصرہ نگار کے نزدیک مختلف جہتوں سے مولانا عبدالسلام خاں صاحب کا مقالہ بہت قیمتی ہے۔ بڑی قابلیت اور اونچی سطح سے لکھا گیا ہے۔ اللہ تعالٰے کے وجود و صفات پر چند صفحات میں گویا ایک پوری کتاب کا مواد سمیٹ لیا گیا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ کسی مضمون کے ہر لفظ اور ہر نکتے سے اتفاق ضروری نہیں۔ بحیثیت مجموعی اونچا مضمون ہے اور اس کو سمجھنے کے لیے بھی اچھی خاصی استعداد کی ضرورت ہے۔ "غالبیہ" کا سلسلہ بھی غالب سے عشق رکھنے والوں کے لیے مفید ہے۔ پہلے نمبر کے ملاحظات میں جن عنوانات پر خاص نمبر شائع کرنے کا پروگرام شائع کیا گیا ہے وہ ادب کی آتش شوق میں اشتعال پیدا کرتا ہے۔ اس ماہنامے کا چندہ دس روپے سالانہ غالباً اسی پروگرام کی وجہ سے مقرر کیا گیا ہے۔ پاکستان سے اب جو نگار نکل رہا ہے اس پر بھی کہیں نظر پڑی تھی۔ تبصرہ نگار کے نزدیک بحیثیت مجموعی نگار ہند، نگار پاکستان سے بہتر ہے۔ (ع۔ ق)

تعارف مضامین قرآن جلد اول تالیف مولانا محمد سلیم الدین شمسی۔ صفحات ۲۲۴ قیمت مجلد مع گرد پوش دو روپے آٹھ آنے
ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ رومی ۱۳۲ برنیٹ روڈ۔ کراچی ۵

مولانا سلیم الدین شمسی پہلے کراچی سے ایک ماہانہ رسالہ "مقام رسالت" نکالتے تھے جو اصلاً فتنۂ انکار حدیث یا تحریف قرآن کے خلاف نکالا گیا تھا۔ زیر تبصرہ کتاب انہیں کی تالیف ہے۔ اس کی تالیف کا سبب انھوں نے خود یہ بیان کیا ہے کہ رمضان المبارک ۱۳۸۱ھ میں کراچی کی ایک مسجد میں تراویح کے اندر قرآن کریم کا جو حصہ پڑھا جاتا تھا وہ اس کا مضمون اور خلاصہ لوگوں کو سنا دیا کرتے تھے لوگوں نے اس کو پسند کیا اور بعد کو ان کے احباب نے تقاضا کیا کہ اس کو شائع کر دیا جائے چنانچہ "تعارف مضامین قرآن" کے نام سے انھوں نے اس کو شائع کر دیا ہے۔ یہ پہلی جلد ہے۔ اس میں سورۂ فاتحہ سے لے کر سورۂ طٰہٰ کے رکوع ۷ تک کا خلاصہ آگیا ہے۔ ابتدا میں انھوں نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ اس کو قرآن کا ترجمہ یا تفسیر نہ سمجھا جائے کیونکہ مصنف کے نزدیک متن کے بغیر صرف اردو ترجمہ شائع کرنا جائز نہیں ہے اس کتاب کو بس ایک مختصر تعارف سمجھا جائے۔ مصنف متوقع ہیں کہ اس کو پڑھنے کے بعد قرآن کا ترجمہ اور تفسیر ایک ابتدائی آسانی کے ساتھ پڑھ لے گا۔ اس کتاب پر مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور چند دوسرے علماء کی تقریظیں بھی ہیں

اس زمانے میں جب پاکستان میں قرآن کے مضامین و احکام کو مسخ کرنے کی مستقل تحریک چل رہی ہے، ہر ایسی کوشش قابل قدر ہے جو قرآن کے صحیح مطالب و مفاہیم لوگوں کے سامنے پیش کرے۔　　　(ع - ق)

حقوق الاسلام
(مع رسالہ سماع و مزامیر)

مصنفہ:- قاضی ثناء اللہ پانی پتی۔ مترجمہ:- وحید الدین سلیم پانی پتی۔ صفحات ۱۲۸ مجلد مع گرد پوش
قیمت:- دو روپے۔ ناشر:- پاک اکیڈمی۔ گولیمار۔ کراچی

قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ نے فارسی زبان میں ایک مختصر رسالہ حقوق الاسلام کے نام سے لکھا تھا یہ اس کا اردو ترجمہ ہے۔ اس ترجمے کا مقدمہ شیخ اسمٰعیل پانی پتی نے لکھا ہے۔ اس میں انھوں نے اس کتاب کے جلیل القدر مصنف کا مختصر حال لکھا ہے۔ حضرت قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جنہیں قاضی عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ نے "بیہقی وقت" کا خطاب دیا تھا اپنی تفسیر مظہری کی وجہ سے بڑی شہرت رکھتے ہیں۔ فقہ کی مشہور کتاب "مالابد منہ" بھی انہیں کی تصنیف ہے۔ اس کتاب کے آخر میں قاضی ہی صاحب کے ایک رسالہ سماع و مزامیر کا ترجمہ بھی شامل ہے۔ شیخ اسمٰعیل صاحب پانی پتی نے مقدمہ میں جزم و یقین کے ساتھ لکھا ہے کہ ان دونوں رسالوں کے ترجمے سید وحید الدین سلیم ہی صاحب کے قلم سے ہیں۔ تبصرہ نگار کے سامنے چونکہ اصل رسائل موجود نہیں ہیں اس لیے ترجمے کے بارے میں کوئی تبصرہ نہیں کیا جا سکتا۔ "حقوق الاسلام" کا ترجمہ پہلے "حقیقت الاسلام" کے نام سے وحید الدین صاحب نے ۱۹۰۴ء میں "حالی پریس" پانی پت سے شائع کیا تھا اور اب یہ کراچی سے شائع کیا گیا ہے اس میں مصنف علام نے قرآن اور احادیث کی روشنی میں اللہ و رسول کے حقوق کے بعد دیگر انسانی حقوق کو اجمال کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ اس کتاب کے مفید ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔　　　(ع - ق)

(باقی تنقید صفحہ ۶۲)

ذی الحجہ ۱۳۸۲ھ
مئی ۱۹۶۳ء

جلد:- ۳۰
شمارہ:- ۵

مدیر:- سید احمد قادری

• خط وکتابت وارسال زر کا پتہ — منیجر "زندگی" رامپور، یوپی
• زر سالانہ :- صہ ششماہی :- تین روپیہ — فی پرچہ :- پچاس نئے پیسے
• —— ممالک غیر سے :- دس شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر

پاکستانی اصحاب مندرجہ ذیل پتہ پر رقوم بھیجیں اور رسید ہمیں ارسال فرمائیں
منیجر ہفت روزہ "شہاب" ۱۱/c شاہ عالم مارکیٹ لاہور

مالک:- جماعت اسلامی ہند- اڈیٹر:- سید احمد عروج قادری- پرنٹر پبلشر:- احمد حسن مطبع:- دہلی پرنٹنگ پریس، بنگلہ آزاد خاں رامپور
دفتر زندگی وکانتی رامپور یوپی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

(سید احمد قادری)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی اور راہ حق میں ان کی فداکاری کو ایک لفظ میں سمیٹنا ممکن ہو تو اس کے لیے "قربانی" سے بہتر لفظ شاید ہی مل سکے — چار ہزار برس پہلے شہر اُر کا مقدس ترین انسان جس نے اللہ کی راہ میں اپنا سب کچھ لٹا دیا، قربان کر دیا

یہ تھے حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام۔

اُر اس عہد کے جاہلی تمدن کا نمائندہ شہر، وقت کی مادی تہذیب کا معیاری نمونہ، ننار (چاند دیوتا) کی مملکت کا پایۂ تخت جس کی نیابت، نمرود کا شاہی خاندان کرتا تھا، وہ نمرود جس کی حکومت، جبر و قہر کا لاجواب ماڈل تھی۔ وہ نمرود جس کی صف میں آگے چل کر فرعون نے نمایاں مقام حاصل کیا —— ننار کا بت خانہ اُر کی سب سے اونچی پہاڑی پر پتھر کی عالی شان عمارت تھی، ایک پورا محل، جسے شاہی محل سرا کہنا چاہیے جس پر ملک کی سیکڑوں کنواریاں وقف تھیں تاکہ ہر رات ان میں کی ایک چاند دیوتا کی خواب گاہ میں دلہن بنے۔ جہاں عورت کا کسی اجنبی کے لیے اپنا گوہر عصمت لٹانا ذریعہ نجات تھا۔ وہ محل سرا پجاریوں کی صرف عیش گاہ ہی نہ تھی، مملکت کی سب سے بڑی عدالت بھی تھی، جس کا فیصلہ، خدا کا فیصلہ تھا۔ پجاریوں کے گروہ اور شاہی خاندان کو خدا کا درجہ حاصل تھا اور دوسرے تمام باشندے ان کے بندے تھے ان انسانی معبودوں میں سب سے بڑا نمرود تھا، ننار کا اوتار اور اس کا نائب — باشندگان ملک کا کام یہ تھا کہ اس خدا کے چرنوں میں اپنا سب کچھ لٹائیں، اور اس خدا کا کام یہ تھا کہ ان کے سروں پر اپنی خدائی کا تخت بچھائے —— یہ نقشہ تھا کہ اس مملکت کے سب سے بڑے افسر کے گھر میں حضرت ابراہیم پیدا ہوئے۔

خالص مشرکانہ ماحول اور مادیت میں ڈوبی ہوئی فضا میں انھوں نے آنکھ کھولی۔ ہر طرف سورج، چاند اور دوسرے تاروں کی خدائی کے ڈنکے بج رہے تھے۔ انسان کے جذبۂ عبدیت کی تسکین کے لیے بت، مجسمے، پجاری اور بادشاہ حاضر تھے اور اس کی حیوانیت کی آسودگی کے لیے صنعت، تجارت، شراب اور عورت موجود تھی۔ قحبہ گری اور بدکاری رائج ہی نہ تھی بلکہ اس کو مذہب اور سیاست دونوں کی سندِ جواز حاصل تھی۔

حضرت ابراہیم کی عمر جیسے جیسے شعور و ادراک کی سرحدوں کو چھو رہی تھی ویسے ویسے ان کے اندر ماحول کے خلاف، جذبات بیدار ہو رہے تھے۔ اچھے ماحول سے اثر پزیری تو ایک عام بات ہے اس میں کوئی خصوصیت نہیں، لیکن جب ہادیِ مطلق کی رحمت جوش میں آتی ہے تو وہ کفر و شرک اور معصیت کی کالی اور بھیانک رات میں، ہدایت اور نیکی و اطاعت کا چراغ روشن فرما دیتا ہے۔ گمراہ انسانوں کے درمیان ایک ایسے فرد کو نشو و نما دیتا ہے جس کی فطرتِ سلیم پر ماحول کی کوئی بیماری اثر انداز نہیں ہوتی بلکہ وہ بیمار ماحول کے لیے طبیب حاذق بن جاتی ہے۔ حضرت ابراہیم کو بھی اللہ نے نبوت و رسالت کے لیے چن لیا تھا، شہر اُر کا سڑا ہوا ماحول انہیں متاثر نہ کر سکا۔ ننار کا دیو ہیکل بت اور اس کی بیوی ننگل کا حسین مجسمہ انہیں انسانی ہاتھ کا ایک کھیل، ایک تماشا اور ایک مذاق نظر آیا۔

ان کی متجسس نگاہوں نے چاند اور سورج کا جائزہ لیا اور وہ اس حقیقت کو پا گئے کہ یہ خدا تو کیا ہوتے انسانوں سے بھی زیادہ مجبور و بےبس ہیں۔ یہ خود ایک ایسے قانون میں جکڑے ہوئے ہیں کہ بال برابر بھی وہ اس سے ہٹ نہیں سکتے۔ آخر کار وہ چاند اور سورج ہی کو زینہ بنا کر اس بارگاہ قدس میں پہنچ گئے جو پوری کائنات کا مالک ہے۔ ان کی روح فرطِ مسرت سے جھوم اٹھی اور زبان سے بے ساختہ نکلا۔

إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي	میں نے یکسو ہو کر اپنا رخ اس ہستی کی طرف
فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا وَمَا	کر لیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور
أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ (انعام ر۹)	میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔

آج ہم حضرت ابراہیمؑ کے اس اعلان کو ایک سیدھا سادہ اور ٹھنڈا اعلان سمجھتے ہیں لیکن جس قوم جس ملک اور جس سوسائٹی میں کھڑے ہو کر انھوں نے یہ اعلان کیا تھا اس نے اس کو اپنے خلاف ایک زلزلہ انگیز اور شعلہ فشاں نعرہ قرار دیا تھا، اس لیے کہ اس نے اس کا مطلب یہ سمجھا تھا کہ ابراہیمؑ اپنے اس اعلان کے ذریعہ اپنا رخ ننار سے موڑ رہے ہیں پجاریوں کے گروہ سے موڑ رہے ہیں، نمرود سے موڑ رہے ہیں، شاہی خاندان سے موڑ رہے ہیں، وقت کے قانون سے موڑ رہے ہیں

ندانی رسم و رواج سے موثر رہے ہیں اور رہ اس چیز سے موثر رہے ہیں جو فاطر السموات والارض کی طرف رخ
پیدھا کرنے میں حائل ہو۔ یہی وجہ ہے اس نے اسے خاموشی کے ساتھ نہیں سنا بلکہ حسب دستور قدیم وہ پہلے اس
عامان کے مقابلے میں حجت بازی پر اتر آئی۔ قرآن کہتا ہے :۔ وَحَاجَّهُ قَوْمُهُ اور اس کی قوم اس سے
جھگڑنے لگی۔ اس کے حافظے سے خالق کائنات کی یاد اس کی عظمت اس کی یکتائی اور اس کے حقوق اس طرح محو
ہو چکے تھے کہ حضرت ابراہیم کی دعوت توحید بالکل اوپری نرالی اجنبی اور نئی نظر آئی۔ اس نے کہا تم یہ کیا
بات اپنے منہ سے نکال رہے ہو کیا تم چاند دیوتا سے نہیں ڈرتے ؟ کیا تمہیں اپنے باپ کا عہدہ یاد نہیں رہا
کیا تم نمرود کے قہر و غضب سے بے پروا ہو گئے ؟ انھوں نے کہا۔ خوب! تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ اللہ
کے ساتھ دوسروں کو شریک قرار دے رہے ہو جس کی کوئی دلیل و سند تمہارے پاس نہیں ہے اور مجھے ان بے سند
چیزوں سے ڈرا رہے ہو۔ میں خدا کے مقابلے میں ان سے کس دلیل کی بنا پر ڈروں ؟ تم خود سوچو کہ ہم دونوں میں
کون فریق امن و اطمینان اور بے خوفی کا زیادہ مستحق ہے۔ ان کی اس بات کا قوم کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ ان
کی دعوت توحید سے خود ان کے گھر میں بھونچال آگیا۔ پوری قوم میں کھلبلی مچ گئی اور نمرود کا دربار بھی دہل گیا
اور پھر وہ سب کے سب ان کے مقابلے میں صف بستہ ہو گئے۔ انھوں نے اپنی سطح بینی کی وجہ سے یہ سمجھا کہ وہ
یکہ و تنہا ہیں انہیں دبا لینا کیا مشکل ہے وہ یہ نہیں دیکھ سکے کہ ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ خدا ہے جس کے
لشکر کی تعداد کوئی گن نہیں سکتا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت توحید بھی جاری رہی اور قوم سے بحث و مناظرہ بھی ہوتا رہا۔ ایک بار
انھوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا یہ مورتیں کیا ہیں جن کے گرد تم لوگ جمع رہتے ہو اور جن کے اس قدر گرویدہ
ہو ؟ گزشتہ مشرک قوموں کی طرح ان کی قوم کے پاس بھی اس شرک کے لیے تقلید آبا کے سوا کوئی دلیل نہ تھی
انھوں نے جواب میں یہی دلیل دی کہ "ہم نے اپنے باپ دادا کو ان کی عبادت کرتے پایا ہے" ـــــ اب وقت
آگیا تھا کہ قوم سے صاف صاف یہ کہہ دیا جائے کہ جن آبا و اجداد کی دلیل تم پیش کرتے ہو وہ سب گمراہ تھے
چنانچہ انھوں نے کہا۔ تم بھی گمراہ ہو اور تمہارے باپ دادا بھی صریح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے ۔ یہ سنکر اُن
کی قوم گویا بھونچکا ہو گئی۔ اس کے تصور میں بھی یہ بات نہ آسکتی تھی کہ کوئی شخص خود اپنے باپ دادا کو گمراہ
کہنے کی جرات کر سکتا ہے اس نے حیرت کے ساتھ پوچھا "کیا تو ہمارے سامنے سنجیدہ اور واقعی بات کہہ رہا ہے یا مذاق

کرتا ہے۔ قوم کا سوال یہ بتا رہا ہے کہ وہ باپ دادا کو گمراہ کہنے کی بات کو سنجیدگی اور حقیقت سے دور سمجھتی تھی۔ انھوں نے اپنی قوم سے کہا نہیں یہ مذاق نہیں ہے " بلکہ فی الواقع تمہارا رب وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب اور ان کا پیدا کرنے والا ہے، اس پر میں تمہارے سامنے گواہی دیتا ہوں " لیکن پشتہا پشت سے مورتیوں کے بارے میں جو عقیدہ جمایا گیا تھا وہ کب مٹنے والا تھا اس لیے حضرت ابراہیم نے محسوس فرمایا کہ اب عملی مظاہرہ کر کے قوم کے سامنے مورتیوں کی بے بسی واضح کی جائے۔ انھوں نے قوم سے کہا " اور خدا کی قسم میں تمہاری غیر موجودگی میں ضرور تمہارے بتوں کی خبر لوں گا "

سالانہ جشن کے موقع پر انھوں نے اپنی اسکیم پر عمل کر کے دکھایا۔ جشن شہر کے کسی میدان میں منایا جاتا تھا، انہیں بھی اس میں شرکت کی دعوت دی گئی لیکن انھوں نے اپنے بارے میں ایک ایسی بات کہی کہ دعوت دینے والوں نے انہیں شرکت سے معذور سمجھ لیا اور انہیں تنہا چھوڑ کر سب لوگ جشن منانے چلے گئے اس تنہائی سے فائدہ اٹھا کر وہ بت خانے میں گھس گئے اور ایک بڑے بت کے سوا تمام بتوں کو توڑ پھوڑ دیا۔ چونکہ انبیاء کرام دعوت و تبلیغ اور اس سے متعلق تمام امور براہ راست، اللہ کی نگرانی میں انجام دیتے ہیں اس لیے بلاشبہہ یہ بہت بڑا عملی اقدام انھوں نے اللہ کے اذن ہی سے کیا تھا۔ اس عملی اقدام سے ان کی دعوت توحید پوری قوم کے سامنے ایک ایسی دلیل کے ساتھ ثابت ہوگئی جسے وہ اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی، وہ بت جن کے بارے میں یہ عقیدہ پھیلایا گیا تھا کہ وہ خدا کی خدائی میں شریک اور صاحب اختیار ہیں، اس کی آنکھوں کے سامنے ٹوٹے پھوٹے پڑے تھے، شرک کا طلسم باطل ہوچکا تھا اور سرداران قوم کی گردنیں، ذلت و رسوائی کے احساس سے جھکی ہوئی تھیں، لیکن جب اٹھیں تو ان کی پیشانیوں پر عرق انفعال کے بجائے انتقام کی سلوٹیں اور ان کے چہروں سے غصے کی آگ برس رہی تھی۔ ہر ایک چہرا لال بھبوکا بنا ہوا تھا۔

حضرت ابراہیم نے خاندانی جاہ و منصب اور عیش و آرام پر تو اسی دن لات ماردی تھی جب انھوں نے وَمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ کا اعلان کیا تھا اور اب ان کے سامنے خدا کی خوشنودی اور اس کے دین کی سربلندی کے لیے ایثار و قربانی کی ایک ایسی راہ کھل گئی تھی جس میں انہیں اپنا سب کچھ لٹا دینا تھا چنانچہ وہ بت شکنی کی پاداش میں جیل میں ڈال دیے گئے اور ان کا مقدمہ خود ان کے باپ نے جو حکومت کا سب سے بڑا عہدہ دار تھا، نمرود کے سامنے پیش کیا، اس کی کونسل نے فیصلہ کیا کہ مجرم کو آگ کے الاؤ میں ڈال دیا جائے۔ حضرت ابراہیم کو پہلے سے معلوم ہوگا کہ اس " جرم عظیم " کی سزا کیا ہوسکتی ہے اس لیے انھوں نے یہ فیصلہ بڑے اطمینان سے سنا ہوگا اللہ کی راہ میں جاں

منصب اور عیش و آرام کی قربانی کے بعد یہ جان کی قربانی تھی۔

جس خدا کے لیے انھوں نے یہ قربانی دی تھی وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ ابراہیم اس آزمائش میں پورے اترتے ہیں یا نہیں؟ جب آگ کے دہکتے ہوئے الاؤ میں وہ ڈال دیے گئے تو آزمائش پوری ہو گئی اور پھر پدر ابراہیم کی قساوت قلبی نے، نمرود کی جھوٹی خدائی نے اور باغی قوم کی تماشہ بین نگاہوں نے خدائے قادر و توانا کا یہ ادنیٰ کرشمہ دیکھا

قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَّسَلَامًا عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ ۝ (انبیاء ر۵)

ہم نے کہا اے آگ ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی بن جا ابراہیم پر۔

اور دوسرے لمحے، دہکتے ہوئے شعلوں کا الاؤ، مہکتے ہوئے پھولوں کا باغ بن گیا۔ اندازہ لگائیے کہ جب وہ ہنستے ہوئے آگ سے باہر آئے ہوں گے تو نمرود اور اس کے پجاریوں کے چہروں کا رنگ، کس تیزی سے بدل گیا ہوگا۔ آخرت میں تو وہ چہرے سیاہ ہوں گے ہی اس دنیا میں بھی ذلت و رسوائی کے احساس سے سیاہ پڑ گئے ہوں گے۔ قرآن نے کہا:-

وَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَخْسَرِينَ (انبیاء، ر۵)

وہ چاہتے تھے کہ ابراہیم کے ساتھ برائی کریں مگر ہم نے بری طرح ان کو ناکام کر دیا۔

جان کی قربانی اگرچہ بہت مشکل کام ہے، یہ آخری نذرانۂ عبدیت ہے جو بندۂ محتاج اپنے غنی و حمید آقا کے حضور پیش کرتا ہے لیکن اس کے باوجود چند لمحے کی بات ہے اور ہجرت، جلا وطنی، ترک وطن اگرچہ آخری نذرانۂ عبدیت نہیں لیکن وہ کوئی لمحاتی چیز نہیں ہے۔ خدا کے لیے اس جگہ کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دینا جس کی محبت طبعی طور پر انسان کے اندر رچی بسی ہوتی ہے ایک طویل اور صبر آزما قربانی ہے بلکہ وہ قربانیوں کا ایک لمبا سلسلہ ہے۔ حضرت ابراہیم نے خدا کی راہ میں یہ قربانی بھی دی، ان کا باپ جو اپنا سرکاری منصب بچانے کے لیے انہیں آگ کے حوالے کرنے سے بھی باز نہ آیا وہ کس طرح برداشت کر سکتا تھا کہ اس کا "باغی" بیٹا اپنی "خطرناک" دعوت پھیلاتا رہے چنانچہ ایک دن اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ تم میرے پاس سے چلے جاؤ اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو، شاید وہ سمجھتا تھا کہ بیٹے کی تمام توحید پرستی، میرے اور میرے گھر کے سہارے چل رہی ہے۔ گھر میں کھانے کو مل جاتا ہے اور آرام سے قیام کی جگہ مہیا ہے اس لیے یہ تمام دعوتی بلند پروازیاں ہیں جب گھر سے نکالے جائیں گے تو پتہ چلے گا کہ آٹے دال کا بھاؤ کیا ہے۔ شرک اور حب دنیا نے اس کے دل کی آنکھوں کو اندھا کر دیا تھا اس لیے وہ ایمان باللہ کی طاقت کو محسوس

نہیں کرسکا ـــــ شہر اُر کی پوری آبادی میں سے صرف حضرت لوطؑ نے جو حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے تھے ان کی پیروی اختیار کی اور چونکہ حضرت لوطؑ کو بھی اللہ تعالےٰ نے نبوت عطا کی اس لیے کہنا چاہیے کہ عام آبادی سے کوئی ایک شخص بھی حضرت ابراہیمؑ پر ایمان نہ لایا ۔ وقت آگیا تھا کہ وقت کا نبی، شرک اور اہل شرک سے برارت و بیزاری کا اعلان کرکے ہجرت اختیار کرے چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے خدا کی راہ میں اپنے وطن کو بھی قربان کردیا۔ ہجرت سے پہلے انھوں نے شرک و اہل شرک سے برارت کا جو اعلان کیا تھا اسے قرآن نے متعدد مقامات پر نقل کیا ہے لیکن سورہ ممتحنہ کے الفاظ اپنی ایک خاص شان رکھتے ہیں۔ اس سورہ کی آیت ۴، ۵، ۶ سامنے رکھیے۔ میں آیت ۴ کا ایک ٹکڑا یہاں نقل کرتا ہوں :-

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ	تمہارے لیے ابراہیمؑ اور اس کے ساتھیوں کی
فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا	زندگی میں بہترین نمونہ ہے جب کہ انھوں نے اپنی قوم سے
لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَآءُ مِنكُمْ وَمِمَّا	کہا تھا، ہم تم سے اور ان تمام چیزوں سے جنہیں
تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ	تم اللہ کے سوا پوجتے ہو بالکل بری ہیں، ہم نے تمہارا
وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ	انکار کیا اور ہمارے اور تمہارے درمیان عداوت
أَبَدًا حَتَّىٰ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ	اور نفرت ہمیشہ کے لیے آشکار ہوگئی یہاں تک کہ
وَحْدَهُ ۔	تم اللہ واحد پر ایمان لاؤ ۔

اور پھر وہ انی مهاجر الی ربی انه هو العزیز الحکیم (میں وطن چھوڑ کر اپنے رب کی طرف جاتا ہوں بلاشبہ وہ غالب و حکیم ہے) اور انی ذاهب الی ربی سیهدین (میں اپنے رب کی طرف جاتا ہوں وہ میری رہبری فرمائے گا) کہتے ہوئے اپنے وطن سے نکل گئے بایں حال کہ ان کے ساتھ ان کی بیوی حضرت سارہ اور بھتیجے حضرت لوطؑ کے سوا کوئی نہ تھا، خدا پر توکل اور اس کی راہ میں قربانی کی یہ ایک بے نظیر مثال تھی، ان کی قوم نے اور خود ان کے باپ نے اپنے "باغی" بیٹے کی بے بسی و بے کسی پر شاید تالی پیٹ دی ہوگی، کیونکہ اسے معلوم نہ تھا کہ جس بیٹے کو وہ یکہ و تنہا سمجھ رہا ہے اس کی ذات میں پوری ایک امت چھپی ہوئی ہے اور اس کی پشت پر اللہ اور اس کا بے شمار لشکر ہے

آزمائشوں کی اس بھٹی سے کندن کی طرح نکلنے کے باوجود ابھی ایک آزمائش اور باقی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ اپنا سب کچھ قربان کرچکے تھے لیکن ابھی ایک اور عظیم قربانی وقت کی منتظر تھی، وطن سے نکلنے کے بعد اللہ نے انہیں اس

سے زیادہ سرسبز و شاداب اور بابرکت خطے میں بسایا، زمین دی، جائداد دی، مال و اسباب دیے اور امن و سکون عطا فرمایا اور پھر بڑھاپے میں حضرت اسمٰعیل جیسا فرزند عطا فرمایا۔ بوڑھے باپ کو اپنے اکلوتے اور لائق فرزند سے جو محبت ہوگی وہ کوئی ناقابل تصور شے نہیں ہے آج بھی اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جب یہ لائق فرزند اس لائق ہوا کہ زندگی کے کاروبار میں اپنے باپ کا مددگار بنے تو اللہ کی طرف سے حکم آیا کہ ابراہیم خود اپنے ہاتھ سے اس بیٹے کو ذبح کر دیں۔ العظمۃ للّٰہ، یہ ایک ایسی آزمائش تھی کہ اللہ کی طرف سے بھیجی ہوئی آزمائشوں کی پوری تاریخ اس کی مثال سے خالی ہے، یہ اپنے پورے حقیقی معنی کے لحاظ سے بے نظیر آزمائش تھی جو صرف حضرت ابراہیم کے لیے خاص کر دی گئی تھی۔

یہ ابتلا تھی براہیم کے لیے مخصوص ‌ ‌ ‌ خود اپنے ہاتھ سے اپنے پسر کی قربانی

انھوں نے اپنے اکلوتے سے کہا، بیٹے خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں غور کرکے بتا تیری کیا رائے ہے۔ بیٹے نے جواب میں کہا۔ ابا آپ کو جو حکم دیا جا رہا ہے اسے کر گزریے۔ انشاء اللہ آپ مجھے صابر پائیں گے —— چار ہزار برس پہلے کے اس ہیبت ناک اور اضطراب انگیز منظر سے تصور کی آنکھیں بھی پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں جب خدا کے ایک بندے نے اپنے آقائے ولی نعمت کے حکم سے اپنے لائق ترین اکلوتے بیٹے کی گردن پر چھری چلا دی۔ ایک ایسا حکم جو نہ ابراہیم سے پہلے کسی کو دیا گیا اور نہ ان کے بعد۔ بے شک خدا کی محبت میں قربانی دینے والے بہت سے افراد، تاریخ کے اسٹیج پر متحرک نظر آتے ہیں لیکن خود تاریخ گواہ ہے کہ اس نے ان دو باپ بیٹوں کی قربانی سے بڑی قربانی کبھی نہیں دیکھی۔

بندہ جب اس بے نظیر آزمائش میں پورا اتر گیا تو اس کے آقائے ولی نعمت نے جو اجر اُسے عطا کیا وہ بھی بے نظیر تھا۔ نبوت و رسالت جو اس کائنات میں سلطان کائنات کی طرف سے دیے ہوئے مناصب میں مقدس ترین و عظیم ترین منصب ہے۔ ذریت ابراہیم کے لیے خاص کر دی گئی۔ باپ خلیل اللہ کے لقب سے ملقب ہوئے اور بیٹا ذبیح اللہ قرار پایا۔ ان دونوں پر نعمتوں، رحمتوں اور برکتوں کا وہ بادل برسا کہ نہال ہو گئے، باغ باغ ہو گئے اور دونوں نے اپنے آقا کے حضور شکر گزار پیشانیاں جھکا دیں۔ پھر خدا نے چاہا کہ اس بے نظیر قربانی سے جو "اسلام" کا معیاری نمونہ ہے دوسرے بندے بھی فیض پائیں تو اس نے اس دن کو قیامت تک کے لیے یادگار دن اور اس قربانی کو قیامت تک کے لیے یادگار قربانی بنا دیا۔ ہم اور آپ یوم النحر میں جو جانور قربان کرتے ہیں وہ اسی عظیم قربانی کی یادگار اور اس کا ایک پرتو ہے ———

(باقی صفحہ ۴۴ پر ملاحظہ ہو)

امر بالمعروف ونہی عن المنکر

(قسط ۳)

(مولانا سید جلال الدین عمری)

'امر بالمعروف ونہی عن المنکر' اس انقلابی کام کا عنوان ہے جو خدائے تعالیٰ امتِ مسلمہ سے لینا چاہتا ہے۔ اس لیے
ہمیں یہ جاننا ضروری ہے کہ معروف ومنکر ہے کیا؟ اور معروف کا حکم دینا اور منکر سے روکنا کسے کہتے ہیں؟ اس
کے بغیر ہم کبھی بھی یہ کام انجام نہیں دے سکتے۔ ہماری عام بول چال میں 'معروف' ان اخلاقی خوبیوں کو کہتے ہیں جن کا اچھا
ہونا ہر ایک کے نزدیک تسلیم شدہ ہے۔ اسی طرح 'منکر' کی اصطلاح ان اخلاقی خرابیوں کے لیے استعمال کی جاتی ہے جن کو
عقلِ عام برا مانتی ہے۔ اس لیے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے معنی یہ سمجھے جاتے ہیں کہ اچھے کاموں کی نصیحت اور برے
کاموں کی مذمت کی جائے لیکن یاد رکھیے کہ یہ قرآن کا بتایا ہوا مفہوم نہیں ہے بلکہ اسے ہمارے استعمال نے بلکہ زیادہ
صحیح معنی میں ہمارے تنگ ذہن نے پیدا کیا ہے۔ قرآن کے نزدیک نہ تو معروف ومنکر کا دائرہ محض اخلاقیات تک
محدود ہے اور نہ اس نے 'امر ونہی' کے الفاظ وعظ وتبلیغ کے لیے استعمال کیے ہیں۔ قرآن کی زبان میں 'امر بالمعروف ونہی
عن المنکر' کے معنی بہت وسیع ہیں۔ اس میں دین کو اپنی صحیح حالت میں باقی رکھنے اور اسے قائم وغالب کرنے کی تمام کوششیں
شامل ہیں جس شخص کے ذہن میں معروف ومنکر کا محدود تصور ہوگا وہ اخلاق کی تذکیر وتلقین کے بعد مطمئن ہو جائے گا کہ
'امر بالمعروف ونہی عن المنکر' کا حق ادا ہو گیا اور امتِ مسلمہ اپنے فرض سے سبک دوش ہو گئی۔ اقامتِ دین کا بھاری
بوجھ اٹھانے کی نہ تو اسے فکر ہوگی اور نہ وہ اسے اپنا فرض سمجھے گا' بلکہ ہو سکتا ہے کہ دین کو قائم کرنے کی جدوجہد اس کے
نزدیک امتِ مسلمہ کے حدودِ کار سے خارج ہو۔ آپ اس سے کہیں گے کہ خدا نے دین کو قائم کرنے کا حکم دیا ہے اور
وہ جواب دے گا کہ اخلاق کی تبلیغ کے بعد ہمارا فرض ادا ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ اس نے 'امر
بالمعروف ونہی عن المنکر' کی اصطلاح کو صحیح نہیں سمجھا ہے اور اس کے معنی غلط بیان کیے ہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ دین کا

ٹھیک ٹھیک تصور اس کے ذہن میں نہیں ہے اور وہ اس کام کی نوعیت سے ناواقف ہے جس کے کرنے پر امت مسلمہ خدا کی طرف سے مامور ہے۔

'امر بالمعروف ونہی عن المنکر' خالص قرآنی اصطلاح ہے۔ اس پر چند خاص پہلوؤں سے غور کیجیے تو اس کا صحیح مفہوم واضح ہوگا۔

۱۔ قرآن نے 'امر بالمعروف ونہی عن المنکر' کی اصطلاح پیغمبروں کے کام کے لیے استعمال کی ہے اور یہ واقعہ ہے کہ پیغمبر محض اخلاق کا درس دینے نہیں آتے ہیں بلکہ اخلاق کی تعلیم ان کے وسیع کام کا صرف ایک حصہ ہوتی ہے۔ وہ انسانوں کو خدا کی بندگی کی دعوت دیتے ہیں اور خدا کی بندگی کا مطلب یہ ہے کہ انسان زندگی کے ہر معاملے میں خدا کے سامنے جھک جائے۔ ان کا مطالبہ زندگی کے کسی ایک پہلو میں اصلاح کا نہیں ہوتا بلکہ وہ ہمہ جہتی اصلاح چاہتے ہیں۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ انسان پوری طرح خدا کا غلام بن جائے اور اپنے عقائد ونظریات میں، بندگی کے آداب میں، اخلاق ومعاملات میں، تہذیب ومعاشرت میں، طرزِ حکومت وسیاست میں، غرض ہر کام میں اس کے احکام کا تابع ہوجائے۔ ان کی اسی کوشش کو 'امر بالمعروف ونہی عن المنکر' کہا گیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ 'معروف' میں وہ تمام باتیں شامل ہیں جن کے اختیار کرنے کا پیغمبر حکم دیتے ہیں اور 'منکر' سے مراد وہ ساری چیزیں ہیں جن سے وہ منع کرتے ہیں، اور ان کے امر ونہی کا تعلق زندگی کے کسی ایک گوشے سے نہیں بلکہ تمام گوشوں سے ہوتا ہے۔

۲۔ پیغمبروں کا جو مقصدِ وجود ہے ٹھیک وہی امت مسلمہ کا بھی مقصدِ وجود ہے۔ اس لیے اس کا کام بھی یہ ہے کہ دنیا کو معروف کا حکم دے اور منکر سے منع کرے۔ اسی کام کی وجہ سے اسے 'خیر امت' کہا گیا ہے۔ اگر 'امر بالمعروف ونہی عن المنکر' کا مطلب محض اخلاق کی وعظ وتلقین ہے تو دنیا کے بہت سے گروہ اور بہت سی جماعتیں آج بھی یہ کام انجام دے رہی ہیں اور ہمیشہ دیتی رہی ہیں۔ موجودہ دور ہی کو لیجیے جس میں بداخلاقی اپنی آخری حد تک پھیلی ہوئی ہے اور بہت سی اخلاقی قدریں بدل چکی ہیں، لیکن اس کے باوجود ہر جگہ اخلاق کی درس وتدریس ہوتی ہے۔ اخلاق کے موضوع پر کتابیں لکھی جاتی ہیں اور مختلف انجمنیں اور ادارے اخلاق کی تبلیغ واشاعت پر اپنی توتیں صرف کرتی ہیں۔ اگر امت مسلمہ بھی اسی کام میں لگ جائے تو وہ اخلاق کی اصلاح کرنے والے گروہوں میں سے ایک گروہ ہوگی۔ صرف اس ایک کام کی وجہ سے دنیا کی امتوں میں اس کے 'خیر امت' ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسے محض مصلحِ اخلاق نہیں بننا ہے بلکہ زندگی کے ہر میدان میں اصلاح کا کام انجام دینا ہے۔ تب ہی اس کا

کام پیغمبروں کا کام ہوگا اور اس کی حیثیت ایک ممتاز گروہ کی ہوگی خدا نے اسے 'خیرامت' کا مقام اس لیے نہیں عطا کیا ہے کہ وہ دین کے کسی ایک حصے کی تبلیغ کرتی ہے بلکہ یہ مقام اسے اس لیے ملا ہے کہ وہ دنیا میں خدا کے پورے دین کو قائم و غالب کرنے کے لیے وجود میں آئی ہے۔

علامہ ابوحیان اندلسی فرماتے ہیں کہ جن لوگوں کو قرآن نے خیرامت کا لقب دیا انہیں اس لیے دیا کہ

وھی سبقھم الی الایمان برسول	انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان
اللہ وبدارھم الی نصرتہ ونقلھم	میں سبقت کی۔ آپ کی مدد کے لئے سب سے پہلے آگے
عنہ علم الشریعۃ وانتتاحھم	بڑھے۔ آپ سے شریعت کا علم دوسروں تک منتقل کیا
البلاد[1]	اور (خدا کا کلمہ بلند کرنے کے لیے) ملکوں کو فتح کیا۔

۳۔ قرآن نے سورۂ آل عمران میں امت مسلمہ کو 'دعوت الی الخیر' اور 'امر بالمعروف ونہی عن المنکر' کا ایک ساتھ حکم دیا ہے یہ دو الگ الگ حکم نہیں ہیں بلکہ دوسرا حکم پہلے حکم کی تشریح ہے۔ 'دعوت الی الخیر' کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کو خدا کے پورے دین اور اس کی پوری شریعت کی طرف دعوت دی جائے۔ مفسرین نے کہا ہے کہ اسی بات کو مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں سے 'امر بالمعروف ونہی عن المنکر' کے اندر بیان کیا گیا ہے۔ ہم یہاں امام رازی کے الفاظ نقل کرتے ہیں:

الدعوۃ الی الخیر جنس تحتہ	'دعوت الی الخیر' ایک جنس (وسیع حکم) ہے اس
نوعان احدھما الترغیب فی فعل	کی دو قسمیں ہیں ایک یہ کہ ان کاموں کے کرنے کی
ماینبغی وھو الامر بالمعروف الثانی	ترغیب دی جائے جو مطلوب ہیں اسی کا نام 'امر بالمعروف'
الترغیب فی ترک مالاینبغی	ہے۔ دوسری یہ کہ ان چیزوں کے چھوڑنے کی ترغیب
وھو النھی عن	دی جائے جو نامطلوب ہیں اسی کو 'نہی عن المنکر' کہا
المنکر[2]	جاتا ہے۔

نظام الدین قمی نیساپوری لکھتے ہیں:۔

فلاجرم اتبعہ	قطعی بات ہے کہ اللہ تعالے نے 'دعوت الی الخیر'
النوعین زیادۃ فی	کے بعد امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا ذکر مزید وضاحت
البیان[3]	کے لیے کیا ہے۔

---

[1] البحر المحیط جلد ۳ صفحہ ۲۹ [2] التفسیر الکبیر جلد ۳ صفحہ ۲ [3] غرائب القرآن رغائب الفرقان علی ھامش ابن جریر جلد ۴، صفحہ ۳۰

اس سے معلوم ہوا کہ "دعوت الی الخیر" اور "امر بالمعروف ونہی عن المنکر" دونوں حکموں کا منشا یہ ہے کہ دنیا کو خدا کے دین کی طرف بلایا جائے اور اسے بتمام وکمال غالب و سربلند کرنے کی کوشش کی جائے۔

۴۔ یہ دعویٰ کہ معروف و منکر کا دائرہ اخلاق تک محدود ہے حیرت انگیز علمی جسارت ہے۔ تیرہ صدیوں میں کسی بھی قابلِ ذکر صاحبِ علم نے یہ دعویٰ نہیں کیا ہے۔ معروف و منکر کے الفاظ بہت وسیع معنی رکھتے ہیں ان میں عقائد، عبادات اور اخلاق و معاملات سب ہی شامل ہیں۔ انہیں کسی ایک شعبۂ زندگی کے ساتھ مخصوص کرنا ان کی وسعت کو ختم کرنا ہے۔ میں یہاں چند اہلِ علم کی تصریحات نقل کروں گا جن سے اس خیال کی جڑ کٹ جاتی ہے کہ معروف اخلاقی خوبیوں کا اور منکر اخلاقی خرابیوں کا نام ہے۔

قاضی شوکانی:۔

اخرج ابن ابی حاتم عن ابی العالیۃ قال کل اٰیۃ ذکرھا اللہ فی القراٰن فی الامر بالمعروف فھو الاسلام والنھی عن المنکر فھو عبادۃ الاوثان انتھی وھو تخصیص بغیر مخصص فلیس فی لغۃ العرب ولا فی عرف الشرع ما یدل علی ذالک[1]	ابن ابی حاتم کی روایت ہے کہ ابو العالیہ نے کہا کہ "ہر وہ آیت جس میں قرآن نے 'امر بالمعروف' کا ذکر کیا ہے اس سے مراد اسلام ہے اور نہی عن المنکر کا مطلب ہے بتوں کی عبادت سے منع کرنا" لیکن امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی یہ تخصیص بے وجہ ہے۔ عربی زبان میں اور شریعت کے استعمال میں اس تخصیص پر دلالت کرنے والی کوئی دلیل نہیں ہے۔ (اس لیے اسے عام ہونا چاہیے۔)

ابو حیان اندلسی:۔

فسر بعضھم المعروف بالتوحید والمنکر بالکفر لا شک ان التوحید راس المعروف والکفر راس المنکر ولکن الظاھر العموم فی کل معروف مامور بہ فی الشرع وفی کل منھی نھی عنہ فی الشرع[2]	بعض لوگوں نے معروف کی تفسیر توحید سے اور منکر کی تفسیر کفر سے کی ہے لیکن بظاہر اسے عام ہونا چاہیے۔ معروف سے ہر وہ چیز مراد ہے جس کا شریعت نے حکم دیا ہے اور منکر میں وہ تمام باتیں شامل ہیں جن سے شریعت نے منع کیا ہے۔

---

[1] فتح القدیر ج ۱ ص ۳۳۴ [2] البحر المحیط ج ۳ ص ۲۰

امام رازی :۔

راس المعروف الایمان باللہ وراس المنکر الکفر باللہ[1]

معروف کی اصل اللہ پر ایمان ہے اور منکر کی اصل اللہ کا انکار ہے

ابوبکر جصاص :۔

المعروف ھو امر اللہ ..... والمنکر ھو ما نھی اللہ عنہ[2]

معروف سے مراد اللہ کا حکم ہے ..... اور جس چیز سے اللہ نے منع کیا ہے وہ منکر ہے ۔

حاوی :۔

المعروف ھو السنۃ والمنکر ھو البدعۃ[3]

معروف سنت کو اور منکر بدعت کو کہتے ہیں

علامہ سید محمود آلوسی :۔

والمتبادر من المعروف الطاعات ومن المنکر المعاصی التی انکرھا الشرع[4]

بظاہر معروف میں تمام طاعتیں شامل ہیں اور منکر سے وہ سب معصیتیں مراد ہیں جنہیں شریعت نے ناپسند کیا ہے۔

علامہ ابن حجر ہیتمی :۔

المراد بالامر بالمعروف والنھی عن المنکر الامر بواجبات الشرع والنھی عن محرماتہ[5]

امر بالمعروف ونہی عن المنکر سے مراد ہے ان چیزوں کا حکم دینا جنہیں شریعت نے واجب کیا ہے اور ان چیزوں سے منع کرنا جنہیں شریعت نے حرام قرار دیا ہے ۔

ابن ملک :۔

(المنکر) وھو ما لیس فیہ رضاء اللہ من قول او فعل والمعروف ضدہ[6]

جس قول یا فعل میں اللہ کی رضا شامل نہیں ہے وہ منکر ہے اور معروف اس کی ضد ہے ۔

ملا علی قاری :۔

المنکر ما انکرہ الشرع وکرھہ

منکر وہ چیز ہے جس کا شریعت انکار کرے، جو اسے

---

[1] التفسیر الکبیر ج ۲ ص ۵۲۳ [2] احکام القرآن ج ۲ ص ۱۲ [3] روح البیان ج ۱ ص ۹۵ [4] روح المعانی جزو ۴ ص ۲۱ [5] الزواجر عن اقتراف الکبائر ج ۲ ص ۱۶۶ [6] مبارق الازھار شرح مشارق الانوار ج ۱ ص ۵۱

ولم یرض بہ[1]
ناپسند ہوا ور جس سے وہ خوش نہ ہو۔

علامہ مناوی :۔

(من رای منکم منکرا) شیئا قبحہ الشرع فعلا او قولا (فلیغیرہ)[2]
جو شخص تم میں سے منکر کو دیکھے یعنی ایسی چیز جسے شریعت اپنے عمل یا قول سے ناپسند کرے تو اسے بدل دے۔

امام ابن تیمیہ :۔

یدخل فی المعروف کل واجب وفی المنکر کل قبیح والقبائح ھی السیئات وھی المحظورات کالشرک والکذب والظلم والفواحش[3]
معروف میں ہر واجب اور منکر میں ہر قبیح چیز داخل ہے۔ قبیح چیزوں سے مراد برائیاں ہیں یعنی جن سے شریعت نے منع کیا ہے۔ مثال کے طور پر شرک ظلم اور تمام بے حیائی کے کام۔

حقیقت یہ ہے کہ معروف کا لفظ محض اعلیٰ اخلاقی اقدار کے لیے نہیں بولا جاتا بلکہ اعلیٰ اخلاق اس کا صرف ایک حصہ ہیں اسی طرح منکر میں بگڑے ہوئے اخلاق ضرور شامل ہیں لیکن اس کے معنی محض بداخلاقی کے نہیں ہیں۔ خدا کی ذات و صفات، رسول کی رسالت، سنت و شریعت اور پورا اسلامی قانون معروف ہے اور خدا و راس کے رسول کا انکار اور دین و شریعت کی مخالفت کا دوسرا نام منکر ہے۔ معروف و منکر کے الفاظ میں جاننے پہچاننے یا نہ جاننے اور نہ پہچاننے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ جو چیز خدا کی شریعت میں جانی پہچانی ہے وہ معروف ہے اور جو چیز خدا کی شریعت میں نہ جانی پہچانی ہے وہ منکر ہے۔ اگر ہماری عقل کسی چیز کو جان جائے یا رواج عام میں وہ معلوم و مشہور ہو تو قرآن و حدیث کی زبان میں معروف نہیں کہلائے گی۔ اسی طرح ہماری عقل کا کسی چیز کو نہ جاننا یا رواج عام میں اس کا غیر معلوم و غیر مشہور ہونا اسے منکر نہیں بنا دے گا۔ کوئی بھی عقیدہ و عمل اسی وقت معروف یا منکر قرار پائے گا جب کہ شریعت اور اہل شریعت اسے معروف یا منکر قرار دیں۔ ہو سکتا ہے کہ وقت کے دانشمند کسی عمل کو معروف کی حیثیت دے دیں اور وہ شریعت کے نزدیک منکر ہو یا کوئی عقیدہ ان کے لیے منکر ہو اور شریعت اسے معروف کا عنوان عطا کر دے :۔

امام راغب فرماتے ہیں :۔

المعروف اسم لکل فعل یعرف بالعقل او الشرع حسنہ والمنکر ما
معروف ہر اس عمل کا نام ہے جس کی خوبی عقل یا شریعت سے معلوم کی جائے اور منکر وہ ہے جسے عقل

---

[1] المبین المعین لفہم الاربعین ص۱۸۱ [2] التیسیر بشرح الجامع الصغیر ج ۲ ص۴۱۵ [3] العقیدۃ الاصفہانیۃ ص۱۲۱

ینکر بہما[1] اور شریعت ناپسند کرتے ہوں۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ معروف ومنکر کے معلوم کرنے میں عقل کا مرتبہ شریعت کے برابر ہے، بلکہ یہاں عقل سے مراد عقلِ صحیح ہے جس کی صراحت انھوں نے دوسری جگہ کی ہے۔ یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ عقلِ صحیح شریعت سے پوری طرح ہم آہنگ ہوتی ہے۔ کیونکہ خدا کی شریعت کا کوئی ایک لفظ بھی عقل سے متصادم نہیں ہے۔ امام راغب فرماتے ہیں کہ جہاں عقل کسی چیز کے معروف ومنکر ہونے کا فیصلہ نہ کرسکے وہاں شریعت ہی کو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہوگی۔

المنکر کل فعل تحکم العقول الصحیحۃ	منکر وہ ہے جسے عقلِ صحیح برا کہے۔ یا جس کے اچھا
بقبحہ او تتوقف فی استقباحہ و	یا برا ہونے کا عقل فیصلہ نہ کرسکے اور شریعت اس کی
استحسانہ العقول فتحکم بقبحہ الشریعۃ[2]	قباحت کا فیصلہ کردے۔

ابن ابی جمرہ کہتے ہیں کہ جس عمل کو شریعت عملِ نیک کہہ دے وہ معروف ہے۔ خواہ رواج اور دستور اس کے موافق ہو یا مخالف۔ کیونکہ قانون دینے کا حق رواج کو نہیں بلکہ شریعت کو حاصل ہے۔

یطلق اسم المعروف علی ما عرف	معروف کا اطلاق ہر اس نیک عمل پر ہوتا ہے
بادلۃ الشرع من اعمال البر سواء	جو دلیلِ شرعی سے معلوم ہو خواہ عادت اس کے مطابق
جرت بہ العادۃ ام لا[3]	ہو یا نہ ہو۔

امام شوکانی امت مسلمہ کے افراد کے بارے میں فرماتے ہیں:۔

انہم یامرون بما ھو معروف فی	جو چیز اس شریعت میں معروف ہے وہ اس کا حکم
ھذہ الشریعۃ وینھون عما ھو	دیتے ہیں اور جو چیز منکر ہے اس سے منع کرتے ہیں
منکر فالدلیل علی کون ذالک الشیٔ	لیکن اس چیز کے معروف یا منکر ہونے کی دلیل کتاب و
معروفا او منکرا ھو الکتاب والسنۃ[4]	سنت ہوگی۔

علامہ ابن اثیر فرماتے ہیں:۔

(المعروف) اسم جامع لکل ما	معروف ایک جامع اسم ہے۔ اس میں اللہ
عرف من طاعۃ اللہ والتقرب	کی اطاعت، اس کا تقرب لوگوں کے ساتھ حسن سلوک

---

[1] المفردات فی غریب القرآن۔ مادہ 'عرف' [2] المفردات فی غریب القرآن مادہ 'نکر' [3] فتح الباری ج ۱۰ ص ۳۴۲
[4] ارشاد الفحول ص ۸۳

الیہ والاحسان الی الناس وکل
ما ندب الیہ الشرع ونہی عنہ من
المحسنات والمقبحات وھو من
الصفات الغالبۃ ای امر معروف
بین الناس اذا رأوہ لا ینکرونہ[1]
المنکر ... ضد المعروف وکل ما
قبحہ الشرع وحرمہ وکرھہ فھو منکر[2]

اور وہ تمام نیکیاں یا برائیاں شامل ہیں جن کی شریعت
نے ترغیب دی ہے یا جن سے اس نے منع کیا ہے۔
یہ صفات غالبہ میں سے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے
کہ یہ کام لوگوں کے درمیان معروف ہے اس وقت
کہا جائے گا جب کہ وہ اسے ناپسند نہ کرتے ہوں۔
منکر، معروف کی ضد ہے۔ ہر وہ چیز جسے شریعت
نے قبیح، حرام اور مکروہ کہا ہے منکر ہے

علامہ ابن جریر فرماتے ہیں:۔

اصل المعروف کل ما کان معروفا
ففعلہ جمیل مستحسن غیر مستقبح فی
اھل الایمان باللہ وانما سمیت طاعۃ
اللہ معروفا لانہ مما یعرفہ اھل الایمان
ولا یستنکرون فعلہ واصل المنکر ما
انکرہ اللہ ورأوہ قبیحا فعلہ ولذلک سمیت
معصیۃ اللہ منکرا لان اھل الایمان
یستنکرون فعلھا ویستعظمون رکوبھا[3]

معروف کی اصل یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو مشہور ہو
جس کا کرنا خدا پر ایمان رکھنے والوں کے درمیان اچھا
اور مستحسن ہو اور جسے وہ ناپسند نہ کرتے ہوں۔ اللہ
کی اطاعت کو اس لیے معروف کہا جاتا ہے کہ اسے
اہل ایمان خوب پہچانتے ہیں اور ناپسند نہیں کرتے۔
اسی وجہ سے اللہ کی معصیت کو منکر کہا جاتا ہے کیونکہ
اہل ایمان اسے ناپسند کرتے ہیں اور اس کے ارتکاب
کو بڑا جرم سمجھتے ہیں۔

علامہ صاوی لکھتے ہیں:۔

المعروف المراد بہ ما طلبہ الشرع
اما علی سبیل الوجوب کالصلوات
الخمس وبر الوالدین وصلۃ الرحم
او الندب کالنوافل وصدقات

معروف سے مراد ایسے امور ہیں جن کو کرنا
شارع (اللہ تعالیٰ) یا تو ہم پر واجب قرار دے
جیسے کہ پانچ وقت کی نمازیں ہیں یا والدین کے
ساتھ حسن سلوک اور صلہ رحمی ہے یا جسے وہ مندوب

---

[1] النہایۃ فی غریب الحدیث والاثر مادہ عرف، ج ۳ ص ۸۵ [2] النہایۃ فی غریب الحدیث والاثر مادہ نکر، ج ۴ ص ۱۷۵ [3] جامع البیان فی تفسیر القرآن ج ۴ ص ۲۵

التطوع ..... المنکر المراد به ما نهى	کہ مثلاً نفل نمازیں یا نفل صدقات ..... منکر سے
عنه الشارع اما على سبيل الحرمة كالزنا	مراد وہ چیز ہے جسے شارع حرام قرار دے جیسے زنا،
والقتل والسرقة او على سبيل الكراهة[1]	قتل یا چوری یا جسے شارع ناپسند کرے۔

اس تفصیل سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ معروف و منکر اخلاقی اصطلاحات نہیں ہیں بلکہ شرعی اصطلاحات ہیں۔ یہ ان مطالبات کو واضح کرتی ہیں جو خدا کا دین اور اس کی شریعت ہم سے چاہتی ہے۔ خدا کا دین جن نظریات و افکار کا، جن اصولِ عبادت کا، جن اخلاق و معاملات کا اور جس تمدن و سیاست کا ہمیں حکم دیتا ہے وہ سب کے سب معروفات ہیں اور جن افکار و نظریات سے، عبادت کے جن طریقوں سے، اخلاق کے جن اصولوں سے اور جن قوانینِ تمدن و سیاست سے منع کرتا ہے وہ سب کے سب منکرات ہیں۔ انہی کے امر و نہی کا امت مسلمہ کو حکم دیا گیا ہے۔ یہ بہت ہی وسیع کام ہے اور دعوتِ دین سے لے کر جہادِ حق تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ کام آپ کو ماحول خواہ اسلامی ہو یا غیر اسلامی، ہر حال میں انجام دینا ہے۔ غیر اسلامی ماحول میں باطل افکار پر تنقید کرنا، کفر و شرک کے مقابلے میں پوری قوت کے ساتھ اسلام کو پیش کرنا، باطل کو مٹانے اور حق کو کامیاب بنانے کی جد و جہد کرنا اور اس راہ میں اپنی جان و مال کی بازی لگا دینا 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' ہے۔ اسلامی معاشرے میں اس کا تقاضا یہ ہے کہ آپ اسے مضبوط بنائیں۔ اس میں بگاڑ نہ پیدا ہونے دیں، اس کی اصلاح و تربیت کریں اور اسے اس قابل بنائیں کہ وہ دنیا میں اسلام کی سربلندی کا ذریعہ ثابت ہو۔

آئیے پہلے ہم غیر اسلامی ماحول میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے کام کی نوعیت سمجھنے کی کوشش کریں۔ خدا کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہمارے لیے اسوہ ہے۔ ہمیں اس راہ پر چلنا ہے جس پر آپ کے نقش قدم ثبت ہیں اور وہ کام انجام دینا ہے جو آپ نے انجام دیا تھا۔ آپ کو ایک ایسے ماحول میں 'امر بالمعروف' کا حکم ملا تھا جس پر شرک کی حکومت تھی اور جو اپنے مزاج اور ساخت کے لحاظ سے سراسر توحید کے مخالف تھا۔ اس ماحول میں آپ ایک طرف شرک اور اس کی بنیاد پر تعمیر ہونے والے پورے نظامِ حیات پر تنقید فرما رہے تھے اور دوسری طرف یہ ثابت کر رہے تھے کہ بندگی کے لائق صرف خدا کی ذات ہے، اس کے سوا کوئی ایسی ہستی نہیں ہے جس کی عبادت کی جائے اور جسے انسان اپنا معبود و حاکم سمجھے۔ آپ کی اس دعوتِ توحید کا نتیجہ یہ نکلا کہ سارا ماحول آپ کا دشمن بن گیا۔ ہر طرف سے دشنام طرازی ہونے لگی اور آپ کو اس قدر صدموں اور اذیتوں سے دوچار ہونا پڑا کہ اس کے تصور ہی سے روح کانپ جاتی ہے۔ ان حالات میں قرآن نے آپ کو حکم دیا کہ

---

[1] حاشیۃ الصاوی علی تفسیر الجلالین ج ۱ ص ۱۵۲

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ ۝ (الاعراف: ۱۹۹)

درگزر کی روش اختیار کرو، معروف کا حکم دو اور جاہلوں سے اپنا رخ پھیر لو۔

آیت میں 'عرف' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو معروف کے ہم معنی ہے اور معروف خدا کے دین اور اس کی شریعت کو کہتے ہیں۔ یہاں امر بالمعروف کا مطلب یہ ہے کہ حالات کی سنگینی اور نزاکت کے باوجود خدا کا دین اس کے بندوں تک پہنچایا جائے اور اس میں کوئی کوتاہی نہ کی جائے۔

امام ابن جریر طبری فرماتے ہیں:۔

ان الله امر نبيه صلى الله عليه وسلم ان يامر الناس بالعرف وهو المعروف فى كلام العرب ...... فاذ كان معنى العرف ذالك فمن المعروف صلة الرحم من قطع واعطاء من حرم والعفو عمن ظلم وكل ما امر الله به من الاعمال اوندب اليه فهو من العرف ولم يخصص الله من ذالك معنى دون معنى فالحق فيه ان يقال ان الله امر نبيه صلى الله عليه وسلم ان يامر عباده بالمعروف كله لا ببعض معانيه دون بعض[1]

اللہ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپ لوگوں کو 'عرف' کا حکم دیں۔ کلام عرب میں 'عرف' معروف کو کہتے ہیں۔۔۔۔۔ جب 'عرف' کے معنی معروف کے ہیں تو معروف میں یہ بات بھی شامل ہے کہ جو ہم سے رشتہ توڑے ہم اس سے رشتہ جوڑیں، جو ہمیں محروم کر دے ہم اس کا حق ادا کریں، جو ہم پر زیادتی کرے ہم اس سے درگزر کریں۔ وہ تمام اعمال جن کا اللہ نے حکم دیا ہے یا جن کی اس نے ترغیب دی ہے معروف میں داخل ہیں۔ اللہ نے نہ تو کسی ایک معروف کو بیان کیا ہے اور نہ کسی معروف کو چھوڑ دیا ہے۔ اس معاملے میں صحیح بات جو کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ وہ اس کے بندوں کو تمام معروفات کا حکم دیں یہ نہیں کہ بعض کا حکم دیں اور بعض کا نہ دیں۔

امام رازی فرماتے ہیں:۔

الحقوق التى تستوفى من الناس وتوخذ منهم اما ان

وہ حقوق جن کا پورا کرنا انسانوں کے لیے ضروری ہے اور جو ان سے حاصل کیے جاتے ہیں یا ان کی دو

---

[1] جامع البیان فی تفسیر القرآن جزء ۹ ص ۹۶

يجوز ادخال المساهلة والمسامحة
فيها واما ان لا يجوز اما القسم
الاول فهو المراد بقوله خذ العفو
ويدخل فيه ترك التشدد في
كل ما يتعلق بالحقوق المالية
ويدخل فيه ايضا التخلق مع
الناس بالخلق الطيب وترك
الغلظة والفظاظة ......
ومن هذا الباب ان يدعو
الخلق الى الدين الحق بالرفق واللطف
...... واما القسم الثاني وهو الذي
لا يجوز دخول المساهلة والمسامحة
فيه فالحكم فيه ان يأمر بالمعروف والعرف
والعارفة والمعروفة هو كل امر عرف انه
لابد من الاتيان به وان وجوده خير
من عدمه وذالك لان في هذا
القسم لو اقتصر على الاخذ بالعفو ولم
يامر بالعرف ولم يكشف عن حقيقة الحال لكان ذلك
سعيا في تغيير الدين وابطال الحق انه لا يجوز

قسمیں ہیں۔ یا تو ان میں ڈھیل دی جا سکتی ہے اور
صرف نظر ممکن ہے یا یہ بات ممکن نہیں ہے۔ خدائے
تعالیٰ کا فرمانا کہ "درگزر کی روش اختیار کرو" یہ
پہلی قسم سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی میں یہ بات بھی شامل
ہے کہ مالی حقوق میں سختی نہ کی جائے۔ لوگوں کے ساتھ
اچھے اخلاق کا برتاؤ کیا جائے اور تحقیر اور درشتی
کا سلوک نہ کیا جائے ...... اسی کے تحت یہ
بات بھی آتی ہے کہ لوگوں کو نرمی اور ملاطفت کے ساتھ
دین حق کی دعوت دی جائے ...... دوسری
قسم جس میں درگزر اور ڈھیل صحیح نہیں ہے اس کے
بارے میں امر بالمعروف کا حکم ہے۔ 'عرف' 'عارفہ'
اور 'معروفہ' ہر اس کام کو کہتے ہیں جو اس حیثیت سے
جانا پہچانا جائے کہ اس کا کرنا ضروری ہے اور اس
کے موجود نہ ہونے سے اس کا موجود ہونا بہتر ہے۔ اگر
اس دوسری قسم میں بھی درگزر سے کام لیا جائے،
معروف کا حکم نہ دیا جائے اور حقیقت حال کھولی
نہ جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ دین کو بدلنے
اور حق کو مٹانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ظاہر ہے
یہ بات صحیح نہیں ہے۔

امام رازی فرماتے ہیں کہ مفسرین نے 'امر بالعرف' کی تشریح ان الفاظ میں بھی کی ہے:-

والامر بالعرف اى باظهار الدين الحق
وتقرير دلائله [۱]

'معروف کا حکم دے' اس طرح کہ دین حق واضح
ہو جائے اور اس کے دلائل ثابت ہو جائیں۔

۱؎ التفسیر الکبیر جلد ۴ ص ۱۷۴

اس جملہ کی تفسیر خازن اور بغوی نے چند الفاظ میں کی ہے لیکن اتنی بات وضاحت کے ساتھ کہہ دی ہے کہ امر بالمعروف کا حکم اس پورے دین کی تبلیغ پر حاوی ہے جو خدا کی طرف سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ملا ہے۔

خازن فرماتے ہیں :-

وامر بالعرف یعنی وامر بکل ما امرک اللہ بہ وھو ما عرفتہ بالوحی من اللہ عزوجل وکل ما یعرفہ الشارع[1]

'عرف' کا حکم دو یعنی ہر اس چیز کا حکم دو جس کا اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے جو بات وحی سے معلوم ہو اور جسے شارع جانتا ہو وہ 'عرف' ہے۔

علامہ بغوی کے الفاظ ہیں :-

وامر بالعرف ای بالمعروف وھو کل ما یعرفہ الشرع[2]

'عرف' یعنی معروف کا حکم دو۔ اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جسے شریعت جانتی ہے۔

علامہ سید محمود آلوسی فرماتے ہیں :-

قال عطاء المراد بالعرف کلمۃ لا الٰہ الا اللہ وھو تخصیص من غیر داع[3]

عرف سے مراد عطاء کہتے ہیں کہ کلمہ لا الٰہ الا اللہ ہے۔ یہ تخصیص بے وجہ ہے۔ (یعنی اسے عام ہونا چاہیے۔)

زیر بحث آیت میں صرف 'امر بالمعروف' کا ذکر ہے 'نہی عن المنکر' کا ذکر نہیں ہے لیکن یہ صرف الفاظ کی حد تک ہے ورنہ 'امر بالمعروف' کے حکم میں 'نہی عن المنکر' خود بخود موجود ہے۔ "الامر بالشیٔ نھی عن ضدہ[4]" (کسی چیز کا حکم دینا حقیقت میں اس کی ضد سے منع کرنا ہے۔) ایک دوسری آیت میں دونوں احکام ساتھ ساتھ موجود ہیں :-

اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَہٗ مَکْتُوْبًا عِنْدَھُمْ فِی التَّوْرٰاۃِ وَالْاِنْجِیْلِ یَاْمُرُھُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھٰھُمْ عَنِ الْمُنْکَرِ وَیُحِلُّ لَھُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ

جو اس رسول یعنی نبی امی کی اتباع کرتے ہیں۔ جس کا ذکر وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ جو انہیں 'معروف' کا حکم دیتا ہے اور 'منکر' سے منع کرتا ہے۔ پاک چیزوں کو ان کے لیے حلال کرتا ہے اور ناپاک چیزیں ان پر حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ

---

[1] لباب التاویل فی معانی التنزیل جلد ۲ صفحہ ۲ [2] معالم التنزیل علی ہامش الخازن جلد ۲ صفحہ ۲ [3] روح المعانی جزء ۹ صفحہ ۱۴۷
[4] قالہ البلقوی الاکلیل علی مدارک التنزیل جلد ۲ صفحہ ۱۸۱

عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنْزِلَ مَعَهُ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ (الاعراف)

اتارتا ہے جس کے نیچے وہ دبے ہوئے ہیں اور ان زنجیروں کو کھولتا ہے جن میں وہ گرفتار ہیں پس جو لوگ اس پر ایمان لائیں اور اس کی حمایت اور نصرت کریں اور اس روشنی کے پیچھے چلیں جو اس کے ساتھ نازل کی گئی ہے تو وہی فلاح پانے والے ہیں۔

اس آیت میں خدا کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تین صفات بیان کی گئی ہیں۔ پہلی صفت یہ کہ آپ معروف کا حکم دیتے ہیں اور منکر سے روکتے ہیں۔ دوسری صفت یہ کہ آپ پاک چیزوں کو حلال کرتے ہیں اور ناپاک چیزوں کو حرام کرتے ہیں۔ تیسری صفت یہ کہ آپ غیر ضروری بوجھ اتارتے ہیں اور بندشیں کھولتے ہیں۔ بعد کی دونوں صفتیں حقیقت میں پہلی صفت کی شرح و تفسیر ہیں۔ پاک چیزوں کو حلال کرنا 'امر بالمعروف' کے اندر شامل ہے اور ناپاک چیزوں کو حرام کرنا 'نہی عن المنکر' کا ایک حصہ ہے۔ اسی طرح 'امر بالمعروف ونہی عن المنکر' کا تقاضا ہے کہ انسان کو خود ساختہ رسوم و اعمال سے نجات دلائی جائے اور اسے خدا کی بندگی کے سوا ہر بندگی سے آزاد کیا جائے۔

امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں:۔

هو الذی امر الله علی لسانه بكل معروف ونهى عن كل منكر واحل كل طيب وحرم كل خبيث...... فبه كمل دين الله المتضمن للامر بالمعروف والنهي عن كل منكر واحلال كل طيب وتحريم كل خبيث...... وتحريم الخبائث يندرج في معنى النهي عن المنكر كما ان احلال الطيبات يندرج في الامر بالمعروف لان تحريم الطيبات مما نهى الله عنه وكذلك الامر بجميع المعروف والنهي عن كل منكر

آپ ہی کی ذات ہے جس کی زبان سے اللہ نے ہر معروف کا حکم دیا اور ہر منکر سے منع کیا، ہر پاک چیز کو حلال کیا اور ہر ناپاک چیز کو حرام کیا...... آپ ہی کے ذریعہ خدا کے اس دین کی تکمیل ہوئی جس میں ہر معروف کا حکم ہے اور ہر منکر سے منع ہے۔ ہر پاک چیز کو حلال کیا گیا ہے اور ہر ناپاک چیز کو حرام کیا گیا ہے...... ناپاک چیزوں کو حرام کرنا 'نہی عن المنکر' کے مفہوم میں شامل ہے جیسے کہ پاک چیزوں کو حلال کرنا 'امر بالمعروف' میں آتا ہے اس لیے کہ پاک چیزوں کو حرام کرنے سے اللہ نے منع کیا ہے۔ اسی طرح یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تمام معروفات کا حکم دینا اور

ممالا يتم الا للرسول الذى تمم الله به مكارم الاخلاق الذى رجلة فى المعروف[1]

تمام منکرات سے منع کرنا، یہ اسی رسول کے ذریعہ ممکن ہے جس کے واسطے سے اللہ نے تمام اعلیٰ اخلاقیات کی تکمیل کی ہے اور اعلیٰ اخلاقیات 'معروف' میں شامل ہیں۔

آیت میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر، کا ذکر اس سیاق میں آیا ہے کہ آپ یہود کے درمیان یہ کام انجام دیتے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ دوسروں کو معروف کا حکم نہیں دیتے تھے اور منکر سے روکتے نہیں تھے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خواہ یہود و نصاریٰ ہوں یا مشرکین و منافقین ان میں سے جس گروہ پر بھی آپ نے دین حق کی تبلیغ کی اسے معروف کا حکم دیا اور منکر سے منع کیا۔ بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ آپ اپنے ساتھیوں کی جو تربیت کرتے تھے، انہیں جن باتوں کی تعلیم دیتے تھے، جن اخلاق کی نصیحت فرماتے تھے اور جو آداب زندگی سکھاتے تھے وہ ساری چیزیں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے اندر شامل ہیں۔ یہ کام ابتدائے دعوت سے انتہائے دعوت تک جاری ہے اور داعی اسے اس وقت تک انجام دیتا ہے جب تک کہ اس کے جسم میں جان باقی ہے اور وہ حرکت و عمل کے قابل ہے۔ اسی وجہ سے مفسرین نے 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' کو یہود کے ساتھ مخصوص نہیں سمجھا ہے بلکہ اسے بہت ہی مختلف النوع اور وسیع کام کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں:۔

(يامرهم بالمعروف و ينهاهم عن المنكر) هذه صفة الرسول صلى الله تعالىٰ عليه وعلىٰ اٰله وسلم فى الكتب المتقدمة وهٰكذا كانت حاله عليه الصلوٰة والسلام لا يامر الا بخير ولا ينهىٰ الا عن شر..... ... ومن اهم ذالك ما بعثه الله به من الامر بعبادته وحده لا شريك له والنهى عن عبادة من سواه كما ارسل به جميع الرسل قبله[2]

"معروف کا حکم دیتے ہیں اور منکر سے روکتے ہیں" آپ کی یہ صفت سابقہ آسمانی کتابوں میں بیان ہوئی ہے اور یہی آپ کا حال تھا کہ آپ جس بات کا بھی حکم دیتے وہ 'خیر' ہوتی اور جس چیز سے بھی منع کرتے وہ 'شر' ہوتی...... اس سلسلے کی اہم تر چیز یہ ہے کہ آپ کو ہدایت کی گئی تھی کہ خدائے واحد کی بندگی کا حکم دیں اور اس کے سوا ہر ایک کی بندگی سے منع کریں جیسا کہ آپ سے پہلے بھی خدا کے رسول یہی تعلیم لیکر آئے تھے۔

علامہ بغوی اس ٹکڑے کی شرح میں فرماتے ہیں:۔

---

[1] مجموعۃ رسائل لشیخ الاسلام ابن تیمیہ (الحسبۃ فی الاسلام ص۶۶) [2] تفسیر ابن کثیر جلد ۲ ص۲۵۲، ۲۵۳

(یامرھم بالمعروف) ای بالایمان (وینھاھم عن المنکر) یعنی عن الشرک قیل المعروف الشریعۃ والسنۃ والمنکر مالا یعرف فی شریعۃ ولا سنۃ وقال عطاء یامرھم بالمعروف بخلع الانداد ومکارم الاخلاق وصلۃ الارحام وینھاھم عن المنکر عن عبادۃ الاوثان وقطع الارحام[1]

آپ معروف کا یعنی ایمان کا حکم دیتے ہیں اور منکر سے یعنی شرک سے منع کرتے ہیں بعض لوگوں نے کہا ہے کہ معروف سے مراد شریعت اور سنت ہے اور منکر وہ ہے جو شریعت اور سنت میں معلوم نہ ہو۔ عطار تابعی نے اس کی تشریح یوں کی ہے کہ آپ انہیں معروف کا حکم دیتے ہیں یعنی آپ خدا کے جھوٹے شریکوں سے علیحدگی، اعلیٰ اخلاق کی پابندی اور صلہ رحمی کا حکم دیتے ہیں انہیں منکر سے منع کرتے ہیں یعنی بتوں کی پرستش اور رشتے توڑنے سے منع کرتے ہیں۔

شیخ اسمٰعیل حقی کہتے ہیں:-

(یامرھم بالمعروف) ای بالتوحید وشرائع الاسلام (وینھاھم عن المنکر) ای عن کل مالا یعرف فی شریعۃ ولا سنۃ[2]

"آپ انہیں معروف کا حکم دیتے ہیں" یعنی توحید اور اسلامی شریعت کا حکم دیتے ہیں۔ انہیں منکر سے منع کرتے ہیں یعنی ہر اس چیز سے منع کرتے ہیں جو شریعت اور سنت میں جانی پہچانی نہیں ہے۔

ابن جریر نے اس کی تشریح تربیت کے پہلو سے کی ہے:-

یامرھذا النبی الامی اتباعہ بالمعروف وھو الایمان باللہ ولزوم طاعتہ فیما امر ونھی فذلک المعروف الذی یامرھم بہ وینھاھم عن المنکر وھو الشرک باللہ والانتھاء عما نھاھم اللہ عنہ[3]

"نبی امی" اپنے پیرؤوں کو معروف کا حکم دیتے ہیں۔ معروف سے مراد ہے اللہ پر ایمان اور اوامر و نواہی میں اس کی اطاعت یہی ہے معروف جس کا آپ ان کو حکم دیتے ہیں۔ "انہیں منکر سے منع کرتے ہیں" یعنی شرک سے منع کرتے ہیں اور اس بات سے منع کرتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے جن چیزوں کو ممنوع قرار دیا ہے اس کا ارتکاب کریں۔

---

[1] معالم التنزیل علی ہامش الخازن ج ۲ ص ۲۲۵ [2] روح البیان ج ۱ ص ۸۰۷ [3] جامع البیان فی تفسیر القرآن جزء ۹ ص ۵۳

امام رازی نے اس فقرہ کی وسعت کو سامنے رکھ کر تفسیر کی ہے۔ ان کی تفسیر اس قابل ہے کہ اسے یہاں نقل کیا جائے

مجامع الامر بالمعروف محصورة
فی قوله علیه الصلوٰة والسلام
التعظیم لامر الله والشفقة علی خلق
الله وذالك لان الموجود اما واجب
الوجود لذاته واما ممكن الوجود لذاته
اما الواجب لذاته فهو الله جل جلاله
ولا معروف اشرف من تعظیمه واظهار
عبودیته واظهار الخضوع والخشوع
علی باب عزته والاعتراف بكونه
موصوفا بصفات الكمال مبرأ
عن النقائص والآفات منزها عن
الاضداد والانداد واما الممكن
لذاته فان لم یكن حیوانا فلا سبیل الی
ایصال الخیر الیه لان الانتفاع
مشروط بالحیاة ومع هذا فانه
یجب النظر الی كلها بعین التعظیم
من حیث انها مخلوقة لله
تعالی ومن حیث ان كل ذرة
من ذرات المخلوقات لما كانت
دلیلا قاهرا وبرهانا باهرا علی توحیده
وتنزیهه فانه یجب النظر الیها بعین الاحترام
واما ان كان ذالك المخلوق من جنس

"خدا کے احکام کی تعظیم اور اس کی مخلوق پر
شفقت" نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول میں امر بالمعروف
کا خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے
کہ موجودات کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو اپنے وجود
میں کسی کی محتاج نہیں ہے اور دوسری وہ جو اپنے وجود
میں کسی کی محتاج ہے۔ غیر محتاج وجود صرف خدائے
تعالیٰ کا ہے اور اس سے بڑا معروف کوئی نہیں ہے
کہ اس کی تعظیم اور اس کی بندگی کی جائے اور اس
کے جناب میں خشوع و خضوع کا اظہار کیا جائے، اور
اس بات کا اعتراف کیا جائے کہ اس کے اندر تمام
خوبیاں موجود ہیں اور وہ تمام نقائص اور آفات سے
بری ہے اور مخالفوں اور ہمسروں سے پاک ہے۔ جو
چیز اپنی ذات میں دوسرے کی محتاج ہے (وہ خدا کی
مخلوق ہے) اگر وہ ذی حیات نہیں ہے تو اسے فائدہ
پہنچانے کی کوئی صورت نہیں ہے اس لیے کہ فائدہ اٹھانے
کے لیے زندگی شرط ہے لیکن اس کے باوجود ضروری
ہے کہ اس کا اس حیثیت سے مطالعہ کیا جائے کہ وہ
خدائے تعالیٰ کی مخلوق ہے اور یہ کہ مخلوقات کا ہر ذرہ خدا
کے ایک اور بے عیب ہونے کی مضبوط دلیل اور واضح
حجت ہے اس لیے ضروری ہے کہ اسے احترام کی نظر سے
دیکھا جائے۔ اگر خدا کی مخلوق ذی حیات ہے تو ضروری
ہے کہ انسان اس پر جس قدر شفقت کر سکتا ہے اسی قدر

الحیوان فانہ یجب اظہار الشفقۃ علیہ باقصی ما یقدر الانسان علیہ ویدخل فیہ بر الوالدین وصلۃ الارحام وبث المعروف فثبت ان قولہ علیہ الصلوٰۃ والسلام التعظیم لامر اللہ والشفقۃ علی خلق اللہ کلمۃ جامعۃ لجمیع جہات الامر بالمعروف ..... قولہ وینہاہم عن المنکر والمراد منہ اضداد الامور المذکورۃ وہی عبادۃ الاوثان والقول فی صفات اللہ بغیر علم والکفر بما انزل اللہ علی النبیین وقطع الرحم وعقوق الوالدین[1]

شفقت کرے۔ اسی میں ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک، صلہ رحمی اور نیکیوں کا پھیلانا بھی شامل ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد "خدا کے حکم کی تعظیم اور اس کی مخلوق پر شفقت" ایک ایسا جامع کلمہ ہے جو امر بالمعروف کے تمام پہلوؤں کو حاوی ہے ...... "وہ انہیں منکر سے منع کرتے ہیں" اللہ کے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ اوپر جو باتیں بیان ہوئی ہیں ان کے خلاف جتنی باتیں ہیں ان سب سے منع کیا جائے۔ اس میں بتوں کی پرستش، بغیر جانے بوجھے خدا کی ذات وصفات کے بارے میں زبان کھولنا، انبیاء کی تعلیمات کا انکار، رشتوں کا توڑنا اور ماں باپ کی نافرمانی آجاتی ہے۔

میں نے کافی اونچی سطح کے اہل علم کی تحقیقات آپ کے سامنے پیش کی ہیں۔ ان کی روشنی میں آپ آسا 'امر بالمعروف ونہی عن المنکر' کا مفہوم سمجھ سکتے ہیں۔ خدا کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو دعوت دی وہ کائنات پر غور کریں اور اپنے خدا کو پہچانیں۔ آپ نے انہیں خدا کے تصور سے آگاہ کیا، شرک پر تنقید دلائل سے توحید کو ثابت کیا اور اس بات کا اعلان کیا کہ بندگی صرف خدائے واحد کی ہونی چاہیے۔ انسان فرض ہے کہ ایک خدائے برحق کی بندگی کے سوا ہر ایک کی بندگی سے بغاوت کردے۔ آپ نے دنیا کو اخلاق سے بچایا، اعلیٰ اخلاق کی تعلیم دی اور انسانوں کو ایک دوسرے سے محبت کرنا سکھایا۔ جن لوگوں نے خدا کو قبول کیا آپ نے ان کی اس طرح تربیت کی کہ وہ خدا کے ہر حکم کے سامنے جھکنے کے لیے تیار تھے، اور ہر قدم آپ کی ہدایت کے مطابق اٹھتا تھا۔ آپ کے اس عظیم کام کو قرآن نے 'امر بالمعروف ونہی عن المنکر' سے تعبیر کیا ہے اور یہی کام آپ کے بعد آپ کی امت کو انجام دینا ہے۔　　(باقی آئندہ)

---

[1] التفسیر الکبیر ج ۴ ص ۳۰۹-۳۱۰

مُسلمانوں سے

خطبۂ جمعہ بمقام بڑہریا (ضلع اعظم گڈھ) بتاریخ ۲۲ فروری ۱۹۶۳ء

(جناب وحیدالدین خاں)

برادرانِ اسلام! ہم مسلمان ہیں۔ مسلمان ہونے کا مطلب کیا ہے؟ اس کا مطلب اپنے آپ کو امیدواروں
کی ایک فہرست میں شامل کرنا ہے۔ یہ فہرست جنت کے امیدواروں کی فہرست ہے۔ مسلمان ہونا، گویا اس بات
کا امیدوار بننا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو اپنی جنت میں داخل کرے۔ اس دنیا میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جو یہ جانتے
ہی نہیں کہ مرنے کے بعد بھی کوئی زندگی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ بس یہی دنیا کی زندگی کُل زندگی ہو۔ اس لیے وہ اپنی
جنت اسی دنیا میں تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ دنیا میں مکان اور جائداد بنا لینا، دنیا میں اعلیٰ معیارِ زندگی حاصل کر لینا
دنیا میں عزت اور ترقی پالینا، وہ سب سے بڑی چیز ہے جس کی وہ تمنا رکھتے ہیں۔ یہ لوگ بعد کو آنے والی اصل
اور لمبی زندگی کو بھولے ہوئے ہیں اور آج کی تھوڑی زندگی میں خوشی حاصل کر لینے کو سب سے بڑی کامیابی سمجھتے
ہیں۔ یہ بہت بڑی بے وقوفی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص ایک دن کے تماشے کے لیے اپنی ساری زندگی غارت
کردے، وہ چند پھلجھڑی اور پٹاخے کے پیچھے اپنا سارا گھر جلالے۔ مسلمان وہ ہے جو اس حماقت سے بچنا چاہتا
ہے۔ مسلمان ہونا، اس خواہش کو اپنے دل میں جگہ دینا ہے کہ مرنے کے بعد جب ہم خدا کے پاس پہنچیں اور ہمیشہ ہمیش
کی زندگی ہمیں ملے، تو یہ زندگی جنت کی زندگی ہو، جہنم کے عذاب میں ہمیں جلنا نہ پڑے۔

مگر آپ جانتے ہیں کہ کوئی چیز محض چاہنے سے حاصل نہیں ہو جاتی ہر وہ چیز جس کو آپ چاہتے ہیں،
ضروری ہوتا ہے کہ اس کے لیے آپ کوشش کریں۔ مثلاً آپ میں سے جو لوگ کسان ہیں، وہ دوسرے لفظوں
میں وہ لوگ ہیں جنھوں نے کھیت اور زمین سے اپنی زندگی کو وابستہ کیا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ زمین میں اگانے اور
رزق پیدا کرنے کی جو طاقت اللہ تعالیٰ نے رکھی ہے اس میں سے انھیں حصہ ملے۔ ان کی یہ خواہش کیا بیٹھے بٹھائے پوری
ہو جاتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ کسی کسان کے پاس خواہ کتنا ہی کھیت ہو اور وہ کتنا ہی زیادہ پیداوار کا حریص ہو،

مگر وہی کسان کھلیان کرتا ہے اور اسی کے گھر میں غلہ کا ڈھیر آتا ہے جو اپنی اس خواہش کو حاصل کرنے کے لیے محنت کرتا ہے۔ جو اپنے وقت اور صلاحیتوں کو اس کے پیچھے لگا دیتا ہے۔ اسی طرح آپ میں سے جو لوگ دکاندار ہیں وہ گویا وہ لوگ ہیں جو کاروبار اور تجارت سے اپنی امیدیں لگائے ہوئے ہیں۔ وہ کاروبار اور تجارت کا وہ نفع حاصل کرنا چاہتے ہیں جو اس کے اندر چھپا ہوا ہے۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ صرف یہ خواہش کسی کے لیے تجارتی نفع بن کر نہیں لوٹ آتی۔ بلکہ تجارت میں چھپے ہوئے نفع سے اپنی جیب بھرنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ صحیح طریقے پر تجارت کی جائے۔ اپنے دن اور رات کو، اپنے فکر اور عمل کو اس کے لیے وقف کر دیا جائے۔

ٹھیک اسی طرح آخرت کا انعام اور خدا کی جنت بھی اسی کو ملے گی جو اس کے لیے اپنے آپ کو صرف کرے، جو اس کے تقاضے پورے کرنے کے لیے تیار ہو۔ ہر دوسری کامیابی کی طرح آخرت کی کامیابی بھی آپ سے کچھ مانگتی ہے، وہ دینے سے پہلے آپ سے آپ کا کچھ لینا چاہتی ہے۔ اگر موجودہ زندگی میں اس کا یہ مطالبہ پورا کر سکیں تو بے شک آپ مرنے کے بعد اس کے میٹھے پھل پائیں گے اور اگر آپ ایسا نہیں کرتے، جنت کا سودا آپ سے جو قیمت مانگ رہا ہے اس کو دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے، تو خالی خولی اپنے کو مسلمان کہنا اور خدا سے یک طرفہ امید رکھنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص واقعی دکان رکھے ہوئے نہ ہو، اور بس فرضی طور پر اپنے گھر کے سامنے "دکاندار" کا لفظ لکھ کر لٹکا دے۔ ظاہر ہے کہ ایسے شخص کی دکانداری اسے کچھ نہیں دے سکتی۔ بلکہ عجب نہیں کہ کوئی تھانہ دار اس کو دھوکہ باز قرار دے کر ایک روز اس کی چالان کر دے اور اسے الٹا اپنے پاس سے جرمانہ ادا کرنا پڑے۔

بڑے افسوس کی بات ہے کہ آج مسلمانوں کا حال کچھ ایسا ہی ہو گیا ہے۔ کہنے کو تو وہ مسلمان ہیں اور انھوں نے اپنا نام جنت کے امیدواروں کی فہرست میں لکھا رکھا ہے۔ مگر عملی زندگی کو دیکھیے تو ان میں اور دوسروں میں کوئی فرق نہیں۔ ان کی زندگی بھی ویسی ہی گزر رہی ہے جیسے ان لوگوں کی زندگی جو آخرت کو نہیں مانتے۔ ان کی دوڑ دھوپ اور اُن کے مشاغل سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ آخرت کی طلب میں سرگرداں رہنے والے لوگ ہیں۔ جن چیزوں میں ساری دنیا کے لوگ الجھے ہوئے ہیں انھی میں، یہ بھی الجھے ہوئے ہیں۔ دوسروں کے پاس اپنے وقت اور صلاحیتوں کا جو مصرف ہے، وہی مصرف ان کے وقت اور صلاحیتوں کا بھی ہے، آخرت کو ماننے والوں اور آخرت کو نہ ماننے والوں میں کوئی حقیقی فرق نظر نہیں آتا۔

جب صورت یہ ہے تو یہ ایک جھوٹی امید ہو گی کہ ہم سمجھیں کہ خدا کے یہاں ہمارا شمار حقیقی مسلمانوں جیسا ہو گا اور اس کا انعام ہمیں ملے گا۔ جب دنیا میں ہماری زندگی دوسروں سے مختلف نہیں ہے تو آخرت میں ہمارا انجام دوسروں

سے مختلف کس طرح ہوسکتا ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اَلدُّنْیَا مَزْرَعَۃُ الْاٰخِرَۃِ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ کاٹنے کے وقت وہی شخص کاٹتا ہے جس نے بونے کے وقت بویا ہو۔ اسی طرح جس نے دنیا میں آخرت کی کھیتی کی ہوگی، اسی کو وہاں پہنچنے کے بعد اپنی ہری بھری فصل ملے گی، جس نے دنیا میں آخرت کی فصل نہیں بوئی، وہ آخرت میں اپنا کھلیان نہیں کرسکتا۔ یاد رکھیے۔ آج کا عمل ہی کام آنے والا ہے۔ جو آج غفلت میں پڑا ہوا اس کے لیے آخرت میں حسرت اور افسوس کے سوا کچھ نہیں۔

اب میں بتاؤں گا کہ موجودہ حالت سے نکلنے کے لیے آپ کو کم سے کم کیا کام کرنا ہے۔

۱۔ پہلی بات جو میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں وہ وہی ہے جس کا حکم سورۂ جمعہ میں دیا گیا ہے:۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِذَا نُوْدِیَ	اے ایمان لانے والو! جب جمعہ کی نماز کے
لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا	لیے پکارا جائے تو خدا کے ذکر کے لیے دوڑ پڑو اور
اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ وَذَرُوا الْبَیْعَ ط	خرید و فروخت چھوڑ دو۔

معلوم ہوا کہ جمعہ کے روز اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ جب نماز کا وقت ہو تو تمام مسلمان اپنے اپنے کاروبار اور مشاغل کو چھوڑ کر مسجد میں جمع ہوجائیں۔ جمعہ کا دن مسلمانوں کے اجتماع کا دن ہے۔ اکثر محققین کا خیال ہے کہ ہفتہ اور پنجشنبہ کے درمیان کے اس دن کا نام ـــ جمعہ ـــ عہدِ اسلام میں اختیار کیا گیا۔ کیونکہ یہ اہل ایمان کے مسجد میں جمع ہونے کا دن تھا۔ (انما سمیت الجمعۃ فی الاسلام و ذالک لاجتماعھم فی المسجد (لسان العرب)

یہ پہلا کام ہے جو آپ کو کرنا ہے۔ جمعہ کا اجتماع اپنی زندگی میں آپ کو لازماً شامل کرلینا ہے۔ رمضان کے جمعوں میں آپ جس چیز کا مظاہرہ کرتے ہیں اس کو مستقل طور پر اپنا لینا ہے۔ رمضان کے جمعوں میں عام طور پر بستی کے تمام لوگ مسجد میں آجاتے ہیں۔ عام جمعوں میں جتنے لوگ آتے ہیں اس کے مقابلے میں رمضان میں کئی گنا تعداد ہوجاتی ہے۔ یہی کام آپ کو ہر جمعہ کو کرنا ہے۔

ابھی جو آیت میں نے آپ کے سامنے پڑھی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ کا دن نماز کے علاوہ خاص طور پر ذکر اللہ کا دن ہے یعنی نصیحت اور یاد دہانی کا دن۔ علماء نے کہا ہے کہ اس آیت میں "ذکر اللہ" سے مراد خطبہ ہے۔

الذکر ھو الخطبۃ عند الاکثر	بیشتر مفسرین کی رائے ہے کہ فاسعوا الی
من اھل التفسیر (تفسیر کبیر)	ذکر اللہ میں ذکر سے مراد جمعہ کا خطبہ ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جمعہ کا ہفتہ وار اجتماع خاص طور پر اس لیے ہے کہ اس روز مسلمانوں کو جمع کرکے ان کے سامنے خطبہ دیا جائے۔

جمعہ کے دن جو اذان ہوتی ہے گویا خدا کی طرف سے اس بات کی پکار ہے کہ تمام مسلمان مسجد میں جمع ہو کر خطبہ کے ذریعہ دین کی باتیں سنیں اور نصیحت حاصل کریں۔ یہ ہفتہ وار یاددہانی کا ایک پروگرام ہے جو آپ کی زندگی کے آخر لمحات تک جاری رہتا ہے۔ اب یہ کتنی بدنصیبی ہوگی کہ خدا کی طرف سے پکارا جائے کہ آؤ مسلمانو! مسجد میں جمع ہو جاؤ تم کو خدا کی باتیں بتائی جانے والی ہیں لیکن مسلمان اپنے اپنے دھندوں میں لگے رہیں۔ کیا اس سے بڑی بدقسمتی بھی ہو سکتی ہے کہ خدا ہمیں پکارے اور ہم اس کی پکار پر اس کے یہاں حاضر نہ ہوں۔

انسان ایک ایسی مخلوق ہے جس پر بھول طاری ہوتی ہے۔ جس کے دل کو زنگ لگتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ انتظام فرمایا ہے کہ ہفتہ میں ایک روز تمام مسلمان جمع ہو کر اپنے خطیب کی زبان سے دین کی باتیں سنیں اور اپنے دل کے زنگ کو دور کریں، اگر اس یاددہانی کو چھوڑ دیا جائے تو اس کے بعد غفلت کا طاری ہونا یقینی ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے:۔

لَيَنْتَهِيَنَّ أَقْوَامٌ عَنْ وَدْعِهِمُ	لوگوں کو یہ روش چھوڑنی پڑے گی کہ وہ جمعہ
الْجُمُعَاتِ أَوْ لَيَخْتِمَنَّ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوبِهِمْ	میں نہ آئیں، ورنہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر مہر
ثُمَّ لَيَكُونُنَّ مِنَ الْغَافِلِينَ۔ (مسلم)	کر دے گا، پھر وہ غافل ہو کر رہ جائیں گے۔

جمعہ کا حکم قرآن کی جس سورہ میں آیا ہے وہیں اس کے ساتھ یہود کا ذکر ہے۔ کہا گیا ہے کہ اس سے پہلے یہود کتاب الٰہی کے حامل بنائے گئے تھے مگر وہ اس کا حق ادا نہ کر سکے اور اس کو چھوڑ کر دنیا کی زندگی میں غرق ہو گئے۔ چنانچہ اب ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے جس کے اوپر بہت سی کتابیں لدی ہوئی ہوں جس طرح گدھا کتابوں کا بوجھ لیے ہونے کے باوجود کتاب کی حقیقت سے خالی ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ لوگ خدا کی تعلیمات اپنے پاس رکھتے ہیں مگر ان کی زندگی میں اس کی روح موجود نہیں۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود جن اسباب کے تحت اس حالت تک پہنچے، ان میں سے ایک سبب یہ بھی تھا کہ انھوں نے ہفتہ کی اجتماعی عبادت (سبت) کو چھوڑ دیا تھا جس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا تھا کہ ان کا اتحاد باقی نہ رہے ان کے درمیان تبلیغ و تذکیر کا ایک مؤثر ذریعہ ختم ہو جائے، ان کے دینی جذبات دھیرے دھیرے سرد ہو کر رہ جائیں اس طرح سورۂ جمعہ میں یہود کے انجام کا ذکر کر کے جمعہ کی اجتماعی عبادت کا حکم دینا گویا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر تم نے جمعہ کی ادائگی میں کوتاہی کی تو تمہارا حشر بھی وہی ہوگا جو یہود کا ہوا چنانچہ حدیث میں آیا ہے:۔

من تكلم يوم الجمعة والامام	جب امام خطبہ دے رہا ہو، اس وقت اگر

یخطب فھو کمثل الحمار یحمل اسفارا ○ (احمد)

کوئی شخص بولے تو اس کی مثال اس گدھے کی سی ہے جس کے اوپر کتابیں لدی ہوئی ہوں۔

دیکھیے، یہاں خدا کے رسول نے جمعہ میں کوتاہی کرنے والے کے لیے وہی الفاظ دہرائے ہیں جو قرآن میں یہودیوں کے لیے کہے گئے ہیں۔ گویا جمعہ کی تقریبات میں توجہ اور اہتمام کے ساتھ شریک نہ ہونا آدمی کو اس طرف لے جاتا ہے جدھر یہود گئے۔

اسی طرح ایک روایت میں ہے کہ "جس نے کسی معقول وجہ کے بغیر جمعہ کو چھوڑا، وہ خدا کے یہاں منافق کی فہرست میں لکھ دیا جاتا ہے۔ جمعہ کو چھوڑنے کے یہ نتائج اس لیے ہیں کہ جو شخص کسی واقعی عذر کے بغیر محض اس ذہنیت کے تحت جمعہ میں نہیں آتا جس کو حدیث میں "تہاون" کہا گیا ہے (یعنی اس کو حقیر سمجھنا اور اسے اہمیت نہ دینا) اور عین جمعہ کے وقت وہ کسی دوسری مشغولیت میں لگا رہتا ہے۔ وہ اپنے عمل سے اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ اس دوسری چیز کی پکار اس کو خدا کی پکار سے زیادہ عزیز تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسے شخص کا انجام اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ خدا سے دور ہو جائے۔ اس نے جس چیز سے قریب ہونا چاہا تھا اسی کی قربت تو اسے ملے گی۔ مگر جس کی طرف اس نے پکار کے باوجود توجہ نہ دی، اس کی قربت خود بخود کیسے اس کے ساتھ چپک جائے گی۔

یہ پہلا کام ہے جو جنت کی طرف بڑھنے کے لیے آپ کو کرنا ضروری ہے۔ آپ کو جمعہ کے دن کو اپنے اجتماع کا دن بنانا ہے۔ آپ کی پوری آبادی کو جمعہ کے روز اسی طرح مسجد میں جمع ہونا ہے جس طرح آج آپ یہاں اکٹھا ہوئے ہیں[1]۔ پھر یہاں جمع ہونا محض جمع ہونے کے لیے نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ اپنے کچھ وقت کو یہاں آکر خدا کی یاد میں گزاریں۔ آپ اس کے آگے جھکیں اور اپنی پیشانی زمین پر ٹیک دیں۔ آپ اس سے دعا مانگیں کہ وہ آپ کو اسلامی زندگی گزارنے کی توفیق دے۔ اور اپنے خطیب کی زبان سے خدا و رسول کی باتیں سن کر اپنے دل کے اندر ایمان کی گرمی پیدا کریں۔ آپ کا جمعہ کا دن انھیں چیزوں کا دن ہونا چاہیے۔

۲۔ دوسری چیز جو آپ کو اختیار کرنا ہے، وہ جائز زندگی ہے۔ زندگی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک جائز زندگی اور دوسری ناجائز زندگی۔ مسلمان، یا دوسرے لفظوں میں جنت کے امیدواروں کے لیے ضروری ہے کہ وہ جائز زندگی گزاریں اور ناجائز زندگی کو چھوڑ دیں۔ اس کے بغیر ہم موت کے بعد کی دنیا میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔

---

[1] یہ خطبہ رمضان کے الوداعی جمعہ کو تھا اس لیے بستی کے تقریباً سارے مسلمان مسجد میں آگئے تھے۔

یہ دنیا خدا کی دنیا ہے، اسی نے تمام چیزوں کو پیدا کیا ہے اور وہی سب کا مالک ہے۔ اس لیے یہاں وہی ہونا چاہیے جو خدا چاہتا ہو۔ ملکیت دوسرے کی ہو اور مرضی دوسرے کی چلے۔ یہ بالکل غلط بات ہے جس کو نہ کوئی مالک برداشت کر سکتا اور نہ کسی مملوک کے لیے جائز ہے کہ وہ ایسا کرے۔

خدا نے مالک کی حیثیت سے نہایت وضاحت کے ساتھ بتا دیا ہے کہ وہ اپنی ملکیت میں کس طرح کا تصرف دیکھنا چاہتا ہے۔ آدمی کس طرح کے خیالات رکھے اور کس طرح کے خیالات نہ رکھے۔ وہ کس سے محبت کرے اور کس سے محبت نہ کرے، وہ اپنے متعلقین کے درمیان کیسے رہے اور کیسے نہ رہے۔ وہ کس طرح لین دین کرے اور کس طرح لین دین نہ کرے، وہ حقوق کی ادائگی میں کیا طریقہ اختیار کرے اور کیا طریقہ اختیار نہ کرے، وہ اپنی قوت و طاقت کو اور اپنے وقت اور مال کو کن کاموں میں صرف کرے اور کن کاموں میں صرف نہ کرے، وہ دنیا میں کن طریقوں سے کمائے اور کن طریقوں سے نہ کمائے —— یہ سب کچھ ہمارے مالک نے ہمیں بتا دیا ہے، ہم میں سے کوئی نہیں ہے جو اس سے ناواقف ہو۔ اور اگر کوئی ناواقف ہو تو خدا کی کتاب اور اس کے رسول کے ارشادات محفوظ حالت میں لکھے ہوئے موجود ہیں ان کو دیکھ کر ہر شخص معلوم کر سکتا ہے کہ ہمارا مالک کس طرح کے رویے کو پسند کرتا ہے اور کس رویہ کو پسند نہیں کرتا۔ ہمارے مالک کے یہ احکام بتاتے ہیں کہ ہمارے لیے جائز زندگی کیا ہے اور ناجائز زندگی کیا ہے۔ جو کچھ ہمارا مالک پسند کرتا ہے اس کے مطابق زندگی گزارنا جائز زندگی گزارنا ہے اور جو کچھ اسے ناپسند ہے اس کے مطابق رہنا ناجائز زندگی بسر کرنا ہے۔

مثلاً آپ کا ذہن اگر مالک کی یاد سے خالی رہتا ہے اور ہر وقت بس دوسری دوسری باتیں سوچتا رہتا ہے تو یہ ناجائز زندگی ہے۔ اس کے برعکس اگر آپ کو رہ رہ کر اصل مالک کی یاد آتی رہے تو یہ جائز زندگی ہے۔ اگر آپ ماں باپ کا حق ادا نہیں کرتے، اگر آپ اپنے بچوں کے دین اور اخلاق سے غافل ہیں اور صرف اس پر مطمئن ہو گئے ہیں کہ وہ کما کر آپ کو غلہ اور روپیہ دے دیں تو یہ ناجائز زندگی ہے۔ اس کے بجائے اگر آپ اپنے بڑوں کے ساتھ خدا کے حکم کے مطابق برتاؤ کر رہے ہوں اپنے متعلقین کو دوزخ کی آگ سے بچانے کے لیے فکرمند رہتے ہوں تو یہ جائز زندگی ہے۔ اگر آپ سچ بولتے ہوں، وعدہ پورا کرتے ہوں، قرض ادا کرتے ہوں، کسی کا حق نہ مارتے ہوں، کسی کی چیز چوری چھپے نہ لیتے ہوں، امانت میں خیانت نہ کرتے ہوں، تو یہ جائز زندگی ہے اور اگر اس کے خلاف ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ناجائز زندگی کی دلدل میں پھنس گئے ہیں۔ اسی طرح زندگی کے تمام معاملات میں آپ کا ایک رویہ مالک کی منشا کے مطابق ہے اور دوسرا رویہ اس کی منشا کے خلاف ہے۔ جائز زندگی یہ ہے کہ آپ مالک کی مرضی کے مطابق رویہ اختیار کریں

ورنا جائز زندگی یہ ہے کہ آپ اس کے خلاف کرنے لگیں۔

میرے دوستو! زندگی کے یہ دونوں امکانات آپ کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔ آپ چاہیں تو جائز زندگی گزاریں اور چاہیں تو ناجائز زندگی میں پڑے رہیں۔ مگر یاد رکھیے دونوں زندگیوں کا انجام یکساں نہیں ہے۔ اور آپ کے بس میں صرف زندگی گزارنا ہے۔ اس کا انجام آپ کے اختیار میں نہیں ہے۔ دنیا کی مثال ایک پھیلے ہوئے دسترخوان کی ہے جس پر ایک طرف زہر رکھا ہوا ہے اور دوسری طرف کھانا۔ آپ کو آزادی ہے۔ چاہیں تو زہر اٹھا کر کھالیں اور چاہیں تو کھانا کھائیں۔ مگر یہ آزادی صرف کھانے تک ہے۔ جب آپ نے اس کو منھ میں ڈال کر اسے اپنے پیٹ میں پہنچا دیا تو اس کے بعد آپ کی آزادی ختم ہو جاتی ہے۔ اب تو جو چیز کھائی گئی ہے وہ لازماً اپنا کام کرے گی۔ اگر آپ نے زہر کھایا ہے، وہ آپ کو ہلاک کرنے والا ثابت ہوگا اور اگر کھانا کھایا ہے تو وہ آپ کے لیے صحت اور طاقت کا ذریعہ بنے گا۔

معاملے کی یہ نوعیت آپ کے مسئلے کو بہت نازک بنا دیتی ہے عقلمند وہی ہے جو اس نزاکت کو اس کا انجام سامنے آنے سے پہلے محسوس کرے اور وہی خوراک کھائے جو اسے کھانا چاہیے اور اگر غفلت میں زہر کھا گیا ہے تو پہلی فرصت میں قے کرکے اس کو اپنے اندر سے نکال دے اور آئندہ کے لیے صحیح رویہ اختیار کرے۔ بہت جلد وہ دن آنے والا ہے جب ہماری آزادی ہم سے چھین جائے گی اور ہم کو اپنے عمل کا انجام اس طرح بھگتنا ہوگا کہ ہم نہ اس کو چھوڑ کر بھاگ سکیں گے اور نہ کوئی داد فریاد ہمارے کام آئے گی۔

۳۔ تیسری ضروری چیز جو آپ کو اپنی زندگی میں شامل کرنا ہے وہ اہل اللہ کی صحبت ہے۔ یعنی اللہ والوں کے پاس بیٹھنا۔ ان کی باتیں سننا۔ ان سے دینی فائدہ اٹھانا۔ ہر بستی میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے یہاں لوگ آتے جاتے ہیں، جن سے تعلقات رکھتے ہیں۔ مگر یہ اہل اللہ نہیں ہوتے، بلکہ اہل دنیا ہوتے ہیں۔ بستی کے جس شخص سے متعلق لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ مشکل وقتوں میں ان کے کام آسکتا ہے، تھانہ اور کچہری کے معاملات میں اچھے مشورے دے سکتا ہے اس سے ضرورت کے وقت قرض حاصل کیا جا سکتا ہے، جس سے ملے جلے رہنے میں دنیا کے کام بن سکتے ہیں۔ اس سے لوگ تعلق رکھتے ہیں، اس کی بات مانتے ہیں، حتیٰ کہ اس کا کوئی مقدمہ ہو تو اس کے حق میں جھوٹی گواہی دینے بھی چلے جاتے ہیں۔ اور یہ سب صرف اس لیے ہوتا ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ دنیا کا جب کوئی کام اٹکے گا تو وہ ان کی مدد کرے گا۔

مگر یہ سب دنیوی تعلقات ہیں۔ ان کا اگر کوئی فائدہ ہے تو بس اتنا ہی کہ دنیا کی چند روزہ زندگی میں آپ کو کچھ

مل جائے۔ اس کے بجائے آپ کو یہ کرنا ہے کہ اپنی بستی کے نیک لوگوں سے اپنے تعلقات بڑھائیں۔ ایسے لوگ جن کے پاس بیٹھنے میں خدا و رسول کی باتیں سننے میں آئیں، جہاں آخرت کا تذکرہ ہو۔ جہاں بیٹھنے سے دینی معلومات میں اضافہ ہوا ور اسلام پر عمل کرنے کا شوق پیدا ہو۔ ایسی صحبت آپ کو خواہ دنیا میں کوئی فائدہ نہ دے۔ مگر وہ آپ کو جنت سے قریب کرے گی۔ وہ آپ کو دین کی راہ میں آگے بڑھائے گی۔

ہر بستی میں جس طرح اہل دنیا ہوتے ہیں اسی طرح کچھ اللہ والے بھی ہوتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ دنیا اللہ والوں سے خالی ہو گئی ہے۔ مگر لوگ ایسے آدمیوں کی قدر نہیں کرتے۔ ہمارے ناپنے کے پیمانے کچھ ایسے ہو گئے ہیں کہ اس میں دنیا دار لوگ تو بہت وزنی نظر آتے ہیں مگر دین دار لوگوں کے اندر کوئی وزن معلوم نہیں ہوتا۔ ہم آدمی کو اونچے مکان اور بڑی جائداد کی عینک سے دیکھتے ہیں۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کس کے پاس روپیہ زیادہ ہے اور کون زیادہ لچھے دار باتیں کرتا ہے۔ ہم پتہ لگاتے ہیں کہ کون شخص ہے جس کے سرکاری افسروں اور بڑے بڑے عہدیداروں سے تعلقات ہیں، کون قانونی معاملات کو سمجھنے میں مہارت رکھتا ہے اور کس کا غول زیادہ بڑا اور طاقتور ہے ـــــ اب چونکہ ان معاملات میں وہی شخص زیادہ آگے نظر آتا ہے، جو زیادہ سے زیادہ دنیا میں لپٹا ہوا ہو اس لیے ایسے ہی لوگوں کو ہم بڑا سمجھتے ہیں اور ان سے تعلقات قائم کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

اس کے بجائے دین اور آخرت کی چیزیں ہم کو ہلکی پھلکی اور بے حقیقت معلوم ہوتی ہیں اس لیے وہ لوگ ہمیں کچھ بھاری بھرکم نظر نہیں آتے جو نماز روزے کا اہتمام کرتے ہوں، جو اخلاق اور معاملات میں خدا کی حدود کا لحاظ کرنے والے ہوں۔ جو قرآن و حدیث اور دینی مسائل کا علم رکھتے ہوں، جن کی مجلس میں خدا و رسول کا تذکرہ رہتا ہو۔ جن کے یہاں ناولوں اور قانونی کتابوں کے بجائے دینی لٹریچر رکھا ہوا ہو۔ ہماری آنکھوں پر دنیا پرستی کی جو عینک چڑھی ہوئی ہے، اس سے جب ہم ایسے لوگوں کو دیکھتے ہیں تو وہ ہم کو بالکل بے وزن نظر آتے ہیں۔ وہ اس قابل نظر نہیں آتے کہ ہم ان سے دلچسپی پیدا کریں۔ ایسے لوگوں کے متعلق ہمارا خیال ہے کہ وہ بس اسی لیے ہیں کہ مدرسہ میں پڑھائیں یا مسجد کی امامت کریں۔ ان کو اس سے زیادہ مقام دینے کے لیے ہم تیار نہیں ہوتے۔

آدمی کے اوپر صحبت کا بہت اثر پڑتا ہے۔ جیسے لوگوں کے ساتھ آپ رہیں، بالکل یقینی ہے کہ خود بھی کچھ دنوں کے بعد آپ ویسے ہی ہو جائیں گے۔ آپ کے کان میں وہی باتیں پڑیں گی جو وہاں ہو رہی ہوں۔ آپ کے دل میں انھیں چیزوں کی طرف رغبت ہوگی جن کا وہاں چرچا رہتا ہے۔ آپ کا تعلق اسی طرز کے لوگوں سے بڑھے گا جیسے لوگ وہاں جمع ہوتے ہیں۔ آپ کا پورا رخ دھیرے دھیرے اسی طرف ہو جائے گا جدھر وہ لوگ اپنا رخ کیے ہوئے ہیں۔ اب یہ آپ

تھی اگر دینی جذبہ رکھنے والے ہوں تو آپ بھی ان کے ساتھ دین دار بنتے چلے جائیں گے۔ ان کی صحبت آپ کو خدا کے قریب کرے گی۔ اور اگر یہ ساتھی دنیا پرست ہوں تو قدرتی طور پر آپ کو بھی وہ دنیا پرست بنا کر چھوڑیں گے۔ آپ بھی ویسے ہی ہو جائیں گے جیسے وہ لوگ ہیں۔ اسی لیے کہا گیا ہے۔ اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ (آدمی کا انجام اس کے ساتھ ہوتا ہے جس سے وہ محبت کا تعلق رکھتا ہے)

یہ تین کام ہیں جو اس وقت میں آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ میں نے بہت سوچا کہ اس وقت ہندوستان کے عام مسلمانوں کی جو حالت ہے اس کی اصلاح کیسے کی جائے۔ بالآخر یہی چند باتیں میری سمجھ میں آئیں۔ پہلی چیز جمعہ کی تنظیم ہے۔ یہی وہ سب سے بڑا فطری ذریعہ ہے جس سے مسلمانوں کے اندر اجتماعیت پیدا کرنے کا کام لیا جا سکتا ہے اور اسی سے ان کے اندر وعظ و نصیحت کا ایک ہفتہ وار سلسلہ شروع کیا جا سکتا ہے۔ دوسری چیز اپنی زندگی کو خدا کی مرضی کے مطابق بنانا ہے۔ اس کے بغیر ہمارے مسلمان ہونے کے کوئی معنی نہیں۔ نیز اس کے بغیر ہم خدا کی مدد کے مستحق نہیں ہو سکتے جو دنیا اور آخرت کے سارے مسائل کو حل کرنے کا واحد سہارا ہے۔ تیسری چیز اپنے ساتھیوں کے انتخاب میں اسلام کا لحاظ کرنا ہے، نیز اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کی بستی میں اہل دین کو ان کا صحیح مقام حاصل ہو اور موجودہ حالت ختم ہو کہ اہل دنیا لوگوں کی توجہات کا مرکز اور ان کا مرجع بنے ہوئے ہیں اور جو اہل دین ہیں وہ تنہا اور اجنبی ہو کر رہ گئے ہیں۔

میرے عزیز دوستو! یہ چند باتیں جو میں نے آپ کے سامنے رکھی ہیں یہی کل اسلام نہیں ہے، بلکہ یہ وہ "کم سے کم" ہے جس سے آپ اپنی موجودہ حالت سے نکل کر اسلام کی طرف آنے کا آغاز کر سکتے ہیں۔ یاد رکھیے اسلام اس بات کا نام نہیں ہے کہ کوئی شخص اپنے طور پر سمجھ لے کہ میں مسلمان ہوں۔ بلکہ مسلمان درحقیقت وہ ہے جس کو آخرت کے فیصلہ کے دن خدا مسلمان قرار دے۔ پھر سوچیے کہ مرنے کے بعد جب ہم خدا کے یہاں حاضر ہوں گے، اس وقت اگر ہمارے ایمان و اسلام کو دیکھ کر خدا کہہ دے کہ تمہارا 'ایمان' ایمان نہیں ہے۔ اور تمہارے اسلام کو میں قبول نہیں کرتا، تو اس وقت ہمارا کیا حال ہوگا۔ کون سے زمین و آسمان ہوں گے جو اس دن ہم کو جگہ دیں اور کون مددگار ہوگا جو اس دن کی تباہی سے ہم کو بچا سکے ۔۔۔ اس لیے انجام سے پہلے اس کی تیاری کیجیے اور موت سے پہلے موت کے بعد والی زندگی کے متعلق سوچ لیجیے۔ کیونکہ کرنے کا جو کچھ موقع ہے وہ آج ہے۔ اس کے بعد تو صرف پچھتانا ہے اور اپنے کیے کو بھگتنا۔

بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ اور اسلام

قسط (۲)

(جناب عبدالباری، ایم۔اے)

غلط اقدام کے نتائج بے شمار مسائل

نفس کی پیروی میں غیر متوازن راہیں اختیار کرکے انسان انتشار میں مبتلا ہو جاتا ہے اور جب زندگی کے ہر شعبہ میں انتشار پیدا ہو گیا تو پھر چین اور سکھ کہاں؟ جس خطے میں اور جس زمانے میں بڑھتی ہوئی آبادی کے مسئلے نے پہلے پہل اہمیت اختیار کی تھی اس خطہ اور اس زمانے پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو حقیقتیں آشکارا ہوں گی۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں یورپ میں صنعتی انقلاب کی بدولت ایک ایک مشین سے وہ کام لیا جانے لگا جس کے لئے پہلے ہزار آدمیوں کی طاقت درکار ہوتی تھی۔ لیکن ؂

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت — احساسِ مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات

ہوا یہ کہ نفس کی پیروی میں اخلاق و تمدن کے صحیح اصول و مبادی کا سررشتہ ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ یہ صنعتی انقلاب کیا آیا انسانیت کے لیے وبالِ جان بن گیا! اس کے طفیل میں جو معاشرہ وجود میں آیا وہ ہمدردی، غم گساری کے جذبات سے عاری اور اس کے برعکس صفات سے لبریز ہو گیا۔ مغربی تہذیب کے اس سیلاب نے دنیا کے مختلف خطوں کو متاثر کیا جس میں ہندوستان بھی ہے۔ اس اخلاقی زوال سے جو خرابیاں رونما ہوئیں اور جو مسائل پیدا ہوئے اتنے وسیع پیمانے پر ہیں، جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ یہاں صرف ان نمایاں مسائل کے جائزہ پر اکتفا کرنا ہوگی جو ملک کی اقتصادی زندگی کو گھن کی طرح کھائے جا رہے ہیں۔ مثلاً:۔

(۱) بے روزگاری کا مسئلہ۔ (۲) مزدور کا مسئلہ۔ (۳) مہنگائی کا مسئلہ۔ (۴) سودی کاروبار کا مسئلہ (۵) معیارِ زندگی اور بدلتے ہوئے اقدار کا مسئلہ۔ (۶) فضول خرچی اور عیش پرستی کا مسئلہ۔ (۷) ٹیکسوں کا

اور (۸) جنسی آوارگی کا مسئلہ

(۱) **بے روزگاری کا مسئلہ** کسی فنی ایجاد اور مشین کے اندھا دھند استعمال کی اجازت اس وقت تک نہ ہونی چاہیے جب تک کہ اس سے متاثر ہونے والی آبادی کی (جن کی روزی ماری جائے) معیشت کا بندوبست نہ کر دیا جائے۔ چونکہ عموماً ایسا نہیں ہوا اس لیے مشینی دور نے دنیا کے سامنے اب بے روزگاری کا ایک مستقل مسئلہ اتنے بڑے پیمانے پر پیدا کر دیا جس سے تاریخ پہلے کبھی آشنا نہ تھی۔ پڑھے لکھے آدمی نوکری تلاش کرتے ہوئے جب نکلنے لگے تو لامحالہ کم سے کم اجرتوں پر کام کے لیے مجبور ہو گئے۔ پھر ان میں سے سبھی کو کام نہ مل سکا۔ اس طرح بے روزگاروں کی تعداد دن بدن بڑھتی رہی۔ روس و امریکہ جیسے ملکوں میں بھی (جہاں مزدوروں کو بظاہر وسیع پیمانے پر کافی حقوق دیے گئے ہیں) معاشی و سماجی دونوں حیثیتوں سے مزدور مطمئن نہیں ہو سکے۔ حالانکہ امریکہ میں ہر فرد کی اوسطاً آمدنی روزانہ ۲۷ روپیے کے قریب ہے پھر بھی لاکھوں آدمی بیکار رہیں۔ ۱۹۴۹ء میں تو بے روزگاروں کی تعداد ۴۰ لاکھ تک پہنچ گئی تھی اور ۵۳-۱۹۵۴ء میں (سفارت خانہ کی خبر) ۲۰۶۲،۳۲،۸۲ تک۔

ایشیا اور ہندوستان جیسے زراعتی ملکوں کے لیے بھاری مشینوں کا استعمال کسی طرح مفید نہیں ہے۔ پچاس سال پہلے جب ہندوستان میں بھاری مشینیں نہیں آئی تھیں بے روزگاری کا کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا ——————

اب جب سے جدید مشینوں کی اسکیم ہو گئی لاکھوں مزدور بے کار ہو کر چھانٹ دیے گئے۔ مرزا پور کی سمنٹ فیکٹری (جو حکومت کی ہے) کے افتتاح پر وزیر اعظم پنڈت نہرو نے محسوس کرکے کہا تھا کہ "جب اس ملک میں بے روزگاری اتنی ہے تو ہر کام مشینوں کے ذریعہ لیکر مزدوروں کو روزگار سے محروم کرنا غیر مناسب ہے۔ (قومی آواز ۳۰ اگست ۱۹۵۶ء)

برسوں سے ہندوستان میں بے روزگاری کا مسئلہ اہم ترین مسائل میں سے ہو گیا ہے کیونکہ اس کے لپیٹ میں لاکھوں بلکہ کروڑوں انسان آجاتے ہیں۔ اس کے حل سوچنے کے لیے کلکتہ میں ایک بڑا ادارہ قائم کیا گیا ہے جس میں ۲۰۰ ماہرین کام کر رہے ہیں اور مشورہ کے لیے امریکہ، فرانس، جاپان، ناروے اور روس کے ماہرین بھی بلائے گئے ہیں۔ اسی طرح ملک کے تمام مشہور شہروں میں ایمپلائمنٹ ایکسچینج (Employment exchange) اور لیبر آفس (Labour office) نظر آتے ہیں، لیکن بے روزگاری کا خاتمہ ہوتا نظر نہیں آتا۔

نیشنلائزیشن کے تحت چاپلوسوں کا مقام برقرار رہتا ہے۔ بہی خواہوں کی پوچھ نہیں ہوتی۔ اور کتنے ہی کارآمد افراد کا حق مارا جاتا ہے۔

بھائی چارگی کا ایسا فقدان اور ایسی بے گانگی کہ لنکا سے روزی کماتے ہوئے ہندوستانیوں کو جنوری ۵۵ء سے ستمبر ۵۵ء تک (صرف ۸ مہینے میں) ۹۱ہزار کی تعداد میں نکال باہر کیا گیا۔ (الجمیعۃ ۱۹ ستمبر ۱۹۵۵ء) حالانکہ لنکا ہندستان ہی کا ایک جز رہ چکا ہے جس کی تہذیب جس کا تمدن ایک ہے بلکہ شادی بیاہ کے تعلقات سے دونوں جکڑے ہوئے ہیں۔ اسی طرح جنوبی افریقہ میں وہاں کے کالے لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو زبردستی ان کے موجودہ گھروں اور جائدادوں سے بے دخل کر کے دور علاقوں میں بھیج دیا جاتا ہے خواہ ایسی آبادکاری کی اسکیموں پر اربوں روپیہ ہی کیوں نہ برباد کرنا پڑے!

مزدور کے مسئلہ کو آج بڑی اہمیت حاصل ہے محنت و سرمایہ میں بے حد کشمکش ہے

(۲) **مزدور کا مسئلہ** مزدور محنت کی جنس بن کر الگ ایک طبقہ بن گیا ہے۔ اور یہ ذہنیت انھیں اتنی دور کھینچ لے گئی ہے کہ ہمدردی، امداد باہمی کی اسپرٹ مفقود ہو گئی ہے۔ بے اطمینانی اتنی بڑھ گئی ہے کہ ساری دنیا سے روزانہ ہڑتالوں کی خبریں آتی رہتی ہیں اور ہندستان میں شاید ہی کوئی مہینہ اس خبر سے خالی ہوتا ہو۔ روس چین اور مشرقی یورپ کے ان ممالک میں بھی جہاں اس وقت مزدور راج ہے۔ مزدوروں کا حال سرمایہ دار ملکوں سے اچھا نہیں۔ ۱۹۵۴ء میں روس میں کم سے کم اجرت ۵۰۰ روبل (ایک روبل = ایک روپیہ ۱۲ آنہ) تھی اور کارخانے کے ڈائرکٹر ۵ ہزار سے ۷ ہزار روبل تنخواہ پاتے تھے لیکن یہ ۵۰۰ روبل کی تنخواہ حقیر معلوم ہو گی جب روس کی عام ضروریات زندگی کی قیمتوں کا اندازہ کیا جائے۔ مثلاً ایک ٹھنڈی قمیص ۸۱ روپیہ ۱۲؍ ایک انڈے کی عہ ۱؍ ایک سیر ٹماٹر کی دو روپیہ ۳؍ ایک سیر دودھ کی چھ روپیہ ۹؍ (اگست ۵۴ء میں جو خیرسگالی وفد ہندستان سے روس گیا تھا اس کے ایک ممبر کے مشاہدے روزنامہ 'پرتاب' میں شائع ہوئے تھے) یہی حال دوسرے کمیونسٹ ممالک کا ہے۔ مارکیٹ کی مہنگائی کے ساتھ مہنگائی الاؤنس کا تطابق اگر نہ ہوا تو مزدوری کے اضافہ سے کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔

مزدوروں کی تنظیم بنتی ہے کہ حقوق حاصل کرنے کی قوت پیدا کی جائے لیکن "روٹی، روزی کپڑا دو"۔ ورنہ گدی چھوڑ دو" جیسے پُرفریب نعرے (۱۹۵۱ء میں دہلی میں اناج سینا (FOOD ARMY) کا یہ نعرہ تھا) محض وقتی جوش تو ضرور پیدا کر سکتے ہیں مگر کوئی ٹھوس ذہنیت نہیں بنا سکتے۔ آج مزدور تنظیموں کا طرز عمل ایسا ہو گیا ہے کہ ان کے اخراجات کا بار تو مزدوروں ہی پر پڑتا ہے لیکن اکثر اوقات دنیا کی یہ تنظیمیں براہ راست یا بالواسطہ کسی نہ کسی سیاسی پارٹی کے زیر اثر ہو کر سیاسی اغراض و مصلحتوں کی بندش میں آجاتی ہیں اور ان کو وہ فائدہ حاصل نہیں ہو پاتا جو دیانت داری کے ساتھ

آزادانہ طور پر ہوسکتا تھا۔ ایک المناک پہلو یہ بھی ہے کہ مزدوروں و سرمایہ داروں کی کش مکش دور کرنے میں حکومت کی مداخلت اور بیچ بچاؤ (   ) کے جو تجربات مشاہدے میں آتے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ درحقیقت مزدوروں کے حقوق کی پامالی دور نہیں ہوتی۔ کارخانوں میں لیبر افیسر، ویلفیر آفیسر اور لیبر کے محکمہ کی بے بسی و مجبوری بھی اب کوئی غیر معروف شے نہیں۔ ان کے ذریعہ معاملات سلجھنے کی توقع رکھنی محض ایک خوش فہمی ہے۔

مزدوروں کے اندر جو محدود طور پر مزدوری کاٹ کاٹ کر بعض سوشل انشورنس اسکیمیں نافذ کی جاتی ہیں۔ ان سے باشندگان ملک کی وہی محدود تعداد فائدہ اٹھاتی ہے جو فی الوقت کما رہی ہے۔ لکھوکھا آدمی جو ملک میں بے روزگار رہتے ہیں ان کی ذمہ داری لینے والا کوئی دکھائی نہیں پڑتا۔

خراب صورت حال کو درست کرنے کی خاطر اجتماعی منصوبہ بندی، اور نیشنلائزیشن کے وہ تجربات جان بوجھ کر ہندوستان میں بھی کیے جا رہے ہیں جو روس، جرمنی، اٹلی، امریکہ اور انگلینڈ میں ہو چکے ہیں لیکن چند فائدوں کے ساتھ ساتھ جو بڑی بڑی قباحتیں بھی آجائیں گی کیا تجربات کی روشنی میں موجود نہیں ہیں؟ عوام کی معاشی زندگی کو بالکلیہ ریاست کی تحویل میں دے دینے سے ان کی پیٹ کی باگ ڈور اُن چند ارباب سیاست و حکومت کے ہاتھوں چلی جاتی ہے جو زندگی و مسائل معیشت اور خوراک کے سرچشموں پر قابض ہیں اور اس "راتب بندی سے پرواز میں کوتاہی آجاتی ہے"۔ پوری پوری آبادیاں بچوں اور یتیموں کی طرح اتالیقی و تولیت میں زندگی گزارنے لگتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُن محدود آزادیوں کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے جن کو استعمال کرکے وہ ارباب حکومت کو متوجہ کرسکیں! کیا اس اکیلے اور سب سے بڑے نقصان کی تلافی اس غلط نظام معیشت میں کسی طرح بھی ہوسکتی ہے؟

آج ذرائع نقل و حمل کی فراوانی اور سفر کی سہولت نے مزدوروں کی حرکت و نقل (Mobility of labour) میں بہت زیادہ وسعت پیدا کردی ہے لیکن دنیا کے کسی دستور میں دیانت داری کے ساتھ ان کے لیے کوئی ایسی گنجائش نہیں نکالی گئی جس کی رو سے وہ کسی ایسے ملک میں جا سکیں جہاں ان کو بآسانی ذرائع رزق مل سکیں۔ اور جہاں وہ اپنے کو اجنبی اور غریب الدیار محسوس نہ کریں۔ کمیونسٹ ملکوں میں تو خیر اس کی گنجائش سرے سے ہے ہی نہیں۔ ان جمہوری ملکوں میں جہاں بظاہر غیر ملکی اجیروں (EMPLOYEES) کو جانے اور ذریعہ معاش تلاش کرنے کی قانونی اجازت ہے وہاں بھی نہ تو روزی کی کوئی سہولت ہے اور نہ سماجی حیثیت سے وہاں ان کو کوئی مقام ہی حاصل ہوسکتا ہے چنانچہ اسی غلط جذبے کی بدولت امریکہ میں آج تک حبشیوں کو عام شہری حقوق کا حاصل ہونا تو درکنار انھیں کالے رنگ کی وجہ سے تعلیم گاہوں اور ہوٹلوں تک میں برداشت نہیں کیا جاتا۔

(۴) مہنگائی کا مسئلہ ذاتی مفاد اور نفع اندوزی (PROFITEERING) کی بے جا جد میں اقتصادیات کے اصول کے خلاف بھی ایسے طریقے استعمال کیے جاتے ہیں جن سے مصنوعی طور پر گرانی بڑھتی ہے۔ مثلاً:- (۱) اشیاء ضرورت کو خرید خرید کر اسٹاک بڑھاتے چلے جائیں یہاں تک کہ بازار میں ان کی رسد (SUPPLY) کم اور مانگ (DEMAND) بڑھ جائے۔ اسی طریقے سے ۱۹۴۳ء میں بنگال کے اندر انسانوں کا لایا ہوا قحط تھا جس میں لاکھوں آدمی مر گئے۔ (۲) پرمٹ سسٹم موزوں قیمت والی دوکانیں (FAIR PRICE SHOP) اجارہ داری (MONOPOLY) اور کنٹرول کے طریقوں سے متوسط تجار (MIDDLEMEN) خواہ مخواہ مہنگائی بڑھاتے ہیں جس کا تجربہ دوسری جنگ عظیم کے دوران ہندوستان نے خود کیا۔ مہنگائی کے ساتھ ساتھ رشوت، بلیک مارکیٹنگ اور اشیاء کی قلت کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا اور غذا کے وزیر قحط کے وزیر مشہور ہونے لگے۔ (۳) مال پیدا کرنے والے اور اصل استعمال کرنے والے کے درمیان سیکڑوں آدمی غائبانہ بیچتے اور خریدتے چلے جاتے ہیں (جسے سٹہ بازی یا (SPECULATION) کہتے ہیں۔ ان کا منافع اشیاء کی قیمت بڑھاتا چلا جاتا ہے۔ (۴) ابھی تک ہر سال بہت بڑی مقدار میں تیار کیا ہوا مال پیدا کیا ہوا غلہ اور پھل وغیرہ جلا کر یا سمندر میں پھینک کر قصداً برباد کر دیا جاتا ہے (حالانکہ ایسی غارت گری پر بھی لاکھوں روپیے صرف کر دینے پڑتے ہیں) تاکہ منڈیوں میں قیمت گھٹنے نہ پائے۔ (۵) آج اشیاء از قسم تعیش (LUXURY GOODS) تیار کی جاتی ہیں اور متوسط الحال لوگوں کی ضروریات زندگی میں خواہ مخواہ ٹھونس دی جاتی ہیں جو بے چارے اپنے فرائض حیات بھی پوری طرح بجالانے کے قابل نہیں ہیں۔ اس طرح عامۃ الناس کی حقیقی جائز ضرورتوں کا خیال نہ کر کے ایک طرف ناجائز و غیر ضروری اشیاء کی فراہمی پر محنت و سرمایہ صرف کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف نہایت مضر صحت اور مخرب اخلاق اور مفسد تہذیب و تمدن چیزوں کو اپنے سرمایے کے بل بوتے خوشنما بنا بنا کر اس مہلک کاروبار کی طرف کھینچا جاتا ہے اور (۶) ان تمام مذکورہ خود غرضانہ مقاصد کے حصول کا میدان تیار کرنے کے لیے کمزور قوموں کے حقوق پر ڈاکے ڈالے جاتے ہیں اور دنیا کو مختلف حلقہائے اثر میں مصنوعی ہکیٹوں کے ذریعہ تقسیم کیا جاتا ہے جو ایسی دائمی کش مکشوں میں الجھتے ہیں (کیا دنیا کا تجربہ آنکھوں کے سامنے نہیں ہے؟) کہ میدان جنگ اور ایوان صلح بھی آج ان کے سلجھانے میں قاصر ہیں۔

(۵) سودی کاروبار کا مسئلہ آج سودی کاروبار دنیا کے گوشے گوشے میں پھیل گیا ہے۔ دولت کو جمع کر کے سود پر چلانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دولت سمٹ کر چند افراد کے

پاس اکٹھی ہو جاتی ہے اور بڑی بڑی منڈیوں پر ان کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ یہ سرمایہ دار بنیے محنتی کسانوں اور جفاکش
مزدوروں کا خون چوستے رہتے ہیں۔ سودی روپیہ کا لین دین بڑی بڑی حیرت انگیز شرحوں پر ہونے لگا۔ جو شخص ایک مرتبہ
سودی قرض کے جال میں پھنس جاتا ہے وہ پھر اس سے نہیں نکل سکتا۔ جائدادیں تک رہن رکھ لی جاتی ہیں۔ اکثر اوقات
دادا کا لیا ہوا قرض پوتوں تک وراثت میں منتقل ہوتا چلا جاتا ہے۔ دوسری طرف عوام کی قوت خرید
(PURCHASING POWER) روز بروز گھٹتی چلی جاتی ہے۔ صنعت و تجارت میں کساد بازاری BLACK
MARKETING) رونما ہو جاتی ہے۔

آج کا شائلاک (SHYLOCK) سود خوار مہاجن لاکھوں قلیل المعاش کارکنوں کو کتنا پریشان و بددل
کر کے ان کی آمدنی کا بڑا حصہ سمیٹ لیا جاتا ہے! شب و روز کی ان تھک محنت کے بعد جو تھوڑی سی تنخواہ یا مزدوری ملتی
ہے اس میں سے سود ادا کرنے کے بعد اُن کے پاس اتنا بھی نہیں بچتا کہ دو وقت کا کھانا چلا سکیں۔ اولاد کی تعلیم و تربیت
کے معیار کو بڑھانا تو درکنار۔ یہ چیز ان کے اخلاق کو بگاڑ کر انھیں جرائم کی طرف ڈھکیلتی ہے اور دائمی فکر و پریشانی
میں مبتلا کر کے ان کے جذبۂ عمل اور ان کی صلاحیت (CAPACITY) اور قابلیت کارکردگی (Efficiency)
کو گھٹا دیتی ہے۔ کیا اجتماعی معیشت کا یہ بھاری نقصان نہیں ہے؟ اور کیا معاشی پیداوار کو گھٹانے میں سود کا زبردست
ہاتھ نہیں ہے۔

تاجر، صنّاع اور کاشتکار تو تھے ہی۔ آج حکومتیں تک اس سودی لین دین کا شکار ہو رہی ہیں۔ اسی روپے سے
منصوبہ بندی پر عمل درآمد ہو رہا ہے اور جیسا کہ اخباروں کے اعلانات بتا رہے ہیں برسوں نہیں صدیوں ایک ایک
شخص سے ٹیکس وصول کر کے سود کے کروڑوں روپیے سالانہ مہاجن کے گھر پہنچاتی رہتی ہیں (انگلینڈ و امریکہ کے ان
تجربوں کو آج ہندستان دُہرا رہا ہے) حد یہ کہ اگر کسی قوم کو جنگ پیش آ جائے تو جنگی قرضہ مع سود کی ادائگی میں ان لوگوں
کو بھی کسی نہ کسی شکل میں مستقلاً حصہ لینا پڑتا ہے۔ جنھوں نے دورانِ جنگ میں اپنے وقت، اپنی محنت، اپنی جان تک کی
بازی لگا دی تھی! ان ہی ملکی و غیر ملکی قرضوں کی نقل پر آج عوام الناس سے بھی سودی قرض لے کر حکومتیں منصوبہ بندی پر
رقمیں لگا رہی ہیں جسے ایک پسندیدہ عمل سمجھ کر اس کا پرچار بھی کیا جا رہا ہے۔ پھر تقسیم ثروت کا عدمِ توازن معاشی
زندگی کو تباہی کی طرف گھسیٹ لے جائے تو کون سی نئی بات ہے؟

(۴) معیارِ زندگی اور بدلتے ہوئے اقدار کا مسئلہ

آج پوری دنیا خیر و شر کی من مانی تعبیر کر رہی
ہے۔ ایک ہی عمل کو ایک ملک اپنے لیے

تصور کرتا ہو تو دوسرا اسے برا سمجھتا ہے اقدار (VALUES) کے اس بدلتے ہوئے مفہوم (SENSE) سے بے شمار برائیاں پھیل رہی ہیں جن کی خاطر اپنے اپنے اعتبار سے غلط مقاصد کو نصب العین بنا کر ان پر سارا سرمایہ اور ساری قوت لگا دی جاتی ہے۔ مغربی تہذیب کی نقل کر کے آج معیار زندگی (STANDARD OF LIVING) کو روز بروز بڑھانے کی کوشش جاری ہے۔ صرف اچھا کھانا، اچھا پہننا، سوسائٹی میں ممتاز بننا آئیڈیل (IDEAL) بن گیا ہے لیکن اس بات کا پتہ نہیں لگایا جاتا کہ جن ممالک کی نقل اتاری جارہی ہے اور جن کا معیار زندگی کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر ہے انھیں بھی سکون ہے یا نہیں؟ ان کا مستقل انتشار تو خود اندر سے انھیں کھائے جا رہا ہے۔

مغربی تہذیب نے دنیا میں جو اثرات اب تک پھیلائے ان کا جائزہ بتاتا ہے کہ حاسۂ مذہبی کا فقدان ہو گیا ہے۔ دنیا طلبی و شکم پُری کا ایسا طوفان امنڈ پڑا ہے کہ اونچے سے اونچا معیار تسکین و تشفی کے لیے کافی نہیں رہا۔ بلند حوصلگی ختم ہوگئی ہے اور پست ہمتی کا دور دورہ آگیا ہے۔ قابل تقلید نمونہ اور مثالی تصورات نا پست ہو گیا کہ برگزیدہ بندوں کی سیرت تو نظروں سے اوجھل ہوگئی اور وہ شخصیتیں ذہنوں پر چھا گئیں جو اخلاقی و ذہنی حیثیت سے حد درجہ ناقص، اعمال و کردار کے لحاظ سے بے حد پست و گھٹیا۔ اور گھٹیا درجہ کے انسان معاشی جانور یا محض روپیہ پیدا کرنے کی مشین بن گئے ہیں۔ کیا اب بھی مغربی تہذیب کے دلدادہ ان ہی گھٹیا اقدار کو اپنانا چاہتے ہیں؟

(۶) فضول خرچی و عیش پرستی کا مسئلہ

غلط اقدار کو اختیار کر کے مصنوعی تہذیب اور پُرفریب زندگی کا ایسا سیلاب امنڈ آتا ہے کہ فضول خرچی کے سارے لوازمات کو انسان اپنی ضروریاتِ زندگی میں داخل کر لیتا ہے خصوصاً جب سودی قرض کی بھی سہولت ہو اور یہ سب کچھ حکومت کی سرپرستی میں ہو۔

دنیا کی شراب نوشی کا یہ عالم ہے کہ اکثر مقامات پر بجائے پانی کے شراب ہی کا استعمال چلتا ہے۔ دنیا کا اربوں روپیہ سالانہ شراب کی نذر ہو جاتا ہے۔ ہندوستان میں بھی ایسے ایسے علاقے اب بھی موجود ہیں جہاں روزانہ ایک ایک شراب بھٹی سے ہزاروں روپے کی شراب فروخت ہوتی ہے۔ دیگر نشہ آور چیزوں پر بھی کافی روپیہ لٹایا جاتا ہے نتائج دیکھنا ہے تو انسداد مے نوشی کے بین الاقوامی ادارے کے صدر ڈاکٹر رابرٹ پیرس (DR. ROBERT PARIS) کی رپورٹ سنیے! "شہوانی جرائم ۵۰ سے ۷۵ فی صدی تک شراب نوشی کا نتیجہ ہیں"

اسی طرح سینما بینی پر دنیا کا کروڑوں روپیہ روزانہ برباد ہو رہا ہے۔ ہندستان کا سالانہ تقریباً ستر کروڑ سینما دیکھنے کی نذر ہو جاتا ہے۔ صرف دہلی شہر کے سینما گھروں سے حکومت کو تفریحی ٹیکس کے تحت لاکھوں روپیے سالانہ وصول

...یں۔ پھر ان اخلاق سوز سینماؤں سے جو اثرات دیکھنے والوں پر مترتب ہوتے ہیں ایک کمیشن کی زبانی سنیے جسے
...ت امریکہ نے مقرر کیا تھا کہ "جنسی جرائم، زنا بالجبر، اغوا، رقابت میں قتل، امراض خبیثہ اور رہزنی دھاڑ کا بہت بڑا
...ب وہ فلمیں ہیں جو ہالی ووڈ میں تیار کی جاتی ہیں۔ اگر ان فلموں پر کڑا احتساب نہ کیا گیا تو ایک وقت ایسا آئے گا
...ارا امریکہ غنڈوں، قاتلوں، زانیوں اور ڈاکوؤں کی بستی بن جائے گا۔

اسی طرح کلب گھروں، رقص و سرود کے اڈوں، آرٹ و کلچر پروگراموں وغیرہ کے علاوہ گھوڑ دوڑ، معمہ بازی
...ہوئے پر بھی عوام کا روپیہ برباد ہو رہا ہے اور فحش لٹریچر کے ذریعہ ان سب کی پبلسٹی پر علیحدہ کثیر رقم اڑائی جا رہی
...جس کا اثر معمولی آمدنی والوں پر بھی پڑتا ہے اور ان کے بجٹ میں بدترتیبی آنا لازمی ہے۔

شادی بیاہ وغیرہ کے غلط رسومات پر تو فضول خرچی ہوتی ہی ہے، مرنے کے بعد بھی فضولیات پر جس طرح کثیر رقمیں
...مصری اہرام پر خرچ ہوتی رہیں اسی طرز کی چھوٹی یادگاروں پر بعد کے زمانوں میں بھی ہوتی رہیں۔ توہمات کی نذر بھی
...ر رقم لوگ کر دیتے ہیں، مثلاً حال ہی "گرہ (نحوست) کے پھیر میں کروڑوں روپیہ ہندوستان کے عوام نے بے دریغ
...چ کر ڈالا اور اپنے سربراہوں کی نصیحتوں پر کان نہ دھرا۔

سلاطینِ روم اور شاہانِ فارس عیش پرستی میں کیوں نہ بدنام ہوتے جبکہ شاہوں کی کلاہ کی قیمت لاکھ روپیہ تک پہنچ
...ی تھی اور پریشانی کے عالم میں سلطنت چھوڑ کر بھاگتے وقت بھی" یزدگرد اپنے ہمراہ ایک ہزار باورچی، ایک ہزار گویے
...ہزار چیتوں کے محافظ اور ایک ہزار بازدار لے گیا"۔ (طبری) لیکن آج بیسویں صدی کے امریکہ کا بھی یہ حال ہے کہ اُن
...، دو کروڑ بیس لاکھ کتوں پر ہر سال تقریباً ۱½ ارب روپیہ ضائع کیا جا رہا ہے

تخفیف کے دعووں کے علی الرغم حکومتوں کے نظم و نسق پر بے جا فضول خرچی ہو رہی ہے۔ دنیا میں ہر سال ۴۳ ارب
...لر رقم اسلحہ پر خرچ ہوتی ہے۔ (دعوت ۱۶ مارچ ۱۹۶۲ء) ۵۶-۱۹۵۵ء میں ہندوستانی فوج پر ۲۰۵ کروڑ روپے خرچ
...یے گئے (THOUGHT DELHI, FEB, 26, 1955) ۵۳-۱۹۵۲ء میں ایک سال کے اندر دہلی اور نئی دہلی کے رکھ رکھاؤ پر
...لاکھ نوے ہزار روپے خرچ ہوئے۔ (قومی آواز ۱۹ دسمبر ۱۹۵۳ء) دہلی میں آبادکاری پر ۶۰ کروڑ روپے خرچ ہوئے۔
دعوت ۱۶ مارچ ۱۹۶۲ء) سرکاری عمارتوں کے استعمال کے رویے میں بھی کوئی فرق نہ ہوا۔ سرد ملک کے حکمرانوں کے
چلے جانے کے بعد بھی یہاں نہ صرف یہ کہ سابق موسم گرما والے دارالخلافے (SUMMER CAPITALS) برقرار
...یں بلکہ روز بروز ایئر کنڈیشن والے دفاتر اور رہائش گاہوں کا رواج بڑھتا جا رہا ہے۔ حالانکہ ساتھ ہی ساتھ اس
...سے پیدا شدہ امراض کے شکار ہو رہے ہیں! بددیانتی، حرام خوری اور رنگیلے بازی میں کس طرح عوام کی گاڑھی کمائی کو

برباد کیا جاتا ہے۔ معاصر دوست نے شاہکار اسکینڈلوں کو بے نقاب کیا ہے۔

ایک ملک کے سربراہ صدر وزیر اعظم شاہی خاندان کے افراد جب دوسرے ملکوں میں سرکاری طور پر آتے جاتے ہیں تو ان کے استقبال اور جلسے جلوس پر پانی کی طرح روپیہ بہایا جاتا ہے جن کی خبریں روزانہ اخباروں میں آتی رہتی ہیں۔

فضول خرچی کے ان چند نمونوں اور غیر ضروری لوازمات زندگی کے شدید اہتمام سے کیا نشان دہی نہیں ہوتی کہ ایک طرف ایسے لوگوں کا پریشان قافلہ ہے جن کو ایک روز کا کھانا اور ستر پوشی کا کپڑا بھی نصیب نہیں۔ دوسری طرف عیش و عشرت میں ڈوبے ہوئے ایسے لوگ موجود ہیں جنھیں زائد از ضرورت اشیاء کا مصرف نظر نہیں آرہا ہے اور نت نئی راہوں کی تلاش و جستجو میں سرگرداں ہیں (مثلاً افریقہ میں گھانا کے ایک وزیر کی بیوی کی جائے سکونت پہ دس گیارہ لاکھ اور ریلنگ پر چار لاکھ سے زائد خرچ کیا گیا۔

ایسی عیش پسند اور مسرفانہ زندگی کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انفرادی و اجتماعی اور حکومتی

(۷) **ٹیکسوں کا مسئلہ** بجٹ سارے کے سارے بے حد متاثر ہوتے ہیں۔ ایک طرف غریب نادار مفلسوں کا برا حال ہوتا ہے اور خواہ مخواہ روزی کی مصنوعی کمی محسوس ہوتی ہے دوسری طرف حکومتیں اپنے خسارہ بجٹ کی تلافی کے لیے آئے دن طرح طرح کے بھاری ٹیکس عائد کرتی رہتی ہیں اور غیر ممالک سے قرضہ لے کر بھی اسے پورا کرنے کی کوشش کرتی ہیں جن کا سارا کمر توڑ بار گھوم پھر کر غریب عوام ہی پر پڑتا ہے معیشت کے چکر کے چار منازل ہیں شغل اصل (INVESTMENT) پیدائش خرچ اور تقسیم ان چار منازل میں طرح طرح کے ٹیکس لوگوں پر اس طرح لگائے جاتے ہیں کہ آبادی کا کوئی ایسا طبقہ نہیں جو ٹیکسوں سے بچا ہوا ہو۔

جائداد ٹیکس، موت ٹیکس، سس ٹیکس (Cess Tax) تجارتی حفاظتی ٹیکس (PROTECTION TAX) سیل ٹیکس اکسائز ٹیکس، نقل و حرکت ٹیکس (TRANSPORT TAX) سڑک ٹیکس، انکم ٹیکس، سپر ٹیکس (Super tax) تفریحی ٹیکس وغیرہ کے ذریعہ آج ہندوستان کو جو سالانہ آمدنی حاصل ہو رہی ہے وہ کئی ارب تک پہنچ جاتی ہے اور اس میں سال بہ سال اضافہ ہو رہا ہے۔ بظاہر سمجھا یہ جاتا ہے کہ ٹیکس کا بار کسی مخصوص طبقہ یا اس شخص پر براہ راست پڑتا ہے جس پر ٹیکس عائد کیا جاتا ہے لیکن دراصل مصارفِ پیدائش (Cost of production) میں اضافہ کی شکل میں چیزیں گراں ہوتی ہیں جنھیں عوام ہی استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح سیل ٹیکس کا سارا بار فروخت کرنے والے خریداروں پر منتقل کر دیتے ہیں۔ اکسائز ٹیکس خاص خاص اشیاء تعیش (LUXURY GOODS) پر یہ خیال کرکے عائد

کیا جاتا ہے کہ صرف زیادہ آمدنی والے امیر آدمیوں پر بار پڑے گا۔ لیکن موجودہ دَور اور ماحول میں اشیائے تعیش کی عادت ایک ضرورت سی بن گئی ہے اور لوگ انھیں کسی قیمت پر بھی خریدنے کو تیار کیے جاتے ہیں۔ اس طرح اس ٹیکس کا بار بھی آبادی کی غریب اکثریت ہی پر پڑتا ہے۔ غرضکہ ان سارے پیچیدہ ٹیکسوں کی بدولت اشیاء کی مجموعی قیمتیں بڑھتی جاتی ہیں اور غریب و متوسط طبقہ سب سے زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ (باقی)

بقیہ تراجم واقتباسات

بھینٹ چڑھانے پر آمادہ نہ ہوں جب تک ہم اخلاق اور دین و ایمان کے معیار بلند کرنے کو "معیار زندگی" اونچا اٹھانے سے زیادہ اہمیت نہ دیں گے اور اس کے قائل نہ ہوں گے کہ کفر میں جینے کے مقابلے میں اسلام پر مر جانا اچھا ہے ہمارے لیے یہ ممکن نہ ہوگا کہ خود کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے پیروکار سمجھا کریں۔ جس دم بھی ہم اسلام کو "مقدم" اور ماسوائے اسلام ہر شے کو مؤخر کر دیں گے دنیا و آخرت کا ورثہ ہمارے ہاتھ ہوگا۔

(ش، ن، عثمانی)

(بقیہ اشارات) ہر سال اس عظیم واقعے کے یادگار ایام آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ ہم عیدالضحیٰ کی نماز پڑھتے ہیں صاحب نصاب افراد کی ایک بڑی تعداد قربانی کرتی ہے، تین دنوں تک ہم گوشت کھانے اور کھلانے کے جشن مناتے ہیں اور رسائل و اخبارات کے مدیر اس واقعے پر اداریے لکھتے اور مقالات شائع کرتے ہیں اور بات ختم ہو جاتی ہے نماز عید اور قربانی سے جو اصل فائدہ ہمیں حاصل کرنا چاہیے وہ شاید ہی کچھ خوش نصیب افراد حاصل کرتے ہوں۔ اصل فائدہ یہ ہے کہ ہم اپنی ایمانی حالت اور اپنے اخلاق و کردار کا، اس عظیم واقعے کی روشنی میں جائزہ لیں۔ حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیل علیہما السلام کے آئینۂ ایمان و عمل میں اپنے ایمان و عمل کا عکس دیکھنے کی کوشش کریں سنجیدگی اور خلوص کے ساتھ اس پر غور کریں کہ اسوۂ ابراہیمی پر عمل کے معاملے میں ہمارا حال کیا ہے؟ کیا اس واقعے کی یاد سے ہمارے دلوں میں محبت الٰہی کا کوئی جذبہ اور ہمارے سروں میں کلمۂ توحید کو سربلند کرنے کا کوئی سودا پیدا ہوتا ہے؟

آنے کو تو آتی ہیں جنوں خیز بہاریں
کیا جانیے اب کیوں ہمیں سودا نہیں ہوتا

عزت و وقار حاصل کرنیکی واحد راہ

ایک مسلمہ خاتون کی نوائے حق!

پاکستان کے ایک موقر انگریزی ماہنامے "وائس آف اسلام، کراچی" بابت مارچ ۱۹۶۳ء کے صفحات میں ایک نوجوان نو مسلمہ (سابقہ یہودی خاتون) مس مریم جمیلہ صاحبہ زیدامیانہا کا ایک قیمتی مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے :-

"پاکستان کو واقعی اسلامی ریاست بنانے کی چھ تدابیر"

مقام درس و عبرت ہے کہ مغربی تہذیب و تمدن کی گود میں پلی ہوئی اس عورت میں "دین خالص" کی غیرت اور تڑپ کتنی شدید ہے جس کے قلب و روح کو ایمان سے ہم کنار ہوئے ابھی چند ماہ و سال سے زیادہ نہیں ہوئے۔ ان گوشوں کو حذف کر کے جن کا محدود اور براہ راست تعلق صرف پاکستان سے ہے اس عظیم مقالے کے وہ اقتباسات اردو میں ڈھال کر پیش کیے جا رہے ہیں جن میں عمومی اور اصولی انداز کی باتیں کہی گئی ہیں۔ کیسا ایمانی اجالا ہے اس خوش نصیب ہستی کے لفظ لفظ میں جس کے زبان و دل پر گناہوں اور سیہ کاریوں کی عمر کا زنگ نہیں چڑھا۔ پڑھیے ـــ اور سوچیے! ـــ مضمون کا آغاز یوں ہوتا ہے۔

۱۔ اس سے پہلے کہ ہم دوسروں سے اپنا احترام کرائیں ہمارے لیے ناگزیر ہے کہ خود اپنا احترام کرنا سیکھیں ہمیں چاہیے کہ خود کو "ملت پسماندہ" کہنے کی رٹ لگانا بند کریں۔ ہمارے لیے ہرگز روا نہیں کہ امریکہ، انگلستان یا سود روس کو "خوش قسمت اور ترقی یافتہ" سمجھا کریں اور نہ یہ بات کہ کسی بھی شکل میں ان کی چال ڈھال کو اپنانے میں لگ جائیں۔

۲۔ ہمیں تو اسلام اور اس کے طرز حیات کے مطلق شرف و افضلیت پر بہتر سے بہتر ایمان رکھنا لازم ہے۔ لازم ہے کہ ہم یہ سمجھیں کہ آج جو مادہ پرستانہ فلسفے چل رہے ہیں ان سے اسلامی اقدار کلیۃً مختلف و متغائر کیوں ہیں؟ اور یہ کہ ان دونوں میں ہرگز کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ ٹھیک ابھی اور اسی جگہ یہ فیصلہ کر لینا ہوگا کہ سچ مچ وہ کیا چیز ہے جو ہم چاہتے

یا ___ نئی مغربی تہذیب؟ ___ یا اسلام؟ ۔ رہا دونوں کو حاصل کرنا تو یہ ممکن نہیں ہے! ___"

روس اور امریکہ سے فوجی معاہدوں کو ایمان افروز فیصلوں کی راہ کا روڑا اور غیر ملکی امدادوں کو سیاسی فسادات کی ریشہ دوانی قرار دینے کے بعد مصنفہ محترمہ نے پاکستان کو مشورہ دیا ہے کہ وہ ان ذرائع و وسائل پر قانع رہ کر جو اس سرزمین میں خدائے کائنات نے خود ہی رکھ دیے ہیں ان کو فروغ دینے کی عملی جدوجہد کرے ۔ اس کے بعد پاکستان میں شریعت اسلامیہ کو اس کی ہمہ گیر شکل میں قانون مملکت بنا دینے کی رائے پیش کر کے فرماتی ہیں :۔

۳ ۔ یہ بھی اتنا ہی ناگزیر امر ہے کہ شریعت کی تشریح شدت کے ساتھ اس کے اپنے معنی و مفہوم میں کی جائے اور "بدلتے ہوئے حالات" کے ذیل میں بزور رعایت اور مصالحت کی روش اختیار نہ کی جائے ۔ ہماری اصل قانونی اساس قرآن مجید ہے ۔ ثانیاً رسول اکرم کی سنت ٹھیک اسی طرح جس طرح وہ حدیث میں وارد ہے ۔ اس کے بعد ہمارے چاروں ائمہ اور ان کے شارحین کی حیثیت سے ان کے نقوش قدم پر چلنے والے حضرات ۔ بحالات موجودہ تقلید میں ہی ہمارے لیے عافیت ہے ۔ ہرگز ہرگز اجتہاد کی حوصلہ افزائی نہ چاہیے' تاوقتیکہ ہمیں مادہ پرستانہ افکار کی غلامی سے گلو خلاصی نہ مل جائے ۔

نظام تعلیم میں انقلاب لانے کو با وقار زندگی کی طرف لے جانے والے ایک بنیادی اصول کی حیثیت سے لیکر مصنفہ محترمہ نے اول تو "مفت تعلیم" کی رائے دی پھر کہا کہ حکومت درس گاہوں کی کفالت کرے لیکن درس گاہیں حکومت کی بالادستی سے آزاد ہونی چاہییں ___ پھر "جبریہ تعلیم" کو غلط اور نامناسب قرار دیتے ہوئے کہا کہ "ریاست نہیں بلکہ باپ کا یہ موقف ہے کہ وہ اپنے بچے کو کس طرح پروان چڑھائے؟ ___ پھر مساجد کو تعلیمی ارتکاز کی مناسب جگہ پسند کرتے ہوئے یہ کہا کہ قرآن مجید کو "نصاب تعلیم کا مرکز و محور" اور زبان عربی مبین کو ہمارا "خصوصی ذریعہ تعلیم" ہونا چاہیے ۔

اللہ اللہ! ___ مقدر نے کیا دن دکھائے! ___ پیدائشی مسلمان تو چلا چلا کر مانگیں "کارل مارکس کا سرمایہ" اور زبان افرنگ! ___ اور ایک نومسلمہ مغربی خاتون جس کی مادری زبان انگریزی ہے وہ ایمان کی بسم اللہ کرتے ہی چیخ اٹھے اور تڑپ جائے کہ "نہیں نہیں! ___ بلکہ قرآن اور عربی زبان!!" ___ ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا (دنبال دیدۂ دل!) ___ اور ابھی کیا ہے! ___ آگے دیکھیے! ___ دیکھیے وہ عورت جو پیدائشی کافر تھی کیسی مسلمان اور مومنہ نکلی اور ہم کہ ہمیں اپنے پیدائشی اسلام پر "کفر بک نفس" کا الزام بھی گوارا نہیں ہمارے ایمان شریف کا حال زار کیا ہے! مصنفہ نے یہاں تک تو عسکری اور سیاسی زاویوں سے گفتگو کی تھی ۔ اب وہ خالص دینی اور روحانی ورثے کو بچانے کی طرف

بڑھ رہی ہیں اور یہاں ہم مکمل ترجمہ دے کر آپ کو یہ سوچنے سمجھنے کے لیے تنہا چھوڑتے ہیں کہ وہی عورت جس کا ضمیر تہذیب نو کے طشت زرنگار میں اٹھا اور جس نے نگار خانوں، کلبوں اور کلچرل سرگرمیوں" کی پاکستانی فضا میں آنکھ کھولی اس کے دل میں خود اس طاغوتی چمک دمک اور شیطانی رنگ و بو سے اتنی شدید نفرت کہاں سے آگئی ؟ — فرماتی ہیں :—

۴ :- "ہمیں ہر قیمت پر اپنے روحانی ورثے کو بچانا ہوگا اور اپنے نوجوانوں کے اخلاقیاتی بگاڑ کے خلاف سینہ سپر ہو جانا ہوگا۔ ایسا کرنے کے لیے حسب ذیل قدم اٹھانے پڑیں گے۔

ا۔ عصر حاضر کی کشتۂ جنس فلمی صنعت کو اسلامی اقدار کے لیے زہر ہلاہل تسلیم کیا جائے۔ خواہ گھریلو خواہ غیر ملکی فلمیں یہ بات برابر کی حیثیت سے دونوں پر چسپاں ہوتی ہے۔ اپنے نوجوان کی سیرت کو بچانے کا یہ لابدی تقاضا ہے کہ حکومت تمام سینما تھیٹروں کو آناً فاناً بند کر دینے کا مطالبہ کرے۔ غیر ملکی فلموں کی درآمد پر پابندی لگائے ــــــ اور گھریلو فلموں کی پیداوار کو ممنوع قرار دے۔ اس دن کے بعد سختی کے ساتھ فلم کو تعلیمی اغراض و مقاصد تک محدود ہونا چاہیے۔

ب۔ انسانی ہستیوں کے فوٹو اور خاکے خواہ وہ پوسٹروں میں ہوں یا اخبارات میں، رسالوں میں اور کتابوں میں ان سب کی اشاعت وطباعت یک قلم روک دیا جائے۔ اس طرح ہماری بستیاں شرمناک اشتہارات کے بورڈوں اور نسوانیت آموز رسائل وغیرہ سے پاک وصاف ہو جائیں گی۔ سربرآوردہ شخصیتوں کی تصاویر اور مجسموں کا عام گزرگاہوں اور مجلسوں میں مظاہرہ بند کر دینا چاہیے۔

ج۔ رائے عامہ کو اس بات کی تربیت شد ومد سے دینی چاہیے کہ مغربی کلچر اختیار کرنے کے سلسلے میں نوجوانوں کی حوصلہ شکنی کی جائے خواہ یہ کلچر لباس سے تعلق رکھتا ہو خواہ طور طریق سے۔ اگرچہ مغربی پوشاک پہننا بشرطیکہ وہ بے جا طور پر ناشائستہ نہ ہو خلاف قانون قرار نہ دینا چاہیے لیکن سماج کو لازم ہے کہ اس کو اچھی نظر سے نہ دیکھے۔ ہمیں اپنے آپ کو مسلمان کہنے کا حق حاصل نہیں اگر ہمیں اس بات سے شرم آتی ہے کہ مسلمان نظر آئیں۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہم ایسے نہ بنیں جیسے دشمن تو پھر ہمیں چاہیے کہ دشمنوں جیسے نظر نہ آئیں۔

د۔ ضروری ہے کہ ہر شک وشبہہ سے بلند ہو کر ہمیں مادی اغراض پر روحانی اقدار کی برتری کا یقین ہو اور اس دنیا پر ہم آخرت کو ترجیح دیں۔ الحاصل ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے انتہائی عزیز، دیرینہ نصب العینوں کو "ترقی پسندی" "خوش حالی" اور "معاشی ارتقاء" کے جھوٹے خداؤں پر

(باقی صفحہ ۴۴ پر ملاحظہ ہو)

رسائل ومسائل

مقام تنعیم سے عمرے کا حکم

سوال

بعض اہل علم نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ فی زمانہ عوام الناس بکثرت ایسا کرتے ہیں کہ مکہ معظمہ سے باہر حِل یعنی مقام تنعیم وغیرہ بار بار جاتے اور وہاں سے احرام باندھ کر عمرہ کرتے ہیں اور اس کو عمرہ لانا کہتے ہیں، ایسا کرنا جائز تو ہے لیکن فی الواقع غیر مسنون اور غیر مشروع ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی ایسا نہیں کیا ہے

دریافت طلب امر یہ ہے کہ جب یہ فعل غیر مسنون اور غیر مشروع ہے تو عوام الناس محض ایک جائز کام کے لیے زحمت کیوں برداشت کرتے ہیں۔ غیر مسنون وغیر مشروع ہونے کی وجہ سے اس کی اہمیت اور فضیلت ختم ہو جاتی ہے عوام الناس کی واقفیت کے لیے اس مسئلے پر اظہارِ خیال کرنا چاہیے۔

جواب

اوپر جن صاحبِ علم کا خیال نقل کیا گیا ہے انھوں نے اس فعل کو مطلقاً بغیر کسی قید وضاحت کے "غیر مسنون" اور "غیر مشروع" کہنے میں احتیاط نہیں برتی ہے۔ "مشروع" کا لفظ اصطلاحی طور پر دو جگہ استعمال کیا جاتا ہے ایک یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی چیز کے بارے میں کوئی حکم دیا ہو اور کوئی قانون نافذ فرمایا ہو مثلاً شریعت اسلامیہ کا قانون ہے کہ کوئی آفاقی (کسی میقاتِ حج سے باہر رہنے والا) جب موسم حج کے علاوہ کسی مہینے میں مکے میں داخل ہونا چاہے تو احرام باندھ کر داخل ہو اور عمرہ ادا کرے اس عمرے کو "مشروع" عمرہ کہا جاتا ہے اور اس کی خلاف ورزی جرم ہے۔ اس لفظ کا دوسرا موقعِ استعمال پہلے موقع سے بہت عام ہے۔ ہر ایسی چیز کو جس کے لیے شریعت میں اذن موجود ہے مشروع کہا جائے گا یہاں تک کہ مباح اشیا بھی اس میں داخل ہیں کیونکہ "مباح" احکام شرع کی مستقل قسم ہے اور جہاں تک نفل عبادتوں کا تعلق ہے جن کی ترغیب شریعت میں موجود ہے تو ان کے مشروع ہونے

کوئی شبہہ بھی نہیں ہے۔ اس طرح تمام مندوبات و مستحبات اور نفل عبادتیں مشروع ہیں کسی نفل عبادت کو مطلقاً غیر مشروع کہنا صحیح نہیں ہے ـــــ اسی طرح جہاں تک راقم الحروف کو علم ہے۔ "غیر مسنون" کا لفظ اصل میں کسی خلاف سنت شے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص بائیں ہاتھ سے کھاتا ہے تو اس کے اس فعل کو غیر مسنون کہا جائے گا لیکن میں نہیں جانتا کہ کسی ایسی چیز کو بھی علماء و فقہاء نے "غیر مسنون" کہا ہو جو شرعاً مباح ہے ـــ مثلاً اگر کوئی شخص کہے کہ پلاؤ کھانا غیر مسنون ہے تو وہ اس لفظ کا صحیح محل پر استعمال نہیں کرے گا۔ اس بات میں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود یہ کام نہیں کیا اور اس بات میں کہ یہ کام "غیر مسنون" ہے فرق کرنا چاہیے۔ اور اگر کوئی شخص، ایسی عبادت کو جس کی فضیلت بیان کی گئی ہو غیر مسنون کہتا ہے تو اس کا یہ قول غلط ہے۔ میں اس کو ایک مثال سے واضح کرتا ہوں ـــــ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کے عمرے کی بڑی فضیلت بیان کی ہے لیکن خود کبھی رمضان میں عمرہ ادا نہیں فرمایا ہے اب اگر کوئی شخص کہے کہ "رمضان میں عمرہ ادا کرنا جائز تو ہے لیکن فی الواقع غیر مسنون و غیر مشروع ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان میں کبھی عمرہ ادا نہیں کیا ہے" تو ایسے شخص کے بارے میں یہی فیصلہ کیا جائے گا کہ وہ شرعی اصطلاحات سے ناواقف ہے۔ اس ضروری توضیح کے بعد اب اصل مسئلے کو لیجیے۔

عمرے کی اہمیت و فضیلت صحیح احادیث سے ثابت ہے یہاں تک کہ احادیث میں اس کے لیے "حج اصغر" کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے۔ تمام عمر میں ایک بار عمرہ ادا کرنا امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک فرض ہے اور امام ابو حنیفہ اور امام مالک کے نزدیک سنت ہے۔ عمرے کی فضیلت میں جو احادیث آئی ہیں وہ تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے عام ہیں اس کے مخاطب اہل مکہ بھی اسی طرح ہیں جس طرح دوسرے مقامات کے باشندے۔ یہ بات بھی بلا اختلاف ثابت ہے کہ عمرہ سال کے تمام ایام میں کیا جاتا ہے (صرف یوم عرفہ، یوم النحر اور ایام تشریق میں امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک مکروہ ہے) ان مسلمات سے ہی یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اگر کوئی شخص یا گروہ "حج اصغر" کی فضیلت و اجر حاصل کرنے کے لیے بار بار عمرہ کرے تو اس کے لیے یہ فعل مستحب اور باعث تکثیر اجر ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ جمہور ائمہ مذاہب اور فقہائے امت، اکثار اعتمار (بکثرت عمرہ کرنا) کو مستحب کہتے ہیں۔ اس مسئلے میں ائمہ اربعہ میں صرف امام مالک رحمہ اللہ کا اختلاف منقول ہے۔ وہ سال میں ایک سے زیادہ عمرے کو مکروہ کہتے ہیں، اور ان کی طرف سے دلیل یہ دی جاتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سال میں ایک سے زیادہ عمرہ کبھی نہیں کیا ہے ـــ اہل مکہ تو الگ رہے ان کے نزدیک تو مثال کے طور پر اگر ایسا ہو کہ ہندوستان کا کوئی شخص عمرہ ادا کر کے اپنے گھر واپس

نے اور پھر اسی سال جاکر دوبارہ عمرہ کرے تو اس کا یہ فعل مکروہ ہوگا۔ ان کی طرف سے دی ہوئی دلیل کا جواب، جمہور کی طرف سے یہ دیا جاتا ہے کہ حضور کے عدم فعل کو کراہت کی دلیل بنانا صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ حضورؐ کبھی کسی عمل کو مستحب سمجھنے کے باوجود اس کو صرف اس لیے ترک فرما دیتے تھے کہ کہیں امت، مشقت میں نہ پڑجائے۔ ائمہ ثلثہ اور جمہور فقہاء کے علاوہ خود مسلک مالکی کے متعدد ائمہ نے اس مسئلے میں امام مالک سے اختلاف کیا ہے ـــــ یہ تو نہیں معلوم کہ امام مالک نے کس پس منظر میں یہ بات فرمائی تھی کہ سال میں ایک سے زیادہ عمرہ کرنا مکروہ ہے لیکن ان کی طرف سے جو دلیل دی گئی ہے وہ انتہائی کمزور ہے۔ یہ دلیل ایسی ہے جیسے کوئی کہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک وقت میں کبھی ایک اسبوع (کعبے کے گرد سات چکر لگانا) سے زیادہ طواف نہیں کیا اس لیے ایک وقت میں ایک سے زیادہ اسبوع مکروہ ہے اور اسی طرح اس کو پھیلاتے چلے جائیے تو بے شمار نفلی عبادات کی تکثیر مکروہ بن کر رہ جائے گی۔ جب تک خود امام مالک کی صراحت نہ مل جائے کہ انھوں نے ایک سے زیادہ عمرے کو کیوں مکروہ کہا تھا اس وقت تک ان کی طرف اس قول کے انتساب میں بھی تامل ہوتا ہے۔

اب تک جو کچھ لکھا گیا اس سے اصولی طور پر یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ بکثرت عمرے کرنا مکروہ نہیں بلکہ مستحب ہے لیکن بات صرف اصول پر ختم نہیں ہوتی۔

صحابۂ کرام کے عمل سے بھی تکثیر عمرہ کا ثبوت ملتا ہے اور اس خاص جزیے کی بھی دلیل موجود ہے جس پر گفتگو ہو رہی ہے۔ پہلے صحابہ کے عمل کو دیکھیے۔ امام ابن قیم متوفی ۷۵۱ھ نے زاد المعاد میں اور دوسرے محدثین نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہر مہینے ایک عمرہ ادا فرماتے تھے اور انھوں نے اس کا بھی اظہار فرمایا کہ اگر طاقت ہو تو اس سے بھی زیادہ عمرہ کرنا بہتر ہے ـــــ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ قیام مکہ کے ایام میں، جب ان کے سر کے بال بڑھ جاتے تو عمرہ کر لیتے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ یوں ہی سر کے بال کم کرانے یا منڈوانے کے بجائے عمرہ کا اجر حاصل کر کے، سر کے بال کم کراتے یا منڈواتے تھے۔ فتح القدیر جلد ۲ صفحہ ۳۰۳ میں سند کے ساتھ ترجمان القرآن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا وہ فتویٰ نقل کیا ہے جو انھوں نے اپنے شاگرد حضرت طاؤس کو دیا تھا انھوں نے فرمایا۔

"یوم عرفہ، یوم النحر اور ایام تشریق کو چھوڑ کر ان سے پہلے اور ان کے بعد تم جس قدر چاہو، عمرہ کرو۔"

اس کے بعد جس مسئلے پر گفتگو ہو رہی ہے اس کا ثبوت ملاحظہ کیجیے ـــــ یہ صحیح ہے کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ کرنے کے لیے حدود حرم سے باہر جاکر تنعیم یا کسی اور مقام سے احرام نہیں باندھا اور عمرہ نہیں کیا

لیکن آپ کے حکم سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایسا کیا ہے اور مقام تنعیم کی تعیین بھی خود حضورؐ نے فرمائی ہے اس کے بعد بھی کیا مقام تنعیم سے عمرہ کرنے کی مشروعیت و استحباب میں کوئی شبہہ باقی رہتا ہے۔ حجۃ الوداع میں صورت یہ ہوئی تھی کہ حضرت عائشہؓ نے عمرے کا احرام باندھا تھا لیکن مکے میں داخلے سے پہلے ان کو ماہواری کا عذر پیش آگیا وہ عمرے کے افعال انجام نہیں دے سکیں، پھر حضور کے ساتھ حج سے فارغ ہوئیں، دوسری ازواج مطہرات نے چونکہ مستقلاً ایک عمرہ، حج سے الگ کیا تھا اس لیے انہیں الگ عمرہ نہ کرنے کا رنج تھا جب مکہ سے روانگی کا وقت قریب آیا تو انھوں نے اپنے رنج کا اظہار حضورؐ سے کیا، تب انہیں حضور نے حکم دیا کہ اپنے بھائی عبدالرحمٰن بن ابی بکر کے ساتھ جاکر مقام تنعیم سے مستقل عمرہ کرلیں۔ یہ واقعہ تمام کتب احادیث میں مروی ہے اور امام بخاریؒ نے اس کو اپنی صحیح کے متعدد ابواب میں روایت کیا ہے۔ اگر طوالت کا خوف نہ ہوتا تو میں یہاں وہ تمام الفاظ نقل کرتا۔ پھر بھی ابوداؤد کی ایک حدیث نقل کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

عن حفصۃ بنت عبد الرحمٰن بن ابی بکر عن ابیہا ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لعبد الرحمٰن یا عبد الرحمٰن اردف اختک عائشۃ فاعمرھا من التنعیم فاذا ھبطت من الاکمۃ فلتحرم فانھا عمرۃ متقبلۃ (ابوداؤد کتاب المناسک)	عبدالرحمٰن بن ابی بکر کی صاحبزادی حفصہ اپنے والد سے روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبدالرحمٰن سے کہا۔ اے عبدالرحمٰن اپنی بہن عائشہ کو اپنی سواری کے پیچھے بٹھالو اور ان کا عمرہ مقام تنعیم سے کرالاؤ، جب ٹیلے سے نیچے اتریں تو وہاں عائشہ کو احرام باندھ لینا چاہیے اس لیے کہ وہ ایک مقبول عمرہ ہے۔

اس حدیث سے صراحۃً مقام تنعیم سے عمرہ کرنے کی فضیلت نکلتی ہے یہی وجہ ہے کہ حنفیہ کے نزدیک اہل مکہ کے لیے مقام تنعیم سے عمرہ کرنا دوسرے مقامات کے مقابلے میں افضل ہے اور یہی وجہ ہے کہ عرصہ دراز سے وہاں ایک مسجد، مسجدِ عائشہ کے نام سے بنی ہوئی ہے اور صدیوں سے اہل مکہ بالالتزام وہاں جاکر عمرے کا احرام باندھتے ہیں تنعیم کے علاوہ دوسرا مقام جہاں سے اہل مکہ عمرہ کرتے ہیں جعرانہ ہے اس لیے کہ یہاں سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود غزوۂ حنین سے واپسی میں عمرہ ادا کیا ہے اور اسی لیے امام شافعی کے نزدیک اہل مکہ کے لیے یہاں سے عمرہ کرنا افضل ہے۔

آخر میں ایک شبہے کا ازالہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ امام ابن قیم نے زاد المعاد میں اس مسئلے پر کئی فصلیں لکھی ہیں۔ میرا قیاس یہ ہے کہ اس مسئلے کی پہلی فصل سے ان صاحب نے دھوکا کھایا ہے جن کا خیال، سوال میں نقل کیا گیا ہے۔

انھوں نے عبارت پر بھی غور نہیں کیا اور شاید پوری بحث پڑھنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی۔ ابن قیم نے فصل اول میں جو کچھ لکھا ہے اس کا حاصل صرف یہ ہے کہ آج کل جس طرح بہت سے لوگ مکے سے باہر جا کر عمرہ کرتے ہیں اس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی نہیں کیا ہے آپ نے جس عمرے کو شرع و قانون کا درجہ دیا ہے وہ یہ ہے کہ آفاقی جب مکے میں داخل ہو تو احرام باندھے بغیر داخل نہ ہو اور ایام حج کے علاوہ دوسرے ایام میں داخل ہو رہا ہو تو عمرہ ادا کرے۔ چونکہ انھوں نے زاد المعاد حضور کی سیرت میں لکھی ہے اس لیے ان کو یہ بات واضح کرنی ہی چاہیے تھی۔ یہی وجہ ہے کہ چند سطروں میں اس کی وضاحت کر کے انھوں نے پہلی فصل ختم کر دی ہے۔ اس سے ان کا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ بہت سے جو لوگ مکے سے باہر جا کر عمرے کرتے ہیں انھیں ایسا نہ کرنا چاہیے کیونکہ یہ فعل "غیر مسنون" اور "غیر مشروع" ہے۔ اگر ان کی عبارت سے کسی نے ایسا سمجھ لیا ہے تو صحیح نہیں سمجھا۔ اس کی دلیل خود زاد المعاد کی وہ فصلیں ہیں جو انھوں نے متصلاً پہلی فصل کے بعد لکھی ہیں۔ ان فصلوں میں ائمہ کے مذاہب، صحابہ کے عمل اور حضرت عائشہ کے واقعہ پر مفصل بحث موجود ہے۔ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ امام ابن قیم حنبلی ہیں اس لیے ان کا اس مسئلے میں وہی مسلک ہوگا جو امام احمد ابن حنبل کا ہے کیونکہ انھوں نے اس میں اپنا اختلاف کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے۔ اور امام احمد ان ائمہ میں ہیں جو تکثیر عمرہ کو مستحب کہتے ہیں۔ مزید اطمینان کے لیے فقہ حنفی کی ایک تصریح یہاں نقل کی جاتی ہے۔ سوال یہ تھا کہ آفاقی کے لیے جب وہ مکہ میں مقیم ہو طواف افضل ہے یا نماز؟ اور اسی طرح ایک سوال یہ پیدا ہوا کہ اس کے لیے طواف افضل ہے یا عمرہ؟ اس آخری سوال کا جواب علامہ قاضی ابراہیم مکی نے یہ دیا ہے۔

"اگر کوئی شخص مسلسل اتنی دیر تک طواف کرتا رہے جتنی دیر میں وہ ایک عمرہ ادا کرتا رہے تو طواف افضل ہے ورنہ عمرہ افضل ہے۔"

قاضی ابراہیم کا یہ جواب علامہ ابن عابدین نے درمختار کی شرح میں نقل کیا ہے۔ اب فرض کیجیے کہ ایک عمرہ ادا کرنے میں چار گھنٹے وقت صرف ہوتا ہے تو جب تک کوئی شخص چار گھنٹے طواف نہ کرتا رہے ایک عمرے کے برابر اجر حاصل نہیں کر سکتا۔۔۔ راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ عمرے کی فضیلت کے کئی پہلو ہیں جن میں کا ایک یہ ہے کہ وہ بدنی اور مالی دونوں عبادتوں کو جمع کر لیتا ہے کیونکہ عام طور پر حجاج سواری پر تنعیم جاتے اور آتے ہیں، اس کے علاوہ حلاق (بال مونڈنے والا) کو بھی کچھ پیسے دیے جاتے ہیں۔　　(سید احمد قادری)

جمعیۃ علماء ہند کی صدارت

اس عنوان سے معاصر مدینہ بجنور نے ۲۸ مارچ اور یکم اپریل ۱۹۶۳ء کے شماروں میں دو اداریے لکھے ہیں۔ یہاں پہلا داریہ اور دوسرے اداریے کا اقتباس نقل کیا جا رہا ہے۔

(ادارۂ زندگی)

مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد اصل مسئلہ تو نظامت اعلیٰ کا تھا، اور وہ حسن و خوبی کے ساتھ طے ہو گیا تھا لیکن نہ معلوم کن وجوہ سے اس مرتبہ جمعیۃ علماء ہند کی صدارت کے مسئلے نے اچھی خاصی گرما گرمی اختیار کر لی جبکہ ماضی میں کبھی ایسا نہیں ہوا تھا، اور صدارت کا انتخاب ہمیشہ متفق علیہ اور خاموشی سے ہوتا رہا تھا۔

اس مرتبہ صدارت کے لیے دو نام خصوصیت سے زیر بحث رہے، ایک جمعیۃ علماء ہند کے موجودہ صدر مولانا فخر الدین صاحب کا اور دوسرا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی کا۔ کچھ اخبارات نے اس سلسلے میں طویل مقالے بھی سپرد قلم کیے اور رطب و یابس پروپیگنڈہ بھی خوب کیا گیا۔ حالانکہ ہماری رائے میں اس ہنگامہ آفرینی کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ ذہنوں کو اگر فیصلہ کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جاتا اور کنویسنگ نہ کی جاتی تو اچھا تھا، لیکن جو ہو چکا اب اس پر ماتم سرائی لاحاصل ہے۔

اب جمعیۃ علماء ہند کی ورکنگ کمیٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ

(۱) حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب جمعیۃ علماء ہند کہلائیں گے۔

(۲) حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی جمعیۃ علماء ہند کے ورکنگ صدر کہلائیں گے۔

(۳) مجلس عاملہ کی تشکیل جناب صدر و ورکنگ پریذیڈنٹ کے مشورے سے کریں گے۔

(۴) حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب جمعیۃ علماء ہند کے کھلے سالانہ اجلاس اور مجلس عاملہ کے اجلاس کی صدارت فرمائیں گے اور آپ کی غیر موجودگی میں ورکنگ صدر صدارت کریں گے۔

(۵) باقی عہدہ داروں کا جہاں تقرر (نامزدگی) کرنا ہے وہ حضرت مولانا مفتی صاحب موصوف کریں گے

اور جہاں الیکشن ہے وہ موجودہ قانون کے مطابق ہوگا۔

اس فیصلہ کا حاضر ارکان نے پورے جوش اور ولولے کے ساتھ استقبال کیا ہے اور دعا بھی کی ہے بلاشبہہ یہ فیصلہ ایک "مصالحتی فارمولے" کی حیثیت رکھتا ہے، اور سہولت کی خاطر اسے یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ ایک صاحب "نام" کے صدر رہیں گے اور ایک صاحب "کام" کے صدر رہیں گے اور اب آئندہ سے جمعیۃ علماء ہند کی گاڑی دو انجنوں والی گاڑی کہلائے گی اور ظاہر ہے کہ ایک انجن والی گاڑی کے مقابلے میں دو انجنوں والی گاڑی زیادہ طاقتور ہوتی ہے،

لیکن یہ فیصلہ کیا واقعی جماعتی طاقت کا مظہر ہے؟ ہمارے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ اس فیصلے نے یہ ظاہر کردیا ہے کہ جماعت کے اندر "دو گروہ" ہیں جو برابر کے طاقتور ہیں اور یہ گروہ ایک دوسرے کے جماعتی مفادات کی خاطر ضم نہیں ہوئے ہیں بلکہ دونوں گروہوں کے نشان" (صدارت کے امیدوار) ساتھ ساتھ موجود ہیں۔ ہر گروہ اپنے "نشان" کی طرف رجوع کرے گا۔ اور یہ گروہ بندی مٹنے کے بجائے مستقل صورت اختیار کرے گی، تاآنکہ ایک گروہ دوسرے گروہ کو کسی مناسب وقت ختم کردے۔

اگرچہ ورکنگ کمیٹی نے دونوں صدروں کے کاموں کے لیے دائرے کھینچ دیے ہیں اور ہر طرح کے ٹکراؤ کو بچانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن گروہ بندی کا جذبہ دائروں کا پابند نہیں ہوا کرتا۔

اس فیصلے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سب اس بات پر تو متفق ہیں کہ "کام" کے آدمی مفتی عتیق الرحمن صاحب ہیں پھر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ محض تبرک اور نام کے لیے مولانا فخر الدین صاحب کو بھی باقی رکھنا کیوں ضروری سمجھا گیا ہے اور واضح اور دو ٹوک فیصلہ کیوں نہیں کیا گیا۔

مولانا فخر الدین صاحب کی ذات بابرکت کا پورا پورا احترام ہمارے دل میں موجود ہے اور جن لوگوں نے مفتی صاحب کے حق میں رائے دی ہے وہ بھی اپنے دلوں میں مولانا فخر الدین صاحب کے لیے زبردست احترام رکھتے ہیں لیکن قومی اور جماعتی معاملات میں "کام" کو جو اہمیت حاصل ہے اس سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔ جماعتی دستور ول کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کرنے کی بجائے معاملہ یوں بھی حل کیا جاسکتا تھا کہ "سرپرست جماعت" یا روحانی پیشوا کا عہدہ تخلیق کیا جاتا اور ورکنگ صدر صاحب ہی کو صدر بنا دیا جاتا۔

باوجود اس حقیقت کے کہ ایک فیصلہ ہوچکا ہے۔ ہم دونوں بزرگان دین سے گزارش کریں گے کہ وہ اب ذاتی طور پر اس صورت حال کا پھر جائزہ لیں۔ اور ایک صاحب جمعیۃ علماء ہند کی دیرینہ روایات کو برقرار رکھنے کی خاطر اپنے منصب سے مستعفی ہوکر جماعت کی خدمت اس سے زیادہ کریں جتنا عہدہ پر رہ کر کریں گے۔

ہم اس فیصلے کا پرجوش خیر مقدم کرنے سے قاصر ہیں۔

یکم اپریل ۱۹۶۳ء کے اداریے میں لکھا گیا ہے:۔

اس فیصلے کی اشاعت کے بعد سے جو خطوط دفتر مدینہ میں آرہے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر اکابر جمعیۃ نے خود ہی از سر نو صورتِ حال کا جائزہ نہ لیا تو جمعیۃ علماء ہند کی رہی سہی ساکھ بھی جاتی رہے گی۔ اور یہ عظیم ادارہ جس کی تعمیر میں ہمارے عظیم الشان بزرگوں کی دعائیں اور محنتیں شامل ہیں، ختم ہو جائے گا۔

ہمارے ایک کرم فرمانے لکھا ہے کہ اگر یہی حل نکالنا تھا اور دونوں امیدواروں ہی کو صدارت پر برقرار رکھنا تھا تو پھر سارے ملک میں انتخابی مہم کا ڈھونگ کیوں رچایا گیا، کیوں باہمی رنجشوں کو منظر عام پر آنے کا موقع دیا گیا، لوگوں نے امیدواروں کے لیے کوشش کی، جوش و خروش دکھایا، اس کا حاصل کیا نکلا؟

اکثر اخبارات ابھی تک اس فیصلہ پر اظہار رائے کرنے سے گریزاں ہیں، جن اخبارات نے اظہار رائے کیا ہے، انھوں نے بھی اسے پسند نہیں کیا ہے۔ مثلاً معاصر آزاد ہند کلکتہ رقمطراز ہے۔

> "جمعیۃ علماء ہند کے صدر کا انتخاب جتنا پیچیدہ بن گیا تھا اب اس کا اتنا ہی دلچسپ فیصلہ ہو گیا ہے ...... مجلس عاملہ کے اعلان میں کہا گیا ہے کہ دونوں امیدواروں میں سے انتخاب کرنا بہت مشکل ہو گیا تھا اور اس مسئلہ پر غور کرنے میں مجلس کا بہت کافی وقت صرف ہوا، تب یہ حل دریافت کیا گیا کہ دونوں امیدواروں کو منتخب کر لیا جائے۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ مجلس عاملہ کا یہ حل عملاً کامیاب نہ ہو سکے گا۔ صدارتی انتخاب کی مہم کے دوران کافی کیچڑ اچھالی جا چکی ہے اور وہ سب ناشائستہ باتیں کی گئیں جن پر دوست اکابرین جمعیۃ بھی چیخ اٹھے۔ اس قدر کش مکش اور اختلاف کے بعد صدارت کے عہدے میں ساجھے داری قائم کر دینے سے چاہے مجلس عاملہ کی مشکل آسان ہو گئی ہو، لیکن دو صدروں کے لیے اپنے فرائض انجام دینا کافی دشوار ہو گا جبکہ دو دھڑے متضاد سمتوں میں کھینچنے کی کوشش کریں گے اور اگر کسی خاص دھاکے اثر سے صدارت کی یہ ساجھے داری کامیاب ہو گئی تو جمعیۃ علماء ہند کا یہ شاندار کارنامہ ہو گا۔ دوسری جماعتیں بھی ایسے مشکل حالات میں پھنس کر اس نسخے سے کامیابی حاصل کرنے کی کوشش کریں گی جس طرح صدارتی انتخاب کی ہنگامہ خیز مہم جمعیۃ علماء ہند کی روایات اور شان کے خلاف تھی۔ اسی طرح "ڈبل صدر" کا انتخاب بھی اس کے لیے مضحکہ خیز بن گیا ہے۔ خیر اب ایک فیصلہ ہو گیا ہے تو دیکھنا ہے کہ وہ عملاً کہاں تک کامیاب ہوتا ہے یا مزید

تحتا فضیحتی کے بعد کسی ایک صدر کو مستعفی ہونا پڑتا ہے۔"

معاصر بیباک سہارنپور نے لکھا ہے کہ :-

"پہلے تو راقم الحروف کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

ہائے یہ میخانہ، یہ ساقی، یہ ارباب خلوص — اب یہاں بھی اہتمام بیش و کم ہونے لگا۔

اور پھر اس فیصلہ پر توجہ کیجیے جو آل انڈیا جمعیۃ علمار کے صدر کے انتخاب کی شکل میں جمعیۃ علمار ہند کی مجلس عاملہ کی جانب سے صادر فرمایا گیا ہے اور جمعیۃ علمار ہند کی تاریخ میں اس سے اہم، اتنا تاریخی اور اس قدر جمہوری فیصلہ اور وہ بھی منصب صدارت کے لیے شاید اس سے پہلے کبھی وجود میں نہ آیا ہو۔

"صدارت کے امیدواروں میں دو بزرگوں کے نام آرہے تھے اور یہ دونوں بزرگ اپنی امیدواری پر ایسے ڈٹے کہ فیصلہ کے لیے مرکزی مجلس عاملہ کو اپنے فرائض انجام دینے پر مجبور ہونا پڑا، نہ جانے اندر کی کتنی بحث و تمحیص کے بعد حاضر ارکان نے پورے جوش اور ولولے کے ساتھ اس تجویز کو منظور کیا۔"

صورت حال کتنی نازک ہوگئی ہوگی جسے اس "خوش اسلوبی" سے سنبھالا گیا ہے۔ حضرت مولانا سید فخرالدین صدر المدرسین دار العلوم بھی ہیں اور اس عظیم اسلامی مرکز کے شیخ الحدیث بھی، لیکن اس مرتبہ و منصب کے بعد بھی یہ ضروری رہا کہ وہ صدر جمعیۃ علمار ہند بھی کہلائیں۔

جمعیۃ علمار ہند کی صدارت کے یہ ٹکڑے، یا یہ دو قسمیں، کاش شیخ الہند، مفتی اعظم اور شیخ الاسلام بھی دیکھتے، غالباً یہ بھی مسلمانان ہند کی شومی اعمال کی ایک شکل ہے —— بہرحال بے نفسی اور اخلاص للہیت کا یہ عجوبہ بھی برداشت کرنا چاہیے۔ یا مظہر العجائب، جمعیۃ علمار ہند کے دو صدر، ایک محض صدر اور دوسرے ورکنگ صدر، کتنی اہم رہنمائی فرمائی گئی ہے یہ جمعیۃ علمار ہند کے بلند مقام سے؟"

مندرجہ بالا دونوں اقتباسات ان اخبارات سے ہیں جنھیں جمعیۃ علمار ہند کا دشمن نہیں کہا جاسکتا۔ یہ فوری ردعمل ہے جو صدارت کے فیصلہ پر ہوا۔ مدینہ کا گزشتہ اشاعت کا اداریہ اور یہ دونوں اداریے کم و بیش ایک ساتھ لکھے گئے لیکن آپ دیکھیں گے کہ تینوں کا ردعمل تقریباً یکساں ہے۔

مدینہ بجنور کے ان دو اداریوں میں جو باتیں سامنے آئی ہیں انہیں نکات ذیل میں سمیٹا جاسکتا ہے۔

۱- انتخاب صدارت کے سلسلے میں باہمی رنجشیں سامنے آئیں، لوگوں نے امیدواروں کے لیے کوشش کی جوش و

[illegible]

۲۔ صدارتی انتخاب کے دوران کافی کیچڑ اچھالی گئی اور وہ سب ناشائستہ باتیں کی گئیں جن پر اکابر جمعیۃ بھی چیخ اٹھے

۳۔ جمعیۃ العلماء میں دو دھڑے بن چکے ہیں اور اندیشہ ہے کہ یہ دونوں دو متضاد سمتوں میں اسے کھینچنے کی کوشش کریں گے۔

۴۔ صدارتی انتخاب کی ہنگامہ خیز مہم جمعیۃ العلماء ہند کی روایات اور شان کے خلاف تھی۔

۵۔ مزید تھکا فضیحتی کا بھی اندیشہ ہے۔

۶۔ مجلس عاملہ کا فیصلہ مسلمانان ہند کی شومی اعمال کی ایک شکل ہے۔

جمعیۃ العلماء ہند کے صدارتی انتخاب میں یہ صورت حال کیوں پیدا ہوئی اور اس کے اسباب و عوامل کیا ہیں؟ اس پر جمعیۃ کے ممبروں کو غور کرنا چاہیے۔ ہم تو یہاں صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ روداد صرف جمعیۃ العلماء ہند کے لیے عبرت انگیز نہیں ہے بلکہ ہر اس مسلم جماعت کے لیے سبق آموز ہے جو ہندستان میں کام کر رہی ہے۔

تنقید و تبصرہ

قرآن پاک اور آسمانی پروازیں تالیف معین الدین رہبر فاروقی، صفحات ۲۱۶ کتابت طباعت اوسط، رنگین ڈسٹ کور قیمت تین روپیہ۔ ملنے کا پتہ: معین الدین رہبر فاروقی۔ بیرون یاقوت پورہ محلہ املی بن ۵۰۴-۳-۱۷ حیدرآباد دکن (آندھرا پردیش)

فاضل مؤلف نے یہ کتاب بڑی محنت سے ترتیب دی ہے اور ان کی اس محنت کے پیچھے نیک جذبہ کام کر رہا ہے۔ موجودہ سائنس کے نظریات کو سامنے رکھ کر انھوں نے قرآن کریم کی ان آیتوں کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے جن میں کائنات کے اندر رواں دواں عظیم الشان کروں کی طرف اشارات کیے گئے ہیں۔ کتاب کے ابتدائی ۸۴ صفحات میں قرآن کا تعارف ہے اور اس کے بعد پھر اصل موضوع سے متعلق مباحث ہیں۔ مصنف کو خود اس بات کا احساس ہے اور انھوں نے لکھا بھی ہے کہ قرآن کوئی سائنس کی کتاب نہیں ہے جس کا موضوع سائنسی علوم و نظریات ہوں بلکہ اس کتاب کا اصل موضوع یہ ہے کہ انسان کو وہ صحیح راستہ بتایا جائے جس پر چل کر وہ فلاحِ دارین حاصل کرے۔ اس علم کے باوجود انھوں نے اپنی کتاب کو جس زور کے ساتھ پیش کیا ہے اس سے کچھ ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ جیسے قرآن کے اصل حقائق یہی ہیں جنھیں دریافت کرنے میں اہل علم کو اپنی زندگیاں کھپا دینی چاہییں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر انھوں نے اپنے پیش کیے ہوئے نظریات کے بارے میں یہ بات بھی کہہ ڈالی ہے کہ "اگر قلب و نظر، علم و عقل، تعصب سے زنگ آلود نہیں" تو ان کی صداقت کا قائل ہونا ہی پڑے گا۔ یہ انداز تحریر مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ فاضل مؤلف کی اس تنبیہ کے باوجود کتاب کے بہت سے مقامات پر راقم الحروف ان سے اتفاق نہیں کر سکا۔ میں چند مقامات کی نشان دہی کرتا ہوں۔

اُمتِ مسلمہ کو امت وسط کہنے کی جو ایک جہت مؤلف نے بیان کی ہے وہ صحیح نہیں ہے ص ۱۱ اول تو جب تک آدم سے لیکر قیامت تک کی مدت نہ معلوم ہو امت مسلمہ کو عین وسط میں قرار دینا مجرد ایک دعویٰ بلا دلیل ہے ثانیاً یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امت کو دنیا کے دورِ آخر کی امت قرار دیا ہے۔ اس لیے بھی مصنف کی بات صحیح نہیں ہے ــــ سورۂ زمر کی آیت ۵ سے مصنف نے آسمان و زمین کی گردش پر جو استدلال کیا ہے وہ اس بات پر موقوف

ہے کہ لفظ کل اس سے پہلے بیان کی ہوئی تمام اشیار کے ساتھ متعلق مانا جائے حالانکہ مفسرین اس کو صرف شمس و قمر کے ساتھ متعلق مانتے ہیں یعنی کل منهما ای من الشمس والقمر ــــ سورہ ص کی آیت ۱۱ سے جو استدلال انھوں نے کیا ہے وہ بالکل غلط ہے اور اس آیت کے ترجمے میں توسین کے اندر انھوں نے "آسمانوں میں" کے الفاظ بالکل غلط بڑھائے ہیں تفصیل کا تو موقع نہیں لیکن اتنا اشارہ ضروری ہے کہ آیت ۱۱ میں جن احزاب کا ذکر ہے ان کی تشریح اس کے بعد کی آیت ۱۲ اور ۱۳ میں موجود ہے۔ ان سے مراد قوم نوح، عاد، قوم فرعون، قوم ثمود، قوم لوط اور اصحاب ایکہ ہیں اور قرآن نے تصریح کر دی ہے "اولٰئك الاحزاب" یہ سب کو معلوم ہے کہ یہ قومیں زمین ہی پر ہلاک کی گئی تھیں اور کفر و شرک کی پاداش میں ہلاک کی گئی تھیں۔ خلائی پرواز کی کوشش سے ان کی ہلاکت کا کوئی تعلق نہ تھا اس لیے مصنف نے آیت ۱۱ سے جو استدلال کیا ہے وہ بے اصل ہے ــــ سورہ حجر کی آیت ۱۴، ۱۵ کو بھی انھوں نے سیاق و سباق اور ان آیتوں کے مقصد نزول سے علیحدہ کر دیا ہے اور ان میں وہ ایما موجود نہیں ہے جس کا ذکر انھوں نے کیا ہے ــــ سورہ بقرہ کی آیت ۳۵ میں جس جنت کا ذکر ہے وہ جمہور علمار کے نزدیک بے شک آسمانی ہی جنت ہے اور راقم الحروف بھی یہی سمجھتا ہے لیکن اس میں اختلاف اس وقت سے چلا آ رہا ہے جب ڈارون کے باپ دادا بھی اس دنیا میں موجود نہ تھے۔ جو لوگ ڈارون کے نظریے پر یقین رکھتے ہیں وہ خود آدم کی تخلیق کو اس طرح کب مانتے ہیں جس طرح قرآن نے بتایا ہے اس لیے جنت ارضی کے خیال کو ڈارون کے نظریے سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے ــ

سورۂ مریم کی آیت ۵۷ میں اس کی صراحت موجود نہیں ہے کہ حضرت ادریس کو آسمان پر اٹھا لیا گیا ہے اور جمہور مفسرین و علمار یہ خیال رکھتے ہیں کہ حضرت ادریس بھی حضرت عیسیٰ کی طرح آسمان پر اٹھا لیے گئے۔ جس اسرائیلی روایت سے مصنف نے یہ بات لی ہے اس میں تو یہ بھی موجود ہے کہ آسمان پر پہنچنے کے بعد ان کی روح قبض کر لی گئی اور مصنف نے دوسری جگہ ثابت کیا ہے کہ ہر انسان کی موت زمین ہی پر واقع ہونا ضروری ہے تو کیا کہیں سے یہ بات ثابت ہے کہ حضرت ادریس بھی حضرت عیسیٰ کی طرح پھر زمین پر آئیں گے اور یہاں ان کی موت واقع ہوگی؟ شاید مصنف کا ذہن اس طرف نہیں گیا ہے ــــ مصنف نے اپنے نظریات کو ثابت کرنے کے لیے الفاظ کے ترجمے میں تصرف بھی کیا ہے، مثلاً وَاللَّيْلِ إِذَا عَسْعَسَ کا ترجمہ کیا ہے قسم ہے رات کی کہ اپنا اندھیرا لے کر سامنے آتی ہے۔ وَاللَّيْلِ إِذَا سَجَىٰ۔ رات کی قسم جب تاریکی لیے کر آئے۔ اس ترجمے سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ رات ایک الگ وجود ہے۔ أَغْطَشَ لَيْلَهَا اور آسمان سے پیدا ہونے والی رات کو تاریک بنایا۔ اس میں "آسمان سے پیدا ہونے والی" کا ٹکڑا

[illegible]

اپنی طرف سے بڑھایا گیا ہے۔ مصنف چونکہ اس بات کے قائل ہیں کہ رات اور دن دو مستقل مخلوق ہیں، سورج سے ان کا تعلق نہیں ہے اس لیے انھوں نے ترجمے میں اس طرح کا تصرف فرمایا ہے۔

مثلاً پر حدیث مرسل کی جو تعریف انھوں نے لکھی ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے —— بحیثیت مجموعی اس کتاب کے بارے میں دو باتیں کہی جا سکتی ہیں ایک یہ کہ محنت سے لکھی گئی ہے اور مطالعہ کے قابل ہے اور دوسری یہ کہ مصنف نے ناروا تجدد سے بچنے کی پوری کوشش کی ہے۔ (ع۔ق)

کیا ہم مسلمان ہیں؟

شمس نوید عثمانی، صفحات ۲۰۸ مع ایسین گرد پوش کے ساتھ، قیمت دو روپے ۵۰ نئے پیسے ملنے کا پتہ :۔ مکتبہ تجلی، دیوبند، یوپی

ہمارے دوست شمس نوید عثمانی ایک صالح جوان ہیں اور ان کے سینے میں ایک پرسوز اور دردمند دل دھڑکتا ہے۔ یہ کتاب ان کے متفرق مضامین کا مجموعہ ہے اور ان مضامین میں ان کے دل کا سوز و گداز حرف و صوت کے سانچے میں ڈھل گیا ہے۔ ایک ایسا مجموعۂ مضامین جو ایمان و یقین کی دھمک تیز کرے۔ پڑھنے والے کے دل میں محبت رسول کا چراغ جلائے اور ذہن کا رخ آخرت کی طرف پھیرے، ہر طرح قابل قدر ہے۔ ان مضامین میں زیادہ تر ان واقعات کی مؤثر تصویر کشی کی گئی ہے جن کا تعلق مقدس رسول اور ان کے محترم ساتھیوں سے ہے۔ اسوۂ رسول اور سیرت صحابہ امت مسلمہ کی انمول متاع ہے جسے اس نے گم کر دیا ہے اور جب تک یہ متاع گم شدہ پھر ہاتھ نہ آجائے یہ امت نہ دنیا میں مقام عزت حاصل کر سکتی ہے اور نہ آخرت میں رضائے الٰہی کی جنت۔ کیا ہم مسلمان ہیں کے عنوان سے جو مضامین لکھے گئے ہیں ان کی غرض اسی حقیقت کو اجاگر کرنا ہے۔ اور یہ حقیقت خشک انداز بیان میں نہیں بلکہ دل کش اور اثرانگیز اسلوب میں اجاگر کی گئی ہے اور یہ بات اطمینان کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ یہ کتاب ہر ادب آشنا قاری کے لیے مفید ہوگی۔ اس عمومی تبصرے کے بعد چند باتیں ایسی بھی ہیں جنھیں شمس صاحب کے سامنے پیش کرنا تبصرہ نگار اپنا فریضہ سمجھتا ہے، توقع ہے کہ وہ اس پر غور کریں گے۔

اس کتاب کا ایک پہلو ہے، تاثیر و تاثر اور اس کا دوسرا پہلو ہے افسانوی آب و رنگ۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ عہد رسالت و عہد صحابہ کے واقعات کو افسانوی آب و رنگ دینا نامناسب ہے۔ اس عہد کے واقعات و حالات ہمارے لیے دلیل و سند کا درجہ رکھتے ہیں اس لیے انہیں بلا کم و کاست بیان کرنا ضروری ہے اور افسانوی رنگ کمی بیشی کے بغیر پیدا نہیں ہوتا۔ اہل علم جو ان واقعات سے براہ راست واقفیت رکھتے ہیں ان کے بارے میں

تو زیادہ خطرہ نہیں ہے لیکن ناواقف لوگوں کے بارے میں اس کا بڑا خطرہ ہے کہ وہ کسی واقعہ کے قیاسی اِن لارج منٹ
کو بھی واقعہ ہی سمجھ لیں۔ اس کی ایک بڑی عبرت ناک مثال واقعہ کربلا ہے۔ شیعوں نے اس کے بارے میں جو افسانے
گھڑے ہیں وہ تاثیر میں کم نہیں ہیں۔ خود راقم الحروف پر ایسی کتابیں پڑھ کر اتنا اثر پڑا ہے کہ آنسو ضبط کرنا مشکل ہو گیا
ہے۔ صحیح تاثیر وہی ہے جو صحیح چیز سے پیدا ہو ورنہ غلط چیز سے جو تاثر پیدا ہو گا وہ خود غلط ہو گا۔ حاشا کہ اس تمثیل
سے غرض یہ نہیں ہے کہ اس کتاب میں افسانے گھڑے گئے ہیں بلکہ غرض صرف اس بات کی طرف متوجہ کرنا ہے کہ واقعات
کے خلا کو اپنے قیاسات سے پُر کرنے میں بڑی احتیاط کرنے کی ضرورت ہے۔ راقم کو اس کتاب میں متعدد مقامات
پر ایسا محسوس ہوا ہے کہ واقعے کی تصویرکشی میں احتیاط کا سررشتہ ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے۔

ہمارے لیے لائق اختیار اسوۂ اسوۂ محمدی ہے نہ کہ بعد کے لوگوں کی زندگیاں۔ اعتدال و توازن کا معیاری نمونہ صرف
حضورؐ کی زندگی ہے۔ بعد کے بہت سے صالحین کی زندگیاں بعض اوقات غلبۂ حال کی وجہ سے غیر متوازن ہو گئی ہیں۔ اب
کسی ایسی غیر متوازن زندگی کا نقشہ پیش کر کے یہ سوال کرنا کہ کیا ہم مسلمان ہیں؟ میرے نزدیک خود ایک غیر متوازن سوال
ہے۔ اس کتاب کی ایک بڑی کمی یہ ہے کہ یہ حوالوں سے بالکل خالی ہے۔ کم سے کم آخر میں ان کتابوں کے نام ضرور
لکھنے تھے جن سے واقعات لیے گئے ہیں۔ مطبعی غلطیاں بھی ہیں اور ایک جگہ تو کاتب صاحب نے نام تک بدل ڈالا
ہے۔ صفحہ ۱۲ پر معوذ اور معاذ کے بجائے مسعود اور معاذ لکھ دیا ہے۔ ایک جگہ خدا کاری کو خدا کاری بنا دیا ہے اور اس
کے علاوہ اور بھی غلطیاں ہیں۔ ایک جگہ غالباً مولف سے بھی نام درج کرنے میں غلطی ہوئی ہے۔ حضورؐ کی دعوت کے جواب
میں "کیا تو نے اسی لیے ہمیں بلایا تھا" ابولہب نے کہا تھا، ابوجہل نے نہیں۔

پوری توقع ہے کہ اس کتاب کا دوسرا اڈیشن پہلے سے زیادہ مکمل اور بہتر ہو گا۔ (ع۔ ق)

مسئلہ اجتہاد پر تحقیقی نظر

تالیف جناب مولانا محمد تقی امینی۔ صفحات ۱۶۰ مجلد مع گرد پوش قیمت تین روپے
ملنے کا پتہ:- ادارۂ علم و عرفان۔ اللہ رکھا بلڈنگ۔ اسٹیشن روڈ، اجمیر۔
پاکستان میں محمد محی الدین ۴۹۴ اے سٹلائٹ ٹاؤن۔ سرگودھا۔ مغربی پاکستان۔

اس کتاب کے مولف مولانا محمد تقی امینی پرنسپل مدرسہ معینیہ اجمیر اہل علم کے درمیان معروف ہیں، اور ان علماء
میں شمار کیے جاتے ہیں جنھوں نے اپنے ذہن کو تقلید جامد کا قفل ڈال کر بند نہیں کیا ہے۔

راقم کا مجموعی تاثر یہ ہے کہ یہ کتاب مدارس عربیہ کے ان طلبہ کے لیے تو مفید ہے ہی جو اصول فقہ پڑھ رہے ہیں

یا پڑھ چکے ہیں۔ یہ ان علماء کے لیے بھی مفید ہوگی جنھوں نے اصولِ فقہ کا کھلے ذہن سے مطالعہ نہیں کیا ہے — اس کتاب کا بڑا حصہ علامہ شاطبی کی "الموافقات" کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے۔ اصولِ شرع میں یہ کتاب تو اس لائق ہے کہ اس کا مکمل ترجمہ اردو میں شائع کیا جائے۔ اس کا جس قدر حصہ بھی زیرِ تبصرہ کتاب میں آگیا ہے مفید ہے — مسائل کے ضمن میں فاضل مؤلف نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ہمارے لیے نئے نہیں ہیں لیکن اس لحاظ سے خوش آیند ہیں کہ اب مدرسہ معینیہ اجمیر کے صدر مدرس کی طرف سے شائع ہوئے ہیں۔ اس عمومی تبصرے کے بعد مولانا کی خدمت میں چند باتیں غور کے لیے پیش کی جارہی ہیں۔

اجتہاد کا دروازہ بند ہوچکا یا کھلا ہوا ہے؟ اس سوال پر مصنف نے کئی صفحے لکھے ہیں اور ثابت کیا ہے کہ اس کو کسی دور کے ساتھ خاص کر دینا صحیح نہیں ہے۔ راقم کو اس بحث میں خضری کا محاکمہ پسند ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ کسی محقق اور صاحبِ بصیرت عالم نے یہ بات نہیں کہی ہے کہ اجتہاد کسی دور کے ساتھ خاص ہے اور اگر ان میں سے کسی نے کہی ہے تو اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس نے نااہلوں پر اس کا دروازہ بند کیا ہے باقی رہے وہ لوگ جنھوں نے اپنی بے تحقیقی اور جمودِ علم کی پردہ پوشی کے لیے ایسی بات کہی ہے تو ان کے قول کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ تبصرہ نگار کے نزدیک مناسب یہ تھا کہ اس سوال پر علمی و نظری بحث کے بجائے قریب کی دو ایک صدیوں کے علماء کے اجتہاد کی دو چار مثالیں پیش کر دی جاتیں۔ ایسی مثالیں جنھیں عام طور پر علماء نے قبول کر لیا ہے اور لوگ ان مسائل پر عمل کر رہے ہیں۔ یہ عملی دلیل نظری دلیل سے زیادہ مفید ثابت ہوتی۔

موجودہ دور میں جن مسائل میں اجتہاد کی ضرورت ہے ان کی نشان دہی سے زیادہ ضروری یہ بات تھی کہ نمونے کے طور پر دو چار مسئلوں پر تحقیقی نظر ڈال کر قابلِ غور پہلو اجاگر کیے جاتے اور اپنی کوئی رائے دی جاتی۔ مؤلف نے جو طریقہ اختیار کیا ہے اس کی وجہ سے بہت سی مبہم اور لاحاصل عبارتیں کتاب میں جمع ہوگئی ہیں۔ مثال کے طور پر صفحہ ۶۲ کے آخر میں جو عبارت مؤلف نے لکھی ہے اس کا حاصل ابہام کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کوئی ایک ہی مثال دے کر بتانا چاہیے تھا کہ عورتوں کے متعلق فقہاء کا فلاں حکم موجودہ حالات کے پیشِ نظر دشوار گزار ہے یا اس کی ضرورت باقی نہیں ہے۔

صفحہ ۷۲ سود کے موجودہ نظام کے بارے میں یہ لکھنا کہ اگر کوئی پہلو ایسا بھی ہے جس پر سود کا اطلاق نہیں ہوتا تو اسے سود سے خارج کرنے میں تامل نہ ہونا چاہیے۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر اس مشورے کا کیا مطلب ہوا۔ آخر وہ کون عالم دین ہے جو شرعاً غیر سود کو سود بنانے پر مُصر ہو۔ یا تو یہ عبارت نہ لکھنی تھی یا بتانا چاہیے تھا کہ فلاں چیز پر شبہ

سود کا اطلاق نہیں ہوتا۔ صلا پر نصاب کی ایک فکر انگیز بحث مصنف نے چھیڑی ہے لیکن یہاں بھی وہ گول مول بات کہہ کر آگے بڑھ گئے ہیں۔ نصاب کے مسئلے میں جس نکتے کو اٹھایا گیا ہے وہ اہل علم کی نظر میں ہے لیکن کوئی جرأت نہیں کر رہا ہے کہ اس پر کھل کر لکھے۔ مؤلف کی عبارت سے بس اتنا اندازہ ہوا کہ وہ بھی اس پر غور و فکر کے حق میں ہیں ـــ صفحہ ۸۷ پر مزدوروں کے بارے میں نکتہ ۵ اور ۶ محل نظر ہے۔ اس کے لیے کوئی تصریح پیش کرنی تھی تھی۔ مزدور کو طعام و لباس کے مسئلے میں عبد پر قیاس کرنا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

فاضل مؤلف نے اجماع، قیاس، استحسان اور مصالح مرسلہ وغیرہ پر جو کچھ لکھا ہے اس کی متعدد باتیں راقم کی نظر میں محل نظر ہیں لیکن مختصر تبصرے میں نشان دہی بھی دشوار ہے۔ مثلاً ان کا یہ لکھنا کہ اجماع میں تمام اہل اجماع کا متفق ہونا لازمی نہیں ہے بلکہ اکثریت کا اتفاق کافی ہے۔ فقہا کی تصریحات کے خلاف ہے۔ اگر صحابہ کی زندگی اور ان کے طرز عمل میں اس کا ثبوت موجود ہے تو کوئی ایک ہی مثال پیش کرنی چاہیے تھی۔

کتاب میں کتابت و طباعت کی غلطیاں بھی ہیں اور بعض جگہ بہت ناگوار مثلاً صلاا میں وحرّم الربوٰ کو وَصوم الربوٰ لکھا گیا ہے۔

آخر میں اتنا اور عرض ہے کہ اس کتاب کا نام "مسئلۂ اجتہاد پر اجمالی نظر" ہونا چاہیے تھا۔ (ع ق)

پاک بیبیاں

مولانا اعجاز الحق قدوسی صفحات ۶۰ مجلد قیمت ایک روپیہ پچھتر پیسے۔ ناشر:۔ ہلال بک سیلرز چنچل گوڑہ۔ حیدرآباد دکن۔

یہ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کی سیرت ہے۔ مولانا قدوسی نے مستند ماخذ سے سادہ اور عام فہم زبان میں مرتب کیا ہے اور بلا شبہ عورتوں کے لیے ایک تحفہ ہے۔ شروع میں حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ کا پیش لفظ ہے اور اس کے بعد قائد ملت نواب بہادر یار جنگ مرحوم کی اہلیہ کی رائے ہے۔ کتاب بہت دنوں سے تبصرے کے لیے رکھی ہوئی تھی، تاخیر کے باوجود یہ بات مناسب نہ معلوم ہوئی کہ اس پر تبصرہ نہ کیا جائے۔ ازواج مطہرات کی سیرت ہمیشہ مسلمان عورتوں کے لیے نمونے کی حیثیت رکھتی ہے اس سے انہیں فائدہ اٹھانا چاہیے۔

ماہنامہ

زندگی رامپور

جلد ۳۰
شمارہ ۶

محرم الحرام ۱۳۸۳ھ
جون ۱۹۶۳ء

مدیر:- سید احمد قادری

- خط و کتابت و ارسال زر کا پتہ: منیجر زندگی رام پور - یوپی
- زر سالانہ:- صہ - ششماہی:- تین روپیہ - فی پرچہ:- پچاس نئے پیسے
- ممالک غیر سے:- دس شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر

پاکستانی اصحاب مندرجہ ذیل پتہ پر رقوم بھیجیں اور رسید ہمیں ارسال فرمائیں
منیجر ہفت روزہ "شہاب" C/۱۱ شاہ عالم مارکیٹ لاہور

مالک:- جماعت اسلامی ہند۔ اڈیٹر:- سید احمد عروج قادری۔ پرنٹر پبلشر:- احمد حسن۔ مطبع:- دہلی پرنٹنگ پریس۔ محلہ بنگلہ آزاد خاں، رامپور
مقام اشاعت:- دفتر زندگی وکانتی، رامپور- یوپی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

(سید احمد قادری)

دینِ اسلام کو دوسرے ادیان کے مقابلے میں جو ایک بہت بڑا امتیاز حاصل ہے وہ اس کا توازن واعتدال ہے۔ اس کی تمام تعلیمات افراط و تفریط سے دور اور انتہائی متوازن و معتدل ہیں اور توازن واعتدال کا یہ درجۂ کمال اس بات کی بھی ایک بڑی دلیل ہے کہ یہ انسان کا گھڑا ہوا دین نہیں بلکہ خدا کا بھیجا ہوا دین ہے۔ کیونکہ انسان اس طرح کا متوازن نظامِ زندگی وضع کرنے پر قادر ہی نہیں ہے۔ اسی لیے قرآن میں متعدد مقامات پر اسلام کو الدین القیم بھی کہا گیا ہے۔ یعنی سیدھا، درست اور راست دین جس کی تعلیمات میں کوئی کجی نہیں، کوئی افراط نہیں، کوئی تفریط نہیں۔ جس طرح اس پوری کائنات کے نظم کو درست رکھنے کے لیے اللہ نے اس کو ایک قانونِ عدل میں جکڑ رکھا ہے اسی طرح انسانی زندگی کو بگاڑ سے بچانے کے لیے اس نے ایک قانونِ عدل نازل فرمایا ہے۔ اسلام اسی قانونِ عدل کا نام ہے۔ عقائد ہوں یا اعمال ٹھیک، سیدھے اور درست اسی وقت تک رہتے ہیں جب تک وہ اس قانونِ عدل کے مطابق رہیں اور وہ جہاں اس سے ادھر یا ادھر ہوئے۔ ان میں بگاڑ آیا۔ آج دنیا میں باطل اور غلط عقائد و اعمال کا جو تاریک اور گھنا جنگل پھیلا ہوا ہے، ان میں سے ایک ایک عقیدے اور عمل کو الگ الگ چھانٹ کر تجزیہ کیجیے تو پتہ چلے گا کہ وہ باطل اور غلط اس لیے ہے کہ اسلامی عقائد و اعمال میں سے کسی ایک یا چند سے ٹکرا رہا ہے۔ وہ اسلام کی سیدھی راہ سے ہٹ گیا اس لیے غیر متوازن اور غلط ہو کر رہ گیا ہے۔

دینِ اسلام کو ایک معتدل اور دائمی شریعت کے ساتھ آج سے پونے چودہ سو سال پہلے مکمل کر دیا گیا۔ خدا نے اپنی آخری کتابِ ہدایت اپنے آخری رسول سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی اور اس پر ایمان لانے والی ایک امت مبعوث کی اور اس امت کو امتِ وسط کے جاں نواز لقب سے ملقب فرمایا:۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۔ "اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک امت معتدل بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو"

معلوم ہوا کہ جس طرح اسلام دوسرے تمام ادیان کے مقابلے میں ایک معتدل و متوازن دین ہے اسی طرح اس دین پر چلنے والی امت، دوسری تمام امتوں کے درمیان ایک امت معتدل ہے۔ کیونکہ وہ ایک ایسے سیدھے، راست اور درست نظام حیات پر چلنے والی ہے جو افراط و تفریط سے بری ہے۔ وسط کا لفظ اصلاً معتدل کے معنی میں استعمال ہوا ہے لیکن یہ اپنے اندر ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ ایک دیدہ ور مفسر قرآن لکھتے ہیں:۔

"امت وسط" کا لفظ اس قدر وسیع معنویت اپنے اندر رکھتا ہے کہ کسی دوسرے لفظ سے اس کے ترجمے کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے مراد ایک ایسا اعلیٰ اور اشرف گروہ ہے جو عدل و انصاف اور توسط کی روش پر قائم ہو، جو دنیا کی قوموں کے درمیان صدر کی حیثیت رکھتا ہو، جس کا تعلق سب کے ساتھ یکساں حق اور راستی کا تعلق ہو اور ناحق، ناروا تعلق کسی سے نہ ہو۔

پھر یہ جو فرمایا کہ تمہیں "امت وسط" اس لیے بنایا گیا ہے کہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو، تو اس سے مراد یہ ہے کہ آخرت میں جب پوری نوعِ انسانی کا اکٹھا حساب لیا جائے گا اس وقت رسول ہمارے ذمہ دار نمائندے کی حیثیت سے تم پر گواہی دے گا کہ فکر صحیح اور عمل صالح اور نظام عدل کی جو تعلیم ہم نے اسے دی تھی، وہ اس نے تم کو بے کم و کاست پوری کی پوری پہنچا دی اور عملاً اس کے مطابق کام کر کے دکھا دیا۔ اس کے بعد رسول کے قائم مقام ہونے کی حیثیت سے تم کو عام انسانوں پر گواہ کی حیثیت سے اٹھنا ہو گا اور یہ شہادت دینی ہو گی کہ رسول نے جو کچھ تمہیں پہنچایا تھا وہ تم نے انہیں پہنچانے میں اور جو کچھ رسول نے تمہیں دکھایا تھا وہ تم نے انہیں دکھانے میں اپنی حد تک کوتاہی نہیں کی ـــــ اس طرح کسی شخص یا گروہ کا اس دنیا میں خدا کی طرف سے گواہی کے منصب پر مامور ہونا ہی درحقیقت اس کا امامت اور پیشوائی کے مقام پر سرفراز کیا جانا ہے۔ اس میں جہاں فضیلت اور سرفرازی ہے وہیں ذمہ داری کا بہت بڑا بار بھی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس امت کے لیے خدا ترسی، راست روی، عدالت اور حق پرستی کی زندہ شہادت بنے، اسی طرح اس امت کو بھی، تمام دنیا کے لیے زندہ شہادت بننا چاہیے حتیٰ کہ اس کے قول اور عمل اور برتاؤ، ہر چیز کو دیکھ کر دنیا کو معلوم ہو کہ خدا ترسی اس کا نام ہے۔ راست روی یہ ہے، عدالت اس کو کہتے ہیں اور حق پرستی ایسی ہوتی ہے۔ پھر اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ جس طرح خدا کی ہدایت ہم تک پہنچانے کے لیے رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری بڑی سخت تھی حتیٰ کہ اگر وہ اس میں ذرا سی کوتاہی بھی کرتے تو خدا کے یہاں ماخوذ ہوتے اسی طرح دنیا کے عام انسانوں تک اس ہدایت کو پہنچانے کی نہایت سخت ذمہ داری ہم پر عائد ہوئی ہے۔ اگر ہم خدا کی عدالت میں واقعی اس بات کی شہادت نہ دے سکے کہ ہم نے تیری ہدایت، جو تیرے رسول کے ذریعے سے ہم تک پہنچی تھی تیرے بندوں تک پہنچا دینے میں کوتاہی نہیں کی ہے۔ تو ہم بہت بری طرح پکڑے جائیں گے اور یہی امامت کا فخر ہمیں وہاں لے ڈوبے گا۔ ہماری امامت کے دور میں ہماری واقعی کوتاہیوں کے سبب سے خیال اور عمل کی جتنی گمراہیاں دنیا میں پھیلی ہیں اور جتنے فساد اور فتنے خدا کی زمین میں برپا ہوئے ہیں ان سب کے لیے ائمہ شر اور شیاطین انس و جن کے ساتھ ساتھ ہم بھی ماخوذ ہوں گے۔ ہم سے پوچھا جائے گا کہ جب دنیا میں معصیت، ظلم اور گمراہی کا یہ طوفان برپا تھا تو تم کہاں مر گئے تھے؟"

(تفہیم القرآن جلد ۱)

اپنی زندگیوں میں اعتدال و توازن پیدا کرنے کے لیے ہم انسانوں کو ایک انسانی اسوے و نمونے کی ضرورت ہے تاکہ اسے دیکھ کر اور اس کے حالات جان کر ہم اپنی زندگیوں کو معتدل و متوازن بنا سکیں، وہ ایک زندگی، لاکھوں اور کروڑوں زندگیوں کے لیے معیار اور کسوٹی بن سکے۔ اللہ تعالیٰ نے ہماری یہ ضرورت، سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی صفات سے پوری فرمائی۔ اس نے آپ کی زندگی کو اعتدال و توازن کا چلتا پھرتا نمونہ بنایا اور ہمیں بتایا کہ یہ ہے وہ نمونہ جس کے مطابق تمہیں اپنی زندگیاں سنوارنی چاہئیں۔ سورۂ بقرہ کی جو آیت ابھی اوپر نقل کی گئی ہے اس میں بھی یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ رسول تمہارے لیے "شاہد" کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن چونکہ یہ معاملہ بہت اہم تھا اس لیے قرآن کی بہت سی آیتوں میں ہمیں اطاعت و اتباع رسول کا حکم دیا گیا ہے اور ایک جگہ تو صاف لفظوں میں آپ کی زندگی کو ہمارے لیے "اسوہ" قرار دیا گیا ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (احزاب ۳)　　بے شک تمہارے لیے رسول اللہ کی زندگی میں اچھا نمونہ ہے۔

رسول خدا کی بے چون و چرا اطاعت و اتباع کے حکم کے ساتھ اس حکم کو ملا کر دیکھیے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اس آیت میں مخصوص و محدود طور پر حضور کے کسی خاص عمل کو "اسوہ" نہیں قرار دیا گیا ہے بلکہ آپ کی پوری زندگی کو بطور اسوہ پیش کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی اپنی زندگی کو اپنی امت کے لیے

بہترین زندگی قرار دیا ہے۔ حضور نے فرمایا ہے:۔ اِنَّ خَیْرَ الْھَدْیِ ھَدْیُ مُحَمَّدٍ۔ بلاشبہ بہترین سیرت محمدؐ کی سیرت ہے۔ (صلی اللہ علیہ وسلم) بہترین کیوں ہے؟ اس لیے کہ وہ اعتدال و توازن کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔

اب تک جو کچھ لکھا گیا اس کا حاصل یہ ہے:۔ اسلام معتدل و متوازن قوانین و ہدایات کا مجموعہ ہے۔ اس پر چلنے والی امت "امتِ وسط" ہے۔ اس کے رسول کی زندگی و سیرت اعتدال و توازن کا بہترین و اعلیٰ ترین نمونہ ہے —— ان تین نکات میں کسی ایک نکتے سے بھی کسی مومن مخلص کو اختلاف نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے اسی لیے ان کو تفصیل کے ساتھ نہیں لکھا گیا ہے بطور تمہید صرف اجمالی اشارے کیے گئے ہیں۔

آج کی صحبت میں تھوڑی وضاحت کے ساتھ جس سوال پر غور کرنا ہے وہ یہ ہے کہ نکات ثلٰثہ پر اتفاق کے باوجود عام طور سے دین دار اور ذی علم مسلمانوں کی زندگیاں اعتدال سے کیوں ہٹ گئیں اور کیوں ہٹ جاتی ہیں؟ اس سوال کا مختصر اور اجمالی جواب یہ ہے کہ اپنی زندگی کا رویہ متعین کرتے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا "اسوۂ حسنہ" نگاہوں سے اوجھل ہو گیا یا ہو جاتا ہے اور جب کوئی مسلمان اس مرکز اعتدال سے اپنی نگاہیں ہٹائے گا تو لازماً اس کی زندگی سے اعتدال و توازن رخصت ہو جائے گا۔

اعتدال سے انحراف کی بہت سی صورتیں ہیں اور اس کے متعدد اسباب و عوامل ہیں لیکن ان سب کی تفصیل اس وقت مقصود نہیں، اپنی تربیت و اصلاح کے نقطۂ نظر سے صرف چند صورتوں کی طرف اشارے کیے جائیں گے —— اعتدال سے انحراف کی ایک صورت تو یہ ہے کہ دین کی کلی تعلیمات اور اس کے مجموعۂ قوانین و ہدایات میں سے ایک یا چند اجزاء کو عملاً اختیار کر لیا جائے اور باقی سے بالکل صرفِ نظر کیا جائے۔ یہ صورت وہ ہے جس میں دین دار مسلمانوں کی اکثریت مبتلا ہے۔ مجھے اس وقت اس صورت پر گفتگو نہیں کرنی ہے۔ انحراف کی دوسری صورت یہ ہے کہ عملاً پورے دین کی اقامت کو بطور نصب العین اختیار کر کے اس کے لیے جد وجہد کی جائے لیکن اس کے کسی ایک جزو میں اپنی تمام دلچسپیاں اور سرگرمیاں (اگر واقعی کوئی سرگرمی موجود بھی ہو) اس طرح مرتکز کر دی جائیں کہ دین کے دوسرے اجزاء پر عمل کمزور اور بے روح ہو جائے۔ میں اعتدال سے انحراف کی اسی صورت پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔

ہم سب جانتے ہیں کہ اعتدال سے جب بھی انحراف کیا جائے گا تو وہاں افراط اور تفریط دونوں چیزیں پائی جائیں گی۔ افراط کسی ایک یا چند اجزاء میں اور تفریط باقی اجزاء میں۔ سہولتِ فہم کے لیے ہم دین کے دو بڑے جزو سامنے رکھتے ہیں۔ عبادت (فقہاء کی اصطلاح میں) اور اسلامی سیاست۔

اگر کوئی شخص دین کے سیاسی جزو میں منہمک ہو جائے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ عبادت کا جزو کمزور پڑ جائے گا سیاسی جزو میں انہماک کا مطلب یہ ہے کہ اس کی تمام دلچسپیاں اصلاً سیاسی مسائل میں مرتکز ہو جائیں۔ وہ ایسے ہی کاموں میں سرگرمی دکھائے جن میں سیاست کی چاشنی موجود ہو اور جن کاموں سے کوئی وقتی اور فوری فائدہ حاصل ہونے کی توقع ہو۔ اسے ایسے ہی مقالات، کتابیں، تقریریں اور خطبے پسند ہوں جن میں دنیا بھر کی سیاست پر تبصرے، تجزیے اور تنقیدیں موجود ہوں، جن میں وقت کی حکومت اور اپنے مخالف گروہوں اور جماعتوں کو کھری کھری باتیں سنائی گئی ہوں، حصولِ معاش سے جو وقت بچ جائے اس کا بڑا حصہ وہ انہیں باتوں میں صرف کر ڈالے اور یہی اس کی زندگی کا معمول بن جائے۔ اس کو اپنے اخلاق و کردار اور اپنے معاملات کو درست سے درست تر کرنے کی فکر نہ ہو، نمازوں کا اہتمام رخصت ہو جائے۔ جماعت اگر چھوٹ جائے تو غم نہ ہو۔ تکبیرِ اولیٰ اگر فوت ہو جائے تو رنج نہ ہو صبح کو اگر دیر سے جاگنے کی عادت پڑ جائے تو اسے بدلنے کا احساس و اہتمام نہ ہو، اس کے شب و روز میں کوئی ایسی ساعت موجود نہ ہو جس میں قبر کے گڑھے کا خیال اور قیامت کے ہولناک واقعات کا تصور اسے لرزا دے۔ اس کے اوقات میں کوئی وقت ایسا نہ ہو کہ اپنے گناہوں اور کوتاہیوں کی یاد اس کے جسم میں کپکپی پیدا کرے۔ اس کا دل اتنا سخت ہو گیا ہو کہ تنہائیوں میں بھی خدا کے جلال و عظمت اور اپنے تصوروں کا دھیان اس کی آنکھوں کو نمناک بھی نہ کر سکے۔

ایسا شخص نہ صرف یہ کہ اعتدال و توازن سے منحرف ہو گیا ہے بلکہ اس نے اپنے آپ کو سخت خطرے میں ڈال دیا ہے اور اس سے آگے کی بات یہ ہے کہ وہ اس اسلامی سیاست کی بھی مٹی پلید کر رہا ہے جسے اس نے اپنی دلچسپیوں کا مرکز بنایا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور ایسے شخص کی زندگی میں مشرق و مغرب کی دوری ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم میں سے ہر شخص کو ایسی زندگی گزارنے سے محفوظ رکھے۔

عبادت میں انہماک کی دو صورتیں ہیں۔ ایک اس صورت کی برعکس صورت ہے جس کی توضیح "سیاسی انہماک" میں کی گئی یعنی کسی شخص کو اس بات سے کوئی حقیقی دلچسپی باقی نہ رہ گئی ہو کہ اس ملک میں اللہ کا قانون نافذ ہو۔ وہ ان تدابیر پر غور و فکر کرنا ترک کر دے جن سے اسلامی حکومت کے قیام کی راہ ہموار ہوتی ہو۔ وہ ان کاموں میں بے دلی سے شرکت کرے جن میں سیاسی رنگ کی آمیزش ہو گئی ہو۔ وہ احیائے دین کی ضروری دنیوی تدابیر سے بھی صرفِ نظر کرنے لگے۔ اس کی تمام توجہات خدا کی صرف پرستش میں مرتکز ہو گئی ہوں، تنہائیوں میں گریہ و زاری اور آہ و فغاں کی

سوا کسی دوسری چیز سے اس کا کوئی واقعی تعلق باقی نہ رہا ہو۔
ظاہر ہے کہ یہ رویہ دین کے سیاسی پہلو کو کمزور کر دے گا اور اسلامی حکومت کا قیام ایک خواب بن کر رہ جائے گا۔ یہ زندگی بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے "اسوۂ حسنہ" سے منحرف زندگی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تو اللہ نے مبعوث ہی اس لیے کیا تھا کہ آپ دین حق کو تمام ادیان باطلہ پر غالب کر دیں اس لیے اس پہلو سے غفلت کے بعد کسی شخص کی زندگی سنت نبوی کے مطابق نہیں ہو سکتی۔

عبادت میں انہماک کی دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص اس میں افراط کی اس حد تک پہنچ جائے کہ خود اس کے نفس اور اہل وعیال کے حقوق تلف ہونے لگیں۔ ایسی زندگی بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور آپ کے عملی اسوے کے خلاف اور اعتدال سے منحرف ہے۔ خدا کی پرستش کا اتنا تیز جذبہ حضور کے وقت میں صحابہ کرام کے اندر بھی پیدا ہوا تھا۔ آپ کو جب اس کی اطلاع ملی تو آپ نے اس کی تحسین نہیں بلکہ تردید فرمائی اور اپنی حیات طیبہ کو نمونے کے طور پر پیش فرمایا۔ انسان، خدا کا بندہ اور غلام ہے۔ اس کے آقا نے اس کے ذمے بہت سے ضروری کام کیے ہیں اور وہ چاہتا ہے کہ وہ سارے ضروری کام انجام دیے جائیں۔ بندے کو اس بات کا اختیار نہیں ہے کہ وہ ان کاموں میں سے کسی ایک کو اپنی تمام توجہات کا مرکز بنالے اور دوسرے ضروری کاموں سے عملی طور پر بے تعلق ہو جائے۔ یہ آقا کو خوش کرنے والا رویہ نہ ہوگا۔

آخر میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ لفظ "اعتدال" کے مفہوم اور محل استعمال کی تعیین کے لیے بھی کتاب وسنت کی تعلیم اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے "اسوۂ حسنہ" کو سامنے رکھنا چاہیے ورنہ جس طرح کسی دینی معاملے کا فیصلہ کرتے وقت حضور کے اسوہ سے غفلت، انسان کو اعتدال سے منحرف کر دیتی ہے۔ اسی طرح کسی لفظ کا مفہوم متعین کرتے وقت آپ کے اسوے سے غفلت، اس لفظ کے غلط مفہوم تک پہنچا سکتی ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ جس طرح لوگ مداہنت اور حکمت ومصلحت کے درمیان فرق نہیں کرتے۔ اس طرح استقامت اور اعتدال کے درمیان جو فرق ہے اس سے غافل ہو جائیں اور اس لفظ کو ایسی جگہ استعمال کرنے لگیں جو اس کا صحیح محل نہیں ہے ــــ یہ بات ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ حق و باطل کے درمیان، اعتدال کا کوئی نقطہ نہیں ہے، صحیح اصولوں پر قولی وعملی جماؤ، استقامت ہے، بے اعتدالی نہیں ہے۔ اگر یہ فرق سامنے نہ رکھا جائے تو یہ مشہور لطیفہ صادق آئے گا کہ ایک شخص مسلمان ہو گیا لیکن جب وہ کسی بت خانے کے پاس سے گزرتا تو ہاتھ جوڑ کر، بتوں کو سلام کر لیتا۔ ایک دوسرے

مسلمان نے اس سے کہا کہ جب تم مسلمان ہو گئے تو پھر یہ حرکت کیوں کرتے ہو۔ اس نے جواب دیا یہی ان بتوں کی دشمنی مول لینا بھی اچھا نہیں گویا اس شخص نے کفر و اسلام کے درمیان "معتدل راہ" دریافت کر لی تھی ــــ جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا اسلام کے دیے ہوئے قوانین تو خود افراط و تفریط کے درمیان معتدل ہیں اور ان کا اعتدال تو ان ہی ان کا امتیاز ہے۔ اس لیے اسلامی و غیر اسلامی اصولوں کے درمیان کسی درجۂ اعتدال کی تجویز غلط ہی نہیں ہے بلکہ اسلامی اصولوں کے معتدل ہونے کی نفی بھی ہے۔

آج کل سیاسی پارٹیوں میں یہ چیز بہت عام ہے کہ کسی پارٹی کے جو ارکان اپنے اصولوں سے ہٹ کر کسی دوسری پارٹی کے اصولوں سے مصالحت پر آمادہ نہیں ہوتے انہیں غیر معتدل اور انتہا پسند کہا جاتا ہے اور جو لوگ تھالی کے بیگن کی طرح کبھی ادھر اور کبھی اُدھر لڑھکتے رہتے ہیں، انہیں "معتدل" کہا جاتا ہے۔

دینی اصطلاح کے اعتبار سے اعتدال کا لفظ صحیح طور پر نہیں بولا جا سکتا ہے جہاں شرعی نقطۂ نظر سے افراط و تفریط کے دو کنارے متعین کیے جا سکتے ہوں ورنہ نتیجہ یہ ہوگا کہ استقامت کو لوگ بے اعتدالی سمجھیں گے اور استقامت سے ہٹ کر بھی اپنے آپ کو معتدل سمجھنے کی خوش فہمی میں مبتلا رہیں گے۔ یہ بات ایک مثال سے واضح ہوگی۔

فرض کیجیے کہ ایک غیر اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کو توحید کی دعوت دینی ہے اور مسئلہ یہ ہے کہ دعوت کس طرح دی جائے، ایک خیال یہ ہے کہ ان کے سامنے صرف مثبت انداز میں اللہ کی وحدانیت اور اس کی یکتائی پیش کی جائے توحید کی بنیاد پر جو نظام حیات بنتا ہے اس کی تعریف کی جائے کہ یوں اس سے امن و امان پیدا ہوتا ہے، یوں اس سے انسانیت پیدا ہوتی ہے اور یوں اس سے برائیاں مٹتی ہیں۔ باقی رہا شرک، مظاہر شرک اور مشرکانہ و ملحدانہ نظریات زندگی تو ان پر کوئی تنقید نہ کی جائے۔ ان بھڑ کے چھتوں کو نہ چھیڑا جائے کیونکہ غیر مسلم حکومت اور غیر مسلم عوام اس کو برداشت نہیں کریں گے اور دوسرا خیال یہ ہے کہ توحید کی ایسی دعوت، ناقص بھی ہوگی اور بے اثر بھی، جب تک شرک، مظاہر شرک اور مشرکانہ و ملحدانہ نظریات زندگی کے تار و پود نہ بکھیر دیے جائیں اور جب تک یہ واضح نہ کر دیا جائے کہ یہ نظریات باطل، غلط مضرت رساں اور دنیا و آخرت کے لیے تباہ کن ہیں، اس وقت تک نہ توحید نکھر کر سامنے آ سکتی ہے اور نہ اس کی بنیاد پر اٹھائی ہوئی زندگی کی عمارت، تعمیر ہو سکتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ غلط عقائد و نظریات کے ماتحت زندگی گزار رہے ہیں وہ ان کو غلط نہیں سمجھتے بلکہ اپنے لیے ہر طرح مفید سمجھ کر ہی ان کو اختیار کرتے ہیں اور پھر ان کے مطابق اپنی زندگیوں کے تمام کاروبار درست کرتے ہیں۔ جب تک ان پر یہ واضح نہ ہو جائے کہ ان کے اختیار کردہ نظریات غلط اور ان کے لیے نقصان دہ ہیں اس وقت تک وہ اسے چھوڑنے پر تیار نہیں ہو سکتے۔ (باقی ص۶۱ پر ملاحظہ ہو)

مقالات :-

امر بالمعروف ونہی عن المنکر

قسط (۴)

مولانا سید جلال الدین عمری

انسان قانون کا محتاج ہے اور قانون دینے کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ انسان نہ تو شخصی زندگی میں قانون سے بے نیاز ہو سکتا ہے اور نہ اجتماعی زندگی میں لیکن یہ بات اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ خود سے کوئی قانون بنالے اور اس پر عمل شروع کر دے۔ خدا کا بنایا ہوا قانون 'معروف' ہے اور جو قانون خدا کے قانون سے ٹکرائے وہ 'منکر' ہے۔ انسان اگر خدا کو قانون ساز مان لے تو اس کی زندگی 'معروف' کے تابع ہو جاتی ہے اور صحیح رخ پر چلنے لگتی ہے۔ اور اگر وہ خدا کی اس حیثیت کو ماننے سے انکار کر دے تو اس کے سامنے صرف دو ہی صورتیں رہ جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ قانون دینے اور فیصلہ کرنے کا اختیار خواہش اور عقل کو سونپ دے اور ان کے احکام کا پابند ہو جائے دوسری یہ کہ اپنے ہی جیسے کسی فرد یا گروہ کی غلامی قبول کرلے۔ اور یہ دونوں ہی صورتیں اس کے لیے تباہ کن ہیں۔ 'امر بالمعروف ونہی عن المنکر' کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو ایک خدا کا غلام بنایا جائے اور خدا کے سوا ہر ایک کی غلامی سے نجات دلائی جائے۔ خدا کا قانون غالب و سربلند ہونے کے لیے آیا ہے۔ جو لوگ خدا پر یقین رکھتے ہیں' ان کا فرض ہے کہ اسے غالب کرنے اور اس کے مخالف قوانین کو مٹانے کی کوشش کریں۔

خدائے تعالیٰ چاہتا ہے کہ اس کے دین کو جوں کا توں قبول کیا جائے اور اس میں کسی دوسرے فکر و عمل کی آمیزش نہ ہونے پائے۔ زندگی کے ہر معاملے میں صرف اس کا قانون چلے اور اسی کے احکام کی اتباع کی جائے۔ قانون سازی خدا کا حق ہے۔ ہم خود سے نہ تو کوئی قانون بنا سکتے ہیں اور نہ اس کے دیے ہوئے قانون میں تحریف کر سکتے ہیں۔ خدا کے دین سے انحراف اور بغاوت ہی 'منکر' نہیں ہے بلکہ یہ بھی منکر ہے کہ اس کے دین کو بدل دیا جائے اور اپنی طرف سے کمی بیشی کر کے اس کی اتباع کی جائے۔ خدائے تعالیٰ ہم سے 'منکر' کی اتباع کا نہیں بلکہ 'معروف' کی اتباع کا مطالبہ کرتا

ہے۔ اور معروف کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے دین کو جیسا کچھ وہ ہے قبول کیا جائے اور اسے اپنے اندر اور باہر غالب کرنے کی مخلصانہ کوشش کی جائے۔

امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں:۔

الامر والنھی من لوازم وجود بنی آدم فمن لم یامر بالمعروف الذی امر اللہ بہ ورسولہ وینہ عن المنکر الذی نھی اللہ عنہ ورسولہ یؤمر بالمعروف الذی امر اللہ بہ ورسولہ وینہ عن المنکر الذی نھی اللہ عنہ ورسولہ الافلابد ان یأمر وینھی ویؤمر وینھی اما بما یضاد ذالک واما بما یشترک فیہ الحق الذی انزلہ اللہ بالباطل الذی لم ینزلہ اللہ واذا اتخذ ذالک دینا کان دینا مبتدعاً[1]

حکم دینا اور منع کرنا انسانی زندگی کا ایک لازمی عنصر ہے۔ جو شخص معروف کا حکم نہ دے جس کا کہ اللہ اور اس کے رسول نے اسے حکم دیا ہے اور منکر سے منع نہ کرے جس سے کہ اللہ اور اس کے رسول نے اسے منع کیا ہے یا اسے معروف کا حکم نہ دیا جائے جس کا کہ اللہ اور اس کے رسول نے حکم دیا ہے یا منکر سے منع نہ کیا جائے جس سے کہ اللہ اور اس کے رسول نے منع کیا ہے تو یقیناً وہ خدا اور اس کے رسول کی تعلیمات کے برعکس حکم دے گا اور منع کرے گا اور برعکس ہی اسے حکم بھی دیا جائے گا اور منع بھی کیا جائے گا۔ ایک صورت یہ ہے کہ امر و نہی اس طریقے سے ہو کہ اس میں خدا کے نازل کردہ حق کے ساتھ وہ باطل بھی شامل ہو جائے جسے اللہ نے نازل نہیں کیا ہے۔ جب وہ اس طریقے کو دین کی حیثیت سے اختیار کرلے تو وہ ایک خود ساختہ دین ہوگا۔ (خدا کا دیا ہوا دین نہ ہوگا۔)

'امر بالمعروف ونہی عن المنکر' دو کاموں کا مجموعہ ہے۔ دعوت و تبلیغ اور تنظیم و تربیت۔ یہ دونوں کام ایک فطری ترتیب کے ساتھ انجام پاتے ہیں۔ پہلے خدا کے دین کی طرف لوگوں کو بلایا جاتا ہے۔ اس کے بعد ان افراد کی تنظیم و تربیت کی جاتی ہے جو اس کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں۔ ان میں سے کسی بھی کام کو نہ تو چھوڑا جاسکتا ہے اور نہ اس کی اہمیت کم کی جاسکتی ہے۔ یہ دونوں کام 'امر بالمعروف ونہی عن المنکر' کے لازمی مراحل ہیں۔ دعوت کے بغیر تنظیم و تربیت

---

[1] مجموعہ رسائل ابن تیمیہ (الحسبۃ فی الاسلام ص۴)

وجود میں نہیں آسکتی اور تنظیم و تربیت کے بغیر دعوت کا اپنی آخری منزل تک پہنچنا ممکن نہیں ہے۔ یہاں ہم ان دونوں کاموں پر الگ الگ گفتگو کریں گے۔

امت مسلمہ کے دعوتی و تبلیغی کام کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ	تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کے لیے نکالا گیا
تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ	ہے۔ تم معروف کا حکم دیتے ہو اور منکر سے منع کرتے
الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ	ہو اور خدا پر ایمان رکھتے ہو۔

یہ آیت قطعی دلیل ہے اس بات کی کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر خیر امت کا وہ کام ہے، جو اسے اپنے دائرے سے باہر انجام دینا ہے۔ وہ "لوگوں کے لیے نکالی گئی ہے" اس لیے اس کا فرض ہے کہ لوگوں کو معروف کا حکم دے اور منکر سے روکے۔ وہ خود بخود وجود میں نہیں آئی ہے بلکہ انسانوں کی اصلاح و ہدایت کے لیے خدا نے اسے قوموں اور جماعتوں کے درمیان سے نکالا ہے۔ وہ ایک عظیم مقصد کے لیے برپا کی گئی ہے اور ایک بڑا کام اسے انجام دینا ہے۔ اس کے پیدا کیے جانے کا مقصد یہ ہے کہ وہ دنیا کو خدا کی راہ دکھائے اور دین حق کی دعوت دے۔ ہر گروہ اپنا مقصد حیات متعین کرنے میں اور ہر جماعت اپنی راہ تلاش کرنے میں آزاد ہے لیکن امت مسلمہ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ خود سے کوئی راہ متعین کرلے اور اس پر دوڑنے لگے جس دن وہ اس جرم کا ارتکاب کرے گی، خیر امت کے مقام پر باقی نہیں رہ سکتی۔ اسے دنیا کے سامنے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا حکم ملا ہے اور اس حکم کو بجالانا اس کی زندگی کا مقصد ہے وہ خدا کی طرف سے ایک ڈیوٹی (Duty) پر لگائی گئی ہے۔ اس کی کامیابی و ناکامی کا فیصلہ اس بنیاد پر ہونے والا ہے کہ اس نے اس ڈیوٹی کو انجام دیا یا نہیں دیا۔ خیر امت اس گروہ کا نام ہے جو اپنے اختیارات سے دست کش ہو چکا ہے اور خدا کے دیے ہوئے نصب العین کے آگے چون و چرا تسلیم کر چکا ہے۔

علامہ شیخ ابوالسعود نے "أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ" کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے:۔

اخرجت للناس صفة لامة	اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ، امت مسلمہ کی صفت ہے
واللام متعلقة باخرجت اى	اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے لیے ظہور میں لائی
اظهرت لهم وقيل بخير امة	گئی ہے بعض لوگوں نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے
اى كنتم خير الناس للناس	کہ تم لوگوں کے لیے خیر امت ہو یعنی لوگوں کے حق میں

فهو صريح في ان الخيرية بمعنى النفع للناس وان فهم ذالك من الاخراج لهم ايضا اى اخرجت لاجلهم ومصلحتهم[۱]

بہترین انسان ہو۔ گویا 'خیر' کے معنی ہوئے لوگوں کو فائدہ پہنچانا۔ اگرچہ یہ بات اس سے بھی سمجھ میں آتی ہے کہ یہ امت "لوگوں کے لیے نکالی گئی ہے" بالفاظ دیگر لوگوں کے فائدے اور ان کی مصلحت کی خاطر وجود میں لائی گئی ہے۔

علامہ صاوی کہتے ہیں۔

قوله للناس انما عبر باللام دون من اشارة الى ان هذه الامة نفع ورحمة لنفسها وللخلق عموما في الدنيا بالدعاء لجميع الامم وفي الآخرة بالشهادة للانبياء[۲]

قرآن نے 'لوگوں کے لیے' کہا ہے 'لوگوں میں سے' نہیں کہا ہے۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ امت اپنے لیے بھی اور خدا کی تمام مخلوق کے لیے بھی دنیا و آخرت میں سراپا نفع و رحمت ثابت ہوگی۔ وہ اس طرح کہ دنیا میں وہ تمام قوموں کو دین حق کی طرف بلائے گی اور آخرت میں انبیاء کے حق میں گواہی دیگی۔

انبیاء کے حق میں گواہی دینے کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن امت مسلمہ اس بات کی شہادت دیگی کہ جس طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تک خدا کا دین پہنچایا تھا اسی طرح ہر دور میں خدا کے پیغمبر اپنی اپنی قوموں تک خدا کا دین پہنچاتے رہے ہیں۔ اب اگر کوئی قوم اس کا انکار کرتی ہے تو جھوٹ کہتی ہے کیونکہ یہ خدا کے قانون کے خلاف ہے۔ حق کو واضح کیے بغیر وہ کسی قوم کو عذاب نہیں دیتا۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کے دین کو اس کے بندوں تک پہنچانا پیغمبروں کا کام ہے۔ اور اسی کام کو انجام دینے کے لیے امت مسلمہ وجود میں آئی ہے۔ ہر دور میں، ہر قوم میں اور ہر ملک میں خدا کے پیغمبر جو دعوت لیکر اٹھتے رہے ہیں اسی دعوت کے پھیلانے اور غالب و سربلند کرنے کی ذمہ داری امت مسلمہ پر ڈالی گئی ہے۔

'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' کے اندر دعوت دین کی پوری جد و جہد آجاتی ہے۔ یہ حکم ان تمام مراحل پر حاوی ہے جو دعوت کی راہ میں پیش آتے ہیں۔ دعوت کا آغاز تبلیغ سے ہوتا ہے اور اس کی آخری حد جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ یہ دونوں کام 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' میں شامل ہیں۔ میں یہاں ان دونوں کاموں پر قرآن کی آیات اور

---

[۱] تفسیر ابی السعود علی ہامش التفسیر الکبیر جلد ۲ صفحہ ۶۹۳۔ [۲] حاشیۃ الصاوی علی تفسیر الجلالین جلد ۱ صفحہ ۱۵۳

اہل علم کی تشریحات کی روشنی میں گفتگو کروں گا۔

دین وشریعت کی تبلیغ

قرآن نے خیر امت کا امتیازی وصف یہ بیان کیا ہے کہ وہ معروف کا حکم دیتی ہے اور منکر سے روکتی ہے اس کی تشریح میں علامہ ابن جریر طبری فرماتے ہیں:۔

قوله تامرون بالمعروف فانه يعني تامرون بالله ورسوله والعمل بشرائعه وتنهون عن المنكر يعني وتنهون عن الشرك بالله وتكذيب رسوله وعن العمل بما نهي عنه[1]

تم معروف کا حکم دیتے ہو، اس سے اللہ تعالیٰ کی مراد یہ ہے کہ تم خدا اور اس کے رسول اور اس کی شریعت پر عمل کا حکم دیتے ہو۔ منکر سے منع کرتے ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ تم خدا کے ساتھ شرک، اس کے رسول کی تکذیب اور جن چیزوں سے اس نے منع کیا ہے ان کے ارتکاب سے منع کرتے ہو۔

ملا جیون کہتے ہیں:۔

تامرون بالمعروف اى بالايمان بمحمد والقرآن او بجميع الطاعات وتنهون عن المنكر اى من الكفر وسائر المعاصى[2]

تم معروف کا حکم دیتے ہو یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کا اور قرآن کی اتباع کا حکم دیتے ہو۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم تمام اطاعتوں کا حکم دیتے ہو۔ منکر سے منع کرتے ہو یعنی کفر اور تمام معصیتوں سے منع کرتے ہو۔

ایک اور آیت جس میں امت مسلمہ کو 'امر بالمعروف ونہی عن المنکر' کا حکم دیا گیا ہے، یہ ہے:۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (آل عمران ۱۰۴)

تم میں ایک گروہ ضرور ایسا ہونا چاہیے جو خیر کی طرف بلائے اور معروف کا حکم دے اور منکر سے روکے اور یہی لوگ کامیابی پانے والے ہیں۔

اس آیت کی تفسیر میں امام شوکانی لکھتے ہیں:۔

---

[1] جامع البیان فی تفسیر القرآن جزء ۴ صفحہ ۲۸ 		[2] التفسیرات الاحمدیہ صفحہ ۱۲۴

عن الضحاك فی قوله یامرون بالمعروف قال یدعون الی الایمان باللہ ورسولہ والنفقات فی سبیل اللہ وما کان من طاعۃ اللہ وینھون عن الشرك والکفر[1]

ضحاک فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ تم میں ایک گروہ ایسا ہونا چاہیے "جو معروف کا حکم دے"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا اور اس کے رسول پر ایمان لانے، اس کی راہ میں خرچ کرنے اور اس کے ہر حکم کی اطاعت کرنے کا حکم دے "منکر سے منع کرے" یعنی شرک کفر سے منع کرے۔

مقاتل کہتے ہیں :-

ان الخیر الاسلام والمعروف طاعۃ اللہ والمنکر معصیتہ[2]

آیت میں خیر سے مراد اسلام ہے اور معروف سے خدا کی اطاعت اور منکر سے اس کی معصیت مراد ہے۔ (یعنی امت میں ایک گروہ لازماً ایسا ہونا چاہیے جو اسلام کی طرف دعوت دے، خدا کی اطاعت کا حکم دے اور منکر سے منع کرے)

یہاں ایک اور پہلو بھی غور طلب ہے۔ قرآن نے 'دعوت الی الخیر' اور 'امر بالمعروف ونہی عن المنکر' کا عام حکم دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کام مسلمانوں کے اندر بھی ہوگا اور باہر بھی ہوگا۔ ہم اسے کسی بھی گروہ کے ساتھ مخصوص نہیں کر سکتے۔ اگر ہم نے انسانیت کے ایک طبقہ کو خدا کے عذاب سے بچانے کی کوشش کی اور دوسرے کو اس میں گرفتار ہونے دیا تو یہ اس صریح حکم کے خلاف ہوگا اور ہم اپنی ذمہ داری سے سبک دوش نہ ہوں گے۔ خدائے تعالیٰ چاہتا ہے کہ ہر اس فرد اور ہر اس قوم تک خدا کا دین پہنچے جو اس سے ناواقف ہے۔ جہاں معروف مٹ رہا ہو وہاں اسے زندہ کیا جائے اور جہاں منکر فروغ پا رہا ہو وہاں اسے ختم کیا جائے۔ اگر برائی ہماری ذات میں ہے، ہمارے گھر میں ہے، ہمارے خاندان اور قبیلہ میں ہے، ہمارے محلہ اور شہر میں ہے، ہماری ملت اور تنظیم میں ہے، ہمارے وطن اور قوم میں ہے، غرض یہ کہ دنیا کے جس خطہ میں ہے اور جس فرد میں ہے اسے ختم ہونا چاہیے اور ہر فرد اور ہر جماعت کو خدا کے دین اور اس کی شریعت کا مطیع اور اس کے احکام کا تابع ہونا چاہیے۔

علامہ سید محمود آلوسی فرماتے ہیں :-

حذف المفعول الصریح

آیت میں یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ دعوت الی الخیر

---

[1] فتح القدیر ج ۱ ص ۳۶۴　[2] روح المعانی جزء ۴ ص ۲۱

من الافعال الثلاثة اما للاعلام بظهوره اى يدعون الناس ولو غير مكلفين ويامرونهم و ينهونهم واما للقصد الى ايجاد نفس الفعل على حد فلان يعطى اى يفعلون الدعاء والامر والنهى ويوقعونها له (روح المعانی جزء ۴ ص ۲۱)	اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا کام کس پر کیا جائے۔ اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ جو چیز الفاظ میں بیان نہیں کی گئی ہے وہ خود بخود واضح ہے۔ یعنی یہ کہ امت میں ایک گروہ ایسا ہو جو لوگوں کو دعوت دے خواہ وہ غیر مکلف ہی کیوں نہ ہوں، انہیں معروف کا حکم دے اور منکر سے منع کرے۔ اس کی دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اصل مقصد فعل کا وجود میں آنا ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے "فلاں شخص دیتا ہے" اس سے یہ بیان کرنا مقصود نہیں ہوتا کہ وہ کسے دیتا ہے پس اس لحاظ سے آیت کا مطلب یہ ہوا کہ امت کا یہ طبقہ دعوت کا کام کرے اور امر و نہی کو وجود میں لائے۔

اس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ قرآن نے امت مسلمہ کو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا عام حکم دیا ہے۔ یہ حکم اس شرط سے خالی ہے کہ کس فرد یا گروہ کو معروف کا حکم دیا جائے اور کسے منکر سے روکا جائے۔ یہ ایک عام حکم ہے اور اسی عموم کے ساتھ اس پر ہمیں عمل کرنا ہے۔ ایک طرف بے شمار انسان خدا کے دین سے بے بہرہ ہیں اور دوسری طرف ہم پر 'امر بالمعروف ونہی عن المنکر' کا فرض عائد ہوتا ہے۔ یہ فرض ہم سے اسی وقت ساقط ہوگا جب کہ ہم اپنی پوری قوت کے ساتھ خدا کے دین کو ان تمام انسانوں تک پہنچانے کی کوشش کریں جو اس سے محروم ہیں۔

ایک تیسری آیت لیجیے جس میں 'امر بالمعروف ونہی عن المنکر' کے دعوتی پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ یہ آیت سورۂ آل عمران کے بارھویں رکوع میں ہے۔ اس میں اہل کتاب کے حق پرست گروہ کی ایک صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ "وہ معروف کا حکم دیتے ہیں اور منکر سے منع کرتے ہیں"۔

اس فقرے کی تشریح میں امام ابن جریر طبری فرماتے ہیں:۔

يامرون الناس بالايمان بالله ورسوله وتصديق محمد صلى الله عليه وسلم	لوگوں کو خدا اور اس کے رسول پر ایمان کا حکم دیتے ہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے دین کی تصدیق کا حکم دیتے ہیں جو کہ آپ ان کے پاس لائے ہیں

وماجاءهم به وينهون عن المنكر يقول وينهون الناس عن الكفر بالله وتكذيب محمد وماجاءهم به من عندالله[1]	"منکر سے منع کرتے ہیں" یعنی لوگوں کو خدا کے انکار اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور خدا کی طرف سے آپ کے لائے ہوئے دین کی تکذیب سے منع کرتے ہیں۔

جصاص کہتے ہیں :-

صفة لهؤلاء الذين امنوا من اهل الكتاب لانهم امنوا بالله ورسوله ودعوا الناس الى تصديق النبيﷺ والانكار على من خالفه فكانوا ممن قال الله تعالى كنتم خير امة اخرجت للناس[2]	اہل کتاب میں سے جو لوگ ایمان لائے یہ ان کی صفت ہے، کیونکہ وہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور لوگوں کو دعوت دی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کریں اور جنھوں نے آپ کی مخالفت کی ان کا مقابلہ کیا تو اس طرح وہ ان لوگوں میں شامل ہو گئے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ "تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کی اصلاح کے لیے نکالا گیا ہے"۔

ابن عربی مالکی کہتے ہیں کہ دین کو علمی رنگ میں پیش کرنا اور اسے دلائل سے ثابت کرنا بھی "امر بالمعروف ونہی عن المنکر" میں داخل ہے۔

ومن الامر بالمعروف والنهى عن المنكر نصرة الدين باقامة الحجة على المخالفين[3]	یہ بات بھی "امر بالمعروف ونہی عن المنکر" میں شامل ہے کہ مخالفین پر حجت قائم کر کے دین کی مدد کی جائے۔

جہاد فی سبیل اللہ

جہاد فی سبیل اللہ، شریعت کی ایک مخصوص اصطلاح ہے۔ اس کے کچھ حدود و شرائط ہیں۔ یہاں ان سے بحث نہیں ہے۔ اس وقت صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ امت مسلمہ کو "امر بالمعروف ونہی عن المنکر" کا حکم ملا ہے۔ یہ حکم اس سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ دعوتِ دین کے لیے پوری طرح وقف ہو جائے اور اسے غالب و سربلند کرنے کے لیے

[1] جامع البیان فی تفسیر القرآن جزء ۴ صفحہ ۳۵ [2] احکام القرآن جلد ۲ صفحہ ۲۲ - [3] احکام القرآن جلد ۱ صفحہ ۱۲۲

اپنی پوری قوت صرف کردے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں :۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ
يَقُوْلُ تَأْمُرُوْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ اَنْ
يشهدوا ان لا اله الا الله والاقرار
بما انزل الله وتقاتلونهم
عليه ولا اله الا الله هو اعظم
المعروف وتنهونهم عن المنكر والمنكر
هو التكذيب وهو انكر المنكر[1]

تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کے لیے نکالا گیا
ہے۔ تم ان کو "معروف" کا حکم دیتے ہو یعنی اس بات
کا کہ گواہی دیں کہ سوائے خدا کے کوئی معبود نہیں ہے
اور اقرار کریں کہ جو دین اس نے نازل کیا ہے وہ حق
ہے۔ اور اس بنیاد پر تم ان سے جہاد کرتے ہو۔ کیونکہ سب
سے بڑا معروف "لا الٰہ الا اللہ" ہے۔ تم ان کو منکر سے یعنی
خدا کی تکذیب سے منع کرتے ہو اور خدا کی تکذیب سب سے بڑا منکر ہے۔

ہمارے علم کلام کی ایک اہم شخصیت قفالؒ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی تائید میں کہتے ہیں :۔

تفضيلهم على الامم الذين كانوا
قبلهم انما حصل لاجل انهم يامرون
بالمعروف وينهون عن المنكر باكد
الوجوه وهو القتال لان الامر
بالمعروف قد يكون بالقلب و
باللسان وباليد واقواها ما
يكون بالقتال لانه القاء النفس
في خطر القتل واعرف المعروفات
الدين الحق والايمان بالتوحيد
والنبوة وانكر المنكرات الكفر بالله
فكان الجهاد في الدين تحملا لاعظم
المضار لغرض ايصال الغير الى اعظم

پچھلی امتوں کے مقابلہ میں امت مسلمہ کی فضیلت
کی وجہ یہ ہے کہ وہ بہت سخت طریقے سے معروف
کا حکم دیتی ہے اور منکر سے روکتی ہے یعنی یہ کہ وہ دین
کی راہ میں جہاد کرتی ہے امر بالمعروف کبھی دل سے کبھی زبان سے
اور کبھی ہاتھ سے ہوتا ہے لیکن ان میں سب سے مضبوط
طریقہ قتال ہے۔ کیونکہ اس میں انسان کو موت کا سامنا
کرنا پڑتا ہے۔ سب سے بڑا معروف دین حق
توحید اور نبوت پر ایمان ہے۔ اور سب سے بڑا منکر خدا
کا انکار ہے۔ دین کی راہ میں جہاد کا مطلب یہ ہے کہ
انسان دوسرے کو بہت بڑا فائدہ پہنچانے اور بہت
بڑے نقصان سے بچانے کے لیے اپنے آپ کو زندگی و
موت کے خطرے میں ڈال دے۔ اس سے لازم آیا کہ جہاد

---

[1] جامع البیان فی تفسیر القرآن (طبری) جزء ۴ صفحہ ۲۸

المنافع وتخليصهم عن اعظم المضار فوجب ان يكون الجهاد اعظم العبادات ولما كان امر الجهاد فی شرعنا اقوی منه فی سائر الشرائع لاجرم صار ذلک موجبا لفضل الامة علی سائر الامم وهذا معنی ما روی عن ابن عباس

بہت بڑی عبادت ہے۔ جہاد چونکہ ہماری شریعت میں دوسری شریعتوں کے مقابلے میں زیادہ مضبوط طریقے پایا جاتا ہے۔ اس لیے اسے امت مسلمہ کی فضیلت کا سبب قرار دیا گیا ہے۔ اوپر کا مطلب ہے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کے قول کا۔ (جو اوپر نقل کیا گیا ہے)

امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:۔

بين سبحانه ان هذه الامة خير الامم للناس فهم انفعهم لهم واعظمهم احسانا اليهم لانهم كملوا امر الناس بالمعروف ونهيهم عن المنكر من جهة الصفة والقدر حيث امروا بكل معروف ونهوا عن المنكر لكل احد واقاموا ذالك بالجهاد فی سبيل الله بانفسهم واموالهم وهذا كمال النفع للخلق

اللہ تعالیٰ نے یہ بات واضح کردی کہ امت مسلمہ انسانوں کے حق میں بہترین امت ہے، اس نے انہیں سب سے زیادہ نفع پہنچایا ہے اور اس کا احسان ان پر بہت بڑا ہے۔ کیونکہ اس نے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے ذریعہ کیفیت اور مقدار دونوں پہلوؤں سے ان کے دین کی تکمیل کی ہے۔ اس نے ہر معروف کا حکم دیا اور ہر ایک کو منکر سے منع کیا اور جان ومال سے جہاد کے ذریعہ سے قائم کیا۔ پس اس طرح آخری حد تک خدا کی مخلوق کو فائدہ پہنچایا۔

آگے چل کر اسی بحث کے ذیل میں فرماتے ہیں:۔

فمعلوم ان الامر بالمعروف النهی عن المنكر واتمامه بالجهاد هو من اعظم المعروف الذی امرنا به [۲]

یہ بات سب جانتے ہیں کہ معروف کا حکم دینا اور منکر سے منع کرنا اور جہاد کے ذریعہ اس کی تکمیل کرنا وہ سب سے بڑا معروف ہے جس کا ہمیں حکم دیا گیا ہے۔

علامہ ابن جریر طبری فرماتے ہیں:۔

(ولتكن منكم امة ..... يامرون بالمعروف) يقول يامرون

"تم میں ایک گروہ ایسا ضرور ہونا چاہیے... ..... جو معروف کا حکم دے" یعنی جو لوگوں کو محمد صلی اللہ

---

[۱] التفسیر الکبیر، جلد ۳ صفحہ ۲۸، ۲۷ [۲] الحسبۃ فی الاسلام صفحہ ۶۶، ۶۵

الناس باتباع محمد صلی اللہ علیہ وسلم ودینہ الذی جاء بہ من عند اللہ (وینھون عن المنکر) یعنی وینھون عن الکفر باللہ والتکذیب بمحمد وبما جاء بہ من عند اللہ بجہادہم بالایدی والجوارح حتی ینقادوا لکم بالطاعۃ[۱]

علیہ وسلم اور خدا کی طرف سے آپ کے لائے ہوئے دین کی اتباع کا حکم دے" اور منکر سے منع کرتے یعنی اپنے دست و بازو سے جہاد کے ذریعہ خدا کے انکار اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے لائے ہوئے دین کی تکذیب سے روکے۔ یہاں تک کہ وہ تمہارے مطیع ہو جائیں اور اطاعت قبول کریں۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں:۔

ان اخص اوصاف المومن الامر بالمعروف والنھی عن المنکر وراسھا الدعاء الی الاسلام والقتال علیہ[۲]

امر بالمعروف و نہی عن المنکر، مومن کا ایک مخصوص وصف ہے۔ اسلام کی طرف دعوت دینا اور اس کے لیے جنگ کرنا اس کے سر فہرست آتا ہے۔

امام رازیؒ فرماتے ہیں:۔

راس المعروف الایمان باللہ وراس المنکر الکفر باللہ والجہاد یوجب الترغیب فی الایمان والزجر عن الکفر فالجہاد داخل فی باب الامر بالمعروف والنھی عن المنکر[۳]

سب سے بڑا معروف خدا پر ایمان اور سب سے بڑا منکر خدا کا انکار ہے۔ جہاد سے لازماً ایمان کی ترغیب پیدا ہوتی ہے اور کفر سے آدمی باز رہتا ہے۔ اس لیے جہاد امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے اندر شامل ہے۔

شمس الائمہ سرخسیؒ کہتے ہیں:۔

وقد سمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الجہاد سنام الدین وفیہ امر بالمعروف ونھی عن المنکر وھو صفۃ ھذہ الامۃ وفیہ تعرض لاعلی الدرجات وھو الشہادۃ[۴]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد کو دین کی چوٹی کہا ہے۔ جہاد میں معروف کا حکم دیا جاتا ہے اور منکر سے منع کیا جاتا ہے۔ اور یہ اس امت کی صفت ہے۔ جہاد میں انسان سب سے اونچے درجے یعنی شہادت کے پانے کی کوشش کرتا ہے۔

---

[۱] جامع البیان فی تفسیر القرآن جزء ۴ صفحہ ۲۷۔ [۲] الجامع لاحکام القرآن جلد ۴ صفحہ ۴۷۔ [۳] التفسیر الکبیر جلد ۳ صفحہ ۵۲۳
[۴] شرح السیر الکبیر جلد ۱ صفحہ ۱۹-۲۰

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کو اسلام کی طرف بلانا، اتباعِ شریعت کی دعوت دینا، شرک و کفر سے، رسالت کی تکذیب سے اور قانونِ شریعت کی مخالفت سے روکنا، خدا کے دین کو دلائل سے ثابت کرنا، اسے فروغ دینے اور پھیلانے کی کوشش کرنا، دین کی خاطر اس کے دشمنوں سے جہاد کرنا اور اس راہ میں اپنی تمام توانائی لگا دینا، امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔ یہ ایک مقدس کام ہے اور ایک بڑے مقصد کے لیے انجام دیا جاتا ہے۔ وہ یہ کہ خدا کی زمین پر خدا کا کلمہ بلند ہو اور اس کا دین غالب آئے۔ انسان خدا کا بندہ بن جائے اور باطل سے نجات پائے۔ اس ایک مقصد کے سوا اگر کوئی دوسری غرض اس کام میں شامل ہو جائے تو بظاہر وہ ایک اچھا کام ہوگا لیکن خدا کے ہاں اس کے اجر کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں :-

من اھم شروط الامر بالمعروف	امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے ایک اہم
والنھی عن المنکر ان یکون صاحبہ	شرط یہ ہے کہ یہ کام کرنے والا اپنے کام میں مخلص ہو
مخلصا فی فعلہ طالبا اظھار دین	اور اس سے اس کا مقصد یہ ہو کہ خدا کا دین غالب
اللہ واعلاء کلمتہ واطاعۃ امرہ	اور اس کا کلمہ بلند ہو اور اس کی مخلوق اس کے احکام
فی بریتہ دون الریاء والسمعۃ	کی تابع ہو جائے۔ ساتھ ہی اس میں ریا اور شہرت
والحمیۃ لنفسہ وطبیعتہ فانما ینصر و	کا جذبہ نہ ہو، اپنے نفس اور مزاج کی حمیت نہ ہو تو ایسی
یزول بہ المنکر اذا کان صادقا	صورت میں اس کی مدد ہوگی اور منکر زائل ہوگا یعنی
وفی مقام الاخلاص موافقا	جب کہ وہ اپنے عمل میں سچا ہوگا اور اخلاص کے اونچے
قال تعالی ان تنصروا اللہ	مقام پر کھڑا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "اگر تم اللہ
ینصرکم و یثبت	کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہیں
اقدامکم[1]	ثابت قدم رکھے گا"۔

'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' کا یہ کارِ عظیم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام نے انجام دیا تھا۔ یہ کام بندگی رب کی دعوت سے شروع ہوا اور مختلف مراحل طے کرتا ہوا خدا کے دین کے غلبہ اور قیامِ حق کی شکل میں نمودار ہوا۔ اس کام کے نتیجے میں باطل کے ہاتھ سے اقتدار چھن گیا اور دینِ حق کی حکومت قائم ہوئی۔ آج سے چودہ سو سال قبل انجام پانے والا یہ کارنامہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ایک مستند عملی تفسیر ہے اور جب کبھی یہ کارنامہ انجام پائے گا

---

[1] المبین المعین لفہم الاربعین ص۱۹۲، ۱۹۳

اسی کی روشنی میں انجام پائے گا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دنیا کو ایک ایسا جامع اور مکمل دین ملا جس نے پچھلے تمام دینوں کو منسوخ کر دیا۔ امام شاہ ولی اللہ دہلوی فرماتے ہیں کہ اس دین کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ مختلف قومیں مذہب کی بنیاد پر برسرپیکار رہتیں۔ مذہب کی حقیقت گم ہو چکی تھی اور صرف چند مراسم رہ گئے تھے۔

مست الحاجة الی امام راشد	(اس لیے) ایک ایسے صالح رہنما کی حاجت
یعامل مع الملل معاملة الخلیفة	پیش آئی جو مختلف قوموں کے ساتھ اس طرح معاملہ کرے
الراشد مع الملوک الجائرة	جس طرح ظالم بادشاہوں کے ساتھ خلیفۂ راشد معاملہ
وهذا الامام الذی یجمع الامم	کرتا ہے .... تمام قوموں کو ایک دین پر جمع
علی ملة واحدة یحتاج الی اصول	کرنے والا یہ راہنما چند باتوں کا محتاج ہوگا ......
.... منها ان یدعو قوما	ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو
الی السنة الراشدة ویزکیهم	سنت راشدہ کی طرف دعوت دے، اس کا تزکیہ
ویصلح شانهم ثم یتخذهم	کرے اور اس کے حالات کو سنوارے، پھر اسے اپنے
بمنزلة جوارحه فیجاهد	دست و بازو کی حیثیت سے استعمال کرے اور اس کی
اهل الارض ویفرقهم	مدد سے اہل دنیا سے جنگ کرے اور اس قوم کو ساری
فی الآفاق وهو قوله تعالیٰ	دنیا میں (اس پاک مقصد کے لیے) پھیلا دے۔ یہی
(کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ	معنی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے کہ "تم خیر امت
لِلنَّاسِ)	ہو جسے لوگوں کے لیے نکالا گیا ہے۔"

اس کے بعد شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ آخری دین جب نازل ہوا تو روم و ایران کی سلطنتیں متمدن دنیا پر چھائی ہوئی تھیں اور وقت کے افکار و خیالات اور تہذیب و تمدن پر ان ہی کا قبضہ تھا۔ اس لیے ضروری ہوا کہ ان دونوں سلطنتوں کو ختم کر دیا جائے تاکہ ان کی جگہ دین حق کی حکومت قائم ہو۔

لما اراد الله تعالیٰ اقامة	اللہ تعالیٰ نے جب یہ ارادہ کیا کہ بگڑی ہوئی
الملة العوجاء وان یخرج للناس	ملت کو ٹھیک کرے اور ایک ایسی امت کو وجود میں
امة تامرهم بالمعروف وتنهاهم	لائے جو انسانوں کو معروف کا حکم دے اور منکر سے

عن المنكر وتغيير رسومهم
الفاسد لكان ذالك موقوفا
على زوال دولة هذين متيسرا
بالتعرض لحالهما فان حالهما
يسرى فى جميع الاقاليم الصالحة
او يكاد يسرى فقضى الله بزوال
دولتهما واخبر النبى صلى الله
عليه وسلم بان هلك كسرى
فلا كسرى بعده وهلك قيصر فلا
قيصر بعده ونزل الحق الدامغ
لباطل جميع الارض فى دمغ باطل
العرب بالنبى صلى الله عليه وسلم
واصحابه ودمغ باطل هذين
الملكين بالعرب ودمغ سائر البلاد
بملئهما ولله الحجة البالغة[1]

منع کرے اور ان کے بگڑے ہوئے رسم و رواج کو مٹادے
تو یہ کام روم و ایران کی سلطنتوں کے زوال پر موقوف
تھا اور ان سے تعرض کرکے اسے انجام دینا آسان تھا
کیونکہ ان کے حالات تمام متمدن ممالک پر پوری
طرح یا یہ کہ بڑی حد تک چھائے ہوئے تھے اس لیے اللہ
نے ان دونوں سلطنتوں کے زوال کا فیصلہ کیا اور نبی
صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ کسریٰ ہلاک ہو چکا
اب اس کے بعد کوئی کسریٰ پیدا نہ ہوگا اور قیصر ہلاک
ہو چکا اور اب کوئی قیصر پیدا نہ ہوگا۔ اس طرح حق نازل
ہوا اور تمام روئے زمین کے باطل کا سر توڑ دیا گیا۔ اس
کی صورت یہ ہوئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ
نے عرب کے باطل کو توڑا اور عرب نے ان دونوں سلطنتوں کے
باطل کو ختم کیا اور پھر ان دونوں کے ذریعہ تمام ممالک
کے باطل کا سر کچل دیا گیا۔ اور حقیقت کو پہنچنے والی
حجت اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

'امر بالمعروف ونہی عن المنکر' دعوتی کام بھی ہے اور سیاسی کام بھی۔ خدائے تعالیٰ نے جن لوگوں کو 'امر بالمعروف ونہی عن المنکر' کا حکم دیا ہے ان کے بارے میں اس نے یہ بھی صراحت کی ہے کہ زمین میں اقتدار پانے کے بعد وہ معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے۔ یعنی یہ کہ جس دعوت کو وہ لے کر اٹھے ہیں عملاً اسے قائم کریں گے اور جن اصول و نظریات پر ان کا ایمان ہے انسانوں کے درمیان انہیں نافذ کریں گے۔ ایسا نہیں ہوگا کہ اقتدار کے ملنے سے پہلے جس دین کی وہ دعوت دے رہے ہیں اقتدار کے ملنے کے بعد اسے بھلا دیں۔ 'امر بالمعروف ونہی عن المنکر' کا کام بندگی رب کی دعوت سے شروع ہوتا ہے اور اس وقت سے پہلے ختم نہیں ہوتا جب تک کہ زمین پر خدا کی معصیت زندہ ہے اور اس کا ایک بھی نافرمان باقی ہے۔ اس کام کا بوجھ امت مسلمہ پر ڈالا گیا ہے۔ یہ امت خدا کا

---

[1] حجۃ اللہ البالغۃ (مصری) ج ۱ ص ۱۱۹، ۱۱۸

کلمہ بلند کرنے اٹھی ہے۔ وہ اپنی ذمہ داری سے اسی وقت سبک دوش ہوتی ہے جب کہ خدا کی زمین پر خدا کا دین غالب اور اس کی حکومت و فرماں روائی قائم ہو جائے یا وہ اس راہ میں اپنا تمام فکری و عملی سرمایہ لٹا دے اور اپنے جان و مال کی بازی لگا دے۔ قابل صد رشک ہیں وہ زندگیاں جو اس کام میں لگی ہوئی ہیں کیونکہ قدم قدم پر خدا کی مدد ان کے ساتھ ہے۔ امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں :۔

ان اللہ امر المومنین بالایمان والعمل الصالح وامرهم بدعوة الناس وجهادهم على الايمان والعمل الصالح كما قال تعالى وَلَيَنصُرَنَّ اللّٰهُ مَن يَنصُرُهُ إِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوُا الزَّكٰوةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ[۱]

اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو ایمان اور عمل صالح کا حکم دیا ہے۔ ساتھ ہی انہیں اس بات کا بھی حکم دیا ہے کہ وہ لوگوں کو ایمان اور عمل صالح کی دعوت دیں اور اس کے لیے جہاد کریں جیسا کہ اس نے فرمایا :۔ کہ اللہ اس شخص کی ضرور مدد کرے گا جو اس کی مدد کرے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار عطا کریں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، معروف کا حکم دیں گے، اور منکر سے روکیں گے اور تمام معاملات کا انجام اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔"

امام ابن تیمیہؒ نے آخر میں سورۂ حج کی جو آیت پیش کی ہے وہ اس کام کو ظاہر کرتی ہے جو امت مسلمہ اقتدار پر آنے کے بعد انجام دے گی۔ اس آیت کی تفسیر ابن جریر طبریؒ نے ان الفاظ میں کی ہے :۔

يعني بقوله ان مكناهم في الارض ان وطنا لهم في البلاد فقهروا المشركين وغلبوهم عليها وهم اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول ان نصرناهم على اعدائهم وقهروا مشركي مكة اطاعوا الله فاقاموا الصلوة بحدودها وآتوا الزكوة يقول واعطوا زكوة اموالهم

"اگر ہم نے انہیں زمین میں اقتدار عطا کیا" یعنی اگر ہم نے انہیں شہروں میں بسا دیا اور انھوں نے مشرکوں کا زور توڑ دیا اور ان پر غالب آ گئے۔ اس سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ہیں، یعنی اگر ہم نے دشمنوں کے مقابلہ میں ان کی مدد کی اور وہ مشرکین مکہ پر غالب آ گئے تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کریں گے نماز کو اپنے تمام حدود و آداب کے ساتھ قائم کریں گے

[۱] الحسبۃ فی الاسلام صفحہ ۸۵

من جعلها الله له وامروا بالمعروف	جن کو اللہ نے مال دیا ہے وہ اس کی زکوٰۃ دیں گے "معروف
یقول ودعوا الناس الی توحید الله	کا حکم دیں گے" یعنی لوگوں کو اللہ کی وحدانیت کی اس کی
والعمل بطاعته وما یعرفه اهل الایمان	اطاعت وفرماں برداری کی اور ان اعمال کی دعوت دیں گے
بالله ونهوا عن المنکر یقول ونهوا	جو اہل ایمان کے درمیان جانے پہچانے ہیں اور "منکر سے
عن الشرك بالله والعمل بمعاصیه الذی	منع کریں گے" یعنی خدا کے ساتھ شرک سے اور اس کی نافرمانی
ینکره اهل الحق والایمان بالله[1]	سے روکیں گے جسے اہل حق اور اہل ایمان ناپسند کرتے ہیں۔

امام شاہ ولی اللہ دہلوی فرماتے ہیں :-

اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ	نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے" اس میں
اشارۃ است باقامت ارکان اسلام۔	اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ ارکان اسلام کو قائم
وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ شامل است احیاء	کریں گے۔ "معروف کا حکم دیں گے"۔ اس میں علوم دین کا
علوم دین را وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ شامل است	زندہ کرنا شامل ہے۔ "منکر سے منع کریں گے"۔ اس میں
جہاد کفار واخذ جزیہ را زیرا کہ	کفار کے ساتھ جہاد اور ان سے جزیہ لینا آتا ہے۔ کیونکہ
منکری زیادہ تر از کفر نیست و نہیی	کفر سب سے بڑا منکر ہے اور اہل کفر کو منع کرنے کی سب سے آخری
ورد عی بالاتر از قتل اہل کفر وگرفتن	شکل یہ ہے کہ انہیں قتل کیا جائے اور ان سے جزیہ لیا جائے۔ اس
جزیہ نہ وشامل است اقامت حدود	میں نافرمان مسلمانوں پر حدود کا قائم کرنا اور تعزیرات
تعزیرات را بر عصاۃ مسلمین[1]	کا جاری کرنا بھی شامل ہے۔

ان تفصیلات سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ "امر بالمعروف ونہی عن المنکر" میں ایمان وعمل صالح کی تبلیغ، غیر اسلامی افکار و خیالات پر تنقید، خدا کی راہ میں جہاد، نظام دین اور قانون شریعت کو غالب وسربلند کرنے کی کوشش شامل ہے۔ یہ "امر بالمعروف ونہی عن المنکر" کے وسیع کام کا صرف ایک پہلو ہے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ تربیت و تنظیم امت کا کام ہے۔ عبادات کی اصلاح، سیرت کی تہذیب، اسلامی علوم کا زندہ کرنا، خلاف شرع امور کی روک تھام، قانون شریعت کا نفاذ اور اسلامی خطوط پر ریاست کی تعمیر اس کام کے ضروری جز ہیں۔ اس دوسرے جز کی تفصیل پھر کسی مناسب وقت پر آپ کے سامنے آئے گی۔

---

[1] ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء۔ جلد ۱ صفحہ ۲۳

بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ اور اسلام

قسط (۳)

(جناب عبدالباری، ایم اے)

(۸) جنسی آوارگی کا مسئلہ

جس طرح ایران میں چھٹی صدی عیسوی میں مزدکی تحریک نے اٹھکر تمام عورتوں کو سب کے لیے حلال کر دیا تھا جس سے پورے کا پورا ایران جنسی انارکی اور شہوانی بحران میں ڈوب گیا تھا۔ اسی طرح اٹھارویں صدی عیسوی میں یورپ کے صنعتی انقلاب نے زندگی کے بہت سے میدانوں کو متاثر کر دیا اور عورت کو بھی اپنے مقام سے ہٹا دیا۔ جو عورت اپنی روٹی آپ کمانے لگی وہ آخر محض اپنی شہوانی خواہش کی تسکین کے لیے کیوں ایک مرد کی پابند رہتی؟ کیوں اپنے اوپر اخلاقی و قانونی بندشیں عائد کرتی؟ کیوں ایک خاندان کی ذمہ داریوں کا بار اٹھاتی؟ ایسی عورتیں بکثرت ملنے لگیں جو علانیہ کہنے لگیں کہ "ہم اتنی زیادہ مصروف ہیں کہ ہمیں بچے پیدا کرنے کی فرصت نہیں۔" انگلینڈ کے متعلق تاریخ الفحشاء (A. HISTORY OF PROSTITUTION) کا بیان ہے کہ "شوقین یا غیر پیشہ ور فاحشات کی کثرت آجکل جتنی ہے اتنی کبھی نہ تھی ——— سیکڑوں ہزاروں لڑکیاں جو روزانہ گزرتی ہیں عموماً اتنے قیمتی کپڑے پہنے ہوئے ہوتی ہیں کہ ان کی جائز کمائی کسی طرح بھی ایسے لباسوں کی متحمل نہیں ہو سکتی! ——— لڑکیوں کو بھی اتنی آزادی حاصل نہ تھی جتنی اب ان لڑکیوں کو ہے"

۱۹۵۵ء میں فرانس کے میڈیکل بورڈ نے پورے فرانس کے بارے میں اعلان کیا کہ اس کی گود میں ایک بھی باعصمت عورت نہیں اور اہل فرانس کو اس بات پر فخر ہے! ——— ایک ۷۴ سالہ جج جو دس سال تک پولس کے محکمہ تفتیش کے نائب صدر بھی رہ چکے ہیں اپنی کتاب "عصمت فروشی" میں لکھتے ہیں:- "پیرس میں شام ہوتے ہی آٹھ ہزار عصمت فروش عورتیں اپنے ہوٹلوں یا مکانوں سے نکل کر اپنا کاروبار شروع کر دیتی ہیں اور دوپہر سے دو ہزار عورتیں سڑکوں پر

نذر آتی ہیں۔ بہرحال ان دس ہزار عورتوں کو تقریباً پچاس ہزار ٹکا تک ملتے ہیں۔"

انقلابِ فرانس (۱۷۸۹ء) کے بعد سب سے پہلے اہلِ فرانس نے اپنے علم کے بل بوتے ۱۷۹۲ء میں ازدواجی قوانین بنائے۔ اس کے بعد دوسرے ممالک نے بھی وضع کیے۔ لیکن مذہب کو خیرباد کہہ کر غلط قانون سازی کی بدولت نہ صرف انگلینڈ، فرانس اور امریکہ بلکہ اُن دوسرے مغربی ممالک میں بھی، طلاق کی کثرت ہوئی جنھوں نے اخلاقی نظریات و معاشرے کے غیر متوازن اصول اختیار کر لیے تھے۔

آزادانہ اختلاط۔ فحش لٹریچر۔ اخلاق فروش تعلیم۔ عریاں تصاویر۔ گندے سینما۔ نشہ آور اشیاء کا استعمال غرض شہوانیت کی آگ بھڑکانے والے سارے ذرائع نے عورتوں میں حسن کی نمائش اور عریانیت کو غیر معمولی ترقی دے دی ہے یہاں تک کہ شوخ لباس، پاؤڈر سرخی اور بناؤ سنگھار کے نت نئے سامانوں سے ان کی تسکین نہیں ہوئی تو بیچاری گویا تنگ آ کر کپڑوں سے بھی باہر نکل پڑی ہیں! زندگی کے اس تابناک پُرفریب مظاہرہ نے پاکستان، ہندوستان اور دیگر مشرقی ممالک کے حواس کو بیحد متاثر کر دیا ہے۔

پاکستان کا یہ حال ہے کہ تبرّجِ جاہلیت، کے نظارے دن دہاڑے دیکھے جاتے ہیں۔ مثلاً زنانہ نیشنل گارڈ کے بریگیڈ کے ذرّیں ملبوسات و موسیقی کے ساتھ مظاہرے۔ زنانہ و مخلوط کالجوں میں ذہنی انار کی و اخلاقی ادارگی، ڈرامے، مینا بازار، بین الاقوامی زنانہ نمائش، کلبوں، انجمنوں، کھیل تماشوں، تقریبوں میں آزادانہ اختلاطِ مرد و زن۔ پھر فاسد لٹریچر کی کھلی اجازت! دعوت مورخہ ۱۹ اپریل ۱۹۶۲ء مظہر ہے کہ کراچی کی سوک سوسائٹی نے کراچی کے کالجوں کی طالبات میں ایک رائے شماری پر رپورٹ دی کہ ۶۳ فیصدی لڑکیاں شادی کے رشتہ سے منسلک نہ ہونے کو ترجیح دیتی ہیں۔ (حالانکہ ۱۹۵۷ء میں یورپ کے دماغی امراض کے گیارہ ہزار مریضوں کے جائزہ پر یہ بات کہی گئی تھی کہ "اگر سکونِ قلب چاہتے ہو اور بہت سی دماغی بیماریوں سے بچنا چاہتے ہو تو شادی کر لو") دوسری طرف ۵۳ فیصدی طالبات انگریزی کو ذریعۂ تعلیم قرار دینے کے حق میں ہیں ——— محض مغربی زندگی اور جدید فیشن میں مدد پانے کے لیے!

ہندوستان کا حال بھی اس سے کچھ کم نہیں۔ ہندوستان کے کمانڈر ان چیف جنرل کری اپّا نے امرتسر میں کسی تقریر میں عورتوں کو مخاطب کر کے صاف بات کہہ دی کہ "دیویو! تم گھر کے کام کاج سنبھالو، فوج کے کاموں میں تمھاری ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے پاس اس کے لیے مردوں کی کمی نہیں ہے۔" صرف یہی نہیں بلکہ ہنگامی قانون کے ذریعہ ۱۹۵۰ء میں عورتوں کو فوج میں ملازمت سے روک دیا۔ لیکن اب بھی این، سی، سی وغیرہ کے قیام میں

برائیوں کے اندیشے برقرار ہیں۔

جنسی آوارگی و شہوت پرستی سے جو ناقابلِ تلافی اثرات و نقصانات پہونچتے ہیں انھیں غور کرنے سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مثلاً خود عورت کو جو نقصانات پہونچتے ہیں وہ یہ ہیں کہ وہ اپنے اعلیٰ صفات کو کھوتی ہے اور ایسے دوسرے اوصاف حاصل کرتی ہے جو اس کے لیے خسارہ کا سودا ہے۔ گھر کی سلطنت اور اقتدار کو چھوڑ کر باہر ایک حقیر پوزیشن پاتی ہے اور نسوانیت کی خوبیوں کو قربان کر کے بھی مرد سے اپنی سیاسی برتری تسلیم نہیں کرا سکتی۔

خاندان اور معاشرہ کو بھی نقصان پہونچتا ہے اس لیے کہ گھر کی اصل معمار عورت ہی ہے۔ ہزارہا معلموں کے ذریعہ بھی وہ چیز نہیں سکھائی جا سکتی جو عورت اپنے گھر والوں کو سکھاتی ہے۔ اس طرح خاندان کی شیرازہ بندی میں اصل اہمیت عورت ہی کو حاصل ہے۔ اور خاندانوں کے مجموعہ سے معاشرہ بنتا ہے۔ معاشرہ سے ریاست وجود میں آتی ہے لازماً خاندانی انتشار معاشرہ کو پھر معاشرہ کا انتشار ریاست کو انتشار میں مبتلا کر دیتا ہے۔

ریاست کا نقصان اس طرح ہوتا ہے کہ عورت کی فطرت اور سیاست کے مزاج میں فطری نامناسبت ہے۔ عورت کے مزاج میں فعل سے زیادہ انفعال یا تاثیر سے زیادہ تاثر کا غلبہ ہے۔ اس لیے یہ مزاج سیاست میں کسی طرح فٹ ہونے کے لائق نہیں ہے۔ جس کی شہادت روم کی تاریخ، انقلاب فرانس کی سرگذشت اور شاہانِ فرانس کے درباروں سے ملتی ہے۔ بلکہ دوسری جنگِ عظیم کے موقع پر تو فرانس کے لیڈروں کا اعتراف تھا کہ ان کی شکست میں سب سے زیادہ ہاتھ ان عورتوں کا ہے جو سیاست میں دخیل تھیں۔

دوسرے عمومی نقصانات جو پوری انسانیت کو پہونچتے ہیں وہ یہ ہیں ——— قوتوں اور توانائیوں کا ضیاع، نسل انسانی کی افزائش سے غفلت ولاپرواہی، صبر و ضبط میں کمی۔ جذبات کا غلبہ و تسلط۔ ایثار و قربانی کے بجائے خود غرضی اور استحصال کے جذبہ کا ابھار ——— اتحاد و الفت کا خاتمہ اور انتشار و اختلاج کا فروغ۔

ان تمام مثالوں پر بھاری ان دو ملکوں کے خصوصی تجربے بھی دیکھنے کے لائق ہیں جو آج دنیا کو دو بلاکوں میں تقسیم کیے ہوئے ہیں اور جن کی تہذیب کی نقالی کے لیے آج یہاں کا ذہن پوری طرح تیار کیا جا رہا ہے یعنی روس اور (۲) امریکہ کے۔

(۱) روس ——— اشتراکی انقلاب میں ۱۷ اور ۳۲ سال کے درمیان کی تمام عورتیں ریاست کی ملک قرار دیدی گئیں اور ان پر سے ان کے شوہروں کے حقوق ساقط کر دیئے گئے۔

بچوں میں یہ رجحانات پیدا کر دیئے گئے کہ وہ اپنے والدین کے خلاف حکومت میں جاسوسی کریں۔

یہاں تک کیا گیا کہ شوہر کو ایک شہر میں کام دیا جاتا تو بیوی کو دوسرے شہر میں۔ عملی مشکلات محسوس ہونے پر لیبر بورڈ نے یہ حل نکالا کہ میاں اور بیوی دونوں کو یہ اختیار دے دیا کہ اپنی اپنی جگہ پر جس کو چاہیں بیوی اور میاں بنالیں اور ساتھ ہی جائز و ناجائز بچوں کو تمام حیثیتوں سے برابر کر دیا گیا۔

عورتوں کی سہولت کے لیے ملک میں جگہ جگہ سرکاری اہتمام سے حمل گرانے کے مرکز قائم کر دیئے گئے تاکہ کوئی زحمت نہ پیش آئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی سالوں میں لاوارث اور آوارہ بچے۔ باؤلے کتوں کی طرح گلی کوچوں میں پھرنے لگے۔ چوری، مارپیٹ اور قتل کی وارداتیں کرنے لگے۔ لینن کی بیوی کے اندازہ کے مطابق ایسے بچوں کی تعداد ستر لاکھ پہونچ گئی تھی۔ بچوں کے جرائم کا مسئلہ اہمیت پکڑ گیا۔ ۱۹۳۴ء کے اعداد و شمار کے لحاظ سے صرف ماسکو میں ۵۷۰۰۰ ولادتوں کے مقابلہ میں ۱۵۴۰۰۰ حمل گرائے گئے۔ اور دیہات میں ۲۴۲۹۷۹ ولادتوں کے مقابلہ میں ۳۲۴۱۹۴ حمل گرائے گیے۔ طلاقوں میں بے حد اضافہ ہونے لگا۔

ان حالات کو دیکھ کر معاملات پلٹے۔ اور اقدار بدلے۔ ۴ر جولائی ۱۹۳۵ء ہی کی اشاعت میں وہاں کے ایک مشہور اخبار نے اس بات پر زور دیا کہ "ازدواجی زندگی میں خیانت کو قانونی جرم قرار دیا گیا"۔ اب تک جن چیزوں کی تبلیغ و ترویج پر حکومت کے سارے وسائل و ذرائع صرف ہو رہے تھے اب ان ہی چیزوں کی مذمت کرنے پر صرف ہونے لگے۔ کثرت سے ایسا لٹریچر شائع کیا جانے لگا جس میں طلاق، اور اسقاطِ حمل کی خطرناکیوں اور گھناؤنے پن کا اظہار ہوتا۔ کانفرنسوں اور دیگر ذرائع پبلسٹی کی مدد سے گھر اور خاندان کی خوبیاں لوگوں کے ذہن نشین کرائی جانے لگیں۔ غرض کہ بیس سال کے اندر اندر تجربے نے ان پر واضح کر دیا کہ "وہ بالکل غلط راہ پر چل پڑے تھے۔ اب بھی چونکہ انھیں کارخانوں اور دفتروں میں لگا رکھا گیا ہے تمام اصلاحات کے باوجود عورت سے تمغہ، انعام و الاؤنس کا لالچ دے کر بچے جنوائے جا رہے ہیں۔ اسٹالن نے مادرِ ہڈ MOTHR HOOD کا تمغہ جاری کیا تھا ـــــ تاکہ ملک کی اجتماعی و فوجی قوت بڑھے۔ (استفادہ "پاکستانی عورت دوراہے پر")

(۲) امریکہ ـــــ امریکہ میں بچے قبل از وقت بالغ ہونے لگتے ہیں اور بہت کچی عمر میں ان کے اندر صنفی احساس بیدار ہو جاتے ہیں۔ امریکہ میں جن عورتوں نے زناکاری کو مستقل پیشہ بنا لیا ہے ان کی تعداد کا کم سے کم اندازہ چار پانچ لاکھ کے درمیان ہے (PROSTITUTION IN THE U.S.A P.P. 138) قحبہ خانوں کے علاوہ بکثرت ملاقات خانے CALL HOUSES آراستہ کیے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہاں کے جتنے رقص خانے، نائٹ کلب حسن گاہیں BEAUTY SALOON ہاتھوں کو خوبصورت بنانے کی دوکانیں MANICURE SHOP

عشرت کدے (MASSAGE ROOMS) اور بال سنوارنے کی دوکانیں ہیں قریب قریب سب باقاعدہ قحبہ خانے بن چکے ہیں

لندن سے بھی بدتر۔ وہاں کے سرکاری دواخانوں میں اوسطاً ہر سال آتشک کے ۲ لاکھ اور سوزاک کے ایک لاکھ ۶۰ ہزار مریضوں کا علاج کیا جاتا ہے۔ تیس اور چالیس ہزار کے درمیان بچوں کی اموات صرف موروثی آتشک کی بدولت ہوتی ہیں۔ مانع حمل دوائیں اور آلات آزادی کے ساتھ دوکانوں پر فروخت ہوتے ہیں۔ عام آزاد عورتیں تو درکنار مدرسوں اور کالجوں کی لڑکیاں بھی ایسے سامان کو ہمیشہ اپنے پاس رکھتی ہیں تاکہ اگر ان کا دوست اتفاقاً اپنا سامان بھول آئے تو ایک پُر لطف شام ضائع نہ ہونے پائے۔ جج لنڈسے JUDGE LINDSEY کا بیان ہے کہ "ہائی اسکول کی کم عمر والی ۴۹۵ لڑکیاں جنھوں نے مجھ سے خود اقرار کیا کہ ان کو لڑکوں سے صنفی تعلقات کا تجربہ ہو چکا ہے۔ ان میں سے صرف ۲۵ ایسی تھیں جن کو حمل ٹھہر گیا تھا۔ لیکن اکثر کو منع حمل کی مؤثر تدابیر کا کافی علم تھا (بحوالہ 'پردہ' از مولانا ابو الاعلیٰ مودودی)

ایسوسی ایٹڈ پریس آف امریکہ کی رپورٹ کے مطابق ہر سال ۲ لاکھ سے زائد تعداد میں ناجائز بچے پیدا ہوتے ہیں۔ ناجائز پیدائش کی اس رفتار پر قابو پانے کے لیے بعض فرقوں اور اکثر حکام میں یہ تجویز ہے کہ بے راہ ہونے والی تمام عورتوں کو مکمل طور پر بانجھ بنا دیا جائے ——— جو اپنے ناجائز بچے معاشرے کے سر تھوپ کر الگ ہو جاتے ہیں کیا ان سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ دوسروں کی فلاح و بہبود کے لیے اپنی قوت و صلاحیت قربان کریں گے؟ پھر یہ کہ ایک ناجائز بچہ طبعاً اپنے والدین کی حیوانیت ہی کا وارث ہوتا ہے جس کا خیر مقدم کرنے کے لیے وہ والدین بھی نہیں ہوتے۔ بلکہ اس کی تربیت میں بھی انھیں بیزاری معلوم ہوتی ہے۔ 'امریکی جنسی انقلاب' کے مصنف (۱۹۵۸ء) فرماتے ہیں کہ "امریکہ والے جنسی انارکی کی طرف دوڑے جا رہے ہیں جو زوال کی علامت ہے۔ امریکہ کی سیاسی زندگی تک شہوانیت کی لہروں کی رو میں آ چکی ہے اور جنسی رشوت (SEXBRIBERY) اور جنسی استحصال بالجبر ایسے ہی عام ہو چکے ہیں جیسے مالی رشوتیں۔ جنسی بدنامی والی شخصیتیں اور ان کے پٹھو سفارتی عہدوں پر ہیں اور عیاش لوگ کہیں بڑے افسر ہیں۔ کہیں وزیر سلطنت اور کہیں سیاسی پارٹی کے لیڈر" (بحوالہ 'عورت اسلامی معاشرے میں')۔

خاندانی منصوبہ بندی کا خصوصی جائزہ

ظاہر ہے کہ انسان کے مذکورہ بالا حرکات سے سامانِ معیشت کی تقسیم کا توازن بگڑا۔ لیکن آج بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے سامانِ معیشت کو ناکافی سمجھ کر چونکہ خاندانی منصوبہ بندی، کا خوشنما نام دے کر ضبط ولادت ہی کو ہند کی حکومت نے صحیح علاج سمجھا اور اسے اپنے پنجسالہ منصوبہ میں رائج کر دیا ہے اس لیے اس کا مختصراً خصوصی جائزہ لے لینا بہتر ہوگا۔

مالتھوس MALTHUS نے بڑھتی ہوئی آبادی کی رفتار کو روکنے کے لیے جو تجویز پیش کی تھی اس کے خواب وہ

خیال میں بھی یہ بات نہ آئی ہوگی کہ اس کی یہی تجویز ایک صدی بعد زنا اور فواحش کی اشاعت میں سب سے بڑھ کر مددگار ثابت ہوگی!
صنعتی انقلاب کے ساتھ ساتھ بدکاری کے زبردست طوفان نے اپنے گھیرے میں یورپ کے سارے ممالک کو لے لیا۔ ملکوں کی طرف سے برتھ کنٹرول لٹریچر کی کھلی اشاعت ہوئی حتیٰ کہ ایک جرمن لیڈر نے نہایت بے باکانہ انداز میں لکھا کہ " فرانس کے مشہور لیڈر پال رابن PAUL ROBIN نے کس جرأت سے لکھا کہ " پچھلے ۲۵ سال میں ہم کو اتنی کامیابی تو ہو چکی ہے کہ حرامی بچے کو قریب قریب حلالی بچے کا ہم مرتبہ کر دیا ہے۔ اب صرف اتنی کسر باقی رہ گئی ہے کہ صرف پہلی ہی قسم کے بچے پیدا ہوا کریں تاکہ تقابل کا سوال ہی باقی نہ رہے"! برتھ کنٹرول کی تحریک سے حرامی اولاد کی پیدائش کا خوف بھی دل سے جاتا رہا اور عام اخلاقی انحطاط شروع ہو گیا۔ اولاد نہ ہونے سے مودت و رحمت کا فقدان ہوا اور ازدواجی تعلقات کی بندشیں کمزور ہونے لگیں۔ اور والدین ان صفات سے محروم ہونے لگے جو ان میں اولاد کی پرورش کے ذریعہ پیدا ہوتی ہیں۔ کم تعداد میں بچے ہونے کے سبب سے بچوں کی اخلاقی تربیت (جو آپس میں ایک ساتھ رہنے سہنے کھیلنے کودنے سے ہوتی ہے) نامکمل رہنے لگی۔

سب سے نمایاں اور اہم مسئلہ یہ سامنے آگیا کہ اس پر عمل کرنے والی قوموں کی شرح پیدائش ایسی کم ہونے لگی کہ ہر طرف سے چیخ و پکار اٹھنے لگی۔ برطانیہ کو ایک چوتھے درجہ کی طاقت ہو جانے کا خطرہ محسوس ہونے لگا۔ فرانسیسی قوم کو اپنی زوال کی نشانیاں دکھائی دینے لگیں۔ سویڈن نے اس روز افزوں کمی کو قوم کی خودکشی کے برابر سمجھا۔ اٹلی نے ۱۹۳۳ء کے بعد سے آبادی بڑھانے کی طرف توجہ شروع کر دی اور ضبط ولادت کی نشر و اشاعت کو قانوناً ممنوع کر دیا۔ جرمنی نے بھی اصلاح حال کے لئے ضبط ولادت کی ترویج کو قانوناً روک دیا اور عورتوں کو کارخانوں اور دفتروں سے خارج کرنا شروع کر دیا۔ نوجوانوں کو نکاح کی طرف رغبت دلانے کے لیے قرضۂ شادی MARRIGE LOAN کے نام سے رقمیں دیں۔ بن بیاہوں اور بے اولادوں پر ٹیکس لگائے اور زیادہ بچے پیدا کرنے والوں پر ٹیکس کم کر دیئے۔ سنہ ۱۹۳۴ء میں ایک کروڑ پونڈ کے قرضے شادی کے لیے دیے گئے سنہ ۱۹۳۵ء کے نئے قانون کی رو سے طے کیا گیا کہ ایک بچہ پیدا ہونے پر انکم ٹیکس میں ۱۵ فیصدی دو بچوں پر ۳۵ فی صدی چار پر ۷۰ فیصدی پانچ پر ۹۵ فیصدی کمی کی جائے۔ اور جب چھ بچے ہو جائیں تو پورا انکم ٹیکس معاف کر دیا جائے۔ دعوت مورخہ ۱۶ مارچ سنہ ۱۹۶۲ء نے برلن کی ۱۴ مارچ کی رائٹر اوقت خبر دی ہے کہ جرمنی میں نوجوانوں کو مالی امداد دی جاتی ہے کہ وہ شادی کریں۔ اور مغربی برلن میں رہیں۔ ہر نیا شادی شدہ جوڑا تین ہزار مارک (ایک مارک = ایک انگریزی شلنگ) بلا سود قرض حاصل کرتا ہے یہ قرض دس سال میں ۲۵ مارک ماہانہ کے حساب سے واجب الادا ہے۔ اس قسم کے قرضے خاندانی قرضے FAMILY LOAN کہلاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی جب کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس قرضہ کا ایک چوتھائی ادا شدہ، قرضہ قرار دیا جاتا ہے یعنی چار بچے پیدا کرنے کے بعد میاں بیوی دونوں اس قرض کی ادائیگی سے مستثنیٰ قرار دیے جا سکتے ہیں۔ قرض کی ادائیگی اس کی اجازہ

کی تاریخ سے ۲۱ مہینے بعد شروع ہوتی ہے۔

نئی نسلوں کی پیدائش ایک قوم کے وجود کا تسلسل قائم رکھنے کے لیے ناگزیر ہے۔ اگر کوئی قوم اپنی نسل کی دشمن ہے تو در اصل وہ آپ اپنی دشمن ہے اور خودکشی کر رہی ہے۔ یہی حال یونان کا ہوا تھا کہ اسقاطِ حمل اور قتل اولاد کے رواج سے آبادی گھٹتی چلی گئی۔ دوسری طرف خانہ جنگیوں نے بکثرت افراد کو ہلاک کر دیا۔ بالآخر یہ قوم دوسروں کی غلام بن کر رہی!

دوسرے نقصانات جو ضبطِ ولادت کے ذریعہ پہونچ سکتے ہیں یہ ہیں کہ قحط الرجال کا خطرہ سامنے آئے گا۔ مثلاً یہ کہ اگر پیدائش کو اس طرح کنٹرول کیا جائے کہ دو بچّے کے بعد پیدائش کی راہ روک دی جائے تو پہلے سے یہ کون گارنٹی دے سکتا ہے کہ عقلمند و ہونہار یا غیر معمولی ذہانت رکھنے والا تیسرا یا چوتھا یا پانچواں، چھٹا، ساتواں بچہ پیدا ہونے والا تھا ان ہی دو میں سے ہو جائیگا اور کند ذہن و غبی نہ ہوگا؟ اس طرح کتنے قیمتی بچّوں کی پیدائش جو آگے چل کر بہترین جنرل، مدبّر اور حکیم ہو سکتے تھے اس طرح روک دی جائے گی جس کے یہ معنی ہوئے کہ دنیا جسے مختلف صلاحیتوں کے انسانوں کی ضرورت ہوتی رہتی ہے ان کے کارناموں اور فیض سے محروم کر دی گئی! امریکہ کی بندرگاہ بوسٹن کے ایک شخص کا وہ ساتواں لڑکا (پیٹر بینٹ برگھم) تھا جس نے بازاروں میں مچھلیاں بیچ بیچ کر رقم جمع کی اور لوگوں کے افلاس سے متاثر ہو کر ان کے علاج معالجے کے لیے ۱۸۲۸ء میں مرنے سے پیشتر ایک اسپتال کھولنے کی وصیت کی جس کے لیے اس نے تیرہ لاکھ ڈالر کی رقم وقف کر دی! آج یہ اسپتال (جو ادارہ اور مشن بن چکا ہے) خدمت خلق کا کام ایک بڑے پیمانہ پر کر رہا ہے جہاں کوئی غریب مریض واپس نہیں کیا جاتا۔ اگر اس بچّے کے والدین ضبطِ ولادت یا خاندانی منصوبہ بندی پر عمل کرتے تو کیا یہ فیض انسانیت کو پہونچ سکتا؟

معاشی قلت کا یہ حل جو ہندوستان کے لیے سوچا گیا ہے تجربہ اور تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے کہ کسی طرح مفید نہیں۔ بلکہ الٹا اب تو ماہرین معاشیات کہنے لگے ہیں کہ معاشی انحطاط کا ایک قوی سبب آبادی کی کمی ہے۔ اس لیے کہ پیداوار کو خرچ کرنیوالی آبادی میں بوڑھے بچّے، معذور بھی شامل ہوتے ہیں۔ اگر ان کی تعداد گھٹ جائے تو مجموعی طور پر خرچ کرنے والوں میں کمی واقع ہو گی۔ پیدا کرنے والی آبادی میں (جس میں صرف نوجوان ہوتے ہیں) بے کاری بڑھتی چلی جائے گی۔ کیونکہ مال کے خریدار کم ہونے پر کم مال پیدا کیا جائے گا۔ دوسری طرف وہ نوجوان مزدور، بوڑھے ہو کر جب کارخانوں کے لائق نہ رہ جائیں تو ان کی جگہ لینے والا دوسرا نہ رہے گا۔ کیا اس طرح کے مسئلے یورپ کے تجارتی شہروں میں نہیں پیدا ہونے لگے ہیں؟

پیدا ہونے والا انسان معاشرے پر بوجھ بھی کیسے ہو سکتا ہے جب کہ وہ جتنا کھاپی کر مرتا ہے اس سے زیادہ دنیا کو دے کر جاتا ہے۔ بقول ونوبا بھاوے صاحب کے "کھانے کے لیے صرف ایک منہ رکھتا ہے تو پیدا کرنے کے لیے دو ہاتھ"!

ہر آدمی جو اس تمدن کی مشین چلا رہا ہے اس کا فرض یہی نہیں ہے کہ اپنے جیتے جی اس کو چلائے جائے بلکہ یہ بھی ہے کہ اپنی جگہ لینے کے لیے اپنے ہی جیسے اشخاص مہیا کرنے کی کوشش کرے۔ اس نے بچپن سے جوانی کی عمر تک پہونچنے میں اس بے حد و حساب سرمایہ سے فائدہ اٹھایا جو پچھلی نسلوں نے فراہم کیا تھا۔ فطرت کے منشائے کے مطابق اسے ایسا ہی بلکہ بہتر ورثہ چھوڑنے کی تیاری کرنی چاہیئے۔ آج جب کہ زندگی کے گوشہ گوشہ میں خرابی موجود ہے تو ہر شعبہ میں اصلاح کی حاجت ہے اور اس اصلاح کے لیے بڑے اور باصلاحیت اصناف کی ضرورت۔ اس لیے اور بھی زیادہ اولاد کی ضرورت ہے جو خرابیوں کا مقابلہ کر سکیں۔ (استفادہ از "ضبط ولادت اور اسلام"، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی)۔

اس خاندان کے ساتھ جس کے نشو و نما پر سارے انسانی تمدن کا دار و مدار ہے، "منصوبہ بندی" کا خوشنما لیبل لگا دینا دراصل خاندان کے خلاف منصوبہ بندی اور پوری انسانیت کی توہین ہے! معاشی خرابیوں کو دور کرنے کے لیے اس مجوزہ حل سے کیا ایک اور زبردست خرابی بڑھتی ہوئی آبادی کی تحویل میں نہ آجائے گی؟۔

ان تمام مسائل کو سامنے رکھ کر بڑھتی ہوئی آبادی کے ساتھ ذمہ داری کے ساتھ غور کرے کہ آخر ہمیں کون منع کر رہا ہے کہ سادگی کے ساتھ کفایت شعاری و پرہیز گاری کی زندگی نہ گذاریں؟ اور کون مجبور کر رہا ہے کہ اپنی چادر سے زیادہ پاؤں پھیلا کر مغربی تہذیب کے غلط معیارِ زندگی کو اپنائیں؟ ——— اگر ان سوالات کا جواب بدلی ہوئی ذہنیت ہے تو ذہنیت کی اصلاح صرف اسی ضابطۂ حیات سے ممکن ہے جسے اللہ نے خود انسان کے لیے پسند فرمایا۔

صحیح و متوازن راہ سے سارے مسائل حل

اس ضابطۂ حیات نظامِ اسلام کی اساس قرآن و سنتِ نبوی ہے۔ ان ہی دونوں میں اُس صحیح و متوازن راہ کی تفصیلات ہیں جن کی روشنی میں اگر انسان زندگی گذارے تو اس کے سارے مسائل حل ہو سکتے ہیں چہ جائیکہ بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ یہاں ہم قرآن کے صرف ان احکام و اشارات اور احادیثِ نبوی و خلفائے راشدین کے اُن انمول نمونوں کو لیں گے جن کے ذریعہ خصوصی طور پر ان تمام خرابیوں کا استیصال ممکن ہے جن کی وجہ سے رزق اور سامانِ معیشت کی کمی محسوس ہونے لگی۔

(۱) بیروزگاری کا مسئلہ: چونکہ اسلام ذرائع پیداوار پر اجتماعی قبضہ نہیں کرتا اس لیے وہ معاشرے اور ریاست کے ذمہ یہ فرض عائد نہیں کرتا کہ وہ ہر فرد کو روزگار فراہم کرے۔ لیکن وہ پورے معاشرے اور ریاست پر یہ ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ اس کے حدود عمل کے اندر رہنے والا کوئی شخص کم سے کم ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہنے پائے۔ معاشرہ کے اندر جو لوگ بے روزگار ہو جائیں یا کسی عارضی سبب سے ناقابلِ کار ہوں یا کسی مستقل وجہ سے ناکارہ ہو جائیں یا کسی حادثے اور آفت کا شکار ہوں۔ بیوہ، یتیم و بیمار، نادار و مفلس، مقروض و دیوالیہ ان سب کے لیے مالی وسائل کی فراہمی کا انتظام اسلام اس طرح کرتا ہے کہ

حد نصاب سے زائد جمع شدہ سرمائے کا ۲½ فیصدی سالانہ بطور زکوٰۃ وصول ہو۔ کاشتکاروں، گلہ بانوں، تاجروں اور صناعوں سے عُشر وغیرہ کی رقم وصول ہو۔ معدنی کانوں اور دفینوں سے پانچواں حصہ اور جنگ میں اموالِ غنیمت کا بھی پانچواں حصہ لیا جائے ــــ یہ مسلمانوں کی امدادِ باہمی اور سوشل انشورنس کی ایک وسیع ترین اسکیم ہے۔ یہی ان کا پراویڈنٹ فنڈ ہے جو سبھوں کو فکر فردا سے بالکل بے نیاز کر دیتا ہے۔ تمھارا کام بس اتنا ہے کہ اپنی پس انداز کی ہوئی دولت سے ایک معمولی حصہ دے کر بیمہ کرالو۔ آج تمھیں ضرورت نہیں، یہ رقم دوسرے ضرورت مندوں کے کام آئے گی۔ کل جب تم یا تمھاری اولاد ضرورت مند ہوگی تو نہ صرف دی ہوئی رقم واپس لے گی بلکہ کچھ زائد بھی ــــ حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کے پاس قوت و طاقت کے سامان اپنی حاجت سے زائد ہوں اس کو چاہیے کہ اس فاضل سامان کو کمزور کو دیدے اور جس شخص کے پاس سامانِ خورد و نوش حاجت سے زائد ہو اس کو چاہیے کہ فاضل سامان نادار اور حاجت مند کو دیدے۔

اسلامی قانونِ میراث کے ذریعہ بھی لوگوں کی بچی ہوئی دولت نزدیک و دور کے تمام رشتہ داروں میں درجہ بدرجہ پھیلا دی جاتی ہے اور اگر کوئی وارث نہ ہو تو بیت المال میں داخل کر دی جاتی ہے تاکہ اس سے پوری قوم فائدہ اٹھائے۔

زکوٰۃ و صدقات کے ذریعہ قوم کے تمام افراد تک دولت پھیل جاتی ہے۔ ہر شخص کو کافی قوت خرید حاصل ہو جاتی ہے "وَفِیْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ" (الذاریات) اور ان کے مالوں میں حصہ ہے اس کا جو مانگے اور اس کا جو ضرورت کے باوجود ہاتھ نہ پھیلائے)۔ چاہے کوئی لکھ پتی اور کروڑ پتی نہ ہو مگر سب خوش حال و فارغ البال ہو جاتے ہیں۔ دوسری طرف حدیث کی تعلیم ہے "کُنْ فِی الدُّنْیَا کَاَنَّکَ غَرِیْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِیْلٍ" (دنیا میں ایک مسافر اور راہ گیر کی طرح زندگی گذارو)۔

زکوٰۃ کے مصارف میں سے ایک مصرف غارمین یعنی قرضداروں کے لیے بھی ہے۔ اور قرضداروں کے متعلق اسلامی تعلیم یہ ہے "وَاِنْ کَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰی مَیْسَرَةٍ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ" (البقرۃ) (اگر قرضدار تنگدست ہو تو اس کی حالت درست ہونے تک اسے مہلت دو۔ اور اگر معاف کر دو تو یہ تمھارے لیے زیادہ بہتر ہے۔ اس کا فائدہ تم سمجھ سکتے ہو اگر کچھ علم رکھتے ہو۔) پریشان حال لوگوں کی حاجت روائی کے لیے اسلام میں "عاریت" کا طریقہ نہ صرف جائز بلکہ مستحسن و مستحب ہے۔ بلکہ عاریت نہ دینے والوں پر قرآن میں وعید آئی ہے "...... وَیَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ" (ماعون) (اور ان کے لیے بھی ہلاکت ہے جو برتنے کی چیز کو عاریت نہ دیں)۔

سرمایہ دار اگر خرچ کرتا ہے تو بادلِ ناخواستہ۔ لیکن اسلام کہتا ہے کہ آخرت کے منافع پر خرچ کرو اور خرچ کر کے نہ تو احسان جتاؤ "لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِکُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی" (البقرۃ) (اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور اذیت پہنچا

ملیامیٹ نہ کردو)۔ " جو یہ چاہتا ہے کہ اس کے رزق میں کشائش ہو اُسے چاہیے کہ صلۂ رحمی کرے "۔ (حدیث) (یعنی مستحق رشتہ داروں کی امداد کرے)۔

حضرت مُصعب بن سعد بن ابی وقاص رضؓ سے روایت ہے کہ نبی صلعم نے فرمایا " تمھاری جو مدد کی جاتی ہے اور تم کو جو رزق دیا جاتا ہے وہ تمھارے ضعیفوں ہی کی بدولت ہے " (بخاری) " صدقہ کرنے سے کسی کا مال نہیں گھٹتا "۔ حدیث کی رو سے انسان کے مرجانے کے بعد اس کا وقف صدقۂ جاریہ بن کر اس کے نیک عمل کو جاری رکھتا ہے " وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ لَا تُظْلَمُونَ (البقرۃ) (اور تم کو نیک کاموں میں جو خرچ کروگے پورا پورا واپس ملے گا۔ اور تم پر ہرگز ظلم نہ ہوگا)۔ " بہتر صدقہ یہ ہے کہ کسی بھوکے کو پیٹ بھر کر کھلائے "۔ اور " لَيْسَ الْمُؤْمِنُ بِالَّذِي يَشْبَعُ وَجَارُهُ جَائِعٌ إِلَى جَنْبِهِ " (وہ مومن نہیں جو شکم سیر ہو اور اس کا کوئی پڑوسی اس کی بغل میں بھوکا رہے)۔ " وَأَنفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً يَرْجُونَ تِجَارَةً لَّن تَبُورَ لِيُوَفِّيَهُمْ أُجُورَهُمْ وَيَزِيدَهُم مِّن فَضْلِهِ " (فاطر) (اور جن لوگوں نے ہمارے بخشے ہوئے رزق میں سے کھلے اور چھپے طریقے سے خرچ کیا وہ ایک ایسی تجارت کی امید رکھتے ہیں جس میں گھاٹا ہرگز نہیں ہے۔ اللہ ان کے بدلے ان کو پورے پورے اجر دے گا بلکہ اپنے فضل سے کچھ زیادہ ہی عنایت کرے گا) " اَلْخَلْقُ كُلُّهُمْ عِيَالُ اللهِ فَأَحَبُّهُمْ إِلَى اللهِ أَنْفَعُهُمْ لِعِيَالِهِ " (تمام مخلوق اللہ کا کنبہ ہے، پس اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب وہ شخص ہے جو اس کے کنبے کے حق میں مفید ہو) اس بنا پر قیامت میں اللہ تعالیٰ اس طرح نہ فرمائے گا کہ تم نے فلاں بندے کو کھانا کیوں نہیں کھلایا تھا، بلکہ اس طرح کہ " يَا ابْنَ آدَمَ اسْتَطْعَمْتُكَ فَلَمْ تُطْعِمْنِي " (اے ابن آدم میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا تو تو نے مجھے نہیں کھلایا)۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ " جو لکڑی کا ایک بوجھ اپنی پیٹھ پر لاد لائے تو یہ اس کے لیے اس سے بہتر ہے کہ لوگوں سے سوال کرے اور وہ دیں یا نہ دیں " ــــــ بڑے بڑے پیغمبر اپنے ہاتھ سے محنت کر کے کھانے کو عار نہ سمجھتے تھے۔ خود رسول اللہ سفر میں اکثر جنگل سے لکڑیاں لانے کا کام کرتے تھے۔ مسجد نبوی صلعم کی تعمیر میں مزدوروں کے ساتھ کام کیا اور جنگِ احزاب میں خندق کھودنے میں ہاتھ بٹایا۔ ایک صحابی رضؓ نے مدینہ میں تھوڑے سے پنیر لے کر تجارت شروع کردی جس میں اللہ نے اتنی برکت دی کہ بڑے مالدار ہوگئے۔ آج لوگ ایک کام کو اچھا اور ایک کو بُرا تصور کرنے لگے ہیں۔ کھیتی باڑی جس میں آزادی کے علاوہ آمدنی بھی معقول ہے لیکن دیہاتوں کو چھوڑ کر شہر کی کلرکی پُرعزت سمجھی جانے لگی چاہے اس میں آمدنی کم ہو اور غلامی بھی کرنی پڑے۔ چنانچہ ملازمت کے اسی چکّر میں لوگ آج بمبئی، کلکتہ، ٹاٹانگر، رانچی اور کیلا وغیرہ بھاگے چلے جاتے ہیں۔ لیکن ہر جگہ پہونچ کر وہ بیروزگار، مارے مارے پھرتے ہیں! اس ذہنیت کو ختم کرنے کی ضرورت ہے۔

ہندوستان کی آبادی کے تقریباً ۷۰ فیصدی لوگ دیہات میں بستے ہیں۔ ایک زرعی ملک ہونے کی وجہ سے دیہات زیادہ اور شہر کم ہیں۔ بے کار زمینیں بہت ہیں اور زراعت کی گنجائش بھی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب بھی ملک میں روزگار کی کتنی گنجائش نکل سکتی ہے؟ پہلے پنجسالہ منصوبہ کے مطابق قابل کاشت زمین ۹۸ لاکھ ایکڑ بے کار پڑی ہوئی تھی۔ اسی طرح اب بھی ہے لیکن خرید کر آباد کرنے کی قوت لوگوں میں نہیں۔ ایسی زمین کے متعلق نبی اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ "مَنْ عَمَّرَ اَرْضًا لَيْسَتْ لِاَحَدٍ فَهُوَ اَحَقُّ بِهَا۔ مَنْ اَحْيَا اَرْضًا مَوَاتًا فَهِيَ لَهٗ" (جس شخص نے ایسی زمین کو کاشت کے قابل بنا لیا جو کسی کی ملک نہیں ہے تو وہ شخص ہی اس کی ملکیت کا مستحق ہے جس شخص نے مُردہ زمین کو زندہ کیا (RECLAIM) کر لیا وہ اس کی زمین ہے۔

"شاہ ولی اللہؒ زراعت کو اس قدر اہمیت دیتے ہیں کہ جس ملک میں اس کے وسائل موجود ہوں اس جگہ اگر اس سے بے اعتنائی برتی جائے تو اس ملک کی تمدنی حالت کبھی درست نہیں رہ سکتی۔ اور اس کا فاسد اور برباد رہنا یقینی ہے اس لیے کہ خام اجناس کی پیداوار کے بغیر نہ تجارت چل سکتی ہے اور نہ صنعت و حرفت بروئے کار آسکتی ہے ——— پس اگر باشندگان ملک کی اکثریت صنعت و حرفت اور شہری سیاسیات ہی میں مصروف رہے اور زراعت اور مویشیوں کی حفاظت اور پرورش کی جانب بہت تھوڑے لوگ مشغول ہوں تو ان کی دنیوی تمدنی زندگی فاسد اور خراب ہو جائے گی" (اسلام کا اقتصادی نظام ——— از مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب) ——— یہی وجہ ہے کہ آج ہندوستان میں بجائے خالص گھی دودھ کے ڈالڈا اور درآمد شدہ پاؤڈر دودھ سے زیادہ واسطہ پڑ رہا ہے!۔

حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ جب رسول اللہؐ مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو آپؐ نے زراعت کے متعلق قریش کو خطاب فرمایا "يَا مَعْشَرَ قُرَيْشٍ اِنَّكُمْ بِاَقَلِّ الْاَرْضِ مَطَرًا فَاحْرُثُوْا فَاِنَّ الْحَرْثَ مُبَارَكٌ" (اے گروہِ قریش تم ایسی زمین پر ہو جہاں بارش کم ہوتی ہے، تو زراعت کرو، زراعت میں برکت دی گئی ہے) خود رسول اللہؐ نے زراعت کی ہے۔

زراعتی زمینوں کو کرایہ یا بٹائی پر دینے سے پیداوار میں اضافہ ہی ہوتا ہے اور ہر کسان ہی زمین کے مالکوں سے بٹائی پر لے کر کاشت کرتے ہیں، اس میں دونوں خوش رہتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر کوئی قانونی پابندی لگائی جائے تو مالک زمین دوسرے کاموں کی مشغولیت کے باوجود محض نام کے لیے خود ہی کاشت کرے گا اور پیداوار میں کمی آجائے گی۔ اسی طرح کاشتکاروں کی ملکیت سے کچھ زمین چھین کر دوسروں کے حوالہ کر دینے سے دلچسپی میں کمی ہوگی اور پیداوار متاثر۔ تجربہ کے بعد اصلاحی قدم اٹھانے کی ضرورت ہے تاکہ ملک کی پیداوار میں اضافہ ہو!۔

ہندوستان کے اندر چھوٹا ناگپور علاقہ کو معدنی ذخیروں سے اللہ نے غیر معمولی طور پر (باقی صفحہ ۶ پر ملاحظہ ہو)

فطری نظامِ معیشت

(جناب محمد فاروق خاں)

باطل نظام کی قیادت اور سرمایہ دار طبقہ کے مظالم نے آج دنیا کے سامنے جہاں اور بہت سے مسائل
کھڑے کر دیے ہیں انہیں مسائل میں ایک اہم مسئلہ معاش کا مسئلہ بھی ہے ۔ مادہ پرستانہ نقطۂ نظر نے تو انسان کو
اس کی پوری اجازت دے رکھی ہے کہ وہ اپنے ذرائع و وسائل سے کام لے کر دنیا کا جتنا بھی سرمایہ جمع کر سکتا
ہے جمع کرے ۔ اس کے لیے اگر دوسرے انسانوں کے حقوق پامال ہوتے ہوں تو ہوں مادی نقطۂ نظر سے یہ کوئی
قابلِ لحاظ بات نہیں ہے لیکن انسانی فطرت انصاف چاہتی ہے ۔ ایک طرف یہ بات عدل و انصاف کے خلاف
ہے کہ ایک شخص نے اپنی محنت اور صلاحیت اور اپنے ذرائع و وسائل سے جو کچھ کمایا ہے اس سے اس کو محروم
کر دیا جائے ۔ دوسری طرف غریبوں اور ناداروں کی بے کسی کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے ساتھ ہمدردی کا برتاؤ
کیا جائے ۔ وہ بھی ضروریات رکھتے ہیں تکلیف اور راحت کا انھیں بھی احساس ہوتا ہے پھر وہ اس کے
مستحق کیسے نہیں ہو سکتے کہ ان کے ساتھ منصفانہ رویہ اختیار کیا جائے ۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے حل کے
لیے مختلف نظریات لوگوں کی طرف سے پیش کیے جاتے رہے ہیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کو جو متوازن
اور معتدل نظام معیشت درکار ہے، انسان کا ذہن اس کے پیش کرنے سے ہمیشہ قاصر رہا ہے ۔

مارکس کا فلسفہ بتاتا ہے کہ دنیا میں طبقاتی نزاع کا سلسلہ تاریخی قوت سے چلتا آ رہا ہے اور یہ سلسلہ
اسی طرح باقی رہے گا یہاں تک کہ دنیا ارتقا کے اس مقام تک پہنچ جائے گی جہاں معاشرہ میں سرے سے
کوئی طبقاتی تفریق ( ) باقی نہ رہے گی ۔ یہ غیر طبقاتی معاشرہ
(CLASSLESS, SOCIETY) ٹھیک اسی طرح قانون فطرت کے مطابق ظہور میں آئے گا جس طرح آپ
پانی کو دیگچی میں رکھ کر گرم کرتے ہیں تو وہ بھاپ بن کر اڑ جاتا ہے ۔ انسان کی قوت اور اس کے ارادے کا اس میں

کوئی دخل نہ ہوگا۔ انسان تاریخی قوت کے سامنے مجبور محض ہے۔ لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہم انسان
کو مجبور محض قرار دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ تاریخ کی قوت ہی کسی انقلاب کے لانے کی اصل ضامن ہے تو پھر
معاشرے میں کسی انقلاب کے برپا کرنے کی کوشش ایک بے معنی سی بات ہوگی۔ اشتراکی انقلاب کے حق میں لوگوں
کو ہموار کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم انسان کو پہلے با اختیار تسلیم کریں پھر اس انقلاب کے برپا کرنے کی
سعی وجہد میں حصہ لیں۔ اپنے فلسفہ کے اندرونی تضاد کو خود مارکس نے بھی محسوس کیا ہے اور اس تضاد کو رفع
کرنے کی اس نے ناکام کوشش بھی کی ہے کہیں تو وہ کہتا ہے کہ انسان کو اپنی تاریخ بنانے میں کوئی دخل
نہیں ہے اور کہیں وہ تسلیم کرتا ہے انسان کے اعمال و افعال مادی پیداوار پر فیصلہ کن حیثیت سے اثر انداز ہوتے
ہیں۔ اگر ہم انسان کو ارادہ و اختیار کا مالک قرار دیتے ہیں اور اسے تاریخی قوت کے سامنے مجبور محض تسلیم نہیں کرتے
تو مارکس کے فلسفے کی ساری ندرت ختم ہو جاتی ہے پھر تو اس کے فلسفے میں کوئی امتیازی شان باقی نہیں رہتی۔ مارکس
کا دعویٰ یہ تھا کہ اسے انسانی تاریخ کا علمی تجزیہ کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اور اس عظیم حقیقت کو اس
نے دریافت کر لیا ہے کہ انسانی تاریخ میں مادیت کی کارفرمائی کے سوا کسی اور چیز کو دخل حاصل نہیں ہے۔
تاریخ انسانی کی مادی توجیہ (MATERIALIST INTERPRETAION) ہی مارکس کا اصل کارنامہ ہے

مارکسزم کی نظریاتی ناکامی کے علاوہ جب ہم اس کے پیش کردہ معاشی نظام کا جائزہ لیتے ہیں تو اس میں بھی ہمیں
وہ توازن اور اعتدال نظر نہیں آتا جو ایک فطری نظام کا بنیادی وصف ہوتا ہے۔ اشتراکیت کا دعویٰ ہے کہ اس
کا پیش کردہ معاشی نظام ایک فطری نظام ہے اور یہی اس سلسلے کی آخری سچائی اور انسان کی آخری دریافت ہے
اس لیے بہتر کسی نظام کا انسان تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اشتراکی دعوے کی سب سے بڑی دلیل سماج میں پائی جانے
والی طبقاتی کشمکش (CLASS, STRUGGLE) ہے جس کا اپنے طور پر تجزیہ کر کے وہ سمجھتے ہیں کہ انھوں
نے اپنے دعوے کو مدلل کر لیا ہے۔ اس کے علاوہ اشتراکیت کے علمبردار اپنے دعوے کے حق میں بعض دوسرے
فطری دلائل (NATURAL PROOFS) بھی پیش کرتے ہیں۔ بلکہ ان کے نزدیک تو علم طبیعات
(PHYSICS) ہو یا علم کیمیا (CHEMISTRY) ریاضی (MATHEMATICS) ہو
یا اور کوئی علم جتنے بھی انسانی علوم ہیں سب سے اشتراکی فلسفہ کی تائید حاصل ہوتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ آدمی
اگر صرف اپنے جسمانی نظام ہی پر غور کرے تو اسے اشتراکیت کے حق ہونے میں کوئی شبہ دامن گیر نہیں ہو سکتا۔ وہ
کہتے ہیں کہ انسان کا جسمانی نظام ایک فطری نظام ایک فطری نظام ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا جسم کے ہر عضو کا اپنا

الگ الگ ایک مخصوص نظام ہے۔ فطرت نے انسانی اعضاء کو مختلف صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ انسان کے مختلف اعضاء میں باہم کوئی کش مکش اور بغض وعناد نہیں پایا جاتا۔ ان میں باہم ہم آہنگی اور موافقت پائی جاتی ہے جسم کے اندر ایک معدہ ہے جہاں سارے ہی جسم کے لیے غذا فراہم کی جاتی ہے۔ انسان کا دل بغیر کسی تعصب اور جانبداری کے تمام اعضائے جسمانی کو ان کی ضرورت کے لحاظ سے خون سپلائی کرتا ہے۔ پھر ایک اور پہلو سے دیکھیے انسان اپنی حیثیت (STANDARD OF LIVING) کے لحاظ سے قمیص، پاجامہ، جوتا خریدتا ہے قمیص، پاجامہ اور جوتا تینوں اس کی اپنی حیثیت کے مطابق ہوتے ہیں۔ وہ اپنے جسم کے کسی عضو کے ساتھ بے انصافی نہیں کرتا۔ اس مثال کو پیش نظر رکھتے ہوئے اب انسانی سماج پر نظر ڈالیے۔ انسانی سماج شاہی، غلامی اور جاگیرداری وغیرہ مختلف دوروں (STAGES) سے گزرتا ہوا ایک ایسے مقام پر پہنچ چکا ہے جسے ہم سرمایہ دارانہ نظام سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ آج سماج دو حصوں میں تقسیم ہو کر رہ گیا ہے۔ ایک طبقہ سرمایہ داروں کا ہے اور دوسرا طبقہ محنت کش مزدوروں کا ہے۔ ذرائع پیداوار (MEANS OF PRODUCTION) پر صرف سرمایہ دار طبقہ قابض ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ طبقہ جو ذرائع پیداوار پر قابض نہیں ہے اپنا پیٹ پالنے کے لیے محنت کرنے پر مجبور ہے مختلف عوامل کام کرتے ہیں جس کے نتیجے میں ایک کارآمد شے وجود میں آتی ہے جسے ہم پیداوار (PRODUCTION) کہتے ہیں۔ پیداوار حاصل کرنے کے سلسلے میں جتنے بھی عوامل کام کرتے ہیں ان میں سب سے زیادہ اہمیت مزدوروں کی محنت (LABOUR) کو حاصل ہے لیکن آج آپ دیکھتے ہیں محنت کش طبقہ ہی سب سے زیادہ نادار اور پریشان حال ہے جس کے محنتوں کے نتیجے میں کارآمد اشیاء —— خواہ وہ ملوں کا کپڑا ہو یا کھیتوں میں پیدا ہونے والا غلہ ہو —— وجود میں آتی ہیں۔ اس کی ساری کوششوں اور محنتوں کا استحصال ( ) ہوتا رہتا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ اپنی ساری محنتوں اور مشقتوں کے باوجود مفلسی اور ناداری رہتا ہے۔ اس صورتِ حال کو بدلنے کے لیے ضروری ہے کہ سماج طبقاتی تقسیم سے پاک ہو۔ ایک غیر طبقاتی معاشرہ وجود میں لایا جائے۔ ذرائع پیداوار پر کسی مخصوص طبقے کی اجارہ داری باقی نہ رہے۔ بلکہ اسے پورے سماج کی ملکیت قرار دیا جائے۔ جس طرح جسمانی نظام میں معدہ سارے جسم کے لیے غذا حاصل کرتا ہے اور اس کا سامان بہم پہنچاتا ہے کہ جسم کے سارے ہی اعضاء کے لیے خون فراہم ہو سکے۔ ٹھیک اسی طرح ذرائع پیداوار اور تمام ملکیتوں پر صرف حکومت کا قبضہ ہونا چاہیے حکومت کا کام ہے کہ وہ لوگوں سے ان کی صلاحیتوں کے مطابق کام لے اور انھیں ان کی ضرورت کے مطابق

رزق عطا کرے۔ سماج کی فلاح کے لیے اس طرح کی مرکزیت CENTRALISATION) ضروری ہے۔ سماج میں ارتقا کا عمل اس کے بعد بھی ہوتا رہے گا۔ یہاں تک کہ سماج ایک ایسے مقام پر پہنچ جائے گا جہاں حکومت کی بھی کوئی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ بغیر پولیس اور فوج اور کسی مقتدر قوت کے سماج کے افراد اپنی صلاحیتوں کے مطابق کام کرتے رہیں گے۔ اور انھیں ان کی ضرورت کے مطابق رزق ملتا رہے گا۔ اسی عمل کا مظاہرہ پورے سماج میں ہونے لگے گا۔ جو آج ہمیں صرف جسم انسانی کے اندر نظر آتا ہے۔ یہی وہ آخری منزل ہے جسے اشتراکیت (COMMUNISM) کہتے ہیں۔ اشتراکیوں کا کہنا ہے کہ ترقی کی اس منزل تک پہنچنے کے لیے سماج کو ابھی مختلف مرحلوں سے گزرنا ہوگا۔ طرح طرح کی رکاوٹوں اور مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا۔ کہیں نظریات کی لڑائی لڑنی ہوگی اور کہیں دوسرے قسم کے مسائل سے سابقہ پیش آئے گا۔ ظاہر ہے سرمایہ دار طبقہ آسانی کے ساتھ اپنے محبوب سرمایہ سے دست کش نہیں ہو سکتا۔ اس لیے قوت سے کام لینا بھی ناگزیر ہے۔ سماج کی بھلائی کے لیے ضروری ہے کہ سرمایہ دار طبقے کو مجبور کرکے عام سطح پر لایا جائے۔

یہی اشتراکیت کے زعم کے مطابق وہ فطری نظام ہے جس سے بہتر نظام کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اگر عدل و انصاف سے کام لیا جائے تو اس کے فطری نظام ہونے کو عقل کبھی باور نہیں کر سکتی اور نہ اس سے اس طرح کی سوسائٹی ہی وجود میں آسکتی ہے جس کا بلند بانگ نعروں کے ساتھ اشتراکی حضرات دعوے کرتے ہیں۔ بلکہ اس کے برخلاف اس سے مختلف قسم کی ایسی برائیوں کا دروازہ کھل جاتا ہے جس کا سدباب لوگوں کے لیے ناممکن ہو جاتا ہے۔ جس سوسائٹی کو وہ مثالی سوسائٹی قرار دیتے ہیں، اس کے جسم انسانی کے مشابہ قرار دینے کی بھی ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ اگر آپ ان سے سوال کریں کہ ایک شخص اپنے جسم کے ہر عضو کو اپنا عضو سمجھنے پر مجبور ہے۔ جسم میں ایک ہی روح ہے جو سارے جسم پر حکمراں ہے۔ ایک ہی دماغ ہے جو سارے جسم کو سنبھالتا اور اسے حرکت میں لاتا ہے۔ جسم کے خواہ کسی حصہ کو صدمہ پہنچے پورا جسم اس سے متاثر ہوتا ہے۔ ایک شخص اپنے پورے جسم کے ساتھ یکساں برتاؤ کرنے پر اپنے کو مجبور پاتا ہے۔ وہ اپنی حیثیت کے لحاظ سے اگر قمیص پہنتا ہے تو اسی کے لحاظ سے پاجامہ اور جوتا بھی خریدتا ہے لیکن آخر وہ کون سی روح ہے جس کے سبب ہم انسانی سماج کو من وعن ایک جسم کی حیثیت دے سکتے ہیں جن سے معاشرے کے افراد کو جسمانی اعضاء کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ جسمانی اعضاء پر تو انسانی شعور کی حکمرانی ہوتی ہے وہی پورے جسم کو استعمال میں لاتا ہے۔ انسانی شعور کو تو پورا حق حاصل ہے کہ وہ جسم سے کام لے۔ اس کے بغیر جسمانی وجود معطل ہو کر رہ جائے گا۔ معاشرے میں آخر کسے یہ مقام بلند عطا کیا جائے گا۔

معاشرے کا جائز مالک ہم کیسے قرار دے سکتے ہیں۔ جسم کے اعضاء کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ انسانی شعور کے فیصلے کے مطابق اپنا فرض انجام دیں۔ انسانی معاشرہ اگر ایک جسم کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے افراد اعضائے جسمانی کی حیثیت رکھتے ہیں تو عضو کا کام صرف اطاعت امر کا ہے۔ معاشرے کے اندر آخر کس کے حکم کی پیروی کریں گے۔ معاشرہ افراد ہی سے وجود میں آتا ہے۔ معاشرے سے الگ آخر وہ کون سا مستقل اور ذی شعور وجود ہے۔ معاشرے کے افراد اپنے کو جس کی مرضی کے تابع کر سکیں گے۔ اس سوال کا اشتراکیوں کے پاس اس کے سوا اور کوئی جواب نہیں ہے کہ انسانی ذہن و شعور کے ارتقاء کے نتیجے میں اس طرح کا ایک مثالی معاشرہ (IDEAL SOCIETY) وجود میں آجائے گا جس کے سارے افراد جسمانی اعضاء کے مثل کام کر سکیں گے۔ گویا ان کے نزدیک ذہنی ارتقاء کا لازمی نتیجہ ایک روز ہمارے سامنے اس شکل میں آئے گا کہ معاشرے کے افراد اپنی انفرادی حیثیت کو بھول چکے ہوں گے اور وہ اپنے پر سماج کو ترجیح دینے لگیں گے۔ یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جو محتاج دلیل ہے۔ جس دعوے کی پشت پر کوئی محکم دلیل نہ ہو اسے ہرگز یہ حیثیت نہیں دی جا سکتی کہ لوگوں کو اس کے اختیار کرنے کی دعوت دی جائے اور نہ اس کو بنیاد قرار دے کر کوئی عملی قدم اٹھانا لائقِ تحسین قرار پا سکتا ہے۔

یہ بھی کوئی انصاف کی بات ہے کہ محض جسمانی نظام کو سامنے رکھتے ہوئے ہم کوئی نظام ترتیب دینے لگ جائیں اور اسے ایک فطری نظام کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کریں۔ فطری نظام صرف وہی نظام ہو سکتا ہے جس کی شہادت ہمیں پوری کائنات سے ملتی ہو نہ کہ صرف اس کے کسی جزو سے انسانی جسم پوری کائنات نہیں ہے کائنات کا محض ایک جزو ہے۔ آپ انسانی جسم میں صرف انسان کے بازو کو سامنے رکھ کر یہ نتیجہ اخذ کرنے لگیں کہ ہمرنگی اور یکسانیت کا قانون ہی فطری قانون ہے کہیں نشیب اور کہیں فراز نہ ہو۔ یہ فطرت کے خلاف تو ظاہر ہے یہ طریقِ استدلال اور اس سے اخذ کیا ہوا نتیجہ دونوں ہی غلط اور حقیقت کے خلاف ہوں گے۔ اس کا حال سے تو وہی ہوگا کہ اندھوں میں جس کے ہاتھ میں ہاتھی کا پیر آگیا اس نے کہا کہ ہاتھی کھمبا جیسا ہوتا ہے۔ جس کے ہاتھ میں اس کی دُم آئی اُس نے ہاتھی کے بارے میں کچھ اور ہی رائے قائم کی اور جس کے ہاتھ میں اس کے کان آئے اس نے کچھ اور سمجھا۔ پوری کائنات پر نظر ڈالیے تو آپ دیکھیں گے کہ یہاں بلندی کے ساتھ پستی بھی ہے روشنی کے ساتھ تاریکی بھی کہیں نشیب ہے تو کہیں فراز۔ مہینے کی کچھ راتیں اندھیری ہیں تو کچھ راتیں روشن صبح ہے تو اس کی شام بھی ہے۔ دن ہے تو اس کے ساتھ رات بھی ہے۔ خشکی ہے تو تری بھی موجود ہے۔ میدان ہیں تو بے آب و گیاہ صحرا بھی پائے جاتے ہیں۔ اگر کہیں سردی زیادہ پڑتی ہے تو کہیں گرمی اور کہیں

موسم میں اعتدال پایا جاتا ہے۔ پھر دیکھیے کسی کو قدرت امیر گھرانے میں پیدا کرتی ہے، کسی کو غریب خاندان میں کوئی ایسی جگہ پیدا ہوتا ہے جو نہایت پُر فضا ہوتی ہے اور کوئی ایسی جگہ پیدا ہوتا ہے جہاں کا موسم ناخوشگوار اور سخت ہوتا ہے۔

پھر جس طرح جسم میں تمام اعضاء باہم اتفاق کے ساتھ کام کرتے ہیں ان کے مابین گہری موافقت پائی جاتی ہے۔ ایک عضو کو دوسرے عضو سے قوت حاصل ہوتی ہے۔ کوئی عضو کسی دوسرے عضو کے کام میں خلل انداز نہیں ہوتا۔ اسی طرح اس پوری کائنات کے اندر بھی ہم آہنگی اور موافقت (CO-ORDINATION) کا قانون کارفرما ہے۔ اب آپ انسان کا مطالعہ کیجیے آپ دیکھیں گے انسان صرف ایک معاشی حیوان نہیں ہے، بھوک اور سردی گرمی کے احساس کے علاوہ اس کے دوسرے احساسات بھی پائے جاتے ہیں۔ غضب اور غصہ، شفقت و ترحم، محبت والفت، عجز و بے نیازی جیسے جذبات کا بھی وہ مالک ہے۔ وہ کائنات کے بارے میں اور خود اپنے بارے میں بھی ایک نظریہ اختیار کرنے پر مجبور ہے وہ یا تو یہ مانے گا کہ کائنات کا کوئی خالق اور مالک ہے انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنے خالق کی رضامندی کے کام انجام دے یا وہ خدا کا منکر ہوگا اور صرف اپنی خواہشات یا اپنے جیسے دوسرے انسانوں کی خواہش کا پابند ہوگا۔ آدمی بہرحال یا تو خدا کی مرضی کے مطابق اپنی زندگی گزارے گا یا اس کے خلاف کوئی رویہ اختیار کرے گا۔ زندگی کا معاشی نظام ہو یا سیاسی، اخلاقی نظام ہو یا معاشرتی، کوئی بھی ضابطہ یا نظام ہو جب تک اس میں اور انسان کے نظریات و عقائد میں موافقت اور ہم آہنگی نہ پائی جائے اسے فطری اور مکمل نظام نہیں کہا جا سکتا۔ انسان کی زندگی ایک کُل کی حیثیت رکھتی ہے اس کُل سے زندگی کے کسی شعبہ کو الگ اور مستقل قرار دینا زندگی میں دوئی اور تضاد پیدا کرنے کے مترادف ہے۔ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ کمیونزم کا حقیقت میں مذہب سے کوئی تعارض نہیں ہے وہ صرف معاشی اصلاح چاہتا ہے جیسا کہ بعض اشتراکی حضرات اس طرح کی باتیں سیدھے سادے لوگوں کو بہلاوا دینے کے لیے کہہ دیتے ہیں تو یہ اس بات کا کھلا ثبوت ہوگا کہ کمیونزم کا معاشی نظام کوئی مضبوط و مستحکم اور صحیح نظام نہیں ہے۔ صحیح اور مستحکم نظام تو صرف وہی نظام معیشت ہو سکتا ہے جو اپنے ساتھ ایک سیاسی نظام بھی رکھتا ہو اور معاشرتی نظام بھی، اس کا اپنا ایک اخلاقی اور روحانی نظام بھی ہو، زندگی کا وہ کوئی بلند مقصد بھی ہمارے سامنے پیش کرتا ہو، کائنات اور زندگی کے بارے میں ہمیں ایک واضح نظریہ دیتا ہو۔ وہ محض ایک نظام معیشت ہی نہ ہو بلکہ اس کے اندر انسان کی نفسیات اور اس کے جذبات کی پوری رعایت پائی جاتی ہو۔

ایسا نظامِ معیشت جس کا انسان کے عقائد و نظریات، اخلاق اور روحانیت اور اصولِ معاشرت اور اس کے مقصدِ حیات سے کوئی تعلق نہ ہو، ایک ظالمانہ اور غیر عادلانہ نظامِ معیشت تو ہو سکتا ہے۔ مگر اس کو ایک بہترین اور فطری نظامِ معیشت قرار دینا اور اس کو انسان کی معاش اور اس کے دیگر مسائل کا حل سمجھنا ایک فریب کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس کی مثال بس ایسی ہی ہے جیسے آپ انسانی جسم کے لیے کوئی ایسا عضو تجویز کرنے لگیں جس کا جسم کے بقیہ حصوں سے کوئی تعلق نہ ہو۔ ایسا عضو ظاہر ہے صرف نزعی ہو سکتا ہے اسے جسمِ انسانی کا کوئی عضو قرار دینا صحیح نہ ہوگا۔

اسی طرح ایسا نظامِ معیشت جس میں معاش ہی سب کچھ ہو۔ جو معاش ہی کو انسان کے فکر و نظر کا حاصل قرار دیتا ہو۔ اصول و نظریات جہاں معاش ہی کے گرد چکر کاٹتے ہوں جس کے نزدیک تاریخ کا اتار چڑھاؤ اور قوموں کا عروج و زوال صرف معاش ہی کی کرشمہ سازی ہو۔ اسے ہم فطری نظامِ معیشت نہیں قرار دے سکتے جس معاشرے میں معاش ہی کو تمام مسائل کا حل تسلیم کر لیا جائے وہاں جو خرابی یا برائی بھی رونما ہوگی اس کا سبب صرف معاشی بگاڑ ہی کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ پھر تو معاشرے کی اصلاح کے لیے صرف یہی کافی ہوگا کہ معاشی اعتبار سے اس کی اصلاح کر دی جائے۔ دوسری خرابیاں اپنے آپ ختم ہو جائیں گی۔ ظاہر بات ہے جہاں معاش کو یہ اہمیت حاصل ہو وہاں معاش سے الگ ہو کر کسی مسئلہ پر غور کرنا بنیادی طور پر غلط ہوگا۔ وہاں سوچنے کا انداز صرف یہی ہو سکتا ہے کہ انسانی ذہن کا ارتقاء ہو یا تنزل سب معاش کی کرشمہ سازی ہے۔ معاشی نظام اگر درست ہو تو معاشرے کے تمام افراد ذہنی و فکری ہر اعتبار سے بلند ہوں گے اور ان سے کسی گھناؤنے اور قبیح فعل کے صادر ہونے کا امکان ہی باقی نہ رہے گا۔ انسان کو نیک اور صالح اور فکر کے اعتبار سے بلند بنانے کے لیے اس کے اندر کسی قسم کی تبدیلی پیدا کرنے کی ضرورت نہیں ہے اس کے لیے ضرورت ہے تو صرف اس بات کی کہ اس کے خارج میں تبدیلی لائی جائے اور اس کے ماحول کو بدلا جائے۔ ماحول کی تبدیلی کا انحصار اشتراکیت کے نزدیک صرف معاشی نظام کی تبدیلی پر ہے۔ معاشی نظام اگر درست ہوگا تو معاشرہ اپنے آپ درست ہو جائے گا۔ مارکسیت کا دعویٰ ہے کہ انسان کے تمام افکار و اعمال اس کی معاشی حالت کے رہینِ منت ہیں۔ انسان کے اعمال و افکار کی اپنی مستقل بالذات کوئی حقیقت نہیں ہے لیکن یہ نظریہ اپنے پیچھے کوئی ایک بھی ایسی دلیل نہیں رکھتا جسے صحیح معنوں میں دلیل کہا جا سکے۔ یہ محض ایک پیشین گوئی ہے کہ معاشی حالت درست ہونے کے بعد لوگ ذہنی اعتبار سے اتنے بلند ہو جائیں گے کہ وہ سماج کے تمام افراد کو نہ صرف اپنی ذات کی طرح عزیز رکھیں گے بلکہ دوسروں کو اپنے مقابلے میں ترجیح دینے کا جذبہ بھی ان کے اندر بدرجہ اتم پیدا ہو جائے گا۔ اشتراکیت کے معاشی نظام کو جہاں اپنا لیا گیا ہے

کیا وہ سرزمین جنت نشان بن گئی ہے۔ کیا وہاں کے رہنے والے ہر اعتبار سے اپنے کو مطمئن پاتے ہیں۔ انسانی زندگی کی تعمیر کے لیے اگر معاشی اصلاح ہی سب کچھ ہے اور ذہن و فکر کا ارتقاء اگر صرف معاشی ترقی اور سماجی ارتقاء ہی کا نتیجہ ہوا کرتا ہے تو آج آخر مارکس کی بلند خیالی اور وسیع النظری کس ترقی یافتہ ماحول کا نتیجہ تھی اور آج کے کمیونسٹ حضرات کی وسیع النظری اور فکری بلندی کو آخر کس ماحول نے جنم دیا ہے۔

سرمایہ داروں کے ظالمانہ رویے کو ختم کرنے کے لیے یہ کیا ضروری ہے کہ سرمایہ اور ذرائع پیداوار کو حکومت کی تحویل ہی میں دے دیا جائے۔ اس کی ایک دوسری شکل یہ بھی ممکن تھی کہ سرمایہ دار طبقے کو اخلاقی تعلیم و تربیت اور قانون کے ذریعہ انصاف کرنے پر مجبور کر دیا جائے۔ آخر یہ طریقہ کیوں نہیں اختیار کیا جائے۔ آخر یہ ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے کہ کسی ہاتھ پیر میں درد اور تکلیف ہو تو اس بیماری کا علاج کرنے کے بجائے اسے بے دست و پا کر کے رکھ دیا جائے۔ پیداوار اور پیداوار کے ذرائع و وسائل اگر حکومت کی تحویل میں دے بھی دیے جائیں تو یہ مسئلہ کا کوئی حل نہیں ہے اور نہ اس سے سماج طبقاتی اونچ نیچ سے نجات پا سکتا ہے۔ صرف اتنی سی تبدیلی ضرور ہو سکتی ہے کہ پہلے دولت اور ذرائع پیداوار پر سرمایہ دار قابض تھا اب یہ قبضہ حکمراں طبقے کو حاصل ہو جائے گا۔ آخر اس کی کیا گارنٹی ہے کہ سرمایہ دار طبقہ تو اپنے سرمایہ کی قوت سے لوگوں پر ظلم و ستم کو روا رکھ سکتا ہے لیکن حکمراں طبقہ صرف انصاف ہی کرے گا۔ اگر سرمایہ دار طبقے سے آپ کسی بلندیٔ اخلاق اور وسیع النظری کی امید نہیں رکھ سکتے تو آخر حکمراں طبقے سے کس بنیاد پر امید قائم کی جا سکتی ہے۔ اگر دولت کا نشہ انسان کے ذہن و دماغ کو خراب کر سکتا ہے تو آخر یہی دولت ارباب حکومت کی تحویل میں پہنچ کر کیسے اپنی خاصیت کھو سکتی ہے۔ اقتدار خود ایک بڑی قوت ہے اس کے ساتھ اگر رزق کی کنجیاں بھی حکمرانوں ہی کو سونپ دی جائیں تو انھیں ڈکٹیٹر، جابر اور مطلق العنان بننے سے کون چیز روک سکتی ہے۔ کیا اسٹالن کے جبر و تشدد جس کا اعتراف خود کمیونسٹوں کو بھی کرنا پڑا ہے، ہماری عبرت کے لیے کافی نہیں ہے۔ معاش ہی کو زندگی کی غایت قرار دینے کے بعد وہ کون سا فلسفہ ہے جو انھیں انصاف پر قائم رکھ سکتا ہے۔ جب تک لوگوں کے اندر ایثار و قربانی اور باہم ہمدردی اور غمخواری کے جذبات نہ پائے جائیں ہم مثالی معاشرے کا تصور نہیں کر سکتے اور نہ اس کے بغیر زمین میں کسی تہذیب و تمدن کا قیام ممکن ہے لیکن اشتراکی فلسفہ انسان کے اندر اس طرح کے پاکیزہ جذبات ابھارنے والے محرکات بہم پہنچانے سے قاصر ہے۔ طبقاتی شعور کو زیادہ سے زیادہ بیدار کر کے ایک طبقے کے اندر دوسرے کے خلاف منافرت اور بغض و حسد کے بیج بو کر ان کے مابین کش مکش برپا کرنے کے سوا اس کا اور کوئی اخلاق نہیں ہے۔ اشتراکی تحریک اس کا موقع ہی نہیں دیتی کہ لوگ سنجیدگی کے ساتھ مسائل پر غور کر سکیں

مذہب دشمنی کو تو اشتراکیت نے اصول متعارفہ کا درجہ دے دیا ہے۔ دین و مذہب پر غور کرنے کا تو اس تحریک میں سرے سے کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اشتراکی فلسفہ میں حد درجہ جھول پایا جاتا ہے۔ مارکسزم اور سوشلزم تضادات کے مجموعہ کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس کے برخلاف جب ہم اسلامی فکر کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں یہاں روشنی ہی روشنی نظر آتی ہے۔ نہ تو اسلامی فلسفۂ حیات میں کوئی جھول پایا جاتا ہے اور نہ اس کے پیش کردہ اصول و ضوابط میں کوئی نقص نظر آتا ہے۔ اسلام کی روشنی میں زندگی کا جو نقشہ بنتا ہے اس میں حد درجہ اعتدال اور توازن پایا جاتا ہے۔

اسلام مارکسزم کی طرح انسان کو ایک معاشی حیوان قرار نہیں دیتا بلکہ وہ انسان کو ایسا بلند مقام عطا کرتا ہے جس کا تصور بھی مارکس اور اس کے متبعین نہیں کر سکتے۔ اسلام انسان کی مادی ضروریات کو نظر انداز نہیں کرتا بلکہ وہ ان کا پورا لحاظ رکھتا ہے اس کے ساتھ ہی وہ انسانی زندگی کے دوسرے پہلوؤں کی بھی پوری پوری رعایت کرتا ہے وہ انسان کو زندگی کا ایک ایسا نصب العین عطا کرتا ہے جس سے بلند نصب العین انسانوں کے لیے ممکن ہی نہیں ہے۔ زندگی کی مادی تعبیر (MATERIALIST INTERPRETATION) حقیقت میں انسانی وجود کی کوئی صحیح تعبیر نہیں ہے۔ انسانی زندگی کی حقیقت صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ انسان کچھ مادی ضرورتیں رکھتا ہے۔ مادی ضرورتوں سے بڑھ کر وہ سب سے زیادہ اس بات کا ضرورتمند ہے کہ اس کی زندگی کی تکمیل ہو سکے۔ زندگی کی تکمیل ممکن ہی نہیں جب تک کہ انسان حقیقت آشنا نہ ہو۔ انسان کے اندر بلند سے بلند تر ہونے کی طلب پائی جاتی ہے یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنی فطرت کو کچل کر پستی کی طرف مائل ہو جائے۔ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے کسی مقام پر پہنچ کر رکنا پسند نہیں کرتا۔ ایسا نصب العین جو انسان کی اس طلب کے لیے تسکین کا سامان فراہم کر سکے۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ وہ خدا کی خوشنودی اور اس کی رضا طلبی کو اپنا مطمح نظر بنائے۔ اگر خدا کی ہستی اس کے سامنے سے ہٹ گئی تو پھر کچھ بھی باقی نہیں رہا جس کے لیے وہ اوپر کی جانب اپنا رخ کر سکے۔ پھر تو اس کی قسمت میں صرف پستی اور ذلت ہے خدا کی ہستی کا انکار کر کے یہ تو ممکن ہے کہ انسان قانون فطرت (NATURE) کو اپنا خالق تصور کر کے کچھ دن زمین کی پشت پر چل پھر لے لیکن اس کی زندگی ہمیشہ کے لیے حقیقی معنویت سے محروم ہو جائے گی اور اس محرومی کی موت سے بڑھ کر انسان کے لیے دوسری کوئی موت نہیں ہو سکتی۔

اسلام ایک طرف کسب معاش کے اصول و ضوابط متعین کرتا ہے۔ کمائی کے جائز حدود کا آدمی کو پابند بناتا ہے کہ وہ کسب معاش کے لیے ناجائز اور سوسائٹی کے لیے تباہ کن ذرائع و وسائل اختیار نہ کرے۔ دوسری طرف وہ ایسا

بات کی بھی تعلیم دیتا ہے کہ ہم اپنی جائز آمدنی کو کس طرح خرچ کریں۔ اسلام کا امتیازی وصف یہ ہے کہ وہ آدمی کے اندر سے سرمایہ پرستی کی ذہنیت کو ختم کرکے اس کے اندر انفاق اور ایثار و قربانی کے پاکیزہ جذبات کو نشو و نما دیتا ہے وہ اس حقیقت سے لوگوں کو آگاہ کرتا ہے کہ آدمی کے پاس جو کچھ ہے وہ درحقیقت خدا کی امانت ہے۔ اس لیے اسے اسی طرح خرچ ہونا چاہیے جس طرح خرچ کرنے کی خدا نے تعلیم دی ہے بس درحقیقت معاش کے سلسلے میں پیدا شدہ جملہ مسائل کا حقیقی حل یہی ہے۔ خدا سارے انسانوں کا خدا ہے۔ وہ سب کی ضروریات سے اچھی طرح واقف ہے۔ وہ ان محتاجوں، ضرورتمندوں اور محنت پیشہ لوگوں کے مسائل سے بھی آگاہ ہے جو دوسروں کے دست نگر ہوتے ہیں

معاشی اعتبار سے لوگوں میں باہم جو تفاوت پایا جاتا ہے اسے مطلق غیر فطری اور ظلم کی نشانی قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ البتہ بنیادی ضرورتیں سب کی پوری ہونی چاہیں۔ آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی راہیں سب کے لیے کھلی رہنی چاہیئں۔ اگر دنیا کے سارے انسان ایک ہی حیثیت کے حامل ہو جائیں تو دنیا کی یہ رونق اور چہل پہل معدوم ہو کر رہ جائے۔ قدم قدم پر سخت دشواریوں کا سامنا کرنے پڑے۔ معاشی اعتبار سے انسانوں کے مابین جو فرق پایا جاتا ہے اس فرق نے لوگوں کے درمیان ایک تعاون ( ) کا موقع فراہم کر دیا ہے جس سے دنیا کا انتظام چل رہا ہے۔ اگر سب لوگ یکساں حیثیت کے مالک ہوتے تو ملک میں نہ تو گاڑی چلانے والے ڈرائیور ملتے اور نہ اسٹیشنوں پر ہمیں کوئی قلی نظر آتا۔ نہ ملوں اور کارخانوں میں کام کرنے والے لوگ ہمیں مل سکتے۔ اور نہ کوئلے کی کانوں میں کام کرنے والے مزدور ہی میسر آسکتے اور نہ وہ لوگ ہمیں مل سکتے جو سڑکوں، گلیوں اور نالیوں وغیرہ کی صفائی کا کام کرتے ہیں۔ دنیا میں آدمی ایک دوسرے کے کام آتا ہے۔ اس میں معاشی فرق و تفاوت کو ایک موثر محرک کی حامل حیثیت حاصل ہے۔ اس مشینی دور میں بھی آدمی کو بہر حال آدمی کی ضرورت ہے۔ اور یہ ضرورت ہمیشہ باقی رہے گی اس سلسلے میں آدمی کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آج ان ملکوں سے بھی معاشی اعتبار سے پائے جانے والے باہمی فرق و امتیاز کو مٹایا نہیں جا سکا جو اپنے کو سوشلزم اور کمیونزم کا علمبردار کہتے ہیں :-

قرآن اپنے بیان میں کتنا سچا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے :-

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيشَتَهُمْ	دنیا کی زندگی میں ہم نے انھیں (یعنی لوگوں کو)
فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ	روزی تقسیم کر رکھی ہے اور ہم نے (اس سلسلے میں)
فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِيَتَّخِذَ	ایک کو دوسرے پر فوقیت دی ہے تاکہ ایک دوسرے سے کام
بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا	لیتا رہے (اور دنیا کا انتظام قائم رہے) اور تیرے
وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا	رب کی رحمت اس (سرمایہ سے) کہیں بہتر ہے جس کو

یَجْمَعُوْنَ ۞ (۴۳: ۳۲) وہ جمع کر رہے ہیں۔

دیکھیے قرآن کس طرح لوگوں کے ذہنوں کی اصلاح کرتا ہے اور انھیں حقیقت سے آگاہ کرتا ہے جس سے بے نیازی انسان کے لیے تباہی و ہلاکت ہی کا سامان بنتی ہے

غرض فطری نظام معیشت وہ نہیں ہے جس میں مصنوعی طور پر لوگوں کو ایک سطح پر لانے کی کوشش کی جائے بلکہ حقیقت کے اعتبار سے فطری نظام معیشت وہی ہے جہاں معاشی اعتبار سے عدل اور انصاف پایا جاتا ہو، جہاں معاش کے مسئلے کو وہی مقام دیا گیا ہو جو انسان کی زندگی میں اس کا اصل مقام ہے۔ جہاں معاش ہی زندگی کا اول اور آخر نہ ہو بلکہ جہاں معیشت اور زندگی کے دوسرے پہلوؤں اور قدروں کے درمیان ربط و تعلق اور توازن پایا جاتا ہو۔

شرائطِ ایجنسی

(۱) ایجنسی کم سے کم پانچ رسائل پر دی جائے گی

(۲) رسائل حسب ضرورت طلب کیے جائیں۔ غیر فروخت شدہ رسائل واپس نہیں لیے جائیں گے۔

(۳) کمیشن ۲۵ فی صدی دیا جائے گا۔ البتہ ۵۰ یا زائد رسائل کی خریداری پر کمیشن ۳۳ فی صدی دیا جائے گا۔

(۴) رسائل کی روانگی کا صرفہ ہمارے ذمے ہوگا اور رجسٹری اور وی پی کا صرف ایجنٹ صاحبان کے ذمہ ہوگا۔

(۵) رقم پیشگی آنا چاہیے یا رسائل ذریعہ وی پی روانہ کرنے کی اجازت دی جائے۔

منیجر ماہنامہ زندگی رامپور۔ یوپی

ایک انٹرویو کے اقتباسات

جناب الطاف حسن قریشی، مدیر مسئول اردو ڈائجسٹ لاہور نے موجودہ نائب صدر جمہوریہ ہند کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر محمود حسین صاحب سابق وائس چانسلر ڈھاکہ یونیورسٹی سے انٹرویو لیا تھا جو اردو ڈائجسٹ لاہور مئی ۶۳ء میں شائع ہوا ہے۔ اس انٹرویو کے وہ حصے جن کا تعلق مخصوص طور پر صرف پاکستان سے نہیں ہے، یہاں افادۂ عام کی غرض سے نقل کیے جا رہے ہیں۔ (ادارہ)

جب اِدھر اُدھر کی باتیں ہو چکیں تو محمود حسین صاحب نے فرمایا:-

"قریشی صاحب آپ کو جو پوسٹ مارٹم کرنا ہے، کر لیجیے۔ مجھے آپ کے وقت کا بہت زیادہ احساس ہے۔ آپ کو بہت سے ضروری کام کرنے ہیں۔"

"ڈاکٹر صاحب! کام کرنے سے تو میں بچنا چاہتا ہوں جبھی تو یہ راستہ اختیار کیا ہے۔ دیکھتا ہوں کہ آج کل کام نہ کرنا سب سے بڑی سعادت ہے۔ لوگ صرف باتوں کے ذریعے سے، کام کیے بغیر، دیکھتے ہی دیکھتے بڑے بن جاتے ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب کے چہرے پر ایک معنی خیز سنجیدگی پھیلی ہوئی تھی اور وہ کہہ رہے تھے:-

"سچ کہتے ہو دوست۔ ہم میں سے ہر شخص کام سے جی چراتا ہے۔ ہمارے زیادہ تر مسائل اسی لیے پیدا ہوتے ہیں کہ جس شخص کے ذمے جو کام تھا وہ اس نے نہیں کیا۔ بچا ہوا کام پیچیدگیاں پیدا کرتا رہا اور پیچیدگیاں مسائل کے اژدہوں کو جنم دیتی ہیں۔ یہ اژدہے آج ہمیں نگل جانا چاہتے ہیں مگر ہم اب بھی حرکت کرنا نہیں چاہتے۔"

"ڈاکٹر صاحب ایسا کیوں ہے؟" پروفیسر محمود حسین صاحب دو تین لمحوں کے لیے خاموش رہے۔ ایک بار خلا میں گھورا، پھر مجھ پر نگاہیں جماتے ہوئے کہنے لگے:-

"اس صورت حال کے پیدا کرنے میں یوں تو کئی عوامل کام کر رہے ہیں لیکن میرے نزدیک بنیادی وجہ یہ ہے کہ قوم میں کردار پیدا کرنے کے لیے پچھلی صدی سے کوئی منظم اور موثر کام نہیں ہوا۔ قوم یا کسی معاشرے میں اخلاقی خوبیاں

صرف وعظ و تلقین کے انجکشن لگا دینے سے پیدا نہیں ہو سکتیں۔ یہ تو ایک صبر آزما کام ہے جس کے لیے کسان کی سی ریاضت ایثار اور پیہم جد و جہد کی ضرورت ہے چونکہ یہ کام نہیں ہوا اس لیے قوم کی اخلاقی حالت روز بروز گرتی چلی گئی اور اب نوبت یہاں تک آپہنچی ہے کہ اب یہ احساس بھی نہیں رہا کہ ہم اخلاقی اعتبار سے دیوالیہ ہوتے جا رہے ہیں ملک میں ایسی تحریکیں اور تنظیمیں تو موجود ہیں جو ہنگامی مسائل کو ہنگامی انداز میں اٹھاتی ہیں لیکن ایسی تنظیمیں بہت ہی کم ہیں جو قوم میں سنجیدہ ذہن پیدا کریں اور ان کی سیرت و کردار کو اخلاقی اصولوں پر تعمیر کریں۔ دراصل قوم کا اصل سرمایہ ان کی اخلاقی قوت ہوتا ہے "

مجھے حیرت تھی کہ ڈاکٹر صاحب نے راکٹ، میزائل اور ہائیڈروجن بم کے عہد میں اخلاق کو سب سے بڑی قوت قرار دیا ہے۔ ایک طبقے کے نزدیک، قوم کی پس ماندگی کا سب سے بڑا سبب یہی اخلاق کی نشہ آور گولیاں ہیں جنھیں کھا کھا کر قوم مدہوش اور بے عمل رہی۔ اخلاق کے نام پر مذہبی اجارہ داروں نے قوم کو بے وقوف بنائے رکھا اور آج بھی یہی لوگ، قوم کی ترقی کے راستے میں سنگ گراں بنے ہوئے ہیں۔ میں نے اس معاملے میں رہنمائی حاصل کرنے کے لیے ڈاکٹر صاحب سے سوال کیا :-

"یہ تاثر عام ہوتا جا رہا ہے کہ علماء اور مولوی ہماری سوسائٹی کے زوال کے ذمہ دار ہیں۔ انھوں نے قوم کو ذہنی انتشار، فکری ژولیدگی اور افتراق و شقاق کے سوا اور دیا ہی کیا ہے۔ کیا آپ بھی تاریخ کے مطالعے سے اسی نتیجے پر پہنچے ہیں؟"

جب میں یہ سوال کر رہا تھا اس وقت ڈاکٹر صاحب بڑے غور سے میری شخصیت کا جائزہ لے رہے تھے ان کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی لیکن میرے سوال کے آخری الفاظ پر وہ یک دم سنجیدہ ہو گئے اور متوازن لہجے میں گفتگو کرنے لگے۔

"بدقسمتی سے ہماری سوسائٹی میں علماء اور مولویوں کی تضحیک و تحقیر فیشن میں داخل ہو گئی ہے۔ ہر وہ شخص جو اپنے آپ کو ماڈرن سمجھتا ہے یا اپنے آپ کو ماڈرن ثابت کرنا چاہتا ہے وہ علماء کو برا بھلا کہنا اور مطعون کرنا شروع کر دیتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علماء کو بدنام کرنے کی ایک منظم کوشش کی جا رہی ہے اگر کسی دین دار شخص سے کوئی غیر اخلاقی فعل سرزد ہو جائے تو اس کی خوب تشہیر کی جاتی ہے۔ حالانکہ تشہیر کرنے والوں کی اپنی زندگیاں نہایت بھیانک ہوتی ہیں۔ ہمیں تاریخ بتاتی ہے کہ علماء نے آزادی کی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ برصغیر پاک و ہند کی تاریخ علماء کی قربانیوں، انقلاب آفرینیوں اور بلندی کردار

کی قابل رشک مثالوں سے تابناک ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی علماء کی منظم مساعی کا نتیجہ تھی۔ مجھے تاریخ کی جو کچھ تھوڑی بہت سوجھ بوجھ ہے' اس کی بنیاد پر کہتا ہوں کہ اس برصغیر میں مسلمانوں کی انفرادیت قائم رکھنے میں علماء نے تاریخی کردار ادا کیا ہے۔ ان کی بے باکی' جرأت مندی' نتائج سے بے پرواہ ہو کر غیر اسلامی طاقتوں سے ٹکرا جانے کے عزم نے مسلمانوں کو ہندوؤں اور انگریزوں کی تہذیب میں مدغم ہونے نہیں دیا ورنہ آپ جانتے ہیں کہ ہمارے اپنے ہی حکمرانوں نے ہمیں ہندو تہذیب میں جذب کر دینے کی کتنی سرتوڑ کوششیں کی تھیں۔ مجھے ان علماء پر فخر ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب' ہمارے کن کن حکمرانوں نے مسلمانوں کو ہندو تہذیب میں مدغم کرنے کی کوشش کی؟"

مجھے اسلامی ہند کی تاریخ میں دو مخالف قوتیں کام کرتی نظر آتی ہیں۔ ایک قوت تو وہ ہے جو استحکام سلطنت کے لیے مسلمانوں کو مقامی تہذیب میں ضم کر دینا چاہتی تھی۔ اس قوت کے پیش نظر سیاسی مصلحتوں پہ مذہب کو بھینٹ چڑھا دینا تھا۔ اس تحریک کے دو بڑے قائد' علاؤالدین خلجی اور اکبر تھے ——— دوسری قوت وہ تھی جو سیاست کو دین کے تابع رکھنا چاہتی تھی۔ اس جذبے کا شدید اظہار محمد تغلق اور اورنگ زیب کی بلند مرتبت شخصیتوں میں ہوا۔ یہی دونوں قوتیں ذرا مختلف انداز کے ساتھ پاکستان میں بھی سرگرم عمل نظر آتی ہیں۔"

میں نے سوال کیا :۔

"تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف تہذیبیں ایک دوسرے سے ملتی رہی ہیں کیا یہ ہمارے لیے مناسب نہیں کہ ہم مغربی تہذیب کے ساتھ مصالحت کر لیں اس طرح ہم اس تہذیب کی اچھی باتیں اخذ کر لیں گے اور ہماری تہذیبی انفرادیت بھی قائم رہے گی۔"

ڈاکٹر صاحب نے اپنے بازوؤں کو ایک خاص انداز میں حرکت دیتے ہوئے کہا :۔

"قریشی صاحب! تاریخ کا یہ اٹل فیصلہ ہے کہ جو تہذیب' دوسری تہذیب سے سمجھوتہ کرنے کی سعی کرتی ہے وہ زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتی سمجھوتہ' شکست خوردگی اور احساس کمتری کی غمازی کرتا ہے۔ ہمیشہ غالب بلنے کی تہذیب' کمزور تہذیبوں کو ہڑپ کر جایا کرتی ہے۔ اگر ہم نے جدید تہذیب کو اپنا لیا تو یہ ہمارے لیے ناممکن ہو جائے گا کہ ہم اپنی تہذیبی اقدار کی حفاظت کر سکیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ قوم اس خودکشی کے لیے تیار ہوگی۔"

میں نے ذرا جرأت سے کام لیتے ہوئے ڈاکٹر صاحب سے پوچھ لیا کہ جدید تہذیب نے انسانیت کو بے شمار سہولتیں' آسائشیں اور رفعتیں عطا کی ہیں اگر ہم بھی اس تہذیب سے فائدہ اٹھا لیں تو کیا جرم ہے۔ عصری تقاضے'

ہم سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ ہم زیادہ سے زیادہ ترقی یافتہ بنیں اور جدید تہذیب کو اپنائے بغیر ایک ترقی یافتہ قوم نہیں بنا جاسکتا۔

"جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مغربی تہذیب کے اندر کوئی ایسی خوبی اور قوت موجود ہے جس سے ترقی کی راہیں کھلتی ہیں وہ سخت غلطی پر ہیں۔ مغربی اقوام کی ترقی کا اصل منبع یہ مغربی تہذیب نہیں بلکہ وہ چند خوبیاں ہیں جنھیں انھوں نے اپنا لیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے اس بنا پر ترقی نہیں کی کہ وہ کلبوں میں ڈانس کرتے ہیں، شراب پیتے ہیں اور عریاں لباس پہنتے ہیں بلکہ مسلسل ریاضت، عدیم المثال احساس ذمہ داری اور بے پناہ حب الوطنی نے انہیں شاہراہ ترقی پر لا کھڑا کیا ہے لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ ہم ریاضت اور احساس ذمہ داری کی خوبیاں پیدا کرنے کے بجائے مغربی تہذیب کے سطحی مظاہر کو اپنا لیتے ہیں، ترکی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ مغربی تہذیب کی تقلید میں، اس میں ڈانس کرنے والے افراد تو پیدا ہو گئے لیکن یہ قوم ایٹم بم نہ بنا سکی۔"

.... میں نے طلبہ کے بارے میں سوال کیا۔

"ڈاکٹر صاحب، ہمارے طلبہ غیر ذمہ دار اور شورش پسند کیوں بنتے جا رہے ہیں؟"

اس لیے کہ ہمارا پورا معاشرہ غیر ذمہ دار اور شورش پسند ہے۔ معاشرے کا طلبہ پر گہرا اثر ہوتا ہے یہ ناممکن ہے کہ بگڑے ہوئے معاشرے میں ذمہ دار طلبہ پیدا ہوسکیں۔ اگر ہم اپنے تعلیمی اداروں سے فرض شناس جفاکش اور تعمیری ذہن رکھنے والے طلبہ پیدا کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں پہلے اپنے معاشرے کے ہر شعبے کو انہی خطوط پر ڈھالنا ہوگا۔

ایک تاثر کی وضاحت

سوال

آپ نے اپریل ۶۳ء کے اشارات کے اخیر میں جس تاثر کا اظہار کیا ہے اور جو سوالات اٹھائے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کے نزدیک جماعت اسلامی خدانخواستہ کسی نظری و عملی بحران سے دوچار ہے اور جماعت کے سوچنے والے ذہن کسی بڑے فکری انتشار میں مبتلا ہیں حالانکہ یہ بات مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ کہ آپ نے امیر جماعت کی تحریروں اور تقریروں کے حوالے دیکر آخر میں اپنے جس تاثر کا اظہار کیا ہے اس سے بھی کسی طرح کا خلجان پیدا ہوتا ہے۔

جواب

میں نے اشارات کے آخر میں جو کچھ لکھا ہے اس کی غرض صرف یہ ہے کہ ہم سب ان نکتوں کو سامنے رکھ کر اپنا جائزہ لیں جن کا ذکر اشارات کے آخری پیراگراف میں کیا گیا ہے اور جس تاثر کا اظہار میں نے کیا ہے وہ میرا ذاتی تاثر ہے اور عین ممکن ہے کہ اس میں شدت پیدا ہو گئی ہو۔

اس بات سے تو ہم میں کا کوئی شخص اختلاف نہیں کرے گا کہ نظم و ضبط، نصب العین پر استقامت، ایثار و قربانی، نظام حق سے محبت اور نظام باطل سے بیزاری و نفرت، اپنے مسلک و موقف پر پختہ یقین اور اس معاملے میں دوسرے لوگوں کی خواہشات کو قبول نہ کرنے کے عزم کو معیار بنا کر ہمیں اپنا جائزہ لینا چاہیے میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کی غرض بس یہی ہے۔

امیر محترم کے ارشادات نقل کرنے کے بعد اظہار تاثر سے خلجان نہ ہونا چاہیے۔ میرے اشارات ایک خط کا جواب ہیں۔ جواب دینے کی دو صورتیں تھیں۔ ایک یہ کہ خط کے ایک ایک جزو پر الگ الگ گفتگو کی جاتی اور دوسرے یہ کہ جماعت کے بنیادی نظریات و تصورات کو مکتوب نگار کے سامنے رکھ دیا جاتا کہ وہ خود ان میں اپنے خیال کا جواب پڑھ لیں۔ میں نے دوسری صورت اختیار کی ہے۔ اس کی غرض یہ ہے کہ مکتوب نگار کے علاوہ اور جیسے خیالات رکھنے والے لوگ بھی امیر محترم کے ارشادات کو سامنے رکھ کر اپنے خیالات کی اصلاح کر لیں اور موقف پر جمے رہیں جن کی تشریح ان ارشادات میں کی گئی ہے۔

سید احمد قادری

روداد مجلس شوریٰ

منعقدہ ۱۹ اپریل ۶۳ء

الحمدللہ کہ جماعت اسلامی ہند کی مجلس شوریٰ کا سالانہ اجلاس ۱۹ اپریل ۶۳ء مطابق ذوقعدہ ۸۲ء بعد نماز جمعہ مرکز جماعت اسلامی ہند واقع سوئی والان دہلی میں زیر صدارت مولانا ابواللیث صاحب ندوی اصلاحی منعقد ہوا۔ ارکان شوریٰ میں سے حسب ذیل افراد نے شرکت کی:-

۱۔ جناب کے سی عبداللہ صاحب (کیرلہ) ۲۔ مولانا شمس پیرزادہ صاحب (بمبئی) ۳۔ جناب انعام الرحمٰن خاں صاحب (بھوپال) ۴۔ مولانا نظام الدین صاحب اصلاحی (گورکھپور) ۵۔ مولانا حامد علی صاحب (دہلی) ۶۔ جناب محمد یوسف صاحب صدیقی (ٹونک) ۷۔ جناب انیس الدین احمد صاحب (چترپور) ۸۔ جناب محمد عبدالحی صاحب، ۹۔ جناب افضل حسین صاحب (رامپور) ۱۰۔ جناب محمد مسلم صاحب، ۱۱۔ جناب سید حامد حسین صاحب اور ۱۲۔ محمد یوسف قیم جماعت (دہلی)

مولانا محمد عزیز صاحب (آگرہ)، مولانا صدرالدین صاحب (رامپور) اور جناب وحیدالدین خاں صاحب اپنی مختلف معذوریوں کی وجہ سے شریک اجلاس نہ ہو سکے۔

گزشتہ اجلاس شوریٰ کی روداد کی خواندگی کے بعد مرکزی سالانہ رپورٹ اور مرکزی شعبہ جات کے حسابات مع رپورٹ آڈیٹر اجلاس میں پیش کی گئیں اور ان کو منظور کیا گیا۔

اجلاس میں ملک کے موجودہ حالات کا بھی جائزہ لیا گیا اور غور و فکر کے بعد اتفاق رائے سے ذیل کی قرارداد منظور کی گئی۔

(۱) مجلس شوریٰ نے چینی جارحیت اور اس سے پیدا شدہ حالات کا جائزہ لیا۔

مجلس کو اس بات پر اطمینان ہوا کہ اہل ملک اور ارباب حکومت نے چینی جارحیت کی سنگینی کو محسوس کیا اور پورا ملک اس مسئلہ سے نمٹنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ مسلمانان ہند نے اس مسئلے کے سلسلے میں جس سرگرمی کا اظہار کیا اور جماعت اسلامی

کے متوسلین نے اس معاملے میں جو کچھ کیا اس پر مجلس اطمینان کا اظہار کرتی ہے۔

اس اطمینان کے ساتھ مجلس شوریٰ اس بات کو تشویش کی نظر سے دیکھتی ہے کہ موجودہ نازک حالات میں جبکہ ملک کی آزادی کو خطرہ درپیش ہے ملک کے عوام وخاص نے عام طور پر متوقع اخلاقی بلندی کا ثبوت نہیں دیا اس کے برعکس چور بازاری، نفع اندوزی، عام اشیاء خصوصاً غذاؤں اور دواؤں میں آمیزش، آپس کی بے اعتمادی و بدگمانی، سیاسی اکھیڑ پچھاڑ اور اخلاقی پستی میں کوئی قابل ذکر کمی نہیں ہوئی۔ مجلس شوریٰ محسوس کرتی ہے کہ یہ چیزیں بیرونی حملے سے کم خطرناک نہیں ہیں اور بیرونی حملے کی صورت میں ان کی خطرناکی بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے

مجلس شوریٰ ملک کے تمام ہوشمند اور دردمند اصحاب سے اپیل کرتی ہے کہ وہ ان خرابیوں کے ازالے کی طرف خصوصی توجہ کریں۔ مجلس شوریٰ خیال کرتی ہے کہ اس سلسلے میں مسلمانانِ ہند کی ذمہ داری بہت زیادہ ہے کیونکہ ان کے پاس اسلام کی صورت میں تعمیر سیرت کا وہ بہترین پروگرام ہے جس کے مطابق زندگی کو سنوارنا اور جس سے اہل ملک کو متعارف کرانا ان کی دینی ذمہ داری بھی ہے۔

مجلسِ شوریٰ جماعت کے ارکان اور متفقین سے توقع رکھتی ہے کہ وہ اس اہم ترین مسئلے کے سلسلے میں اپنی ذمہ داری کو پوری طرح محسوس کریں گے اور خدا پرستی اور اخلاقی اقدار کو ملک میں زیادہ سے زیادہ فروغ دینے کی کوشش کریں گے کہ اس طرح اہل ملک کا کردار بلند اور مستحکم ہوسکے گا اور کسی بیرونی خطرے کا پامردی سے مقابلہ کیا جاسکے گا۔

● گزشتہ دنوں پارلیمنٹ میں وزیر قانون نے جو رپورٹ پیش کی تھی اس میں اس بات کا ذکر تھا کہ مسلمانوں کے پرسنل لا میں اصلاحات کے لیے کسی کمیشن کا تقرر مرکزی حکومت کے پیش نظر ہے۔ چنانچہ مجلس نے مرکزی وزارت قانون کے اس اعلان پر تشویش اور تعجب کا اظہار کیا اور ذیل کی قرارداد بالاتفاق منظور کی۔

(۳) مرکزی وزارت قانون نے مسلم پرسنل لا میں اصلاحات کے لیے ایک کمیشن کے تقرر کا اعلان کیا ہے مجلس شوریٰ جماعت اسلامی ہند مسلم پرسنل لا میں اصلاحات کے لیے کسی کمیشن کے تقرر کو مندرجہ ذیل اسباب کی بنا پر غلط اور خطرناک قرار دیتی ہے۔

۱۔ مسلمانوں کا پرسنل لا ان کے دین و شریعت کا ایک اہم جزو ہے اس لیے اس میں مداخلت کا ارادہ کرنا غلط نتائج کا موجب ہوگا۔

۲۔ بعض مسلمان ملکوں میں جہاں شرعی آداب و حدود کا کسی نہ کسی حد تک لحاظ رکھا جانا ممکن ہے مسلم پرسنل لا

کے اندر جو اصلاحات تجویز کی گئی ہیں وہ ہرگز اس قابل نہیں ہیں کہ انہیں بطور مثال سامنے رکھا جا سکے۔ یہ نام نہاد اصلاحات کسی درجہ میں بھی مفید ہونے کی بجائے وہاں کے اربابِ اقتدار اور عام آبادی میں کشمکش اور انتشار کا موجب بن گئی ہیں اس لیے وہاں کے کسی اقدام کی نقل میں ہندستان میں ایسا کوئی قدم اٹھانا تدبر اور ہوشمندی کے خلاف ہے۔

ان اسباب کی بنا پر مجلس شوریٰ حکومت ہند سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ مسلم پرسنل لا میں ترمیم کے لیے کمیشن کی تجویز واپس لے لے۔ مجلس شوریٰ ہندستان کی تمام مسلم جماعتوں سے بھی اپیل کرتی ہے کہ وہ حکومت کو اس کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کریں۔

مجلس شوریٰ کو یہ بھی احساس ہے کہ اسلام کے معاشرتی قوانین کی حکمتوں اور مصلحتوں سے ناواقفیت اور کچھ مسلمانوں کا غیر شرعی طرز عمل بھی اس طرح کی تجویزوں کا اصل محرک بنتا ہے اس لیے مجلس شوریٰ اس بات کی بشدت ضرورت محسوس کرتی ہے کہ ایک طرف اس بات کی کوشش کی جائے کہ لوگ اسلامی قوانین معاشرت کی حکمتوں کو صحیح طور سے سمجھ سکیں اور دوسری طرف مسلمانوں کی زندگی کو شریعت کا پابند بنانے کی کوشش کی جائے جو دوسروں کے لیے بھی نمونہ بن سکے۔

تعدد ازدواج پر پابندی عائد کرنے کی غرض سے مہاراشٹر اسمبلی میں جو بل ایک مسلمان ممبر اسمبلی کی جانب سے گزشتہ دنوں پیش کیا گیا تھا اس کا مجلس نے تفصیل سے مطالعہ کیا اور اس کے منظور ہو جانے کی صورت میں مسلمانوں کے معاشرے پر جو مضر اثرات مرتب ہو سکتے ہیں ان کا جائزہ لیا اور متفقہ طور پر ذیل کی

(۳) تعدد ازدواج پر پابندی عائد کرنے کی غرض سے ایک بل مہاراشٹر اسمبلی میں پیش ہو چکا ہے اور بدقسمتی سے اس کو پیش کرنے والے ایک مسلمان ممبر ہی ہیں۔ اس بل کا مقصد ایک سے زائد شادی کرنے پر کلی امتناع عائد کرنا ہے جس کی خلاف ورزی کے لیے سات سال قید و جرمانہ کی سزا تجویز کی گئی ہے اس بل کے سلسلے میں سفارشات پیش کرنے کے لیے حکومت کی طرف سے ایک کمیٹی بھی تشکیل دی گئی ہے۔

مجلس شوریٰ کی نظر میں مسلمانوں کے پرسنل لا میں تبدیلی کی یہ کوشش سخت خطرناک اور قابل احتجاج ہے تعدد ازدواج کی اجازت جو قرآن نے دی ہے اس پر قانونی پابندیاں عائد کرنا صریحاً مداخلت فی الدین ہے خواہ اس کا ارتکاب سیکولر اسٹیٹ کرے یا مسلم اسٹیٹ اور خواہ اس کی تحریک کسی غیر مسلم کی طرف سے ہو یا مسلمان کی طرف سے۔ مجلس کی نظر میں اس کا ایک خطرناک پہلو یہ بھی ہے کہ ایک مرتبہ مسلمانوں کے پرسنل لا میں ترمیم کا دروازہ کھل گیا تو پوری شریعت اس کی زد میں آ جائے گی اور مغرب زدہ طبقہ کو اپنی من مانی کرنے کا پورا موقع مل جائے گا۔

مجلس کا احساس یہ بھی ہے کہ اس طرح کے مسائل پر ایمرجنسی کے حالات میں غور کرنا اور احتجاج کو دعوت دینا حکمت اور دانشمندی کے سراسر خلاف ہے [illegible] پیش شدہ بل کو واپس لے لیا جائے اور جو کمیٹی اس

کے لیے بنائی گئی ہے وہ اس بل کو رد کر دے۔ مجلس شوریٰ مہاراشٹر اسمبلی کے ممبران، دینی جماعتوں اور مسلمانوں کے سربراہوں سے خاص طور سے اپیل کرتی ہے کہ وہ مداخلت فی الدین کی اس کوشش کے خلاف مؤثر آواز اٹھائیں۔

- اکتوبر ۱۹۶۲ء کے آخری ہفتہ میں امیر جماعت کی صدارت میں بعض قریبی ارکان شوریٰ کے اجلاس میں جیپنی جامعہ کے سلسلے میں جو قرارداد منظور ہوئی تھی اس کی بالاتفاق مجلس شوریٰ نے توثیق کی۔

- تنظیمی حلقوں پر نظرِ ثانی کا مسئلہ بھی زیرِ غور آیا۔ چنانچہ حلقوں کے ردوبدل کے سلسلے میں ارکان شوریٰ نے امیر محترم کو کچھ مشورے بھی دیے جن کو نوٹ کر لیا گیا۔

- ارکانِ شوریٰ اور بعض ارکان کی تجاویز بھی زیرِ غور آئیں۔

- آخر میں مرکزی بجٹ بابت جون ۶۳ء تا مئی ۶۴ء زیرِ غور آیا اور اللہ پر توکل و اعتماد کرتے ہوئے اسے منظور کیا گیا۔ بجٹ کی متوقع آمدنی -/63,500 اور متوقع خرچ -/79,200 ہے۔ اس طرح خسارہ -/15,700 ہوتا ہے جس کو رفقاءِ جماعت سے قرض لے کر پورا کیا جائے گا۔

اس کے بعد دعا پر اجلاس کی کارروائی ختم ہوئی۔ • محمد یوسف

تنقید و تبصرہ

انتظار — از اسعد گیلانی۔ صفحات ۱۱۲ قیمت ایک روپیہ۔ ناشر:- آزاد بک ڈپو۔ بلاک ۲ سرگودھا، مغربی پاکستان۔

یہ جناب اسعد گیلانی کے دس مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کے بارے میں انہوں نے حرفِ اول میں لکھا ہے:-

یہ مجموعہ میرے ان مضامین پر مشتمل ہے جو میں نے اپنے مقصدِ زندگی کو زندہ و تابندہ رکھنے کے لیے لکھے ہیں، وہ جذبہ جو مومن کے دل کو اپنے مقصدِ زندگی کے لیے پیہم تڑپتے رہنے کے لیے آمادہ مجبور کرتا ہے اسی کو انگیخت کرنا ان مضامین کا مقصدِ نگارش ہے۔ وہ شعلہ اگر بھڑکتا رہے تو پھر سب کچھ میسر ہے وہ اگر سرد ہو جائے تو پھر سب کچھ چھن گیا۔

پاس اگر تو نہیں شہر ہے ویراں تمام   تو ہے تو آباد ہیں اجڑے ہوئے کاخ و کو

اگر کسی قاری کے دل میں تحریکِ اسلامی کی کامیابی اور غلبۂ اسلام کی لگن موجود ہے، اس کے گوشۂ دل میں کہیں محبتِ الٰہی کی کوئی رمق باقی ہے تو تبصرہ نگار کو توقع ہے کہ وہ اس آگ کی آنچ ضرور محسوس کرے گا جو ان مضامین میں جلائی گئی ہے۔

کتاب میں کہیں کہیں زبان و بیان کی خامی اور کتابت کی غلطی بھی موجود ہے۔

راہِ عمل کا قرآن نمبر — مرتب سید عبدالرزاق قادری۔ اس نمبر کی قیمت ایک روپیہ ملنے کا پتہ:- دفتر راہِ عمل ۲۷، ۹ محلہ کشن گنج۔ دہلی۔

"راہِ عمل" پر تبصرہ "زندگی" میں شائع ہو چکا ہے۔ اب اس نے قرآن نمبر شائع کیا ہے۔ مرتب نے اس میں قرآن کریم سے متعلق چند اچھے مضامین جمع کر دیے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے علاوہ مولانا جلال الدین انصر عمری مولانا ضیاء الدین اصلاحی اور جناب محمد فاروق خاں صاحب کے مضامین پڑھنے کے لائق ہیں۔ کوثر اعظمی صاحب

کی ایک نظم دولت قرآن بھی اس میں ہے

جماعت اسلامی پاکستان کا جمہوری اور شورائی نظام

یہ ۴۴ صفحات کا ایک مختصر پمفلٹ ہے جسے اسعد گیلانی نے مرتب کیا اور شعبۂ نشر و اشاعت جماعت اسلامی حلقہ سرگودھا نے شائع کیا ہے۔ چونکہ پاکستان میں جمہوریت کے قیام کے لیے وہاں کی جماعت اسلامی، سرگرمی سے کام کر رہی ہے اس لیے اس کوشش کو ناکام بنانا وہاں کی حکمراں ٹولی ضروری سمجھتی ہے۔ اسی مقصد کے پیش نظر یہ بات پھیلائی گئی کہ خود جماعت کی تنظیم میں جمہوریت موجود نہیں ہے۔ یعنی جو لوگ خود اپنی تنظیم میں جمہوریت قائم نہیں کرتے وہ پورے ملک میں کسی اور غرض سے جمہوریت کے قیام کا ہنگامہ اٹھا رہے ہیں۔ یہ چھوٹا سا پمفلٹ، انصاف پسندوں کے لیے اس الزام کا تسلی بخش جواب ہے۔ جناب اسعد گیلانی نے اچھی ترتیب کے ساتھ یہ پمفلٹ مرتب کیا ہے۔ جماعت اسلامی کی تنظیم کو سمجھنے کے لیے یہ بہت اچھی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ راقم کا خیال ہے کہ خود جماعت کے عام کارکن بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ قیمت درج نہیں۔ دفتر جماعت اسلامی سرگودھا مغربی پاکستان سے یہ پمفلٹ طلب کیا جا سکتا ہے۔ (ع ق)

ندائے ملت لکھنؤ کا سالنامہ

ادارہ عتیق الرحمٰن سنبھلی۔ محمد آصف قدوائی۔ صفحات ۱۰۸۔ ٹائٹل دیدہ زیب۔ قیمت ایک روپیہ پچاس نئے پیسے۔ ملنے کا پتہ، دفتر ندائے ملت۔ باغ گونگے نواب۔ امین آباد لکھنؤ

لکھنؤ کے ہفتہ وار ندائے ملت نے ایک سال کی مدت میں جو مقبولیت حاصل کر لی ہے وہ بہت کم اخبار و رسائل کو نصیب ہوتی ہے۔ اور اب اس نے ایک سال پورا کر کے اپنا شایان شان سالنامہ شائع کیا ہے۔ سنجیدہ، ٹھوس اور فکر انگیز مقالات کے ساتھ ادب و شعر اور طنز و مزاح کی چاشنی بھی موجود ہے۔

سنجیدہ ذوق رکھنے والوں کے لیے اس میں کافی قیمتی سامان مطالعہ و استفادہ جمع کیا گیا ہے اور امید ہے کہ یہ سالنامہ ہاتھوں ہاتھ نکل جائے گا۔ (ع۔ق)

پرویز کے بارے میں علماء کا متفقہ فتویٰ مع اضافاتِ جدید

شائع کردہ: شعبۂ تصنیف مدرسۂ عربیہ اسلامیہ نیو ٹاؤن کراچی ۵ صفحات ۲۵۶ قیمت قسم اعلیٰ تین روپے قسم دوم دو روپے

چودھری غلام احمد پرویز کی صریح گمراہی عبرت انگیز ہے۔ ایک زمانہ وہ بھی گزرا کہ پرویز صاحب منکرینِ حدیث کے مقابلے میں حدیث کا دفاع کرتے تھے اور اس کی حجیت ثابت کرتے تھے، پھر ان کا ذہن پلٹا اور خود منکرین حدیث کی صف میں جا پہنچے، پھر وہ اسی حد پر نہ رکے بلکہ انھوں نے شیطان کو اپنے دل و دماغ پر پوری طرح چھا جانے کا موقع دے دیا اور انکارِ حدیث سے آگے بڑھ کر تحریفِ قرآن کا پرچم لہرانے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں جو عقل عطا کی تھی اور اردو لکھنے کا جو ڈھنگ سکھایا تھا اب وہ اسے عقائدِ اسلامی کو منہدم کرنے میں استعمال کر رہے ہیں اور وہ مسلمانوں کے لیے ایک فتنہ بنے ہوئے ہیں۔ مرزا غلام احمد قادیانی کی جھوٹی نبوت انگریزوں کے ظلِ عاطفت میں پھلی پھولی اور چودھری غلام احمد پرویز کا فتنۂ الحاد انگریزوں کی شاگرد حکومت کے ظلِ عاطفت میں پھیل رہا ہے۔ اس شخص کے بارے میں علماء کا متفقہ فتویٰ پہلے شائع ہو چکا ہے اور اب نئے اضافات کے ساتھ اسے شائع کیا گیا ہے۔ ابتداء میں مولانا محمد منظور نعمانی مدیر الفرقان لکھنؤ کی موثر اور بصیرت افروز تحریر شائع کی گئی ہے۔ آخر میں ۱۲۲ سے ۲۵۵ تک ممالک اسلامیہ کے علماء کے جوابات ہیں اور استفتاء اور جواب استفتاء کا عربی متن شائع کیا گیا ہے۔ ص۱۲۱ سے ص۲۲ تک ایک ہزار ستائیس علماء کے دستخط شائع کیے گئے ہیں۔

یہ کتاب فتنۂ پرویزی کو سمجھنے کے لیے ایک مستند ماخذ بن گئی ہے۔ امید ہے کہ اہلِ حق اسے بالخصوص ان حلقوں میں پہنچانے کی کوشش کریں گے جو اس فتنے سے متاثر ہیں۔ (ع۔ق)

تواریخ عجیب المعروف بہ کالا پانی

تالیف مولوی محمد جعفر تھانیسری۔ مرتبہ: محمد ایوب قادری صفحات ۳۰۴ مجلد مع گرد پوش قیمت چار روپے پچاس پیسے

ملنے کا پتہ: پاک اکیڈمی ۱/۱۴۱ وحید آباد۔ کراچی ۱۸ پاکستان

شروع میں اس کتاب کا "تعارف" جناب ڈاکٹر محمود حسین صاحب وائس چانسلر ڈھاکہ یونیورسٹی کے قلم سے ہے۔ اپنے انتہائی مختصر تعارف کے آخر میں انھوں نے لکھا ہے۔

"یوں تو کالا پانی کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ خود میری نظر سے کم از کم تین ایڈیشن گزر چکے ہیں مگر محمد ایوب

قادری صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس پر حواشی اور مقدمہ لکھ کر نہایت سلیقہ کے ساتھ کتاب کو از سرِ نو مرتب کیا ہے اور اس طرح تاریخ کی ایک بڑی خدمت انجام دی ہے۔
تبصرہ نگار کو اس بات سے پورا اتفاق ہے کہ جناب محمد ایوب قادری صاحب نے یہ ایک قابل قدر تاریخی خدمت انجام دی ہے۔ ان کے مقدمے اور حواشی کے بغیر اس کتاب سے پورا استفادہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کتاب کو جدید انداز میں مرتب کر کے انھوں نے اسے بہت مفید بنا دیا ہے۔ سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک اسلامی ایک ایسی قیمتی متاع ہے جس پر ہند و پاک کے مسلمان جس قدر فخر کریں کم ہے۔ بحمد اللہ اب اس تحریک کی تفصیلات پر اردو میں کافی کام ہو چکا ہے لیکن یہ تحریک ان تحریکوں میں تھی جن پر کام رکتا نہیں جاری رہتا ہے۔ ہر آئندہ نسل گزشتہ کی وارث ہوتی ہے اور اسے اپنے سینے سے لگائے رکھتی ہے۔ جو لوگ ہند و پاک میں اسلام کو سربلند کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے تو ناگزیر ہے کہ اس تحریک سے واقف ہوں خصوصیت کے ساتھ اس تحریک کے کارکنوں نے جس ایمان و یقین اور جس سیرت و کردار اور جس قابلیت و صلاحیت کا مظاہرہ کیا تھا اس سے واقفیت اور سبق اندوزی تو ہر اس شخص کے لیے ضروری ہے جو یہاں اقامت دین کا کام کرنا چاہتا ہے۔ اس کتاب کے مؤلف مولوی جعفر تھانیسری بھی سید شہید کی تحریک احیائے دین کے ایک کارکن تھے۔ دنیاوی معاملات میں بھی ان کی صلاحیت و قابلیت کی تفصیل جان کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔ امید ہے کہ اس کتاب سے لوگ استفادہ کریں گے اور مرتب کتاب کی محنت کی داد دیں گے۔

(ع۔ق)

پاندان والی خالہ

جناب تخلص بھوپالی صفحات ۲۸۰ کتابت طباعت بہتر، مجلد مع گرد پوش۔ قیمت دو روپے پچھتر نئے پیسے۔ ناشر:۔ پنج بھون پبلیکیشنز۔ جہانگیر آباد۔ بھوپال۔

سنجیدہ اور لطیف طنز و مزاح کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ اس سے ہماری زندگی میں فرحت و انبساط پیدا ہوتا ہے اور دوسرا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ اصلاح و تعمیر کے مفید کام انجام پاتے ہیں۔ کونین سے ملیریا بخار دور ہوتا ہے لیکن وہ اس قدر تلخ ہے کہ اس کو فرو حلق کرنا ایک ناگوار کام بن جاتا ہے اور اگر اس میں شکر لپیٹ دی جائے تو وہ ناگواری کے بغیر کھالی جاتی ہے اور فائدہ وہی ہوتا ہے جو ناگواری کے ساتھ کھانے سے ہوتا۔ طنز و مزاح سے تعمیر پسند ادیب شکر میں لپٹی ہوئی کونین کا کام لیتے ہیں۔ راقم الحروف تخلص بھوپالی صاحب سے واقف نہ تھا۔ پنج بھون (جو اب مرحوم ہو چکا ہے) سے واقفیت ہوئی۔ جب پنج میرے پاس پہنچتا تھا تو میں سب سے پہلے "پاندان والی خالہ"

رہتا تھا۔ زیر تبصرہ کتاب اسی عنوان کے طنز و مزاح کا پہلا حصہ ہے مخلص صاحب کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے طنز و مزاح کو لطف و تفریح اور افادیت کے ساتھ "عبرت" بھی بنا دیا ہے۔

یہ بات تو میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کے تمام اجزا سنجیدگی اور وقار کے معیار پر پورے اترتے ہیں لیکن اس کتاب کا بڑا حصہ بہت ہی دلچسپ اور عبرت انگیز ہے۔ بہت کچھ یکسانیت کے باوجود انھوں نے مضامین میں تنوع پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس کتاب کی ابتدا میں شہزادی گوہر تاج عابدہ سلطان بیگم صاحبہ کا پیغام اور محمد مسلم صاحب مدیر دعوت دہلی کا پیش لفظ ہے۔ شہزادی صاحبہ اس کتاب کی اہمیت کے بارے میں لکھتی ہیں:۔

"کیونکہ بھوپال کی خواتین کی زبان، تمدن اور تاریخ کی وہ بھولی ہوئی یادگار جو ہم جیسے ماضی پرستوں کے بعد اس طرح معدوم ہو جائیں گی کہ ان سے واقفیت اور نسبت رکھنے والوں کو تلاش کرنا بھی ناممکن ہو جائے گا اس لیے مخلص صاحب دورِ ماضی کے اس پہلو کو کتابی شکل دے کر اس طرح محفوظ کر رہے ہیں جو ادبی حیثیت کے علاوہ تاریخ کے دلپذیر اوراق میں بھی رنگینی پیدا کرنے والا کارنامہ سمجھا جا سکتا ہے۔"

مسلم صاحب نے بھی اس کتاب کی متعدد خصوصیات کی طرف توجہ دلائی ہے۔ امید ہے کہ عوام کے علاوہ ادبی حلقوں کے حلقے میں بھی یہ کتاب مقبول ہوگی۔ (ع۔ ق)

بقیہ صفحہ ۳۵) بھر دیا ہے لیکن بہت سے خطے اب بھی ایسے پڑے ہیں جنھیں کسی نے چھوا تک نہیں۔ رسول اللہ نے تو فرمایا تھا: "اُطْلُبُوا الرِّزْقَ فِي خَبَايَا الْأَرْضِ" (رزق کو زمین کی پنہائیوں میں تلاش کرو) حکومت ہند نے کچھ توجہ تو اس طرف دی ہے جس کے نتیجے میں یہاں ایٹمی توانائیوں کا کام شروع کر دیا گیا ہے لیکن مزید ضرورت ہے کہ ان دور افتادہ خطوں میں بڑے پیمانے پر سڑکیں تعمیر ہوں اور بڑھتی ہوئی آبادی کا ایک معتد بہ حصہ منتقل ہو جائے۔

ایک کام یہ کیا جا سکتا ہے کہ بڑے بڑے شہروں اور کارخانوں کے قرب و جوار میں بیس تیس میل کی دوری پر بنجر علاقوں میں لوگ آباد کر دیے جائیں۔ اور انھیں مضافاتی ٹرینوں کے ذریعہ شہروں سے ملا دیا جائے۔ مثلاً آج جاپان کے ٹوکیو شہر جہاں روزگار کی حالت اچھی ہے۔ جس کی آبادی ایک کروڑ کے قریب ہے لیکن روز دن کے وقت شہر میں باہر سے تقریباً ۲ لاکھ افراد آ جاتے ہیں۔

اگر عالمی پیمانے پر مصالحت ہو جائے تو جس طرح صنعتوں کا تیار کردہ سامان نئی نئی منڈیوں میں منتقل ہوتا رہتا ہے

ی طرح بڑھتی ہوئی آبادی بھی ایسے ممالک کو منتقل کی جا سکتی ہے جہاں ان کی آبادکاری کی کافی گنجائش ہو۔ مثلاً
سٹریلیا کا رقبہ ہندستان سے کہیں زیادہ ہے لیکن آبادی صرف ۹۰ لاکھ ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ بہت خوش حال
لاقہ ہو۔ کیا کروڑوں آدمیوں کو وہاں بآسانی بسایا نہیں جا سکتا؟ لیکن جب کالے اور گورے، ملکی و غیر ملکی نسل
ور زبان کا سوال اٹھ کھڑا ہو تو پھر کیسے یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے؟ اسلام نے عربی و عجمی کی تفریق مٹا دی۔ آدم و حوا کی اولاد
ی حیثیت سے سارے انسان بھائی بھائی ہیں اور کنگھی کے دندانے کی طرح سب برابر ہیں۔ اخوت و ہمدردی کا یہی جذبہ
تھا جو حبش کے بلالؓ، روم کے صہیبؓ اور فارس کے سلمانؓ رسول اللہؐ کی صحبت میں اکٹھا تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہجرت
کے بعد مدینہ میں مواخاۃ کے ذریعہ مہاجرین کی آبادکاری کا مسئلہ آناً فاناً بلا صرفہ کے حل ہو گیا۔ یہاں تک کہ انصار
نے مہاجرین کو نہ صرف اپنا بھائی مان لیا بلکہ جائداد تقسیم کر کے دے دی۔ (باقی)

بقیہ اشارات) باقی رہی یہ بات کہ وہ ان نظریات پر تنقید برداشت نہیں کریں گے تو اس کی پروا نہیں کرنی چاہیے اولوالعزمی ہر طرح کی قربانی برداشت کرنی چاہیے۔ اس کے بغیر نہ داعیانہ منصب کا حق ادا ہو سکتا ہے اور نہ دعوت کامیاب ہو سکتی ہے۔

اب اگر پہلا گروہ دوسرے گروہ کو "غیر معتدل" اور اپنے آپ کو "معتدل" کہتا ہے تو وہ اس لفظ کا استعمال برمحل نہیں کر رہا ہے۔ وہ اس طریقۂ دعوت پر بے اعتدالی کا الزام دھر رہا ہے جس سے قرآن کے صفحات بھرے ہوئے ہیں اور جو نہ صرف سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے "اسوۂ حسنہ" بلکہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام کے طریق دعوت کے مطابق ہے۔

اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ جب تک ہم عبادات، معاملات، اخلاق و کردار اور اسلامی سیاست کو اپنی عملی زندگی میں اس طرح اختیار نہ کریں گے جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمایا تھا تو ہم کبھی بھی اعتدال و توازن کے نقطۂ کمال تک نہیں پہنچ سکیں گے اور جب تک ہم ہر نقصان سے بے پروا ہو کر حق پر اس طرح نہیں جمیں گے جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم ثابت قدم رہے تھے تو پھر ہم استقامت حاصل نہیں کر سکیں گے اور جب تک اعتدال و استقامت حاصل نہ ہو نصب العین کا حصول بس ایک سہانا خواب ہے۔

فہرست مندرجات ماہنامہ "زندگی"

از جنوری سنہ ۱۹۶۳ء تا جون سنہ ۱۹۶۳ء

اشارات

نمبر شمار	لکھنے والے	موضوع بحث کا مختصر تعارف	جلد	شمارہ	مہینہ
۱	سید احمد قادری	بھارت پر چینی جارحیت کے خلاف ہمیں کیا کرنا چاہیے اور کیوں کرنا چاہیے؟	۳۰	۱	جنوری سنہ ۶۳ء
		جماعت اسلامی کو بعض مخالفین جنونیوں کی جماعت کیوں کہتے ہیں؟	"	۲	فروری سنہ ۶۳ء
		"بازمانہ بساز" اور "بازمانہ ستیز" کے نظریوں کا تجزیہ	"	۳	مارچ سنہ ۶۳ء
		جماعت اسلامی ہند کا ایک تاریخی جائزہ	"	۴	اپریل سنہ ۶۳ء
		اسوۂ ابراہیمی کی توضیح	"	۵	مئی سنہ ۶۳ء
		توازن و اعتدال	"	۶	جون سنہ ۶۳ء

ارشادات رسولؐ

نمبر شمار	شارح	مضمون احادیث	جلد	شمارہ	مہینہ
۱	سید احمد قادری	قتل کرنے میں بھی احسان کا حکم	۳۰	۲	فروری سنہ ۶۳ء
		ایمان و اسلام کے دنیوی صلے کی پیشکش	"	۳	مارچ سنہ ۶۳ء

مقالات

نمبر شمار	لکھنے والے	عنوانات	جلد	شمارہ	مہینہ
۱	سید احمد قادری	زکوٰۃ کا ایک جزئیہ (۲)	۳۰	۱	جنوری سنہ ۶۳ء

نمبر شمار	لکھنے والے	عنوانات	جلد	شمارہ	مہینہ
	سید احمد قادری	پراویڈنٹ فنڈ کی زکوٰۃ کا مسئلہ	۳۰	۲	فروری ۱۹۶۳ء
		ڈاڑھی کی مقدار کا مسئلہ	〃	۴	اپریل ۱۹۶۳ء
۲	مولانا جلال الدین عمری	قرآن کا تعارف	۳۰	۱	جنوری ۱۹۶۳ء
		قرآن کی انقلابی دعوت	〃	۲	فروری ۱۹۶۳ء
		منزل اور نشان منزل	〃	۳	مارچ ۱۹۶۳ء
		امر بالمعروف ونہی عن المنکر (۱)	〃	۴	اپریل ۱۹۶۳ء
		〃 〃 (۲)	〃	۵	مئی ۱۹۶۳ء
		〃 〃 (۳)	〃	۶	جون ۱۹۶۳ء
۳	مولانا صدر الدین اصلاحی	قرآن مجید کے کتاب الٰہی ہونے کا ثبوت (۱)	۳۰	۱	جنوری ۱۹۶۳ء
		〃 〃 (۲)	〃	۲	فروری ۱۹۶۳ء
۴	جناب عبد المغنی ایم اے	جدید و قدیم کا فریب	۳۰	۱	جنوری ۱۹۶۳ء
۵	جناب عبد الباری ایم اے	بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ اور اسلام (۱)	۳۰	۴	اپریل ۱۹۶۳ء
		〃 〃 (۲)	〃	۵	مئی ۱۹۶۳ء
		〃 〃 (۳)	〃	۶	جون ۱۹۶۳ء
۶	جناب محمد فاروق خاں	فطری نظام معیشت	۳۰	۶	جون ۱۹۶۳ء
۷	مولانا مجیب اللہ ندوی	نماز اور خشوع و خضوع (۱)	۳۰	۲	فروری ۱۹۶۳ء
		〃 (۲)	〃	۳	مارچ ۱۹۶۳ء
۸	جناب وحید الدین خاں	مسلمانوں سے	۳۰	۵	مئی ۱۹۶۳ء

تراجم واقتباسات

نمبر شمار	مترجم ومقتبس	عنوانات	جلد	شمارہ	مہینہ
۱	ادارہ	سیاسی مسئلہ (مولانا سید حامد علی صاحب کی ایک کتاب کا اقتباس)	۳۰	۳	مارچ ۱۹۶۳ء

نمبر شمار	مترجم و مقتبس	عنوانات	جلد	شمارہ	مہینہ
۲	ش۔ن عثمانی	عزت و وقار حاصل کرنے کی واحد راہ (مریم جمیلہ کے ایک مضمون کے ترجمہ)	۳۰	۵	مئی ۱۹۶۳ء
۳	مولانا عبدالقدیر مونگیری	زندگی بعد موت (علامہ ابن تیمیہ کے ایک مقالے کا ترجمہ)	۳۰	۱	جنوری ۱۹۶۳ء

اخبار و افکار

نمبر شمار	لکھنے والے	عنوانات	جلد	شمارہ	مہینہ
۱	ادارہ	جمعیۃ العلماء ہند کی صدارت	۳۰	۵	مئی ۱۹۶۳ء
۲	مولانا صدرالدین اصلاحی	عدم تشدد کا عقیدہ، عمل کی کسوٹی پر	۳۰	۱	جنوری ۱۹۶۳ء

رسائل و مسائل

نمبر شمار	جواب دینے والے	خطوط و سوالات کا موضوع	جلد	شمارہ	مہینہ
۱	مدیر	مقام تنعیم سے عمرے کا حکم	۳۰	۵	مئی ۱۹۶۳ء
	"	ایک تاثر کی وضاحت	۳۰	۶	جون ۱۹۶۳ء

روداد مجلس شوریٰ

نمبر شمار		عنوانات	جلد	شمارہ	مہینہ
۱	قیم جماعت اسلامی	روداد مجلس شوریٰ منعقدہ اپریل ۱۹۶۳ء	۳۰	۶	جون ۱۹۶۳ء

زندگی رامپور

جلد:۔ ۳۱
شمارہ:۔ ۱

جولائی ۱۹۶۳ء
صفر ۱۳۸۳ھ

مدیر:۔ سید احمد قادری

● خط و کتابت و ارسال زر کا پتہ:۔ منیجر ماہنامہ "زندگی" رامپور۔ یوپی
● زرِ سالانہ:۔ چھ روپے۔ ششماہی:۔ تین روپے۔ فی پرچہ:۔ پچاس نئے پیسے
● ممالکِ غیر سے:۔ دس شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر

پاکستانی اصحاب مندرجہ ذیل پتہ پر رقوم بھیجیں اور رسید ہمیں ارسال فرمائیں
منیجر ہفت روزہ شہاب ۱/۷ شاہ عالم مارکیٹ لاہور

مالک: جماعت اسلامی ہند۔ اڈیٹر: سید احمد عروج قادری۔ پرنٹر پبلشر:۔ احمد حسن۔ مطبع:۔ دہلی پرنٹنگ پریس بنگلہ آزاد خاں رامپور۔ یوپی
مقام اشاعت:۔ دفتر زندگی رامپور۔ یوپی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

(سید احمد قادری)

... ت میں مسلمانوں کے پرسنل لا میں مداخلت کا جو رجحان بڑھتا جا رہا ہے، وہ کوئی غیر متوقع چیز نہیں ہے۔ اس کا خطرہ بہت پہلے سے محسوس کیا جا رہا تھا اور جسٹس دھون کے دو فیصلوں کے بعد تو یہ اندیشہ بہت قوی ہو گیا تھا جنوری ۶۲ء میں انھوں نے تعدد ازدواج سے متعلق ایک مقدمے میں اسلام کے اس قانون پر ضرب لگائی تھی اور مئی ۶۲ء میں اسلام کے قانون حجاب کے خلاف فیصلہ دیا تھا اور اپنے دوسرے فیصلے میں تو انھوں نے یہ بات صاف طور پر لکھی تھی کہ حکومت محض سیاسی مصالح کی وجہ سے، پردے کے خلاف قانون نہیں بنا رہی ہے اس کے معنی یہ تھے کہ حکومت ہند کو جرأت کر کے پردے کے خلاف قانون بنوانا چاہیے۔ انھوں نے اپنے فیصلے میں لکھا تھا:۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ ریاست سیاسی مصلحتوں کی بنا پر بہت سے موجودہ سماجی رواج میں خل اندازی نہیں کرتی اور لوگوں کو مجبور نہیں کر سکتی کہ وہ خواتین کو پردے سے باہر لائیں جیسا پیٹر اعظم نے کیا تھا۔"

راقم الحروف نے اس نکتے پر اپنے مختصر تبصرے (زندگی جولائی ۶۲ء) میں اظہار خیال کیا تھا کہ گویا فاضل جج نے یہ بات کہی ہے کہ ریاست سیاسی مصلحتوں کی وجہ سے ابھی ایسا نہیں کر رہی ہے۔ "سیاسی مصلحتوں" کا رخ بدلتے ہی بہت سے سماجی رواج اور پردے کے خلاف قانون بھی بن جائے گا۔ پیٹر اعظم کی مثال دے کر انھوں نے اشارہ کیا تھا کہ حکومت ہند میں وہ جرأت ہونی چاہیے جو پیٹر اعظم میں تھی۔ چنانچہ اب صوبائی اور مرکزی حکومتوں نے مسلم پرسنل لا میں مداخلت کا اقدام کر دیا ہے اور اس اقدام کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اس کا موقع خود مسلمانوں نے بہم پہنچایا ہے مہاراشٹر اسمبلی میں تعدد ازدواج پر پابندی عائد کرنے کے لیے مسودۂ قانون ایک مسلمان نے پیش کیا ہے اور حکومت ہند نے مسلم پرسنل لا پر غور کرنے کے لیے جو کمیٹی بنائی ہے وہ بھی دو مسلمان ممبران پارلیمنٹ کے میمورنڈم کے بعد بنائی ہے

ہرکس از دستِ غیر نالہ کند سعدیؔ از دستِ خویشتن فریاد

تعدد ازدواج کو روکنے کے لیے بمبئی اسمبلی کے ممبر مسٹر علی حسن ہمدانی نے جو مسودۂ قانون پیش کیا ہے وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک عجیب و غریب مسودۂ قانون ہے۔ اس کو پڑھ کر کوئی معمولی پڑھا لکھا مسلمان بھی باور نہیں کر سکتا کہ یہ مسودہ کسی مسلمان نے مرتب کیا ہوگا بلکہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ کسی اور نے اس کو مرتب کیا ہے اور مسٹر علی حسن نے اس پر اپنے دستخط ثبت فرما دیے ہیں اور اگر فی الواقع انھوں نے خود مرتب کیا ہے تو دو باتوں میں ایک بات یقینی ہے، یا تو وہ اسلام کے معاشرتی قوانین سے بالکل ناواقف ہیں یا اسلام کی عائد کی ہوئی پابندی کو کافی نہیں سمجھتے اور اس کے لیے مہاراشٹر اسمبلی کی منظوری ضروری سمجھتے ہیں اس اجمال کی تفصیل مسودۂ قانون پر تبصرے میں آ رہی ہے۔ میں پہلے یہاں اس بل کا ترجمہ نقل کرتا ہوں:۔

مسلمانوں میں دو زوجگی روکنے کیلیے مسودۂ قانون

اغراض و مقاصد:۔ تعدد ازدواج کی اگرچہ مسلم پرسنل لا کے تحت اجازت دی گئی ہے لیکن وہ عملاً ترک کر دیا گیا ہے اور مسلم رائے عامہ یک زوجگی کی مؤید ہے۔ مسودہ قانون کی غرض اسی مقصد کو حاصل کرنا ہے۔ ضمناً اس کا مقصد مسلمان خواتین کو بھی سہولت بہم پہنچانا ہے جن کے خاوند اس بل کے نفاذ کے وقت ایک سے زیادہ بیویاں رکھتے ہوں۔

ہرگاہ کہ مسلمانوں میں دو زوجگی کو روکنا ضروری ہے اس لیے جمہوریۂ ہند کے تیرھویں برس مندرجہ ذیل قانون نافذ کیا جاتا ہے۔

یہ قانون مہاراشٹر قانون انسداد دو زوجگی برائے مسلمانان ۱۹۶۲ء کہلائے گا۔

(۱) اس کا اطلاق پوری ریاست مہاراشٹر پر ہوگا۔

(۲) اس قانون کا اطلاق صرف مسلمانوں پر ہوگا۔

(۳) اس قانون کی اصلاحات میں جب تک کہ کوئی بات مضمون یا متن کے متضاد نہ ہو مقصد یہ ہے۔

(الف) دو زوجگی کی شادی

دو زوجگی کی شادی کا مقصد بیوی یا شوہر کا اپنے زوج کی موجودگی میں نکاح کرنا ہے۔ بشرطیکہ ایسے مرد

یا عورت کی اس کی بیوی یا شوہر سے نکاح کو کسی با اختیار عدالت نے ناجائز قرار نہ دیا ہو یا خلع نہ کرا دی ہو یا وہ رسم و رواج کے اعتبار سے جائز نہ ہوا ہو اس میں وہ شادی شامل نہیں ہے جو کسی نے اپنے زوج کی زندگی میں اس وقت کی ہو جب کہ متعلقہ زوج سات سال تک مسلسل مفقود الخبر ہوا ور اس کی زندگی کے بارے میں کوئی خبر نہ سنی گئی ہو۔ البتہ ایسے شخص کو اپنی شادی سے پہلے واقعات کی صحیح صورت حال سے اس مرد یا عورت کو واقف کر دینا ہو گا جس سے اس کی شادی ہو رہی ہے ۔

(ب) مسلم سے وہ شخص مراد ہے جو مذہب اسلام کا ماننے والا ہو۔

(ج) نابالغ سے وہ شخص مراد ہے جس کی عمر ۱۶ سال سے کم ہے ۔

(۴) عام اس سے کہ کوئی قانون یا رسم و رواج اس کے منافی ہو دو زوجگی کی شادی باطل قرار دی جائے گی ،

(الف) اگر وہ اس قانون کے نفاذ کے بعد اس ریاست میں انجام دی گئی ہو ۔(ب) اگر وہ شادی اس قانون کے نفاذ کے بعد ریاست کے حدود سے باہر انجام پائی ہو مگر زوجین میں سے ایک یا دونوں اس ریاست میں رہتے ہوں ۔

(۵) عام اس سے کہ قانون تنسیخ نکاح مسلمین ۱۹۳۹ء (قانون ۸ ۱۹۳۹ء) کی دفعہ ۲ میں کوئی امر موجود ہو۔ ایک عورت جس کی مسلم قانون کے تحت شادی انجام پائی ہو اس بات کی حقدار ہو گی کہ اس قانون کے نفاذ کے وقت اس کے شوہر کی ایک سے زیادہ بیوی موجود ہو تو وہ خلع حاصل کر سکتی ہے ۔

(۶) عام اس سے کہ کوئی قانون رسم یا رواج اس کے متضاد ہو۔ اگر نابالغ کے علاوہ کوئی فرد ایک زوج کی موجودگی میں دوسری شادی کرتا ہے یا کرتی ہے (جو دفعہ ۴ کی رو سے باطل ہے) اس پر مقدمہ چلا کر سات سال تک کی سزا دی جا سکتی ہے نیز جرمانہ بھی کیا جا سکتا ہے ۔

(۷) جو شخص بھی اس ریاست میں دوسرے نکاح کی رسم انجام دے گا یا اس میں اعانت کرے گا اس پر مقدمہ چلا کر کسی بھی نوع کی سزا دی جا سکتی ہے جس کی مدت ۶ ماہ تک ہوا ور اس پر جرمانہ بھی کیا جا سکتا ہے الا یہ کہ وہ اس بات کا ثبوت پیش کرے کہ اس کے پاس یہ یقین کرنے کے معقول وجوہ موجود تھے کہ یہ نکاح دوسرا نہیں ہے ۔

(۸) ۱۔ جب کوئی نابالغ دوسری شادی کرے جو دفعہ ۴ کی رو سے باطل ہے تو جو شخص اس نابالغ کا نگراں ہو خواہ وہ والدین میں سے ہو یا سرپرست یا کوئی اور نیز قانونی طور پر ولی ہو یا نہ ہو ایسی شادی کو انجام دینے کے سلسلے میں اقدام کرنے یا اسے انجام دینے کی اجازت دینے یا غفلت و تساہل سے ایسی شادی کو روکنے میں ناکام رہنے پر اس پر مقدمہ چلا کر کسی بھی نوع کی سزا دی جا سکتی ہے جس کی مدت ۶ ماہ تک ہو سکتی ہے یا جرمانہ کیا جا سکتا ہے ۔

یا سزا اور جرمانہ دونوں ۔

(۲) اس دفعہ کے تحت سمجھا جائے گا (الا یہ کہ اس کے خلاف ثبوت بہم پہنچایا جائے) کہ جہاں کسی نابالغ کی دوسری شادی انجام پائی ہے جو دفعہ ۴ کی رو سے باطل ہے۔ اسے نابالغ کا سرپرست خواہ وہ والدین میں سے ہو یا سرپرستوں میں سے یا قانونی یا اس کے علاوہ ولی ہو اپنی غفلت سے نکاح کو روکنے میں ناکام رہا ہے ۔

۹ ۔ ہر درخواست جو اس قانون کی دفعہ ۵ کے تحت دی جائے اسے ایسے ڈسٹرکٹ کورٹ میں جس کے دائرۂ اثر میں جائے نکاح واقع ہو یا جہاں خاوند اور بیوی رہتے ہوں یا آخر میں رہتے تھے پیش کیا جائے گا ۔

۱۰ ۔ عام اس سے کہ کوئی امر ضابطہ فوجداری ۱۸۹۸ء میں شامل ہو دفعات ۶ ۔ ۷ یا ۸ کے تحت ہر الزام کی سماعت پریسیڈنسی مجسٹریٹ یا جوڈیشیل مجسٹریٹ کی عدالت میں ہوگی ۔

۱۱ ۔ اس قانون کے تحت آنے والی تمام خلاف ورزیاں قابل سماعت قرار دی جائیں گی ۔

(اخبار دعوت دہلی، ۲۸ ۔ اپریل ۶۳ء)

سب سے پہلے یہ دیکھیے کہ یہ قانون صرف مسلمانوں کے لیے ہوگا اور یہ تخصیص بڑی تاکید کے ساتھ کی گئی ہے۔ اس قانون کے نام میں تو تخصیص تھی ہی لیکن اسے کافی نہیں سمجھا گیا اور ایک مستقل دفعہ میں کہا گیا کہ " اس قانون کا اطلاق صرف مسلمانوں پر ہوگا " شاید یہ تاکید اس لیے برتی گئی ہے کہ کہیں اس کی زد میں غیر مسلموں کے وہ فرقے نہ آجائیں جن میں دو زوجگی عملاً جاری ہے اور یہ کام ایک مسلمان کے دستخط سے کرایا جارہا ہے تاکہ یہ شبہہ نہ ہو کہ اس قانون کا مقصد بھارت میں مسلمانوں کی تعداد کم کرنا ہے یا ان کی معاشرتی حق تلفی پیش نظر ہے ۔

اب اغراض و مقاصد کا مطالعہ کیجیے۔ یہ تضاد بیانی اور مرتب مسودہ کے اضطراب ذہنی کا ایک نمونہ ہے ۔ ابتدا میں کہا گیا ہے کہ مسلم پرسنل لا میں تعدد ازدواج کی اجازت ہے تو سہی لیکن اسے نہ صرف یہ کہ عملاً ترک کر دیا گیا بلکہ مسلم رائے عامہ یک زوجگی ہی کی مؤید ہے لیکن آگے بڑھ کر کہا گیا ہے : ہر گاہ کہ مسلمانوں میں دو زوجگی کو روکنا ضروری ہے " اس کے معنی یہ ہوئے کہ مسلمانوں میں دو زوجگی مروج ہے اس لیے اس کو قانون کے ذریعہ روکنا ضروری ہے۔ یہ دوسری بات پہلی بات کی ضد ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پہلی بات اس لیے کہی گئی کہ مسلمان اس مسودہ قانون سے متوحش نہ ہوں بلکہ یہ سمجھیں کہ یہ چیز عملاً متروک ہے اور مسلم رائے عامہ بھی اس کے خلاف ہے۔ اس لیے یہ قانون پاس ہو جائے تو عملاً اس کا کوئی خاص اثر مترتب نہ ہوگا لیکن مرتب مسودہ کو خیال آیا کہ جب بات یہی ہے تو پھر اس قانون کی ضرورت کہاں سے آپڑی ۔ اس اعتراض کا ازالہ پہلے تو یہ لکھ کر کیا کہ " مسودہ قانون کی غرض اسی مقصد کو حاصل کرنا ہے " لیکن اب بھی بات

نہیں بنی کیونکہ جو مقصد اس قانون کے بغیر خود حاصل ہے اس کی تحصیل کے کیا معنی؟ تحصیل حاصل تو ایک بے معنی بات ہے اس لیے آخر میں زور دے کر کہا گیا کہ ہر گاہ کہ مسلمانوں میں دو زوجگی کو روکنا ضروری ہے۔ اب یہ بات پہلی کہی ہوئی باتوں سے متضاد ہو تو ہوا کرے، نامعقول ہو تو ہوا کرے۔ اسمبلی میں ممبروں سے ہاتھ اٹھوا کر ہر متضاد اور نامعقول بات کو قانون بنوایا جاسکتا ہے۔ مسٹر علی حسن ہمدانی نے کم سے کم یہ مسودہ پڑھا تو ضرور ہوگا کیا انھوں نے یہ تضاد اور اضطراب محسوس نہیں کیا اور اگر مسودۂ قانون خود مرتب کیا ہے تو اغراض و مقاصد میں یہ تکلف پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ انہیں تو ہمت کر کے صاف صاف لکھنا چاہیے تھا کہ اگرچہ قرآن و حدیث میں دو زوجگی نہیں بلکہ چار زوجگی کی اجازت ہے اور اگرچہ عہد رسالت اور عہد صحابہ سے آج تک مسلمان اس پر عمل کرتے آ رہے ہیں اور اگرچہ انگریزوں نے بھی اس میں مداخلت نہیں کی تھی مگر میں چونکہ تعدد ازدواج کو ناپسند کرتا ہوں اور اب چونکہ ہماری قومی حکومت، مسلمانوں کی "خیر خواہی" کے جذبے سے ان کے پرسنل لا کی اصلاح کے لیے بھی تیار ہے اس لیے مسلمانوں میں دو زوجگی کو روکنا ضروری ہے۔

اتنی بات تو ان کی خدمت میں عرض کر دینی چاہیے کہ گونگوں اور نیچے دروں، نیچے بروں کی پالیسی مفید بھی نہیں ہوتی اور اس سے انسان کا وقار بھی مجروح ہوتا ہے۔

اغراض و مقاصد میں ایک ضمنی مقصد بھی بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے

"ضمناً اس کا مقصد مسلمان خواتین کو بھی سہولت بہم پہنچانا ہے جن کے خاوند اس بل کے نفاذ کے وقت ایک سے زیادہ بیویاں رکھتے ہوں"

اس سہولت کا ذکر دفعہ ۵ میں کیا گیا ہے لیکن بات مبہم کہی گئی ہے۔ اگر خلع کو منظور کرنا اور نہ کرنا شوہر کے اختیار میں چھوڑ دیا گیا ہے جیسا کہ فی الواقع وہ اسی کے اختیار کی چیز ہے تو پھر مذکورہ عورتوں کے لیے کیا سہولت بہم پہنچی؟ اور اگر عدالت، شوہر سے بزور خلع منظور کرائے گی یا خود اس کا نکاح فسخ کر دے گی تو پھر واضح طور پر یہ لکھنا چاہیے کہ یہ قانون مسلمانوں میں صرف آئندہ دو زوجگی کو نہیں روکتا بلکہ اس کی زد میں وہ دو زوجگی بھی آتی ہے جو اس قانون کے نفاذ سے پہلے وقوع پذیر ہو چکی ہو۔ اس طرح یہ قانون، ماضی، حال اور مستقبل تینوں زمانوں پر محیط ہو جائے گا اور کوئی قانون اتنا ہمہ گیر بھی نہ ہو تو پھر وہ قانون کیسا ہوا۔

دفعہ ۳ (الف) میں دو زوجگی کی تعیین اس طرح کی گئی ہے: "دو زوجگی کی شادی کا مقصد بیوی یا شوہر کا اپنے زوج کی موجودگی میں نکاح کرنا ہے۔"

یہ تشریح پڑھ کر میرا شبہہ قوی ہوگیا کہ یہ مسودہ قانون مسٹر علی حسن صاحب نے خود مرتب نہیں کیا ہے۔ یہ بات ذہن میں تازہ رکھیے کہ اس قانون کا اطلاق صرف مسلمانوں پر تجویز کیا گیا ہے۔ اب اس کے بعد اس تشریح کو پڑھیے۔ کیا اسے پڑھنے والا یہ محسوس نہیں کرے گا کہ مسلم معاشرے میں بھی تعدد ازدواج کا تعلق صرف مردوں سے نہیں ہے بلکہ عورتوں سے بھی ہے جس طرح ایک مسلمان مرد دو عورتوں سے بیک وقت نکاح کرتا اور کرسکتا ہے اسی طرح مسلمان عورت بھی بیک وقت دو مردوں سے نکاح کرتی اور کرسکتی ہے۔ اس قانون کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں میں رائج ان دونوں قسموں کے تعدد ازدواج کا انسداد ہو۔ کیا یہ بات کسی جاہل سے جاہل مسلمان کے قلم سے بھی نکل سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ مسٹر علی حسن یہ فرمائیں کہ یہ تشریح آئندہ کے امکان کو روکنے کے لیے کی گئی ہے اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ فی الحال یہ عورت موجود ہے لیکن وہ اس کا کیا جواب دیں گے کہ اس امکان کی تجویز بھی ایک مسلمان کے طرز فکر سے بہت دور ہے۔ سوال بدکاری اور زناکاری کا نہیں ہے بلکہ باضابطہ نکاح کا ہے۔ کیا مسلمان معاشرے میں یہ بات ممکن ہے کہ بیک وقت دو مردوں سے کسی مسلمان عورت کا نکاح جائز یا رائج ہو۔ یہ تو اسی وقت ہوسکتا ہے جب مسلمان اسلامی شریعت کے باغی اور شرم و حیا سے عاری ہو جائیں۔ پھر اس کے بعد اس معاشرے کو مسلمان معاشرہ کہنا کب صحیح ہوگا؟ اس کے علاوہ سوال یہ ہے کہ جس چیز کو اسلام نے قطعیت کے ساتھ حرام قرار دیا ہو کیا اس کو ناجائز کرنے کے لیے بھی کسی اسمبلی کے قانون کی ضرورت ہے؟ کیا انھوں نے اپنے مذہبی قوانین کے احترام سے بھی آزادی حاصل کرلی ہے؟ یا انھوں نے کسی اور کے مرتب کردہ مسودے پر بے سوچے سمجھے دستخط کردیا ہے؟

دوزوجگی کی شادی کی تعیین و تشریح کے بعد جو شرط لگائی گئی ہے وہ بھی اسلامی قانونِ نکاح سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ مسلمانوں میں کوئی شادی محض رسم و رواج کی بنا پر رائج نہیں ہے۔ مذہب نے اس کے بارے میں مفصل قوانین دیے ہیں اور نکاح میں مسلمان اپنے مذہبی قوانین ہی کی پیروی کرتے ہیں۔ مسلمانوں میں ایسا کوئی نکاح نہیں ہوتا جو مذہب کی رو سے ناجائز اور رواج کی رو سے جائز ہو۔ نیز یہ کہ مذہب نے جس نکاح کو جائز قرار دیا ہے کوئی مسلمان اسے ناجائز قرار نہیں دے سکتا ــــ اس شادی سے مفقود الخبر کی جس عورت کو مستثنیٰ کیا گیا ہے اس کا حال بھی حسب سابق ہے۔ پہلی بات یہ کہ سات سال تک مفقود الخبری کی قید معلوم نہیں کہاں سے لی گئی ہے۔ دوسری یہ کہ اسلامی قاعدے کے لحاظ سے اگر عورت مفقود الخبر ہو جائے تو اس کے شوہر پر دوسری شادی کے لیے انتظار کی پابندی نہیں ہے اس لیے اس صورت کو مرد اور عورت دونوں پر جاری کرنا غلط ہے۔

اس مسودہ قانون میں ہر جگہ تعدد ازدواج کو مردوں اور عورتوں کے ساتھ متعلق کیا گیا ہے۔ شاید مرتب مسودہ عورتوں کی دوزوجگی کا شرمناک معاملہ مسلمانوں میں بھی دیکھنے کے خواہش مند ہیں۔ بڑی حیرت ہے کہ مسٹر علی حسن نے اس

یمانی کو بھی محسوس نہیں کیا۔

دفعہ ۴ میں کہا گیا ہے :-

عام اس سے کہ کوئی قانون یا رسم و رواج اس کے منافی ہو، دو زوجگی کی شادی باطل قرار دی جائے گی۔

جس طرح، مسلمانوں سے متعلق مسودۂ قانون میں عورتوں کی دو زوجگی کا ذکر کر کے مسٹر علی حسن نے اسلامی تہذیب و معاشرت بیزار لوگوں کے گروہ میں ایک امتیاز حاصل کیا ہے اسی طرح اس دفعہ میں بغیر کسی لاگ لپیٹ کے اسلام کے مسلّمہ قانون تعدد ازدواج کو بہر حال باطل قرار دینے کی تجویز پیش کر کے انھوں نے اپنے ہم مسلک لوگوں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

یہ مسودہ قانون پیش کر کے اگر وہ صرف اپنے آقایان ولی نعمت کو خوش کرنا چاہیے تھے تو اس مقصد میں وہ کامیاب ہو چکے ہوں گے لیکن اگر انھوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ اس مسودے کو پاس کرا کے بھارت کے مسلم معاشرے میں نافذ کرا دیں گے تو یہ ان کی خام خیالی ہے۔ جب ترکی، مصر اور پاکستان کی حکومتیں مسلمان ہونے کے باوجود امت مسلمہ کو مذہبی قوانین سے برگشتہ نہ کر سکیں اور نہ اسلامی تہذیب کو مغربی تہذیب میں ضم کر سکیں تو بھارت کی صوبائی یا مرکزی حکومت اس مقصد میں کس بنیاد پر کامیاب ہو سکتی ہے ہاں ظلم و جبر اور زور و زبردستی سے مسلم معاشرے میں بے چینی ضرور پیدا کی جا سکتی ہے۔

مسلمان ممالک میں تہذیب مغرب سے مرعوب حکومتوں نے اسلام کے معاشرتی قوانین میں جو "اصلاح" فرمائی ہے اس میں مغربی تہذیب کا رنگ جھلکتا ہے اور مسٹر علی حسن صاحب نے جو مسودہ قانون پیش کیا ہے اس پر ہندو تہذیب کی گہری چھاپ لگی ہوئی ہے انھوں نے یہ چھاپ بھارت کے عصری تقاضے کے ماتحت لگائی ہوگی ـــــ اس قانون کی خلاف ورزی کے رخنوں کو جس چابکدستی کے ساتھ بند کیا گیا ہے اور خلاف ورزی پر جو سزائیں تجویز کی گئی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرتب مسودہ کے نزدیک دو زوجگی زناکاری سے بھی کوئی بڑا جرم ہے۔

مرکزی حکومت نے مسلم پرسنل لا پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کرنے کا جو اعلان کیا ہے۔ وہ ہمارے سامنے آچکا ہے۔ مرکزی مجلس شوریٰ جماعت اسلامی ہند کی قرارداد بھی شائع ہو چکی ہے۔ بھارت کے مسلمان اس پر جو احتجاج کر رہے ہیں وہ بھی حکومت کی نظر میں ہے۔ ہم بھی پوری قوت کے ساتھ اس احتجاج میں شریک ہیں۔ مرکزی حکومت اور مہاراشٹر کی حکومت دونوں ہی کے لیے دانش مندی کا رویہ یہ ہے کہ وہ مسلم پرسنل لا میں مداخلت کا ارادہ ترک کر دیں، کیونکہ اس مداخلت سے بھارت کو فائدے کے بجائے نقصان پہنچے گا۔

گزر چکے تھے اور وہ ہندستان کے تقریباً دس ہزار مربع میل پر قبضہ کر چکا تھا۔ اس معاملے میں ہمارے حکمرانوں کے اطمینان کا حال یہ تھا کہ چینیوں نے لداخ کے شمالی کونے میں اس سرے سے اس سرے تک باقاعدہ سڑک بنالی اور ہندستان کے ۱۲ سو مربع میل رقبہ کو کاٹ کر اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔ مگر نئی دہلی کو اس کی خبر تک نہیں ہوئی سڑک بننے کے بعد چین نے اپنی انجینرنگ کے کارنامے بیان کرتے ہوئے جب "تبت سنکیانگ روڈ" کا ذکر کیا تو ہمیں معلوم ہوا کہ ایسا ایک واقعہ ہماری زمین پر رونما ہوا ہے۔ چنانچہ چین کے دلائل میں سے ایک دلیل یہ بھی ہے کہ یہ اگر ہمارا علاقہ نہ ہوتا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ وہاں ہم اپنی سڑک بناتے رہتے اور ہندستان کو خبر بھی نہ ہوتی۔

چین کی طرف سے یہ اطمینان اور بے خبری ہی دراصل وہ سب سے بڑی وجہ ہے جس نے چین کا مسئلہ پیدا کیا۔ یہی وہ چیز تھی جس نے ہم کو آمادہ کیا کہ تبت کو ہم چین کے حوالے کر دیں اور اس دیوار کو بیچ سے ہٹا دیں جو ہمارے اور اس کے درمیان حائل تھی۔ پھر ہمارا یہی اطمینان اور بے خبری تھی جس نے چین کو موقع دیا کہ وہ ہماری سرحد میں دور تک گھس آئے اور یہی وجہ تھی کہ سالہا سال تک ہم اپنی فوج کو شمالی سرحد پر لڑنے کے لیے تیار نہ کر سکے۔ یہ اطمینان اور بے خبری کیوں تھی؟ جب ہم اس سوال پر غور کرتے ہیں تو اس کے جواب میں ہمیں وہی مادی نقطۂ نظر ملتا ہے جو ہمارے حکمرانوں کے ذہنوں میں جگہ بنائے ہوئے ہے۔ اس کی وجہ سوشلزم کا نظریہ ہے جو کائنات کی مادی توجیہ کے نتیجے کے طور پر وجود میں آیا ہے۔

مذہبی نظریہ کے مطابق انسان ایک اختیار اور ارادہ رکھنے والی مخلوق ہے جو خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔ دنیا میں اس کو امتحان کی غرض سے رکھا گیا ہے۔ تاکہ ہمارا مالک یہ دیکھے کہ ہم میں سے کون اپنے اختیار اور ارادے کو صحیح سمت میں استعمال کرتا ہے اور کون غلط کاری میں پڑ جاتا ہے۔ لیکن مادی نظریہ خدا کو نہیں مانتا۔ اس لیے اس کو انسان کی تشریح کسی اور ڈھنگ سے کرنی تھی۔ اس نے کہا کہ انسان بھی اسی طرح سے مادہ کا ایک مجموعہ ہے جس طرح دنیا کی دوسری تمام چیزیں۔ جیسے دوسری چیزیں مادی حالات سے متاثر ہوتی ہیں۔ مثلاً سیلاب سے دریا کا کنارہ کٹ جاتا ہے اور سیلاب نہ ہو تو نہیں کٹتا۔ اسی طرح انسان مادی حالات سے متاثر ہوتا ہے اور بنتا بگڑتا رہتا ہے۔

سوشلسٹ مفکرین نے ایک صدی کی تلاش و تحقیق کے بعد معلوم کیا ہے کہ انسانی زندگی کے لیے فیصلہ کن چیز اس کے پیداواری حالات ہیں۔ یہ پیداواری حالات جیسے ہوں ویسی ہی اس کی زندگی ہوگی۔ قدیم ترین زمانے سے یہ رواج چلا آرہا تھا کہ آدمی اپنی الگ الگ جائداد اور ملکیت بناتا تھا اور اس پر دھڑوں کی محنت سے

لے کر فائدہ حاصل کرتا تھا۔ اس پیداواری نظام نے خودغرضی اور استحصال (Exploitation) کا جذبہ پیدا کیا۔ اب اگر اس پیداواری نظام کو ختم کر دیا جائے۔ یعنی انفرادی ملکیت نہ ہو اور اس کے بجائے ساری جائداد اور پیداوار حاصل کرنے کے ذرائع (Means of prodution) سماج یا دوسرے لفظوں میں پارٹی اولاد کے ہاتھ میں دے دیے جائیں اور اجتماعی طور پر پیداوار حاصل کرکے اجتماعی طور پر اس کو تقسیم کیا جائے تو وہ حالات ختم ہو جائیں گے جو خودغرضی اور لوٹ کھسوٹ کی فضا پیدا کرتے ہیں

اسی کا نام سوشلزم ہے۔ سوشلزم کا مطلب، اس کے عقیدت مندوں کی تشریح کے مطابق استحصال کی نفی ہے:

Socialism means Negation of Exploitation

سوشلسٹ فلسفہ کے مطابق دنیا کی تمام لوٹ کھسوٹ اور ظلم کی تمام قسمیں صرف اس لیے ہیں کہ انفرادی ملکیتوں کی موجودگی کی وجہ سے انسان کو دوسرے انسان کی محنت سے فائدہ اٹھانے کا موقع حاصل ہے۔ اس لیے جو لوگ اس بنیادی برائی کے خلاف ہوں، وہ گویا ناجائز قبضہ و ظلم کی تمام صورتوں کے خلاف ہیں۔ اب چونکہ سوشلسٹ چین وہ ملک ہے جو اس معاملے میں صرف نظریاتی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ وہ عملاً اپنے یہاں اس مسلک کو قائم کر چکا ہے۔ اس لیے ایسے "سماجی بھکشوؤں" سے بھلا کسی کی ملکیت کو کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب یہ خبریں آنے لگیں کہ چین نے ہندستان کی سرحد پر حملہ کر دیا ہے تو طویل عرصے تک ہمارے ملک کے کمیونسٹوں کو اس کا یقین ہی نہیں آیا۔ وہ کہتے رہے کہ کوئی سوشلسٹ حکومت کسی دوسرے کے علاقے پر کبھی حملہ کر ہی نہیں سکتی۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ جس ملک کا نظام "نفی استحصال" کے اصول پر قائم ہو، وہ استحصال کی کارروائی کس طرح کر سکتا ہے۔ وہ دوسرے کی ملکیت کو ہڑپ کرنے کا ارادہ کس طرح کر سکتا ہے۔

ہماری موجودہ قیادت کی ذہنی ساخت بھی بنیادی طور پر وہی ہے جو کمیونسٹوں کی ہے۔ ان کا فلسفہ وہی ہے جو کمیونزم اور سوشلزم کا فلسفہ ہے۔ زندگی کے مسائل کے حل کے لیے ان کا طرز فکر وہی ہے جو کمیونزم اور سوشلزم نے بتایا ہے۔ اس لیے اپنی مخصوص ذہنی ساخت کی وجہ سے ان کے لیے یہ سمجھنا ممکن نہ ہو سکا کہ چین جو ایک سوشلسٹ ملک ہے، وہ کبھی غیر کے علاقے پر حملہ کر سکتا ہے۔ سابق وزیر دفاع اور پنڈت نہرو کے محبوب مسٹر کرشنا مینن نے ہمیشہ چین کو اپنا دوست سمجھا اور پاکستان کو ہندستان کا دشمن نمبر ایک بتاتے رہے۔ چند سال پہلے جب صدر ایوب نے ہندوستان اور پاکستان کے مشترکہ دفاع کی تجویز پیش کی تو پنڈت نہرو نے نہایت حقارت سے کہا ــــ "مشترکہ دفاع کس کے خلاف" ان کے نزدیک ہندستان کی سرحد پر جو ملک تھا وہ اگرچہ ایک طاقتور ملک تھا۔ مگر اس کے مادی

شیر کے پنجے کو گھس کر بے ضرر بنا چکے تھے ۔ پھر مشترکہ دفاع کی زحمت کی حامی تو کس کے خلاف کی جاتی ۔ ہندستان کے ایک مذہبی آدمی سوامی دیوکانند نے ۱۸۹۸ء میں کہا تھا :۔

If and when the British leaves India, there is every possibility of China's invading India

مگر یہ حقیقت جس کو ہندستان کے ایک مذہبی آدمی نے آدھی صدی پہلے ادیکھ لیا تھا اس کو جدید مادہ پرست لیڈر آدھی صدی بعد بھی دیکھ نہ سکے ۔

اور اس کی وجہ یہی تھی کہ پنڈت نہرد اور ان کے قریبی ساتھی اپنے سوشلسٹ ذہن کی وجہ سے یہ سوچ ہی نہیں سکتے تھے کہ ایک ایسا ملک جو سوشلزم یا دوسرے لفظوں میں نفی استحصال کے اصول پر عقیدہ رکھتا ہے وہ بے جا استحصال کی کارروائی کرسکتا ہے، وہ دوسرے ملک پر جارحانہ اقدام کا مرتکب ہوسکتا ہے ۔ کرشنامینن کے الفاظ میں "چین کی طرف سے ہم کو کوئی خطرہ نہیں تھا اس لیے چین کی سرحد پر فوج مامور نہیں کی گئی "

یہ بات کہ پنڈت نہرو کا ذہن سوشلسٹ تصورات کے تحت بنا ہے ۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے ۔ بیس سال پہلے جب انھوں نے آپ بیتی لکھی تو اس میں نہایت واضح لفظوں میں اپنے اس عقیدے کا اظہار کیا تھا :۔

"ناگزیر طور پر ہمارے سامنے ایک ہی ممکن حل ہے ــــــ ایک اشتراکی نظام (Socialist Order) کا قیام پہلے قومی دائرے کے اندر اور پھر ساری دنیا میں ۔ جس میں مفاد عامہ کے لحاظ سے دولت کی پیدائش اور تقسیم پر (ریاست کا) کنٹرول ہو"

آٹو بایا گرافی (لندن ۱۹۳۶) صفحہ ۵۴۳

پنڈت نہرو کے یہ خیالات بجنسہٖ آج بھی باقی ہیں ۔ ۱۹۵۴ء میں جب انھوں نے ہندستان کے وزیر اعظم کی حیثیت سے چین کا بارہ روزہ دورہ کیا تھا تو اس سے واپسی کے بعد ۹ نومبر کو نئی دلی میں نیشنل ڈولپمنٹ کونسل کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا :۔

"میرے ذہن میں ہندستان کے مستقبل کی جو تصویر ہے وہ قطعی طور پر اور پوری طرح سے ایک سوشلسٹ سماج ہے ۔ سوشلسٹ سماج کا لفظ میں کسی بندھے ٹکے معنی میں استعمال نہیں کر رہا ہوں ۔ بلکہ میرے ذہن میں اس کا مطلب بڑی حد تک یہ ہے کہ پیداوار کے ذرائع پوری قوم کی ملکیت ہو جائیں اور ان پر سماج کے مجموعی مفاد کے لحاظ سے کنٹرول قائم کر دیا جائے "

اس کے فوراً ہی بعد جنوری ۱۹۵۵ء میں آوڈی (مدراس) میں کانگرس کا سالانہ اجلاس ہوا اور اس میں "سوشلسٹک پیٹرن آف سوسائٹی" کا مشہور رزولیوشن پاس ہوا جس کا مطلب یہ تھا کہ پنڈت نہرو کے فکر کو پوری کانگرس نے تسلیم کر لیا ہے۔

ظاہر ہے کہ جن لوگوں کا ذہن اس قسم کے فکر سے بنا ہو، وہ یہی سوچ سکتے تھے کہ چین میں چونکہ سوشلسٹ حکومت قائم ہے۔ اس لیے اس کی طرف سے ہندستان کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ انھوں نے پاکستان کے راستے میں سڑکیں بنائیں چھاؤنیاں قائم کیں اور اپنی بہترین فوج اس کی سرحدوں پر لاکر کھڑی کر دی۔ مگر چین کی طرف سے نہایت مطمئن رہے اور اس کی سرحد کو بالکل کھلا چھوڑ دیا۔ آج بھی جبکہ حقیقی اشتراکیت کا سب سے بڑا نمائندہ ملک وہ سب کچھ کر چکا ہے جو ایک دشمن اور حملہ آور ملک کرتا ہے۔ ہماری قیادت کے اشتراکی ذہن میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ وہ یہ سوچ کر مطمئن ہے کہ جو کچھ ہوا یا ہو رہا ہے اس کی ذمہ داری "چین" نامی ملک پر ہے۔ ورنہ جہاں تک "اشتراکیت" کا تعلق ہے، وہ تو بالکل معصوم ہے۔ پنڈت نہرو نے لوک سبھا میں تقریر کرتے ہوئے کہا :۔

The Major issue between India & China was notone of Communism or anti-Communism, but one of an expensionist and im perialist minded country deliberately invading another.

Statesman, Nov. 10. 1963

یعنی ہندستان پر چین کے حملے کا تعلق اشتراکیت سے نہیں ہے بلکہ یہ تو ایک توسیع پسند اور سامراجی ذہن رکھنے والے ملک کا دوسرے ملک پر حملہ ہے۔

اس معاملے میں ہماری حکومت کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص یہ فرض کرے کہ عورت مرد کے درمیان غلط تعلقات قدیم جہالت اور دقیانوسی ذہنیت کا نتیجہ تھے۔ اب جدید ترقی یافتہ زمانے میں تعلیم و تہذیب سے مزین نوجوانوں سے اس قسم کی غلطیوں کا کوئی خطرہ نہیں۔ ایسا شخص قدرتی طور پر اپنے گھر کی تعلیم یافتہ خواتین کے بے پردہ باہر نکلنے یا غیر مردوں سے اختلاط پر پابندی لگانے کی ضرورت نہیں سمجھے گا۔ اس کو تو صرف اس وقت ہوش آئے گا جب اس کی صاحبزادی اس سے اسقاط حمل کی فرمائش کرے گی یا اس کے گھر میں ایک بے باپ کا بچہ پیدا ہو چکا ہوگا۔

یہ چند باتیں جو میں نے آپ کے سامنے رکھی ہیں اس میں آپ الحاد اور خدا پرستی دونوں کا حلیہ دیکھ سکتے ہیں۔ اس میں صاف طور پر نظر آ رہا ہے کہ الحاد کے پاس ان چیزوں میں سے کوئی ایک چیز بھی نہیں ہے جو اس دنیا میں کسی نظریے کو

صحیح نظریہ قرار دینے کے لیے ضروری ہے۔ وہ کائنات کی کوئی واقعی توجیہ نہیں دیتا۔ وہ مکمل طور پر ایک بے دلیل نظریہ ہے، وہ زندگی کے مسائل کے بارے میں ہماری نہایت غلط رہنمائی کرتا ہے۔ دوسری طرف خدا پرستی کے پاس کائنات کی نہایت معقول توجیہ ہے۔ اس کا استدلال نہایت پختہ ہے اور زندگی کے معاملات میں اس سے نہایت صحیح رہنمائی حاصل ہوتی ہے ——— اب آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ دونوں میں سے کون سا نظریہ ہے جس کا ہمیں انتخاب کرنا چاہیے۔

بدلے ہوئے حالات میں

جو لوگ بدلے ہوئے حالات میں ذاتی مفادات کی خاطر یا دوسرے نظریات سے متاثر یا حالات کے دباؤ سے مرعوب ہو کر اپنے اصول و نظریات میں ترمیم کر لیتے ہیں وہ اپنے نظریات کے وفادار مومن سمجھے جانے کے بجائے منافق کہلائے جانے کے زیادہ مستحق ہیں۔ دنیا کا ہر دین اور ہر نظام ایسے ہی لوگوں کے ہاتھوں مسخ ہوتا اور مسخ ہوا ہے۔ یہ لوگ اتنی جرأت نہیں رکھتے کہ جن اصول و نظریات پر سے ان کا اعتماد اٹھ چکا ہے ان سے اعلانِ براءت کر دیں اور کھل کر اُن نظریات کو اپنا لیں جن کو ان کے دل و دماغ نے قبول کر لیا ہے یا جن میں انہیں اپنا مفاد نظر آتا ہے۔ اس کے بجائے وہ ان اصول و نظریات کو توڑ مروڑ کر اپنی خواہشات کے مطابق بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور ساتھ ہی حلق کی پوری قوت کے ساتھ یہ اعلان کرتے رہتے ہیں کہ وہ ان اصول و نظریات کے سب سے بڑے مومن اور سب سے زیادہ مخلص پیرو ہیں۔

مغرب کے فکری اور سیاسی غلبہ سے عالم انسانی کو بہت سے نقصانات پہنچے ہیں مگر سب سے بڑا نقصان جو پہنچا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے نتیجے میں اسلام جیسے مکمل متوازن اور عادلانہ نظام زندگی اور واحد دین حق کے مختلف اصولوں پر سے ان بہت سے لوگوں کا اعتماد اٹھ گیا جو اپنے آپ کو اس کا نام لیوا ظاہر کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اسلام سے زیادہ مغربی افکار و نظریات سے واقف و مرعوب اور اسلامی تہذیب سے زیادہ مغربی تہذیب کے دلدادہ ہیں یہ حضرات اپنی جہالت اور مرعوبیت کا اعتراف کرنے کے بجائے مجتہدانہ انداز میں اسلامی تعلیمات کی نئی نئی تعبیریں پیش کرتے رہتے ہیں اور جو لوگ ان تعبیرات سے اختلاف کریں ان پر اسلام سے ناواقفیت اور حالات زمانہ سے بے خبری کا الزام لگاتے ہیں حالانکہ اگر ان کی مختلف و متضاد تعبیرات کو صحیح باور کر لیا جائے تو نتیجہ صرف ایک نکلے گا اور وہ کہ اسلام کسی متعین چیز کا نام نہیں ہے وہ سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ دنیا کی ہر چیز اس میں داخل بھی کی جا سکتی ہے اور خارج بھی۔ کھلی بات ہے کہ یہ اسلام کی پیروی اور خدمت نہیں، اس کی دشمنی ہے۔

(مولانا حامد علی)

بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ اور اسلام

(جناب عبدالباری ایم اے)

(آخری قسط)

۱۱۔ مزدور کا مسئلہ

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُم مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُم بَعْضًا سُخْرِيًّا ؕ (الزخرف) ہم نے دنیاوی زندگی میں ان کے درمیان ان کی معیشت تقسیم کردی اور ہم نے ایک کو دوسرے پر ترجیح دی تاکہ ایک دوسرے کو اپنے کام میں مدد کے لیے رکھ سکیں۔ فضیلت اور رزق میں تفاوت کی اس حکمت سے قدرت نے ایسا کیا کہ لوگوں کو آزمائے اور دیکھے کہ جو کچھ بھی انھیں بخشا گیا ہے اس کو وہ کس نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اسے کس طرح اپنی ذات کی تعمیر اور انسانیت کی بہبودی میں صرف کرتے ہیں۔ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ (انعام)

اسلام نے عوامل پیدائش (Factors of production) میں ربط و تعلق پیدا کر کے پیدائش دولت کا ایسا متوازن نظام بنایا ہے جس سے نہ تو کسی عامل کی حق تلفی ہوتی اور نہ کوئی کسی کے ہاتھ مجبور رہنے پاتا ہے۔ پھر وہ ایک ایسی اخلاقی حس پیدا کرتا ہے جس کی وجہ سے ان میں وہ مفاد پرستانہ اور خود غرضانہ ذہنیت پیدا نہیں ہونے پاتی جس کی وجہ سے خواہ مخواہ محنت و سرمایہ میں کش مکش پیدا ہو جس کے نتیجے میں ہڑتال ہو اور ملک کی صنعت کو نقصان پہنچے۔ رسول اللہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تین قسم کے انسان ایسے ہیں جن سے میں قیامت کے دن جھگڑوں گا اور جس سے میں جھگڑوں اس کو مغلوب و مقہور ہی کر کے چھوڑوں گا۔ ان میں سے ایک وہ شخص ہے جو مزدور سے کام تو پوری طرح لیتا ہے اور اس کے مناسب اس کی اجرت نہیں دیتا۔ آپ نے ممانعت فرمائی ہے کہ مزدور کو اس کی اجرت طے کیے بغیر کام پر لگا لیا جائے۔ آپؐ نے یہ بھی فرمایا ہے مزدور کی مزدوری اس کے پسینے خشک ہونے سے پہلے ادا کرو۔ پھر جہاں اسلام ایک طرف سرمایہ دار کو مزدور پر بے جا الزام و ظلم سے روکتا ہے وہیں دوسری طرف رسول اللہ نے فرمایا: بہترین کمائی مزدور کی کمائی

بشرطیکہ وہ خیرخواہی اور بھلائی کے ساتھ کام والے کا کام انجام دے"۔ عدل و انصاف کے ذریعہ اسلام
حق شناسی کی ایسی اسپرٹ پیدا کرنا چاہتا ہے کہ غیر فطری تفاوت ختم ہو۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ اونچی اونچی تنخواہ والوں
میں کمی ہو جائے گی۔ بڑے بڑے عہدے والے کم ہو جائیں گے۔ مزدوروں کے کام کے گھنٹے کم ہو کر تعداد مزدور
میں اضافہ ہو جائے گا۔ اور انسان محنت کا ایک 'جنس' بننے سے بچ جائے گا۔ اخوت و ہمدردی کی بنا پر کارخانہ دار
و مزدور۔ افسر۔ سرکاری ملازم۔ تاجر و زمیندار سب ایک قوم کے اسی طرح شہری ہو جائیں گے جس طرح ایک خاندان
کے مختلف افراد جو مختلف طریقوں سے روزی کماتے ہوں بھائی بھائی ہیں۔ ایک شہری کے لحاظ سے جہاں تک
ضروریات زندگی کا تعلق ہے یہ سب برابر ہیں۔ اسی طرح ملک کی کامیابی و ناکامیابی میں سب شریک ہیں ۔
کش مکش و انتقام کا جذبہ ختم ہو کر تعاون کی راہ ہموار ہو جائے گی ۔

مہنگائی کا مسئلہ

صنعت و تجارت کے ہر شعبے کو ممکن حد تک مسابقت (Competition) کے لیے کھلا رکھتا ہے۔ نہ کسی کو امتیازی حقوق و اجارہ داری (Monopoly)
دیتا ہے نہ قومیانے (Nationalisation) کی ہدایت کرتا ہے۔ غائب سودا بازی یا سٹہ (Speculation)
کو بھی ممنوع قرار دیتا ہے۔ اور پیداوار کو قصداً برباد کرنا جرم قرار دیتا ہے۔ اکتناز و احتکار (Hoarding)
کے متعلق تو رسول اللہ کا ارشاد ہے کہ "جس شخص نے احتکار کیا تو وہ گنہگار ہے"۔ غرضکہ ان تمام مصنوعی صورتوں
کو جن کے ذریعہ ضروریات زندگی (Necessities of existence) کو روک کر قیمتیں بڑھائی
جاتی ہیں اور چور بازاری (Blackmarketing) شروع ہو جاتی ہے اسلام ممنوع قرار دیتا ہے۔
جہاں تک قیمتوں پر کنٹرول عائد کرنے کا سوال ہے ذیل کے واقعات خود صحیح رخ کا فیصلہ کر دیتے ہیں۔
مدینہ میں ایک قحط کے موقع پر جب رسول اللہ سے عرض کیا گیا کہ قیمتیں بہت بڑھ رہی ہیں آپ سرکاری طور
پر اشیاء کے نرخ مقرر فرما دیجیے تو آپ نے ایسا کرنے سے انکار فرما دیا اور یہ عذر بیان کیا کہ "إِنِّي أُرِيدُ
أَنْ أَلْقَى اللهَ وَلَيْسَ لِأَحَدٍ عِندِي مَظْلَمَةٌ يَطْلُبُنِي بِهَا (میں خدا سے اس طرح ملنا چاہتا ہوں کہ
میرے خلاف کوئی ایک شخص بھی ظلم کی شکایت کرنے والا نہ ہو) دراصل جس چیز سے آپ نے انکار کیا تھا وہ یہ
تھی کہ حکومت اپنی مصنوعی مداخلت سے قیمتوں کے پیچیدہ اقتصادی نظام کو درہم برہم کرے۔ اس طریقے کو
چھوڑ کر آپ نے اپنی پوری قوت کاروباری لوگوں کی اخلاقی اصلاح پر صرف فرمائی اور مسلسل تبلیغ سے یہ بات ان کے
ذہن نشین کی کہ جان بوجھ کر قیمتیں چڑھانا ایک بہت بڑا گناہ ہے۔ یہ تبلیغ کارگر ثابت ہوئی اور کچھ زیادہ دیر

گذری تھی کہ قیمتیں اعتدال پر آنی شروع ہوگئیں۔

حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایک دفعہ قحط پڑا اور قیمتیں بہت چڑھ گئیں۔ حضرت عثمانؓ جو اس وقت غلہ کے بہت بڑے تاجر تھے ان کے پاس ایک ہزار اونٹ غلہ آیا۔ نفع اندوزی کے خیال سے بہت سے تاجروں نے بڑے بڑے دام دے کر غلہ خریدنا چاہا مگر آپ نے انکار کیا۔ الٹے شہر میں منادی کرادی کہ جسے ضرورت ہو وہ آکر مفت غلہ لے جائے۔ اس طرح سارا غلہ ضرورتمندوں میں تقسیم کردیا۔ دوسری طرف قحط کے ایام میں حضرت عمرؓ نے گوشت مچھلی گھی کی قسم کی کوئی لذیذ شے نہیں کھائی۔

ہزاروں برس پہلے بھی جب شاہ وقت سے قحط کنٹرول نہ ہوسکا تو حضرت یوسفؑ نے سلطنتِ مصر کے سارے قلمدانوں (خزائن) کو اپنے ہاتھوں لے کر اسلامی طریقوں سے اس نازک دَور کو سنبھالا۔ اگر سارے قلمدانوں (Portfolios) کو نہ لیتے تو مختلف شعبوں میں کشمکش رہتی اور یہ نہ سنبھال سکتے۔

کیا خود ہندستان کا ذاتی تجربہ نہیں؟ ۱۹۵۲ء میں بلیک مارکٹنگ اور قلت اشیاء کے طوفان کا مقابلہ کرنے کے لیے جب وزارت بدلی تو مرحوم رفیع احمد قدوائی نے مرکزی کابینہ ریاستوں کے وزراء اور خود وزیر اعظم پنڈت نہرو کی مخالفت کے علی الرغم مصنوعی کنٹرول ختم کرنے کا فوری اعلان کردیا۔ حالت سدھرنے لگی اور دو سال میں اچھا اور سستا اناج ملنے لگا۔

سودی کاروبار کا مسئلہ

ایک بار رسول اللہؐ کی خدمت میں طائف کے لوگ آئے اور اسلام قبول کرنے کے لیے تین شرائط کے ساتھ آمادگی ظاہر کی کہ انھیں زنا کرنے کی اجازت ہو۔ شراب پینے سے نہ روکا جائے اور سودی کاروبار کی اجازت رہے لیکن یہ ساری شرطیں مسترد کردی گئیں۔ کیونکہ یہ تینوں بڑی بڑی خرابیاں تھیں جن سے سماج کے اندر ہزاروں برائیوں کا پھیلنا لازمی تھا۔ جس طرح شراب زنا حرام ہے اسی طرح سودی کاروبار بھی اَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (البقرہ) (اللہ نے خرید و فروخت کے معاملات کو حلال کیا ہے اور سودی کاروبار کو حرام کیا ہے) رسول اکرمؐ کا ارشاد ہے "الربٰو سبعون جزءً ایسرھا أن ینکح الرجل امہ (سود اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس کو اگر ستر اجزاء میں تقسیم کیا جائے تو اس کا ہلکے سے ہلکا جزء اس گناہ کے برابر ہوگا کہ آدمی اپنی ماں کے ساتھ زنا کرے۔) وَمَا آتَیْتُمْ مِنْ رِبًا لِیَرْبُوَ فِی اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرْبُوْ عِنْدَ اللّٰہِ وَمَا آتَیْتُمْ مِنْ زَکٰوۃٍ تُرِیْدُوْنَ وَجْہَ اللّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ٥ (الروم) اور جو تم سود دیتے ہو کہ لوگوں کے اموال میں اضافہ ہو تو اللہ کے نزدیک وہ بڑ

نہیں بڑھتا۔ بڑھوتری تو ان اموال کو نصیب ہوتی ہے جو تم اللہ کے لیے زکواۃ میں دیتے ہو۔

اسلام دراصل اس ذہنیت اور ان تمام معاشی حالات ہی کا استیصال کر دیتا ہے جن کی وجہ سے سودی معاملہ کی مختلف صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔

یا ایُّھا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا لَا تَاکُلُوا	اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے
اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ	کے مال ناروا طریقے سے نہ کھایا کرو۔ بجز اس کے کہ
اِلَّا اَنْ تَکُوْنَ تِجَارَۃً عَنْ تَرَاضٍ	لین دین آپس کی رضامندی سے
مِنْکُمْ (النساء)	ہو۔

اکتساب مال میں جائز و ناجائز کی قید لگا کے پھر ثروت اور اس کے وسائل کو جمع کرنے کی ممانعت اور خرچ کرنے کا حکم کر کے دوامی گردش اور پوری آبادی میں منصفانہ تقسیم کا ایسا کنٹرول قائم کر دیتا ہے کہ جماعت کے ہر فرد کو اس کا متناسب حصہ مل سکے۔

یہ اور ان کے علاوہ معیشت کے دوسرے شعبوں میں جو سہولتیں بیان کی گئی ہیں ایسا ماحول پیدا کر سکتی ہیں افراد کی ضرورتیں بھی بآسانی پوری ہو سکیں اور ربا، سودی بنیاد کے کاروبار کو فروغ حاصل ہو سکے۔

آج دنیا کے بدلتے ہوئے اخلاقی اقدار

معیار زندگی اور بدلتے ہوئے اقدار کا مسئلہ زندگی کے جھوٹے معیار و پیمانوں کی اقدار اور اعلیٰ نمونے کہاں ملیں؟ اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں امید کی ایک ہی شعاع ہے۔ جبکہ دوسری خدائی اور پیغمبروں کی تعلیم و حکمت یکسر ضائع ہو چکی ہیں صرف آخری پیغمبر کی لائی ہوئی مکمل ہدایات آج بھی محفوظ ہیں رہتی دنیا تک رہنمائی کے لیے کافی ہیں۔

اللہ کا فرمان ہے :۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (اللہ کے نزدیک تم میں سب سے بڑا بزرگ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے) حضرت عثمان بن عفان سے روایت ہے کہ نبیؐ نے فرمایا "ابن آدم کے لیے تین چیزوں سوا کچھ حق نہیں ہے۔ رہنے کے لیے گھر، بدن ڈھانکنے کے لیے کپڑا اور کھانے کے لیے روٹی اور پانی" (ترمذی) ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا "اپنے سے کم درجہ والوں کو دیکھو بڑے درجہ والوں کو نہ کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم اللہ کی نعمت کو حقیر نہ سمجھو گے۔ (مسلم)

قرآن و سنت کی روشنی میں انسان اپنی زندگی کے معیار کو اگر درست کرلے تو پھر رزق کی کمی کبھی محسوس

۔اگر کچھ کمی بھی ہو تو اس کی تلافی کا انتظار آخرت میں رہے گا۔ دنیا میں کمی آزمائش کے لیے بھی تو ہوگی جیسا
قرآن کریم کا ارشاد ہے :-

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَ	اور ہم تمہیں کچھ نہ کچھ آزمائیں گے۔ خوف بھوک
الْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالثَّمَرَاتِ	مالوں، جانوں، پھلوں کی کمی اور نقصان کے
(البقرہ)	ساتھ ۔

انسان کی تمنائیں کبھی ختم نہیں ہوسکتیں۔ اس لیے آرام اور سکھ صرف قناعت میں ہے ۔

فضول خرچی و عیش پرستی کا مسئلہ

قرآن کریم کی ہدایت ہے :- كُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا (کھاؤ اور پیو اور اعتدال سے تجاوز نہ کرو ۔) وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوا اِخْوَانَ الشَّيَاطِيْنِ (بنی اسرائیل) اور فضول خرچی ہرگز نہ کرو بے شبہ اخراجات میں حد سے تجاوز کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں) نبی اکرمؐ کا ارشاد ہے۔ الاقتصاد فی النفقۃ نصف المعیشۃ (خرچ میں میانہ روی معاشی زندگی کی خوشگواری کا آدھا حصہ ہے) حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ کا بستر چمڑے کا ہوتا تھا اور اس میں کھجور کے ریشے بھرے ہوتے تھے ۔ (بخاری) حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ میں نے اہل صفہ کے ستر آدمیوں کو دیکھا۔ ان میں سے کوئی ایسا نہ تھا کہ اس کے پاس اوڑھنے باندھنے کے لیے پورا کپڑا ہوتا کسی کے پاس صرف چادر ہوتی تھی کسی کے پاس صرف تہہ بند جس کو وہ اپنی گردنوں میں باندھ لیتے تھے ۔ وہ کسی کے نصف پنڈلی تک پہنچتا اور بعض کے ٹخنوں تک ۔ وہ اپنے ہاتھ سے پکڑے رہتے تھے کہ کوئی برہنہ نہ دیکھے ۔ (بخاری) یہ اہل صفہ وہ لوگ تھے جنھیں دنیا میں تبلیغ کی غرض سے بھیجنے کے لیے مسجد نبویؐ کے صحن میں ایک چبوترہ پر ٹریننگ دی جا رہی تھی ۔ مسجد ہی میں سارے ضروری معاملات طے ہوتے تھے مسجد ہی سے اس وقت روحانی سیاسی تعلیمی ثقافتی اور سماجی مرکز کا کام لیا جاتا تھا ۔ اسی طرح حکومت کے نظم و نسق کے لیے عہد نبوی کے سارے ادارے سادگی کا نمونہ تھے ۔

کیا دنیا کی تاریخ میں حضرت عمرؓ جیسا کوئی حکمراں مل سکتا ہے جس کی معاشرت یہ ہو کہ قمیص میں دس دس پیوند لگے ہوں ۔ کاندھے پر مشک رکھ کر غریب عورتوں کے ہاں پانی بھر آتا ہو تفتیش حالات کے لیے راتوں میں گشت لگاتا ہو اور فرش خاک پر پڑا رہتا ہو ۔ جہاں جاتا ہو تنہا چلا جاتا ہو ۔ دربار، نقیب حشم و خدم کے نام سے آشنا نہ ہو اور پھر رعب داب کہ عرب و عجم اس کے نام سے لرزتے ہوں ؟ اس غیر معمولی حکمراں کا جلوس کس طرح نکلا تھا ۔ ؟

بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ اور اسلام

بیت المقدس کا سفر ایک اونٹ کے ساتھ ہوا۔ آپ کے ساتھ آپ کا غلام تھا۔ دونوں باری باری اونٹ پر سوار ہوتے حتیٰ کہ بیت المقدس پہنچنے کے وقت سواری پر بیٹھنے کی باری غلام کی پڑی اور خود حکمراں کے ہاتھ میں اونٹ کی نکیل! چاروں طرف سے لوگوں کا ہجوم اور شور و غل تھا۔ لوگ پہچان تک نہ سکے۔ انتظار کرتے ہی رہ گئے کہ حکمراں کب پہنچتا ہے؟

فضول خرچی کے تمام طریقوں کے سدباب اور ان کی اصلاح کے لیے اسلام نے مختلف قدم اٹھائے مثلاً جوے شراب اور زنا کو حرام، لہو و لعب کی بہت سی عادتوں کو ممنوع قرار دیا ہے۔ مخرب اخلاق سامان تعیش والی صنعتوں اور تجارتوں کی اجازت نہیں دی جاتی۔ موسیقی غنا، غضِ بصر وغیرہ کے طبعی رجحان کو حدود کا پابند بنایا جاتا ہے قیمتی ملبوسات زر و جواہر کے زیورات، سونے چاندی کے ظروف، تصاویر مجسموں کے لیے نبی اکرمؐ سے ایسے سخت احکام مروی ہیں جو معاشی ڈھانچے میں عمدہ تبدیلی لا سکتے ہیں۔ ان کی روح یہ ہے کہ جو دولت تمہارے بہت سے غریب بھائیوں کی ناگزیر ضرورتیں پوری کر سکتی ہے اسے محض اپنے جسم اور گھر کی مصنوعی تزئین اور آرائش پر صرف کرنا شقاوت و بدترین خود غرضی ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بدتدبیری یا کم عقلی کی بنا پر اپنی دولت کو نا رد طریقے سے تباہ کر رہا ہو تو حکومت اس کی دولت و جائداد اپنے انتظام میں لے لے گی اور اپنے طور پر اس کی ضرورت کا بندوبست کرے گی۔ لَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا (النساء) اسلام کہتا ہے کہ مرنے کے بعد جس جسم کو اللہ نے اٹھا لیا لاکھوں کروڑوں روپیہ صرف کر کے پختہ شاندار عمارتوں کے ذریعہ اس نام باقی رکھنے کی حماقت نہ کی جائے۔ اس دنیا میں ذرائع معاش میں سے ہر شخص کا صرف اس وقت تک حصہ جب تک کہ وہ قانون قدرت کے مطابق اس کا ضرورتمند ہے اور اس کی بقائے حیات اس پر منحصر ہے۔ ماد یادگاروں کی تعمیر کا سارا خرچ دراصل خدا کے زندہ بندوں کا حق ہوگا۔

غرضکہ اسلام نے انسان کو جس قسم کی زندگی بسر کرنے کی ہدایت کی ہے وہ ایک ایسی سادہ زندگی ہے اس کی ضروریات اور خواہشات کا دائرہ اتنا وسیع ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ ایک اوسط درجے کی آمدنی میں گ نہ کر سکے۔ بھلا اس مرقعِ حیات میں کہیں بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ سامنے آتا ہے یا اولاد کو محدود کرنے کا!

ٹیکسوں کا مسئلہ

ٹیکسوں کا وہ مفہوم جو موجودہ زمانے کی حکومتوں میں رائج ہے اسلامی نظام میں ناپید ہے اس لیے کہ آج کل جو ٹیکس پبلک پر لگائے جاتے ہیں وہ عموماً عدل انصاف کے خلاف اور حکومت وارکانِ حکومت کے ان مفادات کی خاطر لگائے جاتے ہیں جن کا پبلک م

کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اسلام کے دستوری نظام میں خراج، جزیہ، عشر، زکوٰۃ، خمس وغیرہ قسم کے ٹیکس اسی قسم سے مقرر کیے گئے ہیں کہ وہ پبلک کی انفرادی و اجتماعی ضروریات کے کام آئیں اس لیے وہ عام طور پر مزید ٹیکس عائد کرنے کو جائز نہیں سمجھتا۔" (اسلام کا اقتصادی نظام از مولانا محمد حفظ الرحمٰن)

البتہ اگر کوئی ہنگامی اہم اجتماعی ضرورت درپیش ہو جائے مثلاً جنگ قحط سالی، رفاہ عام اور عوام کی غیر معمولی بے روزگاری تو اغنیا اور اہل ثروت پر حکومت کی جانب سے امدادی ٹیکس عائد کیے جا سکتے ہیں جنھیں ضرائب کہتے ہیں اس جگہ جزیہ کی پوزیشن بھی سمجھ لینا بہتر ہے۔ جزیہ بدل ہے اس امان و حفاظت کا جو ذمیوں کو اسلامی حکومت میں عطا کی جائے گی۔ یہ اس آزادی کی قیمت ہے جو ذمیوں کو اسلامی اقتدار کے تحت اپنی گمراہیوں پر قائم رہنے کے لیے دی جاتی ہے اور اس قیمت کو اس صالح نظام حکومت کے نظم و نسق پر صرف ہونا چاہیے جو انھیں آزادی دیتا ہے اور جو ان کے حقوق کی حفاظت کرتا ہے ـــــ لیکن اسلامی نظام میں جہاں عدل و انصاف کا یہ عالم ہے کہ" عدل پر قائم رہو خواہ اپنے قریبی رشتہ دار کے خلاف کیوں نہ ہو" ایسا موقع بھی آیا ہے کہ جہاں ذمیوں کی حفاظت کے انتظام میں دشواری نظر آئی۔ جزیہ لینا بند کر دیا گیا۔ عدل و انصاف کی فضا میں اسلامی نظام کے عائد کردہ ٹیکسوں سے رعایا کو کوئی بار بھی محسوس نہیں ہوتا۔ دوسری طرف چونکہ یہ نظام ایسا ماحول پیدا کرتا ہے کہ ضروریات زندگی پر نہ زیادہ خرچ آتا ہے نہ دیگر مسائل کی پیچیدگیاں بڑھتی ہیں عوام کی کمر ٹوٹنے نہیں پاتی۔

جنسی آوارگی کا مسئلہ تمدن کے سنگ بنیاد یعنی عورت مرد کے تعلق کے بارے میں قرآن و سنت کے مستحکم احکام موجود ہیں۔ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (البقرہ)

عورتیں تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو۔ تاکہ ایک دوسرے کی ستر پوشی کریں اور ایک دوسرے کو ان اثرات سے بچائیں جو ان کی عزت اور ان کے اخلاق پر حرف لانے والے ہوں) مردوں کو عورتوں پر قوام بنا کر خانگی نظم کو برقرار رکھا گیا ہے۔ اور وراثت، مہر اور نفقہ کے ذریعہ عورتوں کو بہت سے معاشی حقوق حاصل ہیں۔ پھر روزی کی خاطر آنگن سے باہر نکلنے کا سوال کیا؟ نبی اکرمؐ کا ارشاد ہے: "المرأۃ عورۃ فاذا خرجت استشرفها الشیطن (ترمذی) عورت پوشیدہ رکھی جانے والی مخلوق ہے۔ جب وہ باہر نکلتی ہے تو شیطان اس کی طرف جھانکتا ہے) نامحرموں اور اجنبی مردوں سے اختلاط میں صاف نیت و نیک ارادوں کے باوجود اس کا ہر قدم معصیت کی راہ طے کرتا ہے۔ اور اس کے متاعِ اخلاق کے لٹ جانے کا خدشہ ہے تخلیق آدم کے حوالے

بعد ہی بنی آدم کو مخاطب کر کے اللہ نے فرمایا ہے :۔ یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْكُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِیْشًا وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَیْرٌ (الاعراف) اے بنی آدم ہم نے تمہارے لیے ایسا لباس اتارا ہے جو تمہارے لیے ستر پوشی کا ذریعہ بھی ہو اور زینت کا بھی ـــــ مگر محض ستر پوشی و زینت ہی کافی نہیں۔ اس کے ساتھ ضروری ہے کہ تمہارے دلوں میں تقویٰ بھی ہو ـــــ اور تقویٰ کا لباس سب لباسوں سے بہتر ہے۔ غیر تقویٰ والے لباس سے عریانیت آتی ہے جسے آدم و حوا نے محسوس کیا تھا اور آج کی تہذیب اور غلط روی نے بھی یہی عریانیت پھیلا رکھی ہے۔ وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاھلیۃ الاولی (اور اپنے گھروں میں بیٹھی رہو اور اگلے دور جاہلیت کی طرح زیب و زینت کا اظہار نہ کرتی پھرو۔) اس تاکید کے برخلاف فیشن و مصنوعی حسن کی دلدادہ جو عورتیں نائیلون وغیرہ میں ملبوس بن ٹھن کر ناز و ادا کے ساتھ معاشرے میں چلتی پھرتی ہیں۔ ایسی ہی عورتوں کے لیے نہایت سخت الفاظ میں وعید سنائی گئی ہے۔ قال رسول اللہ نساء کاسیات عاریات ممیلات رؤسھن کالبخت المائلۃ لا یدخلن الجنۃ ولا یجدن ریحھا (مسلم) رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ جو عورتیں کپڑے پہن کر بھی ننگی ہی رہتی ہیں اور اپنے اعضاء کو لچکاتی ہوئی اور لچکتی ہوئی چلتی ہیں جن کی گردنیں بختی اونٹ کی طرح ناز سے بڑھی ہی رہتی ہیں وہ نہ جنت میں داخل ہوں گی اور نہ اس کی خوشبو پائیں گی۔

اسلامی شریعت نے آزادانہ اختلاط و فحاشی کی اشاعت پر پابندی لگا دی ہے اور ناجائز تعلق و عصمت فروشی کو ممنوع قرار دیا ہے اور نکاح کے ذریعہ تعلق کو جائز۔ ان ساری اصلاحات کے بعد بھی اگر عفت کی راہ میں رکاوٹ ہو تو تعزیری احکام بنائے گئے ہیں محض نفس پرستی کی خاطر طلاق دینے والے کو رسولؐ اللہ نے ملعون ٹھہرایا ہے اور طلاق کو ابغض المباحات (جائز کاموں میں سب سے زیادہ برا کام) کہا ہے۔

رہا ملت کی قیادت و رہنمائی میں عورتوں کا حصہ۔ تو اس کے لیے رسول اللہ نے فرمایا" ھلکت الرجال حین اطاعت النساء (مستدرک حاکم) مرد ہلاک ہوئے جب وہ عورت کی اطاعت کرنے لگے) جب آپؐ کو معلوم ہوا کہ اہل ایران نے کسریٰ کی بیٹی کو اپنا بادشاہ بنایا ہے تو آپ کا پُرزور اعلان تھا کہ" لَنْ یُّفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا اَمْرَھُمْ اِمْرَاَۃً (بخاری، کتاب المغازی) وہ قوم کبھی کامیاب نہیں ہوگی جس نے اپنی زمام اقتدار ایک عورت کے حوالے کر دی ہو۔

فیملی پلاننگ کے متعلق اسلام کا نظریہ

اہل مغرب میں ضبط ولادت کے رواج اور پھر اس سے نفرت کا جو نقشہ دیکھا گیا اس سے ثابت ہو گیا کہ اس کو رائج کرنا

انسان کے لیے سخت نقصان دہ ہے۔ اب اسلام کا نظریہ بھی ملاحظہ ہو۔ ربنا الذی اعطیٰ کل شیٔ خلقہ ثم ھدیٰ (ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر شے کو اس کی خاص بناوٹ عطا کی پھر اس کو ان اغراض کے پورا کرنے کی راہ بھی بتادی جن کے لیے وہ پیدا کی گئی ہے۔ نساءکم حرث لکم فاتوا حرثکم انّٰی شئتم وقدموا لانفسکم (تمہاری عورتیں تمہارے لیے کھیتیاں ہیں، پس تم جس طرح چاہو اپنی کھیتیوں میں جاؤ اور اپنے لیے آئندہ کا بندوبست کرو۔) وَلَا تَقْتُلُوٓا اَوْلَادَکُمْ خَشْیَۃَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُھُمْ وَاِیَّاکُمْ اِنَّ قَتْلَھُمْ کَانَ خِطْأً کَبِیْرًا (اور تم اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو۔ ہم انھیں بھی رزق دیں گے اور تمہیں بھی۔ درحقیقت ان کا قتل ایک بڑی خطا ہے۔) یہاں افلاس آجانے کا اندیشہ ہے اور سورۂ الانعام میں خشیۃ املاق کے بجائے "من املاق" آیا ہے جس کے معنی ہیں کہ افلاس آچکا ہے۔ یہاں افلاس آجانے میں قتل اولاد کو منع کیا جا رہا ہے۔ کیونکہ یہ عمل تمدن انسانی اور عمرانیات کے لیے مضر ہے ایک مرتبہ ایک شخص آں حضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟ آپ نے فرمایا:- اَنْ تَدْعُوَ لِلّٰہِ نِدًّا وَّھُوَ خَلَقَکَ (یہ کہ تو اللہ کا نظیر و مثیل قرار دے حالانکہ اس نے تجھے پیدا کیا۔) اس نے پھر پوچھا اس کے بعد کون سا بڑا گناہ ہے؟ آپ نے جواب دیا۔ اَنْ تَقْتُلَ وَلَدَکَ اَنْ یَّطْعَمَ مَعَکَ (یہ کہ تو اپنے بچے کو قتل کردے اس خیال سے کہ وہ تیرے کھانے میں شریک ہوگا۔)

ضبط ولادت کا مسئلہ آج ہی کا نہیں ہے۔ بلکہ قدیم زمانے سے آج تک مختلف ادوار میں جاہل انسانوں نے معاشی اسباب کی بنا پر اسے اٹھایا۔ قدیم زمانے میں افلاس کے خوف سے قتل اطفال اور اسقاط حمل عمل میں آتا تھا اور آج یہ تیسری تدبیر ضبط ولادت یا فیملی پلاننگ اختیار کی جارہی ہے قرآن کریم اس گناہ عظیم سے باز رکھنے کی تاکید کر رہا ہے اور جاہلیت کے اس معاشی استدلال کی تردید بھی جس کی بنا پر ایک ظلم اور "خطاء کبیر" کو حق بجانب ٹھہرانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ کھانے والوں کو گھٹانے کی تخریبی کوشش چھوڑ کر لوگوں کو ان تعمیری پروگراموں میں اپنی قوتیں اور صلاحیتیں کھپانی چاہییں جن سے اللہ کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق رزق میں افزائش ہوا کرتی ہے۔ اللہ کہتا ہے کہ رزق کے خزانے تو ہمارے قبضہ و اختیار میں ہیں۔ اس کی فکر تم خواہ مخواہ کیوں کرتے ہو؟ رزق کی اضافت خاص اپنی طرف کرکے یہ جتلانا مقصود ہے کہ اس کے ادنیٰ سے فیضان سے بے شمار اسباب رزق و سامان معیشت چشم زدن میں رونما ہو سکتے ہیں۔ اور یہ کہ جس طرح وہ پہلے آنے والوں کو روزی دیتا رہا ہے بعد کے آنے والوں کو بھی کیا نہ دے گا؟ (استفادہ از تفہیم القرآن)

تاریخی ریکارڈ کی ایک مثالی اسٹیٹ

کیا اس سارے جائزے سے صاف پتہ نہیں چلتا کہ اسلام زندگی کے ہر شعبہ میں انسان کو فطری حالت سے قریب تر رکھنا چاہتا ہے اور زندگی کے کسی پہلو میں بھی مصنوعی پن کو پسندیدہ نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ مصنوعی پن ہٹ جائے تو پھر راہ ہموار اور آسان ہے۔ مذکورۂ بالا مسائل کی ساری پیدا کردہ مشکلات دور ہو سکتی ہیں اور سامانِ معیشت میں فراوانی آ سکتی ہے لیکن ایک انسان اس وقت تک صحیح نشو و نما نہیں پا سکتا جب تک کہ وہ اپنے ان حقوق و فرائض کو ٹھیک ٹھیک نہ ادا کر دے جو خدا کی مخلوق ہونے اور اللہ کے کنبے کے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے اس کی ذات کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اور یہ حقوق و فرائض اس وقت تک انجام نہیں پا سکتے جب تک کہ کوئی صحیح و صالح نظامِ اجتماعی موجود نہ ہو۔ سوال ہے کہ کیا ان سب حقیقتوں کو عملی جامہ پہنایا جا سکتا ہے؟ کیوں نہیں؟ جب تاریخ کے صفحات پر عہدِ نبویؐ اور خلفائے راشدین کے زمانے کی مثالی اسٹیٹ بطور ریکارڈ کے محفوظ ہے تو یہ تاریخ پھر کیوں نہیں دہرائی جا سکتی؟ موجودہ انسانی معاشرے کی آخر کون سی برائی تھی جو عرب کے باشندوں میں اس وقت نہ تھی؟ اور جب زندگی کا نقشہ قرآن و سنت کی روشنی میں بدلا گیا تو پھر کون سا طبقہ ایسا تھا جس میں قابلِ تقلید اوصاف نہ پیدا ہو گئے ہوں۔

خلیفۂ وقت بھی عدالت میں آتا تو اس کے ساتھ غریب مدعی جیسا مساویانہ سلوک برتا جاتا۔ اگر کوئی قاضی خلیفہ کو رعایت دینی بھی چاہتا تو خلیفہ خود انکار کر دیتا۔ مزدور جس کا کام کرتا پوری دیانتداری کے ساتھ کرتا اور کام لینے والا پسینہ خشک ہونے سے پہلے مزدوری چکا دینا اپنا فرض سمجھتا۔ قرض دار سے قرض وصول کرنے کے لیے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا نہ پڑتا۔ تاجر دوکاندار چور بازاری اور ناجائز نفع خوری کا تصور بھی نہ کرتا۔ وہ اسے بھی حرام سمجھتا تھا کہ کسی چیز کو اس لیے روکے رکھے کہ گراں ہونے پر اسے فروخت کرے گا۔ شراب خوری اور بدکاری کا نام و نشان مٹ گیا۔ بلکہ مجرمین خود آ آ کر اپنے کو دنیاوی سزا کے لیے پیش کرنے لگے تاکہ اخروی سزا سے بچ جائیں ـــ یہ ہے ہلکا سا خاکہ اس مثالی اسٹیٹ کا جس کے معاشی نظام کے نتیجے میں عوام الناس کی وہ فارغ البالی آئی کہ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں ایک شخص مدینے کی گلیوں میں ڈھونڈھتا پھرتا لیکن کوئی شخص ایسا نہ ملتا کہ جو صدقہ اور زکوٰۃ وصول کرنے کا حق دار ہو۔

اگر آج بھی حضرت موسیٰؑ کی جزیرہ نمائے سینا کی سی زبردست مردم شماری اور حضرت عمرؓ کے زمانے کے سے صحیح و دیانتدارانہ اعداد و شمار تمام معاشی مسائل کے جمع کرا لیے جائیں (صحیح و دیانتدارانہ اعداد و شمار اس لیے کہا جا رہا ہے کہ آج کل اکثر غلط اعداد و شمار کی بنا پر غلط فیصلے قائم کر لیے جاتے ہیں) تو ان کی ترتیب سے معاشی مسائل کا

عادلانہ توازن ہوسکتا ہے اور جب برائیوں اور خرابیوں کی صحیح نشان دہی ہو جائے اور معاشرہ اپنی بے چینی کا
اصل سبب سمجھ لے تو پھر اسے انداز فکر بدل دینا چاہیے مختلف محکموں میں محض خوش اخلاقی کا ہفتہ
(Courtesy week) منانے سے تعلقات خوشگوار نہیں ہوسکتے۔ جب اصل مسئلہ یہ ہے کہ نفس انسانی کو
صحیح رخ پر لگایا جائے تو واقعی صحیح رخ پر اسے لگا دینے سے ایک بار پھر کیا انسانیت میں نئی زندگی نہ آجائے گی؟
انسانیت کے وہ ذخیرے جن کی افادیت اور جن کے مصرف کی کسی کو خبر نہیں کام کے نہ ہو جائیں گے؟ ہر ایک کو
اس کی صحیح جگہ نہ مل جائے گی؟ اور معاشرۂ انسانی کا ایک ایسا گلدستہ نہ تیار ہوسکے گا جو مثالی ہوگا؟
اگر ان خطوط پر ہندستان قدم اٹھائے تو کیا اس کے مسائل حل نہیں ہوسکتے؟

مورخین کی تاریخ دنیا جلد ۷ صفحہ ۱۷۵ کے مصنفین لکھتے ہیں کہ ——— "بازنطینی
حکومت اس زمانے میں انتہائی انحطاط و تنزل کے عالم میں تھی اور یہ تنزل ٹیکس اور محصول کی زیادتی، تجارت میں
پستی، زراعت سے غفلت شہروں کی آبادی میں روز افزوں کمی کا نتیجہ تھی۔ ان مصنفین کے خیال میں گویا بڑھتی ہوئی
آبادی ارتقاء تھی! الحاصل نہ دنیا میں اور نہ ہندستان میں بڑھتی ہوئی آبادی کا درحقیقت کوئی مسئلہ ہے۔ اگر رزق
میں کمی محسوس ہو رہی ہے تو یہ اپنے کرتوت و اعمال کے نتائج میں ہے۔ اس لیے ضبط ولادت سے مسائل حل نہ ہوں گے
ہوں گے تو صرف ایک علاج سے اور وہ ہے اپنے کرتوت و اعمال کو درست کرنا اسی صحیح و متوازن راہ پر چل کر
جس کا ایک خاکہ اوپر پیش کیا گیا ہے۔

پوری دنیا میں کمیونسٹ تقریباً ۴ کروڑ ہیں لیکن ان کے نظریات کس طرح آدھی دنیا پر حاوی ہیں۔ ہندستان میں
تو دو لاکھ سے بھی کم ہیں۔ جس صحیح و متوازن راہ میں علاج کا سراغ مل رہا ہے وہ دنیا کی مشترکہ شاہ راہ ہے لیکن اس
پر ایمان رکھنے والوں کی آبادی ہندستان میں تقریباً پانچ کروڑ ہے اور یہ پانچ کروڑ اس خیر امت کا ایک جزو ہے
جو سارے انسانوں کے لیے (اس وقت دنیا کے سارے انسان تقریباً ۳ ارب ہیں) اٹھائی گئی تھی (اُخْرِجَتْ
لِلنَّاسِ) کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیں۔ تو کیا اس وقت یہ پانچ کروڑ کی آبادی ا-
وطنی بھائیوں کی چالیس کروڑ کی آبادی کو تباہی سے بچانے کے لیے خود اسی شاہراہ پر کھڑے ہو کر راستہ نہ دکھ
ختم شد

انسان کا اخلاقی وجود

مکارمِ اخلاق کی تکمیل

قسط (۸)

(سید احمد قادری)

سلام، شریعت اسلامیہ میں آپس کے اتحاد و اتفاق، محبت و الفت اور یگانگت

جواب سلام میں احسان

کی ایک بڑی علامت ہے۔ یہ ایک تدبیر ہے جو باہمی کدورتوں، رنجشوں اور
اختلافات کو مٹانے کے لیے سکھائی گئی ہے کیونکہ سلام کی حقیقت یہ ہے کہ ایک مومن اپنے قلب کی اس کیفیت کا اظہار
کرتا ہے جو دوسرے مومن کے لیے اس میں موجود ہوتی ہے۔ یہ ایک دعا ہے جو وہ اپنے بھائی کو دیتا ہے۔ خدا
کی بارگاہ میں ایک اچھی سفارش ہے جو وہ اپنے بھائی کے لیے کرتا ہے وہ السلام علیک کہہ کر یہ ظاہر کرتا ہے کہ
میرے پاس تمہارے لیے امن اور سلامتی ہے وہ یہ کہہ کر خدا سے درخواست کرتا ہے۔ اے خدا اس بندے کو
اپنے حفظ و امان میں رکھ اور اس پر اپنی سلامتی نازل فرما! جس دل سے یہ دعا نکلے اس میں مخاطب کے لیے رنجش، کدورت
بغض اور عناد کیسے جمع ہو سکتے ہیں۔ اور اگر یہ الفاظ محض رسماً ادا کر دیے گئے ہیں۔ دل سے ان کا کوئی تعلق نہیں تو پھر
یہ سلام کا بے روح ڈھانچہ ہوگا، فی الواقع سلام نہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ سلام کا جواب دینے والے کے لیے اللہ نے
احسان کی ترغیب دی ہے یعنی وہ دعا دینے والے کو اس کی دعا سے بہتر دعا دے وہ اس سے بڑھ چڑھ کر
اپنے خلوص اور اس کے لیے اپنے جذبۂ محبت کا اظہار کرے۔ وہ خدا کی بارگاہ میں سلام کرنے والے سے بہتر
سفارش لے جائے اور اس کو یقین دلائے کہ میرے پاس بھی تمہارے لیے اس سے زیادہ امن و سلامتی ہے جس قدر
میرے لیے تمہارے پاس ہے۔ غور کیجیے، خلوص کے ساتھ اگر سلام و جوابِ سلام موجود ہے تو پھر ایسے دو شخصوں کے
درمیان بغض و عناد کا کیا سوال باقی رہتا ہے۔ قرآن میں ہے :-

وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ

اور جب کوئی تمہیں سلام کرے تو اس سے بہتر

مِنْهَا أَوْ رُدُّوْهَا إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا ۝ (نساء ۸۶)

اس کا جواب دو یا (کم سے کم) وہی لوٹا دو بے شک اللہ ہر چیز کا حساب کرنے والا ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ ابتداءً کسی مسلمان کو سلام کرنا بڑی نیکی ہے لیکن واجب نہیں ہے اور سلام کا جواب سلام سے دینا واجب ہے اور بہتر طریقے سے جواب دینا احسان ہے جس کی ترغیب اللہ تعالیٰ نے دی ہے۔ بہتر طریقے کے ساتھ جواب کی تعلیم و تشریح احادیث میں ملتی ہے۔

عن عمران بن حُصين رضؓ أَنَّ رَجُلًا جَاءَ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ السَّلَامُ عَلَيْكُمْ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَشْرٌ وَجَاءَ آخَرُ فَقَالَ السَّلَامُ عليكم ورحمةُ الله فقال عشرون ثُمَّ جَاءَ آخَرُ فقال السلام عليكم ورحمة الله وبركاته فقال النبي صلى الله عليه وسلم ثلثون (ترمذی)

عمران بن حصین سے مروی ہے کہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا السلام علیکم تو حضور نے فرمایا اس کے لیے دس نیکیاں ثابت ہوئیں اس کے بعد دوسرے شخص آئے اور انھوں نے کہا۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ تو آپ نے فرمایا اس کے لیے بیس نیکیاں ثابت ہوئیں۔ پھر تیسرے شخص آئے انھوں نے کہا السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ۔ آپ نے فرمایا اس کے لیے تیس حسنات ثابت ہوئے۔

یہ حدیث اگرچہ ابتداءً سلام کے سلسلے کی ہے لیکن اسی سے بطریق احسن جواب کی تعلیم بھی نکلتی ہے۔ یعنی اگر کوئی صرف سلام کہے تو جواب میں ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ کا اضافہ کیا جائے اور اگر کوئی ابتداءً ہی رحمت و برکت کو بھی اپنے سلام میں داخل کرے تو اسی طرح جواب دینا بطریق حسن جواب میں داخل ہے۔ حضرت ابن عباس و ابن عمر رضی اللہ عنہم "وبرکاتہٗ" پر اضافہ ناپسند کرتے تھے۔ ابن عباسؓ فرماتے تھے کہ سلام برکت تک پہنچ کر منتہی ہو جاتا ہے۔ یعنی اب اس پر کوئی اور لفظ نہیں بڑھانا چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض روایتوں میں آتا ہے کہ ایک شخص نے آپ کو "وبرکاتہٗ" تک سلام کیا۔ آپ نے جواب میں اسی کو لوٹا دیا تو اس شخص نے کہا یا رسول اللہ! قرآن میں تو بطریق احسن جواب کا حکم ہے آپ نے فرمایا۔ تم نے کوئی فضیلت چھوڑی کب کہ میں اضافہ کرتا۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وبرکاتہ پر اضافہ نہ کیا جائے ویسے بعض احادیث میں "ومغفرتہ ورضوانہ" کے الفاظ بھی "وبرکاتہ" کے بعد آئے ہیں۔

ابتداءً سلام کہنے کو اگرچہ واجب اور فرض نہیں کہا گیا ہے لیکن اس کی فضیلت میں جو حدیثیں آئی

اور اس احسان کی جس طرح ترغیب دی گئی ہے وہ اپنی جگہ اس قدر اہم ہے جو اسے وجوب کے قریب تک پہنچا دیتی ہے۔ یہاں چند حدیثیں پیش کی جاتی ہیں:۔

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والذی نفسی بیدہ لا تدخلون الجنۃ حتی تؤمنوا ولا تؤمنوا حتی تحابوا اولا ادلکم علی شیئ اذا فعلتموہ تحاببتم افشوا السلام بینکم۔ (مسلم، ترمذی)

ابی ہریرہؓ سے مروی ہے انھوں نے کہا کہ رسول خدا نے فرمایا۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ تم جنت میں داخل نہ ہوگے یہاں تک کہ ایمان لاؤ اور تم مومن نہ ہوگے یہاں تک کہ ایک دوسرے سے محبت کرو کیا میں تمہیں ایک ایسی چیز نہ بتاؤں کہ جب تم اسے کروگے تو آپس میں محبت ہوگی وہ شے یہ ہے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو بکثرت سلام کیا کرو۔

اس حدیث سے بصراحت معلوم ہوا کہ باہمی محبت کے بغیر ایمان کی تکمیل نہیں ہوتی اور باہمی محبت کا ذریعہ سلام ہے لہٰذا خود سلام تکمیل ایمان کا ذریعہ بن گیا معمولی غور و فکر سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ کسی گروہ کی شیرازہ بندی کے لیے باہمی محبت و الفت کو وہی حیثیت حاصل ہے جو کسی ضخیم کتاب کی جزبندی کے لیے مضبوط ڈورے کی ہوتی ہے اگر مضبوط ڈورا موجود نہ ہو تو اس کی جزبندی نہیں ہو سکتی اور اگر جزبندی کے بعد وہ ڈورا بوسیدہ ہو جائے یا ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے تو پھر اس کتاب کے اوراق منتشر ہو جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ امت مسلمہ کی شیرازہ بندی اور اس کی اجتماعی روح کو سلامت رکھنے کے لیے تمام ایسی تدبیریں بتائی گئی ہیں جن سے باہمی الفت و محبت باقی رہتی ہے بلکہ ترقی کرتی جاتی ہے۔ یہ اللہ واسطے کی محبت اگر نہ ہو تو امت مسلمہ اپنے مقصد وجود کو بھول جائے گی۔ پھر نہ اجتماعیت باقی رہے گی اور نہ اعلائے کلمۃ اللہ کی جد و جہد کامیاب ہو سکے گی۔ ایک دوسری حدیث میں ہے

اولی الناس باللہ من بدءھم بالسلام ٥ (ابوداؤد۔ ترمذی)

اللہ سے قریب تر وہ شخص ہے جو لوگوں کو سلام کرنے میں پہل کرتا ہے۔

امام بخاریؒ نے کتاب الایمان میں یہ حدیث درج کی ہے:۔

عن عبد اللہ بن عمرو ان رجلا سأل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ای الاسلام خیر قال تطعم الطعام

ایک شخص نے حضورؐ سے پوچھا۔ اسلام کی کون سی خصلت بہتر ہے؟ آپ نے فرمایا۔ تمہارا لوگوں کو کھانا کھلانا اور سلام کرنا، اس کو جسے تم جانتے

وَتَقْرَءُ السَّلَامَ عَلٰی مَنْ عَرَفْتَ وَمَنْ لَمْ تَعْرِفْ　ہو اور اس کو بھی جسے نہیں پہچانتے۔

سلام عہدِ رسالت اور عہدِ صحابہ میں

سلام کی حقیقت اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جو حکم اوپر گزر رہا ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلنا ہی تھا کہ مسلمانوں کے درمیان سلام کی بکثرت اشاعت ہو چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ عہد رسالت اور عہدِ صحابہ میں اس کثرت سے مسلمان ایک دوسرے کو سلام کرتے تھے کہ آج وہ چیز ہمیں عجیب معلوم ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اب مسلمان عام طور سے اس کی حقیقت سے ناواقف ہو گئے ہیں اور محض رسماً کبھی کبھی ایک دوسرے کو سلام کیا کرتے ہیں۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل یہ تھا کہ آپ کسی کے گھر تشریف لے جاتے تو تین بار سلام کرتے۔ ایک سلام استیذان یعنی گھر میں داخل ہونے کی اجازت طلب کرنے کے لیے، دوسرا ملاقات کا سلام اور تیسرا رخصتی سلام۔

صحابہ کو بھی آپ کی تعلیم یہ تھی کہ مسلمانوں کی کسی مجلس میں جائیں تو دو بار سلام کریں۔ ایک وہاں پہنچنے کے بعد اور دوسرا وہاں سے رخصت ہوتے وقت۔ آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ دوسرا سلام بھی اسی درجے کا ہے جس درجے کا پہلا سلام۔ پہلے سلام کو دوسرے پر فوقیت نہیں ہے۔ استیذان (کسی گھر میں داخل ہونے کی اجازت طلب کرنا) کے لیے سلام کی تعلیم قرآن میں موجود ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قولاً و عملاً اس کو کر کے دکھایا ہے۔ ایک صحابی کہتے ہیں کہ سفر میں ایک دفعہ میں حضور کے خیمے میں بلا اجازت داخل ہو گیا تو آپ نے فرمایا کہ تم باہر واپس جاؤ اور کہو "السلام علیکم کیا میں داخل ہو سکتا ہوں؟"

سلام کی کثرت کا یہ حال تھا کہ جب اتفاقی طور پر راستے میں یا سفر میں درختوں کی آڑ آ جاتی تھی تو اس آڑ سے نکلتے ہی صحابہ ایک دوسرے کو سلام کرتے تھے۔ سلام کرنے میں چونکہ اللہ تعالیٰ اجر عطا کرتا ہے اس لیے ان میں کے بعض بازار صرف اس لیے جاتے تھے کہ لوگوں کو سلام کر کے اجر حاصل کریں۔

سلام کی اہمیت اور اس کے شعارِ اسلامی ہونے کی جہت سے بہت سارے مسائل اس سے متعلق ہیں جن کی تفصیل قرآن، حدیث اور فقہ میں ملتی ہے یہاں وہ ساری تفصیل پیش کرنا مقصود نہیں ہے۔ یہاں جو کچھ لکھا گیا اس کی غرض یہ تھی کہ سلام و جواب سلام کے احسان کو اسلامی جماعت کے اتحاد میں بڑا دخل ہے اور مسلمان اس کے محتاج ہیں کہ وہ اس شعار کی حقیقت کا شعور حاصل کریں۔

محسنین کی صفات

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مبحثِ احسان کو ختم کرتے ہوئے محسنین کی چند صفات کا ذکر کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ذہن میں رکھنے کی ہے کہ قرآن میں جو محسنین کا ...

متقین کی جو صفات بیان کی گئی ہیں وہ سب بدرجۂ اولیٰ محسنین کی صفات بھی ہیں کیونکہ احسان، ایمان اور تقویٰ پر ایک مستزاد صفت ہے جیسا کہ سورۂ مائدہ کی آیت ۹۳ سے سمجھ میں آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مومن، متقی اور محسن کے الفاظ کو ایک دوسرے کی جگہ پر بھی استعمال کیا گیا ہے۔ ایک ہی صفات ہیں جو کہیں متقین کے لیے لائی گئی ہیں اور انہیں کو کہیں محسنین کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ اس کی مثال ہمیں سورۂ بقرہ اور سورہ لقمٰن کی ابتدائی آیتوں میں ملتی ہے۔

سورۂ البقرہ میں یہ کہہ کر کہ کتاب اللہ متقین کے لیے ہدایت ہے ان کی حسب ذیل صفات بیان کی گئی ہیں:۔

(۱) وہ ایسی چیزوں کا یقین رکھتے ہیں جن کو انھوں نے دیکھا نہیں یعنی وہ مومن بالغیب ہیں۔ (۲) وہ نماز قائم کرتے ہیں۔ (۳) اللہ کے دیے ہوئے رزق میں سے خرچ کرتے ہیں۔ (۴) نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جو کچھ نازل ہوا اور آپ سے پہلے کے انبیاء پر جو کچھ نازل ہوا سب پر ان کا ایمان ہے۔ (۵) وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

سورۂ لقمٰن میں یہ کہہ کر کہ کتاب الٰہی محسنین کے لیے رحمت اور ہدایت ہے ان کی تین صفات کا ذکر کیا گیا ہے وہ نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں ـــــ متقین ومحسنین کی یہ وہ بنیادی صفات ہیں جن کے بغیر تقویٰ اور احسان کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوسرے مقامات پر جو دوسرے اوصاف بتائے گئے ہیں ان کے لیے یہی بنیادی صفات کسوٹی کی حیثیت رکھتی ہیں اگر آگے کی صفات میں نقص ہو تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ان بنیادی صفات میں نقص رہ گیا ہے۔ ان بنیادی صفات کے بعد اہل احسان کی جو سب سے نمایاں صفت قرآن میں بیان ہوئی ہے وہ جہاد فی سبیل اللہ ہے جان سے بھی اور مال سے بھی۔ جہاد فی سبیل اللہ میں مال خرچ نہ کرنے کو اللہ تعالیٰ نے ہلاکت قرار دیا ہے:۔

انفاق فی سبیل اللہ	وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ وَاَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ o (البقرہ رکوع ۲۴)	اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنی جان کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ احسان کی روش اختیار کرو۔ بلاشبہ اللہ محسنوں کو پسند کرتا ہے۔

یہاں اوپر سے جہاد فی سبیل اللہ کا ذکر چلا آرہا ہے اور اس آیت پر اس کا سلسلہ ختم کر کے آگے حج وعمرہ کے کچھ مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ آیات کی ترتیب خود بتا رہی ہے کہ راہِ خدا میں خرچ کرنے سے مراد جہاد فی سبیل اللہ میں خرچ کرنا ہے۔ اس معاملے میں خرچ نہ کرنے کو ہلاکت قرار دینے کی وجہ ظاہر ہے۔ اگر مسلمان مال کی محبت میں گرفتار ہو کر اللہ کے دین کو سربلند کرنے یا سربلند رکھنے میں اسے صرف نہ کریں۔ ان کے ذاتی مفادات ان کی نگاہ میں عزیز ہو جائیں تو اس کا نتیجہ یہی نکلے گا کہ وہ کمزور رہیں گے اور خدا کے دشمن ان کے مقابلے میں قوی ہو جائیں گے

مسلمان بحیثیت مجموعی مغلوب اور شکست خوردہ ہو کر رہ جائیں گے۔ اس آیت کی تفسیر حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے کی ہے جسے ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن حبان اور حاکم نے روایت کیا ہے۔ حاکم نے کہا ہے کہ یہ حدیث بخاری و مسلم کی شرط پر ہے۔ حدیث کا ترجمہ یہ ہے :۔

اسلم بن یزید کہتے ہیں ہم شہر روم میں تھے کہ رومیوں نے ہمارے مقابلے میں ایک بڑی فوج قلعے سے باہر نکالی مسلمانوں نے بھی ان کے مقابلے میں فوج آگے بڑھائی اہل مصر کے سالار عقبہ بن عامر تھے اور پوری فوج کے امیر فضالہ ابن عبید تھے مسلمانوں کی فوج کا ایک سپاہی نے رومیوں کی صف پر تنہا حملہ کیا اور اس میں گھس پڑا۔ لوگ چیخنے لگے اور کہنے لگے "سبحان اللہ یہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہا ہے (ان کا اشارہ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ کی طرف تھا) یہ سن کر ابوایوب انصاری کھڑے ہوئے اور کہا اے لوگو! تم اس آیت کی یہ تاویل کرتے ہو حالانکہ یہ آیت ہم گروہ انصار کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ جب اللہ تعالٰے نے اسلام کو قوی کر دیا اور اس کے مددگاروں کی تعداد زیادہ ہوگئی تو ہم میں سے بعض نے بعض سے یہ بات کہی کہ ہمارے اموال دیکھ بھال کی کمی کے سبب ضائع ہو رہے ہیں۔ اسلام کی قوت اور مددگاروں کی کثرت کی بنا پر اب ہماری کچھ ایسی ضرورت نہیں ہے تو اب ہم اگر اپنے اموال کی دیکھ بھال اور ضائع شدہ مال کی اصلاح میں مشغول ہو جائیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت اتاری اور ہماری تردید کی اس نے کہا وَأَنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ۔ اس میں تہلکہ کا مطلب جہاد کو ترک کر کے اموال کی دیکھ بھال اور اس کی اصلاح میں مشغول ہو جانا ہے۔ راوی کا بیان ہے کہ ابوایوب انصاری برابر اپنے گھر سے باہر جہاد میں مشغول رہے۔ یہاں تک کہ سرزمین روم میں دفن ہوئے۔

(ترمذی شریف)

اسی مفہوم کی حدیث امام بخاری نے حضرت حذیفہؓ سے روایت کی ہے لیکن ان کی روایت میں صرف اتنا ہے کہ یہ آیت نفقہ میں نازل ہوئی ہے۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ فی النفقہ کا مطلب راہ خدا میں خرچ کرنا ہے حضرت حذیفہ نے جو کچھ کہا ہے وہ تفسیر و تشریح کے ساتھ حضرت ابوایوب کی حدیث میں مذکور ہے۔ ابن حجرؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ اور تابعین کی ایک جماعت سے بھی اس آیت کی یہی تاویل منقول ہے۔

اس آیت اور اس کی تفسیر سے معلوم ہوا کہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے مال خرچ کرنا متقیوں اور محسنوں کی صفت اور خرچ نہ کرنا تقویٰ اور احسان کے خلاف ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جہاد فی سبیل اللہ اور اعلائے کلمۃ اللہ کے

میں مال وجائداد کی دیکھ بھال میں اس طرح مشغول ہوجانا کہ ترکِ جہاد کی نوبت آجائے خدا کو محبوب نہیں ہے۔ یہ بھی قابلِ غور ہے کہ اس وقت جب اسلام کے مددگاروں کی کمی نہ ہو اس کی حمایت ونصرت کو ترک کرنا قبیح فعل ہے تو اس وقت ترکِ جہاد کی قباحت کا کیا حال ہوگا جب اسلام کے حامیوں کی تعداد کم ہو ـــ یہی وجہ ہے کہ سورۂ توبہ اور دوسری سورتوں میں ترکِ جہاد اور راہِ خدا میں خرچ نہ کرنے کو منافقین کی صفت قرار دیا گیا ہے۔

مجاہدہ چراغِ راہ ہے

خلوص دل کے ساتھ شریعت کے ماتحت اللہ کی راہ میں مجاہدہ اس کے قرب و رضا کے حصول کی جد و جہد اس کے انعامات کی طلب میں سرگرمی محسنوں کی خاص صفت ہے اور اللہ اس دنیا میں ان کے مجاہدے کو ان کے لیے چراغ راہ بنا دیتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (عنکبوت رکوع ۷)	اور جو لوگ ہمارے لیے مجاہدہ کرتے ہیں ہم یقیناً ان کو اپنے قرب کی راہیں سجھادیں گے اور بلاشبہ اللہ محسنوں کے ساتھ ہے۔

"لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا" کا مطلب یہ ہے کہ مجاہدے کے صلے میں اللہ انہیں بصیرت کا وہ نور عطا کرتا ہے جو ان کے سامنے قرب الٰہی کی راہیں کھولتا چلا جاتا ہے اور ہر مرحلے میں ان پر یہ چیز واضح ہوجاتی ہے کہ اس وقت انہیں کیا کرنا چاہیے اور اس وقت کون سا کام سب سے زیادہ اہم ہے۔ محسنوں کے ساتھ اللہ کی معیت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کی نصرت و حمایت ان کے ساتھ ہوتی ہے، وہی مشکلات و مصائب میں ان کو ثابت قدم رکھتا اور وہی سخت ماحول میں ان کو ڈھارس دیتا ہے۔

صبر، جہاد، دعا

سورۂ آل عمران میں اگلی امتوں کے محسنوں کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے۔ اس کی آیات ۱۴۶ سے ۱۴۸ تک سامنے رکھیے۔ ترجمہ یہ ہے:-

> اس سے پہلے کتنے ہی نبی گزر چکے ہیں جن کے ساتھ مل کر خدا پرستوں نے جنگ کی۔ اللہ کی راہ میں جو مصیبتیں ان پر پڑیں ان سے وہ دل شکستہ نہیں ہوئے انھوں نے کمزوری نہیں دکھائی وہ (باطل کے آگے) سرنگوں نہیں ہوئے۔ ایسے ہی صابروں کو اللہ پسند کرتا ہے۔ ان کی دعا بس یہ تھی کہ اے ہمارے رب! ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرما! ہمارے کام میں تیرے حدود سے جو کچھ تجاوز ہوگیا ہو اسے معاف کردے۔ ہمارے قدم جمادے اور کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر! آخرکار اللہ نے ان کو دنیا کا ثواب بھی دیا اور اس سے بہتر ثواب آخرت بھی عطا کیا۔ اللہ کو ایسے ہی محسنین پسند ہیں۔ (آل عمران ـــ رکوع ۱۵)

کہ اشتراکی صف میں داخل ہوجائے لیکن خیریت یہ گزری کہ مغربی ممالک خصوصیت کے ساتھ امریکہ آخری وقت میں ہوشیار ہوگیا۔ چین کے اشتراکی ہوجانے کی وجہ سے اس پر بدحواسی طاری ہوچکی تھی، وہ خواب غفلت سے چونکا اور اس نے ولندیزیوں کے مکر و سازش کی تائید ترک کردی اور انڈونیشیا کے مجاہدین حریت کی حمایت کرنے لگا۔

باقی رہیں، مشرقی یورپ کی حکومتیں جو اشتراکی منطقے میں گردش کر رہی ہیں تو ان پر اشتراکیت روس کی فوجی طاقت نے مسلط کی ہے۔ جنگ عظیم ثانی کے دوران، نازی تسلط سے آزاد کرانے کے بہانے روس کی فوجیں ان ممالک میں داخل ہوئیں اور پھر آج تک وہاں دندنا رہی ہیں۔

یہی نہیں بلکہ بڑی بڑی مغربی حکومتیں بھی اشتراکیت کے جال سے بچ نہ سکتی تھیں اگر وہ اپنے سرمایہ دارانہ نظام کی بعض خرابیوں کو دور کرنے پر آمادہ نہ ہوتیں۔ انھوں نے انہیں دور کیا اور برابر خرابیوں کو دور کرنے میں کوشاں ہیں۔

اس سے بھی آگے کی بات یہ ہے کہ خود روس میں اشتراکیت کی کامیابی، زار روس کی ظالمانہ حکومت کا پھل ہے۔ وہ حکومت دس صدیوں تک وہاں کے باشندوں کو عذاب الیم کا مزا چکھاتی رہی۔ اس کے ردعمل میں وہاں کے باشندے ایک دوسرے عذاب الیم میں گرفتار ہوگئے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ دنیا کے بعض منطقوں میں اشتراکیت کا پھیلاؤ، مذہب اشتراکی کی صحت و سلامتی اور اس کی حیات آفرینی کی دلیل نہیں ہے اور نہ اشتراکیوں کا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ ان کا مذہب انسانیت کو نجات بخشنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اشتراکیت اس سابق نظم حکومت کا ردعمل ہے جس نے اپنی رعیت کو ذلت و فقر میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اشتراکیت زدہ ممالک کے باشندے اپنی سابق حکومتوں سے اتنے عاجز آچکے تھے کہ ان سے نجات پانے کے لیے شیطان کو بھی اپنا حلیف اور دوست بنا سکتے تھے۔ اشتراکیت نے ان کو سبز باغ دکھایا اور وہ اس میں پھنس گئے۔ یہ بات صحیح نہیں ہے کہ انھوں نے اس کو اس کے ذاتی خصائص و امتیازات کی وجہ سے اختیار کیا ہو۔ اشتراکیت کے داعی اس کے پھیلاؤ کو اس کی صحت کی دلیل بنا کر بہت سے بھولے بھالے لوگوں کو مبتلائے فریب کرتے ہیں اس لیے ان کے ہاتھ سے یہ خبیث ہتھیار چھین لینا چاہیے۔

مذہب اشتراکیت کا بنیادی ستون ــــــ الحاد

اشتراکیوں کے مذہب کا بنیادی ستون الحاد ہے۔ یعنی خدا کے وجود کا انکار، زندگی بعد موت کا انکا

اور آخرت کے محاسبے کا انکار، اجتماعی نظام ہو یا اقتصادی یا سیاسی ہر ایک پر اس کی گرفت مضبوط ہے۔ الحاد نے ان سب شعبوں پر مکروہ ترین مادیت کی چھاپ لگادی ہے۔ ایسی مادیت جو اپنے راستے میں ہر شے کو کچل دیتی ہے۔ یہ ان تمام اخلاقی و روحانی اقدار کو چور چور کر دیتی ہے جن پر قدیم زمانے سے انسان فخر کرتا آ رہا ہے اور اس مادیت کا آخری انجام یہ ہوتا ہے کہ انسان اور حیوان میں فرق باقی نہیں رہتا — اجتماعی نظام پر اس کا اثر یہ پڑتا ہے کہ خاندان کے سارے حدود ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں۔ افراد خاندان کے درمیان جو حقوق و التزامات ربط و تعلق قائم رکھتے ہیں وہ سب ختم ہو جاتے ہیں۔ انسان صرف ایک رابطے میں بندھ جاتا ہے اور وہ ہے حکومت کی عبودیت کا رابطہ۔ حکومت خدا ہوتی ہے اور انسان اس کا بندہ۔

اقتصادی نظام پر اس کا اثر یہ ہے کہ انفرادی ملکیت بالکل ختم کر دی جاتی ہے۔ رزق کے تمام ذرائع و وسائل حکومت کی ملکیت میں ہوتے ہیں۔ کمیونسٹ پارٹی کے سربراہوں کو چھوڑ کر پوری قوم حکومت کی غلام ہوتی ہے۔ کوئی فرد نہ اپنی پسند سے کوئی کام اختیار کر سکتا ہے اور نہ اجرت کی تعیین میں اسے کوئی دخل ہوتا ہے۔ حکومت جس کام میں اسے جوت دے جُتنا پڑے گا، جتنی مزدوری عطا فرما دے لینی پڑے گی۔

حکومتی اور سیاسی نظام پر اس کا اثر یہ پڑتا ہے کہ بدترین قسم کی ڈکٹیٹرشپ قائم ہو جاتی ہے۔ قوم کی اطاعت خوش دلی سے ختم ہو جاتی ہے اور اس سے اطاعت کرانے کے لیے صرف لوہے اور آگ پر اعتماد کرنا پڑتا ہے پارلیمنٹ ایک نمائش ہوتی ہے اور الکشن ایک ڈھونگ۔

یہ تو الحاد کے اثرات کا اجمالی نقشہ تھا اب ہم ذرا تفصیل سے اس پر گفتگو کرتے ہیں۔

خدا اور آخرت کا انکار انسان کو انسانیت کے آسمان سے حیوانیت کی زمین پر اتار لاتا ہے۔ زندگی کے اعلیٰ مقاصد سے اسے محروم کر دیتا ہے۔ وہ صرف مادے کے لیے جیتا ہے اور مادے ہی کے راستے میں لڑتا ہے اور یہ مشاہدے کی بات ہے کہ مادے کو مقصود و معبود بنا لینے کے بعد انسانوں اور قوموں کے درمیان الفت و محبت باقی نہیں رہتی۔ اس کی فطرت یہ ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان بغض و نفرت پیدا کرے۔ اس کے بطن سے مکار ضمیر اور دغا باز دل پیدا ہوتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ آج دنیا کی تمام مصیبتوں کی جڑ خدا اور آخرت کا انکار ہے۔ یہ عقیدہ کمزور پڑ گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام تصرفات بشری کی نگرانی کر رہا ہے۔ اس ضعف عقیدے میں بڑی حد تک، مغربی حکومتیں (جہاں سرمایہ دارانہ نظام نافذ ہے) بھی شریک ہیں، لیکن ان میں اور اشتراکی حکومتوں میں فرق یہ ہے کہ اشتراکیت نے اس عقیدے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے — پوچھنے والا مجھ سے پوچھ سکتا ہے کہ تمام انسانیت کے لیے

وہ الحاد کیوں خطرناک ہے جو اشتراکیت کی بنیاد ہے۔ کیا غیر اشتراکی ممالک میں ملحد نہیں پائے جاتے ؟ کیا ان کا حساب ہم نے صرف اللہ کے لیے چھوڑ رکھا ہے ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک غیر اشتراکی ممالک میں بھی ملحد پائے جاتے ہیں لیکن ان کو اس کا موقع حاصل رہتا ہے کہ کچھ زمانے کے بعد ظلمت شک سے نور یقین کی طرف منتقل ہو سکیں اس لیے کہ ان کو بحث و تمحیص اور غور و فکر کی آزادی حاصل ہوتی ہے اور وہ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں وہ چاہیں تو اپنے پہلو میں الحاد کا روگ پالے رکھیں اور چاہیں تو اپنا سینہ نور ایمان کے لیے کھول دیں لیکن مذہب اشتراکیت کا الحاد انتہائی خطرناک ہے اس لیے کہ وہ حکومت کا سرکاری مذہب ہوتا ہے اور پوری قوم کے لیے سیاستِ الحاد کو ماننا لازم ہوتا ہے۔ تم کو نظام اشتراکی میں اس کی اجازت حاصل نہیں کہ مومن بنو یا ملحد بلکہ تمہارے لیے لازمی ہے کہ ہر دینی عقیدے سے باز آجاؤ اور اپنے اور خالقِ کائنات کے درمیان ہر تعلق کو کاٹ دو۔ اشتراکی نظام میں کوئی ایسا شخص جو خدا اور آخرت پر یقین رکھتا ہو کسی رعایت کا مستحق نہیں ہے۔ اسے حکومت کا کوئی عہدہ یا ذمہ داری کا کوئی کام سپرد نہیں کیا جا سکتا۔ حکومت جب تک اپنی جانچ پڑتال کے بعد مطمئن نہ ہو جائے تمہیں وہاں کچھ نہیں مل سکتا۔ اگر اسے پتہ چل گیا کہ تمہارے پہلو میں ابھی دینی عقائد کا کوئی ذرہ موجود ہے تو تم قوم اور حکومت کے دشمن قرار دیے جاؤ گے اور تمہیں حکومت کے عذاب کے لیے تیار رہنا چاہیے —— یہ ہے وہ جبری الحاد جو اشتراکیت ہر اس قوم پر فرض قرار دیتی ہے جو اس کے چنگل میں پھنس جائے۔ میرے نزدیک یہ جبری الحاد وضع داخلی اور وضع خارجی میں منقسم ہے۔ وضع داخلی وہ ہے جو ہر اس قوم پر حکومت کرتا ہے جس نے اپنی عقل کو مذہب اشتراکی سے مسموم کر لیا ہو اور وضع خارجی وہ ہے جو ہر اشتراکی حکومت کی خارجی سیاست میں متمثل ہوتا ہے میں پہلے وضع داخلی سے بحث کروں گا اور اس کے بعد وضع خارجی سے۔

وضع داخلی جیسا کہ پہلے اشارہ گزر چکا کہ خدا اور آخرت کا عقیدہ جو انسان کو حیوان بننے سے روکتا ہے اگر کسی قوم میں کمزور پڑ جائے تو پھر اس قوم کی زندگی کے ہر شعبے میں مادیت دخل انداز ہو جاتی ہے صرف مادی قوانین پر زندگی کی تنظیم، انسانی نفوس کے اندر انانیت اور خود غرضی پیدا کرتی ہے اور اخلاق کی ڈوری بتدریج ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے اور اگر یہ عقیدہ بالکل ختم ہو جائے تو پھر انسان کو شیطان بننے سے کوئی چیز روک نہیں سکتی۔ وہ اپنے نفس کی خواہشات پوری کرنے کے لیے وہ سب کچھ کر گزرتا ہے جو اس کے بس میں ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو گزشتہ قوموں کی تاریخ میں بھی دیکھی جا سکتی ہے اور آج ہم اپنی آنکھوں کے سامنے اسے مجسم بھی دیکھ رہے ہیں متناسب کے تھوڑے فرق کے ساتھ یہ حقیقت مشرق و مغرب ہر جگہ یکساں نظر آرہی ہے —— انسان کو حیوان

بننے سے روکنے والا عقیدہ کیا ہے؟ یہ کہ اس تمام کائنات کا ایک خالق ہے جو انسانی تصرفات و اعمال کی نگرانی کر رہا ہے اور انسان اپنی حیات دنیوی میں جو کچھ کر رہا ہے، اخروی زندگی میں اللہ اس کو اس کا بدلہ دے گا۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا — تو جو شخص ایک ذرے کے برابر نیکی کرے گا

يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ — وہ اس کا انجام دیکھے گا اور جو ایک ذرے کے برابر

شَرًّا يَّرَهٗ ۝ — بدی کرے گا وہ اس کا انجام دیکھے گا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مغربی حکومتوں میں بھی یہ عقیدہ بہت کمزور پڑ گیا ہے لیکن آج ہم اس کا مشاہدہ بھی کر رہے ہیں کہ ان ملکوں میں بہت سی جماعتیں اس عقیدے کو از سر نو زندہ کرنے کی کوشش کر رہی ہیں اور وہ چاہتی ہیں کہ کسی طرح ان کی مادی تہذیب اور روحانی اقدار میں توفیق و تطبیق پیدا ہو جائے۔ باقی رہیں اشتراکی حکومتیں تو انھوں نے تمام ادیان کے خلاف ڈنکے کی چوٹ اعلان جنگ کر دیا ہے۔ اپنی قوموں پر الحاد کو بجبر مسلط کر دیا ہے اور دینی عقیدے کے استیصال میں انھوں نے کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی ہے۔

اس معاملے میں مغربی و اشتراکی ملکوں اور اسلامی حکومتوں کے درمیان مقابلے کی میں کوئی ضرورت نہیں سمجھتا۔ تم میں سے ہر شخص یہ بات جانتا ہے کہ خاتم الادیان یعنی دین اسلام کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ وہ عقیدہ توحید و آخرت کو بلند چوٹی تک پہنچاتا ہے اور اس عقیدے کے نشوونما کے لیے اس نے بہت کچھ کیا ہے اور دوسری طرف اس نے مادی مقاصد و مطالب اور روحانی اقدار کے درمیان کامل تطبیق پیدا کی ہے۔ اس کی تعلیمات و عبادات یکساں طور پر انسانی نفوس کے اندر بغیر کسی واسطے کے اللہ سے قرب و اتصال کا شعور پیدا کرتی ہیں۔ مومن و مسلم کے تصرفات و حرکات پر یہ شعور چھا جاتا ہے اور وہ اس کے تمام نقل و حرکت اور جد و جہد کا رہنما بن جاتا ہے۔ لیکن یہ شعور اسے دنیا سے کنارہ کش نہیں کرتا اس کو اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ دنیوی زندگی کی حقیر پونجی سے اپنا حصہ حاصل کرے۔ وہ یہ جانتا ہے کہ اللہ تعالے نے آسمان و زمین سورج اور چاند اور خشکی و تری کو اس کے لیے مسخر کر دیا ہے اور اس لیے مسخر کیا ہے کہ وہ اس کے احکام کے ماتحت اس سے فائدہ اٹھائے اور اپنے خالق کا شکریہ ادا کرے۔ اس طرح اسلام نے مادیت اور روحانیت کے درمیان موافقت پیدا کر دی اور انسان کو اس خطرے سے نجات بخش دی کہ وہ صرف مادیت کے گڈھے میں گر جائے۔ اب وہ اپنی زندگی کو بلند مقاصد کے لیے استعمال کر سکتا اور اخلاق و روحانیت کے آسمانوں پر پہنچ سکتا ہے اور اس کو ایک ایسی قوت حاصل ہو سکتی ہے جو کسی سے مغلوب ہونا نہیں جانتی۔

لیکن مارکس اپنی مادہ پرستی کی تائید و تصویب کے لیے ایک دلیل پیش کرتا ہے اور اسے برہان قاطع سمجھتا ہے۔

کہتا ہے: "مادیت ہی وہ چیز ہے جس نے جدید صنعتی تہذیب پیدا کی ہے۔ یہ جدید فنی ایجادات و اختراعات اور انکشافات، مادیت ہی کا ثمرہ ہیں" اور اس کے پیرو کہتے ہیں: "یہ مادیت ہی ہے جس نے خلائے بسیط کی مہم سر کرنے کا موقع دیا اور اس نے انسان کے لیے ایٹمی عہد کا دروازہ کھولا۔"

نہیں اے مارکس، تم نے بات غلط کہی۔ دراصل عقل انسانی وہ شے ہے جس نے یہ سب کچھ پیدا کیا، وہ عقل بشری جس نے امر الٰہی کی تعمیل کی تدبیر کائنات میں، اس کی مخلوقات پر غور کرنے میں اور ان کی خصوصیات کے اسرار تک رسائی حاصل کر کے ان کی عظمت کے اظہار و بیان میں اور عقل انسانی، اے کارل مارکس! کوئی مادی شے نہیں ہے جس کو تم دیکھ سکو یا چھو سکو، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے نور کا ایک پرتو ہے، جس کے وجود کا تم انکار کرتے ہو۔ لہٰذا تمہاری دلیل اے کارل مارکس تمہیں پر پلٹ گئی۔ یہ ہے اشتراکی الحاد کا اندرونی خطرہ اور داخلی وضع۔

وضعِ خارجی

اشتراکی الحاد میں رنگی ہوئی خارجی سیاست بھی کم خطرناک نہیں ہے۔ اس سیاست کا مشہور و معروف منہاج یہ ہے کہ ہر اشتراکی ملک کے حکام ہی اس کا رخ متعین کرتے ہیں اور دوسری حکومتوں سے تعلقات کی باگ صرف ان کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ اگر چاہیں تو ان سے مصالحت کا رویہ اختیار کریں اور اگر چاہیں تو سیاست کا رُخ دوسروں کو پچھاڑنے کی طرف پھیر دیں۔ کبھی مکر سے اور کبھی مسلح حملے سے

ظاہر ہے کہ جب ایسے منکرین خدا و آخرت کے ہاتھوں میں خارجی سیاست کی باگ ہوگی تو اس میں انانیت حرص و طمع اور سنگ دلی ہی کا غلبہ ہوگا، ان کو تخریب اور نسل کشی سے روکنے والی کوئی چیز نہ ہوگی، نہ خدا کی خشیت نہ ضمیر کی ملامت۔

واقعہ بھی یہی ہے کہ اشتراکی حکومتوں میں ان کے سربراہ کاروں پر یہی جذبہ غالب بھی ہے الا یہ کہ کوئی مادی مصلحت انہیں اس روش سے اجتناب پر مجبور کر دے۔

کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ غیر اشتراکی حکومتوں میں بھی جن لوگوں کے ہاتھوں میں خارجی سیاست کی باگ ہے وہ اشتراکیوں سے کسی چیز میں بھی بہتر نہیں ہیں۔ انھوں نے بھی کمزور قوموں پر مظالم ڈھائے ہیں۔ انہیں اپنی استعماریت کا شکار بنایا ہے۔ انہیں ذلیل کیا ہے اور ان کے ذرائع آمدنی ان سے چھین لیے ہیں اور اب بھی متعدد غیر اشتراکی حکومتیں یہی ظالمانہ جذبہ رکھتی ہیں ــــــ میں جواب میں کہوں گا۔ ہاں، یہ بات صحیح ہے لیکن دونوں میں جو فرق ہے اسے نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔ میں دیکھتا ہوں کہ مغربی ملک کا قائد اپنے آپ کو اس بات کے لیے بالکل مجبور پاتا ہے کہ قوم کے سامنے اپنے خارجی تصرفات کی وجہ پیش کرے اور یہ ثابت کرے کہ اس نے جو کچھ کیا ٹھیک کیا، اور اس

کے لیے وہ طرح طرح کے بہانے اور تدبیریں اختیار کرتا ہے۔ کبھی کہتا ہے کہ پس ماندہ قوموں میں تہذیب پھیلانے کے لیے یہ کام کیا گیا ہے۔ کبھی اپنے ظالمانہ حملے کو چھپانے کے لیے مظلوم قوم پر الزام لگاتا ہے کہ حملے کی ابتدا اس نے کی تھی اور ہماری فوجوں نے مدافعانہ جنگ کی ہے۔ بلکہ کبھی مکر و سازش کے جال پھیلا کر محکوم قوم کے کچھ افراد سے اس طرح کے حملے کرا بھی دیتا ہے تاکہ اپنی قوم کے سامنے صفائی پیش کر سکے۔ کبھی کسی ملک میں فوجیں داخل کرنے کے بعد کہتا ہے کہ اس کے جائز حاکم نے ہمیں مدد کے لیے خود بلایا ہے اور اس طرح کے بہت سارے بہانے تلاش کرتا ہے سوال یہ ہے کہ یہ سب کچھ کرنے پر کون سی چیز اسے مجبور کرتی ہے؟ ایسا کرنے پر وہ اپنے آپ کو اس لیے مجبور پاتا ہے کہ اس کی قوم یا بدرجہ اقل اس کی قوم کا بڑا حصہ اپنے اس دینی عقیدے پر قائم ہے جو خیر و شر کے درمیان فرق پیدا کرتا ہے جس کے ذریعہ اچھے اور برے اعمال ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں۔ وہ ہمیشہ اس بات سے ڈرتا رہتا ہے کہ کہیں وہ اپنی قوم کے غصے کو بھڑکا نہ دے۔ وہ قوم جس کے دینی و مذہبی ضمیر پر پابندی عائد نہیں کی گئی ہے مغربی ممالک میں ہم اکثر ایسی آوازیں سنتے رہتے ہیں جو اپنی حکومت کی خارجی سیاست پر کڑی تنقیدیں کرتی رہتی ہیں اور کبھی کبھی غلط سیاست کی وجہ سے اپنے قائدین کو حکومت کی کرسی پر سے نیچے بھی اتار دیتی ہیں۔ رہیں اشتراکی حکومتیں تو وہاں الحاد اور دینی ضمیر کی نفی حکمرانوں کا سرکاری نشان ہے۔ ان کو کھلی چھٹی ہے کہ ان کا جو جی چاہے کریں۔ کوئی ان کو روکنے والا نہیں ہے۔ یہ ہے اشتراکی الحاد کا وہ خطرہ جس میں غیر اشتراکی دنیا مبتلا ہے۔

میں اس کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتا کہ یہاں اسلام کی سیاست خارجہ کے حدود متعین کروں کیونکہ تم میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ اسلامی سیاست کی بنیاد، پابندیٔ عہد، سرکشی و عدوان کی حرمت، اخوت انسانی کے احترام اور تعاون علی الخیر کے التزام پر قائم ہے

اشتراکی الحاد اور اس کے اثرات کی اجمالی تصویر کشی کے بعد اب میں اس کی سیاستِ داخلہ کی تھوڑی تفصیل پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اس کی خارجی سیاست کا عکس تو صرف بین الاقوامی تعلقات پر پڑتا ہے لیکن اس کی داخلی سیاست کا اثر باشندگان ملک کی زندگی کے تمام شعبوں میں منعکس ہوتا ہے۔ اجتماعی اقتصادی اور حکومتی کوئی شعبہ اس کے سیاہ اور زہریلے چھاپ سے بچا ہوا نہیں ہے۔

اجتماعی پہلو

اشتراکی الحاد کا اثر اجتماعی شعبے میں سب سے پہلے عائلی اور خاندانی نظام پر پڑتا ہے۔ یہ خاندان کے تصور کو کمزور کرنے اور اہل خاندان کے باہمی روابط کو توڑ دینے کا کارنامہ انجام دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اشتراکی الحاد کی خصوصیات میں یہ بات داخل ہے کہ وہ "فرد" کی عزت و اہمیت پر یقین نہیں رکھتا۔ وہ یہ

نہیں مانتا کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا اس کے مناسب تمام قوتیں اور صلاحیتیں درست کیں اور اپنی طرف سے اس میں زندگی کی روح پھونکی۔ اس کے نزدیک حکومت اور اس کی مادی قوتِ قاہرہ ہی سب کچھ ہے۔ "فرد" کچھ نہیں یا وہ حکومت کے ہاتھ میں محض ایک آلے کی حیثیت رکھتا ہے۔ "فرد" وسیلہ ہے اور "حکومت" غایت ہے۔ فرد ایک ذرہ ہے جسے حکومت کے جسم میں فنا ہو جانا ہے۔ اس تصور کے ماتحت ضروری ہے کہ اس فنائیت کے راستے میں، خاندانی روابط اور اس کی ذمہ داریاں حائل نہ ہوں۔ فرد اس لیے پیدا نہیں ہوتا کہ اس کے ماں باپ اپنی آغوشِ شفقت میں اس کی تربیت کریں بلکہ اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ حکومت اس کی نگراں بن جائے۔ پھر وہ اس کے ساتھ جس طرح کا برتاؤ چاہے کرے۔ کیونکہ ماں باپ کا وقت حکومت کی ملکیت ہے اور اس میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ بچے کی پرورش اور نگہداشت پر اسے صرف کیا جا سکے۔

اس تصور نے نکاح و ازدواج کے بند کو کمزور کر دیا اور عورت و مرد کھلے بندوں حیوانیت کی سطح پر اتر آئے کیونکہ نہ شوہر پر بیوی کی ذمہ داری باقی رہی اور نہ بیوی پر شوہر کے حقوق باقی رہے اور نہ ان دونوں پر اس بچے کی ذمہ داری باقی رہی جو عقدِ نکاح کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ اشتراکی حکومت نے عورت کے لیے بھی محنت و مزدوری کو اسی طرح فرض قرار دے دیا ہے جس طرح مرد کے لیے، وہ اپنی روزی آپ کماتی ہے، شوہر پر اس کی ذمہ داری نہیں ہے غرض یہ کہ جو چیزیں اہلِ خاندان کے باہمی ربط کو مضبوط کرتی تھیں وہ سب کی سب ختم کر دی گئیں۔ عائلی نظام کو ختم کرنے کی دلیل یہ ہے کہ اس سے ذاتیت و فردیت کے رجحان کو تقویت ملتی ہے اور ان دونوں چیزوں سے ملک اور قوم کو نقصان پہنچتا ہے۔

فرد کا اسلامی تصور

اشتراکی تصورِ فرد کے ساتھ اسلامی تصورِ فرد کا مقابلہ کرو۔ اسلام فرد کی عزت و کرامت کا محافظ ہے۔ وہ اسے اللہ کا بندہ قرار دیتا ہے۔ حکومت کا نہیں، اس کے نزدیک حکومت افراد کی نائب ہے اور جس کا کام یہ ہے کہ افراد کے مشترک مصالح کی نگرانی کرے۔ قرآن میں کہا گیا ہے:۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا (بنی اسرائیل ۷)	اور ہم نے اولادِ آدم کو بزرگی دی اور انہیں خشکی اور تری میں سواریاں عطا کیں اور ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق عطا کیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فوقیت بخشی۔

[illegible] معاشرے کا بنیادی اینٹ قرار دیتا ہے اور اسلامی معاشرے کی عمارت فطرتِ انسانی

میں جمے ہوئے اخلاق صالحہ اور مودت و رحمت کے جذبات پر تعمیر ہوتی ہے

وَمِنْ اٰیٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ	اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس
اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَیْهَا	نے تمہیں میں سے تمہارے جوڑے بنائے تاکہ ان کے
وَجَعَلَ بَیْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً	پاس سکون پاؤ اور تمہارے درمیان محبت و
(روم ۳)	رحمت پیدا کی۔

دوسری جگہ ہے :-

خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ	اس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اس
وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِیَسْكُنَ	کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ اس کے پاس سکون
اِلَیْهَا (اعراف ۲۳)	حاصل کرے۔

اسلام کی نظر میں عورت اور مرد کا تعلق محض تسکین نفس کا تعلق نہیں ہے بلکہ وہ اس تعلق کے نتیجے میں ایک گھر تعمیر کرنا چاہتا ہے جو بچوں کی تربیت کا پہلا مدرسہ ہے۔ زوجین کے ربط و تعلق کے بعد پھر ان کی اولاد اور والدین کے درمیان تعلق قائم ہوتا ہے اور یہ سلسلہ آگے بڑھ کر ایک اجتماعی وحدت میں بدل جاتا ہے جس کے افراد سختی و نرمی خوشحالی و تنگ دستی صحت و مرض اور محنت و صلۂ محنت میں ایک دوسرے کے معاون ہوتے ہیں اور یہ سلسلہ پشتہا پشت چلتا رہتا ہے۔ اسلام خاندان کو ایک ایسی قرارگاہ بناتا ہے جس کے اندر اور اس کے آس پاس آداب اخلاق کا وہ مجموعہ نشو و نما پاتا ہے جو جنس کے ساتھ خاص ہے اور یہ آداب ہر اس سوسائٹی کے آداب ہیں جو حیوانی اباحیت اور جنسی انارکی سے بلند ہو۔

اشتراکیت دنیا کو اس فریب میں مبتلا کرتی ہے کہ اس نے انسانی تاریخ میں سب سے پہلی دفعہ مرد اور عورت کی مساوات کو محقق کیا ہے وہ اس مساوات کو پردۂ عدم سے عالم وجود میں لائی ہے۔ بے شک اس نے یہ مساوات قائم کی ہے لیکن مساوات کس چیز میں؟ عمل اور اجر عمل میں! اکمر توڑنے والی محنت اور قلیل اجرت اشتراکی ممالک میں عورتیں کارخانوں اور کھیتوں میں ایسے کام کرنے پر مجبور کی گئی ہیں جو مضبوط اور سخت جسم رکھنے والے مردوں ہی کے لیے مناسب ہیں۔ یہ ایک ظالمانہ مساوات ہے جس کی بنیاد خاندان کی تخریب پر قائم ہے۔ یہ مساوات اس چیز پر قائم ہے کہ مرد نے اس کی کفالت سے انکار کر دیا ہے اور اسے مجبور کر دیا ہے کہ اپنی زندگی گزارنے کے لیے وہ بھی اسی کی طرح کام کرے اور اس طرح عمل اور اجر عمل میں مساوات محقق ہوئی۔ اس لیے کہ اشتراکیت میں

زندگی کے تمام مسائل صرف مادے کے گرد چکر لگاتے ہیں۔ تمام بشری جذبات اور تمام انسانی جذبات، عناصر حیات کے صرف ایک عنصر۔ مادہ ــــ میں گھس پڑے ہیں۔

رہا اسلام تو اس نے چودہ سو سال پہلے سے عورتوں کو وہ حقوق دے رکھے ہیں جو اس وقت کی بہت سی یورپین حکومتوں نے بھی انہیں عطا نہیں کیے ہیں۔ اس نے انہیں محنت مزدوری اور ذاتی کاروبار کا حق بھی دیا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ خاندان میں اس کی نگرانی اور کفالت کا حق بھی باقی رکھا ہے اس لیے کہ اسلام کے نزدیک زندگی مال اور جسم سے زیادہ بڑی چیز ہے۔ حیات انسانی اس کے نزدیک ایک ایسی وحدت ہے جس کے بہت سے ہدف، اکل و شرب سے بلند تر ہیں۔ وہ انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر نظر رکھتا ہے۔ وہ افراد خاندان کے مختلف وظیفہ ہائے عمل تجویز کرتا ہے جن میں کامل تناسب و ترتیب پائے جاتے ہیں۔ مرد و عورت کی ذمہ داریوں اور اعمال میں وہ اسی پہلے سے فرق کرتا ہے۔ وہ ان میں سے ہر ایک پر ضروری قرار دیتا ہے کہ وہ اپنے حصے کا کام انجام دے تاکہ بحیثیت مجموعی زندگی میں ارتقاء پیدا ہو اور وہ آگے بڑھے۔ اس کے بغیر حیات انسانی صحیح رخ پر ترقی نہیں کر سکتی ــــ اسلام نے زندگی کے کثیر شعبوں میں عورت اور مرد کے درمیان مساوات رکھی ہے۔ مثال کے طور پر اس نے دینی اور روحانی پہلو میں عورت اور مرد کو مساوی درجہ دیا ہے:۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ۝

(نساء ۱۲۴)

اور جو کوئی اچھے کام کرے، مرد ہو یا عورت اور وہ ایمان رکھتا ہو تو یہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ایک تل کے برابر بھی ان کی حق تلفی نہ ہوگی۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

(نحل ۹۷)

جو شخص بھی نیک عمل کرے گا خواہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ ہو وہ مومن اسے ہم دنیا میں پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور (آخرت میں) ایسے لوگوں کو ان کے اجر ان کے بہترین اعمال کے مطابق بخشیں گے۔

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّىْ لَاۤ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ

پھر ان کے رب نے ان کی دعا قبول کی کہ میں ضائع نہیں کرتا تم میں سے کسی عمل کرنے والے

أُنثَىٰ بَعْضُكُم مِّن بَعْضٍ (آل عمران ر۲۰) کامل مرد ہو یا عورت تم آپس میں ایک ہو۔

اسلام نے فکر و نظر کی تہذیب اور طلب علم میں عورت اور مرد کے درمیان مساوات پیدا کی بلکہ طلب علم کو عورت پر بھی اسی طرح واجب قرار دیا ہے جس طرح مرد پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ طلب العلم فَرِيضَةٌ عَلَىٰ كُلِّ مُسْلِمٍ وَمُسْلِمَةٍ (طلب علم ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے۔

اسلام نے حق ملکیت اور معاشی و مالی تصرف میں عورت اور مرد کے درمیان مساوات رکھی ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا — مردوں کا حصہ ہے اپنی کمائی سے اور

وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ (نساء ر۵) — عورتوں کا حصہ ہے اپنی کمائی سے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ — مردوں کا حصہ ہے اس میں سے جو والدین اور

الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ — رشتہ چھوڑ کر وفات پا جائیں اور عورتوں کا بھی حصہ ہے

نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ — اس میں سے جو والدین اور رشتہ دار چھوڑ کر وفات

وَالْأَقْرَبُونَ (نساء ر۱) — پا جائیں۔

عورت کو اپنے مال میں تصرف مطلق کا جو حق اسلام نے چودہ صدیوں سے دے رکھا ہے وہ ایک ایسا حق ہے جسے آج بھی بہت سی حکومتوں نے تسلیم نہیں کیا ہے۔ ان حکومتوں میں وہ اپنے شوہر یا سرپرست کی اجازت کے بغیر اپنے مال میں تصرف نہیں کر سکتی۔ ہاں ان حکومتوں میں عورت کو اپنے جسم میں تصرف کرنے کی آزادی مطلق حاصل ہے۔ وہ اگر چاہے تو بالاعلان و بالاخفا ہر طرح اپنے جسم کو فروخت کر سکتی ہے، اپنی عصمت لٹا سکتی ہے یہی ایک ایسا حق ہے جو اسلام نے عورت کو نہیں دیا جس طرح اس نے یہ حق مرد کو بھی نہیں دیا۔ زنا اور بدکاری دونوں کے لیے یکساں طور پر حرام ہے اور یہ مرد اور عورت پر کوئی ظلم نہیں ہے بلکہ انسانی شرافت و کرامت کا تحفظ ہے۔ اگر اس کی آزادی دے دی جائے تو مرد اور عورت کے درمیان صنفی اور جنسی ربط و تعلق کے سوا کوئی ربط باقی نہ رہے اور خاندان کی بنیاد ویران ہو جائے ـــ یہ ہے اسلام کا نقطۂ نظر خاندان کے احترام میں۔ مساوات مرد و زن میں صرف اسلام وہیں فرق کرتا ہے جہاں ان دونوں کے فطری و طبعی استعداد و صلاحیت اور جسمانی ساخت میں فرق ہوتا ہے اس فرق کا لحاظ کرتے ہوئے عورت انسانی سوسائٹی کے لیے اپنا رول ادا کر سکتی ہے۔

اشتراکیت نے خاندان کے قصر کو توڑ دیا اور میاں بیوی کو ان کی اولاد کے ساتھ اس سے نکال باہر کیا تاکہ وہ زمین میں دو جانوروں کی طرح زندگی بسر کریں۔ وہ اپنی زندگی کے معاملات میں دو بدترین چیزوں میں سے کسی ایک

، مالک ہیں سرخ اباجبت یا بھیانک انانیت ۔

یہ ہے خاندان کے سلسلے میں وہ مذہب جسے انجلز، لینن، ٹراٹسکی اور ان کے علاوہ صف اول کے پیغمبرانِ اشتراکیت نے اپنے ذہن کے سانچے میں ڈھالا تھا۔ خاندان ان کے خیال میں بورژوائی سوسائٹی کا ستون ہے جسے مسمار کرنا ضروری ہے۔ ان کے خیال میں "آزاد محبت" کو عقد نکاح کا قائم مقام ہونا چاہیے۔ اور اگر نکاح ہو ہی جائے تو پھر طلاق کو ایک بہت ہی آسان چیز بنا دینا چاہیے ۔

لیکن اسٹالن جب تخت اشتراکیت پر براجمان ہوا تو اس نے دیکھا کہ خاندان کے بارے میں اس تصور نے ملک کے اندر عجیب افراتفری مچا دی ہے اور آبادی کی شرح گھٹتی چلی جا رہی ہے۔ حالانکہ فوجوں کی تعداد میں اضافہ کرنے، ملک کو صنعتی بنانے اور پنج سالہ منصوبوں کو پورا کرنے کے لیے مین پاور کی سخت ضرورت ہے چنانچہ اس نے ۱۹۳۵ء میں متعدد فرامین نافذ کیے جن میں اسقاط پر سزائیں مقرر کی گئی تھیں اور طلاق پر قیدیں لگائی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ ان فرامین میں تکثیر نسل کی حوصلہ افزائی کی گئی تھی۔ اس طرح مذہب اشتراکی کے خلاف اس نے خاندان کے تصور میں کچھ اعتدال پیدا کیا اور اس کی غرض یہ تھی کہ اپنے ملک کی عددی طاقت سے دنیا پر اشتراکیت کا پرچم لہرائے ۔

(باقی)

شرائطِ ایجنسی

۱۔ ایجنسی کم سے کم ۵ رسائل پر دی جائے گی

۲۔ رسائل حسب ضرورت طلب کیے جائیں۔ غیر فروخت شدہ رسائل واپس نہیں لیے جائیں گے ۔

۳۔ کمیشن ۲۵ فی صدی دیا جائے گا۔ البتہ ۵۰ یا زائد رسائل کی خریداری پر کمیشن ۳۳ فی صدی دیا جائے گا ۔

۴۔ رسائل کی روانگی کا صرفہ ہمارے ذمہ ہوگا اور رجسٹری اور وی پی کا خرچ ایجنٹ صاحبان کے ذمہ ہوگا

۵۔ رقم پیشگی آنا چاہیے یا رسائل بذریعہ وی پی روانہ کرنے کی اجازت دی جائے ۔

منیجر ماہنامہ زندگی و کانتی رامپور۔ یوپی

پاکستان ــ دینی نقطہ نظر سے

کراچی کے ایک علمی ماہنامے کے فاضل مدیر اپنے اداریے میں لکھتے ہیں :۔

"آج آپ کے ملک میں "اقامت صلوٰۃ" کا کیا حال ہے۔ روزانہ نمازوں کے اوقات میں ذرا اذان کے بعد کسی شہر، قصبہ یا گاؤں کا جائزہ لے لیجیے اور پھر دیکھیے کہ نمازیوں کی تعداد آپ کے ملک میں کتنی ہے۔ موذن کی اذان پر کتنے لوگ ہیں جو اپنا سب کام کاج چھوڑ کر مسجد کی راہ لیتے ہیں۔ اور کتنے ہیں جو حی علی الصلوٰۃ اور حی علی الفلاح کی منادی کو سرے سے درخور اعتنا ہی نہیں سمجھتے۔ ہمارے کارخانوں، دفتروں، بازاروں اور تفریح گاہوں کی ہماہمی میں کبھی اس پُرجلال آواز سے کوئی فرق پڑتا ہے؟ ریل کے تمام ڈبے مسافروں سے کھچا کھچ بھرے ہوتے ہیں۔ ان مسافروں میں کبھی نماز کے لیے بھی آپ نے کوئی ہل چل محسوس کی؟ آپ کی حکومت روزانہ نئے محلے اور کالونیاں بناتی رہتی ہے تعمیر کے نقشے میں ضروریات زندگی کی ساری ہی چیزوں کا لحاظ رکھا جاتا ہے ۔ پارک، سنیما، ڈاک خانے، شفاخانے، سب کے لیے آبادی کے تناسب سے مناسب جگہیں مقرر کر دی جاتی ہیں۔ پھر کیا مسجدوں کی تعمیر کے سلسلے میں بھی ہر محلے اور کالونی میں اسی طرح کا اہتمام کیا جاتا ہے جس طرح کا اہتمام پارک، سنیما، سڑک، ہسپتال، تھانہ اور اسکول کا ہوتا ہے؟ کیا آپ کے تعمیری بجٹ میں جس طرح اور سرکاری عمارتوں کے لیے رقم مخصوص کی جاتی ہے اسی طرح مسجدوں کے لیے بھی کی جاتی ہے؟ مسجدوں کی تعمیر تو درکنار آئے دن یہ قضیے اٹھتے رہتے ہیں کہ فلاں مسجد سرکار کی بغیر اجازت بن گئی لہٰذا اسے ہٹا دینا چاہیے۔ آپ کے شہر کراچی میں کتنے نئے محلے اور کالونیاں ہیں کہ جہاں کے باشندے جماعت سے صرف اس لیے محروم ہیں کہ قریب میں کوئی مسجد نہیں۔ بدین کی مسجد کا قصہ آج کل اخبارات میں چل رہا ہے کہ وہاں مسجد کی زمین عیسائی مشنری کو دے دی گئی۔ چنانچہ اس کی واگزاشت کے لیے کوششیں کی جا رہی ہیں۔

زکوٰۃ پر نظر ڈالیے۔ کتنے مال دار ہیں جو باضابطہ حساب کتاب کر کے پابندی سے زکوٰۃ نکالتے ہیں تفتیش کیجیے تو پتہ چلے گا کہ ہزاروں لاکھوں مالداروں میں بہت تھوڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو اس فرض کو صحیح طور پر حکم شرع کے مطابق بجا لاتے ہیں۔

روزوں کے زمانے میں روزانہ کھلے دھڑلے ہوٹلوں میں پردہ ڈال کر شکم پری کی جاتی ہے اور کوئی پوچھنے والا نہیں کہ اللہ کے بندو! کیا کر رہے ہو۔ رمضان میں ایک طرف مسجد میں نماز تراویح ہوتی ہے اور دوسری طرف اسی مسجد کے زیر سایہ ریکارڈنگ جاری رہتی ہے۔ ملکی ریڈیو کا پروگرام بھی حسب معمول چلتا ہی رہتا ہے اور اس کے نشریات غنا و موسیقی پر رمضان کی آمد و رفت کا کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا۔

حج کی کیفیت یہ ہے کہ آپ کے ملک میں ان اغنیاء کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے جن پر حج فرض ہو گیا ہے وہ حج کرنا چاہتے بھی ہیں لیکن حکومت کی طرف سے قدغن ہے کہ ایک محدود تعداد کے علاوہ کسی کو حج کی اجازت نہیں۔

اوپر کی سطریں پڑھ کر کیا کوئی شخص اس کا خیال بھی کر سکتا ہے کہ یہ ایک ایسے ملک کا حال بیان کیا جا رہا ہے جس کی حکومت خود مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔ وہاں کا نظام حکومت نہ ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے اور نہ عیسائیوں کے، بلکہ ملت اسلامیہ کے فرزندان نامدار اس کی باگ ڈور اپنے مبارک ہاتھوں میں لیے ہوئے ہیں اور یہ حال جب بھارت کے مسلمان پڑھتے ہیں تو ان پر ایک عجیب عالم گزرجاتا ہے۔ لفظوں میں جس کی تصویر کشی ایک مشکل کام ہے' ارکان اسلام کے لحاظ سے آپ نے وہاں کا حال پڑھ لیا اب آگے اور پڑھیے اوپر جو سطریں نقل کی گئی ہیں ان کے بعد کی سطریں یہ ہیں :-

"ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس ملک میں جو اسلام کے نام پر بنا تھا' احتساب کا محکمہ قائم ہوتا جو نیکی کا حکم دیتا اور برائی سے منع کرتا مگر الٹا ہو یہ رہا ہے کہ ادائگی فرض پر پابندی ہے۔ کبیرہ گناہوں کا کھلے بندوں لائسنس دیا جاتا ہے۔ کسبیاں زنا کی باضابطہ سرکار سے اجازت لیتی ہیں۔ ریس اور طرح طرح کے جوے خود سرکار کی نگرانی میں ہوتے ہیں۔ حکومت کا بینک سودی کاروبار کرتا ہے۔ شراب کی تجارت کا پرمٹ' حکومت خود عطا کرتی ہے مخلوط تعلیم' رقص و سرود کی سرپرستی حکومت کے اپنے بجٹ سے ہوتی ہے۔ لوگ آئے دن ان منکرات کے خلاف آواز اٹھاتے اور صدائے احتجاج بلند کرتے رہتے ہیں۔ مگر ع
صدا طوطی کی سنتا کون ہے نقار خانے میں ؟
(بینات کراچی)

بھارت کا مسلمان' یہ سطریں پڑھنے کے بعد سوچنے لگتا ہے کہ اگر دین کی "غربت" پاکستان میں بھی ویسی ہی ہے جیسی ہندستان میں تو پھر ایک ایسے پاکستان کا کیا فائدہ ؟ بس یہی نا کہ وہاں کے مسلمان اس جرم میں قتل نہیں کیے جاتے کہ وہ اپنے کو مسلمان کیوں کہتے ہیں اور دوسرا فائدہ شاید یہ ہے کہ ان پر دنیا کمانے کی راہیں بھارت کے مسلمانوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ کھلی ہوئی ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا صرف اتنی بات کے لیے ہندستان کو تقسیم کر کے پاکستان حاصل کیا گیا تھا ؟ کاش وہاں کے سربراہ کبھی ایمان داری کے ساتھ اپنی ذمہ داری پر غور کرتے۔ (ادارہ)

مشرقی پاکستان کا طوفان

مشرقی پاکستان کے طوفان نے وہاں جو تباہی پھیلائی ہے اس کی تمام تفصیلات ابھی سامنے نہیں آسکی ہیں لیکن جتنی بھی آچکی ہیں وہ بھی اس قدر لرزہ انگیز اور ہولناک ہیں کہ انہیں الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ مرنے والوں کی کثرت، مکانوں کے انہدام، مال و متاع کے نقصان اور فصلوں کی تباہی کے لحاظ سے شاید تاریخ میں بھی کسی ایسے طوفان کی نشان دہی مشکل ہے اس علاقے کے لوگ رات کو سوئے تو ہر طرف امن و اطمینان تھا لیکن جب صبح طلوع ہوئی تو ایک طویل و عریض آباد علاقہ موت اور تباہی کی آغوش میں تھا۔ بیس ہزار سے زیادہ افراد دوسرے دن کا سورج نہ دیکھ سکے۔ جو لوگ مر چکے وہ مر چکے اور جو زندہ ہیں ان کی زندگی موت سے بدتر ہے۔ ان کی بے بسی، بے کسی، فقر و فاقہ اور رنج و غم کی کون شخص تصویر کشی کرسکتا ہے۔ انہیں دو گھونٹ میٹھا پانی بھی میسر نہیں ہے۔ اچانک کسی شخص کے ایک عزیز قریب کی موت واقع ہو جاتی ہے تو اس کا صدمہ بعض اوقات ناقابل برداشت ہو جاتا ہے اور جہاں گھر کے گھر بیک وقت موت کی نیند سو گئے ہوں وہاں زندہ بچے ہوئے عزیزوں کے غم کا کون اندازہ کرسکتا ہے۔ ان کے آنسوؤں کی گرمی اور ان کے سینوں سے اٹھتی ہوئی ہوک کی تلخی کا حصہ کون محسوس کرسکتا ہے۔ آہ یہ انسان! پانی کا یہ حقیر بلبلہ —— وہاں کے تباہ حال باشندے بلاشبہ اس وقت تمام دنیا کی ہمدردیوں کے مستحق ہیں۔ پوری انسانیت پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ ان کی دستگیری کرے اور خود پاکستان کے زندہ و سلامت باشندے تو خدا کی طرف سے ایک سخت آزمائش میں ڈال دیے گئے ہیں۔ اگر واقعی وہاں کے تمام باشندے مدد کو اٹھ کھڑے ہوں تو بہت جلد تباہ حال لوگ پھر اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکتے ہیں۔ اب تک امداد کی جو خبریں آئی ہیں تباہی کی نسبت سے بہت کم ہیں۔

فوری طور پر جو کرنے کا کام ہے وہ یہی امداد و اعانت اور حیران و پریشان لوگوں کی دستگیری و دلدہی ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ دنیا کے تمام مسلمانوں کے لیے سوچنے کا ایک پہلو اور ہے۔ جو لوگ خدا اور آخرت کو نہیں مانتے انہیں چھوڑیے کیونکہ وہ اس طرح کے واقعات کی کوئی سائنسی یا مادی توجیہ تلاش کر لیتے ہیں لیکن جو لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ تمام عناصر و اسباب کو ایک علیم و حکیم اور قادر و مقتدر ہستی کنٹرول کر رہی ہے، ان کے لیے ان واقعات میں کوئی عبرت ہے یا نہیں۔

غور کیجیے کہ آغادیر کے زلزلے (فروری ۱۹۶۰ء) سے لیکر مشرقی پاکستان کے حالیہ طوفان تک دنیا کے جن خطوں میں
ہی آئی ہے وہ خطے کون سے ہیں؟ یہ خطے مسلمانوں کی آزاد حکومتوں کے اندر واقع ہیں۔ آغادیر (مراکش) میں زلزلہ آیا
راس نے چند منٹ میں "سیاحوں کی جنت" کو مٹی کے ڈھیر میں بدل دیا۔ پھر مشرقی پاکستان میں پہلا طوفان آیا اور اس نے سخت
ہی پھیلائی اور ہزاروں انسان مر گئے۔ پھر جنوبی ایران میں زلزلہ آیا اور اس نے گاؤں کے گاؤں کو تلپٹ کر دیا۔ پھر
زیرہ بالی (انڈونیشیا) میں آتش فشاں پہاڑ پھوٹا اور باشندوں پر قیامت کی طرح ٹوٹ پڑا اور اب پھر دوبارہ مشرقی
پاکستان میں طوفان آیا اور اس نے قوم عاد اور قوم نوح کے عذاب کی یاد تازہ کر دی۔ کیا یہ مسلسل تنبیہات ہم مسلمانوں
کے لیے ناقابل اعتنا ہیں؟ افسوس صورت حال کچھ ایسی ہی ہے کہ دنیا کے دوسرے مسلمان تو الگ رہے خود ان تباہ شدہ
علاقوں کے مسلمان بھی ان تنبیہات پر دھیان دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ یہ کیسی دردناک حقیقت ہے کہ مشرقی پاکستان میں تاریخ
کا عظیم طوفان آیا ہوا ہے اور مغربی پاکستان کے شیعہ اور سنی ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے ہیں۔ طوفان پر چند دن بھی نہیں گزرے
تھے کہ مغربی پاکستان کے ایک مقام ٹھاری میں ۲۲ مسلمان خود مسلمانوں کے ہاتھ سے مار ڈالے گئے۔ زندگی کے اسی شمارے
میں اس تحریر سے پہلے "پاکستان — دینی نقطۂ نظر سے" کی تحریر گزر چکی ہے اور وہ وہاں کی دینی و اخلاقی تباہی کا محض چھوٹا سا
نمونہ ہے۔ قابل غور سوال یہ ہے کیا خدا سے بغاوت اور معصیت و نافرمانی ان زلزلوں طوفانوں اور آتش فشانیوں کا
سبب نہیں ہو سکتی۔ کیا مراکش، ایران، انڈونیشیا اور پاکستان کی حکومتوں نے ایک لمحے کے لیے بھی اس پر غور کیا ہے۔
ان حکومتوں میں سے ہر حکومت کو اللہ نے آج یہ آزادی بخشی ہے کہ وہ اپنے ملک میں اللہ کا قانون نافذ کرے —
بے حیائیوں اور بدکرداریوں پر قدغن لگائے۔ فحاشی و عریانی کے اداروں کو بند کرے۔ نیکیوں کو فروغ دینے کی سعی کرے اور
بتدریج پورے ملک میں اسلامی شریعت کے رواج کا اہتمام کرے۔ اگر وہ باشندگان ملک کے اخلاق و کردار کی کتاب و سنت
کی اساس پر تعمیر کرنا چاہے تو فی الواقع آج کوئی مانع موجود نہیں ہے لیکن ان حکومتوں میں سے ہر حکومت میں عملاً آج ہو کیا رہا ہے
اس کے ذکر سے بھی دل خون ہوتا ہے۔ خدا اور آخرت سے غفلت کی انتہا اس حد کو پہنچ چکی ہے کہ ان ملکوں کے سربراہ سنجیدگی
کے ساتھ اس طرح کی باتیں سننا بھی پسند نہیں کرتے۔ وہ اسلام کا نام صرف مسلم عوام کے استحصال کے لیے لیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہر شخص یہ
نام صرف اسی لیے لے۔ عملاً وہ اسلام کا مغربی ایڈیشن تیار کر کے اپنے اپنے ملکوں میں نافذ کرنا چاہتے ہیں جس میں کسی بے حیائی و بدکاری پہ
قدغن نہیں ہے کیونکہ تمام بے حیائیاں اور بدکاریاں اب ثقافت بن چکی ہیں۔ کاش اب بھی مسلمان خواب غفلت سے بیدار ہوتے۔ کاش مشرقی
پاکستان کی بیس ہزار لاشیں ہمارے فکری و ذہنی سانچے کو بدل سکتیں۔ کاش آخرت کے حقیقی اور ابدی عذاب سے بچنے کی فکر ہمارے دل و
دماغ پر چھا جاتی۔ یہ وہ فکر ہے جو انسان کو دنیا میں سرگرم عمل کر دیتی ہے وہ خدا کا مطیع و فرماں بردار بن جاتا ہے اور خدا کی
اطاعت فلاح دارین کی ضامن ہے۔

(ادارہ)

تنقید و تبصرہ

اسلام اور جدید معاشی نظریات | مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، صفحات ۱۶۸ کاغذ، طباعت، کتابت بہتر، مجلد رنگین اور جاذب نظر ڈسٹ کور کے ساتھ، قیمت سوا دو روپے۔ ناشر: اسلامک پبلیکیشنز اسمی شاہ عالم مارکیٹ لاہور۔ ۷

اس کتاب کے دیباچے میں مولانا مودودی فرماتے ہیں:۔

"یہ مختصر رسالہ میری کتاب "سود" کے ان ابواب کا مجموعہ ہے جو اس سے پہلے کتاب مذکور کے حصہ اول و دوم میں شائع ہو چکے ہیں۔ جن حالات میں یہ دونوں حصے مرتب ہوئے تھے ان کی وجہ سے اس کی ترتیب ناظرین کے ذہن کے لیے اچھی خاصی پریشان کن بن گئی تھی۔ اب ازسرِ نو ترتیب کے موقع پر یہ مناسب معلوم ہوا کہ اس کے جن حصوں کا تعلق براہ راست سود کے مسئلے سے نہیں ہے انہیں الگ کر کے ایک جداگانہ رسالہ کی شکل میں شائع کیا جائے اور "سود" کے عنوان سے صرف ان ابواب کو جمع کر دیا جائے جن میں براہ راست مسئلہ سود پر بحث کی گئی ہے۔"

اس کتاب کا "سود" سے علیحدہ شائع کیا جانا ہر لحاظ سے بہتر اور مفید ہے۔ اس کتاب میں جو مباحث ہیں وہ مسئلہ سود کو سمجھنے کے لیے بنیاد اور اساس کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر اس بنیاد کو پہلے سمجھ لیا جائے تو پھر اسلامی تعلیمات کی روشنی میں "سود" کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ یہ چھوٹی سی کتاب ذیل کے سات ابواب میں تقسیم کی گئی ہے۔

(۱) موجودہ عمرانی مسائل کا تاریخی پس منظر (۲) جدید نظام سرمایہ داری (۳) سوشلزم اور کمیونزم (۴) ردِ عمل (۵) تاریخ کا سبق (۶) اسلامی نظام معیشت کے بنیادی ارکان (۷) جدید معاشی پیچیدگیوں کا اسلامی حل ـــــ ان میں سے ہر باب متعدد ذیلی عنوانات سے آراستہ ہے۔ ایک ذہین آدمی کے لیے یہ مختصر کتاب ان مباحث کو سمجھنے کے لیے تسلی بخش ہے جو اس میں پیش کیے گئے ہیں۔ بعض مقامات پر مولانا کے دل کش اندازِ بیان نے تلمیح اور طنز لطیف کا رنگ اختیار کر کے کتاب کو بہت دلچسپ بنا دیا ہے۔ فاشیت اور نازیت پر بحث کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

"انھوں نے پہلے یہ مقدمہ قائم کیا کہ "فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں" پھر اس پر یہ ردا چڑھایا

کہ ربطِ ملت میں جو فرد شامل نہیں ہوتا یا اس ربط کے قیام میں مانع ہوتا ہے اسے واقعی کچھ نہ رہنا چاہیے اس کے بعد استدلال کی عمارت یوں کھڑی کی کہ ربطِ ملت کا اصل مظہر ہے۔ قومی ریاست۔ قومی ریاست اور قومی سیاست کے ضبط و استحکام کا انحصار ہے اس پارٹی پر جو قومی وحدت اور ترقی کا یہ پروگرام لے کر اٹھی ہے۔ ہٰذا جرمن ہے تو نازی پارٹی میں آ" اور اٹالین ہے تو فاشسٹ ہو جا" اس طرح قوم اور ریاست اور حکومت اور حکمراں پارٹی کو ایک ہی چیز بنا ڈالا گیا۔"

(ع۔ق)

موقف العالم الاسلامی تجاہ الحضارۃ الغربیہ

مولانا ابوالحسن علی الحسنی الندوی قیمت دو روپیے
ناشر:۔ المجمع الاسلامی العلمی، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

اچھے کاغذ اور واضح ٹائپ میں چھپی ہوئی ۲۰ صفحات کی یہ عربی کتاب مولانا ابوالحسن علی ندوی کے قلم کی تراوش ہے۔ عربی کے جدید اور باوقار انداز بیان، فصیح و بلیغ زبان اور پُر یقین لہجے میں دینِ حق کی ترجمانی مولانا کا وہ امتیاز ہے جس میں ہندوستان کے اندر ان کا کوئی سہیم نہیں ہے۔ کثّر اللہ امثالہ واطال بقاءہ۔ عرصۂ دراز سے مغرب کی طاقت ور تہذیب نے دنیا کی دوسری تہذیبوں کو جو چیلنج دے رکھا ہے اس کا اصلی اور حقیقی ہدف صرف اسلامی تہذیب ہے اس لیے کہ جدید مغربی تہذیب کا مقابلہ اگر کوئی تہذیب کر سکتی ہے تو وہ یہی تہذیب ہے۔ اگرچہ فی الحال اس تہذیب پر مغربی تہذیب کے چھاپے بہت کامیاب ہیں اور تمام اسلامی ممالک اس کے شکار رہیں لیکن اب بھی اس میں جان باقی ہے اور ہمیں یقین ہے کہ یہ تہذیب اس جدید جاہلی تہذیب کو بھی شکست دے کر رہے گی۔ مولانا نے اپنی کتاب میں تفصیل سے یہ بات واضح کی ہے کہ عالمِ اسلامی کو حضارتِ مغربی کے سامنے کون سا موقف اختیار کرنا چاہیے۔ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے نہ سلبی موقف صحیح ہے اور نہ تقلیدی موقف درست ہے سلبی موقف اس لیے بے کار ہے کہ شتر مرغ کی طرح اپنا سر چھپانے سے طوفان رک نہیں جاتا اور اس کی عبرتناک مثال حجاز و یمن کے ممالک ہیں اور تقلیدی موقف اس لیے درست نہیں ہے کہ یہ مقابلہ نہیں بلکہ اپنی شکست کا اعتراف ہے۔ ترکی اور مصر اس تقلیدی موقف کے نمونے ہیں۔ صحیح موقف صرف میرانہ قف ہے اور وہ یہ ہے کہ اسلامی نظریات و عقائد پر زندہ یقین ہو۔ دنیا کی اصلاح اور آخرت کی کامیابی مطمح نظر ہو۔ خذ ما صفا دع ما کدر کا اصول سامنے ہو اور پھر اس جاہلی تہذیب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کا چیلنج قبول کیا جائے۔ بے کرداری کردار کے مقابلے میں، بے یقینی یقین کے مقابلے میں، مادیت صحیح روحانیت کے مقابلے میں تاریخ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔

کے کسی دور میں زیادہ دیر تک ٹھہر نہیں سکی ہے اور آج بھی ٹھہر نہیں سکے گی لیکن افسوس یہ ہے کہ ابھی تک کوئی ملک اجتماعی طور پر یہ موقف اختیار کرنے پر آمادہ نہیں ہوا اور شکست کا سارا راز اسی میں چھپا ہوا ہے۔ عالم اسلامی کو یہی تیسرا موقف اختیار کرنا چاہیے۔ اس کتاب میں مولانا نے ہندستان کے جن اشخاص اور جن اداروں کا ذکر کیا ہے وہ سرسری ہے لیکن عربی بولنے والے مسلمان ممالک کے باشندوں کے لیے اتنی واقفیت بھی بہت ہے۔ جماعت اسلامی نے اس سلسلے میں اپنا جو رول ادا کیا ہے مولانا نے اس کا ذکر شاید اس لیے نہیں کیا ہے کہ جماعت اسلامی والے خود یہ کام کر رہے ہیں اور کر سکتے ہیں۔ توقع ہے کہ یہ کتاب اسلامی ممالک میں مقبول ہوگی۔ ہندوستان میں بھی عربی جاننے والے اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ (ع۔ ق)

صنعت اکبر

مرتبہ حکیم محمد یوسف حسن صفحات ۴۱۸ مضبوط اور رنگین گرد پوش۔ قیمت تین روپے۔
ناشر:۔ اشرف اکیڈمی، پوسٹ بکس ۱۷۵ لائل پور۔ مغربی پاکستان۔

مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب کا طبی کارخانہ "اشرف لیبارٹیز" پاکستان میں عرصہ دراز سے قابل قدر طبی خدمات انجام دے رہا ہے۔ ان کی ادارت میں ایک طبی ماہنامہ بھی شائع ہوتا ہے۔ اب انھوں نے "اشرف اکیڈمی" کے نام سے ایک علمی ادارے کا آغاز کیا ہے اور زیر تبصرہ کتاب اس کی سب سے پہلی کتاب ہے۔ یہ کتاب کشتہ سازی کی صنعت سے متعلق ہے۔ اس کے دو ایڈیشن پہلے نکل چکے ہیں، یہ تیسرا ایڈیشن ہے۔ اس ایڈیشن میں مرتب نے جگہ جگہ اضافے کیے ہیں اور ابتدا میں ۹۶ صفحات کا مستقل اضافہ کیا ہے جس میں مشاہیر اطبا کے تجربے درج کیے ہیں۔ حرف اول میں حکیم اشرف صاحب نے کشتہ سازی کے فن پر اختصار کے ساتھ چند معلومات افزا سطریں لکھی ہیں۔ اس فن کے آغاز کا سہرا اگرچہ طب ویدک کے سر ہے لیکن مسلمان اطبا نے اس کو بہت ترقی دی ہے جس طرح طب یونانی کو انھوں نے اپنے علم و تجربے سے اتنی ترقی دی کہ ایک زمانے میں اس کی حیثیت وہی تھی جو آج دنیا میں ایلوپیتھک طریقۂ علاج کو حاصل ہے۔ ڈاکٹری علاج کا ایک بڑا امتیاز یہ ہے کہ وہ سریع التاثیر ہوتا ہے اس کے انجکشن اور گولیاں جلد اثر کرتی ہیں۔ یہ چیز ڈاکٹروں نے کشتہ سازی کے بنیادی تصور سے حاصل کی اور خود اطبا اس سے ناآشنا یا غافل ہو گئے۔ اگر اس فن کو اصول کے مطابق وہ پھر ترقی دیں اور علاج میں کشتے استعمال کریں تو مریض کو جلد فائدہ پہنچانے میں وہ ڈاکٹروں سے پیچھے نہ رہیں۔ اس کتاب کو مختلف ابواب میں تقسیم کر کے کشتے بنانے کے نسخے تحریر کیے گئے ہیں۔ اور کہیں کہیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہ کشتہ کس مرض کے لیے زیادہ مفید ہے۔ یہ کتاب

طلباء کے لیے ایک اچھا علمی تحفہ ہے۔ اس سے وہ کافی فوائد حاصل کر سکتے ہیں۔ (ع۔ ق)

اسلامی نظام زندگی اور اس کے بنیادی تصورات

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مجلد رنگین ڈسٹ کور، قیمت اعلیٰ اڈیشن ۹ روپے سستا اڈیشن ۶ روپے۔ ناشر: اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، ۱۳ ای شاہ عالم مارکیٹ لاہور

ساڑھے پانچ سو صفحات کی یہ ضخیم کتاب۔ اسلامی نظام زندگی اور اس کے بنیادی تصورات کو سمجھنے کے لیے ایک نعمت اور بہت ہی اطمینان بخش ذریعہ ہے۔ ناشر نے اس کتاب کے تعارف کے لیے جو کچھ لکھا ہے اس کی چند سطریں ذیل میں نقل کی جاتی ہیں:-

"ایک عرصے سے ایک ایسی کتاب کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی جس میں اسلامی نظام کے جملہ پہلوؤں پر مختصر مگر جامع طور پر روشنی ڈالی گئی ہو اور ایک عام آدمی کو ذہنی اور فکری طور پر اسلام پر مطمئن کر دے چنانچہ اسی مقصد کے پیش نظر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے مشورے سے یہ کتاب شائع کی جا رہی ہے۔ اس میں مولانا محترم کے ان مضامین اور تقاریر کو یک جا جمع کر دیا گیا ہے جو اسلامی نظام زندگی کی فکری بنیادوں سے بحث کرتے ہیں..... یہ مضامین پہلے بھی پمفلٹوں کی شکل میں بڑی تعداد میں شائع ہو چکے ہیں اور ملک میں ہی نہیں بیرون ملک بھی قبول عام حاصل کر چکے ہیں۔ ان کو یک جا شائع کرنے سے ان کی افادیت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ مجموعے میں اسلامی نظام زندگی کو روشناس کرانے اور اس کی طرف مائل کرنے کے لیے ایک بڑا سرمایہ علم نکلے گا۔"

اس کتاب میں جو کچھ جمع کیا گیا ہے اس نے علیحدہ علیحدہ پمفلٹ کی شکل میں بھی قدیم و جدید تعلیم یافتہ اذہان کو متاثر کیا ہے اور اس مجموعے کی شکل میں وہ اور زیادہ متاثر کرے گا لیکن بعض قدیم وجدید حلقوں نے پہلے بھی اس سیل رواں کو روکنے کی سعی کی ہے جو مولانا مودودی کے قلم سے نکلا ہے اور آج بھی کر رہے ہیں لیکن نہ وہ پہلے رکا ہے، نہ اب رُکے گا۔ (ع۔ ق)

اسلامی ریاست

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ صفحات ۷۲۰ مجلد، رنگین ڈسٹ کور، قیمت اعلیٰ اڈیشن بارہ روپے۔ سستا اڈیشن آٹھ روپے۔ ناشر: اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ۱۳ ای شاہ عالم مارکیٹ لاہور

اسلام کا سیاسی نظام کیا ہے؟ اس کے متعلقات کیا ہیں؟ اس زمانے میں عملاً ایک اسلامی ریاست کس نقشے پر بن سکتی ہے؟ ان اہم اور بنیادی سوالات پر پچھلے برسوں میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مدظلہ نے بہت کچھ

لکھا ہے "۔۔۔۔۔۔۔ لیکن ان موضوعات سے متعلق، ان کی تحریریں اور تقریریں یک جا کتابی شکل میں مرتب نہیں کی جاسکی تھیں۔ ان سب کو اس ضخیم کتاب میں پروفیسر خورشید احمد صاحب ایم اے ایل ایل بی نے ایک ترتیب کے ساتھ جمع کر دیا ہے۔ اس کتاب کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ مولانا نے اس پوری کتاب پر نظرثانی کر لی ہے وہ پروفیسر صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دیباچے میں لکھتے ہیں:۔

"اب میں جناب خورشید احمد صاحب کا بہت شکر گزار ہوں کہ انھوں نے بڑی خوش سلیقگی کے ساتھ ان کو ترتیب دے دیا ہے جس سے ایک قاری کے سامنے بیک وقت اسلام کے نظریے اور اس کے نظام ریاست کی پوری تصویر آجاتی ہے۔ اس سے پہلے اس تصویر کا ایک ایک رخ تو مختلف اوقات میں دکھایا جاتا رہا تھا مگر یک ہی مرقع میں پوری تصویر سامنے نہیں آسکی تھی۔ یہی اس مجموعہ کا اصل فائدہ ہے۔

میں نے اس پوری کتاب پر از سر نو نظرثانی کر لی ہے اور ترتیب میں بھی میرا مشورہ شامل رہا ہے۔"

اس کتاب کو پڑھنے کے بعد ایک قاری کو یہ خلا محسوس ہو سکتا ہے کہ اس میں "اسلامی قانون" پر مضامین نہیں ہیں۔ اس خلا کی وجہ کیا ہے اسے مرتب نے اپنے مقدمے میں لکھا ہے:۔

تمام مواد جمع کرنے کے بعد اندازہ ہوا کہ اسلامی ریاست اور اسلامی قانون کے موضوعات پر الگ الگ کتابیں تیار کرنی ہوں گی۔ ایک ہی کتاب دونوں قسم کے مقالات کی متحمل نہ ہو سکے گی۔ اس وقت اسلامی ریاست ناظرین کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ اگر اللہ نے توفیق دی تو جلد ہی "اسلامی قانون" بھی پیش کر دی جائے گی"

اسلامی سیاست و ریاست اور اس کے متعلقات پر جس وسعت نظر اور جس وضاحت اور جس منطقی ترتیب کے ساتھ مولانا مودودی نے لکھا ہے وہ صرف انہیں کا حصہ ہے۔ اس امتیاز میں ان کا کوئی سہیم نہیں ہے۔ ان موضوعات پر ان کے گوہر ریز قلم نے اردو زبان کو اس طرح مالا مال کیا ہے کہ عربی زبان بھی اس سے خالی نظر آتی ہے۔ تبصرہ نگار کو مولانا کے انہیں "جواہر" نے تحریک اسلامی سے قریب اور پھر اس سے وابستہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں دارین میں اس کی جزائے خیر عطا فرمائے۔ پروفیسر خورشید احمد صاحب ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ان موتیوں کو ایک لڑی میں پرو دیا ہے۔" (ع۔ق)

نشری تقریریں | مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ صفحات ۱۰۸ مجلد مع گرد پوش قیمت دو روپے۔ ناشر:۔ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، ۱۱ سی شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور۔

عرض ناشر میں جناب طفیل محمد صاحب نے لکھا ہے :۔

"ہم اس سے پہلے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی نشری تقریروں کا مجموعہ "اسلام کا نظام حیات" کے نام سے شائع کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ مولانا ممدوح کی کچھ نشری تقریریں اور بھی ہیں جو تقسیم سے پہلے آل انڈیا ریڈیو اور تقسیم کے بعد ریڈیو پاکستان کی نشر گاہ لاہور سے نشر ہوتی رہی ہیں۔ یہ مختلف اوقات میں منتشر طور پر تو شائع ہو چکی ہیں لیکن یک جا اور کتابی صورت میں ان کی اشاعت کی سعادت پہلی مرتبہ اس مجموعہ کی شکل میں ہمیں حاصل ہو رہی ہے۔"

اس مجموعے میں اضافہ یہ ہے کہ بعض تقاریر میں مولانا نے حاشیے میں توضیح مدعا کے لیے کچھ عبارتیں بڑھا دی ہیں جو اصلی نشری تقریر کا جزو نہیں ہیں۔ اس مجموعے میں حسب ذیل ۱۳ تقریریں شامل ہیں :۔

اسلام کی ابتدا — سرور عالم — میلاد النبی — سرور عالم کا اصلی کارنامہ۔ معراج کی رات۔ معراج کا پیغام۔ معراج کا سفرنامہ — شب برات — روزہ اور ضبط نفس۔ عید قرباں — قربانی — پاکستان کو ایک مذہبی ریاست ہونا چاہیے — زندگی بعد موت۔

یہ تقریریں متعدد بار شائع ہو چکی ہیں اور پڑھنے والے اس سے برابر فائدہ اٹھا رہے ہیں اس لیے ان کی افادیت کے بارے میں کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے۔ (ع۔ق)

اسلامی اصول صحت | از جناب فضل کریم فارانی بی اے (علیگ) ایل ایل بی۔ صفحات ۲۰۰ مجلد مع گرد پوش قیمت تین روپے پچاس نئے پیسے۔ ناشر:۔ ادارۂ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ۔ لاہور

تبصرہ نگار پوری کتاب نہیں پڑھ سکا۔ شروع کے اسی بیاسی صفحات پڑھے گئے ہیں اور پھر باقی حصے پر سرسری نظر ڈالی گئی ہے۔ فاضل مصنف نے کتاب محنت سے لکھی ہے۔ معلومات افزا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بڑے اچھے جذبے سے لکھی گئی ہے۔ انھوں نے اسلامی اصول صحت و صفائی کی برتری ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہیں۔ بحیثیت مجموعی کتاب قابل مطالعہ ہے لیکن مصنف چونکہ کتاب و سنت سے براہ راست واقفیت نہیں رکھتے۔ اس لیے انھیں احادیث و آیات کے اردو ترجمے پر انحصار کرنا پڑا ہے۔ ایک نہایت تکلیف دہ صورت۔۔ حال یہ ہے کہ مفاد پرست تاجروں نے احادیث کے نہایت ناقص اور غلط ترجمے شائع کیے ہیں اور

عربی سے ناواقف لوگ اسے خریدتے ہیں اور دھوکا کھاتے ہیں۔ مصنف نے بھی غلط ترجمے سے دھوکا کھایا ہے اور بعض غلط ترجمے پر اپنی بحث کی بنیاد رکھی ہے مثلاً ص۵۲ میں ایک ترجمہ یہ ہے:۔ "فراغت کے بعد متعلقہ جسم کی صفائی ہڈی اور گوبر سے ہرگز نہ کرنی چاہیے۔ کیونکہ ان میں جن ہوتے ہیں۔ "کیونکہ ان میں جن ہوتے ہیں" کا ٹکڑا بالکل غلط ہے۔ احادیث میں زاد اخوانکم من الجن کے الفاظ آئے ہیں یعنی ہڈیاں تمہارے جنی بھائیوں کی غذا ہیں۔ غلط ترجمے پر اعتماد کی وجہ سے مصنف کی پوری بحث بے معنی ہوکر رہ گئی ہے ـــــ حدیث کے بعض حوالوں میں بھی غلطی ہوئی ہے۔ مثلاً ص۶۷ پر "جو ہاتھ پاؤں کی انگلیوں کا پانی سے خلال نہیں کرتا اس کا دوزخ کی آگ سے خلال کیا جائے گا۔ مصنف نے ترمذی جلد اول ابواب الطہارۃ کا حوالہ دیا ہے، حالانکہ ترمذی کے ابواب الطہارۃ میں یہ حدیث نہیں ہے۔ ص۶۱ پر مصنف نے لکھا ہے۔ "غیر شادی شدہ نوجوان بالعموم احتلام کا شکار رہتے ہیں اور بعض تو اس کی کثرت کے باعث اپنی صحت کھو بیٹھتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک نوجوان نے اس عارضہ کی شکایت کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "سونے سے قبل اپنا ذکر دھولیا کرو۔" مصنف نے یہ بات صحیح نہیں لکھی اور حدیث کے اس ٹکڑے کا تعلق عارضۂ احتلام سے نہیں ہے ـــــ براہ راست واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے فقہی مسائل کے بیان میں بھی مصنف سے غلطیاں ہوئی ہیں ص۷۲ پر انھوں نے دہ در دہ کی تعریف میں لکھا ہے۔ "دس ہاتھ لمبا دس ہاتھ چوڑا دس ہاتھ گہرا" دہ در دہ ہونے کے لیے دس ہاتھ گہرا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک بالشت گہرائی بھی کافی ہے۔ ص۶۴ پر رفع حاجت کے سلسلۂ بیان میں لکھتے ہیں "لیکن اسلام میں اس غرض کے لیے پانی کا استعمال فرض قرار دے کر" رفع حاجت کے بعد طہارت کے لیے پانی کا استعمال فرض نہیں ہے۔ تجرید بخاری کا حوالہ غلط ہے کسی حدیث میں یہ بات نہیں کہی گئی ہے[1]۔ ص۶۵ میں مصنف لکھتے ہیں:۔ "ناک کی صفائی کے بعد دونوں ہاتھوں سے سارے چہرے پر آنکھیں کھول کر پانی کے چھینٹے دیے جاتے ہیں تاکہ آنکھوں میں پانی پڑے۔" وضو میں آنکھوں میں پانی ڈالنا نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہے اور نہ ایسا کیا جاتا ہے۔ اس مسئلے میں مصنف نے اپنے عمل پر دوسروں کے عمل کو قیاس کیا ہے۔

ص۶۶ پر لکھتے ہیں "اس کے بعد دونوں ہاتھوں پر پانی ڈال کر اور پھر گیلے ہاتھ ننگے سر پر پیشانی سے لے کر نصف حصہ یعنی چوٹی تک سارے بالوں پر پھیر لیے جاتے ہیں اسے مسح کہتے ہیں۔" سر کے مسح میں نصف حصۂ سر تک مسح تو ایک عجیب و غریب عمل ہے۔ مسنون پورے سر پر مسح کرنا ہے نہ کہ نصف حصے تک۔ ص۶۹ پر لکھتے ہیں حضور نے "اچھی طرح وضو کر یہ تیری عمر بڑھا دے گا۔" مصنف نے کسی کتاب کا حوالہ نہیں دیا، حوالہ دینا چاہیے تھا۔

---

[1] ڈھیلے وغیرہ استعمال کرکے بھی پاکی حاصل کی جاسکتی ہے۔

تبصرہ نگار کی رائے یہ ہے کہ اس کتاب کے پڑھنے والے فقہی مسائل میں جب تک تحقیق نہ کرلیں تنہا اس کتاب پر اعتماد نہ کریں۔ احادیث و آیات کے ترجموں کی بھی تصحیح و تصدیق ضروری ہے۔ مصنف نے متعدد مقامات پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بانی اسلام کا لفظ لکھا ہے جسے پڑھ کر کوفت ہوتی ہے۔ (م ا ن)

اُسوہ

مدیر:- سید معروف شیرازی۔ صفحات ۵۰۔ چندہ سالانہ:- پانچ روپیہ۔ فی پرچہ:- پچاس نئے پیسے۔ مقام اشاعت:- ۳۹۹ ڈلہوزی روڈ۔ راولپنڈی صدر۔ مغربی پاکستان

پاکستان کے عبوری دارالسلطنت راولپنڈی سے یہ ایک نیا ماہنامہ نکلنا شروع ہوا ہے اس کے دو شمارے اب تک شائع ہوچکے ہیں اور دونوں ہی میرے پیش نظر ہیں۔ اس ماہنامہ کی اشاعت کا مقصد مدیر کے الفاظ میں یہ ہے :-

> اسوہ کا نصب العین پاکستان اور پھر عالم اسلام میں دین کا احیاء ہے۔ ہمارے خیال میں دین اسلام کی کمزوری کے دو بڑے سبب ہیں۔ ایک حکمرانوں کی دین سے بے زاری اور دوسرا دین کے نمائندوں یعنی علماء کرام کا محدود تصور اور آپس میں ایک دوسرے سے اختلاف۔ انہی دونوں خرابیوں کی اصلاح اسوہ کا نصب العین ہے۔ (شمارہ ۱)

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ مولانا سید معروف شیرازی نے تشخیص بھی صحیح کی ہے اور علاج بھی ٹھیک سوچا ہے۔ ہم اس مقصد کی تائید کرتے اور معاصر کو خوش آمدید کہتے ہیں ــــ اسوہ کے دونوں شماروں میں قابل مطالعہ اور اچھے مضامین شائع ہوئے ہیں۔ پہلے شمارے میں "اسلام اور دور جدید" "ادب اور اسلام" اور دوسرے شمارے میں "نظام تعلیم کی تنظیم جدید" اور "اقبال اور عشق رسول" خصوصیت کے ساتھ لائق مطالعہ ہیں۔ جناب مدیر نے "مصباح المصابیح" کے مستقل عنوان سے مشکوٰۃ کی عام فہم تشریح بھی شروع کی ہے۔ کتابت و طباعت کا معیار ابھی اور بہتر ہونا چاہیے۔ خدا کرے یہ رسالہ اپنے مقصد پر قائم رہے اور ترقی کرے۔ (غ۔ ق)

ماہنامہ

زندگی رامپور

جلد :- ۳۱
شمارہ :- ۲

ربیع الاول ۱۳۸۳ھ
اگست ۱۹۶۳ء

مدیر :- سید احمد قادری

● خط و کتابت و ارسال زر کا پتہ — منیجر "زندگی" رامپور، یوپی
● زر سالانہ :- صہ ششماہی :- تین روپیہ - فی پرچہ :- پچاس نئے پیسے
● ممالک غیر سے :- دس شلنگ برٹش پوسٹل آرڈر

پاکستانی اصحاب مندرجہ ذیل پتہ پر رقوم بھیجیں اور رسیدیں ارسال فرمائیں۔
منیجر ہفت روزہ "شہاب" ۵/۱۱ شاہ عالم مارکیٹ، لاہور

مالک :- جماعت اسلامی ہند - اڈیٹر :- سید احمد عروج قادری - پرنٹر پبلشر :- احمد حسن - مطبع :- دہلی پرنٹنگ پریس محلہ جھگڑا نادخاں رامپور
مقام اشاعت :- دفتر زندگی رامپور، یوپی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

سید احمد قادری

پاکستان کی صوبائی اسمبلی کی ایک خبر یہ ہے :-

"صوبائی اسمبلی میں وقفۂ سوالات کے درمیان آبکاری و محصولات کے پارلیمانی سکریٹری ٹھاکر لچھمن سنگھ نے بتایا کہ صوبے میں شراب نوشی کی قطعی ممانعت کی سفارش کے سلسلے میں جو کمیٹی قائم ہوئی تھی اس کی رپورٹ محض اس لیے تیار نہیں ہوسکی ہے کہ اسلامی مشاورتی کونسل نے بار بار یاد دہانی کے باوجود ابھی شراب کی حلت و حرمت کے بارے میں بعض استفسارات کا جواب نہیں دیا ہے۔

اس خبر پر معاصر ایشیا لاہور نے تبصرہ کرتے ہوئے آخر میں لکھا ہے :-

"لیکن آپ کو شاید یہ معلوم نہیں کہ یہاں اس امر کی توقع بھی ہے کہ "ماہرین" اسلامی مشاورتی کونسل شراب کو قرآن اور اسلام کی روح کے مطابق حلال و طیب قرار دے دیں، آخر کچھ تحقیق انیق ہو رہی ہے جو اتنی دیر لگ رہی ہے ورنہ حرام بات تو سبھی کو معلوم ہے"

میں نے یہ خبر اور تبصرہ اس لیے نقل نہیں کیا کہ پاکستان کی اسلامی مشاورتی کونسل کے حدود و اختیارات پر بحث کروں یا وہاں کی شراب نوشی اور شراب کے کاروبار پر تنقید کروں اور نہ مجھے اس سے بحث ہے کہ غفلت حکومت کے محکمے کی ہے یا کونسل کی، بلکہ یہ خبر اور تبصرہ پڑھ کر ایک سوال یاد آگیا جو راقم الحروف سے ایک صاحب نے کیا تھا — چند سال گزرے ایک صاحب نے مجھ سے کہا کہ میرے ایک دوست اسلام پر یقین رکھتے ہیں، قرآن کو مانتے ہیں لیکن شراب کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ قرآن نے اسے حرام قرار نہیں دیا۔ ان کا سوال یہ ہے کہ کوئی شخص مجھے بتائے کہ قرآن میں کس جگہ شراب کو حرام کہا گیا ہے۔ دوست کا سوال نقل کرکے انھوں نے مجھ سے جواب کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے انھیں سورۂ مائدہ

کی آیت (۹۰) اور (۹۱) کا حوالہ دیا جس سے شراب کی حرمت قطعی ثابت ہوتی ہے۔ میرا یہ حوالہ سن کر وہ ہنسے اور کہنے لگے۔ مولانا! یہ آیتیں تو میرے دوست نے بھی پڑھی ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ان آیتوں میں یہ کہاں کہا گیا ہے کہ تم پر شراب حرام کردی گئی۔ ان کا مطالبہ یہ ہے کہ قرآن میں کوئی ایسی "صریح آیت" دکھائی جائے جس میں صاف صاف کہا گیا ہو کہ "تم پر شراب حرام کردی گئی"۔ مثال کے طور پر اسی سورۂ مائدہ میں آیت (۳) میں، مردار، خون، سور کے گوشت اور چند چیزوں کو "حرمت علیکم" کے لفظ کے ساتھ حرام کیا گیا ہے اسی طرح کوئی دکھائے کہ قرآن میں حرم علیکم الخمر کس جگہ کہا گیا ہے۔ کہنے لگے جب تک لفظ حرام کے ساتھ آپ قرآن میں شراب کی حرمت نہ دکھائیں، میرے دوست ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

نادانی کے اس مطالبے کا جواب دینے کے لیے ایک صورت تو یہ تھی کہ میں عربی زبان اور قرآن کے اسلوب بیان کی وضاحت کرتا، قرآن سے کسی شے کی حلت و حرمت اور کسی شے کے وجوب و عدم وجوب کے اثبات کے طریقوں کی تفصیل کرتا اور پھر یہ بتاتا کہ قرآن فہمی اور اس سے مسائل کے اخذ و استنباط کے لیے کن چیزوں کی ضرورت ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ لمبا کام تھا اور دوسری صورت یہ تھی کہ خود سائل سے دو ایک سوال کرتا جس سے انہیں اپنی غلط فہمی پر تنبیہ ہوتی اور وہ یہ سوچتے کہ ان کا مطالبہ صحیح ہے یا نہیں؟ یہ طریقہ چونکہ مختصر تھا اس لیے میں نے یہی اختیار کیا اور ان صاحب سے پوچھا کہ زنا اور عمل قوم لوط کے بارے میں آپ کے دوست کا کیا خیال ہے؟ اس کو وہ حرام سمجھتے ہیں یا نہیں؟ جوے اور صنم پرستی کے بارے میں ان کی کیا رائے ہے۔ یہ چیزیں حرام ہیں یا نہیں؟ یتیموں کا مال ہڑپ کر لینے کے بارے میں وہ کیا کہتے ہیں۔ یہ حرام ہے یا نہیں؟ اگر وہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں اور توقع ہے کہ حرام سمجھتے ہوں گے تو میری طرف سے ان سے سوال کیجیے گا کہ قرآن میں کس جگہ ان چیزوں کو حرم کے "صریح صیغے" کے ساتھ حرام کیا گیا ہے۔ اگر ان سے کوئی شخص مطالبہ کرے کہ قرآن میں وہ "صریح آیتیں" کہاں ہیں جن میں صاف صاف کہا گیا ہو، "اے مسلمانو! تم پر زنا حرام کردی گئی"، "تم پر عمل قوم لوط حرام کیا گیا"، "تم پر صنم پرستی اور جوا حرام کردیے گئے"، "تم پر یتیموں کا مال ہڑپ کر لینا حرام کیا گیا" اور جب تک کوئی شخص لفظ حرام کے ساتھ ان چیزوں کی حرمت قرآن میں نہیں دکھائے گا میں ان کی حرمت نہیں مانوں گا۔ تو بتائیے اس شخص کا آپ کے دوست کیا جواب دیں گے؟ وہ صاحب اب تک تو اپنے دوست کی پوری وکالت کر رہے تھے مگر میرا یہ سوال سن کر خاموش ہو گئے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ اپنے دوست سے میرے سوال کا جواب طلب کر کے

شارات
بے مطلع کیجیے گا تو پھر میں حرمت خمر کے مسئلے پر مزید اظہار خیال کروں گا ۔ اس کے بعد آج تک پھر انھوں نے کبھی
س مسئلے پر بات چیت نہیں کی ۔

بعض لوگ شرارت سے، مسلمانوں کے عقائد و اعمال کو خراب کرنے کے لیے اس طرح کے چٹکلے ایجاد کرتے ہیں اور بعض لوگ، سادگی مزاج کی وجہ سے غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں ۔ سورہ مائدہ کی جن آیتوں سے شراب کی حرمت ثابت ہوتی ہے ان میں صرف شراب کا ذکر نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ جوا، بتوں کے تھان، اور پانسے بھی مذکور ہیں ۔ ان چیزوں کو گندگی کہا گیا ہے، انہیں "شیطانی عمل" قرار دیا گیا ہے ۔ ان سے اجتناب و پرہیز کا حکم دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ ان چیزوں سے پرہیز کروگے تو امید ہے کہ تمہیں فلاح نصیب ہوگی ۔ شراب کی قطعی حرمت کے لیے اتنا ہی کافی تھا لیکن اتنے پر اکتفا نہیں کی گئی بلکہ آیت (۹۱) میں شراب اور جوے کے اجتماعی و انفرادی نقصانات کا ذکر کیا گیا اور آخر میں پوری شان حاکمانہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے یہ سوال کیا فهل انتم منتهون (پھر کیا تم ان چیزوں سے باز رہو گے ؟) احادیث میں جو کچھ ہے وہ تو ہے ہی، خود قرآن کی ان صراحتوں کے باوجود اگر کوئی شخص اپنے تجویز کیے ہوئے الفاظ میں حرمت شراب کی صراحت کا مطالبہ کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ یہ مطالبہ کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنا حکم اس کے تجویز کیے ہوئے الفاظ میں نازل کرنا چاہیے تھا ۔

جاننے والے جانتے ہیں کہ شراب کی حرمت کے لیے جو کچھ کہا گیا ہے اور جس انداز میں کہا گیا ہے وہ حرّمَ کے صیغے سے کہیں زیادہ شدید ہے ۔ قرآن کے جو لوگ مخاطب اوّل تھے وہ فهل انتم منتهون کی ڈانٹ سن کر بے ساختہ چیخ اٹھے تھے انتهينا انتهينا (ہم باز آگئے، ہم باز آگئے) شراب کے خم چھوڑ دیے گئے اور جام و مینا توڑ دیے گئے ۔ شراب کا پیالہ جو لبوں تک پہنچ چکا تھا وہ حرمت خمر کی اطلاع پاکر لبوں سے دور ہو گیا اور دونوں میں اتنی دوری پیدا ہو گئی جتنی آسمان اور زمین کے درمیان ہے لیکن آج پونے چودہ سال کے بعد ایک مسلمان یہ سوال کرتا ہے کہ شراب کو قرآن میں کس جگہ حرام کہا گیا ہے ۔ عجب نہیں کہ حکومت پاکستان کا محکمۂ آبکاری وہاں کی نام نہاد اسلامی مشاورتی کونسل سے اسی نوعیت کا کوئی سوال کرے اور وفادار کونسل جواب میں عرض کرے کہ "قرآن میں شراب کو صراحۃً حرام کہیں نہیں کہا گیا ہے

اگر کسی کا یہ مطالبہ صحیح تسلیم کرلیا جائے کہ کوئی حکم اسی وقت حکم خداوندی مانا جائے گا جب وہ اس شخص کے تجویز کیے ہوئے الفاظ میں دکھایا جائے تو پھر شریعت اسلامی کے کتنے احکام اپنی جگہ باقی رہیں گے؟ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اسلام کے ارکان اربعہ تک اس کی زد میں آجائیں گے۔

مثال کے طور پر آپ کہتے ہیں کہ "رمضان کے روزے، مسلمانوں پر فرض کیے گئے ہیں" یہ سن کر کوئی "وقت کا عبقری" آپ سے سوال کرے کہ دکھاؤ یہ بات قرآن میں صراحۃً کہاں کہی گئی ہے۔ آپ قرآن کی وہ آیت پیش کریں جس سے فرضیت ثابت ہوتی ہے، وہ شخص قہقہہ لگا کر کہے، خوب اسی کو کہتے ہیں "صریح آیت" مجھے تو جب تک تم "فرضت علیکم صیام شہر رمضان" جیسی کوئی آیت نہ دکھاؤ گے میں نہیں مانوں گا۔ تم مولوی لوگ بہت سی چیزوں کو فرض، فرض کہتے ہو حالانکہ قرآن میں اس کے لیے فرض کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا۔ تو بتائے کہ آپ کے پاس اس "عبقریت" کا جواب کیا ہوگا؟ اسی طرح وہ عبقری وقت، نماز، زکوٰۃ اور حج کی فرضیت کو بھی طاق نسیاں پر رکھ دے اور آپ اس کا منہ دیکھتے رہ جائیں۔

ایک اور مثال لیجیے۔ آپ کہتے ہیں کہ "دنیا کی حکومتوں میں اسلامی حکومت سب سے بہتر حکومت ہے"۔ یہ سن کر کوئی شخص کہے کہ یہ بات قرآن میں کہیں نہیں ہے۔ آپ جواب دیں کہ بے شک اس مضمون کی کوئی آیت نہیں ہے لیکن قرآن کے مجموعی آیات و احکام سے یہ بات مستنبط ہوتی ہے اور یہ استنباط اتنا قوی اور بلند ہے جیسے یہ بات کسی صریح آیت میں کہی گئی ہو۔ وہ شخص کہے، میں تمہارے استنباط کو نہیں مانتا تم تو مجھے الحکومۃ الاسلامیۃ من احسن حکومات الدنیا جیسے الفاظ میں کوئی آیت دکھاؤ تو آپ کے پاس اس کا کیا جواب ہوگا۔ اور اگر کہیں وہ شخص کہے کہ تم حکومت اسلامیہ، حکومت اسلامیہ کی رٹ لگاتے ہو۔ دکھاؤ کہ یہ لفظ قرآن میں کہاں استعمال ہوا ہے تو اس کا سوال اور زیادہ لاجواب ہوگا۔

یہ باتیں اگر کسی ایسے شخص کی طرف سے کہی جائیں جو قرآن و حدیث اور اصول شرع سے ناواقف ہو تو آپ کو اس کی جہالت پر افسوس ہوگا اور آپ چاہیں گے کہ کسی طرح اس کی جہالت دور ہو جائے لیکن اس طرح کی باتیں اگر ان لوگوں کی طرف سے کہی جانے لگیں جو صاحب علم ہیں تو یہ ایک ایسی صورت حال ہوگی جس سے عہدہ برآ ہونا سخت مشکل کام ہے۔ کیونکہ عموماً یہ صورت حال پانچ وجوہ سے پیدا ہوتی ہے۔ ضد۔ غرور علم۔ کسی کی عقیدت میں غلو۔ مداہنت بصورت مصلحت۔ دین کے کسی ایک یا چند اجزاء کا ذہن و دماغ پر غلبہ۔

یہ پانچ ایسی بیماریاں ہیں جن کا علاج کسی دوسرے شخص کے پاس نہیں بلکہ خود بیماروں کے پاس ہوتا ہے وہ چاہیں تو یہ بیماریاں دور ہو سکتی ہیں اور نہ چاہیں تو پھر صحت یاب ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ ان لوگوں کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ اگر آپ اپنے مدعا کے لیے کوئی صریح آیت بھی پیش کریں تو وہ دور از کار تاویل کر کے رد کر دیں گے۔ گویا آیت کی صراحت و عدم صراحت کا معیار بھی انہیں کی ذات گرامی ہوتی ہے وہ جس آیت کو صریح کہہ دیں وہ صریح ہے اور جسے صریح نہ کہیں وہ صریح نہیں ہے چاہے تمام اہل علم اسے صریح کیوں نہ کہہ رہے ہوں۔

اب اگر کوئی سوال کرے کہ ایسے لوگوں کا جواب دینے سے کیا فائدہ تو بات یہ ہے کہ جواب اس لیے نہیں دیا جاتا کہ وہ لوگ اسے مان لیں گے بلکہ اس لیے دیا جاتا ہے کہ دوسرے سادہ لوح اور ناواقف لوگ غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔

آج کل جماعت اسلامی کے نصب العین "اقامت دین" پر ہر طرف سے حملے کیے جا رہے ہیں۔ کچھ لوگ اس نصب العین کو ماننے والوں سے جو مطالبات کر رہے ہیں انہیں سن کر اور پڑھ کر وہ مطالبات یاد آجاتے ہیں جن کا ذکر اوپر گزرا۔

جماعت اسلامی کہتی ہے کہ تمام انبیاء کرام اور آخر میں سیدنا محمد رسول اللہ صلوات اللہ علیہم اجمعین کی بعثت اس لیے ہوئی تھی کہ وہ دنیا میں اللہ کے دین کو قائم کریں اور انہیں دین حق دے کر بھیجنے کی غرض و غایت یہ تھی کہ وہ اس کو تمام ادیان باطلہ پر غالب کریں۔ امت مسلمہ کا مقصد حیات اور نصب العین بھی وہی ہے اور رہنا چاہیے جو اس دنیا کے آخری نبی کا مقصد بعثت تھا۔ جماعت اسلامی نے جو یہ نصب العین اختیار کیا ہے اس کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ اس کے نزدیک اللہ کی طرف سے امت مسلمہ پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی ہے کہ وہ اس مقصد کے حصول کے لیے جد و جہد کرے۔ یہی سعی و جہد اسے آخرت میں سرخ رو کرے گی اور رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ ثابت ہوگی۔

اب ایک صاحب فرماتے ہیں کہ ہمیں تو قرآن میں کہیں نہیں ملتا کہ انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد اقامت دین تھا اور نہ یہ بات ملتی ہے کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دین حق دے کر اس لیے بھیجا گیا تھا کہ وہ اسے

تمام ادیان باطلہ پر غالب کریں۔ اگر تمہارا دعویٰ صحیح ہے تو دکھاؤ قرآن میں "صریح آیتیں" جب ان کے سامنے آیتیں پیش کی جاتی ہیں تو ابھی قہقہہ تو نہیں لگاتے مگر تبسم زیرلب کے ساتھ فرماتے ہیں کہ اچھا! یہی ہیں وہ آیتیں جن سے تم اپنا مدعا ثابت کرتے ہو۔ میں تمہارا دعویٰ اس وقت تک تسلیم نہیں کروں گا جب تک یہ نہ دکھا دو کہ کسی نبی نے اپنی قوم سے کہا ہو "اے میری قوم آگاہ ہو جا کہ مجھے اللہ نے اقامت دین کے لیے بھیجا ہے" اور جب تک تم مجھے یہ نہ دکھا دو کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کہا ہو "اے لوگو! آگاہ ہو جاؤ کہ میری بعثت کا مقصد یہ ہے کہ میں دین حق کو تمام ادیان پر غالب کروں" ان الفاظ میں جب تک تم آیتیں نہ دکھاؤ گے، میں تمہارا دعویٰ تسلیم نہیں کروں گا۔

ایسے لوگوں کا تحقیقی جواب تو دیا جاتا رہے گا۔ الزامی جواب یہ ہے کہ ان سے مطالبہ کیا جائے کہ آپ قرآن میں ایسی "صریح آیتیں" دکھائیے جن میں کہا گیا ہو کہ اے مسلمانو! تم پر نماز فرض کی گئی، روزہ "فرض" کیا گیا، زکوٰۃ فرض کی گئی اور حج فرض کیا گیا ـــ اور قرآن میں کہیں دکھائیے کہ "اے مسلمانو تم پر شراب حرام کر دی گئی" جب تک آپ اس صراحت کے ساتھ آیتیں پیش نہیں کریں گے نہ شراب کی حرمت ثابت ہوگی اور نہ ان ارکان اسلام کی فرضیت و وجوب ثابت ہوگا۔

ایسے لوگ اگر انصاف کے ساتھ اس مطالبے کا جواب دینے لگیں تو انہیں خود اپنے مطالبے کا جواب بھی آپ سے آپ مل جائے۔

اخبار و افکار کا بقیہ) مصر، لبنان اور عراق وغیرہ کے عمل کو بڑے زور کے ساتھ پیش کیا ہے۔

میاں صاحب کے علاوہ ایک خاتون ممبر نے بھی یہ دلیل بڑے زور کے ساتھ پیش کی ہے۔

بیگم جہاں آرا شاہنواز نے دریافت کیا کہ اگر یہ قوانین خلاف شرع ہیں تو آخر دوسرے ممالک ان کو کیوں نافذ کر رہے ہیں۔ کیا عربی پڑھنا صرف ہمارے علماء ہی کو آتا ہے۔ دوسرے ممالک کے علماء کو عربی پڑھنا بالکل نہیں آتا؟

بیگم جہاں آراء نے یہ بیان نہیں کیا کہ کس ملک میں کتنے علماء نے ان عائلی قوانین کو شرعی قرار دیا ہے جو پاکستان میں نافذ کیے گئے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی بیان نہیں کیا کہ نام نہاد اسلامی ممالک نے عائلی قوانین میں جو ترمیمیں کی ہیں وہ ان ممالک کے مستند و متقی علماء کے مشوروں کے بعد کی ہیں۔ ان ممالک میں بھی ترمیم اسی قسم

کے غلامانِ مغرب نے کی ہے جس قسم کے غلامانِ مغرب نے پاکستان میں کی ہے۔ اور اب بھارت کے غلامانِ مغرب، پاکستان کی ترمیم کو سند بنانا چاہ رہے ہیں۔

آئندہ کیا ہوگا؟ پاکستان کی قومی اسمبلی بھی اسے منسوخ کرنے کی سفارش کرے گی یا نہیں؟ پھر یہ کہ صدر ایوب اسے منسوخ کریں گے یا نہیں؟ جو کچھ بھی ہو اتنی بات تو ثابت ہو چکی کہ پاکستان میں عائلی قوانین محض ڈنڈے کے زور سے نافذ کیے گئے ہیں۔ انہیں نہ عوام کی تائید حاصل ہے اور نہ علماء کرام کی حمایت۔

تعدّدِ ازواج کی ایک مصلحت

بعض اوقات ایک شخص اپنے اخلاقی تحفظ کے لیے مجبور ہوتا ہے کہ ایک سے زیادہ شادیاں کرے فرض کیجیے۔ ایک شخص ہے، اس کی بیوی کمزور صحت کی ہے، وہ زیادہ اولاد کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتی میاں بیوی برتھ کنٹرول کو بھی ناجائز سمجھتے ہیں۔ شوہر آوارگی اور بدچلنی پر بھی راضی نہیں ہے۔ یا فرض کیجیے ایک شخص ہے، اس کا دل کسی عورت پر آگیا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ اگر اس کے ساتھ اس نے نکاح نہ کر لیا تو وہ کسی فتنے میں مبتلا ہو جائے گا۔ یا وہ اپنے اندر مفرط جنسی جذبہ رکھتا ہے لیکن اسلام کے اخلاقی حدود کا سختی کے ساتھ پابند ہے۔ ایسی صورت میں مغربی سوسائٹی تو مرد کو قحبہ خانوں، نائٹ کلبوں اور عیاشی کے دوسرے اڈوں کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور جو عورت بھی اس سے اختلاط پر راضی ہو جائے اس سے آزادانہ تمتع کی اجازت دیتی ہے، لیکن اسلام اس کو ان ساری حرکتوں پر سخت سے سخت دنیوی سزا کی دھمکی اور اخروی عذاب کی وعید سناتا ہے۔ البتہ اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ وہ عدل کی شرط پوری کر سکتا ہو تو ایک سے زیادہ شادیاں کر لے۔

(مولانا امین احسن اصلاحی)

خدا کیا چاہتا ہے؟

(مولانا سید جلال الدین عمری)

خدا نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے اور اسی میں اس کا امتحان ہے۔ آپ کی نگاہ جہاں تک جا سکتی ہے وہاں تک دیکھیے، جس چیز کو قدرت نے جس جگہ رکھا ہے وہ اسی جگہ موجود ہے، لیکن انسان آزادی سے سوچ سکتا ہے اور آزادی سے عمل کر سکتا ہے۔ ہوا میں اڑنے والے پرندے اپنی رفتار بدل نہیں سکتے۔ لیکن انسان کسی رفتار کا پابند نہیں ہے۔ وہ خود ہی راہ تلاش کرتا ہے اور خود ہی منزل پر پہنچتا ہے جس روز خدا نے اس کے اندر آزادی کی روح پھونکی، اسے اختیار دے دیا کہ چاہے وہ اس کا اطاعت گزار رہے یا اس سے بغاوت کر دے۔

خدا کو ماننے کے بعد انسان کی آزادی چھن جاتی ہے اور وہ اس کا غلام بن جاتا ہے۔ خدا پر ایمان یہ ہے کہ انسان بندگی کے مقام پر کھڑا ہو جائے اور اپنے تمام اختیارات سے دست کش ہو جائے۔ جب آپ اپنی زبان سے خدا کے وجود کا اقرار کرتے ہیں تو اس حقیقت کا اقرار کرتے ہیں کہ یہ کائنات خود بخود پیدا نہیں ہوئی ہے بلکہ خدا نے اسے پیدا کیا ہے اور وہی اس کا حاکم و فرماں روا ہے۔ سارا اقتدار اسی کے ہاتھ میں ہے اور کوئی اس کا شریک و ہمسر نہیں ہے۔ انسان اس کی مخلوق ہے اور وہ اس کا خالق ہے۔ انسان اس کے در کا بھکاری ہے اور وہ اس کا محسن ہے۔ کائنات کی ہر چیز خدا کی ہے۔ خدا چاہے تو انسان اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور اگر وہ نہ چاہے تو انسان ہر چیز سے محروم ہے۔ انسان اپنے وجود میں اپنی موت و حیات میں اور اپنے فکر و عمل میں خدا کا محتاج ہے لہٰذا اس کے لیے صحیح روش یہ ہے کہ وہ خدا کے سامنے جھک جائے اور اس کی اطاعت کرے۔ یہ یقین کہ خدا ہے انسان کو اس کا بندہ بنا دیتا ہے۔ بندہ اپنی مرضی کا مالک نہیں ہوتا بلکہ آقا کی مرضی کا پابند ہوتا ہے۔ اسے وہی کرنا چاہیے جس کا خدا حکم دے اور ہر اس عمل سے رک جانا چاہیے جس سے خدا روکے۔

لیکن خدا کی مرضی کیا ہے کہ انسان اس کا پابند ہو جائے؟ وہ کس کام کا حکم دیتا ہے کہ انسان اسے بجا لائے اور کس کام سے منع کرتا ہے کہ انسان اس سے باز رہے؟ یہ بہت بڑا سوال ہے جس سے خدا کو ماننے والا ہر انسان دوچار ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ انسان اس حال میں پیدا ہوتا ہے کہ اس کے ہاتھ میں کوئی کتاب نہیں ہوتی جس میں خدا کی مرضی لکھی ہوا ور نہ پیدا ہونے کے بعد براہ راست خدائے تعالیٰ اسے بتاتا ہے کہ وہ کیا چاہتا ہے اور کیا نہیں چاہتا، پھر وہ کیسے اس کی اطاعت کرے؟ وہ کون سا ذریعہ ہے جس سے وہ معلوم کر سکے کہ خدا کی مرضی کیا ہے اور کیا نہیں ہے؟

خدا نے انسان کو عقل دی ہے۔ جن معاملات میں حواس کام نہیں کرتے ان میں وہ عقل سے رہنمائی حاصل کرتا ہے لیکن انسان کی بے بسی یہ ہے کہ اس معاملے میں عقل اسے آخری حد تک نہیں پہنچاتی بلکہ درمیان ہی میں چھوڑ دیتی ہے۔ اصولی طور پر ہم اتنی بات ضرور جانتے ہیں کہ یہ کائنات ایک وحدت ہے۔ اس کے کسی حصے کو ہم دوسرے سے الگ نہیں کر سکتے۔ انسان اس وسیع کائنات کا ایک جزء ہے اور جزء ہمیشہ کل کے تابع ہوتا ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ جزء کا مقصد کل کے مقصد سے ٹکرا رہا ہو اور جو کام کل انجام دے رہا ہو جزء اس سے مختلف کام انجام دے۔ اس لیے عقل کا صریح تقاضا یہ ہے کہ انسان کی زندگی کا مقصد ٹھیک وہی ہونا چاہیے جو اس کائنات کا مقصد ہے اور اسے اسی راہ پر چلنا چاہیے جس راہ پر کائنات چل رہی ہے۔

اس حقیقت کو ماننے کے بعد آپ تنہا انسان کے بارے میں سوچ نہیں سکتے کہ خدا اس سے کیا چاہتا ہے؟ بلکہ اب کو اس سے وسیع تر سوال پر غور کرنا ہوگا۔ وہ یہ کہ خدا اس کائنات میں کیا چاہتا ہے؟ کیونکہ جزء کے بارے میں آپ کا غور و فکر اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ آپ کل کے بارے میں اپنا غور و فکر مکمل نہ کر لیں۔ اگر آپ انسان کے کسی عضو کے متعلق سوچنا چاہیں تو آپ کو اپنی فکر کا آغاز اس بنیاد پر کرنا ہوگا کہ وہ انسانی جسم کا ایک عضو ہے۔ پھر آپ دیکھیں گے کہ پورے نظام جسمانی میں اس کا کیا مقام ہے اور وہ کون سا کام انجام دے رہا ہے۔ اس کے بعد ہی آپ اس کے بارے میں صحیح رائے دے سکیں گے لیکن اگر آپ اسے انسانی جسم کا ایک حصہ نہ مانیں اور مانیں تو اسے نظام جسمانی سے الگ کر کے دیکھیں تو اس کے متعلق آپ جو بھی رائے قائم کریں گے وہ یقیناً غلط رائے ہوگی۔ اس لیے پوری کائنات میں

[illegible]

جزء کا وجود کُل سے قائم ہوتا ہے اور کُل ہی سے اُس کی قدر و قیمت متعین ہوتی ہے۔ جزء کو کُل سے الگ کرنے کے بعد وہ ختم ہو جاتا ہے اور اس کی قدر و قیمت گھٹ جاتی ہے۔ اگر آپ کسی مشین سے اس کا ایک پرزہ جدا کر دیں تو اس کی حرکت رک جائے گی اور اس کی حیثیت محض لوہے یا تانبے کی دھات کی ہوگی لیکن اگر آپ اسے پوری مشین کے اندر رکھ کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ وہ "زندہ" ہے اور مشین کے ایک جزء کی حیثیت سے بہت بڑا کام انجام دے رہا ہے۔ ٹھیک اسی طرح انسان کائنات کے ایک جزء کی حیثیت سے زندہ ہے اور اسی حیثیت سے اس کا مقام بہت اونچا ہے۔ کائنات سے الگ ہونے کے بعد اس کا وجود مٹ جائے گا اور اس کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہے گی۔ انسان کائنات کا جزء ہے اس لیے وہ ایسے عقائد و نظریات کا محتاج ہے جن کی تائید کائنات کے ہر گوشے سے ہو رہی ہو اسے ایسا نظام حیات چاہیے جو نظام کائنات سے ہم آہنگ ہو اور اسے ایسے قوانین کی ضرورت ہے جو قوانین کائنات سے مطابقت رکھتے ہوں۔

خدا اس کائنات میں جو کچھ چاہتا ہے وہی وہ انسان سے بھی چاہتا ہے۔ جس دن انسان کی روش کائنات کی روش سے ہم آہنگ ہو جائے گی خدا کی زمین پر خدا کی مرضی پوری ہونے لگے گی اور وہ انسان سے خوش ہو جائے گا۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے آپ کو ایک خاص پہلو سے غور کرنا ہوگا۔ خدائے تعالیٰ اس کائنات کو ٹھیک ٹھیک اپنی مرضی کے مطابق چلا رہا ہے۔ یہاں اسی کے بنائے ہوئے قوانین کام کر رہے ہیں اور کہیں اس کی حکم عدولی نہیں ہوتی۔ پوری کائنات میں وہی ہوتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔ اس کا ارادہ ہر چیز کی علت ہے۔ کوئی بھی واقعہ اس وقت تک وجود میں نہیں آتا جب تک کہ اس کے پیچھے خدا کی مرضی نہ ہو۔ انسان بھی اپنی زندگی کے بڑے حصے میں ان ہی ضابطوں کا پابند ہے جن کے تحت خدائے تعالیٰ اس کائنات کو چلا رہا ہے۔ اس کا وجود نظام کائنات کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس کی موت و حیات، اس کا عروج و زوال اس کی بیماری و تندرستی غرض ایک دو نہیں بے شمار معاملات میں اس پر قوانین کائنات کی حکومت ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ ایک خاص دائرے میں خدا نے اسے اپنی مرضی کا پابند نہیں بنایا ہے، بلکہ فکر و عمل کی اسے آزادی دے رکھی ہے۔ کیونکہ خدا چاہتا ہے کہ انسان اس دائرے میں اپنے اختیار سے اس مقصد کو قبول کرے جو اس کائنات کا مقصد ہے اور ان قوانین اور ضابطوں کو اپنی زندگی میں نافذ کرے جو پوری کائنات میں نافذ ہیں۔

یہاں آپ سوال کریں گے کہ کیا انسان کائنات میں خدا کی مرضی معلوم کر سکتا ہے؟ کیا وہ اس مقصد کو سمجھ سکتا ہے جو تخلیق کائنات کے پیچھے موجود ہے؟ کیا وہ اُن اصول وقوانین کو جان سکتا ہے جو اس کائنات میں کام کر رہے ہیں؟ اس سوال کا غالباً ایک ہی جواب دیا جاسکتا ہے اور وہی اس کا صحیح جواب ہے۔ وہ یہ کہ اس وسیع کائنات کو پوری طرح سمجھنا' اس کے قوانین اور حکمتوں کو معلوم کرنا انسان کے بس سے باہر ہے اس کے لیے ایٹم کے باریک سے باریک ذرات کا مشاہدہ کرنا ممکن ہے لیکن لوح کائنات پر خدا کی مرضی کا پڑھنا ممکن نہیں ہے۔ وہ کسی طرح جان نہیں سکتا کہ کائنات کا انتظام کس ڈھنگ کا ہے یہاں عروج و زوال کے کیا ضابطے ہیں اور خدائے تعالیٰ انہیں کس طریقے سے چلا رہا ہے؟ اس میں شک نہیں کہ خدا نے اس کائنات کو ایک خاص مقصد کے تحت پیدا کیا ہے لیکن یہ مقصد کیا ہے اور کائنات اس مقصد کو کیسے پورا کر رہی ہے اس کی ابتدا کیا ہے اور کب یہ فنا ہو جائے گی؟ یہ اور ایسے بہت سے بنیادی مسائل ہیں جن کے بارے میں انسان بالکل تاریکی میں ہے۔ کائنات خدا کی مشیت اور اس کے ارادے سے بھری ہوئی ہے لیکن انسان میں یہ طاقت نہیں ہے کہ اس کی مشیت کو خود سے دریافت کرے اور اس کے ارادے کو سمجھ جائے۔ کائنات میں خدا کی مرضی معلوم کرنے کے لیے وسیع علم کی ضرورت ہے لیکن انسان کا علم بہت محدود ہے۔ اس کے سامنے پوری کائنات نہیں ہوتی بلکہ کائنات کے صرف چند گوشے ہوتے ہیں۔ اسی سے حقیقت کو وہ ہمیشہ ناقص اور ادھوری شکل میں دیکھتا ہے۔ وہ اسرار کائنات میں سے بہت کم چیزوں سے واقف ہے۔ حالانکہ خدا کی مرضی کسی ایک یا چند چیزوں میں مرتکز نہیں ہے بلکہ وہ جو کچھ چاہتا ہے اسے اس نے پوری کائنات میں پھیلا دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے محدود علم اور ناقص مطالعہ سے کبھی اس مقام پر پہنچ نہیں سکتا کہ خدا کی مرضی اس پر کھل جائے اور وہ اس کی خوشی و ناخوشی سے آگاہ ہو جائے۔

لیکن یاد رکھیے! اس بحث کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مطالعہ کائنات سے خدا کی مرضی بالکل معلوم نہیں کی ہو سکتی۔ بے شک کائنات پر غور و فکر کے ذریعہ جس طرح انسان کے اندر خدا کے وجود کا کامل یقین ابھرتا ہے اسی طرح کسی نہ کسی درجے میں وہ خدا کی مرضی کا تصور بھی کر سکتا ہے۔ لیکن اس غور و فکر سے نہ تو خدا کی ذات وصفات کا اسے تفصیلی تعارف حاصل ہوتا ہے اور نہ خدا کی مرضی پوری طرح اس کے سامنے جلوہ گر ہوتی ہے۔ خدا کو ماننے کے بعد جس اہم سوال سے ہم دوچار ہیں وہ یہ ہے کہ زندگی کو کیسے خدا کی مرضی کے تابع کریں اور اس کے کامل مطیع و فرماں بردار بن جائیں؟ اس کے لیے خدا کی مرضی کا مجمل تصور یا اس کی ایک جھلک

کافی نہیں ہے بلکہ ایسی روشنی کی ضرورت ہے جس کی مدد سے انسان قدم قدم پر دیکھ سکے کہ خدائے تعالیٰ کیا چاہتا ہے اور کیا نہیں چاہتا۔ اس کی خوشی کن کاموں میں ہے اور وہ ناخوش کن چیزوں سے ہوتا ہے؟ تاکہ پورے یقین اور اطمینان کے ساتھ وہ خدا کی اطاعت کر سکے لیکن افسوس کہ کائنات کا مطالعہ انسان کے اندر اس روشنی کے پیدا کرنے سے قاصر ہے۔ یہ کائنات ایک ایسی تحریر ہے جس میں خدا کی مرضی لکھی ہوئی ہے۔ انسان اس تحریر کا صرف اجمالی شعور حاصل کر سکتا ہے تفصیلی مطالعہ نہیں کر سکتا۔ خدا کی خوشی و ناخوشی اس کائنات میں نغمہ بن کر گونج رہی ہے۔ انسان اس کی ہلکی سی آواز تو سن سکتا ہے لیکن اسے پوری طرح سمجھ نہیں سکتا۔ ہر طرح کے ساز و سامان سے بھری ہوئی اس کائنات میں انسان بہت ہی بے بسی کے مقام پر کھڑا ہے۔ اس کی زندگی میں جو حق نمایاں ہونا چاہیے اس حق کا سراغ وہ خود سے لگا نہیں سکتا۔ البتہ اگر خدائے تعالیٰ اس پر حق کھول دے تو وہ کھلی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے کہ ساری کائنات اسی حق پر قائم ہے اور اسی کی وجہ سے زندہ ہے۔

قرآن کے ذریعہ خدا نے وہ راہ واضح کی ہے جس پر یہ کائنات چل رہی ہے۔ اس کے نزدیک اُسلام' کائنات کا دین ہے۔ جب کوئی چیز خدا کی اطاعت کے جذبے سے سرشار ہوا اور پوری طرح خدا کے سامنے جھک جائے تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کے اندر 'اسلام' ہے۔ کائنات اسی کیفیت کے ساتھ گردش کر رہی ہے اور بے چون و چرا خدا کے احکام کی اطاعت کر رہی ہے۔ اس لیے اس کا راستہ 'اسلام' کا راستہ ہے۔ جس طرح خدا کے بغیر ہم کائنات کا تصور نہیں کر سکتے اسی طرح اس بات کا بھی تصور نہیں کر سکتے کہ خدا موجود ہو اور کائنات میں اس کا حکم نہ چلے۔ وہ کوئی بات کہے اور اس کی اطاعت نہ کی جائے۔ وَلَہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کُلٌّ لَّہٗ قٰنِتُوْنَ ○ الروم: ۲۶ (آسمانوں اور زمین کی تمام چیزیں اسی کی ہیں اور سب کی سب اس کی اطاعت گزار ہیں)

کائنات پر خدا کی حکومت کو کسی نادان یا ظالم فرماں روا کی حکومت نہ سمجھیے' بلکہ خدائے تعالیٰ اسے انتہائی بصیرت اور عدل و انصاف کے ساتھ چلا رہا ہے۔ اس کا کوئی عمل انصاف سے ہٹا ہوا اور حکمت سے خالی نہیں ہوتا بلکہ ہر کام حکمت سے بھرا ہوا اور انصاف کے عین مطابق ہوتا ہے انیسویں صدی کے سائنسداں ڈارون نے کہا تھا کہ یہ کائنات ایک میدان جنگ ہے۔ یہاں مخالف قوتیں ایک دوسرے سے برسرپیکار ہیں۔ اس جنگ میں جو چیز شکست کھاتی ہے وہ مٹ جاتی ہے اور جو چیز غالب آتی ہے وہ زندگی کی جدوجہد

میں کامیاب رہتی ہے۔ ڈارون خدا کا منکر تھا اس لیے وہ یہ سوچ نہیں سکا کہ اس کائنات میں 'حق' موجود ہے اور یہاں جو کچھ ہوتا ہے بہ تقاضائے حق ہوتا ہے۔ ڈارون کی طرح جو بھی شخص خدا کا انکار کرے گا وہ کبھی اس کائنات میں 'حق' کے وجود کا قائل نہیں ہو سکتا۔ اس کو ہر طرف باطل ہی کی حکمرانی نظر آئے گی۔ حالانکہ اس کائنات کے بارے میں یہ سب سے بڑا جھوٹ ہے جو بولا گیا ہے۔ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ذَٰلِكَ ظَنُّ الَّذِينَ كَفَرُوا فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ كَفَرُوا مِنَ النَّارِ ص: ۲۷ (ہم نے آسمان اور زمین کو اور ان ساری چیزوں کو جو ان کے درمیان ہیں بے مقصد نہیں پیدا کیا ہے۔ یہ ان لوگوں کا خیال ہے جو خدا کے منکر ہیں پس تباہی ہے خدا کا انکار کرنے والوں کے لیے کہ وہ جہنم میں جائیں گے۔)

قرآن اس خیال کی سختی سے تردید کرتا ہے کہ کائنات حق و انصاف سے خالی ہے اور ظلم اور باطل کی اساس پر چل رہی ہے۔ اس کے نزدیک یہ کائنات باطل کے تصرف میں نہیں ہے بلکہ حق کے قبضے میں ہے۔ یہ کائنات خدا کی ہے کسی مسخرے کی نہیں ہے۔ خدا نے بطور تفریح یہ کارخانہ نہیں کھول رکھا ہے بلکہ اسے ایک عظیم مقصد کے تحت پیدا کیا ہے۔ جو لوگ اتنی بڑی حقیقت کو جھٹلاتے ہیں وہ قرآن کے نزدیک اپنے انجام سے بے خبر ہیں۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ
وَمَا بَيْنَهُمَا لَاعِبِينَ ۝ لَوْ أَرَدْنَا أَنْ
نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنَاهُ مِن لَّدُنَّا
إِن كُنَّا فَاعِلِينَ ۝ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ
عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ
زَاهِقٌ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُونَ
(الانبیاء: ۱۶-۱۸)

ہم نے آسمان اور زمین کو اور ان تمام چیزوں
کو جو ان کے درمیان ہیں کھیلتے ہوئے نہیں بنایا ہے
اگر ہم کھیل کود کی کوئی چیز بنانا چاہتے تو اپنی طرف سے
ایسا بنا ہی لیتے۔ اگر واقعۃً ہمیں ایسا کرنا ہوتا لیکن
ہم پھینک مارتے ہیں حق کو باطل پر تو وہ اس کا سر
توڑ دیتا ہے۔ پس اس طرح باطل مٹ جاتا ہے۔ اور
تباہی ہے تمہارے لیے ان باتوں میں جو تم کرتے ہو۔

خدائے تعالیٰ نے جس طرح 'حق' کے ساتھ اس کائنات کو پیدا کیا ہے اسی طرح 'حق' کے ساتھ وہ کائنات میں تصرف بھی کر رہا ہے۔ یہاں کوئی واقعہ اس وقت تک وجود میں نہیں آتا جب تک کہ حق و عدل کے تقاضے اس کے وجود کو لازم نہ کر دیں۔ خدائے تعالیٰ نے نظام کائنات کو اس انداز سے بنایا ہے کہ اس نظام میں جس چیز کو اپنے عمل کے لیے جس قسم کی قوتوں اور صلاحیتوں کی ضرورت ہے اسی قسم کی قوتیں اور صلاحیتیں

اسے عطا کی ہیں چنانچہ کائنات کا ذرہ ذرہ اپنے پورے وجود کے ساتھ اس مقصد کی تکمیل کر رہا ہے جس کے لیے وہ پیدا کی گئی ہے۔ کائنات کے اس مجموعی عمل میں بہت سے واقعات آپ کو حکمت سے خالی نظر آئیں گے لیکن اگر آپ انہیں پورے نظام کائنات میں رکھ کر دیکھ سکیں تو معلوم ہوگا کہ ہر واقعہ ٹھیک اپنی صحیح شکل میں وجود میں آ رہا ہے۔ سمندر میں بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگل جاتی ہے، خزاں آتی ہے اور بہار کی ساری رنگینی ختم ہو جاتی ہے۔ زلزلہ کا ایک جھٹکا زمین کو تہ وبالا کر دیتا ہے اور جیتی جاگتی مخلوق زمین کے نیچے دب جاتی ہے۔ موت کا پنجہ بچہ کو ماں کی گود سے چھین لیتا ہے۔ آپ کہیں گے کہ یہ سب کچھ ظلم ہے، ایسا نہیں ہونا چاہیے لیکن یہ آپ کی عقل کا قصور ہے۔ آپ کی نظر محدود ہے اس لیے آپ زیادہ دور تک دیکھ نہیں سکتے۔ اس کائنات کی حکمتوں کو وہی سمجھ سکتا ہے جس نے اسے پیدا کیا ہے، جو اس کا مالک ہے اور جس کا علم پوری کائنات کو محیط ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کائنات میں موت بھی ہے اور حیات بھی، تخریب بھی ہے اور تعمیر بھی، خوشی بھی ہے اور غم بھی، پھول بھی ہیں اور کانٹے بھی کیونکہ کائنات دونوں کی محتاج ہے۔ خدائے تعالیٰ اگر اپنی حکمت سے ہر آن اس کائنات میں خراش تراش نہ کرے تو اس کا سارا نظم درہم برہم ہو جائے، اور اس کے ساتھ وہ بہترین مقصد بھی ختم ہو جائے جس کے لیے کائنات وجود میں لائی گئی ہے۔ اسی لیے قرآن کہتا ہے۔ وَاللّٰهُ يَقْضِي بِالْحَقِّ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَقْضُوْنَ بِشَيْءٍ۔ المومن:۔ ۲۰ (اللہ حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے اور اس کے سوا جن لوگوں کو یہ پکارتے ہیں وہ کسی بھی چیز کا فیصلہ نہیں کرتے ہیں)

اس بات کا سب سے بڑا ثبوت کہ کائنات حق وانصاف اور بصیرت کے ساتھ چلائی جا رہی ہے، خود اس کا حیرت انگیز نظام ہے۔ بڑے بڑے سیارے جن کی لمبائی چوڑائی کا ہم اندازہ نہیں کر سکتے، فضا میں تیر رہے ہیں۔ یہ سیارے اگر آپس میں ٹکرا جائیں تو کائنات میں زبردست شکست وریخت واقع ہوگی اور کوئی چیز اپنی جگہ باقی نہیں رہ سکے گی، لیکن وہ خدا کے قانون میں اس طرح بندھے ہوئے ہیں کہ اپنے حدود سے باہر نہیں نکل سکتے۔ بولتا سمندر ہماری زمین کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں لیکن اس کی طغیانی زمین کو ختم نہیں کرتی۔ کیونکہ خدا کی مرضی یہ نہیں ہے کہ زمین ختم کر دی جائے۔ یہ حیرت انگیز اعتدال اور بے مثال توازن اس بات کی دلیل ہے کہ کوئی قوت ہے جو اس توازن واعتدال کو باقی رکھے ہوئے ہے۔

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا

وہی ذات ہے جس نے سورج کو روشنی اور چاند کو نور عطا کیا اور چاند کے گھٹنے بڑھنے کی منزلیں

عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ○ (یونس: ۵)

متعین کردیں تاکہ تم برسوں اور تاریخوں کا حساب معلوم کرسکو۔ یہ سب کچھ اللہ نے حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ وہ اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان کرتا ہے ان لوگوں کے لیے جو جانتے ہیں۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ○ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ○ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ○ (یٰسٓ)

اور سورج چلتا ہے اپنے متعین راستے پر یہ غالب اور جاننے والے خدا کا فیصلہ ہے اور چاند کے لیے ہم نے منزلیں متعین کردی ہیں یہاں تک کہ وہ کھجور کی پرانی ٹہنی کی مانند ہوجاتا ہے سورج کے لیے ممکن نہیں ہے کہ وہ چاند کو جا لے اور نہ رات دن سے آگے بڑھ سکتی ہے اور ہر چیز اپنے دائرے میں گھوم رہی ہے۔

کائنات میں اس لیے سکون ہے کہ اس پر ایک ایسی ہستی کی حکومت ہے جو اپنے اختیار کو ہمیشہ 'حق' کے ساتھ استعمال کرتی ہے۔ اگر یہ کائنات انسان کے اختیار میں ہوتی تو فتنہ و فساد سے بھر جاتی۔ کیونکہ انسان کی کمزوری ہے کہ وہ اپنے اختیار کو ہر وقت 'حق' کے تابع نہیں رکھتا بلکہ بسا اوقات 'خواہش' کے تابع بنا دیتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ صراط مستقیم سے بھٹک جاتا ہے کیونکہ خواہش ایک اندھی بہری قوت ہے۔ وہ حق و باطل میں تمیز نہیں کرتی اور بیشتر معاملات میں 'حق' کو چھوڑ کر باطل کے پیچھے دوڑنے لگتی ہے۔

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ○ (المومنون: ۷۱)

اگر 'حق' ان کی خواہشات کے پیچھے چلے تو تمام آسمان اور زمین اور وہ ساری چیزیں جو ان کے اندر موجود ہیں خراب ہوجائیں۔

خدائے تعالیٰ چاہتا ہے کہ انسان کی آزادی اس کے حکم کے تابع ہوجائے۔ 'اسلام' اس کی زندگی سے پھوٹ پڑے اور وہ مجسم اطاعت اور سراپا تسلیم و رضا بن جائے۔ بندگی کی جو روح کائنات کے ذرہ ذرہ میں دوڑ رہی ہے وہ اس کی رگوں میں خون بن کر دوڑنے لگے۔ جس طرح کائنات خدا کے گُن گا رہی ہے اسی طرح وہ بھی اس کی حمد و تسبیح میں مشغول ہوجائے۔ وہ اپنے اختیار کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرے

بلکہ خدا کی مرضی کے مطابق استعمال کرے، خدا اسے جس وقت جو حکم دے وہ بجا لائے اور جس چیز سے منع کرے اس سے رک جائے۔ وہ خدا کے سامنے اس طرح بچھ جائے جس طرح اس کا سایہ زمین پر بچھا ہوا ہے، اس کے دل میں اسی کا خوف ہو، اسی سے وہ محبت کرے، اسی کو بڑا مانے اور اپنی موت و حیات کا اسی کو مالک سمجھے، وہ جس کا دوست ہو اس کا دوست بن جائے اور وہ جس کا دشمن ہو اس سے اپنا تعلق توڑ لے۔ وہ کائنات میں اس طرح تصرف کرے جس طرح تصرف کا خدا نے اسے حکم دیا ہے۔ وہ یہاں کی ایک ایک چیز کو امانت سمجھے اور خدا کی مرضی کے مطابق اسے کام میں لائے۔ وہ اسی کے قانون کو قانون سمجھے اور اپنے تمام معاملات میں اس کا پابند ہو جائے۔ غرض یہ کہ جو آزادی اسے ملی ہے اسے چھوڑ کر خوشی سے خدا کی غلامی کا طوق پہن لے اور اپنے آپ کو اس کی تابع داری میں فنا کر دے۔ جب انسان اس طرح فنا ہو جاتا ہے تو اسے وہ 'حق' ملتا ہے جس پر یہ کائنات قائم ہے۔

انسان کے لیے صحیح ترین دین وہی ہو سکتا ہے جو کائنات سے پوری طرح ہم آہنگ ہو۔ اسلام کائنات کا دین ہے۔ جب وہ انسان کی زندگی میں داخل ہوتا ہے تو انسان کائنات کے ساتھ مل کر کام کرنے لگتا ہے اور کائنات اس کی ہم سفر بن جاتی ہے۔ دونوں کا رخ ایک ہوتا ہے اور دونوں ایک راہ پر چلتے ہیں۔ اسلام کے علاوہ انسان جو بھی دین اختیار کرے وہ دین کائنات سے مختلف ہوگا اور انسان پوری کائنات سے کٹ جائے گا۔

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَ	کیا اللہ کے دین کے سوا کوئی دوسرا دین
لَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	یہ ڈھونڈتے ہیں حالانکہ اسی کی اطاعت کر رہی ہیں
طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ	خوشی سے یا جبراً۔ وہ ساری چیزیں جو آسمانوں اور
(آل عمران: ۸۳)	زمین میں ہیں اور یہ سب اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔

'اسلام' عدل کی راہ ہے۔ اس راہ کو چھوڑ کر انسان ظلم کا مرتکب ہوتا ہے۔ خدا نے انسان کو آزادی دی ہے اور آزادی بہت بڑی دولت ہے۔ یہ امتیاز صرف انسان کو حاصل ہے کہ اسے جس منزل تک پہنچنا ہے اپنے ارادے اور مرضی سے پہنچنا ہے۔ اسی وجہ سے اس کا مقام بہت اونچا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ آزادی نے اس کے لیے ایک زبردست خطرہ پیدا کر دیا ہے۔ وہ یہ کہ اگر وہ اپنی آزادی کو غلط طریقے سے کام میں لائے تو منزل سے بھٹک جائے گا۔ اس کا منزل تک پہنچنا اس بات پر منحصر ہے کہ وہ آزادی کو صحیح طریقے

سے استعمال کرے۔ اسلام، خدا کی غلامی کا نام ہے۔ اس سے آزادی کے صحیح حدود متعین ہوتے ہیں۔ ان حدود کی خلاف ورزی خود انسان کے حق میں تباہ کن ہے۔ اسی کو قرآن کی اصطلاح میں ظلم کہا جاتا ہے۔ ظلم یہ ہے کہ کسی چیز کو اس کے صحیح مقام سے ہٹا دیا جائے۔ اس کے برعکس عدل کے معنی یہ ہیں کہ کسی چیز کو اس کے صحیح مقام پر رکھا جائے۔ قرآن خدا کی بندگی کو عدل سے تعبیر کرتا ہے کیونکہ یہ آزادی کا صحیح ترین مصرف ہے۔

قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ وَاَقِیْمُوْا	ان سے کہو کہ میرے رب نے عدل و انصاف
وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ	کا حکم دیا ہے اور یہ کہ ہر عبادت کے وقت تم اپنا رخ
وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ (الاعراف ۲۹)	ٹھیک رکھو اور پکارو اس کو خالص اس کے فرماں بردار ہو کر

'قسط' عدل و انصاف کو کہتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ قسط سے مراد یہاں 'لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ' ہے مطلب یہ ہے کہ خدا کو ایک ماننا اور اس کی اطاعت کرنا ہی وہ عدل ہے جس کا خدا نے اپنے بندوں کو حکم دیا ہے۔ اس کی تشریح گویا بعد کے ٹکڑے میں کی گئی ہے کہ خدا کی بندگی اور اس کی غلامی پورے اخلاص کے ساتھ کی جائے۔ کیونکہ جس عمل میں شرک کی آمیزش ہو جائے وہ خدا کے دربار سے رد ہو جاتا ہے۔ مفسر خازن کہتے ہیں:۔

فالامر بالقسط فی هذه الاٰیة	اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات
یشتمل علی معرفة اللّٰه تعالیٰ بذاته	اور اس کے اعمال کی معرفت 'قسط' کے حکم میں شامل ہے
وصفاته وافعاله وانه واحد	اور یہ جاننا بھی اس میں شامل ہے کہ وہ ایک ہے اور
لا شریك له[1]	اس کا کوئی شریک نہیں۔

قرآن نے کتاب کے ساتھ 'میزان' کا ذکر بھی کیا ہے۔ جو عدل کی نشانی ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ	اللہ نے حق کے ساتھ کتاب نازل کی اور
بِالْحَقِّ وَالْمِیْزَانَ (الشوریٰ: ۷)	میزان اتاری۔

میزان کی تشریح میں علامہ سید محمد آلوسی فرماتے ہیں:۔

المیزان ای العدل ..... او	میزان کا مطلب عدل و انصاف ہے.....
الشرع الذی توزن به الحقوق	یا اس سے مراد شریعت ہے جس سے حقوق تولے جاتے

[1] لباب التاویل فی معانی التنزیل جلد ۲ صفحہ ۱۸۳

ويسوى بين الناس [1] — ہے اور لوگوں کے درمیان ٹھیک ٹھیک معاملہ کیا جاتا ہے

خدا نے اپنے بندوں کے لیے ایک 'میزان' نازل کی ہے۔ یہ اس کا دین اور اس کی شریعت ہے۔ یہ وہ قانون عدل ہے جس سے انسان کو متوازن نظریۂ حیات ملتا ہے، جس سے اس کے معاملات میں اعتدال پیدا ہوتا ہے اور جس سے اس کے حقوق و مفادات محفوظ رہتے ہیں۔ جو قانون خدا کے قانون سے ٹکرائے یقیناً وہ ظلم اور ناانصافی پر مبنی ہوگا۔ اس پر چل کر انسان کبھی بھی عدل و انصاف نہیں پا سکتا۔ خدا کے پیغمبر دنیا کے سامنے یہی قانون عدل پیش کرتے ہیں تاکہ دنیا سے ظلم اور ناانصافی کا خاتمہ ہو اور انسان اپنے تمام معاملات میں عدل و انصاف کا راستہ اختیار کرے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ — ہم نے اپنے رسولوں کو دلائل کے ساتھ بھیجا
وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ — اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ
لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (الحدید) — انصاف پر قائم رہیں۔

علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں:۔

لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ اى بالحق والعدل وهو اتباع الرسل فى ما اخبروا به وطاعتهم فى ما امروا به فان الذى جاء وا به هو الحق الذى ليس وراءه حق [2]

"تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں" یعنی حق و عدل پر قائم رہیں۔ یہ چیز ملتی ہے رسولوں کی بتائی ہوئی تعلیمات کے اتباع اور ان کے احکام کی اطاعت میں۔ اس لیے کہ جو دین وہ خدا کے پاس سے لائے ہیں حق وہی ایک ہے۔ اس کے سوا کہیں حق کا وجود نہیں ہے۔

خدا کا قانون عدل ہی ہے جس پر کائنات کا یہ حیرت انگیز نظام قائم ہے۔ اور اسی کے نتیجے میں یہاں توازن اور اعتدال پایا جاتا ہے۔ خدائے تعالٰی چاہتا ہے کہ اس کائنات میں رہتے ہوئے انسان عدل و توازن سے محروم نہ ہو جائے اور اس کی زندگی ظلم اور بے اعتدالی کا نشانہ نہ بن جائے۔ چنانچہ اس نے قرآن نازل کیا اور عدل کی راہ دکھائی۔

اَلرَّحْمٰنُ ۙ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۙ خَلَقَ — رحمٰن نے قرآن کی تعلیم دی۔ انسان کو پیدا کیا۔

---

[1] روح المعانی جزء ۲۵ صفحہ ۲۶ [2] تفسیر ابن کثیر جلد ۴ صفحہ ۳۱۵

الْإِنْسَانَ ○ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ○ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ○ وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ ○ وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ ○ أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ ○ وَأَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ ○ (۹-۱)

اور اسے بیان کرنا سکھلایا۔ سورج اور چاند کے لیے ایک حساب متعین کر دیا۔ تارے اور درخت اسے سجدہ کرتے ہیں۔ اس نے آسمان کو بلند کیا اور میزان کھڑی کر دی۔ تاکہ تم میزان میں زیادتی نہ کرو انصاف کے ساتھ میزان کو ٹھیک رکھو اور وزن میں کمی نہ کرو۔

ان آیات میں کہا یہ گیا ہے کہ خدا نے انسان کو قرآن عطا کیا اور اسے اس قابل بنایا کہ وہ قرآن پڑھ سکے اور سمجھ سکے۔ یہ اس کی خاص رحمت ہے۔ قرآن حقیقت میں ایک 'میزان' ہے۔ وہ انسان کو ہر معاملے میں عدل کی راہ دکھاتا ہے۔ خدا نے زمین و آسمان پیدا کیے اور ان کے درمیان عدل کی ایسی 'میزان' کھڑی کر دی کہ کوئی بھی چیز اپنی حدود سے باہر نہیں ہوتی۔ یہ خدا کا 'عدل تکوینی' ہے جو پوری کائنات میں نافذ ہے۔ قرآن اس کا 'عدل تشریعی' ہے۔ اس کے ذریعے انسان معلوم کر سکتا ہے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا؟ اسے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے؟

خدائے تعالیٰ کائنات کو عدل و قسط کی جس راہ پر چلا رہا ہے اور جس پر انسان کو چلانا چاہتا ہے، اس پر وہ خود چل رہا ہے۔ وہ کبھی بھی عدل و انصاف کی راہ سے نہیں ہٹتا۔ اگر وہ ظلم کرنے لگے تو کائنات سے عدل کا وجود مٹ جائے۔ کائنات کا سرچشمہ خدا کی ذات ہے۔ اسی سے ہر چیز وجود میں آتی ہے۔ اگر سرچشمہ کھاری ہے تو اس سے کھاری پانی ہی بہے گا۔ اسی طرح اگر خدا کی ذات عدل و انصاف سے خالی ہے تو ممکن نہیں ہے کہ کائنات میں عدل و انصاف کا وجود ہو لیکن چونکہ یہاں عدل و انصاف پایا جاتا ہے اس لیے ماننا پڑے گا کہ خدائے تعالیٰ عدل و انصاف سے متصف ہے۔ قرآن اسے 'قائم بالقسط' (آل عمران: ۱۸) کہتا ہے۔ یعنی وہ اپنے تمام اعمال میں عدل اور راستی پر قائم ہے۔ اس کا کوئی کام خلافِ عدل نہیں ہوتا۔ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ أَحَدًا۔ الکہف: ۴۹ (تمہارا رب کسی پر ظلم نہیں کرتا) وہ 'حق مبین' (النور: ۲۵) ہے۔ اس کا وجود سراپا حق ہے۔ وہ کائنات کی ایسی حقیقت ہے جس کا انکار بے دانشی ہے۔ وہ بہترین صفات سے متصف ہے۔ اس کے اندر کوئی بری صفت نہیں پائی جاتی۔ اس کا ہر کام حق ہے۔ وہ وہی کرتا ہے جو کرنا چاہیے۔ اس کے بارے میں باطل کا تصور بھی گناہ ہے۔ پوری کائنات اس کے قبضے میں ہے

اور وہ ہر چیز کے ساتھ ٹھیک ٹھیک معاملہ کر رہا ہے۔ حضرت ہود علیہ السلام فرماتے ہیں۔ مَا مِنْ دَابَّةٍ إِلَّا هُوَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا إِنَّ رَبِّي عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ۔ ھود: ۵۶ (ہر جان دار کی چوٹی وہ پکڑے ہوئے ہے۔ یقیناً میرا رب سیدھے راستے پر ہے۔)

اسی حقیقت کا اظہار رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

اَللّٰهُمَّ إِنِّي عَبْدُكَ وَ	اے اللہ! میں تیرا غلام ہوں۔ تیرے غلام
ابْنُ عَبْدِكَ وَابْنُ أَمَتِكَ	کا لڑکا اور تیری باندی کی اولاد ہوں۔ میں تیرے
وَفِي قَبْضَتِكَ نَاصِيَتِي بِيَدِكَ	قبضے میں ہوں۔ میری پیشانی تیرے ہاتھ میں ہے۔ میرے
مَاضٍ فِيَّ حُكْمُكَ عَدْلٌ فِيَّ	بارے میں تیرا ہر حکم نافذ ہو سکتا ہے اور تیرا ہر فیصلہ
قَضَاؤُكَ[1]	میرے بارے میں سراسر عدل وانصاف پر مبنی ہے۔

اوپر کی آیت اور حدیث کو ملانے کے بعد یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ عدل ہی وہ 'صراط مستقیم' ہے جس پر خدائے تعالیٰ چل رہا ہے۔ سورۂ نحل کی ایک آیت میں زیادہ وضاحت کے ساتھ اسے بیان کیا گیا ہے۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ	اللہ دو آدمیوں کی مثال بیان کرتا ہے ان
أَحَدُهُمَا أَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ	میں سے ایک (معبود ان باطل) گونگا بہرا ہے اور
عَلَىٰ شَيْءٍ وَهُوَ كَلٌّ عَلَىٰ	کسی بھی چیز کی قدرت نہیں رکھتا اور اپنے آقا پر
مَوْلَاهُ أَيْنَمَا يُوَجِّههُّ لَا يَأْتِ	بوجھ بنا ہوا ہے۔ جہاں بھی وہ اسے بھیجتا ہے تو اپنے
بِخَيْرٍ هَلْ يَسْتَوِي هُوَ وَمَنْ يَأْمُرُ	ساتھ کوئی خیر نہیں لاتا۔ تو کیا یہ شخص اس دوسرے
بِالْعَدْلِ وَهُوَ عَلَىٰ صِرَاطٍ	شخص (معبود حق) کے برابر ہو سکتا ہے جو انصاف
مُّسْتَقِيمٍ ۝ (النحل: ۷۶)	کا حکم دیتا ہے اور راہ راست پر قائم ہے

عدل وانصاف کی راہ خدا کی راہ ہے اسی میں انسان کی دنیا اور آخرت کی کامیابی ہے۔ عدل کے ایک طرف افراط ہے اور دوسری طرف تفریط۔ افراط وتفریط ہی نے ہمیشہ انسان کو تباہ کیا ہے۔ اگر انسان عدل وانصاف کی راہ اختیار کرے تو اس کی رفتار خدا اور کائنات کی رفتار سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ پھر کون کہہ سکتا ہے کہ وہ ناکام ہوگا۔ خدا کے پیغمبر اسی صراط مستقیم کی طرف انسانوں کو بلاتے ہیں۔ وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِي لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ

أَلَا إِلَى اللّٰهِ تَصِيرُ الْأُمُورُ

[1] ۱۰۶ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الدعوات

کارکنانِ تحریک اسلامی کے لیے لمحۂ فکریہ

۱۶ر جون ۱۹۶۳ء کو سہارن پور کے ایک اجتماع میں مولانا سید حامد علی صاحب نے ایک تقریر فرمائی تھی۔ مولانا کی یہ تقریر (مرتبہ احسن مستقیمی صاحب) دعوت دہلی میں تین قسطوں میں شائع ہوئی ہے۔ مناسب معلوم ہوا کہ اس کو زندگی میں یک جائی طور پر شائع کر دیا جائے۔

(ادارہ)

تحریک اسلامی اب ہمارے ملک کے اندر ایک ایسے مقام پر پہنچ گئی ہے جہاں مسلمانانِ ہند کے قلوب بالعموم ہماری دعوت کی طرف جھک رہے ہیں، ملت اسلامیہ ہند کے افراد بڑی تیزی کے ساتھ دعوت اسلامی کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ بظاہر یہ صورت حال بڑی ہی خوش آیند ہے مگر دراصل تحریک کے لیے یہ ایک بڑا ہی نازک موڑ ہے۔ اصولی تحریکیں جب عوام کے اندر نفوذ کرنے لگتی ہیں تو یہ مقام تحریک کے کارکنوں اور رہنماؤں کے لیے بڑا نازک مقام ہوتا ہے۔ تحریکوں اور جماعتوں کے لیے بالعموم یہی وہ مقام ہوتا ہے جہاں عوامی مزاج، حالات حاضرہ اور مصلحت پرستانہ نقطۂ نظر اُن کے اصولوں پر اثر انداز ہونے لگتے ہیں پھر ان تحریکوں اور جماعتوں کے اصولوں پر رفتہ رفتہ تحریف و تاویل کے جراثیم پیدا ہونے لگ جاتے ہیں۔ کمیونسٹ تحریک کی تاریخ آپ کے سامنے ہے۔ آج یہ ہر جگہ عوامی ہوتی جا رہی ہے۔ مگر اس کے ساتھ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ارباب تحریک کے ہاتھوں اس کے اصولوں میں تحریف کا زبردست فتنہ اٹھ کھڑا ہوا ہے اور آج عالمی کمیونسٹ ایک خطرے سے دوچار ہو گئے ہیں روس اور چین کے اختلافات اس کا بیّن ثبوت ہیں۔

لہٰذا ہمیں بھی اس مقام پر پوری ہوشمندی اور احساس ذمہ داری کے ساتھ اپنے قدم آگے بڑھانے چاہییں۔ تحریک اسلامی کا مقصد اس کی دعوت اور طریقہ کار نیز اس کی بیس سالہ تاریخ ہماری نگاہوں کے سامنے رہنی چاہیے۔ جماعت اسلامی ہند کا مقصد تشکیل کیا ہے؟

جماعت سازی کیوں؟

آپ کو اچھی طرح معلوم ہونا چاہیے کہ جماعت اسلامی ہند کی تشکیل مسلم جماعتوں میں کسی ایک جماعت کے اضافے کے طور پر عمل میں نہیں آئی ہے اور نہ اس کا محرک جماعت سازی کا کوئی شوق تھا۔ ہم اس طرح کی جماعت سازی کو ناجائز بلکہ حرام سمجھتے ہیں۔ اس کے برعکس جماعت اسلامی کی تشکیل کا واحد مقصد یہ تھا کہ ہم باطل سے کٹنے اور حق سے جڑنے کی بنیاد پر منظم ہوئے ہیں۔ ہمارا مقصد صرف باطل سے کٹنا ہی نہیں بلکہ باطل کے نام و نشان تک کو مٹا ڈالنا ہے حق سے صرف جڑنا ہی نہیں بلکہ حق کا زندگی کے تمام گوشوں پر غلبہ و نفاذ بھی۔ ہم باطل سے کسی بھی مقام پر ایک لمحہ کے لیے بھی مصالحت پر آمادہ نہیں ہیں۔ آج تو خدا کے فضل و کرم سے جماعت اسلامی ہند اس ملک میں اپنا ایک مقام پیدا کر چکی ہے، آج اس کی آواز ملک کے گوشے گوشے سے اٹھ رہی ہے اور لوگ اس پر لبیک کہہ رہے ہیں مگر اس جماعت پر ایک وقت ایسا بھی آیا ہے جبکہ اس کی آواز اور اس کی تحریک کو دبانے اور مٹانے کے لیے اپنوں اور غیروں نے متحدہ محاذ بنا لیا تھا، حالات حد درجہ نازک تھے۔ تحریک کے کارکن جہاں کہیں بھی تھے ایک زبردست کشمکش سے دوچار تھے۔ ان کی یہ کشمکش حق و باطل کی کشمکش تھی۔ یہ کشمکش اندرون خانہ بھی اور گھر سے باہر بھی۔ الغرض پوری سوسائٹی میں ایک ہلچل تھی۔ مگر کارکنان تحریک ان تمام مشکلات و مصائب اور مخالفتوں کے طوفان میں گھرے رہنے کے باوجود عزم بالجزم کر چکے تھے کہ وہ کسی قیمت پر بھی باطل سے کمپرومائز نہیں کریں گے۔ انھوں نے ڈنکے کی چوٹ پر کہا کہ ایک مومن و مسلم کبھی طاغوت سے مصالحت نہیں کر سکتا۔ لادینی جمہوریت، قوم پرستی اور وطن پرستی نے بڑے حسین و جمیل دام فریب پھینکے۔ بڑی بڑی شخصیتوں نے بڑے بڑے "معجزات" دکھائے۔ مفتیان کرام نے فتووں کے دہانے کھول دیے۔ مگر کارکنان تحریک کے عزائم اور حوصلوں میں سر مو فرق نہ آیا۔ ہماری آواز اٹھتی رہی۔ ہم بلاخوف لومۃ لائم کہتے رہے کہ ایک خدا کے سوا کوئی معبود نہیں۔ بس وہی ہمارا معبود ہے اور وہی ہمارا حاکم اور وہی ہمارا کارساز۔ اس کے سوا کوئی ایسی طاقت نہیں ہے جو ہمارے ارادوں کو بدل سکے، ہمارے عزائم پر قدغن لگا سکے۔

نظامِ اطاعت کا قیام

جماعت اسلامی ہند کی دعوت کی یہ اہم خصوصیت ہمیں کبھی نظر انداز نہ کرنی چاہیے کہ ہم اللہ کی اطاعت اور بندگی کے لیے زندگی کا کوئی ایک گوشہ مخصوص کرنا نہیں چاہتے۔ ہمارا یہ فیصلہ ہے اور ہمارے اس فیصلے کی بنیاد قرآن حکیم، سنت رسول، اسوۂ صحابہ اور تمام بزرگان دین کا تعامل ہے۔ ہم نے یہ فیصلہ بلا سوچے سمجھے نہیں کیا ہے پورے غور و فکر اور اس کے

آغاز و انجام کو اچھی طرح بھانپ کر کیا ہے کہ ہم اپنی زندگی کے تمام گوشوں میں بے کم و کاست و بلا استثناء الٰہی نظام اطاعت کو غالب و نافذ کرنے کی پوری پوری جد و جہد کریں گے۔ اس کا انجام دو صورتوں میں سے کسی ایک ہی صورت میں نکل سکتا ہے اور ہر دو صورتوں میں انشاء اللہ ہم اپنی منزل مقصود (رضائے الٰہی کے حصول) کو حاصل کریں گے پہلی صورت یہ کہ الٰہی نظام اطاعت قیام خالق کائنات ہمارے ہی ہاتھوں سے عمل میں لے آئے اور دوسری صورت یہ کہ ہم اپنی پوری زندگی دین حق کے قیام میں لگا دیں اور بالآخر اپنی جان جان آفریں کے حوالے کر دیں۔ ان دونوں صورتوں میں ہماری تمام تر سعی و جہد اور حرکت و عمل کا واحد محرک مرضی مولا کا حصول ہے اور وعدۂ الٰہی یہی ہے کہ وہ اپنے دربار میں دین کے ایسے خادموں کو اپنے فضل و کرم سے محروم نہ کرے گا۔ ہم یہ بات آج جتنی آسانی کے ساتھ کہتے ہیں اسی ملک کے اندر کل ہمیں اس کے کہنے میں اتنی آسانی میسر نہ تھی اس کے باوجود کل بھی ہم نے یہ بات پورے عزم و جرأت کے ساتھ کہی ہے اور آج بھی کہہ رہے ہیں اور انشاء اللہ آئندہ بھی تادم حیات کہتے رہیں گے۔ حالات کی ناسازگاری ارباب اقتدار کی ناراضگی، مشائخ کی خفگی کا اقامت حق کے سلسلے میں ہمارے نزدیک کوئی وزن نہیں ہے۔ ہمارا یہ قطعی فیصلہ ہے کہ ہم خدا اور اس کے رسول کی اطاعت زندگی کے کسی ایک گوشے میں نہیں بلکہ پوری زندگی کے اندر کرنا چاہتے ہیں۔ یہ دعوت اسلامی کی ایک اہم خصوصیت ہے۔

صحیح ترتیب

تحریک اسلامی اور دعوت اسلامی کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ دین کے اندر خدا اور اس کے رسول نے جو ترتیب قائم کر دی ہے وہی مناسب معقول اور برحق ہے ہم اس ترتیب کو قائم رکھنا چاہتے ہیں اور اسی ترتیب کے مطابق ہم عملی اقدام کرنا چاہتے ہیں "مچھر چھاننے اور اونٹ نگلنے کا کھیل" نہ ہم کھیلنا چاہتے ہیں اور نہ ہم اسے جاری رہنا دینا چاہتے ہیں۔ ہماری پوری کوشش ہے اور آئندہ رہے گی کہ دین کی اس ترتیب کو اور اس کی بنیادی باتوں کو خود اچھی طرح ذہن نشین کر لیں اور اس سلسلے میں لوگوں کے اذہان کو اچھی طرح صاف کریں۔

تحریک اسلامی کی یہ اہم خصوصیت بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ اس تحریک کا مقصد جزوی اصلاح کا کام نہیں ہے۔ جزوی اصلاح کا کام ویسے تشکیل جماعت کے وقت بھی انفرادی اور اجتماعی طور پر کرنے والے افراد اور جماعتوں کی کمی نہ تھی اور آج بھی کمی نہیں ہے۔ دین اسلام کا مطالبہ جماعت مسلمہ سے ہے وہ زندگی کے کسی جزو یا مسائل زندگی میں چند ایک مسئلوں کی اصلاح نہیں ہے بلکہ دین کا مطالبہ اپنے مومنین سے پوری کی پوری زندگی ہے

انسانی سماج، بلکہ پوری حکومت اور پوری دنیا کو بدل دیتا ہے اور یکسر بدل دیتا ہے۔ لہٰذا ہمارے سامنے زندگی کا کوئی جزء بدلنا نہیں ہے۔ زندگی کے کسی ایک گوشے میں ہی تبدیلی مقصود نہیں ہے بلکہ ہم پورے کے پورے انسانی سماج کو اس کے تمام شعبوں اور گوشوں سمیت بدل دینا چاہتے ہیں اس تبدیلی اور انقلاب سے ہمارا منشا یہی ہے کہ خالق کائنات کی پوری اطاعت زندگی کے جملہ مسائل میں ہر جگہ اور بہ آسانی کی جا سکے ھُوَ الَّذِیٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون ۝ کا جو منشا ہے وہ کسی جزوی اصلاح سے ہرگز پورا نہیں ہوتا۔

قرآن کریم نے دعوت و تبلیغ کا مقصد دین کی اشاعت اور اس کا غلبہ و نفاذ قرار دیا ہے۔ اگر دین اسلام ایک مکمل نظام اطاعت ہے اور یقیناً ہے تو یہ بات ویسے بھی بعید از قیاس ہے کہ اس دین کو کسی اور نظام اطاعت کے تابع رکھ کر اس کی کامل اتباع کی جا سکے۔ جب کہ یہ بھی ایک اٹل اور ناقابل انکار حقیقت ہے کہ دین اسلام کے سوا جتنے دین ہیں وہ سب کے سب ادیانِ باطلہ ہیں۔ لہٰذا یہ حقیقت پورے طور پر ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ جماعت اسلامی کا مقصد اور ہماری انفرادی اور اجتماعی سعی و جہد کی غرض دین اسلام کا قیام اور اس کے غلبہ و نفاذ کی جدوجہد ہے۔ ہم دین کے کسی جزء کو نہیں بلکہ پورے اور بے کم و کاست دین کو لے کر اٹھے ہیں۔

شخصیتیں نہیں بلکہ دین

دعوت اسلامی کی یہ بھی ایک اہم خصوصیت ہے کہ اس کی دعوت کا رخ کسی شخصیت کی طرف نہیں ہے۔ یہاں کوئی پیر صاحب اور کوئی حضرت جی نہیں ہیں جن کی طرف ہماری دعوت ہو۔ ہماری دعوت براہ راست دین اسلام کی طرف ہے۔ ہم لوگوں کو اصول کی طرف دعوت دیتے ہیں نہ کہ کسی شخصیت کی طرف۔ ہمارے نزدیک اگر کوئی شخصیت ہے جس پر ہم تن من دھن سے قربان ہیں اور اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے بعد بھی ہمیں تسکین نہیں ہوتی۔ تو ایسی عظیم المرتبت شخصیت صرف رسول خدا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے۔ آج کی تمام شخصیتیں دعوت اسلامی کے اصولوں کے تابع ہیں نہ کہ یہ اصول ان کے تابع۔ بڑی سے بڑی شخصیت بھی اگر آج ان اصولوں سے خدانخواستہ انحراف کرتی ہے تو جماعت کا معدہ کبھی اسے ہضم نہیں کر سکتا۔

جماعت اسلامی اور اس کی دعوت کے سلسلے میں یہ حقیقت بھی نظر انداز نہ ہونی چاہیے کہ ہمارے پیش نظر کوئی ہنگامی کام نہیں ہے۔ اور نہ کوئی وقتی مسئلہ ہے جسے ہم حل کرنا چاہتے ہیں۔ جماعت اسلامی ٹھوس پائدار

اور سنجیدہ کام کرنا چاہتی ہے۔ ہماری دعوت و تبلیغ مستحکم اصولوں پر مبنی ہے۔ ہمیں نہ تو عوام کی خواہشات کی پیروی کرنی ہے۔ اور نہ ہمیں چھوٹے چھوٹے اور وقتی کاموں میں اپنی پوری قوت صرف کرنی ہے۔ بلاشبہ کچھ ایسے کام وقتی طور پر سامنے آتے رہتے ہیں۔ مثلاً دینی تعلیم کا مسئلہ۔ مسلم پرسنل لا وغیرہ۔ یہ مسائل اپنی جگہ پر اہم ہیں، مگر ظاہر ہے کہ ان کی اہمیت کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ ہم ان تمام ٹھوس اور بنیادی کاموں کو چھوڑ کر اپنی تمام تر طاقت اور توجہ اس پر صرف کر دیں۔ ان مسائل میں ضرور حصہ لیجیے مگر اپنی اصل دعوت اور اپنے اصل کام کو نظر انداز نہ کیجیے۔

جماعت اسلامی کی ایک ممتاز خصوصیت اس کی اپنی اجتماعیت بھی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہندستان میں کوئی دور ایسا نہیں گزرا ہے جبکہ یہاں دعوت و تبلیغ کا کام نہ ہوا ہو۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ بغیر ٹھوس اور مستحکم اجتماعیت کے دنیا کے اندر بھی کوئی انقلاب برپا نہیں ہوا ہے۔ ایک صالح انقلاب جو دین اسلام کو مطلوب ہے برپا کرنے کے لیے اسلامی اجتماعیت کا ظہور لازم ہے۔ اسلامی اجتماعیت میں امیر کا مقام وہی ہوتا ہے جو حلقۂ ارادت میں مرشد کا ہوتا ہے۔ امیر جماعت ذمہ دار ہے اپنے جملہ ارکان کا اور جملہ ارکان پابند ہیں اپنے امیر کی اطاعت فی المعروف کے۔ ارکان کے اندر باہمی اخوت محبت اور خیر خواہی کے جذبات ہمہ وقت موجزن ہونے چاہییں۔ اسلامی اجتماعیت کی مثال ایک جسم کی ہے۔ جسم اگر صحت مند ہوتا ہے تو اس کے تمام اعضا فرحت محسوس کرتے ہیں۔ اور اگر کسی عضو میں کوئی تکلیف ہوتی ہے تو پورا جسم بے چین ہو جاتا ہے۔ جب تک یہ کیفیت ہمارے اندر پیدا نہیں ہوتی اس وقت تک صحیح معنوں میں اسلامی اجتماعیت کے مطلوبہ نتائج ہمارے سامنے نہیں آ سکتے۔

آخرت کی فلاح

آپ اچھی طرح واقف ہیں کہ دیگر تحریکیں اور جماعتوں کے پیش نظر دنیا ہوتی ہے وہ اپنی سعی و جہد کا انجام اسی دنیا میں دیکھنا چاہتی ہیں مگر تحریک اسلامی کے پیش نظر دنیا نہیں بلکہ آخرت ہے۔ ہماری نظر میں وہ کام ایک لادینی کام ہے۔ خواہ بظاہر وہ کتنا ہی دین کیوں نہ معلوم ہو جس کا نتیجہ اس کے کارکن اسی دنیا میں دیکھنے کے طالب ہوں اور آخرت ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو۔ ہمارے نزدیک دنیا جائے عمل ہے۔ ہماری تمام کوششوں کا محرک ایک ہے اور وہ یہ کہ آخرت میں خدا کی خوشنودی ہمیں حاصل ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ تحریک اسلامی کی ڈکشنری میں لفظ ناکامی کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اسلامی انقلاب کا امکان اس ملک کے اندر ہے یا نہیں ہے۔ اسلامی انقلاب برپا کرنے میں ہم کامیاب ہوں گے یا ناکام رہے۔ اس

طرح کی بحثیں تحریک اسلامی کے کارکنوں کے لیے فضول اور لایعنی ہیں۔ کیونکہ خدا اور رسول کی طرف سے ہم پر جو ذمہ داری عائد کی گئی ہے وہ یہ نہیں ہے کہ ہمیں دین اسلام کو غالب و نافذ کر دینا ہے۔ اور اگر ہم ایسا نہ کر سکے تو ناکامی و نامرادی ہمارے لیے مقدر رہے۔ اسلامی نظام کا قیام تو بڑی بات ہے میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ کسی ایک فرد کے ذہن کو بدل دینا بھی ہمارے قبضۂ قدرت میں ہرگز نہیں ہے اور نہ ہم اس کے مکلف ہیں۔ ہمارا اصل کام یہ ہے کہ ہم خدائی اطاعت کے نظام کو غالب کرنے اور لادینی نظام اطاعت کے استیصال میں پورے خلوص نیت اور دانشمندی کے ساتھ خدا کی دی ہوئی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو لگا دیں۔ اگر ہم نے ایسا کر دیا تو خواہ اس کے نتیجے میں ایک فرد کا ذہن بھی نہ بدل سکے انشاء اللہ ہم آخرت میں کامیاب و بامراد ہوں گے اور اگر خدانخواستہ ہمارے پیش نظر دنیا ہو تو خواہ خدا کا دین ہمارے ہی ہاتھوں پوری دنیا پر غالب و نافذ ہو جائے۔ آخرت میں خدا کی پکڑ سے ہمیں کوئی طاقت بچا نہیں سکتی۔ اللھم احفظنا۔ السعی منی والاتمام من اللہ۔

اگرچہ دیگر تمام نظاموں کی نسبت اپنے ملک میں اسلامی انقلاب کے امکانات بہت زیادہ روشن ہیں اور یہاں ہمارے لیے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ہے، لیکن بفرض محال اگر یہاں اقامت دین کا کوئی امکان نہ ہو تو کیا ہمارے لیے یہ جائز ہوگا کہ ہم اپنی تمام سعی و جہد کا رخ غیر الٰہی نظامہائے اطاعت کی طرف پھیر دیں اور ان الدین عند اللہ الاسلام و من یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ کو اپنے ذہنوں سے کھرچ کر پھینک دیں؟ دراصل سوچنے کا یہ انداز ہی انتہائی غلط اور بے بنیاد ہے۔ تحریکوں اور جماعتوں کی تاریخ میں کسی ایسی تحریک اور جماعت کا نام نہیں لیا جا سکتا۔ جو انسانی معاشرے کے اندر کوئی ہمہ گیر تبدیلی لانے کے لیے اٹھی ہو اور اس تبدیلی کے روشن امکانات اس کے کارکنوں کے سامنے رہے ہوں خواہ وہ تحریک اسلامی ہو یا غیر اسلامی۔ دراصل اسلامی تحریک کے اندر کامیابی و ناکامی کے وہ تصورات سرے سے ہیں ہی نہیں جن میں دیگر تحریکیں محصور ہیں۔

جماعت اسلامی اور دیگر جماعتوں میں ایک بیّن فرق یہ بھی ہے کہ تحریک کا کارکن سب سے پہلے دعوت اسلامی کا مخاطب خود ہوتا ہے اور جو کچھ کہنا چاہتا ہے سب سے پہلے اسے اپنی عملی زندگی سے پیش کرتا ہے جس دین کی دعوت وہ دوسروں کو دیتا ہے اس دین کو وہ پہلے خود پر قائم کرتا ہے۔ دوسروں کو بدلنے سے قبل پہلے وہ خود کو بدلتا ہے۔ باہر صالح انقلاب پیدا کرنے سے قبل پہلے خود اپنے گھر میں اس صالح انقلاب کو

وبرپا کرتا ہے۔ اقامت دین کی جدوجہد کی یہی ترتیب ہے۔ اگر اس ترتیب کو الٹ دیا جائے تو پھر ہر چیز
وبالا ہو کر رہ جائے گی۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہمارے کارکن اس حیثیت سے ہر وقت جائزہ لیتے رہیں
تامرون الناس بالبر وتنسون انفسکم (کیا تم دوسروں کو نیکی کی تبلیغ کرتے ہو اور خود اپنے
پ کو بھول جاتے ہو) لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ ۔ (ایسی باتیں کیوں کہتے ہو جن پر عمل نہیں کرتے)
ل وعمل کا تضاد دو وہ مہلک جراثیم ہیں جو فرد کی زندگی کو تو تہ و بالا کر ہی دیتے ہیں، لیکن اس سے آگے
ڑھ کر یہ پوری کی پوری جماعت کو تہس نہس کر کے رکھ دیتے ہیں۔
خدا ہم سب کو قول وعمل کے تضاد سے بچائے اور اپنے دین کا مخلص خادم بنائے۔ آمین۔

تعدّدِ ازواج — قرآن کی روشنی میں

(سید احمد قادری)

اسلام کے معاشرتی توانین میں، سب سے زیادہ عیسائی پادریوں اور مغربی ملحدین کا ہدفِ ملامت، قانون تعدد ازواج ہے، طرفہ تماشا یہ ہے کہ جن لوگوں کی اپنی زندگیاں، ہوس رانی، زناکاری و بدکاری کے چہ بچہ میں غرق ہیں وہ اس قانون پر جو سب سے بڑا الزام لگاتے ہیں وہ ہوس رانی کا الزام ہے۔ عیسائی پادری تو اپنے تصور رہبانیت اور اسلام دشمنی میں اس پر اعتراض کرتے ہیں اور مغربی ملحدین، متعدد نکاح و زواج کی ذمہ داریوں سے بچ کر آزاد ہوس رانی کی گنجائش پیدا کرنے کے لیے اسے ہدف ملامت بناتے ہیں یہاں تک کہ وہ دنیا کے اس سب سے زیادہ مقدس انسان کے تعدد ازواج پر چھینٹیں اڑاتے ہیں جس کی پاکیزگیِ اخلاق پر کائنات کی ہر شے گواہ ہے۔ ان مغربیوں کے اعتراضات تعجب انگیز نہیں ہیں اس لیے کہ انھوں نے خیر و شر کو ناپنے کے پیمانے ہی بدل ڈالے ہیں اور ان کے نزدیک عصمت و عفت کوئی ایسی اخلاقی قدر باقی ہی نہیں رہی ہے جس کی حفاظت ضروری ہو۔

مسلمانوں کے انگریزی تعلیم یافتہ اونچے گھرانے جو مغربی تہذیب میں سر سے پاؤں تک غرق ہو چکے ہیں اپنے استادوں کی تقلید میں، تعدد ازواج کے اسلامی قانون سے بھی بے زار ہیں۔ مغربی تہذیب ان کی عورتوں تک پر حکمراں ہے اور وہ بھی اس قانون کے خلاف متحرک ہیں۔ انہیں اس کی کوئی پرنا نہیں کہ ان کے شوہر دوسری عورتوں سے ناجائز تعلق پیدا کریں۔ انہیں صرف اس بات کی فکر ہے کہ کوئی عورت، دوسری بیوی بن کر باضابطہ ان کے شوہروں کے مال میں حصہ دار نہ ہو اور شوہروں کی موت کے بعد وہ اور ان کے بچے بلاشرکت غیرے ان کے مال اور جائداد پر قابض ہوں۔

ڈنڈے کے زور سے تبدیلی آج اسلامی ممالک پر چونکہ مسلمانوں کا مغرب پرست طبقہ قابض ہے

اس لیے وہ بالخصوص اسلام کے قوانین میراث و نکاح و طلاق میں ڈنڈے کے زور سے تبدیلیاں پیدا کرنے کی سعی کرتا رہتا ہے۔ ابھی حال میں ہمارے پڑوسی ملک پاکستان نے بھی عائلی قوانین میں کچھ تبدیلیاں کی ہیں اور بزور حکومت اس کو نافذ کیا ہے وہاں عائلی قوانین میں جو تبدیلی پیدا کی گئی ہے اس کا اصل ہدف تعدد ازواج ہی پر پابندی لگانا ہے۔

مسئلے کی شرعی نوعیت

تعدد ازواج پر علمی انداز میں غور کرتے وقت متعدد پہلو سامنے آتے ہیں اور ایک مسلمان کے لیے سب سے اہم پہلو اس مسئلے کی اسلامی و شرعی نوعیت ہے۔ اگر اسلام نے اس کی اجازت دی ہے تو پھر کسی متجدد یا متجددین کے کسی گروہ کا بگھارا ہوا کوئی فلسفہ اور چھانٹی ہوئی کوئی منطق، مسلمانوں کو اس کی حرمت پر مطمئن نہیں کر سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ اب متجددین نے غلط فہمی پیدا کرنے کے لیے اس کی شرعی اجازت ہی کو اپنی من گھڑت قیدوں اور شرطوں کے ساتھ مقید اور مشروط ثابت کرنے کی سعی شروع کر دی ہے اور یہ لوگ اس باب میں ٹیکنک اور فن کاری کا بھرپور مظاہرہ کر رہے ہیں اس لیے ہمارے لیے اور بھی ضروری ہے کہ اس مسئلے کی شرعی حیثیت کو اچھی طرح واضح کر دیں۔ سورۂ نساء کی دو آیتیں قابل غور ہیں:۔

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَۃً اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ ذٰلِکَ اَدْنٰۤی اَلَّا تَعُوْلُوْا۔ (آیۃ ۳)	اور اگر تم یتیموں کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہو تو جو عورتیں تم کو پسند آئیں ان میں سے دو دو، تین تین، چار چار سے نکاح کر لو لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ ان کے ساتھ عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کرو یا ان عورتوں کو زوجیت میں لاؤ جو تمہارے قبضے میں آئی ہیں۔ بے انصافی سے بچنے کے لیے یہ زیادہ قرین صواب ہے۔

آیت کی تین تفسیریں

مستند اور قدیم کتب تفسیر میں اس آیت کی تین تفسیریں منقول ہیں:۔ (۱) سب سے مشہور تفسیر وہ ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے اور جسے جمہور ائمہ مفسرین نے اختیار کیا ہے۔ بخاری، مسلم، سنن نسائی و بیہقی وغیرہا میں ہے کہ حضرت عروۃ بن الزبیر نے اپنی خالہ عائشہ ام المومنین سے اس آیت کے بارے میں سوال کیا تو انھوں

نے فرمایا:-

اے بھانجے یہ اس یتیم لڑکی کے بارے میں ہدایت ہے جو اپنے ولی (جس سے نکاح جائز ہو مثلاً چچازاد بھائی) کی نگرانی میں ہوتی تھی وہ اس کے مال میں شریک ہوتا تھا پھر اس کو اس کے مال و جمال کی طرف رغبت ہوتی تھی اور وہ اس سے نکاح کرنا چاہتا تھا لیکن اس کا مہر ادا کرنے میں انصاف نہیں کرتا تھا اور اسے اتنا مہر نہیں دیتا تھا جتنا کوئی دوسرا شخص دیتا تو اس آیت نے اس ظلم سے روک دیا اور ان پر پابندی عائد کی کہ وہ ان یتیم لڑکیوں سے اس شرط کے ساتھ نکاح کر سکتے ہیں کہ انہیں ان کا پورا مہر ادا کریں اور ان پر ظلم نہ کریں اور اگر انہیں اندیشہ ہو کہ وہ انصاف نہیں کر سکیں گے تو دوسری عورتوں سے جو انہیں پسند ہوں نکاح کر لیں ان یتیم لڑکیوں سے نکاح نہ کریں۔

عُروہ کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ نے یہ بات بھی فرمائی تھی:-

اس آیت کے نزول کے بعد لوگوں نے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح کی یتیم لڑکیوں کے بارے میں سوال کیا تو اللہ نے آیت یَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَاءِ الخ نازل کی یعنی لوگ تم سے عورتوں کے بارے میں فتویٰ پوچھتے ہیں۔ کہو اللہ تمہیں ان کے معاملے میں فتویٰ دیتا ہے اور ساتھ ہی وہ احکام بھی یاد دلاتا ہے جو پہلے سے تم کو اس کتاب میں سنائے جا رہے ہیں یعنی وہ احکام جو ان یتیم لڑکیوں کے متعلق ہیں جن کے حق تم ادا نہیں کرتے اور جن کے نکاح کرنے سے تم باز رہتے ہو حضرت عائشہ نے فرمایا جس سابق آیت کا حوالہ دیا گیا ہے وہ وہی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ یتیم لڑکیوں کے ساتھ انصاف نہیں کر سکو گے تو تمہیں جو دوسری عورتیں پسند ہوں اُن سے نکاح کر لو۔ حضرت عائشہ نے فرمایا اس دوسری آیت میں اس ظلم سے روکا ہے کہ اگر یتیم لڑکی بدصورت اور کم مال والی ہوتی تو ولی نہ خود اس سے نکاح کرتا اور نہ کسی دوسرے کی زوجیت میں دیتا۔

حضرت عائشہ نے سورۂ نساء کی آیت (۳) کی تشریح کرتے ہوئے جس دوسری آیت کا حوالہ دیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:-

وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَاءِ ۖ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِيهِنَّ وَمَا يُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ فِي يَتَامَى النِّسَاءِ	لوگ تم سے عورتوں کے معاملے میں فتویٰ پوچھتے ہیں۔ کہو اللہ تمہیں ان کے معاملے میں فتویٰ دیتا ہے اور ساتھ ہی وہ احکام بھی یاد دلاتا ہے

الَّتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَ تَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ (آیۃ ۱۲۷)

جو پہلے سے تم کو اس کتاب میں سنائے جا رہے ہیں یعنی وہ احکام جو ان یتیم لڑکیوں کے متعلق ہیں جن کے حق تم ادا نہیں کرتے اور جن کے نکاح کرنے سے تم باز رہتے ہو۔

حضرت عائشہ نے آیت ۳ اور آیت ۱۲۷ کی جو تفسیر بیان کی ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ "جن لوگوں کی سرپرستی میں ایسی لڑکیاں ہوتی تھیں جن کے پاس والدین کی چھوڑی ہوئی کچھ دولت ہوتی تھی وہ ان لڑکیوں کے ساتھ مختلف طریقوں سے ظلم کرتے تھے اگر لڑکی مالدار ہونے کے ساتھ خوبصورت بھی ہوتی تو یہ لوگ چاہتے تھے کہ خود اس سے نکاح کر لیں اور مہر و نفقہ ادا کیے بغیر اس کے مال اور جمال دونوں سے فائدہ اٹھائیں اور اگر وہ بدصورت ہوتی تو یہ لوگ نہ اس سے خود نکاح کرتے اور نہ کسی دوسرے سے اس کا نکاح ہونے دیتے تاکہ اس کا کوئی ایسا سرد ھرا نہ پیدا ہو جائے جو کل اس کے حق کا مطالبہ کرنے والا ہو۔"

حضرت عائشہ نے آیت ۳ کی جو تفسیر کی ہے اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ آیت اصلاً یتیم لڑکیوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے نازل ہوئی ہے اور پھر ضمناً چار تک تعدد ازدواج کی تحدید کی گئی ہے۔ اس آیت میں یتامیٰ سے مراد یتیم لڑکیاں ہیں اور النساء سے مراد ان کے علاوہ دوسری عورتیں ہیں۔

(۲) آیت (۳) کی دوسری تفسیر جو حضرت ابن عباس اور ان کے شاگرد حضرت عکرمہ سے منقول ہے یہ ہے:۔

> جاہلیت میں ایک مرد دس دس اور اس سے بھی زیادہ عورتوں سے نکاح کرتا تھا اور آپس میں وہ کثرت ازدواج پر فخر کرتے تھے اور جب اپنا مال ختم ہو جاتا تھا تو اپنے زیر نگرانی یتیموں کے مال پر ہاتھ صاف کیا کرتے تھے اس پر اللہ نے نکاح کے لیے چار کی حد مقرر کر دی اور فرمایا کہ جب کثرت ازدواج سے تمہارے مصارف بڑھ جاتے ہیں اور تم یتیموں پر ظلم کرنے لگتے ہو لہٰذا تم ایک سے چار تک نکاح کرو اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ اس کے بعد بھی تم اموال یتامیٰ میں عدل نہیں کر سکو گے تو ایک ہی عورت سے نکاح کرو یا لونڈیوں پر اکتفا کرو۔

(۳) تیسری تفسیر جو سعید بن جبیر، قتادہ اور دوسرے مفسرین سے منقول ہے وہ یہ ہے:۔

جاہلیت میں لوگ یتیموں کے مال میں ناجائز تصرف کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن عورتوں کی ان کے نزدیک کوئی وقعت نہ تھی اور ان کے ساتھ ناانصافی عام تھی وہ دس دس شادیاں کر لیتے تھے اور بیویوں کے درمیان عدل نہ کرتے تھے اس آیت میں کہا گیا کہ جس طرح تم یتیموں کے ساتھ ظلم کرنے سے ڈرتے ہو اسی طرح عورتوں پر بھی ظلم کرنے سے ڈرو اور اس ظلم سے بچنے کے لیے ایک سے چار تک نکاح محدود کر لو اور اگر پھر بھی ظلم کا اندیشہ ہو تو بس ایک نکاح پر اکتفا کرو یا لونڈیوں سے فائدہ اٹھاؤ۔

دوسری تفسیر کو امام رازی نے اور تیسری تفسیر کو امام ابن جریر طبری نے اختیار کیا ہے اور اسی کی تائید رشید رضا نے اپنی تفسیر المنار میں کی ہے۔ رشید رضا اور دوسرے مفسرین نے لکھا ہے کہ آیت کے الفاظ میں تینوں تفسیروں کا احتمال ہے لہذا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ آیت کے یہ تینوں مفہوم مراد ہیں۔

تینوں تفسیروں کا فرق

ان تینوں تفسیروں میں جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ پہلی دو تفسیروں کی رو سے آیت اصلاً یتیم لڑکوں اور لڑکیوں پر ظلم سے روکنے کے لیے آئی ہے اور اس ضمن میں تبعاً جاہلیت کے بے شمار نکاح کی تحدید کر دی گئی ہے اور تیسری تفسیر کے لحاظ سے آیت اصلاً و بالذات عورتوں کے حقوق سے بحث کرتی ہے اور ان پر اس ظلم کو روکتی ہے جو جاہلیت میں رائج تھا اس طرح ایک سے چار تک بیویوں کی تحدید کا مسئلہ ضمنی و تبعی باقی نہیں رہتا بلکہ آیت کا اصل مقصود بن جاتا ہے۔

بیویوں کے درمیان عدل کی نوعیت

آیت ۳ ایک سے زیادہ نکاح کرنے کے لیے جو شرط لگاتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ بیویوں کے درمیان عدل کیا جائے اب سوال یہ اٹھتا تھا کہ عدل کی پابندی کس چیز میں ضروری ہے۔ آیا بیویوں کے پاس قیام، ان کے نان و نفقہ اور دیگر اخراجات میں مساوات ضروری ہے یا قلب کے میلان اور محبت میں بھی مساوات لازمی ہے؟ اس سوال کا جواب سورۂ نساء کی آیت ۱۲۹ میں ملتا ہے:۔

وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا أَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ وَإِنْ تُصْلِحُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا	بیویوں کے درمیان پورا پورا عدل کرنا تمہارے بس میں نہیں ہے، تم چاہو بھی تو اس پر قادر نہیں ہو سکتے لہذا ایک بیوی کی طرف اس طرح نہ جھک جاؤ کہ دوسری کو لٹکتا چھوڑ دو، اگر تم اپنا طرز عمل درست رکھو اور اللہ سے

رَّحِيمًا ۞ ڈرتے رہو تو اللہ قصوروں کو بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ (نساء)

اس آیت نے یہ بات واضح کر دی کہ شوہروں پر عدل کی ذمہ داری اسی حد تک ہے جو ان کے بس میں ہو جو چیز ان کی قدرت سے باہر ہو اس کے وہ مکلف نہیں ہیں۔ اس آیت کی صحیح ترین تشریح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت میں ملتی ہے:۔

"عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ازواج کے درمیان تقسیم میں عدل فرماتے اور ساتھ ہی ساتھ یہ دعا بھی کرتے، اے اللہ! یہ میری تقسیم ہے اس چیز میں جس کا میں مالک ہوں، تو مجھے ملامت نہ کر اس چیز میں جس کا تو مالک ہے اور وہ میرے بس سے باہر ہے۔"

حضور جس چیز کے مالک نہ تھے وہ قلبی میلان کے سوا دوسری چیز نہ تھی۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ حضرت عائشہ رض کی خوبیوں اور مخصوص صفات کی بنا پر دوسری ازواج کے مقابلے میں حضور کا قلبی میلان ان کی طرف زیادہ تھا۔

قابلِ غور بات سورۂ نساء کی آیت (۳) اور (۱۲۹) کے الفاظ سامنے رکھ کر دیکھیے، کیا تعدد ازواج کے حکم پر عمل کرنے کے لیے بیویوں کے درمیان ممکن عدل کے سوا کوئی اور شرط لگی ہوئی ہے اور یہ بھی دیکھیے، کیا ان آیتوں میں اس بات کا کوئی اشارہ بھی موجود ہے کہ جنگ میں مردوں کے بکثرت قتل ہو جانے کی وجہ سے جب معاشرے میں یتیم لڑکیوں اور بیواؤں کا مسئلہ پیدا ہو جائے تب ایک سے زیادہ نکاح کی اجازت ہے اور وہ بھی صرف ان یتیم لڑکیوں اور بیواؤں سے جن کا مسئلہ جنگ سے پیدا ہو گیا ہے۔ نہ الفاظ میں اس کا کوئی اشارہ ہے، نہ احادیث میں یہ بات ملتی ہے اور نہ قدیم مفسرین کے ذخیرۂ تفسیر میں اس شرط و قید کا نشان موجود ہے لیکن اس زمانے میں بعض چالاک متجددین نے تعدد ازواج کی اجازت سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایک من گھڑت شرط پیش کی ہے اور وہ یہ ہے کہ جب کسی جنگ میں مردوں کے مقتول ہونے کی وجہ سے، مسلمان معاشرے میں یتیم لڑکیوں اور بیواؤں کا مسئلہ پیدا ہو جائے تو اس وقت اس کی اجازت ہے کہ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے ان یتیم لڑکیوں اور بیواؤں سے ایک مرد بیک وقت چار تک نکاح کر سکتا ہے

من گھڑت شرط کی لغویت یہ من گھڑت شرط متعدد وجوہ سے بالکل لغو ہے۔

(۱) سورۃ نساء کی آیت (۳) تعدد ازدواج کے لیے اجازت دینے کے لیے نازل نہیں ہوئی بلکہ اس کی تحدید کے لیے نازل ہوئی ہے۔ عربوں میں بغیر کسی عددی قید کے تعدد ازواج رائج تھا وہ بیک وقت دس دس بلکہ اس سے بھی زیادہ عورتوں سے نکاح کرتے تھے۔ کتب سماوی اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ تعدد ازدواج کی اجازت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے حاصل تھی اور اللہ تعالیٰ نے اسے کبھی حرام قرار نہیں دیا البتہ اسلامی شریعت میں مسلمانوں کے لیے اس سابق اجازت کو چار تک محدود کر دیا گیا ہے' اس لیے یہ سمجھنا کہ یہ آیت تعدد ازواج کی اجازت دینے کے لیے نازل ہوئی' غلط ہے۔

(۲) یتیم لڑکیوں کا وجود جنگ میں ان کے آباء کے قتل ہی پر موقوف نہیں ہے بلکہ باپوں کی طبعی موت کی وجہ سے بھی لڑکیاں یتیم ہو جاتی ہیں۔ عرب کے لوگ صرف ان یتیم لڑکیوں پر ظلم نہیں کرتے تھے جن کے باپ جنگ میں مارے جائیں بلکہ ان پر بھی ستم ڈھاتے تھے جن کے باپ بستر علالت پر طبعی موت مر جاتے تھے۔ اس آیت نے ہر قسم کی یتیم لڑکیوں پر ظلم کو روکا ہے

(۳) آیت کے دو جملوں میں حرف شرط کا استعمال ہوا ہے ایک وَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تُقۡسِطُوۡا فِی الۡیَتٰمٰی۔ اور دوسرے فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تَعۡدِلُوۡا فَوَاحِدَۃً میں پہلے جملے کی شرط کا تعلق اس مسئلے سے ہے کہ اگر یتیم لڑکیوں کے سرپرستوں کو اندیشہ ہو کہ وہ ان سے نکاح کر کے انصاف نہیں کر سکیں گے تو پھر انہیں ان سے نکاح نہ کرنا چاہیے۔ اس شرط کا تعلق تعدد ازدواج سے بالکل نہیں ہے کیونکہ کسی ایک یتیم لڑکی سے نکاح بھی عدل کی شرط کے ساتھ مشروط ہے۔ اگر اس کا ولی اس کے ساتھ عدل نہیں کر سکتا تو پھر اس سے نکاح نہ کرنا چاہیے اسی ظلم سے بچنے کے لیے آگے کہا گیا ہے کہ دوسری بہت سی عورتیں موجود ہیں اس لیے ولی خواہ مخواہ اس یتیم لڑکی کے ساتھ نکاح کرنے پر مجبور نہیں ہے اس کو کسی دوسری عورت سے نکاح کرنا چاہیے۔

دوسرے جملے کی شرط کا تعلق ان یتیم لڑکیوں سے نہیں ہے جن کا ذکر پہلے جملے میں کیا گیا ہے بلکہ دوسری عورتوں اور تعدد ازدواج سے ہے یعنی اگر کوئی شخص ایک بیوی کی موجودگی میں کسی دوسری عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہے تو اسے اپنے دل کو ٹٹول کر اطمینان کر لینا چاہیے کہ وہ دونوں میں عدل کر سکے گا یا نہیں؟ عام ازیں کہ وہ دوسری عورت' کنواری ہو' بیوہ ہو' کسی دوسرے گھر کی یتیم لڑکی ہو یا اس کا باپ

زندہ ہو۔ بعض چالاک اشخاص نے ناواقف لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے پہلے جملے کی شرط کو تعدد ازدواج کے ساتھ جوڑ دیا ہے حالانکہ اس کا اس مسئلے سے کوئی تعلق نہیں ہے

(۴) اس پوری آیت کو تعدد ازدواج کے مسئلے سے متعلق کرنے والے نے یہ بالکل نہیں سوچا کہ اس کا آیت کے مفہوم اور خود اس کے اپنے مقصد پر کیا اثر پڑے گا۔ آیت کا مفہوم یہ ہوگیا کہ جن یتیم لڑکیوں کے ساتھ بے انصافی کا تمہیں اندیشہ ہو انہیں یتیم لڑکیوں میں سے چار تک نکاح کر لو۔ اب غور کیجیے کہ جن لڑکیوں کے ساتھ انصاف نہ کرنے کا اندیشہ ہو انہیں کے ساتھ نکاح کر لینے سے یہ اندیشہ دور کس طرح ہو جائے گا اور یہ نکاح ناانصافی کا علاج کیسے بن جائے گا۔

من گھڑت تفسیر سے مقصد پر جو اثر پڑے گا وہ یہ ہے کہ صورت یہ بن جائے گی کہ تعدد ازدواج کا حکم مشروط ہے اس شرط سے کہ معاشرے میں (جنگ کے نتیجے میں) یتیم لڑکیوں اور بیواؤں کی کثرت ہو گئی ہو اور ان کے مسئلے کو حل کرنا ہو اور پھر آگے تعدد ازدواج کا حکم ایک دوسری شرط کے ساتھ مشروط ہے وہ یہ کہ نکاح کرنے والے کو اطمینان حاصل ہو کہ وہ بیویوں کے درمیان عدل کرے گا اور اگر اندیشہ ہو کہ عدل نہیں کر سکے گا تو ایک پر اکتفا کرے۔ یعنی کثرت کی وجہ سے ضرورت تو یہ تھی کہ ایک مرد متعدد لڑکیوں اور بیواؤں سے نکاح کرے تاکہ ان کا مسئلہ حل ہو لیکن خود ہی ایک ایسی شرط اور قید لگا دی کہ اب بہت کم لوگ اس پر آمادہ ہو سکیں گے کہ متعدد لڑکیوں اور بیواؤں سے نکاح کریں لہذا ان کی کثرت کا مسئلہ حل نہیں ہو گا۔ گویا آیت کے پہلے ٹکڑے میں اللہ نے مسئلے کا حل بتایا اور پھر خود ہی آخر میں اس مسئلے کو ختم کر دیا اور مسئلہ لاینحل کا لاینحل رہ گیا —— ان مغربی تہذیب سے مرعوب لوگوں کے نزدیک یہی آیت تعدد ازدواج پر پابندی بھی لگاتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ معاشرے میں یتیم لڑکیوں اور بیواؤں کی کثرت کے مسئلے کو بھی حل کرتی ہے۔ یہ ہے وہ اعلیٰ درجے کا مفہوم جسے تیرہ سو سال تک کوئی مفسر نہیں سمجھ سکا۔

(۵) جن لوگوں کے سامنے قرآن نازل ہوا تھا وہ تو یہ کہتے ہیں کہ جاہلیت کے زمانے میں صاحب مال اور خوش جمال یتیم لڑکی پر اس کا ولی (جس سے نکاح جائز ہو) اس طرح ظلم کرتا تھا کہ اس سے خود نکاح کر لیتا اور اس کا واجبی مہر بھی ادا نہ کرتا محض اپنی سرپرستی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اسے اپنے پنجے میں دبا کر رکھتا۔ سورۂ نساء کی آیت ۳ کے پہلے ٹکڑے نے اس ظلم کا دروازہ بند کیا ایسے لوگوں سے کہا گیا کہ اگر تم یتیم لڑکیوں کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتے تو ان سے نکاح نہ کرو۔ دوسری بہت سی عورتیں ہیں جن سے تم نکاح کر سکتے ہو

اور ایک سے لے کر چار تک کر سکتے ہو۔

لیکن تیرہ سو برس کے بعد تعدد ازدواج پر من گھڑت شرط کا اضافہ کرنے والے بعض علامۂ وقت فرماتے ہیں کہ آیت یہ بتا رہی ہے کہ ایسی یتیم لڑکیاں اور بیوائیں جو محتاج اور بے سہارا ہوں اور تم جن کی کفالت نکاح کیے بغیر نہیں کر سکتے۔ تو ان سے نکاح کر لو۔ اس بالکل الٹے مطلب کی آیت کے الفاظ میں کوئی گنجائش موجود نہیں ہے اس کے باوجود دھاندلی یہ ہے کہ آیت کا صحیح ترین مطلب یہی ہے۔ اس دعوے کو وہی لوگ تسلیم کر سکتے ہیں جو قرآن کو اپنے مزعومات کے پیچھے چلانے کی سعی کر رہے ہیں

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ سورۂ نساء کی آیت (۳) کو جنگ کے نتیجے میں یتیم لڑکیوں اور بیواؤں کے پیدا شدہ مسئلے سے تعلق نہیں ہے اور نہ تعدد ازدواج کا حکم اس شرط کے ساتھ مشروط ہے۔

تفسیر بالرائے کی ایک اور مثال

سورۂ نساء کی آیت ۱۲۹ میں بھی اسی طرح کی نادانی کا ثبوت دیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آیت (۳) نے تعدد ازدواج کی اجازت کو عدل کے ساتھ مشروط کیا ہے اور آیت ۱۲۹ نے واضح کیا کہ بیویوں کے درمیان عدل ناممکن ہے ہٰذا ثابت ہوا کہ قرآن نے تعدد ازدواج کی بالکل نفی کر دی ہے۔ قرآن فہمی کا یہ ایسا شاندار مظاہرہ ہے کہ اس کی داد شاید یورپ کے مستشرقین بھی نہ دے سکیں۔ دروغ گو را حافظہ نباشد کی یہ ایک دلچسپ مثال ہے۔ آیت (۳) کے بارے میں فرمایا گیا کہ وہ یتیم لڑکیوں اور بیواؤں کے پرابلم کو حل کرنے کے لیے نازل ہوئی اور اس نے اسی لیے تعدد ازدواج کی اجازت دی اور آیت ۱۲۹ کے بارے میں کہا گیا کہ بیویوں کے درمیان چونکہ عدل کرنا ممکن نہیں ہے اس لیے تعدد ازدواج کی اجازت ختم۔ یہاں پہنچ کر یاد نہ رہا کہ آیت ۳ کو پرابلم کا حل کہہ آئے ہیں۔ اگر تعدد ازدواج کی قرآن نے نفی کر دی ہے تو پھر آیت ۳ پرابلم کا حل کہاں باقی رہی۔ قرآن کے ساتھ اس طرح کا مذاق وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کے دل خدا کے خوف سے بالکل خالی ہو چکے ہوں۔ اپنے مدعا کو ثابت کر دکھانے کی دھن اس درجہ بڑھی ہوئی ہے کہ قرآن کے الفاظ پر غور کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی گئی، اگر تعدد ازدواج کی نفی کرنی تھی تو پھر فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ کے معنی کیا ہوں گے، نفی کی صورت میں تو کہنا چاہیے تھا فَلَا تَنْكِحُوا إِلَّا واحدة لیکن اس پر غور تو اس وقت کیا جاتا جب قرآن کی پیروی مقصود ہوتی اور یہاں پیروی مقصود ہے مسیحی راہبوں اور مغربی تہذیب کی اس لیے اس کے سوا چارہ کیا ہے کہ جو منہ میں آئے بک دیا جائے

اگر غور کیا جاتا تو معلوم ہوتا کہ آیت ۱۲۹ نے تعدد ازدواج کے حکم کو اور زیادہ مؤکد کر دیا ہے اور یہ بات واضح کر دی ہے کہ آیت ۳ میں جس عدل کی شرط لگائی گئی ہے اس سے مراد قلبی میلان اور محبت میں عدل نہیں ہے کیونکہ یہ چیز انسان کی قدرت سے باہر ہے۔ آیت کہتی ہے کہ تم کسی ایک بیوی کی طرف اس طرح نہ جھک پڑو کہ دوسری کو معلق چھوڑ دو بلکہ جہاں تک بیویوں کے یہاں قیام اور ان کے نان نفقے کا تعلق ہے اس میں مساوات برتو، تعدد ازدواج کے سلسلے میں تم سے مطالبہ صرف اسی عدل کا ہے۔

چند حدیثوں پر نظر اس مسئلے سے متعلق چند حدیثوں پر نظر ڈال لینی بھی مناسب ہے۔

(۱) عن ابن عمر قال اسلم غیلان الثقفی وتحتہ عشرۃ نسوۃ فی الجاھلیۃ واسلمن معہ فامرہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان تختار منھن اربعا ویترک سائرھن (بیہقی ج ۷، ص ۱۸۱)

عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ غیلان ثقفی اسلام لائے بایں حال کہ زمانہ جاہلیت میں ان کی دس بیویاں تھیں اور وہ سب بھی ان کے ساتھ مسلمان ہو گئیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم دیا کہ اس میں وہ چار بیوی پسند کر لیں اور باقی کو چھوڑ دیں۔

(۲) عن قیس بن الحارث قال اسلمت وعندی ثمان نسوۃ فاتیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم فذکرت ذالک لہ فقال اختر منھن اربعا (ابوداؤد، ابن ماجہ بحوالہ نیل الاوطار)

قیس بن الحارث کہتے ہیں کہ میں اسلام لایا اور میرے گھر میں آٹھ بیویاں تھیں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا ان میں سے چار کو چن لو (اور باقی کو طلاق دے دو)۔

(۳) عن نوفل بن معاویۃ انہ اسلم وتحتہ خمس نسوۃ فقال لہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم امسک اربعا وفارق الاخری (مسند امام شافعی بحوالہ نیل)

نوفل بن معاویہ سے روایت ہے کہ وہ اسلام لائے اور ان کے پاس پانچ بیویاں تھیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا۔ چار کو روک لو اور پانچویں کو جدا کر دو۔

(۴) اسلم صفوان بن امیۃ

صفوان بن امیہ اسلام لائے اور ان کے پاس

وعنده ثمان نسوة فامره رسول الله صلی الله علیه وسلم ان یمسک اربعا ویفارق	آٹھ بیویاں تھیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم دیا کہ چار کو روک لیں اور باقی کو جدا کر دیں
(۵) عن عروة بن مسعود قال	عروۃ بن مسعود رضؓ کہتے ہیں کہ میں اسلام لایا
اسلمت وتحتی عشر نسوة اربع منهن	اور میرے تحت دس بیویاں تھیں ان میں سے چار
من قریش احدٰهن بنت ابی سفیان	قریشی تھیں اور ان چار میں ایک ابوسفیان کی بیٹی
فقال لی رسول الله صلی الله علیه وسلم	تھیں تو مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
اختر منهن اربعا وخل سائرهن فاخترت	فرمایا ان میں سے چار چن لو اور باقی کا راستہ
منهن اربعا منهن ابنة ابی سفیان	چھوڑ دو تو میں نے چار کو چن لیا۔ ان میں ابوسفیان
(بیہقی جلد، ص۱۸۲)	کی بیٹی بھی تھیں ۔

ان احادیث میں اس بات کی صراحت ہے کہ کسی مسلمان کے لیے بیک وقت چار سے زیادہ بیویاں جائز نہیں، اس کے علاوہ ان احادیث سے چند باتیں اور مستنبط ہوتی ہیں ۔ ایک یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی موقع پر یہ تحقیق نہیں فرمائی کہ پہلے نکاح کے بعد دوسرے نکاح ان یتیم لڑکیوں اور بیواؤں سے کیے گئے ہیں یا نہیں جن کے باپ اور شوہر کسی جنگ میں مارے گئے ہوں ۔ بلکہ آپ نے صرف یہ حکم دیا کہ جن چار عورتوں کو ان کے شوہر چاہیں رکھ لیں اور باقی کو جدا کر دیں اگر تعدد ازواج کی اجازت اس شرط کے ساتھ مشروط ہوتی کہ دوسری شادی صرف ان یتیم لڑکیوں اور بیواؤں سے کی جا سکتی ہے جن کے باپ اور شوہر کسی جنگ میں مارے گئے ہوں اور ان کا مسئلہ پیدا ہو گیا ہو تو ضروری تھا کہ پہلی بیوی کے بعد تین دوسری اسی طرح کی عورتوں کو باقی رکھنے کا حکم دیا جاتا ورنہ پھر ایک پہلی بیوی کے سوا تمام بیویوں کو جدا کر دینے کا حکم دینا ضروری تھا ۔

کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ وہ شادیاں چونکہ جاہلیت میں ہوئی تھیں اس لیے اس کا خیال نہیں کیا گیا اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام لانے کے بعد جب ان پر چار کی تحدید کا حکم نافذ کیا گیا تو شرط کا پایا جانا بالکل ضروری تھا کیونکہ تعدد ازدواج کی اجازت، مغربی ذہن کے اس متجدد کے نزدیک نازل ہی اس شرط کے ساتھ ہوئی ہے جو وہ لگا رہا ہے ۔ اگر جاہلیت کے نکاح کا خیال نہ کیا جاتا تو پھر چار کی پابندی عائد کرنے کے معنیٰ کیا ہوں گے ۔ دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ حکومت اس بات کی بھی تحقیق نہیں کرے گی کہ دوسرا نکاح کسی

ضرورت کے ماتحت کیا گیا ہے یا نہیں۔ اگر یہ تحقیق ضروری ہوتی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسے نظر انداز نہ فرماتے تیسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ حکومت بطور خود یہ تحقیق بھی نہیں کرے گی کہ شوہر بیویوں کے درمیان عدل کر رہا ہے یا نہیں یا عدل کرے گا یا نہیں۔ اس بات کی تحقیق اور اس پر کوئی حکم اسی وقت دیا جائے گا جب عدالت میں اس کا مقدمہ پیش کیا جائے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ مذکورہ بالا واقعات میں کسی ایک موقع پر بھی آپ نے عدل کرنے نہ کرنے کے بارے میں کوئی سوال تک نہیں کیا۔ چوتھی بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ تعدد ازواج کوئی برائی نہیں ہے جسے بمجبوری جائز رکھا گیا ہو۔ اگر اس میں ذرا بھی قباحت ہوتی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کم سے کم یہ مشورہ ضرور دیتے کہ ایک بیوی کے علاوہ باقی تمام بیویوں کو علیحدہ کر دیا جائے۔

مذکورہ بالا احادیث کے علاوہ ایک حدیث اور نقل کی جاتی ہے تاکہ من گھڑت شرط لگانے والے کی تفسیر بالرائے اور واضح ہو جائے۔

> حضرت انس سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ جب کوئی شخص اپنی ثیبہ بیوی (یعنی بیوہ عورت جس سے کسی نے نکاح کیا ہو) پر کنواری لڑکی بیاہ کر لائے تو شوہر اس کے پاس سات دن قیام کرے گا اور جب کسی شخص نے پہلے کنواری لڑکی سے شادی کی ہو اور اس کے بعد اس پر کسی بیوہ عورت کو بیاہ لائے تو شوہر اس کے پاس تین دن قیام کرے گا۔ پھر حضرت انس نے کہا کہ سنت یہی ہے۔ (مسلم شریف)
>
> صحیح مسلم ہی کی ایک حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کنواری کو سات دنوں کا حق ہے اور بیوہ کو تین دنوں کا۔

اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ایک بیوی کی موجودگی میں کوئی شخص کسی دوسری کنواری لڑکی کو بھی بیاہ کر لا سکتا ہے اور کسی بیوہ عورت کو بھی۔ وہ کنواری لڑکی باپ والی بھی ہو سکتی ہے اور یتیم بھی۔ ایسی یتیم بھی جس کا باپ کسی جنگ میں مارا گیا ہو اور ایسی یتیم بھی جس کا باپ بستر پر طبعی موت مرا ہو۔ اسی طرح بیوہ عورت وہ بھی ہو سکتی ہے جس کا شوہر کسی جنگ میں مارا گیا ہو اور وہ بھی جس کا شوہر طبعی موت مرا ہو۔ نہ اس حدیث میں اور نہ کسی حدیث میں کہیں اس بات کا خفیف اشارہ بھی موجود ہے کہ ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کسی ایسی یتیم اور بیوہ ہی سے کی جا سکتی ہے جس کے باپ اور شوہر جنگ میں مارے گئے ہوں۔ یہ من گھڑت شرط افترائے محض کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس حدیث سے جو فقہی مسئلہ مستنبط ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ کسی شخص نے دوسری شادی اگر کنواری لڑکی سے کی ہے تو اس کے ساتھ سات دن قیام کرنے کے

بیویوں کے یہاں باری باری سے قیام کرے گا اور اگر بیوہ عورت سے نکاح کیا ہے تو باری پر عمل اس کے یہاں تین دن قیام کے بعد شروع کرے گا۔

مسئلے کی اصل حقیقت

حقیقت یہی ہے کہ قرآن، حدیث، اجماع امت، نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ کے عمل اور پونے چودہ سو سال کے دینی ریکارڈ سے جو بات بغیر کسی ادنیٰ اشتباہ اور ابہام کے معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ تعدد ازواج کے لیے اللہ تعالیٰ نے بیویوں کے درمیان برتاؤ میں صرف عدل کی شرط لگائی ہے۔ اسلامی شریعت میں یہ نہ کوئی ناگزیر برائی ہے جسے مجبوری جائز رکھا گیا ہے اور نہ یہ حکم یتیم لڑکیوں اور بیواؤں کے پرابلم کو حل کرنے کی شرط کے ساتھ مشروط ہے۔ جو لوگ اسے ناگزیر برائی قرار دے رہے ہیں یا من گھڑت شرط کے ساتھ اسے مشروط کر رہے ہیں وہ قرآن کی پیروی نہیں کر رہے ہیں بلکہ مغربی تہذیب سے مرعوب ذہن کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

عدل کوئی آسان کام نہیں ہے

دوسری حقیقت یہ ہے کہ تعدد ازواج کے لیے قرآن نے عدل کی جو شرط لگائی ہے وہ کوئی معمولی شرط نہیں ہے۔ اس لیے کہ متعدد بیویوں سے یکساں برتاؤ، یکساں حسن سلوک، باری کی تقسیم میں مساوات اور ان کے اخراجات میں مساوات برتنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ بالخصوص ایسی صورت میں کہ کسی ایک بیوی کی طرف دل کا میلان زیادہ ہو انصاف کی روش پر قائم رہنا ایک ایسی آزمائش ہے جس میں وہی لوگ پورے اتر سکتے ہیں جو شریعت کے حکم پر اپنے نفس کے تقاضے اور اپنی بیویوں کی مرضیات کو قربان کر سکتے ہوں

مشورہ

اس زمانے میں جب کہ مسلمان بالعموم عادلانہ عمل، اخلاق و کردار اور ایمان و تقویٰ کے لحاظ سے بہت پست ہو چکے ہیں، اس شرط کی خلاف ورزی عام ہو گئی ہے اور اس کی وجہ سے تعدد ازدواج نے مسلمان معاشرے میں پیچیدگیاں اور خرابیاں بھی پیدا کی ہیں لیکن اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ اس پر پابندی عائد کر دی جائے بلکہ یہ ہے کہ عدل کی شرط کو پورا کرانے اور مظلوم عورتوں کی دادرسی کے بہتر انتظامات کیے جائیں اور ایسی منفی و مثبت تدبیریں اختیار کی جائیں جن کی وجہ سے ظلم و زیادتی میں کمی واقع ہو۔ نفس تعدد ازواج میں خرابی نہیں ہے بلکہ اس کی شرط کو نظرانداز کر کے اس پر عمل کرنے میں خرابیاں ہیں ــــ موجودہ معاشرے کو سامنے رکھ کر اصلاحی تدابیر اور ضابطوں کی ترتیب و تعیین بھی ہر شخص کا کام نہیں ہے بلکہ یہ کام وہ لوگ کر سکتے ہیں جو ایک طرف معاشرے

کے حالات سے واقف اور دوسری طرف شرعی احکام پر گہری نظر رکھتے ہوں۔ عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ تعدد ازدواج پر پابندی عائد نہ کی جائے کیونکہ اس پر پابندی لگا دینے سے معاشرے میں اس سے بہت زیادہ خرابیاں رونما ہوں گی جتنی عدل کی شرط پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ آخر یہ کہاں کی عقل مندی ہے کہ ایک کم درجے کی برائی ختم کرنے کے لیے اس سے بڑے درجے کی برائی قبول کرلی جائے۔

تصحیح جولائی ۶۳ء کے شمارے میں صفحہ ۱۰ سطر ۲ میں ایٹم کے ساتھ "بم" کا اضافہ ہوگیا ہے۔ اصل جملہ ہے "ایٹم کے ٹوٹنے سے" نیز صفحہ ۸ سطر ۴ میں "ریاستی ادارہ" کی جگہ "ریاستی اولاد" چھپ گیا ہے۔ خریداران زندگی تصحیح فرمالیں۔ (اح۔ ع)

تصحیح ماہنامہ زندگی کے ایک قاری نے ہمیں ایک غلطی پر متنبہ کیا ہے ان کے شکریے کے ساتھ اس کی تصحیح کی جارہی ہے۔ مئی ۶۳ء کے شمارے میں صفحہ ۷ پر سورۂ ممتحنہ کی ایک آیت نقل کی گئی تھی اس میں "و بینکم" کا ٹکڑا چھوٹ گیا ہے۔ بَیْنَنَا کے بعد قارئین وَبَیْنَکُمْ بڑھالیں

شرائطِ ایجنسی

(۱) ایجنسی کم سے کم پانچ رسائل پر دی جائے گی۔ (۲) رسائل حسب ضرورت طلب کیے جائیں، اگر فروخت نہ ہوئے تو واپس نہیں لیے جائیں گے۔ (۳) کمیشن ۲۵ فی صدی دیا جائے گا۔ البتہ پچاس یا زائد رسالوں کی خریداری پر کمیشن ۳۳ فی صدی ہوگا ۔ (۴) رسائل کی روانگی کا صرفہ ہمارے ذمے ہوگا اور رجسٹری یا وی پی کا خرچ ایجنٹ صاحبان کے ذمے ہوگا۔ (۵) رقم ہرحال میں پیشگی آنی چاہیے یا پھر وی پی بھیجنے کی اجازت دی جائے۔ وی پی کے مصارف زیادہ ہوں گے۔

منیجر رسالہ زندگی رام پور

اشتراکی الحاد اور اُس کے اثرات

قسط (۲)

(محمد عبداللہ العربی)

اقتصادی پہلو

اشتراکیت' فرد کو انسانی سوسائٹی میں جو مقام دیتی ہے اس کا ذکر پہلے گزر چکا' اسی کا نتیجہ ہے کہ اس نے زندگی کے معاشی و اقتصادی نظام کو ایسی بنیاد پر قائم کیا ہے جو طبیعت انسانی کی خواہشات' جذبات اور قوانین کے بالکل خلاف ہے۔ یہ بنیاد ہے انفرادی ملکیت کی تنسیخ اور اس کے نتیجے میں قوانین میراث کی نفی۔ فرد کو اس کا حق نہیں ہے کہ وہ اپنی قابلیت اور اپنی قوت بازو سے کماتے ہوئے پھل کا مالک ہو یا اپنے بعد اہل قرابت کو اپنے مال کا وارث بنا سکے بلکہ ہر وہ چیز جو حکومت کی زمین میں اور اس کے آسمان کے نیچے ہے وہ حکومت کی ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر اشتراکی ممالک میں فرد کو اس کا بھی حق نہیں ہے کہ وہ اپنے لیے کوئی کام منتخب کر سکے۔ اس کی حیثیت بلا فرق' گدھے یا بیل جیسی ہے۔ اس کا مالک جو چاہے اس سے کام لے' اور جتنی خوراک چاہے اس کے سامنے ڈال دے۔

مذہب اشتراکی کے حکم میں' صرف حکومت تنہا تمام مصادر دولت اور وسائل معیشت کی مالک ہے اور تنہا وہی اس کا اختیار رکھتی ہے کہ اپنے مسخر غلاموں میں سے ہر غلام کی اجرت مقرر کرے۔ افراد قوم کے سامنے صرف دو راستے ہیں۔ یا تو بھوکے مر جائیں یا پھر حکومت کا کوڑا انہیں جدھر ہانکے ادھر ہی بھاگیں۔

یہاں ایک بات بہت زیادہ قابل غور ہے۔ سوال یہ ہے کہ ملک کے تمام وسائل معاش پر اشتراکی حکومت کے مالکانہ اقتدار کے معنی کیا ہیں؟ کیا فی الواقع اس کے معنی یہ ہیں کہ پوری قوم ان وسائل

معاش کی مالک ہوتی ہے جیسا کہ عام طور پر قومی ملکیت کے لفظ سے سمجھا جاتا ہے؟ اگر ملکیت قوم کی ہے تو کیا اس کو اپنی مصلحت کے مطابق اس میں تصرف کرنے اور اس سے متعلق اداروں کو چلانے کا حق حاصل ہے؟ کیا حکومت کے وہ ممبر جنہیں قوم اپنا نمایندہ منتخب کرتی ہے آزادانہ طور پر اپنے حلقۂ انتخاب کی مصلحت کا اظہار کر سکتے ہیں؟ اگر منتخب شدہ ممبر قوم کی مصلحت کو غلط طور پر پیش کریں اور ملکیت میں ان کا تصرف صحیح نہ ہو تو کیا قوم کو اس کا اختیار ہے کہ وہ ان کے بجائے دوسرے لوگوں کو منتخب کر سکے اگر ان سوالات کا جواب اثبات میں ہو تو بے شک یہ دعویٰ صحیح ہے کہ پوری قوم وسائل معاش کی مالک ہوتی ہے اور اگر جواب نفی میں ہو اور صورت واقعہ یہ ہو کہ اسے اپنی ملکیت میں تصرف کی کوئی آزادی حاصل نہیں ہوتی بلکہ تمام اختیارات چند ایسے ہاتھوں میں مرکوز ہو جاتے ہیں جنھوں نے زبردستی اپنے آپ کو قوم پر مسلط کر رکھا ہے تو فی الواقع اس کی حیثیت ان جانوروں سے مختلف نہیں ہوتی جو اس سرزمین میں پائے جاتے ہیں۔ صحیح بات یہی ہے کہ اشتراکی نظام معیشت میں حکومت کی ملکیت کے معنی قومی ملکیت کے نہیں ہوتے اور یہ ایک بہت بڑا جھوٹ ہے جو مارکس نے نظری طور پر اپنی دو کتابوں "اشتراکی مینی فسٹو اور کیپٹل" میں گھڑا ہے اور پھر اس کے بعد لینن نے عملی طور پر اس جھوٹ کے پردے میں اشتراکی ڈکٹیٹر شپ قائم کی ہے۔ اس کے بعد اسٹالن آیا اور اس نے اس آمریت کو کچھ اور بھیانک بنا دیا۔

آیئے دیکھیں کہ اس جھوٹ نے کتنے مراحل طے کیے ہیں اور اس کے کیا طریقے

اس جھوٹ کے مراحل

اختیار کیے گئے ہیں ——— ۱۹۱۷ء میں جب روس پر لینن کے استیلاء کی ابتدا ہوئی۔ اس روس پر جسے جنگ عظیم اول نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا اور روسی قوم پر مایوسی کی ایک ایسی کالی رات چھا گئی تھی جس میں کوئی چمک نہ ہو۔ لینن نے کارل مارکس کے اس جھوٹ کو نافذ کرنا شروع کر دیا قومی ملکیت کے پردے میں حکومت نے باشندگان ملک کے تمام کھیتوں، کارخانوں تجارتی منڈیوں پر قبضہ کر لیا اور لینن نے انہیں حکم دیا کہ اب وہ مالکوں کی طرح نہیں جبری مزدوروں کی طرح کام کریں۔ اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ لوگوں کے تمام جذبات عمل سرد پڑ گئے۔ اگرچہ حکومت کا کوڑا انہیں اجتماعی کھیتوں یا کارخانوں کی طرف ہانک رہا تھا، اور ذرا سی سرکشی پر بھی موت اور جلا وطنی کی سزائیں دی جا رہی تھیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پورے ملک پر معاشی و اقتصادی فالج آگرا۔ قحط عام رونما ہوا اور لاکھوں کی تعداد میں روسی فنا کے گھاٹ اتر گئے۔ خطرہ یہ پیدا ہو گیا کہ کہیں پوری قوم ہی برباد ہو کر نہ رہ جائے۔ اس جبر کے خلاف کسانوں کے

غصے کا یہ عالم تھا کہ وہ اجتماعی کھیتوں کے کھلیان کو جلا دینا اور مویشی کو مار ڈالنا اس سے بہتر سمجھتے تھے کہ انہیں حکومت کے حوالے کیا جائے۔

اس صورت حال نے لینن پر یہ حقیقت واضح کردی کہ یہ نظریہ غلط اور طبیعت بشری کے خلاف ہے اور اگر وہ کارل مارکس کے گھڑے ہوئے فلسفے پر عمل کرتا رہا تو اس کا تختہ الٹ جائے گا۔ چنانچہ ۱۹۲۱ء میں اس نے معاشیات کی جدید سیاست" کے نام سے ایک نیا سیاسی فرمان جاری کیا۔ اس میں مذہب مارکس کے خلاف ذیل کے تین نکتے تھے۔

(۱) کسان مزدوروں کو اس کی اجازت ہے کہ وہ اپنے کھیتوں کا تمام حاصل حکومت کے حوالے کرنے کے بجائے وہ اس کے ایک حصے کے خود مالک ہو سکتے ہیں۔ (۲) وہ اپنے گھروں کے آس پاس، زندگی بھر زمین کے ایک چھوٹے ٹکڑے کے مالک ہو سکتے ہیں۔ (۳) چھوٹے صنعت کار اور پیشہ ور آزادانہ اپنے پیشے اختیار کر سکتے اور اس کی آمدنی کے مالک ہو سکتے ہیں۔ یہ مارکس کے غیر فطری نظریے کو رد کرنے کی ابتدا تھی لیکن، لینن ۱۹۲۴ء میں مرگیا۔ کہا جاتا ہے کہ اگر وہ زندہ رہتا تو اس نظریے کی بنیادوں کو بدل دیتا۔

اس کے بعد اسٹالن اس کا جانشین ہوا، اس نے ابتدا میں کوشش کی کہ مارکس کے نظریے کا اعادہ کرے اور بزور اس کو نافذ کرے۔ چنانچہ قتل، جلا وطنی اور دہشت انگیزی اپنی انتہا کو پہنچ گئی اور بالخصوص روس کا کسان طبقہ اس کا شکار ہوا لیکن اسٹالن بھی طبیعت انسانی سے مقابلہ کرنے میں ناکام رہا۔ صرف یہی نہیں کہ اسے لینن کی دی ہوئی اجازت کو پھر نافذ کرنا پڑا بلکہ اجر و مزد کی تعیین کے اشتراکی ضابطے میں اسے جوہری تبدیلی کرنی پڑی اور اس تبدیلی نے اشتراکیت کے ایک بڑے دعوے کو باطل کردیا۔ اس کا دعویٰ یہ تھا کہ اس کی بنیاد پر بنی ہوئی اسٹیٹ میں طبقات کا اختلاف ختم ہو جائے گا اور باشندوں کے درمیان کامل مساوات ہوگی، تنخواہ یا عمل کی مزدوری میں ضابطہ یہ بنایا گیا تھا کہ مزدوری اس کام کی حیثیت کے مطابق نہیں ہوگی جسے انجام دیا گیا ہے بلکہ کام کرنے والے کی بنیادی ضرورت کے مطابق ہوگی، اور ہر ایک کی بنیادی ضرورت کی تعیین و تحدید حکومت کے ہاتھ میں ہوگی جس سے کوئی باز پرس کرنے والا نہ ہوگا۔ اس قانون کا ہدف یہ تھا کہ تمام باشندوں کے درمیان جبری مساوات پیدا کی جائے اور طبقاتی نظام ختم کردیا جائے۔ اشتراکیت کے مبلغین لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے اپنے اس دعوے کو بار بار دہراتے ہیں کہ اشتراکی معاشرے میں

طبقات کا وجود نہ ہوگا اور سب برابر ہوں گے لیکن اب اس دعوے کا کھوکھلا پن دنیا پر ظاہر ہو چکا ہے۔ روس میں اس وقت جو طبقاتی نظام پایا جاتا ہے وہ دوسرے معاشی نظاموں کے مقابلے میں زیادہ شنیع و قبیح ہے۔ زیادہ قبیح اس لیے ہے کہ وہاں کسی کام کی اجرت آزادانہ مسابقت کے نتیجے میں متعین نہیں ہوتی بلکہ یہ چیز وہاں کی ظالم حکومت کے ہاتھ میں ہے وہ جس عمل کی جو اجرت چاہے مقرر کر دے۔ مارکس کا مذہب یہ تھا کہ "ہر شخص سے اس کی قدرت و صلاحیت کے مطابق کام لیا جائے گا اور اس کو اس کی ضرورت کے مطابق مزدوری دی جائے گی" اب اس کا دوسرا جز بالکل الٹ گیا ہے اب قاعدہ یہ نافذ ہے کہ "ہر شخص کو اس کے عمل کے مطابق مزدوری دی جائے گی"۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ اتنا بڑا انقلاب کیسے آگیا جس نے اشتراکی نظام معیشت کے ایک بڑے ستون کو توڑ کر رکھ دیا ہے اس سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ طبیعت انسانی کے خلاف ایک خیالی نظریہ زندگی کی واقعیت کے سامنے ٹھہر نہیں سکا۔ ہوا یہ کہ اسٹالن نے ڈنڈے کے زور سے روسیوں کو کھیتوں اور کارخانوں کی طرف ہانکنا شروع کیا تاکہ لوگ اس میں مساوی اجرت پر کام کریں۔ کیونکہ اجرت میں مساوات مذہب اشتراکی کا بنیادی ستون ہے۔ یہ ڈنڈا لوگوں کے جسم پر قابو پا سکتا تھا لیکن ذہن اور دماغ کو بدل دینا اس کے اختیار سے باہر تھا۔ عمال (کام کرنے والے) نے دیکھا۔ اور عامل اشتراکیت کی نظر میں ہر وہ شخص ہے جو حکومت کے لیے کام کرتا ہے عام ازیں کہ وہ حکومت کا تنخواہ دار افسر ہو یا کارخانے اور کھیت میں کام کرنے والا کوئی فرد ہو ــــ انھوں نے دیکھا کہ نتیجۂ عمل واحد ہے۔ اجرت میں محنتی، کاہل کے برابر ہے۔ ذہین غبی کے مساوی ہے۔ ماہر فن، کسی بے ہنر کی صف میں ہے وہ شخص جو اپنی زندگی کی تازگی اور اپنے دماغ کا جوہر کسی کام میں فنا کر رہا ہے اس شخص کے برابر ہے جو کسی دیوار پر سفیدی پھیر رہا ہے تو ان کے حوصلے سرد پڑ گئے، ہمتیں کمزور ہو گئیں، جذبات مضمحل ہو گئے اور وہ معاشی داعیہ ہی ختم ہو گیا جو ہر محنت کرنے والے کو محنت کرنے پر ابھارتا ہے۔ حکومت کی سختیوں کے باوجود، کام کرنے والوں کا یہ جمود و خمول ملک کی معاشیات کے لیے تباہ کن ثابت ہونے لگا اور ایک بار پھر پورے ملک کے لیے بھوک اور قحط کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ آخر کار ۱۹۳۱ء میں اسٹالن نے ملکی پیداوار کی نگرانی کرنے والے عمال کی کانفرنس طلب کی اور اس میں اس نے کہا، "کام کرنے والوں کی کاہلی اور تعطل نے ملکی پیداوار میں کمی پیدا کر دی ہے"۔ اس نے اس کاہلی اور تعطل کا اصل مساوات اجرت کے اس قانون کو قرار دیا جسے وہ خود اپنے ڈنڈے کے زور سے نافذ کر رہا تھا اس نے کہا اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا ملک، صنعت و زراعت میں آگے بڑھے تو ضروری ہے کہ درجات بھی متعین کیے جائیں

ماہرِ فن اور غیر ماہرِ فن، محنتی و ذہین اور کاہل و غبی کی اجرتوں میں فرق کیا جائے اور ضروری ہے کہ اجرت کام کرنے والے کی ضرورت کے مطابق نہیں بلکہ اس کے عمل کے مطابق مقرر کی جائے۔"

کمیونسٹ پارٹی کی صفِ اول کے جن ممبروں نے اس کی اس رائے سے اختلاف کیا وہ اس کے غضب کا نشانہ بنے۔ پارٹی سے ایسے ممبروں کی خوں ریز تطہیر کے بعد ۱۹۳۴ء میں وہ تقریر کرنے کھڑا ہوا اور اس نے کہا جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اشتراکیت اور اجرت میں مساوات لازم و ملزوم ہیں وہ احمق ہیں، جس مساوات کا وہ نعرہ لگاتے ہیں اس نے ہمیں سخت نقصان پہنچایا ہے۔"

اس کی یہ تقریر اس بات کا عبرت ناک اعتراف تھی کہ مارکس کا نظریہ طبیعت بشری سے متصادم اور زندگی کے لیے ایک غیر صالح نظریہ ہے۔ اس طرح اشتراکی معاشیات کا ستون زمین پر گر پڑا۔

انفرادی ملکیت اور میراث کی اجازت

اجرتوں میں تفاوت کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ایک حد تک انفرادی ملکیت کی بھی اجازت دی جائے اور بیٹوں کو حق دیا جائے کہ وہ اپنے باپوں کی میراث پاسکیں۔ چنانچہ اسٹالن کو یہ دونوں اجازتیں دینی پڑیں۔ ردِ عمل کے طور پر روس میں اجرتوں کا تفاوت اس تفاوت سے بھی بمراحل آگے بڑھ گیا ہے جو سرمایہ دار ممالک میں پایا جاتا ہے۔ روس میں انجینیروں، سائنس دانوں اور طبیعی و ریاضی علوم کے ماہروں کو جو اجرتیں دی جارہی ہیں سرمایہ دار ممالک میں یہ طبقہ اس کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا۔ اس طبقے پر وہاں اس لیے مُن برسایا جارہا ہے کہ ملک، مادی قوت اور مہلک آلات کی ایجاد میں سب سے آگے بڑھ جائے۔ وہاں اس طبقے میں، سامانِ عیش و عشرت اور دولت و عافیت کا ارتکاز، سرمایہ دار ممالک سے کم نہیں ہے۔ اجرتوں اور درجات کا یہ تفاوت کوئی زبانی اور رواجی چیز نہیں ہے بلکہ سوویت روس کے جدید دستور میں درج ہے۔ ۱۹۳۶ء میں جو دستور نافذ ہوا ہے اس کی دفعہ ۱۲ میں لکھا ہوا ہے:- "ہر شخص سے اس کی قدرت کے مطابق کام لیا جائے گا اور اس کے عمل کے مطابق اجرت دی جائے گی۔" اس طرح بالفعل روس میں وہ نظامِ طبقات پیدا ہوچکا ہے۔ اشتراکی لیڈر جس کی مذمت کرتے ہوئے نہیں تھکتے۔ بلکہ روس کی طبقہ واریت، سرمایہ دار ممالک کی طبقہ واریت سے بڑھی ہوئی ہے۔ اس لیے کہ روس کے تمام وسائلِ معیشت، کمیونسٹ پارٹی اور اس پارٹی کے چند افراد کے ہاتھوں میں ہیں۔ حکومت کے سربراہ کار اور ان کے مقرر کردہ حکام، ان دو طبقوں کا حصہ، مملکت روس کی نعمتوں اور عافیتوں میں شیر کا حصہ ہے اور پھر ان کے دسترخوان کا پس خوردہ درجہ بدرجہ پارٹی کے عملی ارکان کو ملتا ہے

قی رہے وہ لوگ جو پارٹی کے ممبر نہیں ہیں ان کی حیثیت گدھوں اور بھیڑ بکریوں سے زیادہ نہیں ہے

ظالمانہ قوانین روسی قوم کے سواد اعظم پر جو ظالمانہ مالی قوانین نافذ ہیں، ان کی مختصر توضیح سرکاری کاغذات اور کارکنوں سے متعلق قوانین کی کتاب سے ذیل میں کی جاتی ہے۔

۲۴ ستمبر ۱۹۳۰ء واکتوبر ۱۹۳۰ء اور ۲۶ جون و ۱۰ اگست ۱۹۴۰ء کے سرکاری کاغذ میں درج ہے:۔

"سویت روس کے کسی کارکن کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے اختیار سے اس کام کو چھوڑ دے جو اس کے لیے مقرر کیا گیا ہے اور اگر کوئی کارندہ ایسا کر گزرے تو اسے خائن سمجھا جائے گا اور وہ دس سال کی سزا کا مستحق ہوگا۔"

جنوری ۱۹۳۱ء کے قانون میں کہا گیا ہے:۔

"روسی کارکن کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر اس کام کو قبول کرے جو حکومت اس کے ذمہ لگا رہی ہو کام کی نوعیت چاہے کچھ بھی ہو۔"

۲۶ دسمبر ۱۹۳۲ء و ۲۶ جون ۱۹۴۰ء کے سرکاری مرسوم میں ہے:۔

"پہلے سے حاصل کی ہوئی سرکاری اجازت کے بغیر، اپنی ڈیوٹی سے غائب ہونا جائز نہیں ہے اسی طرح جس تاریخ کو کام پر حاضر ہونا ہے اس میں تاخیر ناجائز ہے، اگر ایک مہینے میں تین بار ایسا کوئی واقعہ ہوا تو اس کارندے کو کام سے الگ کر دیا جائے گا۔ اس کا گھر چھین لیا جائے گا اور چھ ماہ سے لیکر بارہ ماہ تک اسے جیل کی سزا بھگتنی ہوگی۔

یکم جون ۳۲ و ۲۰ جون ۴۲ کے گزٹ میں ہے:۔

"مزدوروں سے کارخانے کے ہر نقصان کی بازپرس کی جائے گی۔ اگر کارخانے کے آلات، یا خام مواد یا ایندھن یا کام کے وقت پہننے کے لباس کو کوئی نقصان پہنچے گا تو نقصان پہنچانے والے کی اجرت سے اس نقصان کی دس گونا قیمت وصول کی جائے گی۔

۲۶ جون ۱۹۴۰ء کو سوویت مجلس اعلیٰ نے یہ قانون صادر کیا:۔

"کسی کارخانے کے ناظم یا کسی جائے عمل کے افسر کو اختیار ہوگا کہ محکمہ کی اجازت کے بغیر قصوروار کو چار ماہ، قید بامشقت کی سزا دے اور اگر اس کی رائے ہو کہ اس سے زیادہ سخت سزا کی ضرورت ہے تو وہ قصوروار کارکن کو محکمہ کے سامنے پیش کرے گا۔"

یہ روس کے ظالمانہ قوانین کی چند دفعات ہیں۔ طوالت کے خوف سے تفصیلی احکام کا ذکر ترک کر رہا ہوں۔ اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ روس کے "اشتراکی فردوس" میں مزدور اور دوسرے کارکن کیا کچھ برداشت کر رہے ہیں۔

حکومتی پہلو

اشتراکی الحاد کا اثر نظام حکومت پر کیا پڑا ہے اس کی تفصیل بھی بخوف طوالت چھوڑ رہا ہوں۔ یہاں صرف اس کذب صریح کی طرف اشارہ کرنا کافی ہوگا جو روسی دستور میں جمہوریت کے بارے میں درج کیا گیا ہے۔ روسی دستور کے جھوٹے ملمع کے نیچے بدترین قسم کی ڈکٹیٹرشپ چھپی ہوئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہاں حکومت کی باگ' پارٹی کے چند اونچے ارکان کے ہاتھوں میں ہے۔ اور ان چند افراد میں بھی دراصل صرف ایک شخص پورے ملک کا مالک ہے اور در پردہ ان چند افراد میں سے ہر ایک دوسرے سے خائف ہوتا ہے۔ یہ چند افراد ایک ایسے جاسوسی نظام کے سہارے حکومت کرتے ہیں جس کی کہیں داد فریاد نہیں ہے اور جو لوگوں کے خیالات اور خطرات قلب تک پر پہرے بٹھاتا ہے۔ کریملین کا دیوتا سب سے اونچی کرسی پر بیٹھا ہوا خفیہ احکام دیتا رہتا ہے اور روس کا ہر باشندہ خوف اور دہشت سے لرزتا رہتا ہے۔ پوری روسی قوم بدترین قسم کی غلامی میں زندگی بسر کر رہی ہے۔ اشتراکی الحاد کے ہمہ گیر اثرات کے بارے میں یہ جو کچھ لکھا گیا ہے اسے "نمونہ از خروارے" سمجھنا چاہیے ——— ہم مغربی ممالک کے سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیوں اور برائیوں سے بھی ناواقف نہیں ہیں۔ دنیا میں صرف ایک نظام ہے جو اشتراکیت اور سرمایہ داری دونوں کی برائیوں سے پاک اور انتہائی معتدل ہے اور وہ ہے نظام اسلامی۔ اس نے خرابیوں اور برائیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے تاکہ اسلامی معاشرہ' سیاسی' اجتماعی اور اقتصادی ہر پہلو میں صاف ستھرا اور صالح ہو۔ اس سلسلے میں ہمیں اپنی ذمہ داری کا بھی احساس ہے۔ ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ اسلام کے اصول و مبادی کو اچھی طرح سمجھیں اور پھر انہیں زمانۂ حال کے ترقی پذیر حالات پر فٹ کریں۔

ہم عالم اسلامی کے لیے نہ مہلک اشتراکیت چاہتے ہیں اور نہ بے حیا سرمایہ داری' ہم ایک معتدل طریق زندگی کے طلب گار ہیں اور یہ وہ صراط مستقیم ہے جو اسلام نے دنیا کو دکھائی ہے۔

ہم وہ اشتراکیت نہیں چاہتے جو تمام آسمانی ادیان کی دشمن ہے جو وجود خالق' زندگی بعد موت اور اخروی جزا و سزا کی منکر ہے اور جو انسان کو زندگی کے اعلیٰ مقصد سے محروم کر دیتی ہے۔

ہم وہ اشتراکیت نہیں چاہتے جو خاندانی روابط کو منہدم کرتی' عقد نکاح کی ہنسی اڑاتی' اور باپ بیٹے

کے رشتے کو منقطع کرتی ہے۔

ہم وہ اشتراکیت نہیں چاہتے جو فرد کے حق ملکیت کی نفی کرتی ہے اور کسی کو اس کا حق نہیں دیتی کہ وہ اپنے حاصل محنت کا خود مالک ہو، جو حکومت کو، ملک کے تمام وسائل معاش کا واحد مالک قرار دیتی ہو اور جو فرد کو حکومت کا ذلیل غلام بناتی ہے۔

ہم وہ اشتراکیت نہیں چاہتے جو دنیا کو دکھانے کے لیے پارلیمانی نظام کا نام لیتی اور اس پردے میں گلا گھونٹ دینے والی ڈکٹیٹرشپ قائم کرتی ہے۔

ہم امت اسلامیہ کے ارکان ہیں۔ ہم میں قرآن نازل ہوا جو تمام عالم کے لیے ہدایت اور بشارت ہے۔ ہم قرآن کی روشنی میں ایک مثالی نظام قائم کرسکتے ہیں جس کو دیکھ کر گمراہ دنیا ہدایت پاسکتی ہے ایک ایسا معتدل نظام جو ہمیں سرمایہ داری کی سنگ دلی اور مہلک اشتراکیت کے شر سے بچاسکتا ہے۔

ختم شد

(مجلۃ الشئون الصوفیہ سے ترجمہ کیا گیا)

معاشرتی قوانین پر زمانے کا اثر

آخر زمانہ کس اعتبار سے بدل چکا ہے؟ کیا اس اعتبار سے کہ اسلام نے جن برائیوں کے سدباب کے لیے یہ قوانین بنائے تھے وہ برائیاں اب عرب جاہلیت کے مقابلے میں ہزار گنا بڑھ گئی ہیں یا اس اعتبار سے کہ اب وہ ناپید ہو چکی ہیں یا اس اعتبار سے بدل گیا ہے کہ یہ ساری برائیاں اب تہذیب کے سانچے میں ڈھل چکی ہیں۔ اگر یہ بات ہے تو اسلام اس تہذیب کی خاطر اپنے قوانین منسوخ کرنے کے بجائے آپ کی اس تہذیب پر لعنت بھیجتا ہے اور اپنے پیروؤں کو حکم دیتا ہے کہ اس کے ساتھ کوئی تعاون کرنے کے بجائے اس کو جڑ پیڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے اپنا پورا زور استعمال کریں۔

(مولانا امین احسن اصلاحی)

رسائل و مسائل

اَمَرْنَا مُتْرَفِیْهَا فَفَسَقُوْا کی صحیح تاویل

سوال: سورۂ بنی اسرائیل کی آیت اِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْیَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِیْهَا فَفَسَقُوْا فِیْهَا الخ سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ "فسق" کا بھی حکم دیا کرتا ہے۔ اگرچہ اس حکم سے مراد قطعی طور پر حکم تکوینی ہی ہوگا نہ کہ حکم تشریعی لیکن اس کے باوجود قرآن شریف میں اللہ سبحانہ تعالیٰ کی طرف فسق کا حکم دینے کی نسبت کا ہونا خلجان پیدا کر رہا ہے۔ براہ کرم اس خلجان کو دور فرمائیں۔

جواب۔ آیت کے الفاظ اَمَرْنَا مُتْرَفِیْهَا فَفَسَقُوْا کے ایک معنی تو بے شک وہی بیان کیے گئے ہیں جو آپ نے درج فرمائے ہیں، بلکہ علامہ زمخشری نے تو اس تاویل کے ساتھ کہ یہاں بات مجاز کے پیرایے میں کہی گئی ہے، اس کی صحت پر بڑا زور استدلال صرف کیا ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ عربی زبان و ادب کے معروف قواعد کی رو سے ان الفاظ کا کوئی اور مطلب بیان کرنا صحیح نہ ہوگا۔ لیکن ان الفاظ کے ایک معنی اور بھی بیان کیے گئے ہیں اور وہ یہ کہ "ہم (یعنی اللہ تعالیٰ) اس بستی کے خوش حال لوگوں کو بندگی اور طاعت کا حکم دیتے ہیں لیکن وہ نافرمانی پر تُل جاتے ہیں۔" علامہ آلوسی صاحب روح المعانی، امام رازی صاحب التفسیر الکبیر اور دوسرے بہت سے مفسرین نے یہی تاویل اختیار کی ہے۔ میرے نزدیک بھی ان الفاظ کا صحیح مفہوم یہی ہے۔ وجوہ درج ذیل ہیں:۔

(۱) پہلی وجہ تو یہ ہے کہ قرآن حکیم کے لیے جس طرح یہ بات ناممکن التصور ہے کہ وہ ذات باری سبحانہٗ کی طرف فسق کا تشریعی حکم دینے کی نسبت کرے، اسی طرح فسق کا تکوینی حکم دینے کی نسبت کرنا بھی اس کے مزاج اور انداز کلام کے قطعی خلاف ہے۔ چنانچہ پورے قرآن میں ایسے کسی ایک مقام کی بھی نشان دہی نہیں کی جاسکتی جہاں فسق یا کفر یا شرک یا کسی بھی شر و معصیت کا حکم دینے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہو۔ اس کے بخلاف

وہ پورے زور سے کہتا ہے کہ "یقین رکھو' اللہ برائی کا حکم نہیں دیا کرتا" (اِنَّ اللّٰہَ لَا یَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ۔ اعراف) یہ صحیح ہے کہ یہ ارشاد تشریعی حکم ہی کے سیاق میں ہوا ہے' لیکن اس کے باوجود اس کے اندر ایک عموم بھی ہے۔ اور ضمناً ہی سہی مگر لَا یَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ سے فحشاء کا تکوینی حکم دینے کی نفی بھی بہرحال ہوتی ہے۔ غرض اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف 'امر بالفسق' کی نسبت کرنا چاہے کلامی منطق کی رو سے غلط نہ ہو' مگر یہ قرآن پاک کی زبان پر آنے والی بات ہرگز نہیں ہے۔

(۲) اس آیت میں' جس کا کہ زیر بحث الفاظ ایک حصہ ہیں' 'قریوں' (انسانی بستیوں) کے 'اہلاک' اور 'تدمیر' (مکمل تباہی) کا خدائی قانون بیان ہوا ہے' اور نہایت اجمال و اختصار کے ساتھ' صرف پندرہ میں لفظوں میں' یہ بتایا گیا ہے کہ کسی بستی یا قوم کی ہلاکت جب وقوع میں آتی ہے تو اس سے پہلے کیا کیا مراحل گذر چکے ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بات صرف اسی ایک آیت میں بیان نہیں فرمائی گئی ہے' بلکہ اور بھی بے شمار مقامات پر اس کا ذکر موجود ہے' اور ذکر بھی ایسا جو پوری طرح واضح اور مفصل ہے۔ اس لیے اس آیت کے اجمال کی شرح و تفصیل معلوم کرنے کے لیے ہمیں لازماً قرآن کریم کے انہی تفصیلی بیانات کو دیکھنا پڑے گا' اور ضروری ہوگا کہ انہی کو اس کی شرح و تفسیر سمجھیں۔ ہلاکت اقوام کے خدائی قانون کی جو تفصیلات دوسرے مقامات پر موجود ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ جب کوئی قوم خدا فراموشی اور کفر و شرک میں غرق ہو جایا کرتی تھی تو اللہ تعالیٰ اس کی ہدایت کے لیے اپنا پیغمبر بھیجتا' جو انھیں اس کی بندگی اور طاعت کی دعوت دیتا۔ قوم کے سربرآوردہ لوگ اس پیغمبر اور اس دعوت کی مخالفت پر آمادہ ہو جاتے' جس پر انھیں سمجھانے اور ان کے دل میں عبدیت کا گداز پیدا کرنے کی ہر وہ کوشش کی جاتی جو کی جا سکتی تھی۔ مگر ان کا جذبۂ مخالفت ان کوششوں کا الٹا ہی اثر قبول کرتا' اور روز بروز اور زیادہ تیز ہوتے چلے جاتے۔ یہاں تک کہ جب ان کے راہ راست پر آنے کی ساری امیدیں منقطع ہو جاتیں تو نبی اپنے ساتھی اہل ایمان کے ساتھ اس بستی سے ہجرت کر جاتا' اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ اپنا عذاب بھیج کر اسے تہس نہس کر کے رکھ دیتا ــــ قانون ہلاکت کی یہ تفصیل' جو آپ کو قرآن حکیم کے اندر ایک دو نہیں بیسیوں جگہ مذکور ملے گی' اس حقیقت کا صاف صاف اظہار کر رہی ہے کہ آیت زیر بحث میں جس 'امر' (حکم دینے) کا ذکر ہے اس سے مراد بندگی رب و طاعت الٰہی کا 'امر' ہے' نہ کہ کسی اور بات کا امر۔ چنانچہ خود اسی آیت سے پہلے والی آیت میں بھی ٹھیک یہی بات ایک اور انداز میں بیان کرتے ہوئے فرمایا جا چکا ہے کہ "ہم عذاب ہلاکت نازل نہیں کیا کرتے جب تک کہ کوئی پیغمبر نہ بھیج لیں"۔ (وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُولًا)

ظاہر ہے کہ جب تک کوئی پیغمبر نہ بھیج لیں " کہنا دراصل یہ کہنا ہے کہ جب تک لوگوں کو حق و ہدایت کی تلقین نہ کرلیں اور انھیں اپنی طاعت و بندگی کا حکم نہ دے لیں ۔

یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ قرآن مجید نے انبیائی دعوتوں کے رد و انکار کو صراحۃً 'فسق' سے بھی تعبیر کیا ہے مثلاً كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (یونس)

(۳) جس بنا پر " اَمَرْنَا " کا ترجمہ "ہم فسق کا (تکوینی) حکم دیتے ہیں" کیا گیا ہے وہ کوئی وزن نہیں رکھتی۔ کہا یہ گیا ہے کہ اس آیت میں آمَرْنَا (ہم حکم دیتے ہیں) کہنے کے بعد 'ماموربہ' کا (یعنی اس چیز کا جس کا کہ حکم دیا جاتا ہے) ذکر حذف کر دیا گیا ہے۔ اب جب ہم یہ متعین کرنا چاہیں گے کہ یہ ماموربہ کیا ہے تو عربی اصول زبان کی رو سے یہ ماموربہ 'فسق' ہی ہو سکے گا۔ کیونکہ اصولی طور پر کوئی لفظ اسی وقت حذف کیا جاتا ہے جب اس کی نشان دہی کے لیے کوئی واضح قرینہ موجود ہو' اور 'امر' کے محذوف کیے ہوئے ماموربہ کا قرینہ' عام استعمالات کو دیکھتے ہوئے وہ فعل ہوا کرتا ہے جو اس کے بعد آتا ہے۔ مثلاً جب یہ کہا جائے کہ امرناھم فقاموا" (ہم نے انہیں حکم دیا اور وہ کھڑے ہوگئے) تو اس کا مطلب صراحۃً یہی ہوگا کہ 'ہم نے انھیں کھڑے ہونے کا حکم دیا اور وہ کھڑے ہو گئے' یعنی اس عربی جملے میں 'امرنا' کا جو ماموربہ محذوف ہے اس کی نشان دہی اور تعیین بعد میں آنے والے فعل 'قاموا' سے ہو جاتی ہے اور سننے والا سمجھ جاتا ہے کہ یہاں 'امرناھم' کے بعد 'بِالْقِيَامِ' محذوف ہے۔ اس عام ضابطے سے صرف ایک صورت مستثنیٰ ہے' اور وہ یہ کہ یہ بعد والا فعل 'معصیت' کے مصدر سے نکلا ہوا کوئی فعل ہو۔ مثلاً یوں کہا گیا ہو کہ امرناھم فعصوا (ہم نے انھیں حکم دیا اور انھوں نے نافرمانی کی) ایسی حالت میں 'فعصوا' کے قرینے سے 'امرنا' کا ماموربہ 'عصیان' یا 'معصیت' قرار نہ دیا جائے گا۔ کیونکہ 'معصیت'، 'امر' کی ضد ہے' اور یہ بالکل مہمل بات ہے کہ کوئی شخص کسی کو حکم دے کہ میری حکم عدولی اور نافرمانی کرو۔ اس ایک صورت کے سوا دوسرے کسی بھی موقع پر 'امر' کا ماموربہ اگر محذوف ہو تو اس کی تعیین بعد والے فعل ہی سے کی جاتی ہے' یعنی یہ ماموربہ اسی فعل کا مصدر ہوا کرتا ہے۔ اس لیے جب اس آیت میں اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا " فرما کر ماموربہ کا ذکر نہیں کیا گیا اور اس کے بعد " فَفَسَقُوْا " کہا گیا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہاں اَمَرْنَا کا جو ماموربہ محذوف ہے وہ 'فسق' ہی کا لفظ ہے' اور اس لیے آیت کا ترجمہ یا مطلب یہ ہوا کہ "جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کے خوش حال لوگوں کو فسق کرنے کا حکم دیتے ہیں اور وہ اس کے اندر فسق کرتے ہیں الخ" ——— یہ ہے اس استدلال کی

پوری تفصیل جو 'اَمَرْنَا مُتْرَفِیْھَا' کا یہ ترجمہ اور مطلب بیان کرنے کے سلسلے میں پیش کیا گیا ہے، لیکن تھوڑے ہی سے غور کے نتیجے میں اس استدلال کی غلطی واضح ہو جاتی ہے۔ جب یہ تسلیم ہے کہ اگر 'امر' کے بعد آنے والا فعل 'معصیت' کے مصدر سے بنا ہوا کوئی فعل ہو تو ایسی حالت میں 'امر' کا محذوف "مامور بہ 'معصیت' نہیں ہو سکتا، تو پھر اس آیت میں 'اَمَرْنَا' کا محذوف 'مامور بہ' 'فسق' کیسے ہو سکتا ہے، جب کہ 'معصیت' اور 'فسق' تقریباً ایک ہی معنی رکھتے ہیں؟ کیونکہ فسق کے معنی بھی 'خروج عن الطاعۃ' (طاعت سے باہر نکل جانے) کے ہوتے ہیں۔ 'طاعت سے باہر نکل جانا' اور 'نافرمانی کرنا' اپنے الفاظ کے لحاظ سے دو ہیں، معنی اور حقیقت کے لحاظ سے ہرگز دو نہیں ہیں۔ چنانچہ قرآن نے جس طرح امر خداوندی کی خلاف ورزی کے لیے 'معصیت' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اسی طرح 'فسق' کا لفظ بھی استعمال کیا ہے۔ مثلاً 'فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّہٖ' سورۂ کہف (وہ اپنے رب کے حکم سے سرتابی کر گیا) اس لیے 'امر' کی ضد ہونے کی وجہ سے جس طرح 'معصیت' 'امر' کا مامور بہ نہیں ہو سکتا اسی طرح فسق بھی نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ایک پہلو سے تو اس معاملے میں فسق کا لفظ معصیت کے لفظ سے بھی آگے ہے' اور وہ اس طرح کہ قرآن مجید کے عام استعمالات کی روشنی میں فسق کے معنی صرف مطلق نافرمانی کے نہیں دکھائی دیتے' بلکہ ایسی نافرمانی اور حکم عدولی کے دکھائی دیتے ہیں جو 'فرمان' سے پوری طرح باخبر ہو کر اور 'حکم' کو اچھی طرح سمجھ کر کی جائے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ 'فسق' کا 'امر' کی ضد ہونا 'معصیت' سے بھی زیادہ واضح اور نمایاں ہے۔ ایسی حالت میں خود قواعد زبان کا تقاضا یہی ہوگا کہ آیت زیر بحث میں 'اَمَرْنَا' کا مامور بہ فسق ہرگز نہ قرار دیا جائے۔

رہی یہ بات کہ پھر 'اَمَرْنَا' کا مامور بہ کس دلیل سے 'طاعت' یا 'عبدیت' متعین کیا جا سکتا ہے؟ جب آیت میں ان امور کی طرف اشارہ کرنے والا کوئی قرینہ موجود نہیں ہے، تو چاہے اس آیت کے اندر قرینہ موجود نہ ہو، مگر پورا قرآن اس قرینے سے بھرا پڑا ہے۔ اس کے صفحے صفحے سے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اللہ جب اپنے بندوں کو حکم دیتا ہے تو وہ حکم کس بات کا ہوا کرتا ہے؟ غرض یہاں 'اَمَرْنَا' کا جس قرینے سے حذف کیا گیا ہے وہ یہ حقیقت تھی کہ یہ مامور بہ بجائے خود واضح اور پہلے ہی سے معلوم

صدر الدین اصلاحی

اسلامی حکومت کے قیام کی جدوجہد

سوال :۔ ماہنامہ میثاق (لاہور) کے جون کے شمارے میں ایک مراسلہ اور اس کا جواب شائع ہوا ہے۔ مراسلہ نگار نے 'میثاق' کے فاضل مدیر مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کی کسی گزشتہ تحریر سے یہ جملہ نقل کر کے کہ "حکومت اسلامی کا قیام ایک آزاد اسلامی معاشرے کی ذمہ داری ہے" اور پھر یہ واضح کرتے ہوئے کہ "مجھے آپ کی یہ بات بہت صحیح معلوم ہوتی ہے" ان سے ان کے اس خیال کے دلائل پوچھے تھے۔ جب انھیں اپنے اس استفسار کا جواب موصول ہوا تو انھوں نے اسے تشنہ قرار دیتے ہوئے مولانا کو پھر لکھا کہ "اصل میں یہ بات کہ حکومت اسلامی کا قیام ایک آزاد اسلامی معاشرے کی ذمہ داری ہے' اس کے کچھ متعلقات ہیں، جو نظریاتی طور پر پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً اس کا مطلب یہ ہے کہ اجتماعی قوانین اور شرعی حدود کے نفاذ کا مخاطب صرف مسلمانوں کا وہ گروہ ہے جو آزاد اور با اختیار حیثیت کا حامل ہو۔ متفرق اور غیر آزاد اہل ایمان کے اوپر اس کی تکلیف نہیں ہے۔ اور جب وہ اس کے مخاطب ہی مکلف نہیں ہیں تو اس کا مطلب یہ بھی ہوا کہ ان کے اوپر یہ ذمہ داری بھی نہیں ہے کہ وہ جد و جہد کر کے وہ حالات پیدا کریں جب وہ اس قسم کے احکام کو نافذ کر سکیں۔ اسی مخصوص پہلو کے اعتبار سے اس معاملے میں آپ کا استدلال جاننا چاہتا تھا اگر ممکن ہو تو تحریر فرمائیں۔" مولانا نے اس کے جواب میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جن ممالک میں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں اسلامی حکومت کے قیام کو مقصد و نصب العین قرار دے کر کوئی تحریک چلانا بہت غلط بلکہ شدید جہالت ہے۔

اس سوال و جواب کے سلسلے میں دو اہم باتیں دریافت طلب ہیں۔ ایک تو یہ کہ مراسلہ نگار نے مولانا کے الفاظ سے جو نتیجہ اخذ کیا ہے اور ان کے جملے کا جو مطلب بیان کیا ہے وہ کہاں تک صحیح ہے۔ دوسری یہ کہ خود مولانا کا یہ ارشاد کہاں تک درست ہے کہ کسی مسلم اقلیت کو اسلامی حکومت کے قیام کی دعوت ہرگز نہ اٹھانی چاہیے۔

جواب :۔ مولانا کا یہ ارشاد کہ "حکومت اسلامی کا قیام ایک آزاد اسلامی معاشرے کی ذمہ داری ہے" ایک ایسی روشن حقیقت ہے جس سے انکار یا اختلاف کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہو سکتا۔ شریعت کا یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ جو کام انسان کے بس سے باہر ہو اس کی بجا آوری کا وہ ذمہ دار نہیں

ٹھیرتا (لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا - الآیۃ) ظاہر بات ہے کہ حکومت کا قائم کرلینا صرف ایسے ہی لوگوں کے بس کی بات ہوتی ہے جو اپنی مرضی کے آپ مالک ہوں اور جن کی اجتماعی زندگی کا نظم و نسق کلیۃً ان کے اپنے ہی ہاتھوں میں ہو۔ اس لیے محکوم اور غیر آزاد مسلمان اس بات کے مکلف اور ذمہ دار نہیں قرار پاسکتے کہ اپنے سارے معاملات زندگی کو دینی احکام و قوانین کے مطابق انجام دینے کے لیے اسلامی حکومت قائم کرلیں، اس کے مکلف اور ذمہ دار صرف آزاد و خود مختار مسلمان ہی ہوسکتے ہیں۔

لیکن مراسلہ نگار نے مولانائے محترم کے اس ارشاد سے 'مطالب' اخذ کرنے کی جو کوشش کی ہے، وہ ایک زبردستی کی کوشش ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو ہیں خود ان کے اپنے نظریات، لیکن مولانا کے ان لفظوں کو شاہد اور 'شفیع' بنا کر وہ انھیں یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ یہ آپ کے نظریات ہیں۔ چنانچہ وہ مولانا سے یہ نہیں پوچھتے کہ آپ کے اس ارشاد سے میں نے مزید 'مطالب' کا جو استنباط کیا ہے وہ کہاں تک صحیح ہے، بلکہ یہ پوچھتے ہیں کہ" .... اسی مخصوص پہلو کے اعتبار سے اس معاملے میں آپ کا استدلال جاننا چاہتا تھا" گویا ان کے نزدیک یہ بات تو کسی بحث و تحقیق کی ضرورت سے یکسر بالاتر تھی کہ مولانا کے مذکورہ ارشاد کے 'مطالب' اور 'متعلقات' خود ان کے نزدیک بھی وہی ہیں جو مراسلہ نگار نے سمجھے ہیں! اس لیے دریافت طلب بات اگر کوئی رہ گئی ہے تو صرف یہ کہ اس معاملے میں ان کا استدلال کیا ہے، لیکن مولانا نے ان کے اس خیال کی کہاں تک توثیق فرمائی ہے، اس کا اندازہ ان کے جواب کے ان فقروں سے لگا لیجیے:-

> "یہ خیال نہ فرمایئے کہ جس وقت ایک داعی ایک غیر اسلامی معاشرے میں ایمان و اسلام کی بنیادی اور تعمیری دعوت شروع کرتا ہے تو وہ دین کے دوسرے اجتماعی و سیاسی معاملات کو نظر انداز کرتا ہے، یا اپنے آپ کو وہ ان کا مخاطب یا مکلف نہیں سمجھتا، یا وہ ان کے نفاذ کے لیے حالات پیدا کرنے کی جدوجہد نہیں کرتا۔ وہ اپنے اسی تعمیری اور تمہیدی کام کے ساتھ یہ سارے کام کر رہا ہوتا ہے۔ لیکن وہ جانتا ہے کہ میں دین کے ان مطالبات کا مخاطب و مکلف اپنی انفرادی حیثیت میں یا اس حالت میں نہیں ہوں جب کہ میں اپنے گرد و پیش صرف کچھ منتشر افراد رکھتا ہوں، بلکہ صرف اسی صورت میں ہوں جب اس دعوت سے ایک ایسا منظم اور با اختیار معاشرہ وجود میں آجائے جو ان مطالبات کے اجراء و تنفیذ کے لیے مؤثر اقدام کرسکے۔ اس سے پہلے کی ساری جدوجہد اس کے اسی آخری منصوبے

کی تمہید ہوتی ہے لیکن وہ جانتا ہے کہ اس آخری سرحد تک پہنچنا خدا کے فضل و رحمت پر منحصر ہے ......
اللہ تعالیٰ اگر چاہتا ہے تو اس کی جد و جہد کو آخری منزل تک بھی پہنچاتا ہے الخ (میثاق ص۵۲، ۵۱)

یہ الفاظ صاف بتاتے ہیں کہ مراسلہ نگار نے مولانائے محترم کے 'قول' کی جو 'تفسیر' کی تھی، اس کی توثیق پر وہ تیار نہیں ہیں، جیسا کہ ہونا بھی نہیں چاہیے تھا۔ مراسلہ نگار صاحب ان کے ارشاد کا 'مطلب' یہ نکالے بیٹھے تھے کہ متفرق اور غیر آزاد مسلمان شریعت کے اجتماعی قوانین کے کسی درجے میں بھی نہ تو مخاطب ہیں نہ مکلف، اور نہ ان کے اوپر اس بات کی کوئی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسے حالات پیدا کرنے کی جد وجہد کریں جن کے اندر ان قوانین کا نفاذ ہو سکے۔ لیکن مولانا فرماتے ہیں کہ جس وقت ایک داعی ایک غیر اسلامی معاشرے میں دین کی بنیادی دعوت دے رہا ہوتا ہے اس وقت بھی دین کے اجتماعی و سیاسی مطالبات اس کی نظر میں ہوتے ہیں وہ اپنے کو ان کا مخاطب و مکلف سمجھتا ہے، اور ان کے نفاذ کے لیے مطلوبہ حالات پیدا کرنے کی جد وجہد کر رہا ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ غیر آزاد اہل ایمان بھی دین کے اجتماعی احکام کے مخاطب اور مکلف ہیں، اس معنی میں کہ انھیں ایسے حالات پیدا کرنے کی جد وجہد کرنی چاہیے جو ان احکام کے نفاذ کے لیے ضروری ہیں۔ یہی نہیں، مولانا یہاں تک صراحت کرتے ہیں کہ ایسے حالات کا پیدا کرنا ہی، جب اسلام کے اجتماعی قوانین اور سیاسی مطالبات کا اجراء و تنفیذ عمل میں آسکے، یعنی اسلامی حکومت قائم ہو جائے، داعی کی "آخری منزل" اور "آخری سرحد" ہوتی ہے اور اس کی اب تک کی ساری جد وجہد دراصل تمہید ہوتی ہے اسی "آخری منصوبے"۔

حقیقت یہ ہے کہ ایسا کوئی شخص بھی، جو اسلام کو سمجھتا اور قرآن سے واقفیت رکھتا ہو، یہ سمجھنے سے قاصر رہے گا کہ اسلام کے اجتماعی اور سیاسی احکام سے غیر آزاد اہل ایمان کا کوئی ایمانی تعلق باقی نہیں رہ جاتا اور ان کی نگاہ میں ان کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ ایسا وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس کا ذوق شعوری یا غیر شعوری طور پر، خدا پرستی کے قرآنی تصور کے بجائے ویدانت اور رہبانیت کے تصور سے عقیدت رکھتا ہو۔

اب اس دوسرے مسئلے کو لیجیے کہ کسی غیر اسلامی حکومت کی مسلم اقلیت کے لیے اسلامی حکومت کے قیام کی دعوت کا اٹھانا کیسا ہے؟ اس سلسلے میں سب سے پہلے تو یہ عرض کروں گا کہ مولانائے محترم کی رائے اس بارے میں لفظوں کے اندر جتنی شدید ہے، فی الواقع بھی اتنی شدید ہرگز نہیں کہی جا سکتی۔ کیونکہ ہمارے سامنے مولانا کے صرف یہی الفاظ نہیں ہیں، بلکہ وہ الفاظ و ارشادات بھی ہیں جن کا حوالہ ابھی اوپر دیا جا چکا ہے۔ ان ارشادات میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ موصوف ان لوگوں میں نہیں ہیں جو غیر آزاد مسلمانوں کے حق میں

دین کے اجتماعی احکام اور سیاسی مطالبات کے وجود و عدم دونوں کو برابر سمجھتے اور انھیں ان کے بارے میں ہر طرح کی ذمہ داری سے آزاد خیال کرتے ہیں، بلکہ اُن لوگوں میں ہیں جو انھیں ان احکام و مطالبات دین کے لیے قابلِ نفاذ حالات پیدا کرنے کی جد و جہد کا مکلف اور ذمہ دار یقین کرتے ہیں، جنھیں اس بارے میں کوئی شک نہیں کہ اسلامی نظامِ حکومت کی اقامت ہی ان مسلمانوں کی دعوتی سرگرمیوں کی "آخری منزل" اور "آخری سرحد" ہوتی ہے، اور جنھیں اس بارے میں شرحِ صدر حاصل ہے کہ "حکومتی اقتدار عین اس کی (یعنی اسلام کی) فطرت کا تقاضا ہے" (میثاق جنوری ۶۳ء ص۳۲) ان ساری باتوں کی موجودگی میں یہ کیسے مانا جا سکتا ہے کہ مولانا کے زیرِ بحث الفاظ ان کی واقعی رائے سے پوری پوری مطابقت رکھتے ہیں! جب ایک شے کے داعی کا واقعی نصب العین ہونے میں کوئی کلام نہیں، تو اس کی اس حیثیت کے اعلان و اعتراف کو "شدید جہالت" کے لفظوں سے تعبیر کرنا لفظوں ہی کی شدت سمجھا جائے گا معنی کی نہیں۔

رہی یہ بات کہ مولانائے محترم کی یہ رائے بجائے خود کہاں تک درست ہے، تو نہایت ادب سے یہ عرض کرنا پڑ رہا ہے کہ اس کا مطلقاً درست ہونا قابلِ قبول نہیں ہے۔ بعض مخصوص اور غیر معمولی حالات کی بات تو دوسری ہے، مگر عام حالات میں اتنی "احتیاط" اور "رُد و ربنی" مسلمان کے شایانِ شان ہرگز نہیں ہو سکتی۔ بلاشبہہ عام حالات میں بھی فضا پر خطرات کی گھٹائیں برابر چھائی رہتی ہیں، مگر یہ فضا تو اس وقت بھی صاف نہیں رہ سکتی جب اسلامی نظامِ حکومت کا نام نہ لیا جائے اور "ایمان و اسلام کی صرف بنیادی دعوت" اور "اللہ کی بندگی اور اس کی اطاعت" کی صرف سادہ تبلیغ ہی تک بات محدود رکھی جائے، بشرطیکہ یہ دعوت و تبلیغ اس واشگاف انداز میں کی جائے جس کا کلامِ الٰہی اور اسوۂ انبیاء تقاضا کرتا ہے چنانچہ واقعات و تجربات گواہ ہیں کہ کسی غیر مسلم کا دعوتِ حق سے متاثر ہو کر مسلمان اور پیروِ قرآن بن جانا کبھی آسانی سے برداشت نہیں کیا جاتا۔

پھر عملی حیثیت سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ ذہن میں تو ایک اسلامی نظامِ حکومت کے قیام کو اپنی منزلِ مقصود سمجھنا اور اس کے لیے جد و جہد بھی کرنا، لیکن زبان سے اس کا اظہار نہ ہونے دینا کوئی قابلِ عمل بات نہیں۔ کیونکہ "اللہ کی بندگی اور اس کی اطاعت" کی قرآنی دعوت کوئی ایسی دعوت نہیں جو دعوتی معاملے صرف عقائد و عبادات ہی کی بحث و گفتگو تک محدود رہنے دے، بلکہ وہ لازماً اجتماعی اور سیاسی احکام

تک پہنچ کر رہے گی۔ خصوصاً ملک کے ذہین اور اونچے طبقے (ملأ القوم) سے تو، جو دعوت دین کے اولین مخاطب ہوتے ہیں، یہ حقیقت ہرگز چھپی نہیں رہ سکتی کہ "اسلام صرف مسجد کا دین نہیں ہے بلکہ حکومت کا بھی دین ہے" اور یہ کہ "اسلام صرف عقائد و عبادات ہی پر مشتمل نہیں ہے، بلکہ وہ ہماری پوری انفرادی و اجتماعی زندگی کی تنظیم کرتا ہے، اس وجہ سے حکومتی اقتدار عین اس کی فطرت کا تقاضا ہے"۔ قرآن کریم کا ایک سرسری مطالعہ بھی ان پر اسلام کی یہ حیثیت اور دعوت اسلام کی واقعی منزل مقصود پوری طرح عیاں کر کے رکھ دے گا۔ یعنی جو بات ہم اپنی زبان سے نہ کہیں گے وہ اسے اپنے کانوں سے خود بخود سن لیں گے، اور اس وقت ہم آنے والے خطرات اور 'خبط و جنوں' کے طعنوں سے اپنے کو ہرگز محفوظ نہ کر سکیں گے، الّا آنکہ ان کے سامنے یہ صفائی پیش کر دیں کہ اس قرآن میں آپ حضرات یہ جو سیاست و حکومت کی باتیں بھی دیکھتے ہیں وہ دین اور اسلام نہیں ہیں، اور "اللہ کی بندگی اور اس کی طاعت" کے یہ معنی بالکل نہیں ہیں کہ ان احکام و قوانین کو بھی واجب الاتباع سمجھا جائے۔ لیکن ظاہر ہے کہ مولانا بھی اس صفائی کو کفر ہی قرار دیں گے۔ اب غور کرنے کی بات ہے کہ جو حقیقت اگلی صبح ہوتے ہی ہم سے لازماً قبول کرائی جانے والی ہو اس کو ایک سیدھے سادے مسلمان کی طرح آج ہی لوگوں پر خود واضح کر دینا کون سی بے عقلی ہے؟

یہ تو مسئلے کا ایک پہلو ہوا، اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ حق کا نصب العین کوئی چھپانے کی چیز نہیں ہوتی۔ اس کا تو فطری تقاضا ہی یہ ہوتا ہے کہ اسے صاف لفظوں اور بہتر سے بہتر انداز میں متعارف کرا دیا جائے۔ اس کے بغیر نہ تو اس کی طرف لوگوں کو بلایا جا سکے گا اور نہ مطلوبہ جد و جہد ہی کی جا سکے گی۔

اس سلسلے میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق دعوت سے کسی الجھن میں نہ پڑنا چاہیے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ آپ نے جب اپنی دعوت شروع کی تو اس کا عنوان صراحت کے ساتھ حکومت الٰہیہ کا قیام نہیں قرار دیا تھا۔ مگر ساتھ ہی یہ بات بھی غلط نہیں کہ اس دعوت کا عنوان لفظوں میں یہ نہ ہونے کے باوجود معناً یہی تھا، اور جب آپ نے لوگوں سے کہا کہ 'اللہ کی بندگی کرو' تو یہ دراصل ایک ایسی جامع بات تھی جس کے اجمال کی شرح پوری انسانی زندگی کو احکام خداوندی کے تحت دے دینے اور ایک الٰہی نظام حکومت کے قیام کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ لیکن چونکہ ابھی یہ احکام خداوندی نازل ہونے والے تھے، نازل شدہ حالت میں موجود نہ تھے۔ اس لیے قدرتی طور پر اس 'شرح' کے باضابطہ اظہار و اعلان کا یہ کوئی

ناسب موقع بھی نہ تھا۔ مگر آج صورت واقعہ بالکل دوسری ہے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ کے یہ ہمہ گیر احکام نازل
شدہ حالت میں موجود ہیں، اور اللہ ہی کی طاعت و بندگی کرنے کے اجمال کی شرح نامعلوم اور کسی نزولِ
ہی پر موقوف نہیں رہ گئی ہے، بلکہ ساری دنیا جان چکی ہے کہ یہ شرح کیا ہے؟ اس لیے اگر اس وقت
بندگی رب کی قرآنی دعوت دی جائے تو اس سلسلے میں اسوۂ نبوی کی پیروی کا تقاضا یہ ہرگز نہ ہوگا کہ اب
بھی اس اجمال کو اجمال ہی باقی رکھا جائے، اور اس کی شرح کو زبان پر لانے سے گریز کیا جائے۔

البتہ یہ بھی ایک حقیقت ہے، جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا، کہ 'اسلامی یا الٰہی حکومت' کی اصطلاح
بڑی شدید غلط فہمی پیدا کر سکتی ہے۔ چنانچہ تجربہ بتاتا ہے کہ غیر مسلم ہی نہیں، کتنے ہی اچھے خاصے اور پڑھے
لکھے مسلمان بھی اس غلط فہمی کا شکار ہیں۔ کہیں اسلامی حکومت کو مسلم حکومت کے مرادف سمجھ لیا جاتا ہے۔ تو
کہیں اس کے قیام کی دعوت کو اسلام کے صرف سیاسی ڈھانچے کے قائم کرنے کی دعوت خیال کر لیا جاتا ہے۔
اس لیے اس صورت حال کا تقاضا یہ ہے کہ اس اصطلاح کے بجائے 'اقامت دین' کی اصطلاح استعمال
کی جائے، جو ہر لحاظ سے موزوں ترین اصطلاح ہے۔

آخر میں ایک بات اور بھی عرض کر دینے کی ہے۔ اسلامی حکومت کے قیام کو اپنا نصب العین قرار دینا
ایک الگ بات ہے، اور اس کے حصول کے لیے صحیح طریق کار اور موزوں تدابیر کا اختیار کرنا بالکل دوسری
بات ہے۔ اگر کوئی داعی گروہ اپنے طریق کار کی غلطی کی وجہ سے اپنے اس صحیح نصب العین کے مستقبل کو
غارت کر لے تو اس کے معنی یہ ہرگز نہ ہوں گے کہ یہ نصب العین ہی غلط تھا لیکن یہ علیحدہ مسئلہ ہے کہ اس
نصب العین کے حصول کا صحیح طریقہ کیا ہے، اور اس وقت یہ مسئلہ ہماری اس بحث سے باہر ہے۔

(صدر الدین اصلاحی)

اخبار و افکار :-

مغربی پاکستان اسمبلی نے

عائلی قوانین کو منسوخ کرنے کی سفارش منظور کر لی

لاہور۔ ۳ جولائی ۱۹۶۳ء

مغربی پاکستان اسمبلی نے آج بھاری اکثریت سے یہ قرارداد منظور کر لی کہ صوبائی حکومت مرکزی حکومت سے عائلی قوانین کا آرڈی ننس منسوخ کرنے کی سفارش کرے۔ یہ سفارش ایک غیر سرکاری قرارداد پر کی گئی جو حزب مخالف کے رکن راؤ خورشید علی خاں کی طرف سے پیش کی گئی تھی۔ جب یہ قرارداد پیش کی گئی تو ایوان کے دونوں طبقوں نے بلالحاظ جماعت، قرارداد کے حق اور مخالفت میں حصہ لیا۔ سرکاری پارٹی کی اکثریت نے قرارداد کے حق میں تقریریں کیں۔ اسمبلی کی خاتون ارکان نے قرارداد کی سخت مخالفت کی اور جب انھوں نے اپنی آواز کو مؤثر نہ پایا تو وہ احتجاجاً واک آؤٹ کر گئیں اور تھوڑی دیر بعد واپس آ گئیں۔

(روزنامہ وفاق سرگودھا۔ لائل پور، ۴ جولائی ۱۹۶۳ء)

یہ چھوٹی سی خبر اپنے اندر ایک ہنگامہ خیز پس منظر رکھتی ہے۔ ڈھائی گھنٹے کی گرما گرم بحث میں موافقین و مخالفین کی طرف سے کیا کچھ کہا گیا۔ اسمبلی کی خاتون ارکان سے کیا سوالات و جوابات ہوئے، اپوا اور دیگر سماجی اداروں کی "ماڈرن خواتین" نے اس مسئلے سے کیا دلچسپی لی اور قرارداد منظور ہو جانے کے بعد انھوں نے کیا حرکتیں کیں، ان سب کی تفصیل یہاں پیش کرنا لاحاصل ہے۔ میں یہاں صرف چند تقریروں کے اقتباسات دے رہا ہوں۔

راؤ خورشید علی خاں رکن جماعت اسلامی نے قرارداد پیش کرتے ہوئے کہا :-

عائلی قوانین قرآن حکیم اور سنت نبوی کے منافی ہیں۔ موجودہ عائلی قوانین کی تنسیخ سے متعلقہ قرارداد کسی صورت میں بھی خواتین کے حقوق پر چھاپہ نہیں۔ یہ قوانین، مغربی تہذیب کی دلدادہ چند مغرب زدہ

خواتین کے احتجاج پر بنائے گئے تھے۔ یہ احتجاج سابق وزیر اعظم محمد علی بوگرہ مرحوم کی دوسری شادی پر ہوا تھا۔ رائے خورشید علی خاں نے عائلی کمیشن کی تشکیل پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ کمیشن میں کوئی عالم دین شامل نہیں ہوا تھا۔ ممکن ہے وہ دنیوی علوم میں بڑے قابل ہوں لیکن ان کو دین کا کوئی علم نہیں۔ مولانا احتشام الحق کو کمیشن میں دینی امور کے بارے میں مشورے کے لیے شامل کیا گیا تھا اور انھوں نے اپنے اختلافی نوٹ میں کمیشن کی رپورٹ کی زیر زبر تک سے اختلاف کیا تھا۔ انھوں نے کہا جب اس کمیشن کی رپورٹ شائع ہوئی تو پاکستان بھر میں اس کے خلاف احتجاج کیا گیا۔ ۱۹۵۶ء تک کسی بھی حکومت کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ ایسا قانون نافذ کرتی لیکن ۱۹۵۸ء میں صدر مملکت پر زور ڈالا گیا کہ وہ خصوصی اختیارات سے کام لے کر ان قوانین کو نافذ کریں۔ صدر نے شروع میں کچھ ہچکچاہٹ ظاہر کی لیکن بعد میں یہ قوانین نافذ کر دیے اور ایک اخباری بیان میں یہ بات واضح کر دی کہ جمہوریت کی بحالی کے بعد اس میں رد و بدل کیا جا سکتا ہے ——

انھوں نے خواتین کے حقوق کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے علما اور ماہرین قانون پر مشتمل ایک کمیشن قائم کرنے کا مطالبہ کیا اور کہا کہ اس کمیشن کی رپورٹ پر عوام کی رائے معلوم کرنے کے بعد اسے قانونی شکل دی جائے۔ آپ نے کہا "مسلمان اپنی جان و مال کی قربانی دے سکتا ہے لیکن دین کا حلیہ بگاڑنے کی اجازت نہیں دے سکتا"

انھوں نے تعدد ازدواج کے سلسلے میں انبیاء کرام، صحابہ، تابعین اور صلحائے امت کے عمل کو ثبوت میں پیش کیا۔

رائے خورشید علی صاحب کی اس تقریر سے پاکستان کے موجودہ عائلی قوانین کی رپورٹ اور اس کے نفاذ کا پس منظر اجمالاً معلوم ہو جاتا ہے۔ موجودہ عائلی قوانین کی حمایت میں سب سے زیادہ مفصل تقریر میاں عبداللطیف نے کی۔ یہاں ان کی تقریر کے چند اقتباسات دیے جا رہے ہیں۔

میاں عبداللطیف نے اپنی تقریر میں کہا۔ عائلی قوانین میں رجسٹریشن کے قانون پر اعتراض کیا جا رہا ہے حالانکہ یہ رجسٹریشن پاکستان کے علاوہ مصر، لبنان، عراق اور دوسرے اسلامی ممالک میں رائج ہے، کیا وہ اسلامی ممالک نہیں ہیں؟

آپ نے تعدد ازدواج کے مسئلے پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ قرآن کریم میں دوسری شادی کے لیے بعض شرائط ہیں۔ قرآن پاک میں یہ واضح ہے کہ اگر یتیموں کے ساتھ اچھا سلوک نہ کر سکو تو ان کی بیوہ ماؤں

سے شادی کرلو۔ظاہر ہے کہ اس کی اجازت کے سلسلے میں پہلے یتیموں کے ساتھ سلوک کی شرط ہے۔ دوسری شادی بیواؤں کے ساتھ ہونی چاہیے کم عمر لڑکیوں سے نہیں۔ یہ نہیں کہ جب چاہا بیوی کو طلاق دی اور ایک اور شادی کرلی۔ میاں عبداللطیف نے قرآن پاک سے حوالہ دیتے ہوئے کہا۔" سوال یہ ہے کہ دو عورتوں میں ایک مرد کس طرح انصاف کرسکتا ہے؟ سوال صرف دولت گھر یا جائداد کی برابر کی تقسیم نہیں۔سوال یہ ہے کہ آپ دونوں کا مساوی خیال کس طرح رکھ سکتے ہیں۔ایک کم عمر اور دوسری زیادہ عمر کی ہے۔ پھر بتایئے کہ آپ دونوں کا برابر سے کس طرح خیال کرسکتے ہیں۔

آپ نے کہا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیاہی گئی تھیں۔ایک شخص نے اپنی بیٹی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو دینی چاہی اور اس کی اجازت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کرنی چاہی۔ رسول کریمؐ نے فوراً کوئی جواب نہ دیا اور کچھ دن ٹھہر کر ممبر پر کھڑے ہوکر فرمایا " اگر علی دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں تو پہلے وہ میری بیٹی کو طلاق دے دیں۔ فاطمہ میرے دل کا ٹکڑا ہے۔جو اسے تکلیف دیتا ہے وہ مجھے تکلیف پہنچاتا ہے۔

میاں عبداللطیف نے کہا۔" کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ جو لوگ دوسری شادی کی حمایت کرتے ہیں کیا وہ اپنی بیٹی یا بہن پر سوت آنے کو خوش آمدید کہہ سکتے ہیں؟ ۔

مغربی تہذیب کی تقلید میں تعدد ازواج کو ناجائز قرار دینے کی سعی کرنے والے جس ٹیکنک اور " فن کاری" کا مظاہرہ کررہے ہیں۔ یہ تقریر اس کا ایک نمونہ ہے۔ زندگی کے اسی شمارے میں راقم الحروف کا مضمون" تعدد ازواج قرآن کی روشنی میں" شائع ہورہا ہے۔اس میں قرآن کی ان دلیلوں کا جائزہ لیا گیا ہے جو یہ حضرات پیش کرتے ہیں۔میاں عبداللطیف کی یہ تقریر مضمون کی کتابت کے بعد سامنے آئی ورنہ میں انہیں کے نام سے ان دلیلوں کا جائزہ لیتا۔قارئین زندگی ان کی دی ہوئی قرآنی دلیلوں کا جواب' میرے مضمون میں ملاحظہ فرمائیں۔

میاں عبداللطیف صاحب نے تعدد ازواج پر پابندی عائد کرنے کے لیے ایک دلیل حدیث سے بھی پیش کی ہے۔ناواقف لوگوں کو فریب دینے کے لیے انھوں نے اس میں اپنی " مہارت " کا ثبوت دیا ہے ۔ ابوجہل کی بیٹی سے حضرت علی نے نکاح کا جو ارادہ کیا تھا اور اس پر حضورؐ نے جو اعتراض کیا تھا اس کا تعدد ازواج کے عدم جواز یا اس پر پابندی سے دور کا تعلق بھی نہیں ہے۔اس واقعہ پر مفصل گفتگو کا یہ موقع نہیں'

یہاں تو صرف یہ دیکھ لینا چاہیے کہ میاں صاحب نے اس کو پیش کرنے میں کس "مہارت" کا ثبوت دیا ہے۔
سب سے پہلی "مہارت" تو یہ ہے کہ انھوں نے اس واقعے کو بیان کرنے میں ابوجہل کا نام بھی نہیں آنے دیا اور اس کو یوں گول کیا کہ "ایک شخص نے اپنی بیٹی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو دینی چاہی" حالانکہ وہ بیٹی ابوجہل کی تھی جو غزوۂ بدر میں مارا جا چکا تھا۔ اس لیے ظاہر ہے وہ اپنی بیٹی حضرت علی کو دینے نہیں آیا تھا۔ دوسری "مہارت" حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یہ قول منسوب کرکے دکھائی کہ "اگر علی دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں" حالانکہ یہ بات اس واقعے میں کہیں مذکور نہیں ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جملہ ہرگز نہیں فرمایا۔ حضورؐ کو اعتراض حضرت علی کی دوسری شادی پر نہ تھا بلکہ ابوجہل کی بیٹی سے شادی پر تھا۔ افسوس ہے کہ میاں صاحب کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ایک غلط قول منسوب کرنے میں ذرہ برابر بھی جھجک محسوس نہ ہوئی۔ جو شخص حضورؐ کی طرف ایک غلط بات منسوب کرنے میں اللہ سے نہیں ڈرتا وہ اگر اس واقعہ کے اصل اجزا حذف کردے تو اس پر کیا تعجب ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف صاف یہ بات فرمائی تھی کہ "میں نہ حلال کو حرام کرسکتا ہوں اور نہ حرام کو حلال کرسکتا ہوں لیکن رسول اللہ کی بیٹی اور عدو اللہ (اللہ کے دشمن) کی بیٹی دونوں ایک جگہ کبھی جمع نہیں ہوسکتیں"۔ میاں صاحب نے یہ پوری بات غائب کردی۔ اس کے علاوہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا تھا کہ اس نکاح سے مجھے اندیشہ ہے کہ فاطمہ کسی دینی فتنے میں مبتلا نہ ہوجائے۔ یہ بات بھی میاں صاحب نے حذف کردی۔ واقعہ میں کتربیونت اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ایک غلط قول منسوب کرکے ثابت کر دکھایا کہ حضورؐ نے حضرت علی کی دوسری شادی پر اعتراض کیا تھا اور اس کی علت گویا یہ تھی کہ حضورؐ کو تعدد ازواج ہی ناپسند تھا۔ کیا کہنے ہیں اس مہارت اور فن کاری کے

اصل میں یہ تجدد پسند لوگ مغربی تہذیب کو وقت کی مہذب ترین تہذیب سمجھتے ہیں۔ تعدد ازواج اس تہذیب میں ناجائز ہے اور اسلامی تہذیب میں جائز ہے۔ اب یہ بے چارے پریشان ہیں کہ کسی طرح اسلامی تہذیب میں بھی اسے ناجائز ثابت کر دکھائیں، لیکن اتنی جرأت نہیں کہ وہ اس کا اظہار کرسکیں اس لیے اپنی اس سب سے بڑی دلیل کو چھپا جاتے ہیں۔ ان کی دوسری ------------
بڑی دلیل موجودہ اسلامی ممالک کا عمل ہے۔ چنانچہ یہ لوگ اس دلیل کو بڑے زور کے ساتھ بیان کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ میاں عبد اللطیف صاحب نے بھی رجسٹریشن کے سلسلے میں (باقی صفحہ ۷ پر ملاحظہ فرمایئے

زندگی
رامپور

جلد :- ۳۱
شمارہ :- ۳

ربیع الثانی ۱۳۸۳ھ
ستمبر ۱۹۶۳ء

مدیر :- سید احمد قادری

- خط و کتابت و ارسال زر کا پتہ — منیجر "زندگی" رامپور۔ یوپی
- زر سالانہ :- ۵۔ ششماہی :- تین روپیہ۔ فی پرچہ :- پچاس نئے پیسے
- ممالک غیر سے :- دس شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر

پاکستانی اصحاب مندرجہ ذیل پتہ پر رقوم بھیجیں اور رسید ہمیں ارسال فرمائیں
منیجر ہفت روزہ "شہاب" ۱۱/C شاہ عالم مارکیٹ لاہور

مالک: جماعت اسلامی ہند۔ اڈیٹر: سید احمد عروج قادری۔ پرنٹر پبلشر: احمد حسن۔ مطبع: دہلی پرنٹنگ پریس بنگلہ آزاد خاں رامپور
مقام اشاعت :- دفتر زندگی رامپور۔ یوپی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

سید احمد قادری

بخار کے کسی مریض کا ٹمپریچر اگر ایک سو پانچ ڈگری تک پہنچ جائے یا اس سے بھی بڑھ جائے تو عارضی طور پر اس ٹمپریچر کو کم کرنے کے لیے ڈاکٹر مختلف تدبیریں اختیار کرنے کی ہدایت دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر مریض کے سر پر برف کی تھیلی رکھی جاتی ہے۔ اگر اس تدبیر سے عارضی طور پر ہی بخار کم ہو جائے تو مریض بھی کچھ آرام محسوس کرتا ہے اور تیمارداروں کو بھی خوشی ہوتی ہے لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ یہ نہ بخار کا اصل علاج ہے اور نہ اس سے شفا حاصل ہوتی ہے۔ جب تک بخار کی علت اور اس کا اصل سبب دور نہ ہو شفایابی دور ہی رہتی ہے

ادھر صدی دو صدی سے دنیا کی متحارب قوتوں کے درمیان جو معاہدے ہوتے رہے ہیں ان کی حیثیت برف کی تھیلی کے سوا اور کچھ نہیں رہی ہے۔ انسانیت آج بھی تپ زدہ ہے اور لرز رہی ہے۔ امن وسلام آج بھی مفقود اور عنقا صفت ہے

ابھی ماسکو میں "ایٹمی تجربات کے جزوی امتناع" کا جو معاہدہ ہوا ہے اس کے شور سے پوری دنیا گونج رہی ہے۔ ۱۰ دنوں کی طویل گفتگو کے بعد ۲۵ جولائی ۶۳ء کو مسٹر ہیری مین مندوب امریکہ، مسٹر گرومیکو روسی وزیر خارجہ اور لارڈ ہیلشم مندوب برطانیہ نے معاہدے پر دستخط کیے دنیا کے ایک ممتاز سیاسی رہنما نے اس معاہدے کو تاریخ عالم کا ایک اہم موڑ قرار دیا۔ ذیل میں ایک اخباری خبر کا اختصار دیا جا رہا ہے

"وزیر اعظم نہرو نے ایٹمی تجربات کے امتناع کے جزوی معاہدے کو جو ماسکو میں کل ہوا ہے، "تاریخ عالم میں ایک موڑ" قرار دیا۔ یہ تاریخی معاہدہ جس کا دنیا کو ایک طویل مدت سے انتظار تھا کل ماسکو میں سوا سات بجے شام (ماسکو ٹائم) پر ہوا۔ فرانس کے علاوہ دنیا کے تمام ملکوں نے بڑی گرم جوشی سے اس معاہدے کا خیر مقدم کیا ہے۔ معاہدہ دس روز کی طویل لیکن معقول اور صلح جویانہ گفتگو کے بعد ہوا ہے۔ ماسکو میں جلد ہی باقاعدہ

اور سرکاری طور پر دستخط ہو جائیں گے اور دستخط کے لیے توقع ہے کہ امریکی وزیرخارجہ مسٹرڈین رسک اور
برطانی وزیرخارجہ لارڈ ہوم ماسکو جائیں گے ۔"

دس دنوں کی طویل گفتگو کا حاصل جو معاہدہ ہوا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے ۔

"معاہدے میں کہا گیا ہے کہ جانبین وعدہ کرتے ہیں کہ وہ کسی ایٹمی ہتھیار کا تجرباتی دھماکہ یا اور کوئی
ایٹمی دھماکہ نہ کریں گے، نہ کرنے دیں گے اور اس کو ممنوع قرار دے دیں گے ۔ اس کے بعد فضاء، خلاء اور
زیر آب دھماکوں کی تشریح کی گئی ہے ۔ زیرزمین دھماکے، اس معاہدے کے تحت نہیں آتے، لیکن معاہدے
میں کہا گیا ہے کہ یہ معاہدہ تمام تجربات کو مکمل طور سے ممنوع قرار دینے کی راہ میں کسی طرح حائل نہیں ۔

۵ راگست ۶۳ء کو اس معاہدے پر باضابطہ دستخط ثبت ہوئے ۔

ماسکو ۔ ۵ راگست ۔ امریکہ، برطانیہ اور روس نے آج یہاں ایٹمی تجربات کے جزوی امتناع کے
تاریخی معاہدے پر دستخط ــــ تالیوں کی زبردست گونج اور دوستی و امن کے جام صحت ــ کے ساتھ کردیے
لارڈ ہوم نے کہا ۔ بنی نوع انسان آج سے آرام کی نیند سوئے گی ۔ مسٹر ڈین رسک نے کہا ۔" یہ ایک
اچھا پہلا قدم ہے ۔" مسٹر گرومیکو نے کہا ۔" یہ امن پسندوں کی فتح ہے ۔" اب تک ایک سو پانچ ملک اس
معاہدے میں شرکت کا اعلان کر چکے ہیں ۔ ۸ راگست کو ماسکو میں سب سے پہلے ہندستان نے اس پر دستخط کیے
ہندستان کی طرف سے اس کے سفیر مسٹر ٹی این کول نے دستخط کرتے ہوئے اس معاہدے کو "صحت و مسرت کا
منشور" کہا ۔

مسٹر خروشچیف، مسٹر کینیڈی اور مسٹر میکملن نے بھی بڑی گرم جوشی کے ساتھ اس معاہدے کا خیر مقدم کیا۔
ہمیں بھی اس سے خوشی ہوئی اس لیے کہ عارضی ہی طور پر سہی، دنیا ایٹمی تابکاری کے مزید نقصانات سے بچ گئی
لیکن پروپیگنڈے کے اس شور اور ہنگامے میں بھی سوچنے والے ذہنوں کے سامنے چند سوالات آتے ہیں ۔ کیا
اس معاہدے سے دنیا، ایٹم بموں اور ہائڈروجن بموں کی برسات سے محفوظ ہو گئی ؟ کیا جنگ کے خطرات ختم
ہو گئے ہیں ؟ کیا روس اور امریکہ و برطانیہ کی موجودہ قربت کسی مثبت بنیاد پر قائم ہوئی ہے ؟ کیا ان تینوں
طاقتوں کے مفادات کا ٹکراؤ ختم ہو گیا ہے ؟ کیا واقعی یہ آئندہ کے کسی ٹھوس معاہدے کے لیے اچھا آغاز
ثابت ہوگا ؟ اندرونی حقائق کا تو علم نہیں لیکن اخبارات جو کچھ بتاتے ہیں ان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان
سوالات میں سے ہر سوال کا جواب نفی میں ہے ۔

اخبارات جو معلومات ہم پہنچا رہے ہیں ان کا اختصار پیش کرنا بھی موجب طوالت ہے۔ یہ بات ہر اخبار بیں پر واضح ہو گی کہ ان تمام قربتوں معاہدوں اور حالات کی تبدیلیوں کا محور و مرکز چین کی جارحیت ہے۔ چین اب صرف امریکا و برطانیہ ہی کے لیے خطرہ نہیں ہے بلکہ روس کے لیے بھی خطرہ بنتا جا رہا ہے یا بن گیا ہے۔ ہندستان پر اس کے حملے نے روس کو بھی چونکا دیا اور اس نے محسوس کر لیا کہ اگر اس کی جارحیت کو بریک نہ لگایا گیا تو وہ خود اس کے بین الاقوامی پوزیشن کے لیے خطرہ بن جائے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ روس و امریکہ کی قربت کی بنیاد محض ایک منفی بنیاد ہے۔

راقم الحروف کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان تینوں کی قربت ویسی ہی قربت ہے جیسی ہٹلر کی نازیت کے مقابلے میں پیدا ہو گئی تھی بے شک جرمنی کا تیا پانچہ ہو گیا لیکن کیا دنیا کو امن و سکون بھی نصیب ہوا بلکہ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ جس ملک کو ان تینوں نے مل کر شکست دی وہی ملک ان کی قربت و دوستی کا مدفن بن گیا اور آج جرمنی کا مسئلہ بھی ان پیچیدہ مسائل میں سے ایک ہے جن کا حل نہیں نکل رہا ہے اور جو بین الاقوامی جنگ کے لیے بارود کے ایک تودے کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس پہلو سے بھی غور کیجیے کہ اس معاہدے نے چین کو خوف زدہ نہیں کیا ہے بلکہ روس سے اس کی مخالفت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ فرانس بھی اس معاہدے سے الگ ہے اور خود ایٹمی تجربات کر لے پر مصر، اگرچہ وہ بہت کمزور ہو گیا ہے۔ پھر بھی دنیا کی طاقتوں میں بہرحال ایک طاقت ہے۔ اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ اس معاہدے پر خوشی و مسرت کے جو ڈونگرے برسائے جا رہے ہیں اس کی کوئی ٹھوس بنیاد موجود نہیں ہے۔

میں یہاں صرف ایک خبر کا حوالہ دوں گا جس سے معلوم ہو گا کہ یہ جزوی معاہدہ کس "خوش نیتی" کے ساتھ کیا گیا ہے۔

واشنگٹن۔ ۱۴ اگست۔ وزیر دفاع مسٹر میک نامارا نے بیان کہا ہے کہ امریکہ کے پاس ہزاروں کی تعداد میں راکٹی ہائیڈروجنی بم ہیں اور دھماکوں پر جو پابندی کا سمجھوتہ ہوا ہے اس سے امریکہ کو اس میدان میں روس سے آگے رہنے میں مدد ملے گی۔ ہم اس بات کا عزم رکھتے ہیں کہ روس سے بہتر ہائیڈروجنی فوج تیار رکھیں۔ دھماکوں کو "زیر زمین" حد تک رکھنے کے نتیجے میں ہم اس قابل رہ سکیں گے۔ کہ ہم اپنی تکنکی معلومات کی مدت کو روس کے مقابلے میں بڑھا سکیں۔ (قومی آواز ۱۵ اگست ۱۹۶۳ء)

یہ ہے وہ نیک نیتی جس کی روشنی یا اندھیرے میں جزوی امتناع کے معاہدے پر دستخط ہوئے ہیں

دنیا کو امن و سکون دینے کے لیے ٹھوس بنیاد صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ اپنی پوری زندگی میں
کسی جزو کو بھی مستثنیٰ کیے بغیر ۔ خدا کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کر لیا جائے اور وہ نظام بروئے کار آئے
جو اس نے اپنے آخری رسول کے ذریعہ بھیجا ہے ۔ آخرت پر ایمان لا کر جب تک اس کے مفاد کو دنیوی مفادات
پر ترجیح نہیں دی جاتی ۔ انسانیت، امن و سکون سے ہم کنار نہیں ہو سکتی ۔ تاریخ نے پہلے بھی اس کا ثبوت
بہم پہنچایا ہے اور آئندہ بھی یہ حقیقت اپنے کو ثابت کر کے رہے گی ۔

اگرچہ اس وقت حال یہ ہو گیا ہے کہ دنیا کی حکومتیں اور اس کے سربراہ کار سیاست اور اجتماعی و
حکومتی معاملات سے خدا کی ہدایات کو اس طرح خارج کر چکے ہیں کہ اب اس کا ذکر بھی تمسخر آمیز ہنسی کے بغیر
سن نہیں سکتے لیکن وہ اس بات کا بھی انکار نہیں کر سکتے کہ تنہا ان کی عقل و خرد دنیا کے مسائل حل کرنے
میں پوری طرح ناکام ہو چکی ہے ۔ کیا ان کی عقلیں اتنی موٹی بات سمجھنے سے بھی عاجز ہیں کہ دنیا کی کوئی قوم
کسی دوسری قوم، دنیا کا کوئی ملک کسی دوسرے ملک، دنیا کی کوئی نسل کسی دوسری نسل اور دنیا کی
کوئی زبان کسی دوسری زبان اور دنیا کا کوئی ازم کسی دوسرے ازم کی برتری اور اس کا اقتدار تسلیم کرنے
پر نہ آمادہ ہے اور نہ آمادہ ہو سکتا ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حقیقت نفس الامری کے لحاظ سے تمام
انسان آدم کی اولاد ہیں اور اس لحاظ سے سب مساوی الدرجہ ہیں ۔ پھر آدمیوں کا کوئی گروہ کسی دوسرے
گروہ کے فلسفۂ حیات کو کیوں تسلیم کرے اور اپنے گھڑے ہوئے فلسفۂ حیات پر کیوں نہ چلے ۔ کوئی گروہ
کسی دوسرے گروہ کی قومی و نسلی برتری کیوں مان لے جبکہ قوم و نسل کے لحاظ سے وہ بھی آدمی ہی ہے ۔
یہ جھگڑے تو اسی وقت مٹ سکتے ہیں جب انسان اپنی برتری اور اپنے اقتدار سے دست بردار ہو جائے
اور کسی ایسی ہستی کے سامنے جھک جائے جس کا اقتدار حقیقی، ہمہ گیر، دائمی اور لازوال ہے اور جو فی الواقع
تمام انسانوں کی خالق و مالک ہے ۔

یہ تو خیر ایٹمی تجربات کے جزوی امتناع کا معاہدہ ہے ۔ ابھی ابھی قریب میں پنچ شیل کے اصولوں پر
ایک بڑا معاہدہ بنڈونگ میں ہوا تھا اور ایشیا و افریقہ کے ممالک جوشِ مسرت میں پھولے نہ سمائے تھے ۔

اخبارات جس کے ذکر و مذکور سے بھر گئے تھے اور کروڑوں انسان جس کی مدح میں رطب اللسان تھے۔ لیکن جب اس کے سب سے بڑے رکن چین نے دوسرے بڑے رکن ہندوستان پر حملہ کر دیا تو معلوم ہوا کہ اس معاہدے کے لیے چین کی سرگرمی ہندوستان کو فریب دینے کی ایک تدبیر تھی۔ ہند و چین کے درمیان پرامن بقائے باہمی کا جو پُرفریب پردہ کھنچا ہوا تھا۔ اس کے اس طرف بھارت کی حکومت خواب خرگوش کے مزے لے رہی تھی اور اس طرف چین کی حکومت بھارت پر حملہ کرنے کے لیے سڑک تعمیر کر رہی تھی۔ یہ ہے آج کل کی حکومتوں کے معاہدوں کی حقیقت ——— اس غداری اور فریب کاری کا سبب اس کے سوا اور کیا ہے کہ انسان نے اپنی قوم اور اپنے وطن کو اپنا معبود بنا لیا ہے۔ حالانکہ حقیقی عدل و انصاف اور واقعی خلوص و صداقت کا وجود اس بات پر موقوف ہے کہ انسان اپنے معبود حقیقی کی معرفت حاصل کرے۔ جو لوگ آج ایٹم بموں اور ہائیڈروجن بموں سے لرز رہے ہیں وہ اگر جہنم کے عذاب سے کانپ رہے ہوتے تو شاید ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم اس دنیا میں موجود ہی نہ ہوتے۔ یہ کیسی تکلیف دہ صورت حال ہے کہ دنیا کے سربراہ کار ایٹمی تجربات کی تباہ کاری سے بچنے کے لیے ایک میز کے گرد بیٹھ کر دس دن طویل بات چیت کرتے اور جزوی امتناع کے باوجود خوشی سے بغلیں بجانے لگتے ہیں لیکن جہنم کی تباہ کاری سے بچنے کا انہیں کبھی خیال تک نہیں آتا اور وہ ان ہولناک ترین شعلوں سے یکسر غافل ہیں جو ان کی ابدی زندگیوں کو بھسم کرنے کے لیے لپکے چلے آ رہے ہیں۔

ارشادات رسول:-

دینی تعلیم کا ایک مفید اور آسان طریقہ

(سید احمد قادری)

عَنْ اَبِی قِلَابَۃَ عَنْ اَبِی سُلَیْمَانَ مَالِکِ بْنِ الْحُوَیْرِثِ قَالَ اَتَیْنَا اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَنَحْنُ شَبَبَۃٌ مُتَقَارِبُوْنَ فَاَقَمْنَا عِنْدَہٗ عِشْرِیْنَ لَیْلَۃً فَظَنَّ اَنَّا اشْتَھَیْنَا اَھْلَنَا وَسَاَلَنَا عَمَّنْ تَرَکْنَا فِی اَھْلِنَا فَاَخْبَرْنَاہُ وَکَانَ رَفِیْقًا رَحِیْمًا فَقَالَ ارْجِعُوْا اِلٰی اَھْلِیْکُمْ فَعَلِّمُوْھُمْ وَمُرُوْھُمْ وَصَلُّوْا کَمَا رَاَیْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ فَاِذَا حَضَرَتِ الصَّلٰوۃُ فَلْیُؤَذِّنْ اَحَدُکُمْ وَلْیَؤُمَّکُمْ اَکْبَرُکُمْ

ترجمہ:- ابو قلابہ ابو سلیمان مالک بن الحویرث رض سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہم لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور ہم چند قریب العمر جوان تھے۔ ہم آپ کے پاس بیس دن مقیم رہے آپ نے خیال فرمایا کہ ہم لوگ گھر والوں سے ملاقات کے خواہش مند ہو چکے ہیں، تو آپ نے ہم سے افراد خاندان کی تفصیل دریافت کی جنھیں ہم اپنے پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ ہم نے آپ کو تفصیل بتائی۔ حضور بہت نرم دل اور مہربان تھے۔ آپ نے فرمایا اپنے گھر والوں کے پاس واپس جاؤ۔ انہیں تعلیم دو اور حکم دو اور تم لوگ اس طرح نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا ہے اور جب نماز کا وقت آجائے تو تم میں جو سن میں سب سے زیادہ بڑا ہو وہ امامت کرے۔

حدیث کا درجہ یہ اعلیٰ درجہ کی صحیح ترین احادیث میں سے ایک ہے۔ صحاح ستہ کے علاوہ حدیث کی دوسری مستند کتابوں میں بھی موجود ہے۔ امام مسلم نے باب من احق الامامۃ میں روایت کیا ہے اور امام بخاری نے دس سے زیادہ ابواب میں تفصیل و اختصار کے ساتھ اس کو روایت کیا ہے۔ میں نے اوپر کتاب الادب باب رحمۃ الناس والبہائم کے الفاظِ حدیث نقل کیے ہیں

وفد کی تعداد

جوانوں کے اس وفد کی صحیح تعداد معلوم نہیں ہے لیکن ایک روایت میں نفر کا لفظ آیا ہے اور نفر تین سے دس تک کی تعداد کو کہتے ہیں۔ اس حدیث کے مختلف ٹکڑوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وفد کی تعداد تین سے بہرحال زیادہ تھی۔

وقتِ آمد

فتح الباری میں ابن سعد کے حوالے سے ہے کہ یہ وفد غزوۂ تبوک سے کچھ پہلے آیا تھا بلکہ اس وقت حضورؐ غزوے کی تیاری میں مشغول تھے۔

مبلغین کی تعلیم و تربیت

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں وفود کی آمد جزیرۃ العرب کے گوشے گوشے میں دین کے پھیلنے کا ایک بڑا ذریعہ تھی۔ گنے چنے افراد مختلف قبائل سے مدینے آتے اور چند دن حضورؐ کے پاس قیام کر کے واپس جاتے۔ یہ چند روزہ قیام انہیں مس خام سے کندن بنا دیتا۔ ان افراد کو دین کے بنیادی عقائد و اعمال کی اس طرح تعلیم دی جاتی کہ ان میں دوسروں کو تعلیم دینے کی اہلیت پیدا ہو جاتی وہ واپس جا کر اپنے قبیلے اور اپنی بستی کے معلم بن جاتے اپنے فہم و اخذ کی صلاحیت کے لحاظ سے ان میں کا ہر فرد گویا اپنی ذات سے ایک مستقل مدرسہ بن جاتا۔ اگر کسی بستی میں مثال کے طور پر پانچ افراد تعلیم و تربیت پا کر پہنچ گئے تو اس کے معنی یہ تھے کہ وہاں دینی تعلیم کے پانچ مدرسے کھل گئے۔ اس حدیث میں صراحت ہے کہ بنو لیث سے جو چند جواں سال افراد حضورؐ کی خدمت میں گئے تھے وہ بیس دن وہاں مقیم رہے اور جب وہ رخصت ہونے لگے تو ان میں کا ہر فرد اس لائق ہو چکا تھا کہ جو کچھ اس نے سیکھا ہے وہ دوسروں کو سکھا سکے۔ زبانی تعلیم کے ساتھ جس چیز میں عملی تعلیم کی ضرورت تھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم انہیں عملی تعلیم دیتے اور اپنے عمل ہی کو نمونے کے طور پر پیش فرماتے۔

عہدِ رسالت کا یہ طریقۂ تعلیم انتہائی مفید، سادہ اور سہل تھا اور اس طریقے سے کسی ملک کے گوشے گوشے میں بنیادی عقائد و اعمال کی تعلیم بڑی آسانی سے پھیلائی جا سکتی ہے۔

ایک قابلِ عمل تجویز

اس حدیث کو پڑھ کر راقم الحروف کے ذہن میں ایک تجویز کا خاکہ آیا ہے اس پیش کرنے سے پہلے یہ بتانا مناسب ہے کہ عہدِ رسالت کے تعلیم و تعلم اور ہمارے عہد کے تعلیم و تعلم میں کیا فرق پیدا ہو گیا ہے ـــ ایک بڑا فرق یہ ہو گیا ہے کہ اس وقت یہ کام کوئی پیشہ نہ تھا اور اب دینی تعلیم بھی ایک مستقل پیشہ ہے جس طرح تجارت، صنعت اور زراعت حصولِ معاش۔

(باقی صفحہ ۶۰ پر ملاحظہ فرمائیں)

صلہ رحمی (۱)

(سید احمد قادری)

محاسنِ اخلاق کی تیسری چیز جس کا حکم اللہ تعالےٰ نے سورۂ نحل کی آیت (۹۰) میں دیا ہے' ایتاءِ ذی القربیٰ ہے، اس حسن خلق کی دوسری تعبیر صلہ رحمی سے کی جاتی ہے۔ گویا ایتاء ذی القربیٰ (قرابت مندوں کے حقوق کی ادائیگی) ایک عنوان ہے صلہ رحمی کا۔

سب سے پہلے اس بات پر غور کر لینا مناسب ہے کہ عدل واحسان کے دو عمومی حکم کے بعد الگ سے صلہ رحمی کا ایک مخصوص حکم کیوں دیا گیا جب کہ عدل واحسان میں صلہ رحمی بھی داخل تھی۔ اس سوال کا جواب امام رازی نے یہ دیا ہے کہ "احسان" جن وسیع حدود تک پھیلا ہوا ہے ان میں تعظیم لامر اللہ (اللہ کے حکم کی تعظیم) اور شفقۃ علیٰ خلق اللہ (خدا کی مخلوق پر مہربانی) بھی داخل ہے۔ مخلوق خدا پر شفقت کی بہت سی قسمیں ہیں ان میں سب سے افضل واشرف' صلہ رحمی ہے اسی لیے اللہ نے علیحدہ سے اس کا حکم دیا ہے۔ راقم الحروف اس میں اتنا اضافہ اور کرنا چاہتا ہے کہ بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ صلہ رحمی مخلوق پر شفقت کی سب سے افضل قسم ہے بلکہ اس کا درجہ یہ ہے کہ اگر عام طور سے لوگ اس سے غفلت برتنے لگیں تو معاشرے کی جڑیں ہل جائیں کیونکہ اس کے بغیر عدل واحسان محض ایک رسمی چیز بن کر رہ جاتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انسانی معاشرہ ایک خاندان سے شروع ہوتا ہے اور پھر بہت سے خاندان مل کر قبیلہ اور قوم بن جاتے ہیں۔ خاندان ایک قطرہ ہے جو پھیل کر سمندر بن جاتا ہے۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ کسی قبیلہ یا قوم کے تمام خاندان صلہ رحمی سے خالی ہیں۔ نہ والدین اپنی اولاد کے ساتھ شفقت ورحمت

---

(۱) انسان کا اخلاقی وجود' کے عنوان سے جو طویل مقالہ شائع ہوا ہے یہ مضمون اس کی قسط (۹) ہے چونکہ یہ مضمون تمام تر صلہ رحمی ہی سے بحث کرتا ہے اس لیے طویل سلسلے کے عنوانات حذف کر دیے گئے ہیں۔

کا برتاؤ کرتے ہیں، نہ اولاد اپنے والدین کے ساتھ بر و صلہ اور اطاعت و احترام کا برتاؤ کرتی ہے۔ نہ بھائیوں کے درمیان اعانت و شفقت کا رشتہ قائم ہے۔ نہ چچا اور بھتیجوں میں اچھے تعلقات ہیں، نہ ماموں اور بھانجے ایک دوسرے کے حقوق ادا کرتے ہیں اور نہ شوہر اور بیوی کے تعلقات میں حسن سلوک کی شیرینی ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ پورا قبیلہ اور پوری قوم عدل و احسان، مرحمۃ و مواساۃ اور فیاضی و رحم دلی سے خالی ہے۔ ایسی قوم جنگلی جانوروں کا ریوڑ تو کہی جا سکتی ہے لیکن اسے انسانی سوسائٹی کا معزز نام نہیں دیا جا سکتا۔ ایتاء ذی القربیٰ کے حکم کو عام عدل و احسان کے حکم سے علیحدہ کرنے کی یہ ایک بڑی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کی اہمیت کو نمایاں کرنے کی ایک اور وجہ معلوم ہوتی ہے زندگی بسر کرنے کے ذرائع و وسائل میں اشتراک اور نسل کی بقاء و ارتقاء کے لیے گہرے تعلقات، عام طور سے قرابت مندوں ہی کے درمیان ہوتے ہیں۔ رہنے کے مکان میں اشتراک، زمین اور جائداد میں اشتراک، تجارتی و صنعتی کاروبار میں اشتراک، نیز شادی بیاہ کے تعلقات، اجنبی لوگوں کے درمیان، کم اور قرابت مندوں کے درمیان بہت زیادہ ہوتے ہیں اور یہی وہ چیزیں ہیں جو انسانوں کے درمیان جھگڑے ٹنٹے اور کشاکش و کش مکش کا سبب بھی بنتی ہیں۔ یہ بات کم یاب نہیں ہے کہ لوگوں کے تعلقات غیر رشتہ داروں سے اچھے اور رشتہ داروں سے کشیدہ ہوتے ہیں، اس کا سبب مفادات میں اشتراک ہے۔ اس لیے ضرورت تھی کہ صلہ رحمی کے لیے علیحدہ سے مزید تاکیدی احکام دیے جائیں اور اس کی اہمیت اچھی طرح واضح کی جائے چنانچہ جب ہم کتاب و سنت کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ و رسول کے حق کے بعد سب سے زیادہ قرابت مندوں کے حقوق کی ادائگی یعنی صلہ رحمی پر زور دیا گیا ہے۔

سورہ نحل کی اس آیت کے علاوہ متعدد دوسری آیتوں میں ہمیں یہ حکم ملتا ہے۔ سورہ روم میں یہ حقیقت سمجھانے کے بعد کہ رزق کی تنگی و کشادگی تمام تر اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے۔ فرمایا گیا ہے:-

فَآتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ ۔ پس (اے مومن) رشتہ دار کو اس کا حق دے

سورہ بنی اسرائیل میں ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کے بعد فرمایا:- وَآتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ۔ اور رشتہ دار کو اس کا حق دے۔

صلہ رحمی کا حکم دیتے ہوئے "حق" کا لفظ استعمال کر کے انسان کو اس بات کی طرف توجہ دلائی

گئی ہے کہ رشتہ داروں کی جانی و مالی امداد اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کر کے اس کے دماغ میں یہ خیال پیدا نہ ہو کہ وہ ان کے ساتھ احسان کر رہا ہے جس کے بعد انہیں اس کے سامنے سر جھکا کے رہنا چاہیے وہ چونکہ دینے والا ہے اس لیے سربلند ہے اور رشتہ دار چونکہ لینے والے ہیں اس لیے اس کے مقابلے میں پست اور حقیر ہیں۔ بلکہ یہ خیال کرنا چاہیے کہ وہ جو کچھ دے رہا ہے ان کا حق دے رہا ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے ضرورت سے زیادہ مال اسی لیے دیا ہے کہ وہ اپنے رشتہ داروں کا حق بھی ادا کرے۔ اگر ادا نہیں کرے گا تو خلق اور خالق دونوں کی نگاہ میں ناشکرا قرار پائے گا۔ سورۂ بقرہ رکوع ۱۰ میں بنی اسرائیل سے لیے ہوئے جس پختہ عہد کا ذکر کیا گیا ہے اس میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے حق کا ذکر کیا ہے اس کے بعد والدین کے حق کا اور تیسرے نمبر پر دوسرے رشتہ داروں کے حق کا، فرمایا گیا ہے:۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰہَ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّ ذِی الْقُرْبٰی الخ

یاد کرو اسرائیل کی اولاد سے ہم نے پختہ عہد لیا تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا ماں باپ کے ساتھ اور رشتہ داروں کے ساتھ نیک سلوک کرنا۔

سورۂ بقرہ ہی کے رکوع ۲۲ میں حقیقی نیکی کی تفصیل کرتے ہوئے اللہ، آخرت، ملائکہ، آسمانی کتابوں اور انبیاء پر ایمان کے بعد سب سے پہلی جس نیکی کا ذکر کیا گیا ہے وہ یہ ہے:۔

وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ ذَوِی الْقُرْبٰی ۔

اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتہ داروں پر خرچ کرے۔

سورۂ نساء رکوع ۶ میں اللہ اور والدین کے حق کے بعد دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔

بدسلوکی کے باوجود صلہ رحمی کا حکم صلہ رحمی کا یہ حکم کچھ اس بات پر موقوف نہیں رکھا گیا کہ رشتہ داروں کی طرف سے بھی صلہ رحمی اور حسن سلوک کا برتاؤ ہو بلکہ ہدایت یہ کی گئی ہے کہ رشتہ داروں کی طرف سے بدسلوکی بھی ہو تو انسان ان کے ساتھ حسن سلوک کرے سورۂ نور میں فرمایا گیا:۔

وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ (۲۲)

اور تم میں سے جو صاحب فضل اور صاحب مقدرت ہیں وہ اس بات کی قسم نہ کھا بیٹھیں کہ رشتہ دار، مسکین اور مہاجر فی سبیل اللہ لوگوں کی امداد نہ کریں گے، انہیں معاف کر دینا اور درگزر کرنا چاہیے، کیا تم اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمہاری مغفرت فرمائے۔ اللہ بہت بخشنے والا اور بڑا مہربان ہے۔

صحیح سندوں سے حضرت عائشہ رضؓ کا بیان ہے کہ جب میری برأت اللہ کی طرف سے نازل ہوئی تو حضرت ابو بکر صدیق رضؓ نے قسم کھائی کہ اب آئندہ وہ مسطح بن اثاثہ کو نہ خرچ دیں گے اور نہ ان کو کسی طرح کا کوئی نفع پہنچائیں گے۔ حضرت مسطح ان کے خالہ زاد بھائی تھے اور مسکین ہونے کی وجہ سے حضرت ابو بکر ان کی کفالت فرماتے تھے وہ مہاجر بھی تھے اور غزوۂ بدر میں بھی شریک تھے لیکن شیطانی اغوا کی وجہ سے واقعۂ افک میں یہ بھی مبتلا ہو گئے تھے۔ جب حضرت ابو بکر نے ان کی کفالت ترک کر دینے کی قسم کھائی تو سورۂ نور کی مذکورہ آیت نازل ہوئی۔ یہ آیت سن کر انھوں نے فرمایا "ہاں بخدا ہم ضرور اس کو پسند کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب تو ہماری مغفرت فرمائے"۔ اس کے بعد انھوں نے حضرت مسطح کی پہلے کی طرح کفالت شروع کر دی بلکہ بعض روایتوں میں آتا ہے کہ پہلے سے زیادہ انہیں خرچ دینے لگے۔ حضرت ابن عباس اور دوسرے مفسرین قرآن سے روایت آتی ہے کہ صرف حضرت صدیق نہیں متعدد صحابہ نے قسم کھائی تھی، کہ اپنے ان قرابت مندوں سے صلہ رحمی نہیں کریں گے جنھوں نے حضرت عائشہ صدیقہ پر بہتان میں حصہ لیا تھا اور یہ آیت سن کر سبھوں نے اپنی قسم توڑ دی۔ اس آیت کے سبب نزول سے متعدد باتیں معلوم ہوئیں جن میں سب سے نمایاں بات یہی ہے کہ قرابت مندوں کی طرف سے بدسلوکی ہو جب بھی ان سے قطع رحم صحیح نہیں ہے بلکہ ان سے صلہ رحمی کا برتاؤ جاری رکھنا چاہیے۔ اگر کوئی عزیز و قریب اپنے کسی قرابت مند کی عزت و آبرو پر حرف زنی شروع کر دے تو اس سے بڑی بدسلوکی اور کیا ہوگی۔ لیکن اس بدسلوکی کے باوجود اللہ رب العزت نے ہدایت فرمائی کہ ایسے شخص کو معاف کر دیا جائے۔ اس سے درگزر کیا جائے اور صلہ رحمی سے منہ نہ موڑا جائے۔ جن الفاظ اور

جس انداز میں یہ ہدایت اتری ہے اسے سمجھ کر ہر مومن مخلص کی زبان سے وہی بات نکلنی چاہیے جو حضرت صدیق کی زبان سے نکلی اور اس کا رویہ وہی ہونا چاہیے جو صحابہ کرام نے اختیار فرمایا۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کی غفاری و ستاری اور اس کی رحمت پر غور کرو۔ وہ قادر مطلق ہونے کے باوجود اپنی شان میں گستاخی کرنے والوں کی روزی کبھی دنیا میں بند نہیں کرتا۔ اس کے علاوہ اس بات پر بھی غور کرو کہ تم بھی معصوم نہیں تم سے بھی قصور ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے تو کیا تم یہ پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمہارے قصوروں کو معاف کر دے؟ ان دو باتوں کو سمجھ لینے کے بعد بھی اگر کوئی مسلمان کسی قصور وار قرابت مند سے ترک تعلق پر اصرار کرتا ہے تو اسے اپنے ایمان کا جائزہ لینا چاہیے۔ اگر یہ ہدایت ہم مسلمانوں کے قلب میں اتری ہوئی ہوتی اور ہم اس پر عمل پیرا بھی ہوتے تو ہمارے خاندانی تعلقات میں وہ بدمزگی موجود نہ ہوتی جو آج سیکڑوں خاندانوں میں موجود ہے۔ سورۂ نسا جس کا بڑا حصہ مسلم معاشرے کی تنظیم و تعمیر کے احکام پر مشتمل ہے اس کی بالکل ابتدائی آیتوں میں صلہ رحمی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور حق اللہ کے بعد اس کی نگہداشت کا حکم دیا گیا ہے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ	اور اس خدا سے ڈرو جس کا واسطہ دیکر
بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ	تم ایک دوسرے سے اپنے حقوق مانگتے ہو اور
عَلَیْكُمْ رَقِیْبًا	رشتہ و قرابت کے تعلقات کو بگاڑنے سے پرہیز
(۱:۱)	کرو۔ یقین جانو کہ اللہ تم پر نگرانی کر رہا ہے

اس آیت میں قطع رحم کی شناعت اور صلہ رحمی کی اہمیت پوری طرح نمایاں ہے۔ سورۂ رعد میں اللہ تعالیٰ نے اپنے عقل مند اور فرماں بردار بندوں کی جو صفات بیان کی ہیں ان میں ایک صفت یہ ہے:

وَالَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ	وہ لوگ جنہیں اللہ نے جن جن روابط کو
بِهٖ اَنْ یُّوْصَلَ	برقرار رکھنے کا حکم دیا ہے انہیں برقرار رکھتے ہیں۔

اس حکم عام میں صلہ رحمی کا حکم بدرجۂ اولیٰ داخل ہے۔ اس کے ساتھ بے وقوف اور نافرمان بندوں کی جو صفتیں بیان کی گئی ہیں ان میں ایک صفت یہ ہے:۔

وَیَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖ	جو ان رابطوں کو کاٹتے ہیں جنہیں اللہ نے
اَنْ یُّوْصَلَ	جوڑنے کا حکم دیا ہے۔

قطع رابطہ کے اس عموم میں قطع رحم بھی یقیناً داخل ہے اور اس سے معلوم ہوا کہ قطع رحم کسی مومن مطیع کا کام نہیں ہو سکتا۔ یہاں قطع رحم کی مذمت آیت کے عموم میں داخل ہے اور سورۂ محمد کی آیت ۲۲ میں صراحۃً اس کی مذمت بیان کی گئی ہے۔

صلہ رحمی کی تاکید احادیث میں کتاب اللہ میں ایتاء ذی القربیٰ اور صلہ رحمی کا جو حکم اور قطع رحم کی جو ممانعت و شناعت بیان کی گئی ہے اس کی توضیح و تشریح احادیث میں ملتی ہے اس سلسلے کی تمام احادیث کا استقصاء مقصود نہیں، ایک ترتیب سے چند احادیث پیش کی جاتی ہیں۔

صلہ رحمی، دعوت اسلامی کے ابتدائی نکات میں صلہ رحمی کی اہمیت کا ایک نمایاں رخ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی کو نبوت کے ابتدائی ایام میں جن چیزوں کی تبلیغ کا حکم دیا تھا ان میں صلہ رحمی بھی داخل تھی۔

عن عمرو بن عبسۃ قال کنت وانا فی الجاھلیۃ اظن ان الناس علی ضلالۃ وانھم لیسوا علی شیٔ وھم یعبدون الاوثان فسمعت برجل بمکۃ یخبر اخبارا فقعدت علی راحلتی فقدمت علیہ فاذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مستخفیا جُرَاءُ علیہ قومہ فتلطفت حتی دخلت علیہ بمکۃ فقلت لہ ما انت؟ قال انا نبی فقلت ما نبی؟ قال ارسلنی اللہ فقلت بای شیٔ ارسلک؟ قال ارسلنی

حضرت عمرو بن عبسہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میں اپنے جاہلیت ہی کے زمانے میں یہ سمجھنے لگا تھا کہ لوگ گمراہی میں مبتلا ہیں اور جب وہ بت پوج رہے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ خیر و صلاح کا کوئی حصہ ان کے پاس باقی نہیں ہے۔ اسی اثنا میں مجھے خبر ملی کہ مکہ میں کوئی شخص نئی باتیں بیان کرتا ہے چنانچہ میں اپنی اونٹنی پر سوار ہوا اور مکہ پہنچا اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چھپے چھپے رہتے تھے اور ان کی قوم ان پر چرب اور جری تھی۔ میں نے آپ تک پہنچنے کی ایک لطیف تدبیر اختیار کی یہاں تک کہ آپ کے پاس پہنچ گیا اور پوچھا کہ آپ کس طرح کے آدمی ہیں۔ حضور نے فرمایا میں نبی ہوں۔ میں نے کہا۔ نبی کیا ہوتا ہے۔

بصلة الارحام وكسر الاوثان وان يوحد الله لا يشرك به شيئ (ریاض الصالحین بحوالہ مسلم)

آپ نے فرمایا مجھے اللہ نے اپنا پیغام دے کر بھیجا ہے۔ پھر میں نے پوچھا کس چیز کے ساتھ آپ کو بھیجا ہے آپ نے فرمایا مجھے اللہ نے بھیجا ہے صلہ رحمی کی تبلیغ کے لیے، بتوں کی شکست وریخت کے لیے اور اس بات کے لیے کہ لوگ اللہ کی توحید کا اس طرح اقرار کریں کہ اس کے ساتھ کوئی شے شریک نہ کی جائے۔

یہ حضرت عمرو بن عبسہ کی ایک طویل حدیث ہے جس کے ابتدائی حصے یہاں نقل کیے گئے ہیں۔ اس حدیث نے صلہ رحمی کی اہمیت کو جس درجہ بڑھا دیا ہے وہ کسی اہلِ نظر سے مخفی نہیں رہ سکتی۔ یہاں صلہ رحمی کو بت شکنی اور توحید کی دعوت سے بھی پہلے ذکر کیا ہے۔ یہ لطیف اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ بت شکنی اور شرک کا استیصال صلہ رحمی کے خلاف نہیں اس کے عین مطابق ہے بلکہ کہنا چاہیے کہ اسی کا تقاضا ہے، اس سے بڑی کوئی صلہ رحمی نہیں ہوسکتی کہ انسان اپنے رشتہ داروں کو اللہ کے عذاب سے بچانے کی سعی کرے اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم کو جو دعوت دے رہے تھے وہ اس کے ساتھ سب سے بڑا حسن سلوک تھا لیکن سرداران قریش اپنی حماقت سے یہ سمجھ رہے تھے بلکہ علی الاعلان کہہ رہے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی دعوت سے ہمارے رشتوں کو کاٹ رہے ہیں اور خاندان میں انتشار پیدا کر رہے ہیں۔ حضرت عمرو بن عبسہ کو اپنی رسالت کے چند نکات بتاتے ہوئے صلہ رحمی کو مقدم کرنا ان کے الزام کا بڑا لطیف جواب تھا

اس حدیث کی تائید اس متفق علیہ حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں ہرقل اور ابوسفیان کی گفتگو کا ذکر ہے۔ ہرقل نے ایک سوال کیا تھا کہ یہ مدعی نبوت تمہیں کن چیزوں کا حکم دیتے ہیں۔ اس کے جواب میں ابوسفیان نے کہا تھا:۔

قال قلت اعبدوا الله ولا تشركوا به شيئا واتركوا ما يقول اٰباءكم ويامرنا بالصلوٰة

وہ کہتے ہیں کہ اے لوگو! اللہ کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور تمہارے باپ دادا جو کچھ کہا کرتے تھے اسے

والصدق والعفاف والصلۃ • چھوڑ دو اور وہ ہمیں حکم دیتے ہیں نماز کا سچائی کا عفت و پارسائی کا اور صلہ رحمی کا۔
(ریاض بحوالہ بخاری ومسلم)

حضرت جعفر طیارؓ نے نجاشی کے دربار میں جو تقریر کی تھی اس میں بھی کہا تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں صلہ رحمی کا حکم دیتے ہیں۔ وامرنا بصدق الحدیث واداء الامانۃ وصلۃ الرحم وحسن الجوار الخ

یہ تمام احادیث ہمیں بتاتی ہیں کہ مکارم اخلاق میں صلہ رحمی کا درجہ کیا ہے؟ اور اس سوال کا صریح جواب بھی احادیث میں موجود ہے۔

صلہ رحمی کا درجہ اللہ کے نزدیک

اللہ نے صلہ رحمی کا جو حکم دیا ہے اس کا درجہ کیا ہے آپ ذیل کی احادیث میں دیکھیے۔

عن ابی هريرة رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم الرحم شجنة من الرحمٰن فقال الله من وصلك وصلته ومن قطعك قطعته
(مشکوٰۃ بحوالہ بخاری)

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ رشتہ داری خدائے رحمٰن کے آثار رحمت میں سے ایک اثر ہے تو اللہ اس سے فرماتا ہے جو تجھے جوڑے گا میں اس کو اپنی رحمت سے جوڑے رکھوں گا اور جو تجھے کاٹے گا میں اس کو اپنی رحمت سے کاٹ دوں گا۔

دوسری حدیث میں ہے:۔

عن عائشة قالت قال رسول الله صلی الله علیه وسلم الرحم معلقة بالعرش تقول من وصلنی وصله الله ومن قطعنی قطعه الله (مشکوٰۃ بحوالہ بخاری ومسلم)

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ رشتہ داری عرش الٰہی کو تھامے ہوئے دعا کرتی رہتی ہے جو مجھے جوڑے اللہ اسے جوڑے اور جو مجھے کاٹے اللہ اسے کاٹے۔

تیسری حدیث میں ہے:۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف سے روایت ہے

قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول قال اللہ تبارک وتعالیٰ انا اللہ وانا الرحمن خلقت الرحم وشققت لہا من اسمی فمن وصلہا وصلتہ ومن قطعہا بتتہ

(مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد)

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے ہوئے سنا ۔ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے ۔ میں اللہ ہوں، میں رحمٰن ہوں ۔ میں نے رحم (رشتہ داری) کو پیدا کیا اور اس کے لیے اپنے نام میں سے ایک نام منتخب کیا جو اسے جوڑے گا میں اس کو اپنی رحمت سے جوڑوں گا اور جو اسے کاٹے گا میں اس کو اپنی رحمت خاص سے کاٹ دوں گا

یہ احادیث جس حقیقت کی تعبیر ہیں وہ یہ ہے کہ اللہ نے صلہ رحمی کا جو امر فرمایا ہے اور قطع رحم سے جو نہی فرمائی ہے تو یہ امر و نہی فقہی اصطلاح میں استحباب وکراہت کے دائرے میں داخل نہیں ہے بلکہ فرض وحرام کے دائرے میں داخل ہے ۔ صلہ رحمی فرض ہے اور قطع رحم حرام ہے ۔ صلہ رحمی انسان کو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے قریب کرتی اور قطع رحم اس کو رحمت خداوندی سے دور پھینک دیتا ہے اجمالی طور پر صلہ رحمی کے وجوب اور قطع رحم کی حرمت پر تمام علماء متفق ہیں اس کی مزید تفصیل آئندہ فقہ کی فصل میں آرہی ہے ۔

صلہ رحمی، رسول خدا کی نمایاں صفت

صلہ رحمی کا تعلق دراصل انسانی اخلاقیات سے ہے جسے اللہ اور یوم آخر پر ایمان ترقی دے کر درجۂ کمال تک پہنچا دیتا ہے ۔ اسی لحاظ سے یہ انبیاء کرام علیہم السلام کی نمایاں ترین صفات میں سے ایک ہے خاص طور پر سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں معلوم ہو چکا کہ آپ نے ابتدائے نبوت ہی سے اس کی تبلیغ شروع کر دی تھی اور جہاں تک حضور کے عمل کا تعلق ہے نبوت سے پہلے بھی صلہ رحمی آپ کی نمایاں ترین صفات میں سے ایک صفت تھی اور اس کی سب سے بڑی دلیل حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا وہ اظہار خیال ہے جو حضور کی بعثت کے بعد انھوں نے کیا تھا ۔ ہم سب کو معلوم ہے کہ پہلی وحی کے بعد حضور پر ایک قسم کی گھبراہٹ طاری ہوئی تھی اور جب انھوں نے نزول وحی اور اپنے اندیشے کا ذکر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے کیا تو انھوں نے بڑی فصیح و بلیغ زبان میں حضور کی چند نمایاں صفات کا ذکر کیا اور دیکھنے کی بات یہ ہے کہ سب سے پہلے جس صفت کا ذکر کیا وہ صلہ رحمی ہے انھوں نے فرمایا :-

کلا واللہ لا یخزیک اللہ ابدا — ہرگز نہیں، بخدا اللہ آپ کو کبھی رسوا نہ کرے گا

انک لتصل الرحم وتصدق الحدیث (مشکوٰۃ) • آپ صلہ رحمی کرتے ہیں اور سچ بولتے ہیں

جب نبوت سے پہلے بھی صلہ رحمی آپ کی نمایاں صفت تھی تو کھلی بات ہے کہ نبوت کے بعد اس میں ترقی ہوتی رہی ہوگی اور وہ درجۂ کمال کو پہنچ گئی ہوگی کیونکہ آپ کی بعثت کی غرض مکارم اخلاق کی تکمیل تھی جیسا کہ سابق قسطوں میں اس پر تفصیل کے ساتھ لکھا جا چکا ہے۔ مکہ معظمہ میں قبل نبوت، آپ کی صلہ رحمی کا ایک واقعہ ابن ہشام نے تھوڑی تفصیل کے ساتھ لکھا ہے، ان کا بیان ہے

اللہ تعالیٰ نے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ پر جو احسانات کیے ہیں ان میں کا ایک احسان یہ ہے کہ وہ اسلام سے پہلے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آغوش تربیت میں پہنچ گئے تھے۔ واقعہ یوں ہوا کہ قریش سخت قحط میں مبتلا ہو گئے اور ابوطالب کثیر العیال شخص تھے۔ اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عم محترم حضرت عباس سے فرمایا۔ جو بنو ہاشم میں سب سے زیادہ خوش حال شخص تھے اے چچا! آپ کے بھائی ابو طالب کثیر العیال شخص ہیں اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ لوگ کتنے سخت قحط میں مبتلا ہیں۔ آئیے میرے ساتھ، ہم ان کے پاس چلیں اور ان سے درخواست کریں کہ وہ اپنی اولاد میں سے ایک کو میری کفالت میں دے دیں اور ایک کو آپ کی کفالت میں۔ اس طرح ہم ان کا بار کچھ کم کر دیں۔ حضرت عباس تیار ہو گئے۔ چنانچہ دونوں ابو طالب کے پاس پہنچے اور کہا ہم چاہتے ہیں کہ قحط دور ہونے تک آپ کا بار کچھ کم کریں اور وہ اس طرح کہ آپ کی اولاد میں سے دو کی کفالت ہم لوگ کریں انھوں نے کہا عقیل کو چھوڑ کر تم لوگ جسے جانا چاہتے ہو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو اپنے کنبے میں داخل کر لیا اور حضرت عباس نے حضرت جعفر کی کفالت سنبھال لی۔ حضرت علی رسول خدا کی بعثت تک آپ کے ساتھ رہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت عطا فرمائی تو حضرت علی آپ پر ایمان لائے اور آپ کی تصدیق کی۔ اس وقت ان کی عمر دس سال تھی۔ اسی طرح حضرت جعفر حضرت عباس کے ساتھ رہے۔ یہاں تک کہ اسلام لائے اور پھر ان کی کفالت سے مستغنی ہو گئے۔

(سیرت ابن ہشام)

نبوت و رسالت کے بعد اس عظیم ترین ذمہ داری نے تمام اوقات گھیر لیے اور آپ کے پاس کسب معاش کے لیے کوئی وقت نہ چھوڑا اور یہ حالت ابتدائے نبوت سے لے کر زندگی کے آخری لمحے تک یکساں قائم رہی۔ آخر

جس خدا نے آپ پر یہ ذمہ داری ڈالی تھی اس نے جب مال غنیمت (دشمن پر حملے کے بعد جو مال لڑائی میں ہاتھ آتا ہے) اور فئے (دشمن سے جو مال بغیر جنگ کے ہاتھ آتا ہے) کے احکام نازل فرمائے تو صراحت کے ساتھ اپنے حبیب کے اہلِ قرابت کا حصہ خود متعین فرمایا تاکہ آپ صلہ رحمی اور ایتاء ذی القربیٰ کے فرض سے عہدہ برآ ہوں۔ سورۂ انفال میں فرمایا:۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ　　اور تمہیں معلوم ہو کہ جو کچھ مال غنیمت تم نے
فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی　　حاصل کیا ہے اس کا پانچواں حصہ اللہ اور اس
الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنَ　　کے رسول اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں
وَابْنِ السَّبِیْلِ　　اور مسافروں کے لیے ہے۔

اس آیت میں رشتہ داروں سے مراد حضورؐ ہی کے رشتہ دار ہیں۔ سورۂ حشر میں ارشاد ہوا:۔

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ　　جو مال لوٹا دیا اللہ نے اپنے رسول پر بستیوں
مِنْ اَهْلِ الْقُرٰی فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَ　　والوں کے سو اللہ کے واسطے اور رسول کے اور
لِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ　　قرابت والوں اور یتیموں کے اور محتاجوں کے اور
وَابْنِ السَّبِیْلِ　　مسافروں کے۔

ان آیتوں کے بعد مال غنیمت کے پانچویں حصے سے اور مال فے سے حضور اپنے رشتہ داروں کو دیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ حضور نے اپنے قرابت مندوں کے ساتھ جنھوں نے آپ کی دشمنی اور ایذا رسانی میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی، متعدد مواقع پر حسن شفقت و رحمت اور صلہ رحمی کا برتاؤ کیا وہ تاریخ کے مشہور واقعات ہیں اور فتح مکہ کے بعد اپنے دشمن اہل قرابت کے معاملے میں جس عالی ظرفی اور حسن سلوک کا ثبوت دیا وہ صلہ رحمی کی سب سے بلند چوٹی ہے اور جسے پڑھ کر دشمنان اسلام بھی آپ کی وسعت ظرف کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہتے۔

صلہ رحمی ایمان کا تقاضا

اوپر کی تفصیل سے خود یہ بات واضح ہے کہ ایک مومن کے لیے صلہ رحمی صرف طبعی محبت ہی کا تقاضا نہیں ہے بلکہ اس کے ایمان کا تقاضا بھی ہے۔ اور یہ بات احادیث میں صراحۃً بھی آئی ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث کا ٹکڑا ہے:۔

وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيَصِلْ رَحِمَهُ

اور جو شخص اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتا ہے اسے صلہ رحمی کرنی چاہیے۔

صلہ رحمی گناہوں کی مغفرت کا ذریعہ

عن ابن عمران رجلا اتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا رسول اللہ انی اصبت ذنبا عظیما فهل لی من توبة قال هل لك من ام قال لا قال وهل لك من خالة قال نعم قال فبرها (مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی)

ابن عمر سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر کہا یا رسول اللہ مجھ سے ایک بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہے تو کیا میرے لیے اس سے تائب ہونے کی کوئی صورت ہے؟ آپ نے فرمایا۔ کیا تمہاری ماں زندہ ہیں انھوں نے کہا، نہیں، آپ نے فرمایا کوئی خالہ زندہ ہیں انھوں نے کہا، ہاں، آپ نے فرمایا ان سے نیک سلوک کرو (صلہ رحمی کرو۔)

دخولِ جنت کا سبب

ہر خیر دخول جنت اور ہر شر دخولِ جہنم کا سبب بن سکتا ہے لیکن احادیث میں جن نیکیوں کو دخولِ جنت کا سبب اور جن برائیوں کو دخول نار کا سبب کہا گیا ہے ان کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔

عن ابی ایوب الانصاری رضی اللہ عنہ ان رجلا قال یا رسول اللہ اخبرنی بعمل یدخلنی الجنة فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم تعبد اللہ ولا تشرك به شيئا وتقيم الصلوٰة وتوتی الزکوٰة وتصل الرحم (متفق علیہ)

ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ مجھے ایسا عمل بتائیے جو مجھے جنت میں داخل کرے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تم اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو۔ نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور صلہ رحمی کرو۔

اس حدیث سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ رشتہ داروں کے حقوق کی ادائیگی ان اعمال میں ہے جو دخول جنت کا سبب ہیں اور دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ حق اللہ کے بعد بندوں کے حقوق میں سب سے مقدم حق رشتہ داروں کا ہے۔ اسی تقدم کا اثر ہے کہ دوسرے حاجت مند لوگوں کی مالی امداد کے مقابلے میں رشتہ داروں کی مالی امداد کا دہرا اجر ہے جیسا کہ آگے آرہا ہے۔

رشتہ داروں کی مالی امداد کا دُہرا اجر

حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کی حدیث کا ایک ٹکڑا یہ ہے :۔

عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال الصدقۃ علی المسکین صدقۃ و علی ذی الرحم ثنتان: صدقۃ وصلۃ (ترمذی)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مسکین پر صدقہ بس ایک صدقہ ہے اور رشتہ دار پر صدقہ دو چیزیں بن جاتا ہے ۔ صدقہ بھی اور صلہ رحمی بھی

یہی بات ام المومنین حضرت میمونہ کی حدیث میں ملتی ہے جسے بخاری و مسلم دونوں نے روایت کیا ہے ان کا بیان ہے کہ میں نے اپنی ایک لونڈی آزاد کردی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع نہ دے سکی جب باری کے دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم میرے یہاں تشریف لائے تو میں نے کہا' یا رسول اللہ! کیا آپ نے محسوس فرمایا میں نے اپنی لونڈی آزاد کردی ۔ آپ نے کہا ۔ کیا تم نے اسے آزاد کردیا ؟ میں نے کہا' ہاں! اس کے بعد حضور نے جو جملہ فرمایا وہ یہ تھا :۔

اما انک لو اعطیتھا اخوالک کان اعظم لاجرک

اگر تم اسے اپنے ماموں کو دیدیتیں تو تمہارا اجر بڑھ جاتا ۔

لونڈی' غلام آزاد کرنا بڑے اجر کا کام ہے لیکن اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قرابت مندوں کی ضرورت پوری کرنا اس سے بھی بڑے اجر کا کام ہے ۔ یہی مشورہ آپ نے حضرت ابو طلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کو دیا تھا جب انھوں نے اپنے بہترین باغ بیرحاء کو فی سبیل اللہ صدقہ کرنا چاہا ۔ آپ نے ان سے فرمایا کہ میری رائے ہے کہ تم اسے اپنے اہل قرابت کو دے دو ۔ چنانچہ انھوں نے اس مشورے کو قبول کرتے ہوئے اس باغ کو اپنے چچا کی اولاد اور دوسرے قرابت مندوں میں تقسیم کردیا ۔

صلہ رحمی سے روزی اور عمر میں اضافہ

اوپر صلہ رحمی کے اخروی اجر کا بیان تھا اب اس نیکی کے دنیوی فائدے کا ذکر کیا جاتا ہے ۔ یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ دنیا اصلاً دار الجزا نہیں بلکہ دار العمل ہے اس لیے نیکیوں پر دنیا میں کوئی اجر ملتا نہ دکھائی دے جب بھی اجر آخرت پر یقین رکھنے والے کے لیے شکایت کی کوئی وجہ نہیں ہے ۔ لیکن یہ اللہ کا کرم ہے کہ وہ نمونے کے طور پر اس دنیا میں بھی نیکیوں کا صلہ عطا فرماتا ہے ۔

عن انس رضی اللہ عنہ ان

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جسے یہ
احب ان یبسط لہ فی رزقہ وینساء	بات پسند ہو کہ اس کا رزق وسیع اور اس کی عمر
لہ فی اثرہ فلیصل رحمہ (ریاض الصالحین بحوالہ بخاری)	طویل ہو تو اسے صلہ رحمی کرنی چاہیے

یہ تعبیر ہے اس بات کی کہ صلہ رحمی یعنی رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے اور اُن کے ساتھ نیک سلوک کا دنیوی فائدہ یہ ہے کہ اس سے رزق اور عمر میں اضافہ ہوتا ہے۔ امام ترمذیؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے جو روایت کی ہے اس میں ایک فائدہ کا اور اضافہ ہے وہ یہ کہ صلہ رحمی اہلِ خاندان میں محبت کا سبب ہے۔ صلہ رحمی کرنے والا اپنے اہلِ قرابت کا محبوب ہوتا ہے۔ رزق میں زیادتی، عمر میں زیادتی اور اہلِ خاندان کی محبت، دنیاوی نعمتوں میں یہ کتنی بڑی نعمتیں ہیں اور کون نہیں چاہتا کہ اسے یہ نعمتیں حاصل ہوں۔

حقیقی صلہ رحمی صلہ رحمی کی ایک قسم تو بدلے کی صلہ رحمی ہے یعنی میرے قرابت مند میرے ساتھ حسن سلوک کر رہے ہیں تو بدلے میں ان کے ساتھ میں بھی نیک برتاؤ کر رہا ہوں۔ صلہ رحمی کی یہ قسم محض رسمی ہے حقیقی صلہ رحمی یہ ہے کہ جب میرے قرابت مند بدسلوکی کر رہے ہوں اور رشتے کو کاٹ رہے ہوں تو میں ان کے ساتھ نیک سلوک کروں اور رشتے کو جوڑوں۔ اوپر آیت سورہ نور کی تشریح میں یہ بات لکھی جا چکی ہے کہ اللہ کی ہدایت اور اس کی مرضی یہ ہے کہ رشتہ داروں کی طرف سے بدسلوکی ہو جب بھی ان کے ساتھ نیک سلوک کیا جائے۔ احادیث نے یہ بات بالکل واضح کر دی ہے۔

عن عبد اللہ بن عمرو بن العاص	عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے
رضی اللہ عنہما عن النبی صلی اللہ علیہ	مروی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ رشتہ
وسلم قال لیس الواصِلُ بالمُکافِیِٔ	جوڑنے والا وہ نہیں ہے جو بدلے میں ایسا کرتا ہے
لکنِ الواصِلُ الَّذِی اذا قُطِعَت رَحِمُہٗ	بلکہ حقیقی صلہ رحمی کرنے والا وہ ہے کہ جب اس کا
وَصَلَھَا (ریاض الصالحین بحوالہ بخاری)	رشتہ کٹ جائے تو وہ اسے جوڑے۔

افسوس کہ اس حقیقی صلہ رحمی کا وجود اب مسلم معاشرے میں بہت کم ہو گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ خاندانی اختلافات بے حد بڑھ گئے ہیں۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر شخص تعلقات کو بگاڑنے پر تلا بیٹھا ہے۔ حال یہ ہو گیا ہے کہ شادی بیاہ کی دعوتی فہرست میں ناموں کے تقدم و تاخر پر تعلقات خراب ہو جاتے ہیں۔ برائی کے بدلے میں بھلائی اور قطع رحم کے جواب میں صلہ رحم کا تصور تک مٹتا جا رہا ہے۔ اس سلسلے کی ایک اور

حدیث یہ ہے :-

عن ابی هريرة رضی اللہ عنہ ان رجلا قال یا رسول اللہ ان لی قرابة أصلهم ويقطعونی واحسن اليهم ويسيئون الی واحلم عنهم ويجهلون علی فقال لئن كنت كما قلت فكانما تسفهم الملّ ولا يزال معك من اللہ ظهير عليهم ما دمت علی ذالك	حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے کہا' یا رسول اللہ! میرے کچھ قرابت مند ہیں۔ میں ان سے تعلق جوڑتا ہوں اور وہ مجھ سے قطع تعلق کرتے ہیں۔ میں ان سے نیک سلوک کرتا ہوں اور وہ مجھ سے بدسلوکی کرتے ہیں۔ میں ان سے حلم و بردباری کا برتاؤ کرتا ہوں اور وہ جہالت پر اتر آتے ہیں یہ سن کر آپ نے فرمایا اگر تم ایسے ہی ہو جیسا کہہ رہے ہو تو گویا تم انہیں گرم راکھ کھلا رہے ہو اور جب تک تم اپنی روش پر قائم رہوگے تمہارے ساتھ اللہ کی طرف سے انکے مقابلے میں ایک مددگار رہے گا۔
(ریاض بحوالہ مسلم)	

گرم راکھ کھلانے کی تشبیہ ان کے انجام کو ظاہر کرنے کے لیے اختیار فرمائی گئی ہے یعنی جس طرح گرم راکھ کھانے سے تکلیف ہوتی ہے اسی طرح قطع رشتہ' بدسلوکی اور جہالت کا انجام ان کے لیے دردناک ہوگا۔ اس حدیث میں "جب تک تم اپنی روش پر قائم رہوگے' ان کے مقابلے میں تمہارے ساتھ اللہ کی طرف سے ایک مددگار رہے گا" کا ٹکڑا بدسلوکی کے جواب میں حسن سلوک کی روش پر قائم رہنے کے لیے بڑی ترغیب پیدا کرتا ہے۔ دوسری طرف ان بدمعاملہ رشتہ داروں کو اپنی روش سے توبہ کرنے کی طرف مائل کرتا ہے جو اللہ کی قدرت اور جزا و سزا پر ایمان رکھتے ہیں۔

قطع رحم جنت سے محرومی کا سبب

پہلے کتاب اللہ سے معلوم ہو چکا ہے کہ قطع رحم اصلاً کسی مسلم کی صفت نہیں ہو سکتی بلکہ یہ خدا کے باغیوں اور منافقوں کی صفت ہے۔ احادیث سے بھی یہ معلوم ہو چکا کہ رشتے کو کاٹنا یعنی قرابت مندوں کے حقوق ادا نہ کرنا' خدا کی رحمت سے دور کر دیتا ہے اور آخرت میں خدا کی رحمت کا مظہر جنت ہے۔ اس لیے اشارتاً یہ بات پہلے ہی آ چکی کہ قطع رحم جنت سے محرومی کا سبب ہے لیکن بات اشارے تک محدود نہیں رکھی گئی۔ صراحتہً بھی اس صفتِ بد کو

جنت سے محرومی کا سبب قرار دیا گیا ہے۔

عن جبیر بن مطعم ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا یدخل الجنۃ قاطع رحم (جمع الفوائد بحوالہ بخاری، مسلم ابوداؤد)

جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جنت میں رشتہ قطع کرنے والا داخل نہ ہوگا۔

یہ سخت وعید جنت وجہنم پر ایمان رکھنے والے کو لرزا دینے کے لیے کافی ہے۔

اعمال خیر کی نامقبولیت

اس بری خصلت کے ساتھ مومن کے اعمال خیر اللہ کے دربار میں قبول نہیں کیے جاتے۔

عن ابی ہریرۃ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ان اعمال بنی آدم تعرض کل خمیس لیلۃ الجمعۃ فلا یقبل عمل قاطع رحم (جمع الفوائد بحوالہ مسند احمد)

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بنی نوع انسان کے اعمال ہر شب جمعہ کو پیش کیے جاتے ہیں تو رشتہ کاٹنے والے کا عمل قبول نہیں کیا جاتا۔

نزولِ رحمت کا انقطاع

قطع رحم ایسی بری چیز ہے کہ نزول رحمت الٰہی کے منقطع ہو جانے کا سبب بن جاتی ہے۔

عن عبد اللہ بن ابی اوفی قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول لا تنزل الرحمۃ علیٰ قوم فیہ قاطع رحم (مشکوٰۃ بحوالہ بیہقی)

عبد اللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔ اس قوم پر رحمت نازل نہیں ہوتی جس میں کوئی شخص قطع رحم کرنے والا ہو۔

قطعِ رحم دنیوی سزا کا سبب ہے

جیسا کہ ہمیں معلوم ہے، دنیا اصلاً دارالجزا نہیں ہے لیکن نمونے اور عبرت کے لیے اللہ تعالےٰ دنیا میں بھی کبھی اعمال بد کی سزا دیتا ہے، رشتہ داروں کے ساتھ بدسلوکی بھی ان برے اعمال میں ہے جو عقوبت دنیا کا سبب بنتے ہیں۔

عن ابی بکرۃ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ما من ذنب احد ر ان یعمل لصاحبہ العقوبۃ فی الدنیا

ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اپنے بھائی مسلمان پر زیادتی ظلم اور قطع رحم سے زیادہ کوئی گناہ

مع ما یدخر لہ فی الآخرۃ من البغی	اس لائق نہیں کہ گنہگار کو دنیا میں بھی سزا دی
وقطیعۃ الرحم	جائے اور آخرت میں اس کے لیے جو عذاب تیار
(جمع الفوائد بحوالہ ابو داؤد و ترمذی)	کیا گیا ہے وہ اس کے علاوہ ہو۔

صلہ رحمی فقہ کی روشنی میں کتاب و سنت کی تصریحات کے بعد صلہ رحمی کے وجوب پر کسی فقہی استشہاد کی کوئی خاص ضرورت باقی نہیں رہتی ہاں ان تصریحات سے اس کی جو تفصیلات مستنبط ہوتی ہیں ان کے لیے فقہ کی یقیناً ضرورت ہے، لیکن میں پہلے مزید توثیق کے لیے وجوب و حرمت پر بھی فقہار کی رائے پیش کرتا ہوں۔ متن تنویر الابصار اور اس کی شرح درمختار میں ہے۔

وصلۃ الرحم واجبۃ ولو کانت بسلام وتحیۃ وھدیۃ ومعاونۃ ومجالسۃ ومکالمۃ وتلطف واحسان ویزورھم غبا لیزید حبا بل یزور اقرباءہ کل جمعۃ او شھر ولا یرد حاجتھم لانہ من القطیعۃ۔	صلہ رحمی واجب ہے۔ اگرچہ یہ سلام تحیۃ، ہدیہ، معاونت، مجالست، گفتگو اور ملاطفت و احسان کے ذریعہ ہو اور اہل قرابت سے ملاقات کرتے رہنا چاہیے تاکہ محبت میں اضافہ ہو بلکہ ہر جمعہ یا ہر مہینے ان سے ملاقات کرنا چاہیے اور (بلا وجہ) ان کی حاجت کو رد نہ کرنا چاہیے کیونکہ ایسا کرنا صلہ رحمی کے
(کتاب الحظر والاباحۃ)	خلاف ہے۔

"وصلۃ الرحم واجبۃ" کی تشریح میں علامہ شامیؒ لکھتے ہیں :۔

نقل القرطبی فی تفسیرہ اتفاق الامۃ علی وجوب صلتھا وحرمۃ قطعھا للادلۃ القطعیۃ من الکتاب والسنۃ علی ذالک قال فی تبیین المحارم واختلفوا فی الرحم التی یجب	قرطبی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ تمام امت مسلمہ صلہ رحمی کے وجوب اور قطع رحم کی حرمت پر متفق ہے۔ اس لیے کہ اس کے بارے میں کتاب و سنت کے قطعی دلائل موجود ہیں تبیین المحارم (فقہ کی ایک مستند کتاب کا نام) میں کہا ہے کہ فقہار کے درمیان اختلاف ہے کہ کن

صلتها قال قوم هي قرابة كل ذي رحم محرم وقال آخرون كل قريب محرما كان او غيره الخ والثاني ظاهر اطلاق المتن قال النووي في شرح مسلم وهو الصواب واستدل عليه بالاحاديث نعم تتفاوت درجاتها ففي الوالدين اشد من المحارم وفيهم اشد من بقية الارحام وفي الحديث اشارة الى ذالك كما بينه في تبيين المحارم۔

شامی جلد ۵ صفحہ ۲۶۰
مطبوعہ مصر

رشتہ داروں سے صلہ رحمی واجب ہے اور کن سے واجب نہیں ہے۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ جو رشتہ دار ایک دوسرے کے محرم ہوتے ہیں ان کے درمیان صلہ رحمی واجب ہے اور دوسری جماعت کہتی ہے کہ ہر رشتے سے صلہ رحمی واجب ہے وہ محرم ہو یا نہ ہو (علامہ شامی لکھتے ہیں) دوسرا قول اس لیے مرجح ہے کہ متون فقہ میں کسی قید کے بغیر صلہ رحمی کو واجب کہا گیا ہے نووی نے شرح مسلم میں دوسرے ہی قول کو صحیح قرار دیا ہے اور احادیث سے استدلال بھی کیا ہے۔ ہاں رشتہ داروں کے درجات متفاوت ہیں۔ والدین سے صلہ رحمی سب سے مقدم و مؤکد ہے اور ان کے بعد محارم (وہ رشتہ دار جو ایک دوسرے کے محرم ہوتے ہیں) کا درجہ ہے اور اس کے بعد دوسرے رشتہ داروں کا درجہ ہے اور احادیث میں اس درجہ بندی کی طرف اشارہ موجود ہے جس کی توضیح تبیین المحارم میں ہے۔

میں نے یہ لمبا حوالہ عربی عبارت کے ساتھ اس لیے نقل کیا ہے کہ ان معاملات میں فقہی عبارتوں کی تصریحات بہت کم مقالات و مضامین میں نظر سے گزرتی ہیں۔ علامہ شامی نے درمختار کی مذکورہ عبارت کی تشریح کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ

تبیین المحارم میں لکھا ہے کہ اگر رشتہ دار کہیں دور رہتے ہوں تو ان کو خط لکھ کر ان سے ربط و تعلق قائم رکھنا چاہیے اور اگر وہاں پہنچ کر ان سے ملاقات پر قدرت ہو تو یہ افضل ہوگا۔ والدین کا معاملہ یہ ہے کہ اگر وہ خدمت کے محتاج ہوں یا خط پر اکتفا نہ کریں بلکہ اپنی اولاد کو اپنے پاس بلائیں تو صرف

خط لکھنا صلہ رحمی کے لیے کافی نہیں ہے اور بڑا بھائی باپ کے انتقال کے بعد صلہ رحمی میں باپ کا درجہ حاصل کرلیتا ہے اسی طرح دادا اور اس کے اوپر کے رشتے اور بڑی بہن اور خالہ صلہ رحمی میں ماں کے مثل ہیں۔ اسی طرح چچا باپ کے مثل ہے۔ ان کے علاوہ جو رشتے دار ہیں ان کو خط لکھنا یا ان کے پاس ہدیہ بھیجنا صلہ رحمی کے لیے کافی ہے۔ پھر یہ بات بھی جان لو کہ صلہ رحمی سے مراد یہ نہیں ہے کہ جب رشتہ دار تم سے صلہ رحمی کریں تب تم ان سے صلہ رحمی کرو کیونکہ یہ تو مکافات اور بدلہ ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ جب وہ قطع رشتہ کریں تب تم ان سے رشتہ جوڑو اور ان کے حقوق ادا کرو جیسا کہ بخاری کی حدیث میں ہے۔

فقہاء کی ان تصریحات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ فقہ میں صلہ رحمی کی حیثیت کیا ہے، بلکہ یہاں بات اتنے پر ختم نہیں ہو جاتی آگے بڑھتی ہے۔

رشتہ داروں پر رشتہ داروں کی کفالت بھی واجب ہے

فقہ کی کتابیں اس مسئلے کی تفصیل سے بھی بھری ہوئی ہیں کہ کن رشتہ داروں پر کن رشتہ داروں کو خرچ دینا واجب ہے اور کن حالتوں میں واجب نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں وہ تمام تفصیلات پیش نہیں کی جا سکتیں۔ مسلم معاشرے میں عام طور سے اس وقت جو تصور رہ باقی ہے وہ بس اتنا ہے کہ شوہر پر بیوی کی اور اولاد پر والدین کی کفالت واجب ہے لیکن فقہاء بتاتے ہیں کہ معاملہ صرف اتنا نہیں ہے بلکہ صلہ رحمی میں درجہ بدرجہ تمام رشتہ داروں کو خرچ دینا بھی داخل ہے۔ شرط یہ ہے کہ اہل قرابت ضرورت مند ہوں اور دینے والا خرچ دینے کی مقدرت و وسعت بھی رکھتا ہو۔ عام طور پر ہمارا مسلم معاشرہ اس وجوب کا احساس بھی نہیں رکھتا الّا ماشاء اللہ

رشتہ داروں کی درجہ بندی

اس بات کا ادراک تو عقل بھی کر لیتی ہے کہ تمام رشتہ دارو ں کے درجے ایک نہیں ہو سکتے۔ ان کے مدارج و مراتب میں یقیناً فرق ہے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ سب سے بڑا درجہ اسی کا ہونا چاہیے جو رشتہ میں سب سے زیادہ قریب ہے۔ احادیث نے اس عقلی ادراک کی تصدیق کر کے اسے شرعی حقیقت بنا دیا ہے۔ رشتہ داروں کی درجہ بندی میں ذیل کی حدیث ایک اصل کلی کی حیثیت رکھتی ہے۔

عن ابی ھریرۃ جاء رجل الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال یارسول

حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور

اللہ من احق الناس بحسن صحابتی قال امك ثم امك ثم ابوك ثم ادناك فادناك (بخاری ومسلم)

انھوں نے پوچھا۔ یا رسول اللہ میرے حسن سلوک کا کون سب سے زیادہ مستحق ہے؟ آپ نے فرمایا۔ تمہاری ماں پھر تمہارا باپ، پھر اس کے بعد تمہارا قریب ترین رشتہ دار پھر قریب ترین رشتہ دار

ماں باپ کے ساتھ صلہ رحمی کی اہمیت اور اس کی تفصیل اس سے پہلے کی ایک قسط میں گزر چکی ہے۔ اس حدیث سے علماء ومحدثین رشتہ داروں کی درجہ بندی پر استدلال کرتے ہیں اور یہ استدلال بالکل واضح ہے۔ ماں باپ کے علاوہ کچھ اور رشتہ داروں کا ذکر بھی صراحۃً احادیث میں آیا ہے انہیں بھی دیکھ لینا چاہیے

کلیب بن منفعۃ عن جدہ قال یا رسول اللہ من ابر قال امك واباك واختك واخاك ومولاك الذی یلی ذالك حق واجب ورحم موصولۃ (ابوداؤد بحوالہ جمع الفوائد)

کلیب بن منفعہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا یا رسول میں کس کے ساتھ نیکی اور صلہ رحمی کروں۔ آپ نے فرمایا اپنی ماں اور باپ کے ساتھ بہن اور بھائی کے ساتھ اور اس رشتہ دار کے ساتھ جو ان سے قریب ہو ان کے حقوق ادا کرنا اور ان کے ساتھ صلہ رحمی کرنا واجب ہے

بعض حدیثوں میں آیا ہے کہ بڑے بھائیوں کا حق چھوٹے بھائیوں پر وہی ہے جو باپ کا حق اپنی اولاد پر ہوتا ہے، اسی طرح صحیح حدیث میں چچا کو باپ کا مثل قرار دیا گیا ہے۔ ماموں کا ذکر اوپر حضرت میمونہ کی حدیث میں گزر چکا۔ خالہ کا درجہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

عن البراء بن عازب رضی اللہ عنہما عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال الخالۃ بمنزلۃ الام (ترمذی)

براء بن عازب رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ خالہ ماں کے درجے میں ہے

اوپر یہ گزر چکا کہ جس طرح ماں کے ساتھ حسن سلوک اور صلہ رحمی گناہ کا کفارہ بنتی ہے اسی طرح خالہ کے ساتھ نیک سلوک گناہ کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ مال دار بیوی اگر ضرورت مند شوہر کی مالی امداد کرے تو اسے بھی دُہرا اجر ملتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک ذرا لمبی حدیث آتی ہے۔ میں یہاں اس کا مفہوم پیش کرتا ہوں

زینب ثقفیہ رضی اللہ عنہا حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی بیوی کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں سے ارشاد فرمایا کہ تم لوگ صدقہ کرو اگرچہ زیور ہی کے ذریعہ کیوں نہ ہو۔ یہ سن کر میں اپنے گھر گئی اور میں نے عبداللہ بن مسعود سے کہا۔ تم کم آمدنی والے شخص ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم عورتوں کو صدقے کا حکم دیا ہے۔ تم جا کر ان سے پوچھو، اگر تم کو صدقہ دینے سے میرا فرض ادا ہو جاتا ہو تو تمہیں کو دوں، ورنہ دوسروں کو دوں۔ حضرت عبداللہ نے کہا۔ تم خود جا کر پوچھو۔ وہ گئیں اور دیکھا حضور کے دروازے پر ایک انصاری عورت بھی موجود ہے اور ان کی ضرورت بھی وہی تھی جو میری تھی۔ حضور کی شخصیت میں اللہ نے ایک رعب اور ہیبت رکھ دی تھی۔ اس لیے ہم میں سے کسی کو براہ راست پوچھنے کی جرأت نہ ہو رہی تھی کہ اتنے میں حضورؐ کے گھر سے بلال نکلے۔ ہم نے ان سے کہا کہ جاؤ حضورؐ سے کہو کہ دروازے پر دو عورتیں کھڑی ہیں اور پوچھ رہی ہیں کہ اگر وہ اپنا صدقہ اپنے شوہروں کو اور ان یتیموں کو دیدیں جن کی وہ پرورش کر رہی ہیں تو کیا یہ ان کے لیے کافی ہو جائے گا۔ یہ نہ بتانا کہ ہم کون لوگ ہیں۔ حضرت بلال حضورؐ کے پاس گئے اور سوال کیا، حضورؐ نے پوچھا وہ دونوں کون ہیں، انھوں نے کہا ایک انصاری عورت ہیں اور ایک زینب ہیں۔ حضورؐ نے پوچھا کون سی زینب؟ انھوں نے کہا۔ عبداللہ بن مسعود کی بیوی۔ تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان کے لیے دو اجر ہے۔ قرابت کا اجر اور صدقہ کا اجر۔

(ریاض الصالحین بحوالہ بخاری و مسلم)

رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی اور حسن سلوک کا حکم انہیں کے ساتھ ختم نہیں ہوتا ہے بلکہ اس قدر وسعت اختیار کرتا ہے کہ کسی ملک کے تمام باشندوں کے ساتھ نیک سلوک کا اس لیے حکم دیا گیا ہے کہ اس ملک کے کسی ایک شخص سے رشتے کا تعلق تھا۔ امام مسلم نے حضرت ابوذر سے یہ حدیث روایت کی ہے کہ حضورؐ نے صحابۂ کرام سے فرمایا کہ عنقریب تم لوگ مصر فتح کروگے تو باشندگان مصر کے لیے میری طرف سے نیک برتاؤ کی وصیت ہے کیونکہ وہ ذمی بھی ہوں گے اور ان سے رشتے کا بھی تعلق ہے۔ اس حدیث کی شرح میں علماء نے لکھا ہے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی والدہ محترمہ حضرت ہاجرہ مصر کی تھیں اس لیے حضورؐ نے اہل مصر سے رشتہ داری کا ذکر فرمایا۔ یہ ہے صلہ رحمی کے بارے میں اسلامی شریعت کا نقطۂ نظر۔
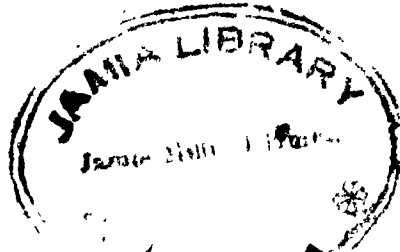
خطبۂ افتتاحیہ

بہار اسٹیٹ مسلم پرسنل لا کنونشن

از

(مولانا ابواللیث ندوی، امیر جماعت اسلامی ہند)

جس کنونشن میں یہ خطبہ دیا گیا وہ ۲۸ جولائی ۱۹۶۳ء کو انجمن اسلامیہ ہال ۔ مراد پور پٹنہ میں منعقد ہوا تھا ۔ یہ پمفلٹ کی صورت میں چھپ کر اسی موقع پر شائع ہو چکا ہے ۔ مناسب سمجھا گیا کہ اس جامع خطبہ کو زندگی کے صفحات میں بھی محفوظ کر لیا جائے ۔ (ادارہ)

جناب صدر محترم حاضرین!

بہار اسٹیٹ مسلم پرسنل لا کنونشن میں شرکت کا دعوت نامہ جب مجھے ملا تھا، میں نے اس کا مطلب کچھ اس سے زیادہ نہیں سمجھا تھا کہ کنونشن کے داعی حضرات نے ایسے اہم اور مبارک کنونشن میں مجھے شرکت کرنے یا زیادہ سے زیادہ کنونشن کے نمائندگان سے کچھ گفتگو و خطاب کا ایک موقع عنایت فرمایا لیکن بعد میں اخباری خبروں اور روانگی سے چند گھنٹے قبل کنونشن کے جنرل سکریٹری جناب غلام سرور صاحب کے تار سے معلوم ہوا کہ مجھے اس سے آگے یہ شرف بھی عطا فرمایا گیا ہے کہ میں اس مبارک اجتماع کا افتتاح کروں اور اس موقع پر کوئی مطبوعہ افتتاحی خطبہ بھی پیش کروں ۔ چنانچہ اس وقت میں اسی حکم کی تعمیل میں آپ کے روبرو حاضر ہوا ہوں ۔ یعنی کچھ باتیں جو رہا روی میں قلم بند ہو سکی ہیں ان کو اللہ کے نام پر اس کنونشن کا افتتاح کرتے ہوئے آپ کی خدمت میں پیش کر دینی چاہتا ہوں ۔

حضرات! یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ مسلمانان ہند اس وقت اپنی تاریخ کے ایک نہایت نازک دور سے گذر رہے ہیں، اسباب سے بحث کا یہاں موقع نہیں ہے، لیکن یہاں کے حالات ان کے لیے اتنے سخت ہو چکے ہیں، کہ ان کے خواص و عوام سب ہی سخت اضطراب و بے چینی کے شکار ہیں ۔ اور

ان میں بہت سے لوگ تو ایسے ہیں جو حالات کی نزاکتوں اور مستقبل کے اندیشوں کی بنا پر حد درجہ مایوس بھی ہو چکے ہیں۔

ہندوستان میں جو دستور اس وقت رائج ہے، وہ کلی طور سے نہ سہی، لیکن اس میں ملک کی اقلیتوں کے لیے بہت کچھ سامانِ اطمینان موجود ہے۔ کیونکہ اس میں باشندگانِ ملک کے لیے کچھ بنیادی حقوق و تحفظات طے کیے گئے ہیں، جن میں مذہب کی آزادی بھی شامل ہے لیکن بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ ابھی تک دستوری تحفظات اور یقین دہانیاں اپنی حقیقی روح کے ساتھ عملی قالب اختیار نہیں کر سکی ہیں، بلکہ اس کے برعکس آئے دن ایسے واقعات پیش آتے رہتے ہیں جن سے صرف مسلمانوں بلکہ یہاں کی دیگر اقلیتوں کے دلوں میں بھی یہ بدگمانی بڑھتی جا رہی ہے کہ یہ تحفظات اور یقین دہانیاں محض دکھاوے کے لیے ہیں۔ اور شاید اکثریت جان بوجھ کر ان کو ان کے دستوری حقوق سے محروم کر دینا چاہتی ہے۔

مسلمانوں کے لیے یہ بات کچھ کم پریشان کن نہیں تھی کہ آزادی کے سولہ سترہ برس بعد بھی ابھی تک ان کو اپنی جان و مال اور عزت و آبرو کی طرف سے کلی اطمینان نصیب نہ ہو سکا۔ اور آئے دن ملک کے کسی نہ کسی گوشے میں فسادات ہوتے ہی رہتے ہیں، یا ان کو ملازمتوں اور معاشی میدانوں میں طرح طرح کی رکاوٹوں اور زحمتوں سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے لیکن جو چیز اُن کے لیے پریشان کن ثابت ہو رہی ہے، وہ یہ ہے کہ ان کو اپنے مذہب کی طرف سے اطمینان نصیب نہ ہو سکا ہے۔ ملک میں خاص طرح کے نصاب تعلیم کے ذریعہ طلبہ کے ذہن و دماغ کو ایک خاص مذہب و تہذیب کے سانچے میں ڈھالنے کی جو کوششیں ہو رہی ہیں اور تعلیم کے علاوہ دیگر ذرائع سے بھی پورے ملک میں جس طرح ایک خاص تہذیب کو فروغ دیا جا رہا ہے، اور اس کے مقابلے میں دیگر تہذیبوں کو جس طرح دبانے اور پامال کرنے کی تدبیریں اختیار کی جا رہی ہیں، وہ تو اپنی جگہ پر ہیں اور ان سے بھی مسلمانوں کا پریشان و مضطرب ہونا ایک بالکل قدرتی بات ہے۔ کیونکہ اپنی تہذیب ہر قوم و ملت کو عزیز ہوتی ہے اور ہندوستان میں جس تہذیب کو اسلامی تہذیب کہا اور سمجھا جاتا ہے، وہ ہرچند خالص اسلامی تہذیب نہیں ہے لیکن بہرحال اس پر اسلام کی گہری چھاپ پڑی ہوئی ہے۔ اور مسلمانوں کا اپنی تہذیب کے بارے میں بنیادی نقطۂ نظر یہ ہے کہ اس کا حقیقی سرچشمہ ان کا مذہب ہی ہونا چاہیے۔ اس لیے اس کے سلسلے میں کسی خطرے کا احساس درحقیقت مذہب کے سلسلے میں ———— ان کے اضطراب و تشویش ہی کا ایک گوشہ ہے۔ لیکن جو چیز ان کے لیے ہر چیز سے زیادہ پریشانی و اضطراب کا موجب بن رہی ہے، ان کا یہ

ساس ہے کہ اب براہ راست مذہب میں بھی مداخلتیں شروع کردی گئی ہیں ۔ اور ان کا یہ احساس اور اس کی بنا پر ان کا اضطراب کچھ بے وجہ نہیں ہے ۔

آپ حضرات کو معلوم ہوگا کہ انگریزی دورِ حکومت میں یہاں سول میرج ایکٹ رائج تھا، جس کی رو سے ہر مرد یا عورت کسی دوسرے مذہب کے کسی فرد سے شادی کرسکتے تھے لیکن مرد اور عورت دونوں کے لیے ضروری تھا کہ وہ اس سے پہلے اپنے مذہب سے انکار کریں لیکن اب سول میرج کی جگہ اسپشل میرج ایکٹ نافذ کیا گیا ہے، جس کی رو سے ایک عورت اپنے کو مسلمان کہتے ہوئے بھی کسی ہندو، ہریجن، عیسائی یا یہودی سے شادی کرسکتی ہے۔ اور یہ شادی قانوناً جائز ہوگی اور اس سے جو اولاد پیدا ہوگی وہ جائز وارث قرار پائے گی اس قانون کی رو سے اسلامی شریعت کا یہ اصول کالعدم ہوجاتا ہے کہ کوئی مسلمان عورت کسی غیر مسلم سے شادی نہیں رہ سکتی۔ اور اگر وہ ایسا کرتی ہے تو اس کے بعد وہ مسلم معاشرے میں شامل نہیں رہ سکتی۔

اسی طرح حکومت نے سرکاری ملازمین کے سلسلے میں تعدد ازدواج پر جو پابندی عائد کی ہے، اس سے مسلمان ملازمین اس حق سے محروم ہوگئے ہیں، جس کی گنجائش شریعت نے تسلیم کی ہے۔

اور اب جیسا کہ آپ سب حضرات کو معلوم ہوچکا ہے، پچھلے دنوں حکومت نے اس بات کا ارادہ کرلیا ہے کہ مسلم پرسنل لا میں بھی تبدیلیاں کرلی جائیں۔ چنانچہ اس کے سلسلے میں ایک ایسا کمیشن بنانے کی تجویز زیر غور ہے، جو مسلم ملکوں کی اصلاحات کو سامنے رکھ کر مسلم پرسنل لا میں تبدیلیوں کے بارے میں اپنی سفارشات پیش کرے۔

یہاں تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے، لیکن ہر شخص جو اسلام سے ذرا بھی واقفیت رکھتا ہے اس پر یہ بات پوری طرح واضح ہوگی کہ مذہب کے بارے میں مسلمانوں کا تصور دیگر مذاہب کے ماننے والوں کے مقابلے میں بالکل جداگانہ نوعیت رکھتا ہے۔ دوسروں کا نقطۂ نظر مذہب کے بارے میں بالعموم یہ ہے کہ وہ بس اللہ اور بندے کے درمیان ایک مخصوص تعلق کا نام ہے۔ دنیاوی معاملات و مسائل اس کے دائرے سے خارج ہیں۔ یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ کچھ رسم و رواج اور عبادات و اخلاق کا بھی انسان کو پابند بنایا ہے لیکن اس کے برعکس اسلام کا حال یہ ہے کہ وہ دین و دنیا اور مذہب و سیاست کی تفریق کا روادار نہیں ہے۔ اس کے نزدیک انسان کی پوری زندگی مذہب کے دائرے میں داخل ہے اور اسے اس کے ہر کل و جزو میں اللہ کی اطاعت کرنی چاہیے۔ چنانچہ اس نے ہر شعبۂ زندگی کے بارے میں

واضح ہدایت دی ہے۔ اس طرح اسلام عرفِ عام کے لحاظ سے محض ایک مذہب نہیں ہے، بلکہ وہ بیک وقت مذہب، اخلاق، معاملات اور سیاست سب کا جامع ہے اور سب کو محیط ہے۔ اس بنا پر قدرتاً مسلمان کسی حال میں اس کا روادار نہیں ہو سکتا کہ اس کے مذہب میں کوئی بھی حکومت یا فرد خواہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو، کسی طرح کی مداخلت کرے یا اس میں اپنی طرف سے کوئی ترمیم یا حذف و اضافہ ہو سکے۔ زیادہ سے زیادہ جس بات کی گنجائش ہو سکتی ہے، وہ یہ ہے کہ جن امور و مسائل کے بارے میں قرآن و سنت کی کوئی واضح ہدایت نہیں ہے، ان کے متعلق قرآن و سنت کی ہدایات کے پیشِ نظر کوئی نقطۂ نظر متعین کیا جائے، لیکن یہ کام بھی ہر کس و ناکس کے کرنے کا نہیں ہے، بلکہ یہ مخصوص طور سے علمائے امت کا کام ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ اس وقت کچھ مسلمان ملکوں میں وہاں کے موجودہ برسرِ اقتدار طبقے کی طرف سے شریعت میں کچھ ترمیمات کی گئی ہیں، لیکن ان ملکوں کے عام مسلمان ان کا یہ حق تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ وہ اسے ان کی مذہب دشمنی یا مغربیت سے مرعوبیت کا نتیجہ قرار دے رہے ہیں۔ اور ان کی طرف سے ان اصلاحات کی شدید مخالفت ہو رہی ہے جس کی بنا پر یہ ممالک اس وقت سخت ترین کش مکش میں مبتلا ہیں جس سے ان کی تعمیر و ترقی بری طرح متاثر ہو رہی ہے۔

پھر جہاں تک مسلم پرسنل لا کا تعلق ہے، یہ شریعت کا وہ حصہ ہے، جو مسلمانوں کی نگاہ میں شریعت کا ایک اہم ترجزو ہونے کے ساتھ یہ حیثیت بھی رکھتا ہے کہ درحقیقت اس پر ہی پورے اسلامی معاشرے کا دارومدار ہے۔ اس لیے اس کے سلسلے میں مسلمانوں کے جذبات ہمیشہ اتنے نازک رہے ہیں کہ جن مسلم ملکوں پر مغربی اقوام کا غلبہ رہا ہے، انھوں نے اگرچہ مالیات و انتظامیہ کے سلسلے میں ان ملکوں کے رائج الوقت قوانین میں طرح طرح کی تبدیلیاں کر ڈالیں، بلکہ ان کو منسوخ کر کے اپنے پسندیدہ قوانین کو بھی رائج کیا، لیکن ان کو کبھی اس کی جرأت نہیں ہوئی کہ مسلمانوں کے پرسنل لا کو بھی ہاتھ لگائیں۔ اور اب ان ملکوں کی آزادی کے بعد موجودہ مغرب زدہ برسرِ اقتدار طبقے کی طرف سے اگرچہ اسلامی شریعت میں بہت کچھ تبدیلیاں کر دی گئی ہیں لیکن ان کو بھی اب تک اس کی جرأت نہیں ہو سکی ہے کہ وہ مسلم پرسنل لا میں براہ راست دخل دیں، یا اگر وہ اس میں کچھ تبدیلیاں کر بھی رہے ہیں تو وہ بھی مذہب ہی کے نام پر کی جا رہی ہیں۔ خود ہندستان میں بھی انگریزوں نے اپنے دورِ اقتدار میں ملک میں اپنے من مانے قوانین نافذ کیے، لیکن جہاں تک مسلم پرسنل لا کا تعلق ہے، نہ صرف یہ کہ انھوں نے اس کو ہاتھ نہیں لگایا، بلکہ مسلمانوں کی خواہش و مطالبے کی بنا پر ۱۹۳۷ء میں شریعت ایکٹ

اور ۱۹۳۹ء میں قانون انفساخ نکاح کو منظور کیا گیا لیکن تعجب ہے کہ اب جب کہ ملک میں اپنی حکومت قائم ہوئی ہے، مسلمانوں کو اس صورت حال سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے کہ اس رہی سہی چیز کو بھی حکومت کی طرف سے خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔

چنانچہ یہ قدرتی بات ہے کہ حکومت کے اس مجوزہ اقدام کی خبر کے شائع ہوتے ہی پورے ہندستان کے مسلمانوں میں ایک اضطراب کی لہر دوڑ گئی جس کا اندازہ ان اجتماعات سے ہوتا ہے جو ملک کے گوشے گوشے میں ہوئے اور اب تک ہو رہے ہیں

چنانچہ اس وقت کا یہ اجتماع بھی جس میں صوبے کے اطراف و جوانب کے نمائندے آئے ہوئے ہیں، بلکہ ان کے علاوہ دوسرے صوبوں سے بھی کچھ لوگ آ کر شریک ہوئے ہیں، مسلمانوں کے اسی اضطراب اور بے چینی کا ایک ثبوت ہے۔ اور جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ یہ اجتماع مسلمانوں کی کسی مخصوص پارٹی یا جماعت کی طرف سے منعقد نہیں کیا گیا ہے، بلکہ صوبے میں جتنی بھی قابل ذکر جماعتیں موجود ہیں سب کے نمائندے اس میں حصہ لے رہے ہیں اور جو لوگ باہر سے تشریف لائے ہیں وہ بھی مختلف جماعتوں سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں۔ گویا یہ اضطراب ایک عمومی نوعیت رکھتا ہے اور اتنا شدید ہے کہ جماعتی اور مسلکی امتیاز و اختلاف بھی اس معاملے میں معدوم ہو چکا ہے۔ یقیناً وقت کا یہی تقاضا تھا اور مسلمانانِ بہار کی خدمت میں، میں ہدیۂ مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے ایسے مبارک اجتماع کا انتظام فرمایا ہے۔ مسلمانوں کی زندگی میں یہ ایک بڑی اچھی علامت ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ جذبہ اگر قائم رہا تو انشاء اللہ مسلمانوں کے بہت سے مسائل جو آج انہیں پریشان کیے ہوئے ہیں آسانی سے حل ہو سکتے ہیں۔

مسلمانوں نے اس مجوزہ مداخلت کے مقابلے میں جس یک جہتی اور اتحاد و تعاون کا ثبوت پیش کیا ہے اور پھر اپنی اس تحریک کو جس پر وقار اور آئینی انداز میں چلایا ہے، اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ بظاہر حالات یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ حکومت کم از کم فی الحال اپنے اس ارادے کو ملتوی کر دے گی۔

آپ حضرات کو اخبارات کے ذریعے یہ معلوم ہو چکا ہوگا کہ پچھلے دنوں جمعیۃ علمائے دہلی کے ایک وفد نے وزیر اعظم ہند سے ملاقات کی تھی ــــ پھر جناب حافظ محمد ابراہیم صاحب نے بھی وزیر قانون مسٹر اشوک سین اور وزیر اعظم پنڈت نہرو سے اس موضوع پر گفتگو اور تبادلۂ خیال کیا ہے۔ ان حضرات نے اس گفتگو اور تبادلۂ خیال کے بعد یہی خیال رائے قائم کی تھی کہ حکومت اس سلسلے میں سر دست کوئی اقدام نہیں کرنا چاہتی

ہے۔ اور آپ نے اخبارات میں یہ بھی پڑھا ہوگا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نائب صدر جمہوریہ کے دولت کدہ پر مرکزی حکومت کے کچھ مسلم وزراء اور کچھ سرکردہ مسلمانوں کی ایک نشست ہوئی تھی جس میں مسلم پرسنل لا کے مسئلے پر ان حضرات نے حکومت کو یہی مشورہ دیا تھا کہ وہ اس سلسلے میں کوئی اقدام نہ کرے۔ ان باتوں کے پیش نظر غالباً یہ توقع کرنا کچھ بے جا نہ ہوگا کہ حکومت اب اس معاملے کو آگے نہیں بڑھائے گی۔ بلکہ توقع تو یہ تھی کہ اس سلسلے میں حکومت کی طرف سے کوئی اعلان بھی شائع کر دیا جائے گا۔ اور اگر واقعتہً حکومت اس سلسلے میں کچھ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی ہے تو اسے یہ اعلان شائع کر دینا چاہیے تھا، تاکہ مسلمانوں میں جو اضطراب اور بے چینی پیدا ہوگئی ہے وہ دور ہو جاتی اور اس وقت ان کی جو قوت اس کے خلاف احتجاج میں صرف ہو رہی ہے اس طرف سے مطمئن ہو کر اسے وہ اپنے اور ملک کے دیگر اہم اور ضروری کاموں پر صرف کر سکتے۔ اور ظاہر ہے اس کے بعد غالباً اس کنونشن کی بھی کوئی خاص ضرورت باقی نہ رہتی۔ لیکن کہا نہیں جاسکتا کہ اس راہ میں وقار کا سوال آڑے آرہا ہے۔ یا یہ خیال مانع بن رہا ہے کہ اس طرح کے اعلان کے بعد مسلمانوں کا حوصلہ نہ بڑھ جائے، یا خدانخواستہ ہم محض خوش گمانی میں مبتلا ہیں اور حکومت اپنے ارادے پر بدستور قائم ہے۔ اگر یہ آخری بات ہے تو خیر اعلان کی توقع ہی فضول ہے۔ لیکن اگر واقعی وقار اور مصلحتیں آڑے آرہی ہیں تو مجھے کہنے دیجیے کہ یہ طرز فکر جمہوریت کے مزاج سے قطعاً مطابقت نہیں رکھتا ہے۔ مسلمان تو پھر بھی اس ملک کی ایک اہم اکائی ہیں، لیکن کسی چھوٹی سے چھوٹی اقلیت کے اضطراب سے بھی پورے ملک کو بے چین ہو جانا چاہیے اور اسے اولین فرصت میں دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

بہرحال اس طرح کے اعلان میں کیا بات مانع بن رہی ہے، اس کا حال تو آئندہ معلوم ہو سکے گا لیکن اس موقع پر میں آپ حضرات کی توجہ اس طرف مبذول کرانا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہو سکتا ہے کہ اس وقت یہ خطرہ ٹل جائے کہ حکومت مسلم پرسنل لا میں کوئی ترمیم کرنا چاہتی ہے لیکن مسلمانوں کو آئندہ کی طرف سے مطمئن ہو کر بیٹھ رہنا کسی طرح بھی مناسب نہیں ہوگا۔

یہ بات آپ کو معلوم ہونی چاہیے کہ مسلم پرسنل لا کے سلسلے میں حکومت نے کمیشن کی جو تجویز پیش کی تھی وہ یوں ہی سامنے نہیں آگئی بلکہ اس کے پیچھے ایک سوچا سمجھا اور طے شدہ منصوبہ کام کر رہا ہے۔ آپ میں سے بہتوں کو معلوم ہوگا کہ حکومت کی پالیسی کے رہنما اصول جو دستور میں طے کیے گئے ہیں ان میں ایک دفعہ (۴۴) یہ بھی ہے کہ

The state shall endeavour to secure for the citizens a uniform civil code
THROUGH OUT THE TERRITORY OF INDIA

یعنی ریاست پورے ہندوستان میں اپنے باشندوں کے لیے یکساں (سول کوڈ) شہری ضوابط تشکیل دینے کی جدوجہد کرے گی۔ ہر چند رہنما اصولوں کی حیثیت محض رہنما اصولوں کی ہے جن کو قانون کا درجہ حاصل نہیں ہے لیکن دستور کی دفعہ ۳۷) کی رو سے ان رہنما اصولوں کو ملک پر حکمرانی کے سلسلے میں ایک بنیادی مقام حاصل ہے اور حکومت کا فرض قرار دیا گیا ہے کہ وہ قانون سازی میں ان منصوبوں کو روبہ عمل لائے۔ دستور کی اس دفعہ کے ہوتے ہوئے اگر حکومت پورے ملک میں یکساں معاشرتی قوانین نافذ کرنے کی طرف کوئی خاص قدم نہیں اٹھا رہی ہے تو اسے اس کی کسی نہ کسی مجبوری یا مصلحت کا نتیجہ سمجھنا چاہیے۔ خود دستور کے لحاظ سے اس کی مکلف قرار دی گئی ہے اور وہ ایسا کرنا بھی چاہتی ہے لیکن تدریج و مصلحت کے ساتھ جیسا کہ ہندو کوڈ میں ترمیمات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے یہ بات تقریباً یقینی سی ہے کہ حالات جس قدر سازگار ہوتے جائیں گے وہ دستور کی اس ہدایت پر عمل پیرا ہونے کی پوری کوشش کرے گی اور حالات کو سازگار بنانے کی طرف سے بھی وہ غافل نہیں ہے۔ بلکہ کیا عجب کہ پرسنل لا میں ترمیم کا ارادہ بھی کچھ اسی کے لیے راستہ ہموار کرنے کی خاطر کیا گیا ہو۔

پھر اس سلسلے میں یہ بات بھی پیش نظر رکھنے کی ہے کہ پچھلے برسوں جب ہندو کوڈ بل پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا تو ایوان کے بہت سے غیر مسلم ممبروں نے اس بات پر سخت احتجاج کیا تھا کہ ہندوؤں کے لیے جداگانہ قوانین کیوں بنائے جا رہے ہیں اور ان کا اطلاق مسلمانوں پر کیوں نہیں کیا جاتا؟ اور اس مطالبے یا احتجاج کا جو جواب اس وقت ذمہ داران حکومت کی طرف سے دیا گیا تھا وہ یہی تھا کہ مصلحت وقت کے تقاضے سے ایسا نہیں کیا جائے۔ یہ بات یہ سمجھنے کے لیے کافی ہے کہ حکومت کیا چاہتی ہے؟ نیز یہ کہ اکثریت کی عام خواہش کیا ہے؟ اور یہ خواہش خود اس موقع پر بھی اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہ سکی۔ اخبار بین طبقہ واقف ہوگا کہ متعدد با اثر غیر مسلم اخبارات نے اس خبر پر کس قدر برہمی اور غصہ کا اظہار کیا ہے کہ حکومت مسلم پرسنل لا میں ترمیم کا ارادہ ترک کر رہی ہے۔ وہ اسے مسلمانوں کی بے جا خوشامد اور ملکی مفاد کے خلاف ایک طرح کی غداری قرار دے رہے ہیں۔

پھر ان باتوں کے ساتھ اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ بدقسمتی سے ہمارے جائی بنڈل میں سے جو لوگ حکومت کے نزدیک مسلمانوں کے نمائندے سمجھے جاتے ہیں یا اس کے منظورِ نظر ہیں، ان کی اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو اسلام سے کوئی واقفیت یا دلچسپی نہیں رکھتے بلکہ بڑی حد تک اپنا ذہنی تعلق بھی اس سے توڑ چکے ہیں اور ان کا مطمح نظر حکومت یا اکثریت کی خوشنودی حاصل کرنے یا اپنی ترقی پسندی کا مظاہرہ کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ یہ لوگ حکومت کو مسلمانوں کے معاملات کے سلسلے میں نہایت غلط مشورے دیتے رہتے ہیں اور یہ بات تو اخبارات میں شائع ہی ہو چکی ہے کہ حکومت کے زیر بحث اقدام میں بھی بعض مسلم وزراء اور ممبران پارلیمنٹ کی تحریک کو خاص دخل ہے۔

ان وجوہ کی بنا پر اگر حکومت اس وقت اپنے مجوزہ اقدام سے باز بھی آجائے تو بھی سمجھنا چاہیے کہ یہ مسئلہ ہمیشہ کے لیے ختم نہیں ہو گیا ہے اور اس پر ہمیں نہایت سنجیدگی اور اہمیت کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے۔

حضرات! مجھے یقین ہے کہ یہ مسئلہ اس اہمیت کے ساتھ آپ میں سے ہر شخص کے سامنے ہوگا اور یقیناً آپ حضرات نے اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اپنے اپنے طور سے بہت کچھ سوچا بھی ہوگا اور اس وقت یہاں ہمارے جمع ہونے کی اصل غرض و غایت بھی یہی ہے کہ ہم سب مل کر اس مسئلے پر غور کریں اور اس کا کچھ حل سوچیں اس لیے آغازِ گفتگو کے لیے میں اس سلسلے میں اپنے کچھ خیالات آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔

(۱) سب سے پہلی بات مجھے یہ عرض کرنی ہے کہ میرے نزدیک آپ کا یہ اجتماع بجائے خود بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس سے ہم بہت کچھ فوائد حاصل ہونے کی توقع کر سکتے ہیں۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ یہ جس پیمانہ و انداز پر منعقد ہو رہا ہے اس سے حکومت کو اس کا بخوبی اندازہ ہو سکے گا کہ مسلمانوں کے جذبات اس کے مجوزہ اقدام کے سلسلے میں کیا ہیں اور وہ کس طرح اس بارے میں باہم متفق ہیں لیکن جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، ہمیں حکومت کے مجوزہ اقدام کے خلاف صرف احتجاج ہی کرنا نہیں ہے بلکہ ایک مستقل خطرے کو سامنے رکھتے ہوئے اس کے تدارک کے لیے بھی بہت کچھ سوچنا ہے۔ بلکہ یہ بات اگر کسی درجے میں بھی صحیح مان لی جائے کہ حکومت اپنے اس اقدام کو واپس لینے کے لیے بھی تیار ہو چکی ہے اور دیر سویر اس کا اعلان ہونے والا ہے تب تو جو کچھ ہمیں سوچنا ہے وہ آئندہ خطرے ہی کے سلسلے میں ہے۔ اور یہ ظاہر بات ہے کہ یہ مسئلہ اپنے اندر گوناگوں نزاکتیں اور پیچیدگیاں رکھتا ہے جن کا حق غالباً اس طرح ٹھیک طور سے ادا نہیں ہو سکتا کہ ہم اسے

مثلاً اس کنونشن کا موضوعِ گفتگو بنائیں، کیونکہ اس کے لیے طویل فرصت اور پرسکون ماحول کی ضرورت ہے اور اس سے زیادہ اس بات کی کہ اس سلسلے میں جو کچھ طے کیا جائے اس کو زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کا اتفاق اور اشتراک حاصل ہو سکے اور اس غرض کے لیے کوئی ایسی مجلس تشکیل دینی ہوگی جس میں مسلمانانِ ہند کے نمایاں سربراہ کاروں کی تمام قابلِ ذکر جماعتوں کے نمائندے شریک ہوں اور یہ کام آئندہ ہی ہو سکے گا، البتہ اس موقع پر اس سلسلے میں کوئی تجویز زیرِ بحث لائی جا سکتی ہے یا آئندہ کے بارے میں کچھ اصولی باتیں بھی طے کی جا سکتی ہیں۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ میرے خیال میں آئندہ خطرے کا انسداد اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ دستور کے رہنما اصولوں میں سے اس اصول کو بدلوانے کی کوشش کی جائے جس کی رو سے حکومت پورے ملک میں یکساں معاشرتی قانون نافذ کرنے کی مکلف قرار دی گئی ہے۔ کیونکہ اس نے نہ صرف یہ کہ حکومت کے اقدامات کا ایک رخ متعین کر دیا ہے بلکہ وہ عام پبلک کے ذہن و دماغ کو بھی ایک خاص رخ پر موڑتے رہنے کی موجب ہے۔

بلاشبہ دستور میں اس طرح کی تبدیلی کرا لینا کوئی آسان مسئلہ نہیں ہے۔ اس کے لیے ظاہر ہے کہ رائے عامہ کی بہت بڑی تبدیلی کی ضرورت ہے جس کے نتیجے میں ترمیم کے لیے پارلیمنٹ میں مطلوبہ اکثریت حاصل ہو سکے لیکن اگر مسلمان پورے عزم و حکمت کے ساتھ اس مطالبے کو منوانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں تو کامیابی کی بہرحال توقع کی جا سکتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ملک کے برسرِ اقتدار طبقے کا عام رجحان مذہب کے خلاف ہے اور پورے ملک میں یکساں معاشرتی قانون رائج کرنے کا جذبہ بھی پوری شدت کے ساتھ موجود ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ ہندوستان کا پڑھا لکھا اور سمجھ دار طبقہ اس بات کی اہمیت کو بھی کسی نہ کسی درجے میں ضرور تسلیم کر رہا ہے کہ ہندوستان جو مختلف ملتوں اور تہذیبوں کا گہوارہ ہے، تو ان سب کو حتی الوسع اپنی اپنی جگہ راضی اور مطمئن کرنے کی پوری پوری کوشش ہونی چاہیے کہ اسی پر ملک کی وحدت و استحکام کا دار و مدار ہے اور یہی جذبہ دستور بناتے وقت ممبرانِ مجلس قانون ساز کے دلوں میں بھی رہا ہے، جس کی بنا پر دستور میں اقلیتوں اور ان کے مذہب و تہذیب کے سلسلے میں طرح طرح کے تحفظات رکھے گئے ہیں۔ اس خیال و ذہن کے لوگوں کو بآسانی یہ بات سمجھائی جا سکتی ہے کہ مذکورہ دفعہ اپنی تفصیلی شکل میں ان تحفظات کے قطعاً مغائر ہے اس لیے دستور کو تضاد سے پاک کرنا ضروری ہے — اور ظاہر ہے بنیادی حقوق میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ

وہ اس زمانے میں تمام مہذب ملکوں کے دستوروں کا ایک لازمی جزو ہیں بلکہ درحقیقت ان کے مہذب ہونے کی علامت بھی ہیں۔ اسی کے ساتھ ملک کے سمجھ دار طبقے کو یہ بات بھی سمجھائی جاسکتی ہے۔ کہ ایسے قوانین جن کے پیچھے عمل درآمد کرنے والوں کی دلی آمادگی اور جذبہ موجود نہ ہو، عملاً وہ بے معنی ہی ہوتے ہیں جس کی بہت ساری مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ پچھلے دنوں ہندو کوڈبل میں جو اصلاحات کی گئی تھیں وہ بھی اسی بنا پر بڑی حد تک بے اثر ثابت ہوئی ہیں۔ اس لیے یکساں معاشرتی قوانین نافذ کرنے کا خیال ہی قابل ترک ہے۔ البتہ غیر مسلموں کی اکثریت اپنے یہاں کوئی تبدیلی لانا چاہے تو وہ اس کے لیے ہر طرح مجاز ہے اور جب مسلمان اپنے پرسنل لا میں کوئی تبدیلی پسند نہیں کرتے ہیں تو اس سلسلے میں ہرگز کسی جبر سے کام نہیں لینا چاہیے۔

(۳) تیسری بات جو اس سلسلے میں مجھے عرض کرنی ہے وہ یہ ہے کہ مسلم پرسنل لا میں ترمیم کے بارے میں جو لوگ آواز اٹھا رہے ہیں ان کی طرف سے اگرچہ اب تک کوئی ایسی بات سامنے نہیں آئی ہے جس سے یہ پتہ چل سکے کہ مسلم پرسنل لا میں ان کو کیا باتیں قابل ترمیم معلوم ہو رہی ہیں اور ان کی ترمیمات کیا ہیں؟ بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید بے قیدی کی خواہش یا مغرب سے مرعوبیت ہی نے مل کر انھیں 'اصلاح' کا نعرہ لگانے پر آمادہ کر دیا ہے لیکن میرے خیال میں اس معاملے کے بعض پہلو ہمارے لیے بہر حال قابل توجہ ہو سکتے ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ جہاں تک قرآن وسنت کے مخصوص اور بنیادی احکام وہدایات کا تعلق ہے وہ اپنی جگہ قطعاً ناقابل ترمیم ہیں لیکن فقہاء کے عام اجتہادات واستنباطات یہ حیثیت نہیں رکھتے۔ بلکہ حالات وظروف میں تبدیلیوں کے بعد ان پر نظر ثانی کی ضرورت ہو سکتی ہے اس لیے اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ بلکہ ایک حد تک حالات کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ایک طرف نئے حالات ومسائل کے سلسلے میں جو اس دور کی پیداوار ہیں اور جن سے ہمارے ائمہ اور مجتہدین کو واسطہ پیش نہیں آیا تھا، صحیح شرعی نقطۂ نظر متعین کرنے کی کوشش کریں اور دوسری طرف ان اجتہادات واستنباطات کا بھی اس حیثیت سے جائزہ لیں کہ بدلے ہوئے حالات میں ان کو بعینہٖ باقی رکھنے کی ضرورت ہے یا ان میں ترمیم کی ضرورت ہے اور اس کی گنجائش بھی ہے لیکن یہ بات پوری طرح واضح رہنی چاہیے کہ یہ خود مسلمانوں کے اپنے بلکہ صحیح معنوں میں ان کے علماء اور ماہرین شریعت کا کام ہے نہ کہ ان لوگوں کا جو اگرچہ اپنی بزدلی اور کم ہمتی کی بنا پر اب تک اپنے کو مسلمانوں میں شامل کیے ہوئے ہیں لیکن حقیقتاً اسلام سے اپنا رشتہ منقطع کر چکے ہیں اور جہاں تک حکومت کا تعلق ہے، اس پر پورے زور وقوت سے یہ بات واضح کر دینی چاہیے کہ وہ ہرگز اس کی مجاز نہیں ہے کہ اس میں کسی طرح کی مداخلت

کرے اور نہ اس طرح کی مداخلت کے مسلمان کسی حال میں روادار ہوسکتے ہیں۔
یہاں اس بات کا اظہار غالباً نامناسب نہ ہوگا کہ جہاں تک فقہی اجتہادات کا تعلق ہے ہمارے علماء اس کے منکر نہیں ہیں کہ حالات کے جدید تقاضوں پر غور و فکر کرنے اور ان کے بارے میں صحیح اسلامی نقطۂ نظر متعین کرنے کی ضرورت ہے۔ نیز وہ اپنی فقہ کی بہت سی قدیم جزئیات پر نظر ثانی کی ضرورت کے بھی قائل رہے ہیں۔ چنانچہ خود ہندوستان میں اس سے پہلے یہ ہو چکا ہے کہ خود علماء ہی کی کوششوں سے ۱۹۳۹ء میں قانونِ انفساخِ نکاح پاس ہوا ہے جس کی رو سے مسلمان عورتوں کے لیے اپنے غلط کار، ناکارہ یا مفقود الخبر شوہروں سے رستگاری حاصل کرنے کی صورتیں فقہ مالکی کے مطابق طے کی گئی ہیں۔ اس بنا پر اس وقت کے حالات و ضروریات کے پیش نظر غور و فکر اور نظر ثانی کے لیے کوئی متعین صورت اختیار کرنا بہرحال مناسب ہی ہوگا۔ کیونکہ بات یہ ہے کہ جو غیر مسلم یا نام نہاد مسلمان پرسنل لا میں ترمیم و اصلاح کی ضرورت کے قائل یا اس کے طالب ہیں وہ سب کے سب وہی نہیں ہیں جو مذہب سے کوئی واسطہ یا لگاؤ نہیں رکھنا چاہتے اور صرف مغرب کی تقلید ان کے پیش نظر ہے۔ بلکہ ان میں بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جو درحقیقت اسلام یا اسلامی تعلیمات سے پوری طرح واقف ہی نہیں ہیں اس لیے بسا اوقات تو ایسا ہوتا ہے کہ مسلم معاشرے کی بہت سی خرابیوں کو جو درحقیقت شریعت پر عمل درآمد کے نہیں بلکہ اس سے گریز کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہیں، ان کو محض اس بنا پر کہ وہ مسلم معاشرے میں پائی جاتی ہیں۔ اسلام کی طرف منسوب کر دیتے ہیں اور پھر وہ ان کے ازالے کے لیے مسلم شریعت میں ترمیم کی ضرورت کا شور مچاتے ہیں، مثلاً مسلمان عورتوں کی بہت ساری حق تلفیاں محض شریعت پر عمل درآمد سے گریز کے نتیجے میں ظہور میں آتی ہیں اور شریعت میں ان کا پورا پورا تحفظ موجود ہے، مگر ناواقف لوگ خواہ مخواہ ان حق تلفیوں کے لیے شریعت ہی کو براہ راست ذمہ دار سمجھتے ہیں۔ اس طرح بہت سے لوگ اپنی ناواقفیت کی بنا پر بہت سے اسلامی احکام و ہدایات کی حکمتوں اور باریکیوں سے ناآشنا رہتے ہیں اور بے وجہ ان پر اعتراضات شروع کر دیتے ہیں۔ مثلاً تعدد ازدواج کا مسئلہ جو اس وقت خاص طور سے ہمارے جدید تعلیم یافتہ مذہب سے ناواقف طبقے کے لیے خاص نشان ملامت بنا ہوا ہے۔ اس بنا پر اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ لوگوں کو اسلام اور اس کی تعلیمات سے واقف کرانے کی پوری پوری کوشش کی جائے تاکہ وہ یہ سمجھ سکیں کہ بہت سی خرابیوں کی اصلاح کے سلسلے میں کسی جدید قانون سازی کی یا قدیم قانون شریعت میں کسی ترمیم

ضرورت نہیں ہے بلکہ اس پر عمل پیرا ہونا اور عمل پیرا کرانے کی صورتیں اختیار کرنا اصلاح کے لیے بالکل کافی ہے اور شریعت کی جن باتوں پر وہ اپنی ناواقفیت کی بنا پر معترض ہیں انھیں یہ بتایا جائے کہ ان کی حکمتیں اور مصلحتیں کیا ہیں۔ مثلاً تعدد ازدواج کے مسئلے میں انھیں یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ شریعت نے اس کی گنجائش کن حالات میں رکھی ہے اور اس کے حقیقی وجوہ و اسباب کیا ہیں؟ اور یہ معاشرے کو بہت سی معاشرتی خرابیوں سے بچانے کے لیے کس درجہ ضروری ہے؟

لیکن اس ضمن میں یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ شریعت کے کسی جزوی حکم کی معقولیت اور حکمت ثابت کرنے کے لیے تنہا اس جزو کی تفصیلات پر گفتگو کرنا کافی نہیں ہوگا۔ کسی جزوی حکم کی حکمت و معقولیت اس وقت تک واضح نہیں ہوسکتی جب تک کہ پورے اسلامی نظام میں اسے رکھ کر اس کی حیثیت واضح نہ کی جائے۔ اس لیے درحقیقت اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم لوگوں کو پورے نظام اسلام سے صحیح طور سے واقف کرانے کی کوشش کریں۔ یہ ہماری ایک شرعی ذمہ داری بھی ہے اور اصلاح و ترمیم کے زور وشور کو ختم کرنے کا ایک کامیاب راستہ بھی ہے اور یہ واضح بات ہے کہ اس کے لیے ہمیں نشر و اشاعت کے لیے ایک وسیع نظام قائم کرنا پڑے گا۔ کاش امت اس کے لیے آمادہ ہوسکے۔

اس سلسلے کی ایک مزید بات مجھے یہ بھی عرض کرنی ہے کہ نظام اسلام کا تعارف بھی اس کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا کہ ہم اسلام کے بنیادی تصورات کو اپنی صحیح شکل میں لوگوں کے سامنے پیش کریں۔ یعنی یہ کہ اس دنیا کا خالق و مالک اور اس کا حقیقی حکمراں اللہ تعالیٰ ہے اور دنیا میں بندے کی حیثیت ایک آزاد خود مختار وجود کی نہیں ہے بلکہ اس کا ہر طرح بندہ و محکوم ہے اور دینی و دنیاوی تمام کامیابیوں کا دار و مدار محض اسی کی اطاعت پر ہے۔ اسلام کا اس حیثیت سے تعارف کا یہ فائدہ تو خیر حاصل ہوگا ہی کہ اسلامی شریعت اپنی صحیح روح و شکل میں لوگوں کے سامنے آسکے گی لیکن اس کا ایک ضمنی فائدہ یہ بھی ہوگا کہ لوگوں کے لیے یہ سمجھنا بھی آسان ہو جائے گا کہ مسلمان کیوں اپنی شریعت ہی پر عمل کرنا چاہتے ہیں اور اس میں کیوں کسی کی مداخلت کے روادار نہیں ہیں اور اس کے نتیجے میں عام مسلمان بھی اس سے واقف ہوسکیں گے کہ اسلام پر عمل درآمد کے سلسلے میں آسانیاں اور سہولتیں حاصل کرنے کے لیے بقدر وسعت جد و جہد کرنے کی کتنی بڑی ذمہ داری ہے۔

یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہندستان میں ایک مدت دراز سے اسلامی شریعت کا صرف وہ جزو کسی درجے میں نافذ العمل ہے جس کا تعلق انسان کے شخصی احوال زندگی سے ہے اس کے علاوہ معاملات میں

انھیں چار و نا چار رائج الوقت قوانین ہی کی اطاعت کرنی پڑتی ہے۔

آخر میں یہ بھی گزارش کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اسلام کے تعارف کے لیے محض تقریروں اور کتابوں وغیرہ پر تکیہ کر لینا ہی کوئی صحیح بات نہیں ہوسکتی۔ بلکہ اس کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے عمل کو بھی اس کے تعارف کا ذریعہ بنائیں۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ جن باتوں پر عمل درآمد کے سلسلے میں کوئی بیرونی رکاوٹ موجود نہیں ہے، خود ان کے سلسلے میں بھی ہمارا عمل سراسر اسلام کے خلاف ہو رہا ہے۔ جس کی بنا پر ہم خود اسلام کی رسوائی کے بھی موجب بن رہے ہیں۔

یہ چند باتیں تھیں جو مختصر طور سے میں نے عرض کی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ میری ان معروضات پر سنجیدگی کے ساتھ غور فرمایا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہماری مشکلات میں ہماری رہنمائی فرمائے اور ہندستان میں اسلام اور مسلمانوں کے بقاء و تحفظ کے لیے جو عظیم کام ہمیں درپیش ہیں۔ ان میں ہماری مدد فرمائے۔ ہم سب بہت کمزور ہیں اور کاموں کا بوجھ بہت بھاری ہے۔ مگر خدائے قوی و بزرگ کا سہارا سب سے بڑا سہارا ہے۔ اسی کے سہارے ہم نے اس طوفانی سمندر میں اپنی کشتی ڈالی ہے اور اسی کی ذات سے امید ہے کہ اس کشتی کو ساحل سے ہم کنار فرمائے گا

ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا وھب لنا من لدنک رحمۃ انک انت الوھاب
ربنا افرغ علینا صبرا و توفنا مسلمین ٥ و اٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

شرائط ایجنسی

(۱) ایجنسی کم سے کم ۵ رسائل پر دی جائے گی۔

(۲) رسائل حسب ضرورت طلب کیے جائیں۔ اگر فروخت نہ ہوئے تو واپس نہیں لیے جائیں گے۔

(۳) کمیشن ۲۵ فی صدی دیا جائے گا۔ البتہ ۵۰ یا زائد رسالوں کی خریداری پر کمیشن ۳۳ فی صدی ہوگا۔

(۴) رسائل کی روانگی کا صرفہ ہمارے ذمے ہوگا۔ اور رجسٹری یا وی پی کا خرچ ایجنٹ صاحبان کے ذمہ ہوگا۔

(۵) رقم ہر حال میں پیشگی آنی چاہیے یا پھر وی پی بھیجنے کی اجازت دی جائے۔ وی پی کے مصارف زیادہ ہوں گے۔

منیجر رسالہ زندگی رام پور

انسانی تمدّن میں نکاح کی حیثیت

(مولانا محمد یوسف اصلاحی)

نکاح دراصل انسانی تمدن کی جڑ ہے۔ نکاح مرد و عورت کا صرف ایک شہوانی تعلق ہی نہیں ہے بلکہ ایک انتہائی سنجیدہ معاشرتی اور پاکیزہ اخلاقی تعلق بھی ہے، اسی سے انسانی تمدن کی بنا ہوئی اور اسی سے وہ برقرار رہ سکتا ہے۔

اسلام میں مرد و عورت کے تعلق کی یہی ایک جائز اور صحیح شکل ہے اس کے سوا ہر نوعیت کا تعلق ناجائز اور حرام ہے۔ اسلام نکاح کے ذریعہ مرد و عورت میں باہمی اتحاد، یک جہتی، رفاقت، تعاون اور محبت و الفت پیدا کر کے تمدن و تہذیب کی تعمیر چاہتا ہے۔ نکاح کی تاکید کرتا ہے اور طرح طرح سے اس کی ترغیب دیتا ہے واقعہ یہ ہے کہ عورت و مرد کے تعلق کی درستی پر پورے انسانی تمدن کی درستی اور اس کے بگاڑ پر پورے انسانی تمدن کے بگاڑ کا مدار ہے۔ اسی لیے اسلام نکاح کو زیادہ سے زیادہ آسان اور مقبول بنانا چاہتا ہے اور اس تعلق کی استواری اور خوش گواری کو انسانیت کے حق میں سب سے بڑی رحمت قرار دیتا ہے۔

نکاح، مرد و عورت کے تعلق کی ایک ہی صحیح شکل

وَاُحِلَّ لَکُمْ مَّا وَرَآءَ	ان محرمات کے سوا جتنی عورتیں ہیں سب تمہارے
ذٰلِکُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِکُمْ	لیے حلال ہیں مگر (صرف اسی شکل میں) کہ اپنے مال خرچ
مُّحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ ؕ	کر کے ان کو اپنے نکاح میں لے آؤ۔ نہ یہ کہ آزاد
(النساء - ۲۴)	شہوت رانیاں کرنے لگو۔

اس ٹکڑے سے پہلے ان عورتوں کا ذکر ہے جن سے نکاح حرام ہے۔ ان محرمات کے علاوہ مرد جس عورت سے چاہے تعلق جوڑ سکتا ہے لیکن تعلق جوڑنے کی ایک ہی صحیح شکل ہے کہ ان کے مہر ادا کر کے شرعی قانون

کے مطابق ان سے نکاح کیا جائے۔ شرعی نکاح کے بغیر مرد و عورت کا شہوانی تعلق قرآن کے نزدیک حرام ہے اور ایسا تعلق جوڑنے والے مجرم ہیں۔

فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ۚ وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

(النساء - ۲۵)

تو ان باندیوں کے سرپرستوں کی اجازت سے ان سے نکاح کرلو۔ اور معروف دستور کے مطابق ان کے مہر بھی ادا کردو تاکہ وہ تمہارے حصار نکاح میں محفوظ ہوکر رہیں کھلم کھلا بدکاریاں نہ کرتی پھریں اور نہ چوری چھپے آشنائیاں کرتی پھریں۔ اور اگر تمہارے حصار نکاح میں محفوظ ہونے کے بعد بھی کسی بدکاری کا ارتکاب کر بیٹھیں تو ان پر اس سزا کی بہ نسبت آدھی سزا ہے جو خاندانی آزاد عورتوں کے لیے ہے۔ یہ سہولت ان لوگوں کے لیے رکھی گئی ہے جنہیں شادی نہ ہونے کی صورت میں گناہ کر بیٹھنے کا اندیشہ ہو اور اگر تم صبر سے کام لو (اور اپنے شہوانی جذبات پر قابو رکھو) تو یہ تمہارے حق میں بہت زیادہ بہتر ہے (اور اگر کبھی نادانستہ کوئی کوتاہی کر بیٹھو تو فوراً توبہ کرلو) اللہ تعالیٰ بہت زیادہ معاف فرمانے والا ہے اور بہت زیادہ رحم کرنے والا ہے (اسی لیے تو اس نے تمہارے لیے یہ سب سہولتیں مہیا کی ہیں)۔

انسانی تمدن و معاشرت کی بنیاد مرد و عورت کی باہمی رفاقت سے پڑتی ہے اور اسلام کے نزدیک مرد و عورت کے تعلق کی صرف ایک ہی صحیح شکل ہے اور وہ نکاح کا پختہ اور پاکیزہ معاہدہ ہے۔ اس کے سوا تعلق کی ہر نوعیت غلط ہے۔ الا یہ کہ کوئی عورت کسی شخص کی مملوکہ و مقبوضہ لونڈی ہو۔

نکاح ہمیشہ سے صالحین کا طریقہ

يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوبَ عَلَيْكُمْ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝ (النساء-۲۶)

اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تم پر ان طریقوں کو واضح کرے اور انہیں طریقوں پر تمہیں چلائے، جن کی پیروی تم سے پہلے گزرے ہوئے صالحین (ہمیشہ سے) کرتے رہے ہیں۔ خدا اپنی رحمت کے ساتھ تمہاری طرف متوجہ ہونے کا ارادہ رکھتا ہے اور وہ علم و حکمت والا ہے۔

نکاح انبیاء کی سنت

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّيَّةً (الرعد)

اور اے محمد! آپ سے پہلے بھی ہم نے رسول بھیجے اور ان کو بیوی بچوں والا بنایا تھا۔

بعض دین سے نا آشنا لوگ نکاح کو روحانی اور اخلاقی ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے ہیں اور تجرد و رہبانیت کو روحانی ترقی کا ذریعہ سمجھتے ہیں لیکن قرآن حکیم کی صاف شہادت یہ ہے کہ روحانی ترقی کی معراج پر پہنچے ہوئے اکثر رسولوں کی سنت نکاح ہے اور وہ سب بیوی بچوں والے تھے۔

نکاح ایک پختہ عہد

وَاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيثَاقًا غَلِيظًا (النساء)

اور عورتیں تم سے پختہ عہد لے چکی ہیں۔

نکاح کو "پختہ عہد" کہہ کر قرآن نے اس حقیقت کی طرف متوجہ کیا ہے کہ اس عہدِ نکاح کو زندگی بھر نباہنے کی پوری پوری کوشش کی جائے۔ اس کے تقاضے پورے کرنے میں فراخ دلی کا ثبوت دیا جائے۔ ایسی کوئی حرکت ہرگز نہ کی جائے جس سے یہ پختہ عہد کمزور پڑتا ہو اور اس پاکیزہ معاہدے کو اسی وقت توڑا جا سکتا ہے جب اس کے نباہنے کے تمام امکانات واقعی ختم ہو جائیں اور علیحدگی کے سوا فی الواقع کوئی چارۂ کار نہ رہ جائے۔

نکاح ایک سنجیدہ اور بامقصد تعلق

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ (البقرۃ ۲۲۳)

تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں تمہیں اختیار ہے کہ جس طرح چاہو اپنی کھیتیوں میں جاؤ۔

عورت اور مرد کا تعلق محض شہوانی تسکین کا جذباتی تعلق ہی نہیں ہے بلکہ انتہائی سنجیدہ اور بامقصد تعلق ہے، ان دونوں کی مثال کھیت اور کسان کی سی ہے۔ مرد نسل انسانی کا کسان ہے اور عورت انسانیت کی کھیتی، کھیت میں ایک کسان محض تفریح اور سیر کے لیے ہرگز نہیں جاتا۔ بلکہ اس مقصد سے جاتا ہے کہ

پیداوار حاصل کرے۔ اس لیے نسل انسانی کے اس کسان کو نسل انسانی کی کھیتی کے پاس اسی مقصد سے جانا چاہیے کہ نسل کی پیداوار حاصل کرنی ہے۔

نکاح صالح اولاد کے لیے

وَقَدِّمُوا لِاَنْفُسِكُمْ (البقرہ ۲۲۳) اور اپنے مستقبل کی فکر کرو۔

یہ انتہائی جامع الفاظ ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ نکاح کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ تم نکاح کے ذریعے اپنی نسل کو برقرار رکھنے کی کوشش کرو تاکہ تمہارے دنیا چھوڑنے سے پہلے تمہاری جگہ دوسرے کام کرنے والے پیدا ہوں، اور یہ فکر بھی کرو کہ آنے والی نسلیں دین و اخلاق اور انسانیت کے جوہر دل سے پوری طرح آراستہ اٹھیں۔ مسلمانوں کے تابناک مستقبل کا انحصار اس بات پر ہے کہ آنے والی نسلیں دین و ایمان، اخلاق و کردار اور شرافت و انسانیت سے آراستہ ہوں اور ان کے وجود سے دنیا میں خیر و صلاح کی روشنی پھیلے۔

نکاح قیام تمدن کی بنیاد

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَائِكُمْ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَاءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ

(النور:۔ ۳۲-۳۳)

اور تم میں سے جو لوگ مجرد ہوں اور تمہاری لونڈی غلاموں میں جو صالح ہوں ان کے نکاح کر دو۔ اگر وہ نادار ہوں گے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے غنی کر دے گا۔ اور جو نکاح کی وسعت نہ رکھتے ہوں انہیں چاہیے کہ پاک دامنی اختیار کیے رہیں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے فضل سے غنی کر دے۔

قرآن ہر مرد و عورت کو نکاح کی تاکید کرتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ آدمی اپنی شہوانی حاجت صرف اسی مستقل پائیدار اور معلوم و معروف طریقے سے پوری کرے، نکاح کے سوا مرد و عورت کا ہر شہوانی تعلق حرام ہے اور انسانیت کے لیے تباہ کن ہے۔ اسی لیے قرآن معاشرے میں کسی مرد یا عورت کو بن بیاہا دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ اور پورے معاشرے کو اس مسئلے سے دلچسپی لینے کی ہدایت کرتا ہے، اور اگر کوئی مفلس نکاح کا موقع نہ پاتا ہو تو اس کو بھی یہ حکم دیتا ہے کہ وہ اپنے جوہر انسانی کی حفاظت کرے لطف اندوز

کے آزادانہ مواقع تلاش کرکے اپنی پاک دامنی کو داغ دار نہ بنائے اور انسانی تمدن کی جڑ نہ کاٹے بلکہ انتظار کرے کہ اللہ تعالیٰ اسے اتنی وسعت بخشے کہ وہ نکاح کے پاکیزہ رشتے کو استوار کرسکے اور ایک نئے گھر اور خاندان کی بنیاد ڈال سکے۔

نکاح انسانی تمدن کے قیام کا واحد ذریعہ ہے۔ کیونکہ تمدن کی تو پیدائش تب ایک مرد و عورت کے مل کر رہنے ایک گھر اور خاندان وجود میں لانے اور پھر خاندانوں کے درمیان رشتے اور رابطے پیدا ہونے سے ہوئی ہے۔ اگر مرد و عورت کو یہ آزادی مل جائے کہ وہ گھر اور خاندان کی تخلیق سے قطع نظر محض لطف و لذت کے لیے ملیں اور الگ ہو جائیں تو سارے انسان بکھر کر رہ جائیں اور اجتماعی زندگی کی جڑ کٹ جائے اور وہ بنیاد ہی باقی نہ رہے جس پر تہذیب و تمدن کی عمارت اٹھتی ہے۔ اسی لیے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کی ذمہ دارانہ زندگی سے منہ موڑنے والوں کو یہ سخت ترین وعید سنائی ہے کہ " ایسے لوگوں سے میرا کوئی واسطہ نہیں حقیقت بھی یہ ہے کہ نکاح کے پاکیزہ رشتے کو چھوڑ کر دوسرے ذرائع سے اپنی حاجتوں کو پورا کرنے والے معاشرے کے سخت ترین مجرم اور انسانی تمدن کے بدترین دشمن ہیں ایسے لوگوں کا نہ رسول خدا سے کوئی واسطہ ہے اور نہ اسلامی معاشرے میں ان کے لیے کوئی گنجائش ہے۔

نکاح نوعِ انسانی کے بقا کا ذریعہ

یٰاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ	لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس
الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ	نے تمہیں ایک ذات سے پیدا کیا ہے اور اسی سے
وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا	اس کا جوڑا بنایا پھر ان دونوں سے بہت سے
رِجَالًا كَثِیْرًا وَّنِسَآءً (النساء-۱)	مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیے۔

نوعِ انسانی کے بقاء کا انحصار اس بات پر ہے کہ عورت اور مرد کا باہمی تعلق نکاح کے مستقل اور پائیدار عہد وفا پر استوار ہو اور یہ دونوں محض وقتی لذت کے لیے ملنے اور الگ ہونے میں آزاد نہ ہوں کیونکہ اس کے بغیر نسل انسانی ایک دن کے لیے نہیں چل سکتی۔ انسانی بچہ اپنی زندگی اور انسانی نشو و نما کے لیے کئی برس کی دردمندانہ نگہداشت اور تربیت کا محتاج ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب دونوں کی رفاقت پائدار اور معلوم و معروف ہو اور دونوں کے درمیان مستقل تعاون ہو۔

نکاح رحمت و مودت کی بنیاد

وَمِنْ اٰیٰتِہٖ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ	اور اللہ کی نشانیوں میں سے ایک (اہم)
اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْا اِلَیْھَا	نشانی یہ ہے کہ اس نے تمہاری ہی جنس سے تمہاری
وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً۔	بیویاں بنائیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل
(الروم ۲۱)	کرو اور تمہارے درمیان محبت و رحمت پیدا کردی

نکاح وجہ سکون

ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ	وہ خدا ہی ہے جس نے تمہیں ایک جان سے
وَّجَعَلَ مِنْھَا زَوْجَھَا لِیَسْکُنَ اِلَیْھَا	پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا کہ
(اعراف۔ ۱۸۹)	اس کے پاس سکون حاصل کرے۔

یہاں سکون سے مراد اصلاً تو شہوانی سکون ہی ہے لیکن یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ جائز شہوانی سکون پوری زندگی میں سکون و اطمینان کے ہم معنی ہے، اور اس جائز سکون سے محرومی پوری زندگی میں انتشار اور تباہی کے ہم معنی ہے۔ یہ شہوانی سکون خدا کی بہت بڑی نعمت ہے اور اس کا کھلا ہوا تقاضا یہی ہے کہ مومن اس سکون کو خدا کی مرضی اور خدا کے قانون کے مطابق ہی حاصل کرے۔

نکاح حفاظتِ عصمت کا ذریعہ

ھُنَّ لِبَاسٌ لَّکُمْ وَاَنْتُمْ	عورتیں تمہارے لیے لباس ہیں اور تم عورتوں
لِبَاسٌ لَّھُنَّ (البقرۃ ۱۸۷)	کے لیے۔

جس طرح لباس انسانی جسم کی پردہ پوشی کرتا ہے اور ہر طرح سے حفاظت کرتا ہے، ٹھیک اسی طرح ایک عورت مرد کی پردہ پوش بنتی ہے اور اس کے جوہر عصمت کی حفاظت کرتی ہے اور مرد عورت کی پردہ پوشی کرتا ہے اور اس کی عفت و عصمت کا محافظ بنتا ہے، اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر نوجوان کو تاکید فرمائی ہے کہ "جو نوجوان بھی نکاح کر سکتا ہو وہ ضرور نکاح کرے۔ کیونکہ یہ نگاہ کو بدنظری سے بچانے اور آدمی کی عفت کو قائم رکھنے کا بڑا ذریعہ ہے۔ ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا اس شخص کی مدد اللہ کے ذمہ ہے جو پاک دامن رہنے کے لیے نکاح کرے۔

نکاح خانہ آبادی کا ذریعہ

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ	اور پاک دامن مومن عورتیں اور پاک دامن
الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ	اہل کتاب عورتیں بھی تمہارے لیے حلال ہیں ۔
مِنْ قَبْلِکُمْ اِذَآ اٰتَیْتُمُوْھُنَّ اُجُوْرَھُنَّ	بشرطیکہ تم ان کے مہر ادا کرکے ان کے محافظ
مُحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ وَ لَا	بنو نہ یہ کہ آزاد شہوت رانیاں کرنے لگو اور
مُتَّخِذِیْٓ اَخْدَانٍ (المائدہ ۔ ۵)	چوری چھپے آشنائیاں کرو ۔

نکاح انسانی جوہر عصمت کی حفاظت کے لیے ایک مضبوط قلعہ ہے اور اس کا مقصود یہ ہے کہ آدمی خانہ آبادی کرکے اپنی تمام شہوانی قوتوں کو سمیٹ کر گھر میں مرکوز کرے اور ہر طرح کی آوارگی اور بدکرداری سے اپنے کو بچا کر ایک نئے خاندان کی بنیاد ڈالے ۔

نکاح کی تاکید

وَاَنْکِحُوا الْاَیَامٰی مِنْکُمْ	اور تم میں سے جو لوگ مجرّد ہوں
وَالصّٰلِحِیْنَ مِنْ عِبَادِکُمْ وَاِمَآئِکُمْ	اور تمہارے غلاموں اور باندیوں
اِنْ یَّکُوْنُوْا فُقَرَآءَ	میں سے جو صالح ہوں ان کے
یُغْنِھِمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ	نکاح کر دو ۔ اگر وہ غریب ہوں گے
وَاللّٰہُ وَاسِعٌ	تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے انہیں خوش حال
عَلِیْمٌ ٥	کر دے گا ۔ اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والا اور
(النور ۔ ۳۲)	(سب کچھ) جاننے والا ہے ۔

اَیامیٰ سے مراد وہ تمام مرد اور عورتیں ہیں جو بے زوج ہوں ۔ اَیامیٰ ' ایم کی جمع ہے ۔ ایم ہر اس عورت کو کہتے ہیں جس کا شوہر نہ ہو اور اسی طرح ہر اس مرد کو کہتے ہیں جس کی کوئی بیوی نہ ہو ۔

قرآن حکیم تاکید کرتا ہے کہ تمام غیر شادی شدہ مردوں اور عورتوں کے نکاح کیے جائیں اور معاشرے میں کسی مرد اور عورت کو بن بیاہا نہ رہنے دیا جائے ۔ حتّٰی کہ لونڈی غلاموں کو بھی بن بیاہا نہ رکھا جائے ۔ قرآن اپنے اس حکم میں صرف صاحب معاملہ نوجوانوں ہی کو تاکید نہیں کرتا بلکہ عام مسلمانوں کو خطاب فرماتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ خاندان کے لوگ ' دوست احباب ' رشتہ دار اور پڑوسی سب ہی اس معاملے

میں دلچسپی لیں اور جس کا کوئی نہ ہو اس کے نکاح میں خود حکومت مدد کرے۔

پھر نکاح کی ترغیب دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا۔ "اگر وہ غریب ہیں تو اللہ تعالیٰ انہیں غنی کر دے گا"۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر نکاح کرنے والا لازماً مال دار ہو جائے گا بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس معاملے میں لوگ بہت زیادہ حسابی بن کر نہ رہ جائیں۔ اس فقرے میں نکاح کرنے والے مرد و عورت اور ان کے متعلقین کی ذہنی اصلاح کے لیے اہم اشارات فرمائے گئے ہیں۔

لڑکی والوں کو یہ ہدایت ہے کہ اگر ان کے یہاں کسی شریف اور صالح لڑکے کا پیغام آئے تو وہ محض اس کی ناداری دیکھ کر انکار نہ کر دیں، لڑکے والوں کو تلقین ہے کہ وہ کسی نوجوان کو محض اس لیے نہ بٹھائے رکھیں کہ وہ بہت زیادہ نہیں کما رہا ہے۔ اور خود نوجوانوں کو نصیحت ہے کہ وہ بہت کشائش اور خوش حالی کے انتظار میں اپنی شادی کو خواہ مخواہ نہ ٹالتے رہیں۔ جو تھوڑی بہت آمدنی بھی ہو خدا پر بھروسہ کر کے شادی کر ڈالنا چاہیے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ خود شادی آدمی کے حالات درست کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ بیوی کی مدد سے اخراجات قابو میں آ جاتے ہیں۔ ذمہ داریاں سر پر آ جانے کے بعد خود بھی آدمی پہلے سے بہت زیادہ محنت کرنے لگتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کسے معلوم کہ مستقبل میں کس کے لیے کیا لکھا ہے اور کس کو اللہ تعالیٰ کیا بنانے والا ہے۔ اس لیے آدمی کو نکاح کے معاملے میں ایک حد تک تو اپنی آمدنی کا لحاظ کرنا چاہیے۔ لیکن بہت زیادہ حسابی بننے سے پرہیز کرنا چاہیے۔

نکاح میں ایمان و اسلام کی اہمیت

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ۚ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ۚ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ۚ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۚ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ

(مسلمانو!) تم مشرک عورتوں سے ہرگز نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں۔ ایک مومن باندی مشرک شریف زادی سے بہتر ہے اگرچہ وہ تمہیں کتنی ہی بھلی لگے اور اپنی عورتوں کے نکاح مشرک مردوں سے کبھی نہ کرنا جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں ایک مومن غلام مشرک شریف سے بہتر ہے اگرچہ وہ تمہیں بہت پسند ہو۔ یہ مشرک تمہیں آگ

وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝ (البقرۃ ۲۲۱)

کی طرف بلا رہے ہیں اور اللہ تعالےٰ اپنے اذن سے تم کو جنت اور مغفرت کی طرف بلا رہا ہے۔ وہ اپنے احکام کھول کھول کر لوگوں کے سامنے بیان کرتا ہے تاکہ وہ سبق لیں اور نصیحت حاصل کریں۔

قرآن ایک مومن کو ہرگز یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ کسی مشرکہ سے رشتہ نکاح قائم کرے اسی طرح وہ ایک مومنہ کو بھی یہ اجازت ہرگز نہیں دیتا کہ وہ کسی مشرک سے عقد نکاح باندھے۔ کیونکہ نکاح محض ایک شہوانی تعلق نہیں ہے بلکہ وہ ایک سنجیدہ تمدنی، اخلاقی اور قلبی تعلق ہے۔ اور ایک مومن یہ قلبی تعلق صرف ایک مومن ہی سے قائم کرسکتا ہے۔ ایک مشرک زوجِ حیات کے افکار و خیالات و طریق کے اثرات نہ صرف یہ کہ شخص متعلق پر پڑیں گے اور اس کے دین و ایمان کو خطرہ لاحق ہوگا بلکہ اس کی آنے والی نسل بھی اس کے گھناؤنے اثرات سے متاثر ہوگی۔ اور ایک مومن ہرگز اس بات کو گوارا نہیں کرسکتا کہ محض شہوانی جذبات کی تسکین کی خاطر وہ اپنی نسلوں کے دین و ایمان کو خطرے میں ڈالے۔

پاکیزہ مردوں کے لیے پاکیزہ عورتیں ہی ہیں

اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَ الْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ (النور-۲۶)

خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لیے ہیں اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لیے، پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لیے ہیں اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لیے۔"

یعنی پاکیزہ لوگوں کا جوڑا پاکیزہ لوگوں ہی سے لگ سکتا ہے، نہ یہ مناسب ہے کہ کوئی پاکیزہ مرد کسی کمینی اور خبیث عورت سے تعلق جوڑے اور نہ یہ جائز ہے کہ کوئی پاکیزہ عورت کسی کمین اور خبیث مرد سے رشتہ جوڑے، اور نہ ایسے جوڑوں سے ان رحمتوں اور برکتوں کی توقع کی جاسکتی ہے جن کے لیے اسلام نے نکاح کو مشروع قرار دیا ہے۔

زانیہ عورتوں سے نکاح نہ کیا جائے

وَالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ وَحُرِّمَ

اور زانیہ عورت کے ساتھ زانی مرد یا مشرک کا نکاح ہی موزوں ہے اور صالح اہل ایمان پر

ذَالِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (النور ۳)   یہ حرام کر دیا گیا ہے۔

زناکار مردوں سے نکاح نہ کیا جائے۔

اَلزَّانِیْ لَا یَنْكِحُ اِلَّا زَانِیَةً   زانی مرد کا نکاح زانیہ یا مشرکہ کے ساتھ ہی

اَوْ مُشْرِكَةً۔ (النور ۳)   موزوں ہے۔

یعنی جو لوگ کھلم کھلا بدکاریوں میں مبتلا ہیں ان کے رشتے صالح لڑکیوں کے ساتھ ہرگز نہ ہونے چاہیں اہل ایمان کے لیے یہ حرام ہے کہ وہ جانتے بوجھتے اپنی بیٹیاں بدکاری کی عادت رکھنے والے زناکاروں کو دیں اور اسی طرح صالح مومنوں کے لیے بھی یہ بات حرام ہے کہ جن عورتوں کی بدچلنی کا حال انہیں معلوم ہو ان سے دانستہ نکاح کریں۔

(رسائل و مسائل کا بقیہ) اس وقت چونکہ شرعی اصطلاح کے لحاظ سے غلاموں اور لونڈیوں کا وجود نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ جس موضوع پر مقالہ لکھا گیا ہے اس سے یہ مسئلہ غیر متعلق تھا اس لیے لونڈیوں کے مسئلے کی تشریح نہیں کی گئی۔ یہ خود ایک علیحدہ اسلامی مسئلہ ہے جس پر اعتراض کیا جاتا ہے اور اس اعتراض کے جواب میں علماء نے بہت کچھ لکھا بھی ہے

امید ہے کہ اس توضیح کے بعد ان عبارتوں سے غلط فہمی پیدا نہ ہوگی۔

(سید احمد قادری)

تعددِ ازواج تکثیرِ نسل کے لیے

"اگر کوئی خوش حال مسلمان، جو عدل کرنے پر قادر ہو محض اس نیت سے متعدد شادیاں کرے کہ مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہو تو اس نیکی پر اس کو ثواب ملے گا۔ اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:۔

"محبت کرنے والی اور خوب اولاد پیدا کرنے والی عورت سے نکاح کرو اس لیے کہ میں قیامت میں تمہاری کثرتِ تعداد پر فخر کروں گا۔"

شیخ عبدالحق محدث دہلوی
ترجمہ: سید احمد قادری

تقویت دین و ملت سے اونچا کوئی کام نہیں

(شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا مکتوب)

التعظیم لامر اللہ اور الشفقۃ علی خلق اللہ امر خداوندی کی تعظیم اور خلق خدا پر شفقت' بازوئے دین مسلمانی کے دو ایسے شہپر ہیں جن کی قوت کے بغیر قرب و رضائے الٰہی کے مقام تک پہنچنا محال ہے۔ اس راہ کے رہرووں کے درمیان' سرعت سیر' قوت سلوک اور قلیل مدت میں بارگاہ الٰہی تک پہنچ جانے میں تفاوت انہیں دو بازوؤں کی قوت کے اندازے سے ہوتا ہے جس شخص کے ان دو بازوؤں میں زور زیادہ ہوتا ہے وہ مقام قرب تک بہت آسانی سے اور بہت جلد پہنچ جاتا ہے۔ میں نے اس حقیقت کی تعبیر قوت بازو سے کی ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ توفیق الٰہی اگر مددگار رہو تو ان دو صفتوں (امر خداوندی کی تعظیم اور خلق خدا پر شفقت) کی وساطت سے قطعِ مسافت اس حد تک پہنچتی ہے کہ بعض رہرووں کی رفتار پرندے کی پرواز بن جاتی ہے اور وہ ایک لمحے میں اس مقام تک پہنچ جاتے ہیں جہاں دوسرے لوگ سخت محنت و مجاہدہ کے باوجود عمر کی ایک طویل مدت تک پہنچ نہیں پاتے۔

مردانِ حق ببالِ محبت چو بر پرند
اول قدم بکنگرۂ عرش جا کنند

مردانِ حق جب بازوئے محبت سے پرواز کرتے ہیں تو ان کا پہلا قدم عرش کی بلندی پر پڑتا ہے

ان دو صفتوں میں پہلی صفت یعنی امر الٰہی کی تعظیم اہم بھی ہے اور مقدم بھی ہے گویا یوں سمجھو کہ یہ پرندوں کے دو بازوؤں میں دہنا بازو ہے یا آدمیوں کے دو ہاتھوں میں سیدھا ہاتھ ہے جس طرح سیدھے ہاتھ میں قوت بھی زیادہ ہوتی ہے اور عمل پر قدرت بھی زیادہ ہوتی ہے اسی طرح قرب الٰہی کے حصول میں یہ صفت قوی تر سبب کی حیثیت رکھتی ہے

خلقِ خدا پر شفقت اگرچہ نسبت محبت کی تحصیل' رحمتِ الٰہی کی کشش' علاوہ آدمیت و طبیعت کی رعایت

اور طریقِ انصاف وشکرگزاریِ حق کے سیر وسلوک میں ایک بلند مقام رکھتی ہے۔ نیز یہ صفت فطرت کی سلامتی ہمت کی بلندی اور طبیعت کی پاکیزگی کی دلیل ہے۔ اجرِ جزیل اور دنیا وآخرت میں ثنائے جمیل کا سبب ہے، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود تعظیم امرِ الٰہی کا مقام، اعلائے کلمۂ اسلام اور دین وملت کی تقویت وتائید میں اس سے بہت زیادہ بلند ہے۔

وبحقیقت ہیچ صفتے وہیچ کارے	اور درحقیقت کوئی صفت اور کوئی کام
کہ باعث قبول وسفید روئی مرد در	جو بارگاہ الٰہی اور درگاہ نبوی میں قبولیت اور سفیدروئی
بارگاہ عزت ودرگاہ نبوت تواند شد	کا سبب ہو سکتا ہو اس سے بلند نہیں ہے کہ کوئی
بالاتر ازاں نیست کہ درتقویت دین و	شخص، دین وملت کی تقویت اور سنت کی ترویج
ملت وترویج وتائید سنت کوشد ودرآں	تائید میں کوشاں ہو۔ اس میدان میں اپنی پوری کوشش
بذل مجہود نماید ودر سواد آں لشکر اگرچہ	صرف کرے اور اگرچہ وہ تن تنہا ہو اس لشکر کی تعداد
تن تنہا باشد بیفزاید[۱]	میں اپنے وجود سے اضافہ کرے۔

امرِ الٰہی کی تعظیم کے معنی یہ ہیں کہ جس چیز کے بارے میں اللہ نے کہا ہے کہ "کرو" اسے کرے اور جس چیز کے بارے میں کہا ہے کہ "نہ کرو" اس سے باز رہے۔

بنائے اسلام کے دو رکن ہیں۔ اوامر کا امتثال اور نواہی سے اجتناب۔ یہ بات جان لینی چاہیے کہ طریقِ حق میں سیر وسلوک اور مقام قرب تک رسائی کے لیے نواہی سے اجتناب زیادہ اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اوامر کی تعمیل، نواہی کے ارتکاب کے ساتھ مفید نہیں ہے۔ اس کو یوں سمجھو کہ مرض سے شفا حاصل کرنے کے لیے مضر چیزوں سے پرہیز دواؤں کے استعمال سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ اگر کوئی مریض پرہیز نہ کرے تو نفع بخش دواؤں کے استعمال کے باوجود اسے صحت حاصل نہ ہوگی اور اگر وہ پوری

---

[۱] اس عبارت کی اہمیت کا صحیح اندازہ وہی شخص جان سکتا ہے جو اس تاریخی کشمکش سے واقف ہو جو اکبر کے دینِ الٰہی نے حق پرستوں اور باطل پرستوں کے درمیان برپا کی تھی۔ اس عظیم کشمکش کے استیصال میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے بڑا اہم رول ادا کیا تھا۔ یہ خط انھوں نے نواب فرید مرتضیٰ کو لکھا ہے اور اس میں پوری صراحت کے ساتھ ان کو دینِ حق کی حمایت کی ترغیب دی ہے۔ اس مختصر عبارت میں شیخ نے اپنے دینی جوش اور جذبۂ گرم کو ادبیت کے سانچے میں ڈھال دیا ہے بیان کے ادب پاروں میں ایک مؤثر ادب پارہ ہے۔ (مترجم)

احتیاطاً اور مبالغہ کے ساتھ نقصان دہ چیزوں سے پرہیز کرے تو دواؤں کے استعمال کے بغیر بھی شفا کی امید ہے ہاں اس صورت میں شفایابی میں دیر لگ سکتی ہے ۔ اور اگر پرہیز بھی کرے اور مفید دوائیں بھی استعمال کرے تو شفا جلد حاصل ہوگی ۔ یہی وجہ ہے کہ مشائخ طریقت نے فرمایا ہے کہ مقام قرب تک رسائی کے حصول میں تقویٰ اور پورے مبالغے کے ساتھ محرمات، مکروہات و مشتبہات سے پرہیز کو زیادہ دخل حاصل ہے ۔ اگر کوئی شخص اس کے ساتھ فرائض و واجبات اور سنن موکدہ پر اکتفا کرے اور تکثیر نوافل میں کوشش نہ کرے تو حصول مقصود کے لیے کافی ہے لیکن محرمات و منہیات کا ارتکاب کرتے ہوئے نوافل و مستحبات کی کثرت کوئی چیز نہیں ہے ۔ انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ فرائض میں سستی اور نوافل میں چستی، غرورِ نفس اور فریب شیطان کا اثر ہے ۔

یہاں ایک پہلو اور قابلِ غور ہے ۔ سوال یہ ہے کہ امتثالِ اوامر و اجتناب نواہی کے لیے تعظیم امر اللہ کی تعبیر کیوں اختیار کی گئی ۔ اس میں جو اشارہ مخفی ہے اسے سمجھنا چاہیے ۔ اشارہ یہ ہے کہ مجرد احکام کی تعمیل اور منہیات سے پرہیز کافی نہیں ہے بلکہ مومن کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ احکامِ الٰہی کی عظمت اس کے دل میں ہو اور اس کی زبان اس کا اعتراف و اظہار کرتی رہے ۔ شریعت کے اصول و ضوابط پر پورے جذبۂ احترام کے ساتھ نظر ڈالے ۔ اہل دین کی عزت کرے اس لیے کہ وہ خدا کے مقبول بندے ہیں اور رسول خدا کی طرف منسوب ہیں ۔ اہلِ بدعت و ضلالت اور اہلِ الحاد و اباحت کو ذلیل سمجھے ان کو آگے نہ بڑھائے، ان کی طرف التفات نہ کرے اور انہیں قابلِ اعتبار نہ سمجھے اس لیے کہ خدا کی رحمت سے دور اور اس کے مردود بندے ہیں ۔ ائمۂ دین نے فرمایا ہے کہ ملحدوں اور زندیقوں کی عزت کرنا فی الحقیقت انبیاء کرام کو زندہ کرنا ہے اس لیے کہ دین و شریعت کو لانے والے وہی ہیں ۔ جس شخص نے بھی ان ملحدوں اور زندیقوں میں سے کسی کو ذلیل کیا اس نے گویا انبیاء کی عزت کی ۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ کسی شخص کے دین و مذہب اور طریقہ و روش کے مخالف کی عزت و تعظیم درحقیقت اس شخص کی توہین و تحقیر کے مترادف ہے اسی طرح کسی شخص کے طریقہ و روش کے پیرو کی تعظیم دراصل اس شخص کی تعظیم ہے ۔ اسی لیے لوگوں نے کہا ہے کہ دوست کا دوست ہوتا ہے اور دوست کا دشمن دشمن ہوتا ہے مسلمانی یہی ہے ۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے دعویٰ بلا دلیل ہے [1]۔

---

[1] حضرت شیخ کا یہ پورا پیراگراف قابلِ غور ہے ۔ تھوڑے تامل کے بعد واضح ہو جاتا ہے کہ پہلا انھوں نے (باقی اگلے صفحے پر)

حرام اور نامشروع چیزوں کے باب میں نیت دخل نہیں رکھتی۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ کسی کی نیت معلوم ہیں کہ کیا ہے۔ نیت نیک ہونی چاہیے۔ عمل کا اعتبار نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ نیک نیتی اصل شے ہے لیکن اچھی نیت وہ ہوتی ہے جس سے اچھا کام کیا جائے۔ نیت اچھی اور کام برا۔ یہ کیا لغویت ہے۔ برا کام، اچھی نیت سے اچھا نہیں ہو سکتا۔ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرنی چاہیے کہ نیکی و بدی، حکم شریعت کے تابع ہے۔ شریعت نے جس کام کا حکم دیا ہے وہ نیک ہے اور جس سے روکا ہے وہ بد ہے۔ عقائد کی کتاب میں علماء نے لکھا ہے الحسن ماحسنہ الشرع والقبح ما قبحہ الشرع (اچھا وہ ہے جسے شریعت نے اچھا قرار دیا ہو اور برا وہ ہے جسے شریعت نے برا کہا ہو) شریعت کے حکم کے بغیر کسی کام میں حسن یا قبح نہیں ہوتا عقل کسی کام کے نیک یا بد ہونے کا حکم نہیں لگا سکتی۔

یہاں ایک شبہہ پیدا ہوتا ہے کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ تم نے جو بات کہی وہ عقل کے خلاف ہے اور حقیقت نفس الامری سے متصادم ہے اس لیے کہ ہر شخص یہ جانتا ہے کہ مثلاً علم، عدل، جود وسخا اور تواضع اچھے صفات ہیں اسی طرح جہل، بخل اور تکبر برے خصائل ہیں۔ یہ بات مجرد عقل سے معلوم ہوتی ہے اور عقل ان صفات کے اچھے اور برے ہونے کا حکم خود لگاتی ہے۔ بالفرض اگر شریعت نہ ہوتی جب بھی عقل یہ حکم لگاتی۔

اس شبہے کا جواب یہ ہے کہ سب سے پہلے یہ بات جان لینی چاہیے کہ اس مقام میں نیکی اور بدی کے معنیٰ کیا ہیں؟ تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ نیکی و بدی صرف شریعت کے حکم پر موقوف ہے۔ نیکی و بدی کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ کوئی صفت بذات خود موجب کمال ہو اور لوگ اس کی تعریف کریں، یا کوئی صفت بذات خود نقصان دہ ہو اور لوگ اس کی مذمت کریں۔ اس معنی کے لحاظ سے بے شک عقل کسی صفت پر نیکی یا بدی کا حکم لگا سکتی ہے اور اس معنی کا ادراک شریعت پر موقوف نہیں ہے لیکن یہاں نیکی اور بدی کے ایک معنی اور ہیں اور وہ یہ کہ کون سی صفت آخرت میں موجب ثواب اور کون سی صفت وہاں موجب عذاب ہے۔ اس معنی کے لحاظ سے نیکی و بدی صرف شریعت کے حکم پر موقوف ہے عقل کا یہاں دخل نہیں۔ اگر کوئی کام ایسا ہو کہ لوگ اس کی تعریف

(پچھلے صفحے کا حاشیہ) نواب فرید کو دین اسلام کی حمایت پر آمادہ کیا ہے اور اس پیراگراف میں ان کو اکبر شاہی دین کے خلاف صف آرا ہو جانے کی ترغیب دی ہے اور پورے زور کے ساتھ دی ہے

* مسلمانی یہی ہے باقی جو کچھ ہے دعویٰ بلا دلیل ہے: مومن صادق کو جھنجوڑ دینے والا جملہ ہے۔ (مترجم)

کر رہے ہے اور اسے موجب کمال جان رہے ہوں لیکن شرع نے اس سے روک دیا ہو تو وہ کام آخرت میں موجب عقاب ہوگا اور اس کے برعکس اگر لوگ کسی کام کو ناپسند کر رہے ہوں اور شریعت نے اس کا حکم دیا ہے تو آخرت میں وہ موجب ثواب ہوگا۔ اسی معنی کے لحاظ سے یہ بات کہی جاتی ہے کہ حسن و قبح شریعت کے حکم پر موقوف ہے۔ اس بات کا اشارہ ذیل کی آیت میں موجود ہے۔

عَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا	ہوسکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور
وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا	وہ تمہارے لیے خیر ہو اور تم کسی چیز کو پسند کرو
شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ	اور وہ تمہارے لیے شر ہو۔

اگرچہ یہ آیت براہ راست اس مسئلے سے متعلق نہیں ہے لیکن اشارتاً اس میں یہ حقیقت موجود ہے، علم، عدل اور سخاوت پر ثواب اس لیے ملے گا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا حکم دیا ہے اور ان کے ضد پر عذاب اس لیے ہوگا کہ ان سے روکا گیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو محض عقل کے اچھا یا برا کہنے سے نہ ثواب ملتا، نہ عذاب ہوتا۔ آخر عقل کیا سمجھ سکتی ہے کہ ۲۹ رمضان کو دن کے وقت اگر کھائیں تو گنہگار ہوں اور دوسرے دن اگر عید ہوا ور عید کے دن نہ کھائیں (یعنی روزہ رکھیں) تو گنہگار ہوں حقیقت یہ ہے کہ حکم شریعت کا حکم ہے، دوسری کوئی چیز نہیں ہے۔

یہاں ایک اور نکتہ ہے جس کی طرف تنبیہ کرنا ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ تمام کمالات و حسنات کا مبنیٰ و مدار دو چیزیں ہیں۔ نیت صحیح اور عمل صحیح۔ اگر یہ دونوں جمع ہوں (اور ان دونوں کا اکٹھا ہونا آسان نہیں ہے) تو کام مکمل ہوتا اور دین مسلمانی میں کمال آتا ہے نیت صحیح یہ ہے کہ جو عمل کریں، خدا کے لیے کریں اور اس کا مقصود رضائے الٰہی اور ثواب آخرت کے سوا کچھ اور نہ ہو، اور عمل صحیح یہ ہے کہ وہ طریقۂ دین و شریعت، اور حکم شارع کے موافق ہو، اس کے خلاف نہ ہو — اگر اعمال، صرف نیت صحیح کی بنیاد پر، اچھے اور موجب کمال ہوتے تو بہت سے گمراہ درویشوں، ملنگوں بلکہ برہنہ فقیروں کے اعمال و افعال بھی اچھے اور موجب کمال بن جاتے، اس لیے کہ یہ سب، اپنے اعتقاد فاسد کی بنا پر بزعم خود نیت صادق رکھتے ہیں۔ راہ حق کے مسافر ہیں اور خدا کا قرب چاہتے ہیں، لیکن یہ قرب حق سے محروم ہیں کیونکہ ان کا عمل، عمل صحیح نہیں ہے۔ مرضیٔ حق اور حکم شارع کے موافق نہیں ہے۔

یہاں ایسے مجاہدے اور ریاضت کی ضرورت ہے جو طریق حق اور مرضیات الٰہی کے موافق ہو تاکہ ثمر

پیدا کرے اور قابل اعتبار ہو۔ مجاہدہ ریاضت کا مفہوم ہی یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کو محنت و مشقت کرکے، شریعت کا مطیع و منقاد بنائے۔

جس طرح نیت صحیح، عمل صحیح کے بغیر کارآمد نہیں۔ اسی طرح عمل صحیح، نیت صحیح کے بغیر لاحاصل ہے۔ اگر کسی شخص کا ظاہری عمل شریعت کے موافق ہے لیکن نیت فاسد ہے یعنی اس سے مقصود ریا و سمعہ اور محض دکھاوا ہے تو یہ شخص ثواب آخرت اور رضائے الٰہی سے محروم رہے گا۔ انما الاعمال بالنیات اعمال، اچھی نیت سے لائق ثواب اور قابل اعتبار ہوتے ہیں۔

میں نے اوپر جو یہ بات کہی ہے کہ موافقت حق کے بغیر ریاضت و مجاہدے سے اثر پیدا نہیں ہوتا اس سے مراد اس اثر کی نفی ہے جو نور ایمان کی زیادتی، رضائے الٰہی کے حصول اور آخرت کی سرخ روئی کا سبب بنتا ہے۔ جو موجب اجر و ثواب اور باعث نجات ہوتا ہے۔ اس اثر کی نفی مقصود نہیں ہے جو بعض جوگیوں کو بھی ان کی مشقت و ریاضت سے حاصل ہو جاتا ہے۔ بعض امور کے کشف کسی خارق عادت شے کے ظہور اور بعض ارواح خبیثہ کی تسخیر کے لیے ایمان و عمل شرط نہیں ہے۔ یہ چیز بے ایمانوں کو بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ اس کو یوں سمجھو کہ چہرا پانی میں بھی نظر آتا ہے اور پیشاب میں بھی باوجود اس کے کہ پانی پاک ہے اور پیشاب ناپاک۔ اس فرق کو نہ جاننے کی وجہ سے ایک طرف بہتیرے کفار اپنے اعتقاد فاسد پر مطمئن رہتے ہیں اور دوسری طرف بعض نادان و سادہ لوح مسلمان اس طرح کے جوگیوں تک کے معتقد ہو جاتے اور ان کا احترام و اکرام کرنے لگتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا اعزاز دین سے غفلت کا نتیجہ ہے — اسی کے ساتھ یہ بھی ملحوظ رہے کہ مسلمان اگرچہ عاصی و اسیر شہوت ہو وہ قابل عزت ہے۔ اس کے اسلام کی عزت اور اس کے ایمان کی حرمت، ہاتھ سے جانے نہ دیں یہ ٹھیک ہے کہ وہ جرم کرے تو اس پر شریعت کے حدود و احکام نافذ کیے جائیں، لیکن اس کی بے حرمتی صحیح نہیں ہے۔

(مکتوب ۳۴)

رسائل و مسائل

لونڈیوں سے فائدہ اٹھانے کا مطلب کیا ہے

سوال :۔ زندگی ماہ اگست ۶۳ء میں "تعدد ازدواج قرآن کی روشنی میں" کے عنوان سے جو مقالہ شائع ہوا ہے اس کے ص۲۳ سطر ۲-۲۲ میں آپ نے تحریر فرمایا ہو کہ "ایک ہی عورت سے نکاح کرو یا لونڈیوں پر اکتفا کرو" پھر ص۲۳ سطر ۹ میں تحریر فرمایا کہ "اگر پھر بھی ظلم کا اندیشہ ہو تو بس ایک نکاح پر اکتفا کرو یا لونڈیوں سے فائدہ اٹھاؤ"۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کیا ایک نکاح کے ساتھ لونڈیوں پر اکتفا کرو" "لونڈیوں سے فائدہ اٹھاؤ" سے مراد کیا ہے۔ آنے والے شمارے میں اس پر روشنی ڈالیے ورنہ میرے جیسے کم علم رکھنے والے غلط فہمی کا شکار رہیں گے۔

جواب :۔ ان دونوں عبارتوں میں لونڈیوں کا جو لفظ استعمال ہوا ہے وہ فقہ کا اصطلاحی لفظ ہے اس سے مراد آج کل کی نوکرانیاں یا گھر کی خدمتگار عورتیں نہیں ہیں۔ "لونڈی" شرعی و فقہی اصطلاح میں اس عورت کو کہتے ہیں جو کفار سے جنگ میں بطور مال غنیمت ہاتھ آئی ہو اور مال غنیمت تقسیم کرنے کے بعد خلیفۂ وقت کی طرف سے کسی سپاہی کو اس کی حصہ میں دے دی گئی ہو۔ وہ عورت جس کے حصہ میں آجائے وہ اس کا مالک ہو جاتا ہے۔ اسی لیے قرآن کریم میں ایسی عورتوں کے لیے " مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ " (وہ عورتیں جو تمہاری ملکیت میں آگئی ہوں) کا جملہ استعمال کیا گیا ہے۔ آزاد عورتوں اور اس طرح کی مملوکہ و مقبوضہ لونڈیوں کے بہت سے احکام میں اسلامی شریعت نے فرق کیا ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ایسی کسی لونڈی کا مالک نکاح کیے بغیر اس سے مباشرت کر سکتا اور اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

" ایک نکاح پر اکتفا کرو یا لونڈیوں سے فائدہ اٹھاؤ" کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم چند آزاد عورتوں سے نکاح کر کے ان کے درمیان عدل و انصاف نہیں کر سکتے تو تمہارے لیے دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ کسی ایک ہی آزاد عورت سے نکاح کرو۔ دوسری یہ کہ اگر تمہارے پاس تمہاری مملوکہ و مقبوضہ لونڈیاں ہوں تو ان سے مباشرت کا فائدہ اٹھاؤ۔

(اس کے بعد صفحہ ۵۲ پر ملاحظہ فرمائیے۔)

بقیہ ارشاداتِ رسول

پیشے ہیں اسی طرح تعلیم بھی حصول معاش کا ایک ذریعہ اور پیشہ بن گئی ہے۔ عام طور سے دینی
، اور درس گاہیں بھی وہ کارخانے ہیں جہاں طلبہ کو تحصیل معاش کے لیے تیار کیا جاتا ہے اس کا
ہے کہ اگر کسی بستی کے دس افراد بھی عالمیت و فضیلت کی باضابطہ سندیں حاصل کرلیں تو خود
کے لوگوں کو ان کے علم سے فائدہ نہیں پہنچتا اس لیے کہ ۹۹ فی صدی بلکہ اس سے بھی
ایسا ہوتا ہے کہ ان افراد کو حصول معاش کے لیے اپنی بستی سے دور زندگی بسر کرنی پڑتی ہے
ذہنوں سے دینی تعلیم کی غرض و غایت، غائب ہو جانے کا دوسرا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اسلام
بادی عقائد و اعمال کا زبانی علم، علم ہی نہیں سمجھا جاتا۔ جب تک کوئی شخص کسی مدرسے
سند عالمیت حاصل نہ کرلے وہ تعلیم یافتہ نہیں سمجھا جاتا۔ چنانچہ اب حالت یہ ہوگئی ہے کہ
ں کے لاکھوں کروڑوں مسلمان ٹھیک سے کلمہ طیبہ بھی نہیں پڑھ سکتے۔ وہ اپنے آپ کو مسلمان
یے کہتے اور سمجھتے ہیں کہ مسلمان کے گھر میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس صورت حال کو بدلنے کی
سے آسان تدبیر وہی ہے جو ہمیں عہد رسالت کے طریقۂ تعلیم میں نظر آتی ہے۔

تجویز یہ ہے کہ ہر دیہات کے ان مسلمان باشندوں میں سے جو اسی دیہات یا اس کے
پاس کے مقامات سے اپنی روزی حاصل کر رہے ہوں اور وہ مستقلاً اپنے دیہات ہی میں مقیم
چند نوجوانوں کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ اپنا کچھ وقت اسلام کے بنیادی عقائد و اعمال
نے کے لیے نکالیں اور ایسے لوگوں کی زبانی اور عملی تعلیم کے لیے خاص انتظام کیا جائے۔ انہیں
دینے کا کام مدرسوں اور خانقاہوں سے بھی لیا جاسکتا ہے اور انفرادی طور پر ذی علم افراد و
ص سے بھی۔ اس تجویز کی تمام تفصیلات مرتب کرنا اس وقت پیش نظر نہیں ہے۔ مثال کے طور پر
لیا جاسکتا ہے کہ کوئی مدرسہ اسی مقصد سے اپنے یہاں ایک خاص درجہ کھولے اور کسی مناسب
ذ کو اسی کام کے لیے متعین کرے۔ تعلیم کتابی نہیں بلکہ زبانی ہوگی اور جہاں عملی تعلیم کی ضرورت ہے
عملی تعلیم دی جائے گی۔ ایام تعلیم بھی مقرر و متعین ہوں گے اور وہ زیادہ سے زیادہ چالیس دن
سکتے ہیں۔ اس طرح فارغ ہو کر جو طلبہ اپنے گاؤں واپس جائیں گے وہ وہاں کے معلم ہوں گے اور
انھوں نے سیکھا ہے وہ حسبۃً للہ دوسروں کو سکھائیں گے۔ یہ ایک ایسا کام ہے جو ہندستان گیر

پیمانے پر کیا جا سکتا ہے۔ آج ملک میں لاکھوں ایسے مسلمان موجود ہیں جو باضابطہ نوشت وخواند کی عمر سے بھی گزر چکے ہیں اور اب جنہیں اس کا موقع بھی نصیب نہیں ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے ہمارے پاس کوئی انتظام نہیں کہ ہم انہیں اسلام کے بنیادی عقائد و اعمال سے باخبر کریں اور انہیں عملاً مسلمان بن کر زندگی بسر کرنے میں مدد دیں۔ ہم جن حالات میں گرفتار ہیں ان میں بالخصوص تعلیمی وفود کے طریقے کو آزمانا مفید معلوم ہوتا ہے بلکہ اگر مسلمان اس کی افادیت محسوس کرلیں تو ہر دیہات میں یا چند دیہاتوں کے ایک مجموعہ میں اس طرح کی تعلیم کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔

تعلیم اور امر

وفد کے افراد کو رخصت کرتے وقت آپ نے انہیں فرمایا "تعلیم دو اور حکم دو" اس سے معلوم ہوا کہ محض تعلیم دے دینا اور سکھا دینا کافی نہیں ہے بلکہ لوگوں کو اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے کی ترغیب دینا، ہدایت دینا اور ضرورت ہو تو حکم دینا بھی ضروری ہے۔ مثلاً اگر کسی کو نماز سکھا دی گئی لیکن وہ نماز پڑھتا نہیں ہے تو ایسے شخص کو اگر ہمیں اس پر کسی طرح کی بالادستی حاصل ہے، نماز پڑھنے کا حکم دینا بھی ضروری ہے۔ اور اگر کسی شخص پر ہمیں بالادستی حاصل نہ ہو تو ترغیب دینا، نصیحت کرنا اور اسے آمادہ کرنا ہمارے فرائض میں داخل ہے۔

نماز کس طرح پڑھی جائے

نماز چند شرائط، ارکان، اقوال و افعال اور حرکات و سکنات کا مجموعہ ہے ان سب کی زبانی تفصیل کرنے کے بجائے حضورؐ نے وفد کو جو حکم دیا وہ یہ تھا کہ نماز اس طرح پڑھو جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا ہے۔ اس حدیث کے علاوہ دوسری حدیثوں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم عموماً وضو و نماز کی عملی تعلیم دیا کرتے تھے۔ صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ کے قول نے اس عملی تعلیم کو مزید تقویت بخش دی۔

ایک اصولی مسئلہ

نماز کے علاوہ عبادت حج بھی متعدد شرائط، ارکان اور اقوال و افعال پر مشتمل ہے۔ اس عبادت کے لیے بھی آپ نے اپنے عمل کا نمونہ پیش فرمایا۔ حجۃ الوداع میں آپ نے صحابۂ کرام سے ارشاد فرمایا۔ لِتَأْخُذُوْا مَنَاسِكَكُمْ فَإِنِّيْ لَا أَدْرِيْ لَعَلِّيْ لَا أَحُجُّ بَعْدَ حَجَّتِيْ هٰذِهٖ (مسلم، باب استحباب رمی جمرۃ العقبۃ راکبا) امام نووی نے اس لِتَأْخُذُوْا میں لامؔ لامِ امر ہے۔ یعنی خُذُوْا مَنَاسِكَكُمْ جیسا کہ امام مسلم کے علاوہ دوسرے محدثین نے خُذُوْا ہی کے صیغے سے روایت کیا ہے۔ حضورؐ کے اس ارشاد کا مفہوم یہ ہے کہ میں نے اس

حج میں اپنے جن اقوال و افعال اور جن ہیئتوں کے ساتھ حج ادا کیا ہے وہی تمہارے لیے مناسکِ حج ہیں۔ انہیں مجھ سے اخذ کرو، قبول کرو، یاد رکھو، اُن پر عمل کرو اور دوسرے لوگوں کو سکھاؤ ــــ یہ حدیث مناسکِ حج میں ایک اصلِ عظیم ہے جس طرح نماز کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قول صَلُّوا کَمَا رَاَیْتُمُوْنِی اُصَلِّی ایک اصلِ عظیم ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ دو عظیم اصول صرف نماز اور حج کے ساتھ خاص ہیں یا ان تمام اوامر کے لیے عام ہیں جن میں قربت و عبادت کی جہت پائی جاتی ہے۔ فقہائے اصولیین کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اصول نماز اور حج کے ساتھ خاص نہیں ہیں بلکہ حضور کے افعال سے تمام ایسے اوامر و احکام کی تبیین ہوتی ہے جن کا تعلق قربت و عبادت اور سنن ہدیٰ سے ہے۔

عملی تعلیم کے طریقے پر عمل

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ تعلیم پر بھی عمل کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت مالک بن الحویرث نماز کی زبانی تعلیم پر اکتفا نہ کرتے تھے بلکہ عمل کر کے دکھاتے تھے کہ حضورؐ اس طرح نماز پڑھتے تھے۔ امام بخاریؒ نے ابو قلابہ سے روایت کی ہے کہ:۔

"مالک بن الحویرث ہماری مسجد میں آئے اور فرمایا کہ میں اس وقت تمہارا امام بن کر نماز پڑھوں گا اور غرض صرف یہ ہے کہ میں تمہیں تعلیم دوں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کس طرح نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ پھر انھوں نے نماز پڑھ کر دکھائی حالانکہ اس وقت کسی فرض نماز کا وقت نہ تھا"

اس حدیث سے مزید متعدد فقہی احکام مستنبط ہوتے ہیں۔ میں یہاں چند احکام کا ذکر کرتا ہوں:۔

سفر میں اذان

سفر میں اذان کی مشروعیت پر تمام فقہا متفق ہیں اور یہ حدیث اس کی ایک بڑی دلیل ہے اگر دو مسلمان بھی سفر کر رہے ہوں تو سفر میں انہیں اذان و اقامت کے ساتھ نماز باجماعت ادا کرنی چاہیے۔ اوپر حدیث کے جو الفاظ نقل کیے گئے ہیں ان میں سفر کی اذان کا ذکر نہیں ہے لیکن مالک بن الحویرث سے یہ الفاظ بھی مروی ہیں:۔

اِذَا اَنْتُمَا خَرَجْتُمَا فَاَذِّنَا ثُمَّ اَقِيْمَا ثُمَّ لِيَؤُمَّكُمَا اَكْبَرُكُمَا۔

جب تم دونوں سفر کرو تو تم میں سے کوئی ایک اذان دے پھر اقامت کہے پھر تم میں سے جو سن میں بڑا ہو وہ امامت کرے

حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ یہ بھی اسی سفر کا واقعہ ہے جب وفد مدینہ سے رخصت ہو رہا تھا۔

اذان و اقامت کا فرق اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اذان میں عمر کی ترجیح کا اعتبار نہیں ہے اور امامت میں عمر کا بھی اعتبار کیا جائے گا۔ عمر کی زیادتی بھی امامت کے لیے ایک وجہِ ترجیح بن جاتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر چند برابر درجے کے عالم و قاری اکٹھا ہوں تو امامت کا سب سے زیادہ مستحق وہ ہوگا جو ان میں عمر کے لحاظ سے سب سے بڑا ہو چونکہ وفد کے تمام افراد نے حضورؐ سے یکساں تعلیم پائی تھی اس لیے وہ علم اور قرأت قرآن میں برابر تھے، یہی وجہ ہے حضورؐ نے فرمایا کہ تم میں جو سب سے بڑا ہو وہ امامت کرے۔

وجوب اذان اس حدیث سے فقہاء نے اذان کے وجوب پر بھی استدلال کیا ہے۔ امام اوزاعیؒ ابن المنذر اور داؤد ظاہری وجوب اذان کے قائل ہیں۔ موطا سے معلوم ہوتا ہے کہ امام مالک بھی اسی کی طرف مائل ہیں۔ امام محمد بن حسن سے بھی ایک روایت وجوب کی آتی ہے ویسے جمہور فقہاء کے نزدیک اذان سنت مؤکدہ ہے۔ (فتح الباری)

(بقیہ صفحہ ۴٦) یہ کتاب اپنے اندر خاص افادیت رکھتی ہے۔ وہاں جب پارلیمانی اور صدارتی نظام کی بحث چھڑی ہوئی تھی تو نعیم صاحب نے ترجمان القرآن میں اس موضوع پر ایک مقالہ لکھا تھا، اور اب کافی اضافے کے بعد اسے کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔

مباحثِ کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے میں امریکہ کے صدارتی نظام کا تعارفی مطالعہ ہے اور دوسرے میں تنقیدی جائزہ۔ یہ دونوں حصے پڑھنے کے لائق ہیں۔ (ع، ق)

تنقید و تبصرہ

صدف (سہ ماہی) | ادارہ طیب عثمانی، عبد المغنی۔ سائز $\frac{20 \times 30}{8}$ صفحات ۹۶۔ سالانہ چار روپیہ فی جلد ایک روپیہ۔ پتہ۔ دفتر صدف سہ ماہی دار الکتاب۔ کریم گنج۔ گیا صوبہ بہار۔

طیب عثمانی صاحب اور عبد المغنی صاحب دونوں ہی جانے پہچانے اور معروف ادیب ہیں۔ ذی صلاحیت اور حوصلہ مند ہیں۔ جہاں تک مضامین نظم و نثر اور معنوی معیار کا تعلق ہے۔ صدف کا پہلا شمارہ خاصہ کامیاب ہے اور توقع ہے کہ یہ اپنا معیار بڑھاتا ہی جائے گا۔ ہاں ظاہری گٹ اپ اور رسالے کی ضخامت کا پہلو ذرا کمزور ہے۔ اگر سائز چھوٹا ہوتا تو رسالہ بھاری بھرکم نظر آتا۔ کتابت و طباعت کا معیار بھی اور بلند ہونا چاہیے۔ یقیناً یہ باتیں ادارے کے سامنے بھی ہوں گی اور مدیران ہر لحاظ سے اس کو بلند معیار بنانے کی کوشش کریں گے۔ ویسے گیا جیسے چھوٹے شہر سے جو رسائل نکلتے رہے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے "صدف" کے پہلے شمارے کو بہت کامیاب کہا جاسکتا ہے۔ رسالے میں نو، دس مستقل عنوانات قائم کیے گئے ہیں اور ہر عنوان کے تحت اچھی معیاری چیزیں شائع کی گئی ہیں۔ اداریہ بھی "جو تلاطم" کے عنوان سے معنون۔ ہے فکر انگیز ہے۔ تبصرہ نگار کو اس کے ہر جزو سے اتفاق نہیں ہے لیکن جو کچھ پیش کیا گیا ہے اس میں سلیقہ مندی بھی ہے اور گہرائی بھی۔ ہم اس نئے معاصر کا خیر مقدم کرتے ہیں اور اس کی کامیابی کے لیے دعاگو ہیں۔ (ع' ت)

امریکہ کا صدارتی نظام | نعیم صدیقی، صفحات ۴۴ مجلد مع گرد پوش، قیمت دو روپیہ ناشر۔ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ۱۱ سی، شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

جناب نعیم صدیقی کی یہ کتاب قانون اور سیاسیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے بڑی مفید ہے۔ اس موضوع پر اردو زبان میں یہ پہلی اور معیاری کتاب ہے۔ بالخصوص پاکستان کے لیے جہاں دستور ریاست کا اونٹ ابھی کھڑا کا کھڑا ہے، کسی کروٹ بیٹھا نہیں ہے (باقی ص۱۳ پر ملاحظہ ہو)

زندگی رامپور

جلد:- ۳۱
شمارہ:- ۴

جمادی الاولیٰ ۱۳۸۳ھ
اکتوبر ۱۹۶۳ء

مدیر:- سید احمد قادری

- خط و کتابت و ارسال زر کا پتہ — منیجر "زندگی" رامپور۔ یوپی
- زر سالانہ:- پانچ روپیہ — ششماہی:- تین روپیہ — فی پرچہ:- پچاس نئے پیسے
- — ممالک غیر سے:- دس شلنگ بذریعہ پوسٹل آرڈر

پاکستانی اصحاب مندرجہ ذیل پتہ پر رقوم بھیجیں اور رسید ہمیں ارسال فرمائیں

منیجر ہفت روزہ "شہاب" ۱۱/C شاہ عالم مارکیٹ لاہور

مالک:- جماعت اسلامی ہند۔ ایڈیٹر:- سید احمد عروج قادری۔ پرنٹر پبلشر:- احمد حسن۔ مطبع:- دلی پرنٹنگ ورکس، محلہ بجلا آنا دہلی
دفتر اشاعت:- دفتر زندگی، رام پور۔ یوپی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

(سید احمد قادری)

بعض اوقات انسان کو ایک ایسا کام کرنا پڑتا ہے، جس کے بارے میں اس کو تصور بھی نہیں ہوتا کہ کبھی یہ کام بھی کرنا پڑے گا۔ اب یہ کون سوچ سکتا تھا کہ قام یقوم قیاماً اور اقام یقیم اقامۃ کے ترجمے پر اشارات لکھنے کی ضرورت پیش آئے گی لیکن ان دنوں "تحریک اقامت دین" پر جو نت نئے حملے کیے جا رہے ہیں ان میں ایک حملہ" اقیموا الدین" کے ایک اردو ترجمے کی مدد سے بھی کیا گیا ہے۔ بعض رفقاء نے راقم سے وضاحت چاہی ہے اس لیے یہ مختصر تحریر پیش کی جا رہی ہے۔

ہر عربی جاننے والا جانتا ہے کہ قام یقوم قیاماً کے اصل معنی کھڑا ہونا یا قائم ہونا اور اقام یقیم اقامۃ کے اصل معنی کھڑا کرنا یا قائم کرنا آتے ہیں اور پھر اسی اصل معنی کی مناسبت سے پہلے صیغے دائم ہونا اور جاری ہونا کے معنی میں اور دوسرے صیغے قائم رکھنا، جاری کرنا اور سیدھا کرنا کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں ـــــ قرآن کریم میں دونوں ہی صیغوں کی بکثرت مثالیں موجود ہیں۔ میں ذیل میں مصدر اقامۃ سے مشتق صیغوں کی چند مثالیں اور ان کے ترجمے نقل کرتا ہوں۔ پہلے قرآن کے الفاظ نقل کیے جا رہے ہیں اور ان کے نیچے مختلف ترجمے۔

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ ۔ سورۂ بقرہ ۵

شاہ عبدالقادر	اور کھڑی کرو نماز
حضرت شیخ الہند	اور قائم رکھو نماز
شاہ رفیع الدین	اور قائم کرو نماز کو
مولانا اشرف علی	اور قائم کرو تم لوگ نماز کو (یعنی مسلمان ہو کر)
مولانا فتح محمد	اور نماز پڑھا کرو
ڈپٹی نذیر احمد	اور نماز پڑھا کرو
مولانا ابوالکلام	اور نماز قائم کرو

وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ (سورۂ ہود ۱۰)

شاہ عبدالقادر	اور کھڑی کر نماز

شیخ الہند محمود الحسن — اور قائم کر نماز
شاہ رفیع الدین — اور قائم کر نماز کو
مولانا فتح محمد جالندھری — اور نماز پڑھا کرو
ڈپٹی نذیر احمد — اور نماز پڑھا کرو

وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ — سورۂ بقرہ ر ۲۲

شاہ عبدالقادر — اور کھڑی رکھے نماز
شیخ الہند — اور قائم رکھے نماز
شاہ رفیع الدین — اور قائم کیا نماز کو
مولانا اشرف علی — اور نماز کی پابندی رکھتا ہو
ڈپٹی نذیر احمد — اور نماز پڑھتے رہے
مولانا فتح محمد — اور نماز پڑھیں
مولانا ابوالکلام — نماز قائم کرتے ہیں

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ (سورۂ مائدہ ر ۹)

شاہ عبدالقادر — اور اگر وہ قائم رکھیں توریت اور انجیل کو اور جو اترا ان کو ان کے رب کی طرف سے
شیخ الہند — اور اگر وہ قائم رکھتے توریت اور انجیل کو اور اس کو جو نازل ہوا ان پر ان کے رب کی طرف سے
شاہ رفیع الدین — اور اگر وہ قائم رکھتے توریت کو اور انجیل کو اور جو اتارا گیا ہے طرف ان کی پروردگار ان کے سے
مولانا اشرف علی — اور اگر یہ لوگ توریت کی اور انجیل کی اور جو کتاب (اب) ان کے پاس بھیجی گئی (یعنی قرآن) اس کی پوری پابندی کرتے۔
ڈپٹی نذیر احمد — اور اگر یہ توریت اور انجیل اور ان (صحیفوں) کو جو ان پر ان کے پروردگار کی طرف سے اترے ہیں قائم رکھتے۔

حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ (سورۂ مائدہ ر ۱۰)

شاہ عبدالقادر — جب تک نہ قائم کرو توریت اور انجیل اور جو تم کو اترا تمہارے رب سے
شیخ الہند — جب تک نہ قائم کرو توریت اور انجیل کو اور جو اترا تم پر تمہارے رب کی طرف سے۔
شاہ رفیع الدین — یہاں تک کہ قائم کرو توریت کو اور انجیل کو اور جو کچھ اتارا جاتا ہے طرف تمہارے پروردگار تمہارے سے۔
مولانا اشرف علی — جب تک کہ توریت کی اور انجیل کی اور جو کتاب (اب) تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے بھیجی گئی ہے اس کی بھی پوری پوری پابندی نہ کرو گے
ڈپٹی نذیر احمد — جب تک تم توریت اور انجیل اور ان (صحیفوں) کو جو تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل ہوئے ہیں قائم نہ رکھو گے۔

قرآن میں مصدر اقامت کے اکثر صیغے استعمال کیے گئے ہیں اور آیتوں کی تعداد بہت ہے ان صیغوں میں چند بطور نمونہ اوپر نقل کیے گئے ہیں۔ ان کے ترجموں کو پڑھیے۔ آپ دیکھیں گے کہ مختلف مترجمین نے قائم رکھنا بھی ترجمہ کیا ہے اور قائم کرنا بھی۔ مولانا فتح محمد نے قائم رکھنا کے مفہوم کو "نماز پڑھا کرو" اور

قائم کرنے کے مفہوم کو "نماز پڑھیں" سے ادا کیا ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی نے قائم رکھنا کے مفہوم کو "پابندی" سے ادا کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ "اقیموا" کا ترجمہ قائم رکھو اور قائم کرو دونوں ہی درست ہے اور عام طور سے مترجمین قرآن دونوں ہی ترجمے کرتے ہیں اور کوئی غلط فہمی نہ قائم کرو کے ترجمے سے پیدا ہوتی ہے اور نہ قائم رکھو کے ترجمے سے۔

سورۂ مائدہ رکوع ۹ والی آیت میں دو ٹکڑے ہیں ایک ٹکڑا توریت وانجیل کی اقامت کا ہے اور دوسرا قرآن کی اقامت کا لیکن تمام مترجمین نے اس کا ترجمہ قائم رکھنا ہی سے کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قائم رکھنے میں قائم کرنے کا مفہوم شامل ہے۔ "قائم رکھنا قائم کرنے کو مستلزم ہے۔ جب تک کوئی چیز قائم نہ ہو اسے قائم رکھنے کی بات بے معنی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس آیت میں قرآن کو قائم رکھنے کا جو ترجمہ کیا گیا ہے اس میں قائم کرنے کا مفہوم بھی موجود ہے۔ ورنہ ترجمہ صحیح باقی نہیں رہے گا۔ شیخ الہند کے ترجمے پر مولانا شبیر احمد عثمانی نے حاشیہ لکھ کر اس کو واضح کر دیا ہے وہ لکھتے ہیں

"یعنی قرآن کریم جو توراۃ وانجیل کے بعد ان کی تنبیہ وہدایت کے لیے نازل ہوا اس کو قائم کرتے کیونکہ اس کی تسلیم کے بدون توراۃ وانجیل کی بھی صحیح معنی میں اقامت نہیں ہو سکتی بلکہ توراۃ وانجیل اور جملہ کتب سماویہ کی اقامت کا مطلب ہی اب یہ ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم اور پیغمبر آخر الزماں صلعم جو کتب سابقہ کی پیشین گوئیوں کے مطابق بھیجے گئے ہیں ان کو قبول کیا جائے گویا اقامت توراۃ وانجیل کا حوالہ دے کر آگاہ فرمایا کہ اگر قرآن کو انھوں نے قبول نہ کیا تو اس کے معنی یہی ہیں کہ اپنی کتابوں کے قبول کرنے سے بھی منکر ہو گئے۔"

یہ بات جو یہاں عرض کی گئی ہے۔ ذہن میں محفوظ رکھنی چاہیے۔

سورۂ مائدہ رکوع ۱۰ والی آیت میں چونکہ اہل کتاب کو توریت وانجیل کے ضائع کر دینے پر ملامت اور ان کی دین داری کی نفی کی گئی ہے اس لیے اکثر مترجموں نے اس کا ترجمہ قائم کرنے ہی سے کیا ہے کیونکہ بات یہ کہی گئی ہے کہ اہل کتاب نے توریت وانجیل کو منہدم کر دیا ہے اب جب تک وہ ان کو قائم نہ کر لیں اور اب ان کو قائم کرنے کی صورت یہ ہے کہ قرآن پر ایمان لا کر اسے قائم کریں جب تک وہ ایسا نہیں کرتے وہ کچھ بھی نہیں ہیں اور ان کی مذہبیت محض فریب ہے۔

یہاں ضمناً راقم الحروف اپنے اس تاسف کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اب امت مسلمہ کے بھی

بہت سے افراد یہ سمجھنے لگے ہیں کہ وہ "اقامتِ قرآن" کے بغیر ہی دین داری کا اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ حاصل کر سکتے ہیں بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ امت مسلمہ پورے قرآن کی اقامت کی مکلف ہی نہیں ہے اور اب تو بعض افراد اس حد تک آگے بڑھ گئے ہیں کہ وہ اقامت قرآن کی جدوجہد تک کو غیر ضروری قرار دیتے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

اب آئیے سورۂ شوریٰ کی اس آیت کا ترجمہ دیکھیں جس میں ان اقیموا الدین کا ٹکڑا آیا ہے۔ لغت کے اعتبار سے اور "اقیموا" کے جو ترجمے مستند مترجمین قرآن نے کیے ہیں ان کو سامنے رکھ کر اگر کوئی شخص اس کا ترجمہ "دین قائم کرو" کرے تو یہ ترجمہ بالکل درست ہوگا بلکہ صیغے کے اصل معنی کے لحاظ سے یہی ترجمہ حقیقی ہوگا۔ جماعت اسلامی سورۂ شوریٰ کی اس آیت کو اپنے نصب العین کی تائید میں پیش کرتی ہے اور اس جماعت کے بعض علماء نے اقیموا الدین کا ترجمہ "دین قائم کرو" کیا ہے۔ اس وقت اقامت دین کے نصب العین پر جو حملے کیے جا رہے ہیں اس کے ایک نئے حملے میں اس ترجمے کو بھی ہدف بنایا گیا ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ اردو کے تمام مترجمین نے اس کا ترجمہ "دین قائم رکھو" کیا ہے اور بس ایک جماعت اسلامی کا حلقہ اس کا ترجمہ "دین قائم کرو" کرتا ہے گویا اپنا نقطۂ نظر ثابت کرنے کے لیے اس حلقے نے ترجمے کی ایک "بدعت" کا ارتکاب کیا ہے جس سے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔ دین قائم رکھو سے غلط فہمی نہیں پیدا نہیں ہوتی اور دین قائم کرو سے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے یہ بات تو آگے لکھی جائے گی کہ جس "غلط فہمی" سے بچنے کی کوشش کی گئی ہے وہ دین قائم رکھو کے ترجمے سے زیادہ پیدا ہوتی ہے۔ پہلے ہم عربی نہ جاننے والوں کے ذہن کو الجھن سے بچانے کے لیے عرض کرتے ہیں کہ دین قائم کرو کا ترجمہ اگر کوئی جدت و بدعت ہے تو اس کا ارتکاب آج سے بہت پہلے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کر چکے ہیں۔ ذیل میں آیت کے الفاظ اور اس کے سامنے ترجمہ نقل کیا جاتا ہے۔

شَرَعَ لَکُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰی	مقرر کرد برائے شما از آئین آنچہ امر کردہ
بِہٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ وَمَا	بود با قامت آں نوح را و آنچہ وحی فرستادیم
وَصَّیْنَا بِہٖٓ اِبْرٰھِیْمَ وَمُوْسٰی وَعِیْسٰٓی	بسوئے تو و انچہ امر کردیم باقامتِ آں ابراہیم

أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ ط (شوریٰ ر ۲) — موسیٰ و عیسیٰ باین مضمون کہ قائم کنید دین را و متفرق مشوید دراں

حضرت شاہ ولی اللہ رح کے فارسی ترجمے کا اردو ترجمہ یہ ہے اس ترجمے میں دین کا ترجمہ آئین بھی قابل غور ہے

تمہارے لیے وہ آئین مقرر کیا جس کی اقامت کا حکم دیا تھا نوح کو اور جس کے لیے ہم نے وحی بھیجی ہے تیری طرف اور جس کی اقامت کا ہم نے حکم دیا ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو باین مضمون کہ قائم کرو دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ جماعت اسلامی کے علماء کا جرم صرف یہ ہے کہ انھوں نے "قائم کنید دین را" کے فارسی ترجمے کو اردو میں منتقل کرکے "قائم کرو دین کو" کر دیا ہے۔

اور بات یہ بھی نہیں ہے کہ شاہ صاحب نے اقیموا کا ترجمہ ہر جگہ "قائم کنید" ہی کیا ہو" بلکہ متعدد مقامات پر انھوں نے "قائم دارید" بھی ترجمہ کیا ہے چنانچہ سورۂ بقرہ ر۵ کی جس آیت کا اوپر حوالہ گزرا وہاں انھوں نے "و برپا دارید نماز را" ترجمہ کیا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ سورۂ شوریٰ کی اس آیت میں انھوں نے "دین قائم کرو" کے ترجمے کو "دین قائم رکھو" کے ترجمے پر ترجیح دی ہے۔ راقم الحروف کو حیرت اس پر ہوئی کہ اس ترجمے والے جملے کی تائید حضرت شاہ صاحب کے عقیدت مند حلقوں کی طرف سے بھی ہو رہی ہے۔ ممکن ہے یہ تائید "لاحب علی بل لبغض معاویۃ" کی مصداق ہو۔

بات یہاں ختم ہو جاتی ہے لیکن آیئے یہ بھی دیکھ لیں کہ اپنی کتابوں اور مقالوں میں صرف جماعت اسلامی والوں نے "دین قائم کرو" کا ترجمہ کیا ہے یا کسی اور نے بھی۔ معمولی تلاش سے معلوم ہوا کہ اس "بدعت" کا ارتکاب مولانا آزاد مرحوم نے بھی کیا ہے ـــ ادارہ اشاعت الکتاب دہلی نے مولانا غلام رسول مہر کی کتاب "باقیات ترجمان القرآن" شائع کی ہے اس میں سورۂ شوریٰ کی زیر بحث آیت کا ترجمہ یہ ہے :۔

"تمہارے لیے دین کا وہی راستہ ٹھہرایا جس کے لیے نوح کو وصیت کی تھی اور اے پیغمبر اسلام جس کے لیے ہم نے تم پر وحی کی ہے نیز یہ وہی راستہ ہے جس کے لیے ہم نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو بھی وصیت کی تھی کہ دین الٰہی قائم کرو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔" (بحوالہ البلاغ۔ ا دسمبر ۱۹۱۵ء)

مولانا غلام رسول مہر نے اس پر نوٹ دے کر لکھا ہے کہ مولانا ابوالکلام نے ترجمان القرآن جلد اول میں ایک جگہ اس آیت میں اقیموا الدین کا ترجمہ "دین قائم رکھو" بھی کیا ہے گویا مولانا ابوالکلام کے یہاں دونوں ترجموں کی سند موجود ہے۔

اس گفتگو کے بعد ضرورت نہ تھی کہ ہم "دین قائم رکھو" کے ترجمے کی توجیہ پیش کریں لیکن تبرعاً اس کی طرف بھی اشارہ کر دینا مناسب سمجھتے ہیں کہ اس ترجمے نے امت مسلمہ پر ذمہ داری کا بوجھ ہلکا نہیں کیا ہے بلکہ بڑھا دیا ہے کیونکہ "دین قائم رکھو" نے دُہری ذمہ داری عائد کی ہے۔ یہ ترجمہ بتاتا ہے کہ صرف دین قائم کر دینا فرض نہیں ہے بلکہ اس کو قائم رکھنا بھی ضروری ہے۔ یہ بات تو کسی عاقل کے تصور میں بھی نہیں آسکتی کہ دین قائم کرو کا حکم دیے بغیر اللہ تعالےٰ نے دین قائم رکھو کا حکم دے دیا ہو۔ ہمیں اس وقت اس بحث میں نہیں پڑنا کہ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ میں الدین سے مراد کیا ہے۔ مراد جو کچھ بھی ہو جب تک اسے قائم کرنے کا حکم نہ دیا جائے اس کو قائم رکھنے کا حکم نہیں دیا جا سکتا۔ اکثر مترجمین قرآن نے مناسب سمجھا کہ امت مسلمہ کو بیک جملہ دونوں ذمہ داریوں کی طرف متوجہ کر دیا جائے۔

شاہ عبدالقادر نے "دین قائم رکھو" ترجمہ کر کے حاشیہ موضح القرآن میں لکھا ہے:۔

"اصل دین ہمیشہ سے ایک ہی ہے اس کو قائم کرنے کے طریق ہر وقت میں جدا ٹھہرا دیے اللہ نے"

اس مختصر حاشیے نے ایک طرف مزید وضاحت کی کہ قائم رکھو میں قائم کرو کا معنی داخل ہے اور دوسری طرف "قائم کرنے کے طریق" کا جملہ لکھ کر انھوں نے ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے جس کی وضاحت کا یہ موقع نہیں۔

اردو مترجمین قرآن کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہ ہوگی کہ کبھی کوئی شخص "دین قائم رکھو" سے "دین قائم کرو" کے مفہوم کو الگ کر دکھانے کی "ذہانت" کا ثبوت دے گا۔ اسی ذہانت کا ایک کرشمہ یہ بھی ہے کہ وہ "دین کو قائم رکھو" اور "دین پر قائم رہو" میں فرق محسوس نہیں کرتا۔ "دین پر قائم رہو" اقیموا الدین کا صحیح ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ قوموا علی الدین یا ان تقوموا علی الدین کا البتہ ہو سکتا ہے۔ اگر آیت کا اصل مفہوم محض دین پر قائم رہنا ہوتا تو اللہ تعالےٰ فعل لازم ترک کر کے

فعل متعدی استعمال نہ کرتا۔ قرآن کے فعل متعدی کو اپنی طرف سے فعل لازم بنا کر ترجمہ کرنا ہرگز صحیح نہیں ہے۔ شاید اس ذہن نے "دین کو قائم رکھو" میں بھی "غلط فہمی" کا خطرہ محسوس کیا اس لیے اقیموا الدین کے متعدی صیغے کو لازم بنا کر "دین پر قائم رہو" ترجمہ کیا تاکہ اقامت دین کی جھنجھٹ سے بالکل فراغت حاصل ہو جائے۔

یہ ہے تحقیق و تنقید کا وہ اعلیٰ نمونہ جس کی ہندوستان و پاکستان کے بعض دینی حلقے بڑے زور شور سے تائید فرما رہے ہیں۔

یہ خوشی کی خبر اخبارات میں شائع ہو چکی ہے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں "مجلس تحقیقات شرعیہ" کے نام سے ایک ادارے کا قیام عمل میں آیا ہے۔ یکم ستمبر ۶۲ کو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی تحریک پر ہندوستان کے چند منتخب علماء کا اجتماع ندوہ کے مہمان خانے میں منعقد ہوا۔ اس اجتماع نے جو قرارداد پاس کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

"نئے حالات اور ایجادات نے جو ایسے مسائل پیدا کر دیے ہیں جن کا واضح حکم ہماری فقہ میں موجود نہیں، یا وہ معاملات و مسائل جنھوں نے موجودہ زمانے میں نئی شکل اختیار کر لی ہے ان مسائل پر غور و فکر اور ان کے بارے میں ممکن حد تک اجتماعیت پیدا کرنے کے لیے اصحاب نظر علماء کی ایک مجلس تشکیل کی جائے"

اس اجتماع نے جن علماء کو اس مجلس کے بنیادی ارکان کی حیثیت سے نامزد کیا ہے ان کے نام یہ ہیں:۔

مولانا سید منت اللہ رحمانی (بہار) مولانا ابواللیث اصلاحی (امیر جماعت اسلامی ہند) مولانا سید فخر الحسن (استاذ دارالعلوم دیوبند) مولانا شاہ معین الدین ندوی (اعظم گڈھ) مولانا محمد عمران خاں ندوی (بھوپال) مولانا محمد اویس نگرامی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء) مولانا محمد رضا انصاری (فرنگی محلی) مولانا محمد تقی امینی۔ مولانا عتیق الرحمٰن (سنبھلی) مولانا ابوالحسن علی ندوی (ناظم مجلس)

اس ادارے کے ضروری علمی کاموں کی انجام دہی کے لیے ایک مجلس عاملہ بھی منتخب کی گئی ہے اور مجلس کا دستور العمل تیار کرنے کے لیے ایک کمیٹی بھی مقرر کی گئی ہے۔

خدا کرے یہ مجلس ایک اہم ضرورت کو پورا کرنے اور ملک کے مختلف مکاتیب فکر سے تعلق رکھنے والے علماء کے درمیان ہم آہنگی و اتفاق کی فضا ہموار کرنے میں کامیاب ہو۔

سید احمد قادری

دنیا میں اس وقت بدکاریوں کا جو طوفان برپا ہے اور طرح طرح کے جرائم کی جو آندھی چل رہی ہے اس کے وجوہ واسباب کی تلاش کی جائے تو ان میں ایک بڑا سبب شراب کا استعمال نظر آئے گا۔ شراب کی کثرت کے ساتھ ساتھ بدکاریوں اور جرائم کی کثرت لازمی چیز ہے۔ جرائم پیشہ گروہوں کے خصائل وعادات کی تفتیش کی جائے تو کوئی ایک گروہ بھی ایسا نہ ملے گا جو شراب کا عادی نہ ہو عام ازیں کہ وہ علی الاعلان پیتا ہو، یا آنکھوں سے پوشیدہ خلوت خانوں میں۔

شراب کے نشے کا ایک بڑا خاصہ یہ ہے کہ وہ انسان کی نفسانی خواہشوں اور بہیمی قوتوں کو اس درجہ مشتعل کر دیتا ہے کہ وہ انسانیت اور آدمیت سے گزر کر حیوانیت و درندگی پر اتر آتا ہے اور اس کے بعد اس سے ایسی حرکتیں سرزد ہوتی ہیں جن پر جنگل کے بھیڑیے اور کتے شرماتے ہیں۔

شراب کا دوسرا بڑا خاصہ یہ ہے کہ وہ انسانی عقل پر پردہ ڈال دیتی ہے اس کا نشہ عقل پر اس طرح چھا جاتا ہے کہ اچھے برے کی تمیز جاتی رہتی ہے، قوت شناخت ختم ہو جاتی ہے اور پھر اس سے ایسی حرکتیں سرزد ہوتی ہیں کہ ہوش میں آنے کے بعد وہ خود شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہے ایک مستند مورخ کا بیان ہے کہ "میں نے نشے میں مست ایک مسلمان شرابی کو دیکھا جو اپنے ہاتھوں میں پیشاب کر کے اپنے چہرے کو وضو کی طرح دھو رہا ہے اور یہ جملے کہہ رہا ہے۔" اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ جَعَلَ الْاِسْلَامَ نُوْرًا وَّالْمَآءَ طَهُوْرًا۔ تعریف اس اللہ کی جس نے اسلام کو نور اور پانی کو پاک ہونے کا ذریعہ بنایا۔ ظاہر ہے کہ جو شے انسان کو بے سمجھ جانور کے درجے میں پہنچا دے اس کو حرام اور ناقابل استعمال قرار دینا دراصل انسانیت اور انسانی سوسائٹی کی حفاظت کے مترادف ہے۔ انسانی صحت

کے لیے بھی شراب نوشی کی مضرت ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شراب میں کچھ فائدے بھی ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ دنیا کی وہ کون سی شے ہے جو ہر لحاظ سے مضر ہی مضر ہو اور اس میں کچھ فائدہ نہ ہو۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی پر شراب کی مضرت و نقصان کا پہلو غالب ہے یا منفعت کا۔ انسانی سوسائٹی پر شراب نوشی کے جو تباہ کن اثرات مترتب ہو رہے ہیں ان سے کوئی عاقل انکار نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی وہ حکومتیں بھی جو اپنی عقل ہی کو قانون سازی کے لیے کافی سمجھتی ہیں اور خدا کی ہدایت سے بے نیاز ہیں۔ شراب نوشی کو بند کرنے کے قوانین بنا رہی ہیں لیکن انھیں پوری کامیابی اس لیے نہیں ہو رہی ہے کہ شراب اور دیگر جرائم کو بند کرنے کے لیے جس دل و دماغ جس فکر و خیال جس تعلیم و تربیت اور جس نظریۂ حیات کی ضرورت ہے اس سے وہ کوسوں دور ہیں صرف اسمبلیوں میں قانون پاس کر دینے سے کیا ہوتا ہے۔ مجرم اس قانون سے بچنے اور اس کو توڑنے کے بیسیوں ذرائع پیدا کر لیتا ہے اور قانون عملاً بے کار ہو جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ جب تک انسان کے دل سے یہ آواز نہ اٹھے کہ میں جو کام کر رہا ہوں وہ برا ہے اور قابل ترک ہے۔ اس وقت تک وہ خارجی دباؤ سے اس کو ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ دنیا سے برائیوں اور جرم و فساد کو مٹانے کے لیے اللہ پر ایمان، روزِ حساب پر ایمان اور اللہ کے بھیجے ہوئے رسولوں کی پیروی ضروری ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو انسان کو آنکھوں سے مخفی خلوت خانوں میں بھی جرم اور گناہ سے روکتی ہے۔ ورنہ صرف قانون پولس اور فوج کی طاقت نہ آج تک اسے روک سکی ہے اور نہ روک سکتی ہے، ہاں اللہ کے بتائے ہوئے طریقۂ زندگی پر ایمان و عمل نے قوت و طاقت کے استعمال کے بغیر شراب نوشی اور دیگر جرائم کو اس طرح روک دیا ہے کہ آج ہم اس عہد سعادت کی تاریخ پڑھ کر دنگ رہ جاتے ہیں۔

عرب کی قوم، کہ شراب جس کی گھٹی میں پڑی تھی اور جس نے شراب نوشی کو مستقل ایک فن بنا لیا تھا جب دولت ایمان سے مالا مال ہوئی تو اس نے ایک آواز پر شراب اس طرح چھوڑ دی کہ لبوں تک پہنچے ہوئے پیمانے بھی واپس آ گئے اور وہ خم و سبو جو اس کی محبوب متاع تھے اس طرح توڑے کہ مدینے کی گلیاں شراب سے تر ہو گئیں یہ اللہ و رسول کی اطاعت کا محیر العقول منظر تھا اور یہ چیز حاصل نہیں ہو سکتی جب تک جذبۂ ایمان پیدا نہ ہو۔ [illegible]
ادھر رسول کے منادی نے اعلان کیا کہ شراب حرام کر دی گئی ادھر [illegible]

ایمان کے ساتھ چون و چرا کی گنجائش کہاں؟ وہاں تو صرف یہ کیفیت تھی۔ ع

سر تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

قوم عرب کو شراب محبوب تھی لیکن اللہ اس سے زیادہ محبوب تھا۔ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ' اور محبت الٰہی کا مظاہرہ اطاعت ہی کی صورت میں ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے

حرمتِ خمر میں تدریج

جیسا کہ ابھی راقم نے عرض کیا شراب عرب کی گھٹی میں پڑی تھی اور وہ اس کے انتہا سے زیادہ مشتاق اور عادی تھے۔ اس لیے اللہ تعالٰی نے اس کی حرمت بتدریج نازل فرمائی۔ اس سلسلے کی سب سے پہلی آیت کا ترجمہ یہ ہے:۔

لوگ پوچھتے ہیں کہ شراب اور جوے کا حکم کیا ہے؟ کہو: ان دونوں چیزوں میں بڑی خرابی ہے اگرچہ ان میں لوگوں کے لیے کچھ منافع بھی ہیں مگر ان کا نقصان ان کے فائدے سے بہت زیادہ ہے

(البقرہ ۲۱۹)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ شراب اور جوے کے سلسلے میں بہت بے چین رہتے تھے اور دوسرے صحابہ بھی ان دونوں کے نقصانات کو دیکھ کر ان کے حرام کر دیے جانے کے خواہشمند تھے چنانچہ ایک بار سیدنا عمرؓ، معاذ بن جبلؓ اور دوسرے صحابہ سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور کہا، یا رسول اللہؐ! شراب اور جوا ہماری عقل اور مال کے دشمن ہیں ان کے بارے میں فتویٰ دیجیے۔ اس سوال کے جواب میں مسطورہ بالا آیت نازل ہوئی۔ اس میں چونکہ حرمت کی صراحت نہ تھی اس لیے سیدنا عمرؓ نے یہ دعا کی اَللّٰھُمَّ بَیِّنْ لَنَا فِی الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ بَیَانًا شَافِیًا۔ اے اللہ شراب اور جوے کے بارے میں ہمیں واضح حکم عطا فرما!

کچھ مدت کے بعد اس سلسلے کی دوسری آیت نازل ہوئی۔

"اے ایمان والو! نشے کی حالت میں تم نماز کے پاس بھی نہ جاؤ یہاں تک کہ تم سمجھنے لگو کہ تم کیا کہتے ہو۔" (نساء۔ ۴۳)

پہلی آیت نے شراب نوشی میں کمی واقع کر دی تھی کیونکہ بہت سے صحابہ نے اس آیت کے نزول کے بعد شراب ترک کر دی تھی۔ اب اس آیت نے شراب نوشی کی تعداد اور اس کے اوقات کو محدود کر دیا صرف وہ وقت رہ گئے تھے جس میں پینے والے اس کا استعمال کرتے تھے۔ نماز عشاء کے بعد

تاکہ صبح تک ہوش میں آجائیں اور پھر صبح کی نماز کے بعد تاکہ ظہر تک ٹھیک ہوجائیں۔ ظہر کے بعد چونکہ نماز کے اوقات جلد جلد آتے تھے اس لیے شراب نوشی کا موقع ہی باقی نہ رہا تھا ویسے بھی ان دو آیتوں کے نزول کے بعد عام طور پر لوگ اس سے پرہیز کرنے لگے تھے۔ اور اب وقت آگیا تھا کہ کوئی دو ٹوک فیصلہ کر دیا جائے۔ سیدنا عمرؓ نے اس آیت کو سننے کے بعد بھی وہی پہلی دعا کی۔ یہاں تک کہ غزوۂ احزاب کے کچھ دنوں کے بعد شراب اور جوے کی قطعی حرمت کی یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

اے مومنو! بات یہی ہے کہ شراب اور جوا اور بت وغیرہ اور قرعہ کے تیر یہ سب گندی باتیں اور شیطانی کام ہیں۔ سو اُن سے بالکل الگ رہو تاکہ تم کو فلاح ہو۔ شیطان تو یوں چاہتا ہے کہ شراب اور جوے کے ذریعے سے تمہارے آپس میں عداوت اور بغض واقع کردے اور اللہ کی یاد سے اور نماز سے تم کو باز رکھے پس کیا تم اب بھی باز آؤ گے اور تم اللہ کی اطاعت کرتے رہو اور رسول کی اطاعت کرتے رہو اور مخالفتِ حکم سے بچو اور اگر اعراض کرو گے تو یہ جان رکھو کہ ہمارے رسول کے ذمے صرف صاف صاف حکم کا پہنچا دینا ہے۔

(المائدہ ۹۰، ۹۱، ۹۲)

ان آیتوں نے شراب اور جوے کے استعمال کو بت پرستی کی صف میں داخل کر کے ہمیشہ کے لیے قطعاً حرام کر دیا۔ سیدنا عمرؓ نے جب یہ آیتیں سنیں تو پکار اٹھے۔ اَللّٰھُمَّ انْتَھَیْنَا انْتَھَیْنَا اے اللہ! ہم باز آگئے، ہم باز آگئے ــــ شراب نوشی اور قمار بازی میں انفرادی و اجتماعی دونوں قسم کی خرابیاں اور نقصانات ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اجمال و جامعیت کے ساتھ ان دونوں کو بیان فرمایا ہے۔ انسانی سوسائٹی کا سب سے بڑا روگ آپس کی عداوت، بغض اور ایک دوسرے پر ظلم و تعدی ہے اور ایک مسلمان کی انفرادی زندگی کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ وہ اللہ کی یاد اور نماز سے غافل ہوجائے چونکہ شراب اور جوا انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کو خراب کرنے والی چیزیں ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے بڑی شدت و تاکید سے انھیں حرام قرار دیا ہے ان آیتوں کے مندرجہ ذیل نکتے یاد رکھنے کے لائق ہیں۔

(۱) شراب اور جوا انصاب یعنی بت پرستی کی صف میں داخل ہیں۔

(۲) یہ چیزیں نجس یا گندی ہیں۔ یہیں سے مسئلہ نکلتا ہے کہ شراب نجس العین ہے۔ یعنی پیشاب اور پاخانہ کی طرح ناپاک ہے۔

(۳) یہ سب شیطانی کام ہیں

(۴) فَاجْتَنِبُوْهُ اور فَهَلْ اَنْتُمْ مُنْتَهُوْنَ (صیغے استعمال کرکے ان سے قطعی اجتناب کا حکم دیا گیا ہے۔

(۵) انسانی فلاح کو ان چیزوں سے اجتناب کے ساتھ متعلق کیا گیا ہے۔ شرابی اور جواری فلاح نہیں پا سکتے۔

(۶) شیطان شراب اور جوے کے ذریعہ انسانوں کے آپس میں عداوت و بغض پیدا کرتا ہے اور اللہ کی یاد اور نماز سے روکتا ہے۔

(۷) مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ اگر تم نے اللہ و رسول کی اطاعت سے منہ موڑا تو یاد رکھو کہ نہ اللہ کا کچھ بگڑے گا اور نہ اس کے رسول کا کیونکہ رسول کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ حکم کو کھول کر بیان کر دے۔ یہ بڑی سخت تنبیہ ہے جو قرآن اپنی زبان میں دیا کرتا ہے۔

شراب کی حرمت احادیثِ رسول میں

سورۂ مائدہ کی یہ آیتیں نازل ہوئیں تو سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو حکم دیا کہ مدینے میں پکار دیں کہ شراب حرام کر دی گئی۔ اس پکار کے بلند ہوتے ہی اللہ و رسول کی اطاعت کا وہ منظر دیکھا گیا کہ آج ہم اسے حدیثوں میں پڑھ کر دنگ رہ جاتے ہیں۔ جو لوگ شراب نوشی میں مشغول تھے۔ اس ایک آواز کے سنتے ہی رُک گئے، مٹکے توڑ دیے اور شراب مدینے کی گلیوں میں بہہ پڑی۔

بخاری و مسلم میں حضرت انس سے روایت آئی ہے کہ میں ابوطلحہ و ابوایوب اور چند دوسرے صحابہ کو شراب پلا رہا تھا کہ ایک شخص آئے اور انھوں نے کہا کہ شراب حرام کر دی گئی۔ یہ سنتے ہی سب کی زبان سے نکلا "اے انس! ان مٹکوں کی شراب بہا دو" انھوں نے اس خبر کے بعد نہ تو کچھ پوچھ گچھ کی اور نہ پھر شراب پی۔

بخاری و مسلم میں حضرت ابن عمر سے روایت آتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر نشہ لانے والی چیز خمر (شراب) ہے اور ہر نشہ لانے والی پینے کی چیز حرام ہے۔

بخاری و مسلم میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شہد کی شراب کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا۔ ہر پینے کی چیز جو نشہ آور ہو حرام ہے۔

ابو داؤد میں حضرت نعمان بن بشیر سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں تمہیں ہر مسکر (نشہ آور) سے روکتا ہوں۔

ابو داؤد میں حضرت ابو موسیٰ اشعری سے مروی ہے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شہد اور جو کی شراب کے متعلق پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ اپنی قوم کو مطلع کر دو کہ ہر نشہ آور حرام ہے۔

ہمارے ملک ہندستان کے متعدد صوبوں میں تاڑی کا رواج ہے بہتیرے لوگ جو یا تو ناواقف ہیں یا نفس پرست، تاڑی کی حرمت میں شک اور شبہے کا اظہار کرتے ہیں۔ ایسے لوگ اگر نفس پرستی چھوڑ کر ان احادیث کا مطالعہ کریں گے تو دیکھیں گے کہ اللہ کے رسول نے پینے کی نشہ آور اشیاء کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا ہے بلکہ ہر نشہ آور مشروب کو یکساں حرام قرار دیا ہے کیونکہ مفاسد اور خرابیوں کی جہت سے تمام مسکرات یکساں ہیں چاہے وہ انگور کے رس سے تیار کیے گئے ہوں یا تاڑ اور کھجور کے رس سے۔

شراب کا قلیل و کثیر دونوں حرام ہے ابو داؤد و ترمذی نے حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَا أَسْكَرَ كَثِيرُهُ فَقَلِيلُهُ حَرَامٌ۔ یعنی جس کا کثیر نشہ آور ہو اس کا قلیل بھی حرام ہے۔

ابو داؤد و نسائی میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جس کا ایک فرق (فرق ایک بڑے برتن کا نام ہے) نشہ آور ہو، اس کا ایک چلو بھی حرام ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہ حجۃ اللہ البالغہ میں تحریر فرماتے ہیں

چونکہ تھوڑی شراب کا استعمال کثرت مے نوشی کا سبب بن جاتا ہے اس لیے سیاست امت کے لیے واجب تھا کہ وہ مدار تحریم (حرام ہونے کی بنیاد) اس کے نشہ آور ہونے کو قرار دے نہ کہ فی الحال نشے کے وجود کو۔ یعنی شراب میں اگر نشہ پیدا کرنے کی صفت پیدا ہو گئی تو وہ حرام ہو گئی

[illegible]

اسی کتاب میں دوسرے مقام پر تحریر فرماتے ہیں۔
"شریعت محمدیہ نے جو سیاست امت، سدِ ذرائع اور قطعِ احتمال تحریف میں منتہائے مقصود کو پہنچی ہوئی ہے یہ دیکھا کہ شراب کی تھوڑی مقدار زیادہ مقدار کی داعی بن جاتی ہے۔ اس لیے اس نے قلیل وکثیر دونوں کو حرام قرار دیا۔ کیونکہ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو امت کو ان مفاسد سے نہیں بچایا جاسکتا تھا جو شراب نوشی سے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر کچھ شراب کے استعمال میں رخصت کا دروازہ کھول دیا جاتا تو سیاست امت کا انتظام کبھی درست نہ ہوتا۔ (ص۴۷)

شراب کی تجارت بھی حرام ہے

تمام امت کا اس پر اجماع و اتفاق ہے کہ شراب کی بیع و فروخت اور اس کی قیمت و ثمن حرام ہے یہ کوئی قیاسی مسئلہ نہیں ہے بلکہ صحیح حدیثوں سے بنص صریح ثابت ہے۔

بخاری شریف میں حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر نکلے اور فرمایا "حُرِّمَتِ التِّجَارَةُ فِي الْخَمْرِ" یعنی شراب کی تجارت حرام کر دی گئی۔

بخاری و مسلم میں حضرت جابر سے روایت ہے کہ فتح مکہ کے سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ تعالیٰ نے شراب کی خرید و فروخت اور اس سے انتفاع نیز مُردار، سُور اور بتوں کی خرید و فروخت حرام کر دی۔

ابوداؤد میں حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ نے شراب اور اس کے دام، مُردار اور اس کے دام، سُور اور اس کے دام کو حرام کر دیا۔

ابوداؤد میں حضرت مغیرہ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (زجر و توبیخ کے لہجے میں) فرمایا جو شخص شراب بیچتا ہے اسے چاہیے کہ سور ٹکڑے ٹکڑے کر کے بیچے یعنی سُور کا گوشت اور شراب بیچنے میں کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ دونوں کی حرمت برابر ہے۔

ان حدیثوں نے جس شدت کے ساتھ شراب کی تجارت کو حرام قرار دیا ہے۔ وہ ظاہر ہے لیکن حیرت ہے کہ جس شریعت نے سُور اور مُردار حد یہ کہ بت فروشی اور مے فروشی میں کوئی فرق نہیں کیا، آج اس شریعت کو ماننے والوں کا ایک قبیلہ صرف شراب فروشی کی وجہ سے دوسرے قبیلوں سے ممتاز ہوتا ہے۔ ہمارے ان بھائیوں کو جو شراب فروشی کو پیشہ بنائے ہوئے ہیں، سوچنا چاہیے کہ انھوں نے اپنے لیے

کیسا برا ذریعۂ معاش اور کیسی خبیث کمائی اختیار کی ہے۔ وہ شراب فروشی کر کے صرف یہ کہ انسانی سوسائٹی کو تباہ کرنے میں مدد بہم پہنچا رہے ہیں بلکہ یہ کام ان کے دعوی ایمان و اسلام کے بھی منافی ہے وہ حقیقت میں چوروں کی، ڈاکوؤں کی، بدمعاشوں کی اور جرم پیشہ گروہوں کی مدد کر رہے ہیں اور بہتیرے غریب کسانوں اور مزدوروں کی زندگیوں کی تباہی کا ذریعہ بن کر چند پیسوں کے لئے تحصول دنیا کے لیے اپنا دین تباہ و برباد کر رہے ہیں۔ کاش ان کے دلوں میں جذبۂ ایمان جاگ اٹھے اور وہ اس ملعون پیشے سے باز آئیں [1]۔

دس اشخاص پر اللہ و رسول کی لعنت

ابو داؤد میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے شراب پر اور اس کے پینے والے پر، پلانے والے پر، بیچنے والے پر، خریدنے والے پر، کشید کرنے والے پر، کشید کرانے والے پر، بوجھا اٹھانے والے پر اور جہاں وہ پہنچائی جائے اس پر لعنت کی ہے۔

ترمذی میں حضرت انس سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب سے متعلق دس اشخاص پر لعنت کی ہے۔ کشید کرنے والے پر، کشید کرانے والے پر، پینے والے پر، پلانے والے پر، اس کا بوجھا اٹھانے والے پر، جس کے یہاں پہنچائی جائے اس پر، بیچنے والے پر، خریدنے والے پر، اس کا تحفہ دینے والے اور اس کے دام کھانے والے پر۔

جو مسلمان بھی شراب کے کسی کام میں لگا ہوا ہے اس کو ان حدیثوں پر غور کرنا چاہیے۔ اس سے زیادہ بدنصیب کون ہوگا جس پر اللہ جو ماں باپ سے زیادہ مہربان ہے اور رسول جو تمام عالم کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے۔ لعنت بھیجیں جو مسلمان بھی اس کاروبار میں لگا ہوا ہے وہ پیسوں اور روپوں کے ساتھ ہر آن اللہ و رسول کی لعنتیں بھی سمیٹ رہا ہے۔ مسلمان ملکوں کے سربراہوں اور حکمرانوں کو بھی ان حدیثوں سے عبرت حاصل کرنی چاہیے۔

شراب پینے والے کے متعلق وعیدیں

بخاری و مسلم میں حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب

---

[1] اور یہ بات تو ایک مومن مخلص کے لیے انتہائی صدمہ اور رنج ہے کہ مسلمان حکومتیں اپنی مملکت میں شراب کی تجارت کے لیے پرمٹ اور لائسنس جاری کریں اور طرح طرح کے بہانے کر کے شراب کے کئی امتناع میں رکاوٹ اٹھائیں۔

دنیا میں شراب پی اور پیتا رہا یہاں تک کہ بغیر توبہ کے مر گیا وہ آخرت میں شراب طہور سے محروم رہے گا۔ مسلم میں حضرت جابر سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یمنی کو جواب دیتے ہوئے فرمایا "جو مسکرات کا استعمال کرتا ہے اللہ اس کو آخرت میں دوزخیوں کے جسم سے بہے ہوئے پیپ اور خون پلائے گا۔ نسائی میں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انھوں نے فرمایا "شراب سے بچو اس لیے کہ وہ خبائث (برائیاں) کی اصل ہے خدا کی قسم ایمان اور شراب نوشی پر اصرار دونوں جمع نہیں ہو سکتے یا تو ایمان شراب نوشی کو بند کر دے گا یا شراب، ایمان کو دل سے نکال باہر کرے گی۔

حاصل کلام، شراب نوشی اور شراب فروشی انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو برباد کر دیتی ہے اس لیے عقل و نقل کا فیصلہ ہے کہ اسے قطعاً ترک کر دیا جائے۔ خصوصیت کے ساتھ مسلمان کے لیے جو اللہ و رسول پر ایمان کا دعویٰ کرتا ہے۔ شراب نوشی اور شراب کا کاروبار ایسا کام ہے جو اس کے ایمان و اسلام کی جڑیں ہلا دیتا ہے۔ ایک شاعر واعظ کاشی نے یہ قطعہ کیا خوب لکھا ہے۔

ترا رحمان ہمی گوید کہ اے مومن مخور بادہ ترا ترسا ہمی گوید کہ در صفرا مخور حلوا
نمی دانی تو تا پاکی برائے گفتۂ رحمن بمانی شہد و شکر را برائے گفتہ ترسا

شرائطِ ایجنسی

(۱) ایجنسی کم سے کم ۵ رسائل پر دی جائے گی۔

(۲) رسائل حسب ضرورت طلب کیے جائیں، اگر فروخت نہ ہوئے تو واپس نہیں لیے جائیں گے۔

(۳) کمیشن ۲۵ فی صدی دیا جائے گا، البتہ پچاس یا زائد رسالوں کی خریداری پر کمیشن ۳۳ فی صدی ہوگا۔

(۴) رسائل کی روانگی کا صرفہ ہمارے ذمے ہوگا اور رجسٹری یا وی پی کا خرچ ایجنٹ صاحبان کے ذمے ہوگا

(۵) رقم بہر حال پیشگی آنی چاہیے یا پھر وی پی بھیجنے کی اجازت دی جائے۔ وی پی کے مصارف زیادہ ہوں گے۔

منیجر رسالہ "زندگی" رام پور۔ یوپی

خدا کا آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم

(مولانا سید جلال الدین عمری)

اگر آپ انسانی تاریخ کا اس کی ابتدا سے انتہا تک مطالعہ کریں تو آپ کو سب سے بڑی اور صاحبِ عظمت شخصیت جو ملے گی وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت ہوگی۔ آپ انسان تھے، لیکن اتنے عظیم انسان کہ آج تک کسی دوسرے انسان کو اتنی بڑی عظمت نصیب نہیں ہوئی۔ دنیا کے تمام بڑے انسانوں کو ایک صف میں کھڑا کیا جائے تو آپ کا مقام سب سے نمایاں اور سب سے اونچا ہوگا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے عظمت و بلندی آپ کی ذات پر ختم ہوگئی اور ہر بڑا آدمی آپ کے مقابلے میں اپنی بڑائی سے دست بردار ہوگیا۔

ساتویں صدی عیسوی کے شروع میں آپ نے دعویٰ کیا کہ آپ خدا کے رسول ہیں اور سارے عالم کی نجات آپ کی اتباع میں ہے۔ یہ بہت بڑا دعویٰ تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ تنہا آپ کو قائد اور راہنما مانا جائے اور ہر معاملے میں صرف آپ کی پیروی کی جائے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اتنے بڑے دعوے کو انسانوں نے قبول کیا اور اس طرح قبول کیا کہ وہ ان کے دل و دماغ پر چھا گیا اور ان کی رگوں میں خون بن کر دوڑنے لگا۔ آپ نے دنیا کو خدا کی بندگی کا پیغام دیا اور بہت ہی مختصر مدت میں ایسے افراد تیار ہوگئے جو اس پیغام کی عملی تصویر تھے۔ وہ خدا کے وفادار بندے تھے اور خدا کو اسی ڈھنگ سے یاد کرتے تھے جس ڈھنگ سے خدا کو یاد کرنے کا آپ نے حکم دیا تھا۔ ان کی سیاست و عدالت بالکل ان اصولوں پر قائم تھی جو آپ نے بتائے تھے۔ وہ دوسروں کے ساتھ معاملات ان بنیادوں پر کرتے تھے جن کی آپ نے تعلیم دی تھی۔ ان کی صبح و شام ان کی موت و حیات اور ان کی خوشی اور غم آپ کی ہدایات کے تابع تھے۔ آپ کی زبان سے جو کلمات نکلے ان کے لیے سند بن جاتے اور

آپ کے کلمات حیات ظاہر ہوئی وہاں کے لیے اسوہ قرار پائی۔

آپ کا پیغام انقلابی پیغام تھا۔ یہ ایک نئی دنیا تعمیر کرنے کی دعوت تھی۔ یہ دعوت جس وقت حجاز کی سرزمین سے بلند ہوئی تو سارے ملک میں ہنگامہ مچ گیا اور ہر طرف سے اس کی مخالفت ہونے لگی لیکن یہ ایک سچی دعوت تھی اور سچائی میں اتنا وزن ہوتا ہے کہ زیادہ عرصے تک اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ مخالفت کا زور ٹوٹتا چلا گیا اور ایک وقت آیا کہ اس کے ماننے والے اس کے مخالفین پر غالب آ گئے۔

یہ ایک حیرت انگیز انقلاب تھا جو خدا کی زمین پر رونما ہوا لیکن جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا اس دعوت کی گرفت اس کے ماننے والوں پر کمزور ہونے لگی اور ساتھ ہی ان کی سیاسی قوت بھی زوال پذیر ہونی شروع ہو گئی لیکن اس کے باوجود آج بھی بے شمار انسان اس دعوت کو اپنے سینوں سے لگائے ہوئے ہیں۔ وہ ان کی زندگیوں میں اس طرح اتر چکی ہے کہ وہ ایک لمحہ کے لیے اس سے الگ ہونا پسند نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک اپنی جان ہلکی ہے اور یہ دعوت زیادہ قیمتی ہے۔ وہ اسے اپنا عزیز ترین سرمایہ سمجھتے ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ اس دعوت سے جو دنیا آباد ہوئی تھی وہ ویران نظر آتی ہے لیکن اس ویرانے میں جگہ جگہ چراغ جل رہے ہیں اور یہ احساس زندہ ہے کہ چراغ کی لَو کمزور ہے اور اسے تیز کرنا ہے۔ اس احساس کے ہوتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے کہ ان ہی کھنڈرات سے پھر کوئی نیا محل نہیں اُبھرے گا۔ آگ بجھ چکی ہے لیکن چنگاریاں باقی ہیں جو کسی بھی وقت دہکتے ہوئے انگاروں میں تبدیل ہو سکتی ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت آج بھی ایک زندہ دعوت ہے۔ زمانے کی رفتار نے اسے ختم نہیں کیا ہے اور وہ کسی بھی وقت پھر اُبھر کر ہر طرف چھا سکتی ہے۔

جو دعوت اپنے اندر اتنی زبردست طاقت رکھتی ہو اور جسے ڈیڑھ ہزار سال سے بے شمار انسان پورے شرحِ صدر کے ساتھ اپنائے ہوئے ہوں اسے وہی شخص نظر انداز کر سکتا ہے جس کی فکری قوتیں مفلوج ہو چکی ہوں یا جو چھوٹے چھوٹے واقعات میں الجھ کر بڑے واقعات پر غور کرنے کی صلاحیت کھو چکا ہو۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ کسی دعوے کی قدامت اسے حق نہیں ثابت کر دیتی اور نہ انسانوں کی بڑی تعداد کا کسی بات کو مان لینا اس کے صحیح ہونے کی دلیل ہے۔ بہت سی باتیں خاص طور پر مذہب کی دنیا میں حقیقت سمجھی جاتی تھیں لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وہ غلط اور بے بنیاد ہیں۔

بے شک آپ کا یہ خیال ایک خاص دائرے میں بالکل درست ہے لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ کسی دعوے کو ہوشمند انسانوں کی بڑی تعداد میں قبول کرنا اس کے وزن کو بڑھا دیتا ہے۔ آپ آسانی سے ان کے فکر کو غلط نہیں قرار دے سکتے۔ اس کے لیے آپ کو سنجیدگی سے سوچنا ہوگا اور ایک خاص مدت اس غور و فکر میں صرف کرنی ہوگی۔ اس کے بعد ہی آپ یہ فیصلہ کرنے کا حق رکھتے ہیں کہ ان سوجھ بوجھ رکھنے والے انسانوں کا یہ اقدام صحیح ہے یا غلط؟ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو قبول کرنے والوں میں جاہل اور کم علم انسان ہی نہیں ہیں بلکہ ایسے اصحاب علم بھی ہیں جو اپنے علم و فن میں تجدید و امامت کا مقام رکھتے ہیں اور جن کی عظمت سے ان کا کوئی مخالف بھی انکار نہیں کر سکتا۔ اس میں عوام ہی نہیں ہیں بلکہ بڑی بڑی سلطنتوں کے حاکم اور فرماں روا بھی ہیں۔ اس میں ناتجربہ کار نوجوان ہی نہیں ہیں بلکہ تجربہ کار اور جہاں دیدہ اصحاب بھی ہیں۔ اس میں جوش اور جذبات رکھنے والے اشخاص ہی نہیں ہیں بلکہ خاموش طبع اور سنجیدہ انسان بھی ہیں۔ اس میں معاشرے کی نچلی سطح کے افراد ہی نہیں ہیں بلکہ ایسے افراد بھی ہیں جو سوسائٹی میں اونچا مقام رکھتے ہیں۔ غرض یہ کہ انسانوں کے مختلف طبقات نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو اپنے اپنے معیار سے جانچا ہے اور اسے اپنے ذہن سے قریب تر اور اپنے علم و تحقیق کے مطابق پایا ہے۔

پھر یہ کہ آپ کی دعوت کے ماننے والے کسی خاص دور اور کسی خاص قوم سے متعلق نہیں ہیں بلکہ چودہ سو سال سے ہر دور اور ہر قوم کے انسانوں نے اسے قبول کیا ہے اور انہیں یہ دعوت حقیقت کے عین مطابق معلوم ہوئی ہے۔ اس کے لیے انھوں نے اپنے جان و مال قربان کیے ہیں۔ اپنی بہترین زندگیاں وقف کی ہیں اور وہ تمام مشکلات برداشت کرتے رہے ہیں جو اس راہ میں انہیں پیش آئی ہیں۔ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے اور امید ہے آئندہ بھی جاری رہے گا۔ اس طرح اس دعوت کی قدامت بھی اس کے معقول ہونے کی زبردست دلیل بن جاتی ہے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی اہمیت کا یہ صرف ایک پہلو ہے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ دعوت صرف ان لوگوں کے لیے نہیں ہے جنہوں نے اسے قبول کیا ہے بلکہ ان لوگوں کے لیے بھی ہے جنہوں نے اسے ابھی قبول نہیں کیا ہے۔ یہ دعوت ہر ایک فرد کے سامنے اس کا ذاتی مسئلہ بن کر آتی ہے اور اس سے براہ راست مطالبہ کرتی ہے کہ اسے قبول کرے کیونکہ اس کی نجات

اس کے ساتھ وابستہ ہے۔ اگر وہ اسے قبول کرتا ہے تو کامیاب ہے ورنہ اسے ناکامی سے کوئی چیز بچا نہیں سکتی۔ ظاہر ہے یہ کوئی معمولی آواز نہیں ہے جس سے آپ کان بند کر لیں۔ بلکہ یہ ایک ایسی پکار ہے جس کی تائید میں ہزاروں بلکہ لاکھوں عظیم انسان موجود ہیں۔ یقیناً آپ اس دعوت کو رد کرنے کا حق رکھتے ہیں لیکن اس کے لیے آپ کے پاس بہت ہی معقول وجوہ ہونے چاہییں۔ اگر بغیر دلیل کے آپ اس دعوت کا انکار کرتے ہیں تو آپ کو اس زبردست خطرے کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے جس سے یہ دعوت آگاہ کر رہی ہے۔

اس وقت میں آپ کے سامنے تین ایسی حقیقتیں رکھوں گا جن سے ثابت ہوتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے سچے رسول ہیں۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوی رسالت کی تصدیق ان بہت سے غیر معمولی واقعات سے ہوتی ہے جنہیں مذہبی اصطلاح میں معجزات کہا جاتا ہے۔ یہ دراصل رسالت کی محسوس نشانیاں ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بے شمار معجزات ظاہر ہوئے ہیں۔ میں یہاں صرف تین معجزات کا ذکر کروں گا۔

۱۔ مکہ میں آپ کے مخالفین نے آپ سے دلیل نبوت کا مطالبہ کیا تو آپ نے آسمان کی طرف اشارہ کیا اور چاند دو ٹکڑے ہو گیا۔ (بخاری)

۲۔ جنگ خندق بڑی عسرت کی حالت میں لڑی جا رہی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے شکم پر پتھر بندھے ہوئے تھے۔ حضرت جابرؓ نے یہ حال دیکھا تو جلدی سے گھر گئے اور آپ کے لیے کھانے کا انتظام کیا۔ اس کے بعد آپ سے گزارش کی کہ آج آپ اور دو ایک اصحاب میرے گھر کھانا تناول فرمائیں۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ تم نے کیا پکوایا ہے۔ حضرت جابرؓ نے جواب دیا کہ ایک بکری کا بچہ ذبح کیا ہے اور ایک صاع (۳ ½ سیر) جو کی روٹی پکوائی ہے۔ یہ سنتے ہی آپ نے پورے لشکر میں اعلان کر دیا کہ آج جابر کے ہاں سب کی دعوت ہے۔ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ حضورؐ گھر تشریف لائے اور دعا کی۔ اس کے بعد باری باری سے پورے لشکر نے جو ایک ہزار افراد پر مشتمل تھا سیر ہو کر کھایا لیکن خدا کی قسم اس کے باوجود کھانا جوں کا توں بچا رہا۔ (بخاری)

۳۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر آپ کے ساتھ تقریباً ۱½ ہزار افراد تھے۔ ایک وقت پانی کی اتنی قلت ہوئی کہ صرف ایک لوٹا پانی پورے مجمع کے پاس رہ گیا تھا۔ جب آپ کو معلوم ہوا تو آپ نے لوٹے پر

اپنا ہاتھ رکھا اور دعا کی، فوراً انگلیوں کے درمیان سے پانی چشموں کی طرح ابلنے لگا۔ جابر کہتے ہیں کہ پانی سے پورا مجمع سیراب ہوا۔ راوی کا بیان ہے کہ پانی اتنی تیزی سے ابل رہا تھا کہ اگر مجمع ایک لاکھ کا ہوتا تو بھی اس کے لیے کافی ہو جاتا۔ (بخاری)

یہ غیر معمولی واقعات حقیقت میں دلائلِ نبوت ہیں۔ یہ عام قوانینِ عالم کے تحت کبھی وجود میں نہیں آ سکتے۔ یا اسی وقت وجود میں آتے ہیں جب کہ خدائے تعالیٰ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ فلاں شخص اس کا فرستادہ ہے، قوانینِ عالم میں تغیر پیدا کرتا ہے۔ اس طرح ایک وہ چیز جو کسی عام انسان سے وقوع میں نہیں آسکتی پیغمبر کے ہاتھوں واقع ہو جاتی ہے۔

ان واقعات کے بارے میں آپ پہلا سوال یہ کریں گے کہ آیا یہ ثابت بھی ہیں یا نہیں؟ اگر تاریخ ان کا ثبوت فراہم کرتی ہے تو یقیناً وہ قابلِ غور بن جاتے ہیں لیکن اگر ان کی حیثیت محض افسانہ کی ہے تو ان پر غور و فکر کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

اس سوال کے جواب میں متعدد وجوہ ہمارے سامنے ایسے آتے ہیں جن کی بنا پر ان واقعات کا انکار ممکن نہیں رہتا۔

(۱) تاریخ کے مستند ذرائع سے ثابت ہے کہ یہ واقعات عام طور پر بڑے مجمعوں میں پیش آئے۔ ان کے دیکھنے والی آنکھیں دو ایک نہیں بلکہ سیکڑوں تھیں۔ اس لیے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کے دیکھنے اور سمجھنے میں لوگوں نے دھوکا کھایا ہے۔ مثال کے طور پر شقِ قمر کے واقعہ کو ان لوگوں نے بھی دیکھا جو واقعہ کے وقت آپ کے قریب موجود تھے اور اُن لوگوں نے بھی اس کی گواہی دی جو باہر سے آئے تھے۔ (ترمذی) جنگ خندق میں حضرت جابرؓ کے گھر کثرتِ طعام کا مشاہدہ ایک ہزار افراد نے کیا۔ اسی طرح صلح حدیبیہ کے موقع پر تھوڑے سے پانی کے فواروں کی شکل میں ابلنے کا واقعہ پندرہ سو انسانوں کے درمیان پیش آیا۔

اگر ہم تاریخ پر اعتماد کرتے ہیں تو ماننا پڑے گا کہ یہ واقعات صحیح شکل میں ہم تک پہنچے ہیں کیونکہ انسانوں کی اتنی بڑی تعداد کسی استدلال میں تو غلطی کر سکتی ہے لیکن کسی مشاہدے میں غلطی نہیں کر سکتی۔

(۲) جن لوگوں نے یہ واقعات ہم تک پہنچائے ہیں ان کے بارے میں یہ بدگمانی نہیں کی جا

وہ کسی غلط بات پر متفق ہو گئے تھے اور دنیا کو فریب دینا چاہتے تھے کیونکہ بظاہر وہ بہت ہی نیک، خدا ترس ہیں اور انتہائی قابلِ اعتماد نظر آتے ہیں۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ ہم ان پر جھوٹے ہونے کا الزام لگائیں۔

(۳) ان واقعات کے بیان کرنے میں ان کا کوئی مادی فائدہ نہیں تھا۔ کیونکہ اس سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ رسالت کی تصدیق ہوتی ہے۔ اسی تصدیق کی وجہ سے وہ اپنے وطن سے نکالے گئے، ان کے مال و دولت پر قبضہ کیا گیا، ان کی جانیں ضائع ہوئیں اور طرح طرح کی تکلیفیں انہیں اٹھانی پڑیں، ان حالات میں عقل یہ کہتی ہے کہ اگر یہ واقعات وجود میں نہ آتے اور ان کے حق ہونے کا انہیں یقین کامل نہ ہوتا تو وہ انہیں اپنے جی سے گھڑ کر کبھی بیان نہ کرتے اور اگر کسی وجہ سے ان سے یہ غلطی سرزد ہو بھی جاتی تو وہ زیادہ مدت تک اس پر جمے نہ رہتے۔

(۴) اس قسم کے جتنے واقعات مشہور ہیں ان میں سے کسی خاص واقعہ کے بارے میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس کے حق میں تاریخی ثبوت کافی نہیں ہے۔ لیکن مجموعی طور پر ان سب کا انکار ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ ان میں سے بہت سے واقعات اسلامی تاریخ میں تواتر کے ساتھ ثابت ہیں کسی واقعہ کی چھان بین کے لیے آپ جو سخت سے سخت شرائط پیش کر سکتے ہیں وہ ان پر پورے اترتے ہیں۔

(۵) یہ واقعات اپنی تاریخِ وجود سے مسلمانوں کے تمام طبقات میں مشہور رہیں۔ اسے ہر نسل نے اپنے بعد آنے والی نسل تک پورے اہتمام کے ساتھ پہنچایا ہے۔ عوام نے ان واقعات کو سنا اور قبول کیا اور اہل علم نے انہیں اپنی تحقیق کے مطابق پایا اور بیان کیا۔ آج تک کسی بھی طبقے نے ان کی تردید نہیں کی بلکہ اگر مخالفین کی طرف سے ان کا انکار کیا گیا تو پوری قوت اور دلائل کے ساتھ انہیں ثابت کیا۔ ان واقعات کا اس کثرت سے پوری ایک امت میں پھیل جانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

آپ کہیں گے کہ یہ ایک خاص قوم میں پھیلے ہوئے واقعات ہیں ساری دنیا ان سے واقف نہیں ہے لہٰذا وہ سب کے لیے قابلِ قبول نہیں ہو سکتے۔

میں کہوں گا یہ بالکل بے معنی اعتراض ہے۔ تاریخ میں آپ کو بہت سے اہم ترین واقعات ملیں گے جو پوری قطعیت کے ساتھ ثابت ہیں لیکن ان کے جاننے والے گنتی کے چند افراد ہیں۔ اگر کسی واقعہ کے اثبات کے لیے یہ شرط لگا دی جائے کہ اسے ہر شخص جانتا ہو تو ہم بڑے سے بڑے واقعہ کو ثابت نہیں

کر سکے ۔ کیا سکندر رومی اور اس کی فتوحات سے دنیا کا ہر فرد واقف ہے؟ کیا حضرت مسیح اور ان کی تعلیمات سے ہر ایک شخص باخبر ہے؟ نہیں بلکہ میں تو کہوں گا کہ بہت سے اہم واقعات حتی کہ عظیم شخصیتیں صرف مخصوص قوموں ہی میں مشہور ہیں۔ دنیا کے ہر طبقے اور ہر قوم کی سندِ قبولیت انہیں حاصل نہیں ہے۔ غزالی اور ابن تیمیہ اسلامی تاریخ میں بہت ہی اونچے مقام کے مالک ہیں۔ ان کے کارنامے اتنے نمایاں ہیں کہ امت مسلمہ کبھی نہیں بھلا سکتی لیکن اس امت سے باہر کم ہی لوگ ان کے نام تک سے واقف ہیں اور ان کے کام کو جاننے والے تو انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔

یہ معجزات ظاہر ہوئے اور اسی وقت ختم ہو گئے۔ ان معجزات کو جن انسانوں کی آنکھوں نے دیکھا انھوں نے بعد والوں تک انہیں پہنچایا اور دنیا سے چلے گئے۔ اب یہ ہمارے لیے ماضی کے تذکرے ہیں جو کتابوں میں محفوظ ہیں یا جنھیں روایت کرنے والی زبانیں اگلوں سے روایت کر رہی ہیں لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ایسا معجزہ بھی ہے جو بالکل ہمارے سامنے موجود ہے اور جسے مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک ہر شخص ہر جگہ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔ آپ کا یہ معجزہ وہ عظیم کتاب ہے جو آپ کو خدا کی طرف سے ملی ہے۔ دنیا نے اس کا مطالعہ ہر رخ سے کیا لیکن کسی بھی پہلو سے آج تک اس کا جواب نہیں دیا جا سکا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کو اپنے حقیقی معجزہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

ما من الانبیاء من نبی الا وقد	جتنے بھی نبی گزرے ہیں ان میں سے ہر نبی کو
اعطی من الآیات ما مثلہ آمن علیہ	ایسے معجزات عطا کیے گئے تھے کہ جنہیں دیکھ کر لوگ
البشر وانما کان الذی اوتیتہ	اس پر ایمان لا سکتے لیکن مجھے جو معجزہ دیا گیا ہے
وحیا اوحاہ اللہ الی فارجوان	وہ یہ وحی (قرآن) ہے جو اللہ نے مجھ پر نازل
اکون اکثرھم تابعا یوم	کی ہے۔ مجھے توقع ہے کہ قیامت کے دن میرے
القیامۃ (احمد، بخاری، مسلم)	پیچھے چلنے والے ہر نبی کی امت سے زیادہ ہوں گے

یہ معجزہ ایک ایسے ماحول میں صادر ہوا جہاں علم و حکمت کے چرچے نہیں تھے جہاں معمولی لکھنا پڑھنا جاننے والے افراد بھی گنتی کے چند تھے، جہاں جہالت اور تاریک خیالی عام تھی، جہاں لوگ اوہام و خرافات میں گرفتار تھے، جہاں مظاہر پرستی عقیدے میں شامل تھی اور خیالات کی پستی اپنی آخری حد کو پہنچ چکی

تھی جہاں آنکھ اور کان ہی انسانی فکر و دَو کی آخری منزل تھیں اور محسوسات سے اوپر اٹھ کر سوچنے
والے انسان دور دور تک موجود نہیں تھے، جہاں اچھے اچھے خطیب تھے لیکن ان کی خطابت کا
موضوع اپنی شجاعت، لوٹ مار اور قتل و غارت گری تھا۔ جہاں تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے لوگ پائے
جاتے تھے لیکن ان کی تاریخی دلچسپی اپنے باپ دادا کی داستانوں، اپنے جھگڑوں اور لڑائیوں
کے واقعات اور اپنے گھوڑوں اور اونٹوں کے نسب ناموں تک محدود تھی، جہاں بچہ بچہ شاعر تھا،
لیکن ان کی شاعری عورت، شراب اور بے حیائی کے تذکروں سے بھری ہوئی تھی۔ اس میں حکمت و
دانائی کی باتیں بھی کہیں کہیں آجاتی تھیں لیکن اصلاً یہ ان کے موضوع سے خارج تھیں جہاں زندگی
اتنی سادہ تھی کہ سیاست و تمدن اور فلسفہ و الٰہیات کے پیچیدہ مسائل سے کوئی واقف نہ تھا
اور جہاں علم کی دنیا اتنی تنگ تھی کہ خدا کی ذات و صفات، کائنات کی حقیقت، انسان کے مقصدِ
حیات اور اس کے آغاز و انجام سے کسی کو بحث نہیں تھی۔ اس ماحول میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے
سامنے آتے ہیں اور وہ زبردست انقلابی کتاب اپنے ساتھ لاتے ہیں جس نے دنیا کی دنیا بدل دی۔
انسان اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ مدرسوں اور کالجوں میں صرف کرتا ہے تو اسے علم کی سند ملتی ہے لیکن
آپ نے کسی مدرسے اور کالج میں تعلیم نہیں پائی۔ لوگ عالموں اور فلسفیوں کی صحبت میں بیٹھتے ہیں
تو حکمت و دانائی کی باتیں سیکھتے ہیں، لیکن آپ نے کسی عالم اور فلسفی کی صحبت نہیں اٹھائی۔ لکھنے والے
مدتوں لکھنے کی مشق و ممارست کرتے ہیں تو چند سطر لکھنے کے قابل ہوتے ہیں لیکن آپ نے کبھی لکھنے کی
مشق نہیں کی۔ بولنے والے زمانے تک بولنے کی صلاحیت پیدا کرتے ہیں تو انہیں مجمعوں میں تقریر کرنا
آتا ہے لیکن آپ نے کبھی صلاحیتِ تقریر پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے باوجود قرآن جیسی کتاب کا
پیش کرنا کیا کوئی معجزہ نہیں ہے؟ جس میں علم کی وسعت بھی ہے، فلسفہ کی گہرائی بھی ہے، تصنیف کی
ترتیب اور سلیقہ بھی ہے اور خطابت کا زور بھی ہے جو اس وسیع کائنات کے بارے میں صحیح ترین
نقطۂ نظر عطا کرتی ہے، جو مابعد الطبیعاتی مسائل پر پوری تفصیل سے بحث کرتی ہے، جو ماضی کے حالات
ہمارے سامنے رکھتی ہے اور ان سے ٹھیک ٹھیک نتائج اخذ کرتی ہے جو انسان کے اعمال اور
ان کے اچھے اور برے ثمرات سے گفتگو کرتی ہے، جو اس کے معاشی، تمدنی، سیاسی اور تہذیبی مسائل
کو اس طرح حل کرتی ہے کہ آج تک اس سے بہتر حل دنیا پیش نہیں کر سکی اور جو اسے بہترین قانون

بہترین نظام حیات دیتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ خدا اور انسان کے ان لطیف [illegible]
ہے جسے انسان خود سے کبھی جان نہیں سکتا اور جس کے جانے بغیر اس کی زندگی کا ہر لمحہ اور اس کا
ہر پہلو لاحاصل اور بے معنی ہے۔ اس عظیم معجزہ کے ہوتے ہوئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوئ
رسالت کی تصدیق کے لیے پھر کس معجزے کی ضرورت ہے؟ اور اس دلیل سے بڑھ کر آخر آپ
تائید میں اور کون سی دلیل لائی جاسکتی ہے؟

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ
كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ
الْمُبْطِلُوْنَ ۝ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ
فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ
وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَا اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ۝
وَقَالُوْا لَوْلَا اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ
مِّنْ رَّبِّهٖ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ
عِنْدَ اللّٰهِ وَاِنَّمَا اَنَا نَذِيْرٌ
مُّبِيْنٌ ۝ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ
اَنَّا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ
يُتْلٰى عَلَيْهِمْ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ
لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ
يُّؤْمِنُوْنَ ۝

(العنکبوت ۵۱-۴۸)

اس کتاب کے نازل ہونے سے پہلے
تم کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ
سے اسے لکھتے تھے۔ اگر یہ بات ہوتی تو یقیناً
یہ باطل پرست شبہے میں پڑ جاتے۔ واقعہ یہ ہے
کہ یہ قرآن کھلی ہوئی آیتوں کی شکل میں ان
لوگوں کے سینوں میں موجود ہے جن کو علم عطا
کیا گیا ہے۔ یہ منکرین کہتے ہیں کہ اس شخص پر
اس کے خدا کی طرف سے کچھ نشانیاں کیوں نہیں
اتاری گئیں۔ کہو کہ نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں
اور میں تو محض کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں۔ کیا ان
کے لیے (یہ نشانی) کافی نہیں ہے کہ ہم نے تم پر
(قرآن جیسی) کتاب نازل کی ہے جو ان کو پڑھ کر
سنائی جاتی ہے؟ بے شک اس میں رحمت اور
نصیحت ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں

قرآن کی اعجازی شان یہ ہے کہ اس کی ہر بات حقیقت کی ترجمانی کرتی ہے۔ اس کی تعلیمات اہل علم
کے دل کی آواز ہیں۔ اس کی آیتوں میں انہیں حق و صداقت کا دریا موجزن نظر آتا ہے۔ قرآن کے مطالعہ
سے یہ یقین پیدا ہوتا ہے کہ یہ کتاب کسی انسانی ذہن کی تصنیف نہیں ہو سکتی۔ یہ صرف اس خدا کی کتاب
ہو سکتی ہے جو حقیقت کا ٹھیک ٹھیک علم رکھتا ہے اور اس عالم کے آغاز و انجام سے پوری طرح باخبر

ہے۔ دنیا کا ہر انقلاب بہت سے نظریات کو الٹ کر رکھ دیتا ہے لیکن حیرت ہوتی ہے کہ قرآن اس دنیا میں چودہ صدیوں سے موجود ہے اور اس دوران میں بے شمار ذہنی و فکری انقلاب آچکے لیکن کوئی بھی انقلاب اس کے کسی بیان کو رد نہیں کر سکا بلکہ ہر انقلاب اس کی علمی عظمت کو اور بڑھا دیتا ہے۔ تم چاہتے ہو کہ کائنات کی کوئی ایک چیز محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی گواہی دے، لیکن دیکھو کہ انہوں نے تمہارے سامنے ایک ایسی کتاب رکھ دی ہے کہ جس کی تائید میں زمین و آسمان کی ایک ایک چیز بول رہی ہے۔ ہر حسی معجزہ ایک دلیل ہوتا ہے لیکن قرآن اپنے دعوے کے ثبوت میں آفاق و انفس کی بے شمار دلیلیں فراہم کرتا ہے۔ اگر انسان کے پاس حقیقت کا مطالعہ کرنے والی آنکھیں ہوں تو وہ دیکھے گا کہ پوری کائنات اس کی تصدیق کر رہی ہے۔ اگر وہ صحیح فکر کا حامل ہے تو معلوم ہوگا کہ قرآن عقل اور منطق کی میزان پر ٹھیک ٹھیک اتر رہا ہے۔ بلکہ خود اس کا ضمیر اگر وہ زندہ ہے تو اس کے حق ہونے کی شہادت دے گا۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص قرآن کی صداقت کا قائل ہو اور اس کے دلائل کو ماننے سے انکار کر دے، لیکن دنیا میں اس کے منکرین ہی آباد نہیں ہیں، ان ہی کے پاس عقل و دانش کا سرمایہ نہیں ہے اور صرف وہی قوتِ فیصلہ کے مالک نہیں ہیں، بلکہ اس دنیا میں وہ لوگ بھی ہیں جو اس کے حق ہونے کی گواہی دیتے ہیں۔ وہ اسے خدا کی کتاب سمجھتے ہیں اور اس کے دلائل سے مطمئن ہیں۔ ان کا یہ اطمینان جھوٹا اطمینان نہیں ہے بلکہ حقیقی اطمینان ہے جو اعترافِ حقیقت کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے۔ لیکن اس کے منکرین میں سے کوئی بھی شخص اپنے مقام پر مطمئن نہیں ہے کیونکہ وہ ایک ایسی حقیقت کا انکار کر رہا ہے جس کا اقرار کائنات میں ہر طرف سے ہو رہا ہے۔ قرآن کا انکار کر کے اس نے اپنے خدا کو چھوڑ دیا ہے۔ جب انسان خدا کو چھوڑ دیتا ہے تو اس کی زندگی میں زبردست خلا پیدا ہو جاتا ہے۔ اس خلا کو وہ کسی بھی ذریعہ سے پُر نہیں کر سکتا۔ وہ ایک مجرم ہے۔ وہ جس پہلو سے بھی اپنے آپ کو دیکھے گا خطا کار محسوس کرے گا۔ وہ وقتی طور پر اپنے جرم کو چھپا سکتا ہے لیکن اس کی روح اضطراب اور بے چینی سے نجات نہیں پا سکتی۔ قرآن انسان کو خدا سے قریب کرتا ہے۔ اس سے سکون اور اطمینان کی دولت نصیب ہوتی ہے۔ جو لوگ صحیح معنوں میں قرآن کو مان رہے ہیں ان کی زندگیوں میں اس کی جھلک ہر حال میں دیکھی جا سکتی ہے۔ معجزے کا مقصد انسان کی روح کو مطمئن کرنا ہے تو قرآن دنیا کا عظیم ترین معجزہ ہے۔ پھر لوگ

کیوں اس معجزے کو نہیں دیکھتے؟

وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ قُلْ إِنَّ اللَّهَ يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ أَنَابَ ○ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُمْ بِذِكْرِ اللَّهِ أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ ○

(الرعد: ۲۸، ۲۷)

جن لوگوں نے کفر کیا وہ کہتے ہیں کہ اس شخص (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری گئی ہے؟ کہہ دو کہ اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے اسے سیدھی راہ دکھاتا ہے۔ یہی لوگ ہیں جو ایمان لائے اور ان ہی کے دل اللہ کی یاد سے چین اور سکون پاتے ہیں۔ یاد رکھو اللہ کی یاد ہی سے دل مطمئن ہوتے ہیں۔

اس کتاب کا اعجاز دیکھو کہ اس نے بے شمار زندگیوں میں عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا، جو لوگ خدا سے ناواقف تھے وہ اسے جاننے لگے، جو اسے بھولے ہوئے تھے ان کے دلوں میں اس کی یاد بس گئی، جو اس سے بے خوف تھے وہ متقی اور اس سے ڈرنے والے بن گئے، جن کے اخلاق بگڑے ہوئے تھے ان کی اخلاقی حس جاگ اٹھی، جو چور تھے ان کے اندر جذبۂ امانت اُبھر آیا، جو زانی تھی ان کی پاکبازی اور عفت کی دھوم مچ گئی اور جو قاتل اور لٹیرے تھے وہ دوسروں کی جان و مال کے محافظ بن گئے۔ برائی سے بھلائی کی طرف اور بدی سے نیکی کی طرف یہ زبردست انقلاب، بتاؤ کیا معجزہ نہیں ہے؟ تم محسوسات کی دنیا میں انقلاب کو معجزہ قرار دیتے ہو اور اس اعجاز کو سمجھتے نہیں ہو جو قرآن نے اخلاق اور روحانیت کی دنیا میں پیدا کیا ہے۔ لکڑی کا سانپ کی شکل اختیار کرنا، کوئی شک نہیں کہ معجزہ ہی ہے لیکن کیا سانپ جیسے انسانوں کے اندر فرشتوں کے اوصاف پیدا کر دینا معجزہ نہیں ہے؟ خشک زمین سے پانی کا چشمہ ابل پڑے تو بلا شبہہ یہ معجزہ ہے لیکن اگر گمراہ انسانوں کے دلوں میں ہدایت کا چراغ جل اٹھے تو کیا یہ معجزہ نہیں ہے؟ مردے کو زندہ کرنا بے شک ایک زبردست معجزہ ہے لیکن مُردہ دلوں کو حیاتِ تازہ عطا کرنا کیا کوئی معجزہ نہیں ہے؟ قرآن نے یہی زبردست معجزہ ظاہر کیا تھا اور آج بھی اس کے وسیع اثرات ہر طرف دیکھے جا سکتے ہیں۔

دوسری چیز جو میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ رسالت کی تائید میں پیش کروں گا وہ آپ کی تعلیمات ہیں۔ آپ کی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا اس کائنات کا خالق، مالک اور حاکم ہے۔ وہی معبود ہے، زندگی کے ہر معاملے میں صرف اسی کی بندگی کرنی چاہیے۔ اس کے سوا کسی دوسرے کی بندگی انسان کے لیے جائز نہیں ہے۔ وہ تمام اعلیٰ صفات سے متصف ہے، اس کی طرف کوئی بری صفت منسوب نہیں کی جاسکتی۔ وہ اچھے اخلاق کو پسند کرتا ہے اور برے اخلاق اسے ناپسند ہیں۔ یہ دنیا ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے بلکہ اسے ایک دن فنا ہونا ہے۔ اس دن خدا نیک بندوں کو اپنی خاص نعمتوں سے نوازے گا اور جو بدکردار ہیں انہیں سخت سے سخت عذاب دے گا۔

یہ تعلیمات حقیقت کے بالکل عین مطابق ہیں۔ ان سے کائنات کے آغاز و انجام کی بہترین توجیہ ہوتی ہے اور خدا کا صحیح ترین تصور ملتا ہے۔ ان سے انسانی زندگی کے لیے ایسا مکمل نقشہ تیار ہوتا ہے کہ اس میں کہیں سے کوئی خلا یا نقص نظر نہیں آتا۔ یہ دلیل ہے اس بات کی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا سرچشمہ ان کا اپنا ذہن نہیں ہے بلکہ خدا کی ذات ہے۔ کیونکہ کسی بھی انسان کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ خدا، کائنات اور انسان کے بارے میں اتنا متوازن نظریہ پیش کر دے اور اس کے اندر اتنی ہم آہنگی اور توازن پایا جائے۔ أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا۔ النساء: ۸۲ (کیا یہ قرآن پر غور نہیں کرتے کہ ان پر اس کی حقانیت واضح ہوتی۔ اگر یہ خدا کے سوا کسی دوسرے کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بڑا اختلاف اور تضاد پاتے۔)

محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تعلیمات پیش کی ہیں ٹھیک وہی تعلیمات وہ تمام انبیاء پیش کرتے رہے ہیں جو آپ سے پہلے گزر چکے ہیں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ گزشتہ انبیاء کی تعلیمات اب اپنی صحیح شکل میں محفوظ نہیں ہیں بلکہ انسانوں نے اپنی خواہش سے انہیں بہت کچھ بدل دیا ہے حتیٰ کہ بہت سے انبیاء کے متعلق یہ پتہ چلانا بھی مشکل ہو رہا ہے کہ ان کی اصل تعلیمات کس زبان میں تھیں لیکن اس کے باوجود ہم ان بنیادی باتوں کو جانتے ہیں جن پر آسمانی کتابیں متفق رہی ہیں۔ قرآن ان سب کی تصدیق کرتا ہے۔ اس لیے اگر آپ اس واقعہ کو مانتے ہیں کہ ہر دور میں خدائے تعالیٰ انسانوں کی ہدایت کے لیے اپنے پیغمبر بھیجتا رہا ہے تو آپ کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے رسول ہیں، کیونکہ ایک ہی بات جسے دس اشخاص بیان کر رہے ہیں ان میں سے نو کی تصدیق کرنا اور دسویں

سے بھی آپ کے دعویٰ رسالت کی تائید ہوتی ہے۔ ان میں سے کوئی بھی کتاب اس حیثیت سے ہمارے سامنے نہیں آتی کہ وہ خدا کی آخری کتاب ہے بلکہ وہ صریح طور پر ایک آخری نبی کے آنے کی خبر دیتی ہے یہ آخری نبی ہم پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔ ہمارا یہ یقین محض اس لیے نہیں ہے کہ آپ نے آخری نبی ہونے کا دعویٰ کیا تھا بلکہ اس لیے ہے کہ آخری نبی کے جو اوصاف اور خصوصیات ان کتابوں میں بیان کی گئی ہیں وہ تنہا آپ ہی کے اندر پائی جاتی ہیں۔

توریت اور انجیل آسمانی کتابیں ہیں۔ یہ کتابیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے صدیوں پہلے نازل ہوئی تھیں۔ ان کتابوں میں آپ کی آمد کی کھلی ہوئی بشارتیں موجود تھیں اور آج بھی یہ تحریف کے باوجود موجود ہیں۔ اس لیے ان کتابوں کے ماننے والوں کا فرض ہے کہ وہ آپ کے دعویٰ رسالت کو فوراً قبول کرلیں۔

اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ	(خدا کی رحمت اہل کتاب کے ان لوگوں
النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَکْتُوْبًا	کے لیے ہے) جو اس بے پڑھے لکھے نبی کی پیروی
عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ۔	کرتے ہیں جس کا ذکر وہ اپنے ہاں توریت اور
(الاعراف: ۱۵۷)	انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ ان کتابوں کے ماننے والے آپ کو بحیثیت رسول کے "اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح کوئی باپ اپنی اولاد کو پہچانتا ہے"۔ (البقرہ: ۱۴۶) اس کے باوجود آپ کی رسالت کا انکار حقیقت میں ان کتابوں کا انکار ہے جن میں یہ بشارتیں درج ہیں اور جن کے آسمانی کتاب ہونے کا وہ اپنی زبان سے اقرار کرچکے ہیں۔ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ کَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ (اس سے بڑا ظالم اور کون ہوگا جو اس گواہی کو چھپا دے جو اس کے پاس خدا کی جانب سے ہے۔)

جن لوگوں کے پاس آسمانی کتابیں ہیں ان کا آپ کی رسالت کے بارے میں یہ یقین اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ خود ساختہ نبی نہیں ہیں بلکہ اس سلسلۂ رسالت کی آخری کڑی ہیں جس سے حضرت موسیٰؑ و عیسیٰؑ تعلق رکھتے ہیں اور جو حضرت آدمؑ کی پیدائش کے دن سے آپ کی بعثت تک قائم رہا ہے۔ وَاِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ ۞ اَوَلَمْ یَکُنْ لَّهُمْ اٰیَةً اَنْ یَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ۞ (الشعراء ۱۹۶-۱۹۷)

(یقیناً یہ قرآن پچھلے صحیفوں میں ہے۔ کیا ان کے لیے یہ نشانی نہیں ہے کہ اسے بنی اسرائیل کے علماء جانتے ہیں؟)

قرآن کے ان دعووں کے ثبوت میں علماء نے پچھلی ان دونوں آسمانی کتابوں سے بہت سی تصریحات

ال کر دکھائی ہیں یہاں ان سب کے دُہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں صرف دو تین تصریحات نقل کروں گا۔

"خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا۔ فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشیں شریعت ان کے لیے تھی۔"

یہ توریت (کتاب استثنا باب ۳۳۔ آیت ۲) کی عبارت ہے۔ اس میں حضرت موسیٰؑ و عیسیٰؑ کی نبوت کے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی بھی صراحت ہے۔ حضرت موسیٰؑ کو نبوت کوہ سینا پر ملی تھی اور شعیر سے طلوع ہوا۔ اس سے مراد حضرت عیسیٰؑ کی نبوت ہے۔ اس کے بعد کی پوری عبارت کا انطباق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر ہوتا ہے۔ فاران مکہ کی پہاڑیوں کا نام ہے۔ جہاں سے آپؐ کی نبوت کا آغاز ہوا تھا اور نبوت کے بائیس سال بعد آپ ہی دس ہزار فرشتہ صفت انسانوں کے ساتھ مکے میں فاتحانہ داخل ہوئے تھے اور آپ ہی کے ہاتھ میں آتشیں شریعت تھی جس نے بہت ہی مختصر عرصے میں باطل کو جلا کر خاکستر کر دیا۔

حضرت موسیٰؑ فرماتے ہیں:۔

"خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں سو ٹھیک کہتے ہیں۔ میں ان کے لیے ان ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں ان سے کہوں گا وہی وہ ان سے کہے گا اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے تو میں ان کا حساب اس سے لوں گا۔" (تثنیہ باب ۱۸)

حضرت ابراہیمؑ کے دو بیٹے تھے۔ حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت اسحاقؑ۔ حضرت اسحٰقؑ کے بیٹے حضرت یعقوبؑ سے جو نسل چلی اس کا نام بنی اسرائیل پڑ گیا۔ اوپر کی عبارت میں کہا گیا ہے کہ آنے والا نبی ان کے بھائیوں میں سے ہوگا۔ اس سے قطعی طور پر بنی اسمٰعیل ہی مراد ہو سکتے ہیں اور بنی اسمٰعیل میں سوائے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی دوسرا نبی نہیں پیدا ہوا۔

اس عبارت میں جو بات کہی گئی ہے ٹھیک یہی بات قرآن مجید میں کہی گئی ہے۔

اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا	ہم نے تمہاری طرف ایک رسول بھیجا ہے
شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ	جو تمہارے بارے میں گواہی دینے والا ہے۔
اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ۔	بالکل اسی طرح جس طرح کہ ہم نے فرعون کے پاس
(المزمل: ۱۵)	اپنا رسول بھیجا تھا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیشین گوئی فرماتے ہیں:

"مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہے۔ مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے لیکن جب وہ یعنی سچائی کی روح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا۔ اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا۔" (انجیل یوحنا۔ باب ۱۶۔ آیت ۱۲، ۱۳)

اب آپ دیکھیے کہ قرآن نے حضرت عیسیٰ ؑ کی جو پیش گوئی نقل کی ہے وہ اس سے کتنی مطابقت رکھتی ہے۔

وَاِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ	اور اے پیغمبر اس وقت کا ذکر کرو جب
يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ	مریم کے بیٹے نے کہا "اے بنی اسرائیل میں
اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا	تمہاری طرف خدا کا رسول ہوں۔ مجھ سے پہلے
بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ	نازل شدہ کتاب تورات کی تصدیق کرتا ہوں اور
مُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي	ایک رسول کی خوش خبری دیتا ہوں جو میرے بعد
اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ فَلَمَّا جَآءَهُمْ	آئے گا اور اس کا نام احمد ہوگا۔ لیکن جب وہ
بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ	رسول دلیلوں کے ساتھ ان کے پاس آیا تو کہنے
مُّبِيْنٌ ○ (الصف: ۶)	لگے کہ یہ کھلا ہوا جادو ہے۔

یہ ہیں آپ کے رسول ہونے کے حق میں توریت اور انجیل کی واضح شہادتیں جنہیں دنیا کی دو بڑی قومیں آج بھی آسمانی کتابیں مانتی ہیں۔ جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ رسالت کا انکار کرے اسے معلوم ہونا چاہیے کہ آپ کی تائید میں حضرت موسیٰ و عیسیٰ جیسی تاریخ کی عظیم شخصیتیں کھڑی ہیں۔

(باقی)

طریقۂ تعلیم

قرآن حکیم کی روشنی میں

(جناب افضل حسین ایم اے)

یہ مضمون میری کتاب "فن تعلیم و تربیت" کا ایک حصہ ہے۔ "زندگی" میں اس مضمون کی اشاعت کا مقصد یہ ہے کہ مفید اور صحیح طریقۂ تعلیم و تعلم کے لیے جو باتیں میں نے قرآن کی آیتوں سے مستنبط کی ہیں ان کے بارے میں اہل علم سے مشورے حاصل کروں، اگر استنباط و استدلال میں کہیں چوک ہو گئی ہو تو اس کی نشان دہی کی جائے۔ میں شکر گزار رہوں گا۔

افضل حسین

فن تعلیم و تربیت پر اسوۂ حسنہ کی روشنی میں اختصار سے ہم پہلے ہی غور کر چکے ہیں۔ اب ہمیں سرسری طور پر یہ دیکھ لینا چاہیے کہ قرآن حکیم سے طریقۂ تعلیم پر کیا روشنی پڑتی ہے۔

۱۔ طلبہ کی طلب اور آمادگی قرآن حکیم کھولتے ہی جو بات نمایاں طور پر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ تعلیم و تلقین سے استفادے کے لیے طالب میں طلب صادق ضروری ہے۔ جب تک وہ خود خواہش مند نہ ہو اور اس کا دل و دماغ پورے طور پر اور یکسوئی کے ساتھ آمادہ نہ ہو تعلیم و تلقین ہرگز نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی خواہ جو کچھ بتایا اور سکھایا جا رہا ہو وہ خود اس کے حق میں کتنا ہی مفید کیوں نہ ہو اور خواہ اس کا سکھانے اور بتانے والا کتنی ہی بڑی اور مؤثر شخصیت کا مالک ہی کیوں نہ ہو۔ سورۂ فاتحہ میں طالب کی طرف سے

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ۔ (۱-۵) ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔

کی پُرخلوص دعا کا مطالبہ اس کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔ معلم کو چاہیے کہ سب سے پہلے طلبہ میں علم کی پیاس اور طلبِ صادق پیدا کرے۔ ان کو علم حاصل کرنے پر آمادہ کرے اس کے بغیر اس کی ساری کوششیں

غیر مؤثر ہوں گی۔ معلم کو چاہیے کہ وہ پوری دل سوزی سے طلبہ کو عالم و جاہل کا فرق، اہلِ علم پر اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل اور علم کی ضرورت و اہمیت، دل کش انداز میں دلائل کے ساتھ اور واقعات کا حوالہ دے کر برابر سمجھاتا رہے تاکہ علم کی طرف ان کی توجہ ہو نیز حصولِ علم کے لیے انہیں مختلف طریقوں سے آمادہ کرتا رہے۔

خود قرآن حکیم نے مندرجہ ذیل آیات کے ذریعے علم کے حصول کی ترغیب دی ہے۔

- هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۝ (۲۹-۹) — کہیں عالم و جاہل برابر ہوتے ہیں۔
- مَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا (۲-۲۶۹) — جسے حکمت عطا کی گئی اسے دراصل خیرِ کثیر (بہت بڑی دولت) عطا کی گئی۔
- يَرْفَعِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ (۵۸-۱۱) — اللہ تم میں سے ایمان والوں کے اور ان لوگوں کے جن کو علم عطا ہوا ہے درجے بلند کرے گا۔
- إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ (۳۵-۲۸) — اللہ سے وہی ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔

۲۔ معلم کے علم پر بھروسہ

استفادے کے لیے دوسری ناگزیر شرط معلم کے علم پر غیر معمولی اعتماد ہے۔ معلم کا کام ہی یہ ہے کہ طلبہ کو وہ چیزیں بتائے جو وہ نہیں جانتے۔ اب اگر معلم کی نااہلی یا اپنی کسی کوتاہی کے سبب طلبہ کا اعتماد متزلزل ہو جائے اور انہیں یقین ہی نہ ہو کہ معلم جو کچھ بتا رہا ہے وہ ٹھیک ہے اور اسی میں ان کی فلاح ہے تو وہ اس کی تعلیم و تلقین سے کیوں کر مستفید ہو سکتے ہیں۔

فَسْئَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝ (۱۶-۴۳) — اہلِ ذکر سے پوچھ لو اگر تم نہیں جانتے۔

(اس آیت میں اہلِ ذکر سے مراد اہلِ علم ہیں جن میں علمائے اہلِ کتاب بھی داخل ہیں اور دوسرے اہلِ علم بھی جو آسمانی کتابوں اور انبیاء کے حالات سے واقف ہوں)

اگر نہ جاننے والے جاننے والوں کے علم پر اعتماد نہ کریں تو پھر دنیا میں تعلیم و تعلم کا قصہ ہی ختم ہو

اس آیت سے یہ شرط مستنبط ہوتی ہے کہ شاگرد کو اپنے معلّم کے علم پر اعتماد کرنا چاہیے۔ دوسری بات یہ بھی نکلتی ہے کہ معلّم محض نام کا معلّم نہ ہو بلکہ واقعی طور پر ذی علم ہو ورنہ وہ شاگرد کے اعتماد کو قائم نہ رکھ سکے گا۔

۴۔ اللہ ہی کو علم کا منبع و مصدر سمجھنا کسی فرد کا علم خود اس کے یا سماج اور انسانیت کے حق میں اسی وقت نفع بخش ثابت ہو سکتا ہے جب اللہ کے نام سے شروع کیا جائے اس کی ذات و صفات کو مستحضر رکھ کر اور اس کی پناہ میں آکر حاصل کیا جائے' اسی کو علم کا سرچشمہ مانا جائے۔ اور یہ یقین کیا جائے کہ علم صرف اسی کے پاس ہے اور علم کا جو حصہ بھی کسی کو ملتا ہے' وہ اسی کا فیض ہوتا ہے۔ اسی صورت میں وہ فرد علمی پندار میں مبتلا ہونے' علم کو غلط راستوں سے حاصل اور غلط مقاصد میں استعمال کرنے اور علم کی راہ میں شیطان کے حائل ہونے سے محفوظ رہ سکے گا۔ اور علم میں اضافے کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہے گا۔ ان حقائق پر مندرجہ ذیل آیات دلالت کرتی ہیں۔

اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ ۝ (۴۹-۱۳)	بے شک خدا سب کچھ جاننے والا ہے
وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ ۝ (۲۴-۱۸)	اور اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔
وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ (۲۴-۳۰)	اور اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔
وَسِعَ رَبِّیْ کُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ۝ (۶-۸۰)	میرے رب کا علم ہر چیز پر چھایا ہوا ہے۔
اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝ (۹۶-۱)	اپنے رب کا نام لے کر پڑھ جس نے (سب کو) پیدا کیا۔
فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ (۱۶-۹۸)	پھر جب تم قرآن پڑھنے لگو تو شیطان مردود سے پناہ مانگ لیا کرو۔
وَاِمَّا یَنْزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ (۷:۲۰۰'۴۱'۳۶)	اگر کبھی شیطان تمہیں اکسائے تو اللہ کی پناہ مانگو۔

معلّم کو چاہیے کہ طلبہ کے ذہن میں یہ بات بخوبی بٹھا دے کہ علم کا منبع و سرچشمہ ذاتِ باری تعالیٰ ہے اس کا علم ہر چیز پر محیط ہے۔ علم کا جو حصہ بھی کسی کو ملتا ہے اللہ تعالیٰ ہی کا فیض ہوتا ہے۔

پڑھنا لکھنا شروع کرتے وقت معلم کو چاہیے کہ خود بھی اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ پڑھ لیا کرے اور بالالتزام طلبہ سے بھی کہلوا لیا کرے۔ علم میں اضافے کے لیے برابر خود بھی یہ دعا مانگتا رہے۔

رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا (۲۰-۱۱۴) اے میرے رب میرے علم میں اضافہ کر۔

اور طلبہ کو بھی اس کی تلقین کرتا رہے۔ اس صورت میں خود وہ اور اس کے طلبہ علمی پندار میں مبتلا ہونے، علم کو ناجائز طریقے سے حاصل کرنے اور ناجائز مقاصد میں استعمال کرنے نیز علم کی راہ میں شیطان کی دراندازی سے محفوظ رہ سکیں گے۔

۴۔ کچھ بتانے سے پہلے بخوبی متوجہ کرلینا

بات اسی وقت دل لگا کر سنی جاتی اور اس پر سنجیدگی سے دل سے غور کیا جاتا ہے۔ جب ذہن اس کی طرف بخوبی متوجہ اور اس کے لیے متجسس ہو۔ قرآن حکیم تجسس کو بیدار کرنے اور فرد کو ہمہ تن متوجہ کرنے کے لیے مختلف طریقے اختیار کرتا ہے۔ چند یہ ہیں:۔

- حروف مقطعات سے کلام شروع کرتا ہے۔ الٓمٓ۔ الٓرٰ۔ کٓھٰیٰعٓصٓ۔ طٰہٰ۔ حٰمٓ وغیرہ۔
- کوئی سوال کرتا ہے یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ھَلْ اَدُلُّکُمْ عَلٰی تِجَارَۃٍ تُنْجِیْکُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝ (۶۱-۱۰) اے ایمان والو! کیا میں تم کو ایسی تجارت بتا دوں جو تمہیں دردناک عذاب سے نجات دے دے۔

ھَلْ نُنَبِّئُکُمْ بِالْاَخْسَرِیْنَ اَعْمَالًا ط (۱۸-۱۰۳) کیا میں تمہیں ان کی خبر دوں جو اعمال کے لحاظ سے بڑے گھاٹے میں ہیں۔

- کوئی منظر پیش کرتا ہے۔

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَھَا ۝ وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَھَا ۝ وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَھَا ۝ (۹۹-۱ تا ۳)

جب زمین بھونچال سے ہلا دی جائے گی اور زمین اپنے اندر کا بوجھ نکال پھینکے گی اور انسان حیرت سے کہے گا اس کو کیا ہوگیا ہے

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ۝ وَاِذَا الْکَوَاکِبُ انْتَثَرَتْ ۝ وَاِذَا الْبِحَارُ

جب آسمان پھٹ جائے گا اور جب تارے جھڑ پڑیں گے اور جب دریا بہہ کر ایک دوسرے

فُجِّرَتْ ○ وَإِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ ○ میں مل جائیں گے اور جب قبریں اکھیڑ دی جائیں گی۔ ● (۸۲ تا ۴)

أُولٰئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ○ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ .... لِأَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ○ (۵۶-تا

اور سورۂ رحمٰن میں بڑی وضاحت سے منظر کشی کی گئی ہے۔

● دوسروں کے سوالات یا اعتراضات کو سامنے رکھ کر اُن کے جوابات کی طرف ذہنوں کو متوجہ کرتا ہے۔

سَأَلَ سَائِلٌ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ (۷۰-۱) ایک طلب کرنے والے نے عذاب طلب کیا جو نازل ہو کر رہے گا۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ .... (وہ تم سے پوچھتے ہیں) سے پندرہ پندرہ مقامات پر خطاب شروع ہوتا ہے۔

وَقَالُوْا ءَإِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَإِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ○ (۱۷-۹۸) اور کہا "کیا جب ہم ہڈیاں اور خاک ہو کر رہ جائیں گے تو نئے سرے سے ہم کو پیدا کر کے اٹھا کھڑا کیا جائے گا۔

قَالُوْا أَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا (۱۷-۹۴) وہ کہنے لگے "کیا اللہ نے بشر کو پیغمبر بنا کر بھیج دیا؟

● اچانک کسی واقعے کی خبر دے کر یا پیشین گوئی کر کے لوگوں کو بات سننے پر آمادہ کرتا ہے۔

الٓمّٓ ○ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ○ فِيْ أَدْنَى الْأَرْضِ وَهُمْ مِّنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ○ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ○ (۳۰-۱تا۴) ا-ل-م- اہلِ روم مغلوب ہو گئے نزدیک کے ملک میں اور وہ مغلوب ہونے کے بعد عنقریب غالب آجائیں گے چند ہی سال میں۔

ان آیات میں رومیوں کے غلبے کی اس وقت پیشین گوئی کی گئی جب ایرانی انہیں مغلوب کر چکے تھے اور ان کا غلبہ بظاہر محال نظر آ رہا تھا۔

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا (۴۸-۱) ہم نے تم کو فتح دی۔ فتح بھی صریح و صاف

اس آیت میں فتح مکہ کی اس وقت پیشین گوئی کی گئی تھی۔ جب حدیبیہ کے مقام پر دب کر مسلمان

نے کفار سے صلح کی تھی۔

• بہت زیادہ چوکنا کرنے یا چونکا دینے کے لیے خطاب کرنا ہوتا ہے تو بسا اوقات مندرجہ بالا طریقوں میں سے بیک وقت کئی ایک کو استعمال کرتا ہے۔ مثلاً:۔

اَلْقَارِعَةُ ۝ مَا الْقَارِعَةُ ۝	کھڑکھڑانے والی، کھڑکھڑانے والی کیا ہے
وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ۝ يَوْمَ	اور تم کیا جانو کہ کھڑکھڑانے والی کیا ہے۔ وہ
يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ	قیامت ہے جس دن لوگ ایسے ہوں گے جیسے
الْمَبْثُوْثِ ۝ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ	بکھرے ہوئے پتنگے، اور پہاڑ ایسے ہو جائیں گے
الْمَنْفُوْشِ ۝ (۱۰۱- ۱تا۵)	جیسے دھنکی ہوئی رنگ برنگ کی اُون۔

ان آیات میں خبر سوال، منظر سب ایک ساتھ پیش کر کے ذہنوں کو متوجہ کیا گیا ہے۔
معلم کو بھی موقع محل کی مناسبت سے مختلف طریقوں کو اختیار کر کے درس سے پہلے طلبہ کو ہمہ تن متوجہ کر لینا چاہیے پھر انہیں کوئی بات بتانی چاہیے۔

۵۔ پیش کش طلبِ صادق پیدا کر دینے اور اپنی طرف ہمہ تن متوجہ کر لینے کے بعد قرآن حکیم اپنی بات پیش کرتا ہے۔ پیش کش کے لیے وہ خطابت کا طریقہ اختیار کرتا ہے اور بلاشبہ یہ بھی یہی سب سے زیادہ مؤثر طریقہ ہے۔ پورا کلام پاک مختلف چھوٹے بڑے خطبوں کی شکل میں نازل ہوتا رہا اور حضورؐ خطبات ہی کی شکل میں انہیں دوسروں کے سامنے پیش فرماتے رہے۔ قرآن حکیم کی خطابت میں زورِ بیان کی اتنی شدت اور اندازِ کلام اتنا شاہانہ ہے کہ سننے والا مسحور ہو جاتا ہے۔ کوئی بدبخت ہی ہو گا جس کے کانوں تک یہ آواز پہنچے اور وہ متاثر نہ ہو۔ حتیٰ کہ جیسا کٹر دشمن اسلام اس کی چند آیات سنتے ہی ہتھیار ڈال دیتا اور چوکڑی بھول جاتا ہے۔ اس کا ایک ٹکڑا حضرت عمرؓ جیسے زبردست مخالف کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیتا ہے۔ کہاں تک گنایا جائے۔ قرآن حکیم اپنی پاکیزہ ہدایات فصیح و بلیغ زبان، شاہانہ طرزِ تخاطب، غیر معمولی اثر آفرینی، مؤثر لہجہ و آہنگ اور زورِ بیان کے ذریعے بہرحال ہر ایک سے اپنا لوہا منوا ہی لیتا ہے۔ قرآن حکیم تو خیر کلامِ الٰہی ہے۔ اس کی تاثیر کا کیا کہنا۔ جو لوگ اپنے طرزِ تخاطب یا اندازِ بیان میں اس کی ہلکی سی جھلک پیدا کر لیتے ہیں وہ بھی کتنوں کی زندگیوں میں انقلاب برپا کر دیتے ہیں۔ مولانا روم اپنی مثنوی، علامہ اقبال اپنی چند نظموں، اخوان الصفا اپنے بعض رسالوں، مولانا آزاد

ور مولانا مودودی وغیرہ اپنے بعض خطبات ومقالات میں قرآن حکیم کی مدد سے اس کے زور بیان کی خفیف سی جھلک پیدا کرسکے ہیں۔ اس کا حال یہ ہے کہ پڑھنے والا بہر حال جھوم جاتا اور ایک عجیب و غریب عالم میں پہنچ جاتا ہے۔

استاد کو بھی اپنے بیان میں زور پیدا کرنا چاہیے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب اس کو اپنے علم پر یقین واعتماد ہو۔ اس کے پاس پیش کرنے کے لیے واقعی کوئی پیغام ہو۔ اور بات دل کی گہرائیوں سے نکلے۔

۶۔ **توضیح وتشریح** قرآن حکیم صرف زور بیان پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اپنی بات بخوبی واضح اور ذہن نشین کرنے کے لیے:۔

- آفاق وانفس سے شواہد پیش کرتا ہے۔
- گرد وپیش کے حوالے دیتا ہے۔
- روزمرہ کے تجربات ومشاہدات کو بطور دلیل سامنے لاتا ہے۔
- طرح طرح کی مثالیں دیتا اور تمثیلات سے کام لیتا ہے۔
- معروف تاریخی واقعات اور اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات سے ثبوت بہم پہنچاتا ہے
- متعدد واقعات بیان کر کے مطلوبہ نتائج اخذ کراتا ہے۔
- انبیاء اور اقوام وملل کے قصے کہانیوں سے مدد لیتا ہے۔
- ایک ہی حقیقت کو طرح طرح سے بیان کرتا ہے تاکہ ہر صلاحیت و استعداد کے لوگ بآسانی سمجھ سکیں۔
- الفاظ میں اتنی واضح منظر کشی کرتا ہے گویا سر کی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔
- لوگوں کی الجھنوں اور شکوک وشبہات کو دلائل سے رفع کرتا ہے۔

معلم کو بھی توضیح وتشریح کے ضمن میں حسب ضرورت وموقع ان تدابیر سے کام لینے کی کوشش کرنی چاہیے۔

۷۔ **سوالات** • توجہ کو مرکوز رکھنے اور غور وفکر کی دعوت دینے کے لیے بیچ بیچ میں سوالات کرتا جاتا ہے۔

الم تر کیف فعل ربک بعاد (۸۹-۶) — کیا تم نے نہیں کہ تمہارے رب نے عاد کے ساتھ کیا کیا

افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت ۝ والی السماء کیف رفعت ۝ (۸۸-۱۷،۱۸)

کیا یہ لوگ اونٹوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ کیسے عجیب پیدا کیے گئے ہیں اور آسمان کی طرف کہ کیسا بلند کیا گیا ہے!

وما تلک بیمینک یٰموسیٰ (۲۰-۱۷) — اور اے موسیٰ! یہ تمہارے داہنے ہاتھ میں کیا ہے؟

• سوالات کے جوابات سنتا اور اگر واضح ہوتے ہیں تو ان کی طرف سے خود ہی جواب دے کر آگے بڑھ جاتا ہے۔

قال ہی عصای اتوکؤا علیہا واہش بہا علیٰ غنمی ولی فیہا مارب اخریٰ (۲۰-۱۸)

اس نے جواب دیا یہ میری لاٹھی ہے اس پر میں سہارا لیتا ہوں اس سے میں اپنی بکریوں کے لیے پتے جھاڑتا ہوں اور اس میں میرے لیے اور بھی کئی فائدے ہیں۔

ولئن سالتہم من خلق السمٰوٰت والارض لیقولن اللہ (۳۱-۲۵، ۳۹-۳۸)

اور اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے؟ تو وہ بول اٹھیں گے کہ خدا نے۔

معلم کو بھی چاہیے کہ دوران سبق طلبہ سے سوالات کرے اور ان کو بھی سوالات کرنے کا موقع دے طلبہ کی طرف سے جو سوالات، اعتراضات یا شکوک و شبہات ابھریں ان کا تشفی بخش جواب دے طلبہ کے جوابات اطمینان سے سنے اور انہیں دل کی بات کہنے کا موقع دے تاکہ کھل کر ان کا ذہن سامنے آسکے۔

قرآن حکیم تھوڑی دیر کے بعد چند الفاظ میں خلاصہ بیان پیش کر دیا کرتا ہے۔

۸۔ خلاصہ ابتدائی خطبات، سورتوں، رکوعوں میں جو باتیں خوب پھیلا کر وضاحت سے بیان کی ہیں آخری سورتوں میں وہی باتیں نہایت اختصار سے چند الفاظ میں بیان کر دی ہیں یا صرف اشاروں کنایوں میں پوری بات کہہ دی ہے تاکہ بآسانی یاد ہو جائے اور ہمیشہ یاد رہے۔

پارہ عم کی ذرا آخری سورتوں پر غور کیجیے۔ کوزوں میں سمندر بند ہیں مثلاً:۔

والعصر ۝ ان الانسان لفی — عصر کی قسم (زمانہ گواہ ہے) بے شک

تعلیم

خُسْرٍ ۙ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝

انسان خسارے میں ہے مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور آپس میں حق (بات) کی تلقین اور صبر کی تاکید کرتے رہے۔

اس مختصر سورہ میں تو قرآن حکیم نے اپنا پورا خلاصہ سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔
معلم کو بھی چاہیے کہ سبق کا ایک ایک جز پیش کر کے اس کا خلاصہ بھی بیان کرتا جائے اور آخر
اپنے پورے بیان کا نہایت اختصار سے خلاصہ پیش کر دیا کرے۔ اس طرح طلبہ کو پوری بات یاد
کرنے اور یاد رکھنے میں سہولت ہوتی ہے۔

۹۔ اعادہ و تکرار — قرآن حکیم نے اعادہ و تکرار کا بڑا التزام کیا ہے۔ ایک ہی بات کو بار بار مختلف
انداز سے سامنے لاتا ہے تاکہ بخوبی ذہن نشین ہو جائے۔ شاید ہی کوئی ایسا
صفحہ ہو جس پر اس نے اپنی بنیادی دعوت یا اس کے کسی جز کا اعادہ نہ کیا ہو لیکن تکرار میں بھی انداز ایسا
اختیار کیا ہے کہ وہی بات ہر بار نیا لطف دے جاتی ہے۔
معلم کو بھی اعادے اور تکرار کی طرف پوری توجہ دینی چاہیے لیکن انداز ایسا اختیار کرنا چاہیے
کہ بے زاری اور اکتاہٹ نہ پیدا ہونے پائے۔

۱۰۔ تفویض — اپنی بات کو وضاحت سے سمجھا دینے، دلائل سے مطمئن کر دینے
اور زور بیان سے منوا لینے ہی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ کچھ سوالات دے کر
اپنے طور پر غور و فکر کر کے مطمئن ہونے کی دعوت دیتا ہے۔ نیز اطمینان قلب حاصل کرنے کے لیے تجربے
و مشاہدے کے لیے کام تفویض کرتا ہے۔ نیز جاننے والوں سے بھی پوچھ کر اطمینان کر لینے کی طرف توجہ
دلاتا ہے۔

سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ .... (ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھو) قرآن حکیم میں چھ مقامات پر کہہ کر اور
اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ ...... اَوَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ (کیا انھوں نے زمین کی سیر نہیں کی) سات
مقامات پر کہہ کر خود مشاہدہ کر کے اطمینان حاصل کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔
اسی طرح سَلْ، فَسْئَلْ، وَسْئَلْ، فَسْئَلُوْا (پوچھو) نو مقامات پر کہہ کر جاننے والوں سے
پوچھ کر اطمینان کر لینے کی طرف قرآن حکیم نے توجہ دلائی ہے۔

معلم کو بھی چاہیے کہ جو کچھ طلبہ کو بتائے اس سے متعلق کوئی کام تفویض کر کے تجربہ و مشاہدے کا مزید موقع دے تاکہ انہیں پورا اطمینان بھی ہو جائے اور وہ اپنے علم کو عمل میں لانا اور برتنا سیکھیں۔
یہ ہے قرآن حکیم کے حکیمانہ طریقۂ تعلیم کا سرسری خاکہ۔ اس طرح اس نے اپنی تعلیمات کو لوگوں کے لیے بے حد آسان بنا دیا ہے۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ (۵۴-۱۷، ۲۲، ۳۲، ۴۰)

اور ہم نے قرآن کو سمجھنے کے لیے آسان کر دیا ہے۔ تو کوئی ہے کہ سوچے سمجھے۔

حاملِ قرآن کی چند صفات

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا:۔

"حاملِ قرآن کے لیے یہی زیبا ہے کہ اپنی شب بیداری کی بدولت پہچانا جائے جب کہ دوسرے لوگ مزے سے سو رہے ہوں ــــ اپنے دن کے پاکیزہ مشاغل سے پہچانا جائے جب کہ لوگ جائز و ناجائز کی تفریق کا خیال نہ رکھ رہے ہوں۔ اس کی علامت گریہ و زاری ہونا چاہیے جب کہ دوسرے قہقہے لگا رہے ہوں۔ خاموشی ہونی چاہیے جب دوسرے لاطائل بحثوں میں غور و خوض کر رہے ہوں۔ خشوع ہونی چاہیے جب دوسرے کبر و نخوت کے نشے سے سرشار ہوں۔ نیز حاملِ قرآن کے لیے زیبا یہ ہے کہ متواضع اور نرم خو ہو۔ سخت دل، جھگڑالو اور شور مچانے والا نہ ہو۔ اس کو یہ بات بھی زیب نہیں دیتی کہ لوہے کی طرح سخت اور غیر تاثر پذیر ہو"

قرآن کی حقیقی تلاوت یہ ہے کہ تلاوت کرنے والا اس پر عمل کرے۔ ایک حدیث میں فرمایا۔

"قرآن پڑھنے کے معنی یہ ہیں کہ یہ برائیوں سے تمہیں روکتا ہے اور گناہوں سے باز رکھتا ہے لیکن اگر یہ برائیوں سے نہیں روکتا تو تمہارا اس کو پڑھنا درحقیقت کوئی پڑھنا نہیں ہے۔"

اس مفہوم کو ایک دوسری حدیث میں یوں بیان فرمایا ہے:۔

"وہ شخص قرآن پر ایمان نہیں رکھتا جو اس کے محارم کو حلال سمجھتا ہے۔"

(تعلیمات غزالی)

حرام عورتیں[1]

(مولانا محمد یوسف اصلاحی)

نسلِ انسانی کا بقا اور مرد و عورت کے فطری سکون کا انحصار ہی اس بات پر ہے کہ دونوں صنفوں میں باہم جنسی تعلق قائم ہو ——— قرآن اس تعلق کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے اسے ضروری قرار دیتا ہے، اور اس سے فرار کو ناپسند کرتا ہے، لیکن وہ اس تعلق کے قیام میں انسان کو مطلقاً آزاد نہیں چھوڑتا بلکہ کچھ پابندیاں لگاتا ہے اور کچھ حدود مقرر کرتا ہے۔ یہ حدود اور پابندیاں نسب اور رشتوں کے احترام و حفاظت، خاندانی تعلقات کی استواری اور پاکیزگی، باہمی اتحاد و تعاون اور صالح معاشرت کے لیے انتہائی ناگزیر ہیں۔ معاشرے کی صلاح و بقا کے لیے جس طرح دونوں صنفوں کا باہمی تعلق ضروری ہے اسی طرح حرمت کے ان حدود کی پابندی بھی ضروری ہے۔ قرآن جن رشتوں میں باہم نکاح کو حرام قرار دیتا ہے۔ اس حرمت کے تین وجوہ بیان کرتا ہے۔ نسب۔ رضاعت۔ مصاہرت۔

۱۔ حرمتِ نسب حقیقی ماں باپ کے تعلق سے جو رشتے قائم ہوتے ہیں یہ بنیادی طور پر سات ہیں۔ ماں، بیٹی، بہن، پھوپھی، خالہ، بھتیجی، بھانجی کے رشتے۔ ان رشتوں میں باہم نکاح حرام ہے اور اس حرمت کی وجہ حرمتِ نسب ہے۔

۲۔ حرمتِ رضاعت لڑکی یا لڑکا اگر کسی عورت کا دودھ پی لیں تو وہ عورت دودھ پینے والے کی رضاعی ماں اور اس کا شوہر رضاعی باپ قرار پاتا ہے، اور رضاعی ماں باپ سے اسی طرح نکاح حرام ہو جاتا ہے جس طرح حقیقی ماں باپ سے پھر اس رضاعت کے تعلق سے وہ تمام رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو حقیقی ماں باپ کے تعلق سے حرام ہوتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ یحرم من

---

[1] یعنی وہ عورتیں جن سے نکاح حرام ہے۔

الرضاع ما یحرم من النسب" رضاعت سے وہ تمام رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو نسب کے تعلق سے حرام ہوتے ہیں
۳۔ حرمت مصاہرت: نکاح کے تعلق سے بھی بعض رشتے حرام ہو جاتے ہیں۔ اس کو "حرمت مصاہرت" کہتے ہیں۔ مصاہرت کے سبب حرام ہونے والے رشتے دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جن کی حرمت دائمی ہے مثلاً بیوی کی ماں (خوشدامن) بیٹے کی بیوی (بہو) اور اس بیوی کی لڑکی جس سے خلوت ہو چکی ہو ـــــ ان رشتوں میں باہم نکاح ہمیشہ کے لیے حرام ہو جاتا ہے۔ دوسرے وہ رشتے ہیں جن کی حرمت دائمی نہیں ہے۔ مثلاً بیوی کی بہن، پھوپھی، خالہ، بھتیجی، بھانجی وغیرہ، بیوی کی موجودگی میں ان سے نکاح حرام ہے لیکن بیوی کے مرنے یا تعلق ختم ہونے کے بعد ان میں سے کسی سے بھی نکاح کیا جا سکتا ہے قرآن نے محرمات کے سلسلے میں جو اصولی احکام دیے ہیں ان کو سمجھنے اور قرآن کا منشا معلوم کرنے کے لیے حدیث میں دی ہوئی تفصیل و توضیح کا جاننا اور ماننا ناگزیر ہے۔

سوتیلی ماں

وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا (النساء ۲۲)	اور جن عورتوں سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہوں ان سے ہرگز نکاح نہ کرو، جو پہلے ہو چکا سو ہو چکا۔ درحقیقت یہ ایک بے حیائی کا کام ہے ناپسندیدہ بات ہے اور برا چلن ہے۔

اس سے اگلی آیت (۲۳) میں ان عورتوں کی فہرست بیان کی گئی ہے جن سے نکاح حرام ہے اور ان میں سر فہرست ماں کا ذکر ہے۔ ماں کا اطلاق سگی اور سوتیلی دونوں قسم کی ماؤں پر ہوتا ہے لیکن مذکورہ آیت (۲۲) میں سوتیلی ماں کی حرمت کا خصوصی ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ جاہلیت کے زمانے میں بعض بے حیا لوگ باپ دادا کی منکوحہ سے بھی نکاح کر لیتے تھے۔ اگرچہ اس دور میں سنجیدہ اور سمجھ دار لوگ اس نکاح کو برا سمجھتے تھے اور اس تعلق سے پیدا ہونے والی اولاد کو بری نظر سے دیکھتے تھے۔ قرآن حکیم نے اس بے حیائی اور بے غیرتی کے فعل کو حرام قرار دیا، سوتیلی ماں کو سگی ماں کی طرح محترم گردانا اور پوری اہمیت کے ساتھ اس حکم کو الگ بیان کیا۔

محرمات سے نکاح یا شہوانی تعلق اسلام کی نظر میں بدترین بے حیائی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسے مجرموں کو قتل اور ضبطی جائداد کی سزا دیا کرتے تھے، اور ابن ماجہ نے حضرت ابن عباسؓ سے جو روایت نقل فرمائی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے یہ قاعدہ کلیہ ارشاد فرمایا تھا: "جو شخص محرمات

میں سے کسی سے ملوث ہوا اس کو قتل کر دو۔

آباء کی منکوحہ سے مراد باپ کی منکوحہ تو ہے ہی لیکن آباء کے لفظ سے دادا پردادا اور نانا پرنانا سب مراد ہیں۔ ان کی منکوحہ بھی باپ کی منکوحہ کی طرح حرام ہے۔

ماں حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ — تم پر حرام کی گئیں تمہاری مائیں

ماں کے حکم میں دادی، نانی بھی داخل ہیں اور پھر دادی اور نانی کی ماں اور ماں کی ماں اوپر تک سب حرام ہیں۔

بیٹی وَبَنَاتُكُمْ — اور تمہاری بیٹیاں

بیٹی کے حکم میں پوتی، نواسی، ان کی بیٹیاں اور بیٹیوں کی بیٹیاں نیچے تک سب شامل ہیں۔

بہن وَأَخَوَاتُكُمْ — اور تمہاری بہنیں

بہنوں میں سگی بہن کے علاوہ ماں شریک بہن اور باپ شریک بہن بھی شامل ہے۔

پھوپھی وَعَمَّاتُكُمْ — اور تمہاری پھوپھیاں

پھوپھی کے حکم میں دادا کی بہن اور اوپر تک کی پشتوں کی بہن سگی ہو یا سوتیلی سب شامل ہیں۔

خالہ وَخَالَاتُكُمْ — اور تمہاری خالائیں

ماں کی بہن کے علاوہ نانی، پرنانی کی بہنیں سگی ہوں یا سوتیلی سب کا یہی حکم ہے۔

بھتیجی وَبَنَاتُ الْأَخِ — اور تمہاری بھتیجیاں

بھائی خواہ سگا ہو یا سوتیلا اس کی بیٹی اسی طرح حرام ہے جس طرح اپنی بیٹی اور پھر ان بھتیجیوں کی بیٹیاں کا بھی یہی حکم ہے۔

بھانجی وَبَنَاتُ الْأُخْتِ — اور تمہاری بھانجیاں

بہن سگی ہو یا سوتیلی اس کی بیٹیاں اور بیٹیوں کی بیٹیاں سب حرام ہیں۔

رضاعی ماں وَأُمَّهَاتُكُمُ الَّتِي أَرْضَعْنَكُمْ — اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا

رضاعی ماں اور رضاعی باپ کے تعلق سے وہ تمام رشتے حرام ہیں جو حقیقی ماں باپ کے تعلق سے حرام ہیں۔

رضاعی بہن وَأَخَوَاتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ — اور تمہاری دودھ شریک بہنیں

خوشدامن وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ — اور تمہاری بیویوں کی مائیں

بیوی کی ماں حقیقی ماں کی طرح ہمیشہ کے لیے حرام ہو جاتی ہے اور جس عورت سے محض نکاح ہوا ہو اور خلوت کا موقع نہ مل سکا ہو اس کی ماں سے بھی نکاح حرام ہے اور اس حرمت پر چاروں ائمہ کا اتفاق ہے۔

سوتیلی بیٹی وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ — اور تمہاری بیویوں کی لڑکیاں جنھوں نے

مِنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ — تمہاری گودوں میں پرورش پائی ہے — ان

بِهِنَّ ؗ — بیویوں کی لڑکیاں جن سے تم صحبت کر چکے ہو۔

گودوں میں پرورش پانے کی بات اس حقیقت کی تصویر کشی ہے کہ یہ حکم فطری حیا کا عین تقاضا اور ذوق سلیم کی حقیقی ترجمانی ہے۔ بھلا شریف آدمی کا ذوق سلیم یہ کیسے گوارا کر سکتا ہے کہ اس لڑکی سے شہوانی رشتہ جوڑے جس نے بیٹی کی طرح گود میں پرورش پائی ہو — گود میں پرورش پانے کی بات کوئی ایسی شرط نہیں ہے جس سے نکاح کے حلال و حرام ہونے پر کوئی اثر پڑتا ہو۔ جس سوتیلی بیٹی نے باپ کے گھر میں پرورش نہ پائی ہو وہ بھی سوتیلے باپ کے لیے حرام ہے۔

بہو وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِیْنَ — اور تمہارے ان بیٹوں کی بیویاں تم پر (حرام

مِنْ اَصْلَابِكُمْ — کی گئیں) جو تمہاری پشت سے ہوں۔

تمہاری پشت سے ہوں کی شرط اس لیے لگائی گئی ہے کہ متبنّٰی کی مطلقہ سے نکاح جائز ہے۔ بیٹے کی بیوی کے حکم میں پوتے اور نواسے کی بیوی بھی داخل ہے۔

بیک وقت دو بہنیں وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ — اور دو بہنوں کا بیک وقت نکاح میں جمع کرنا تم پر (حرام کیا گیا)۔

ایک بہن اگر نکاح میں ہو تو اس کی دوسری بہن سے نکاح حرام ہے۔ ہاں اگر وہ مر جائے یا نکاح ختم ہو جائے تو عدت کے بعد اس کی بہن سے نکاح کیا جا سکتا ہے۔

بہن ہی کی طرح اس کی خالہ، پھوپی، بھانجی اور بھتیجی کا بھی حکم ہے۔ بیوی کی موجودگی میں ان میں سے کسی سے نکاح کرنا بھی حرام ہے۔ فقہائے نے اس کے لیے ایک اصول بتایا ہے کہ ایسی دو عورتوں کا بیک وقت نکاح میں جمع کرنا حرام ہے، جن میں سے اگر ایک کو مرد فرض کر لیں تو دوسری سے اس کا نکاح حرام ہو۔

دوسرے کی منکوحہ　وَالْمُحْصَنٰتُ　اور (وہ عورتیں بھی تم پر حرام ہیں) جو کسی
النساء　دوسرے کے نکاح میں ہوں۔

حلال عورتیں[1]

جنگ میں پکڑی ہوئی عورتیں　اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (النساء)　مگر وہ عورتیں (حلال ہیں) جو (جنگ میں) تمہارے ہاتھ آئیں۔

جو عورتیں جنگ میں پکڑی ہوئی آئی ہوں اور ان کے کافر شوہر دارالحرب میں موجود ہوں۔ ان سے جنسی تعلق قائم کرنا جائز ہے۔ دارالحرب سے دارالاسلام میں آنے کے بعد ان کے نکاح ٹوٹ گئے۔ یہ جس کی ملکیت میں ہوں وہ ان سے بغیر نکاح کے بھی جنسی سکون حاصل کر سکتا ہے۔

محرمات کے سوا تمام عورتیں　وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ (النساء)　اور ان (محرمات) کے ماسوا جتنی عورتیں ہیں وہ سب تمہارے لیے حلال ہیں۔

اوپر جن عورتوں سے نکاح حرام بتایا گیا ہے ان کے ماسوا جتنی عورتیں ہیں وہ سب حلال ہیں مسلمان ان میں سے جس عورت سے چاہے نکاح کر سکتا ہے۔

کتابیہ　وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ　اور وہ پاک دامن عورتیں (حلال ہیں) جو ان لوگوں میں سے ہوں جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی

قرآن نے اہل کتاب خواتین سے نکاح کی اجازت ضرور دی ہے لیکن اس اجازت سے فائدہ اٹھانے میں اس بات کو ضرور پیش نظر رکھنا چاہیے کہ قرآن حکیم نے نکاح کے معاملے میں اصل اہمیت دین و ایمان ہی کو دی ہے، وہ مشرکہ عورتوں سے نکاح کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ خواہ وہ اپنے حسن و جمال مال و دولت اور ہنر اور سلیقے کے لحاظ سے کتنی ہی پسندیدہ کیوں نہ ہوں۔

یہود و نصاریٰ کی عورتیں بلاشبہ حلال ہیں لیکن اگر ان سے نکاح کرنے میں دین و ایمان کے لیے کچھ بھی اندیشے ہوں تو پھر ان سے صرف نظر کرنا ہی زیادہ بہتر ہے کیونکہ اجازت کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اس سے آدمی بہرحال فائدہ اٹھائے۔

---

[1] ... سے جنسی تعلق قائم کرنا جائز ہے۔

مسلمان لونڈیاں وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا أَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ (النساء - ۲۵)

اور تم میں سے جو شخص اتنی وسعت نہ رکھتا ہو کہ خاندانی آزاد مسلمان عورت سے نکاح کر سکے تو اسے چاہیے کہ وہ تمہاری ان لونڈیوں سے نکاح کرے جو تمہاری ملکیت میں ہوں اور مومنہ ہوں۔

سوتیلی لڑکی اگر بیوی سے صحبت نہ کی ہو فَإِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ۔

اور اگر تم نے بیویوں سے قربت نہیں کی ہے تو تم پر کوئی گناہ نہیں اگر اپنی سوتیلی لڑکیوں سے نکاح کر لو۔

اگر کسی عورت سے نکاح ہوا اور خلوت کا موقع ملنے سے پہلے ہی کسی وجہ سے تعلق منقطع ہو گیا تو اس عورت کی بیٹیوں سے نکاح کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

متبنّٰی کی مطلقہ فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ أَزْوَاجِ أَدْعِيَآئِهِمْ إِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا

پھر جب زید اُن سے اپنی حاجت پوری کر چکے تو ہم نے ان کا نکاح آپ سے کر دیا تاکہ مسلمانوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے معاملے میں کوئی تنگی نہ رہے جب کہ وہ ان سے اپنی حاجت پوری کر چکیں۔

"حاجت پوری کر چکے" یعنی طلاق دے دی اور عدت بھی گذر گئی۔ یہ واقعہ حضرت زیدؓ اور حضرت زینبؓ کا ہے۔ حضرت زید حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متبنّٰی تھے۔ آپ نے ان کا نکاح حضرت زینبؓ سے کر دیا تھا لیکن دونوں میں نباہ نہ ہو سکا اور آخر کار حضرت زیدؓ نے حضرت زینب کو طلاق دے دی جب عدت گذر گئی تو ان کا نکاح حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہو گیا۔ قرآن حکیم نے اس نکاح کی علت و مصلحت بیان کی ہے کہ مسلمانوں کو خدا کا یہ حکم معلوم ہو جائے کہ اگر ان کے منہ بولے بیٹے اپنی بیویوں کو طلاق دے دیں تو عدت گذرنے کے بعد ان مطلقات سے بے کھٹک نکاح کیا جا سکتا ہے منہ بولا بیٹا حقیقی بیٹا نہیں ہوتا کہ اس کی بیوی ہمیشہ کے لیے حرام ہو جاتی ہو۔

رسائل و مسائل

بینک کا سود

سوال: ہم لوگوں نے ایک بیکری ایسوسی ایشن قائم کیا ہے اور ایک اچھے خاصے سرمایے سے کاروبار کر رہے ہیں ہمارے ایسوسی ایشن کی رقم بینک میں جمع کی جاتی ہے اور بینک اس پر سود دیتا ہے، سوال یہ ہے کہ سود کے روپے برآمد کرکے انہیں کس مصرف میں صرف کیا جائے؟

جواب۔ سوال کا جواب دینے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سود کے لین دین اور سود پر چلنے والے اداروں میں شرکت کے بارے میں اسلامی عقیدے کو تازہ کر لیا جائے۔ آپ لوگوں کو یہ بات معلوم ہے کہ دین اسلام میں سودی لین دین اور سودی کاروبار میں شرکت کی ممانعت و حرمت بہت سخت ہے۔ سودی کاروبار سے باز نہ آنے والوں کو قرآن کریم میں اللہ و رسول کی طرف سے اعلان جنگ تک دے دیا گیا ہے یعنی جو شخص سود لیتا دیتا ہے وہ اللہ و رسول سے لڑائی مول لیتا ہے۔

اس عقیدے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ مسلمان سود سے دور بھاگے، صرف یہی نہیں کہ خود سود کے لین دین سے بچے بلکہ کسی ایسے ادارے کے ساتھ تعاون بھی نہ کرے جو سود پر چلتا ہو۔ آج کل بینک کی بنیاد ہی سود پر ہوتی ہے اور اس میں اپنی رقم جمع کرنا بھی اس کے ساتھ تعاون کرتا ہے اس لیے مسلمان کو جہاں تک ممکن ہو، اس سے پرہیز کرنا چاہیے۔ ہاں مجبوری کی حالت میں ایسا کیا جا سکتا ہے۔

یہ بات اس لیے لکھی گئی ہے کہ بینک کے لین دین میں شرکت کی قباحت ذہن میں تازہ رہے۔ اصل سوال کے جواب [illegible] ہے کہ آپ لوگوں کے لیے سب سے بہتر [illegible] ہے کہ ایسی [illegible] سود حرام

ہے اس لیے بہتر [illegible] رقم پر سود نہیں لے گا۔ اس کے دو فائدے ہیں۔ ایک فائدہ تو یہ ہے کہ اس طرح اسلام کے ایک اہم عقیدے کی تبلیغ بھی ہوگی اور اس کا اخلاقی اثر بھی اچھا پڑیگا اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اب آپ کی رقم پر بینک جو سود دے گا اس سے آپ لوگوں کا تعلق باقی نہیں رہے گا۔ وہ جس مصرف میں چاہے سود کے روپیے کو صرف کرے آپ لوگوں پر اس کی ذمہ داری نہ ہوگی۔

اس مسئلے میں دوسری رائے یہ ہے کہ سود کے روپیے بینک میں نہ چھوڑے جائیں بلکہ انہیں اس سے نکال کر فقراء و مساکین کو دے دیا جائے لیکن ثواب ملنے کی نیت نہ کی جائے کیونکہ حرام مال کے صدقے پر ثواب نہیں ملتا بلکہ ایسے موقع پر ثواب کی نیت کرنا بھی گناہ ہے۔

جس طرح سود کے روپیوں کو اپنے کسی مصرف میں لانا جائز نہیں ہے اسی طرح ان کو مسجد کی کسی عمارت کے کسی حصے میں صرف کرنا بھی غلط ہے۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ مسجد سے متعلق پاخانے، پیشاب خانے کی تعمیر میں انہیں صرف کیا جا سکتا ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔

اس دوسری رائے پر عمل کرنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے اس لیے بہتر یہی ہے کہ سود کے روپے بینک سے برآمد ہی نہ کیے جائیں۔

سید احمد قادری

پراویڈنٹ فنڈ کی زکوٰۃ کا مسئلہ

استفسار

زندگی بابت رمضان ۱۳۸۵ھ (فروری ۱۹۶۶ء) میں پراویڈنٹ فنڈ کی زکوٰۃ کا مسئلہ میں نے بغور مطالعہ کیا اس سلسلے میں چند باتیں تشریح طلب ہیں براہ کرم وضاحت فرما کر ممنون فرمائیے۔

مضمون کے آخر میں آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ "فقہ حنفی میں ملکیت تامہ کے لیے حکماً قبضہ کافی ہے" قبضہ حکمی کا مطلب یہ ہے کہ مالک کو اپنے مال پر قبضہ حاصل کر لینے کی قدرت حاصل ہو۔

اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ ہماری فیکٹری میں جو پراویڈنٹ فنڈ کاٹا جاتا ہے اس پر ہمارا بالکل اختیار نہیں ہوتا بلکہ یہ رقم حکومت کے خزانے میں داخل کر دی جاتی ہے اور حکومت اپنی مرضی سے پنج سالہ منصوبوں یا دوسرے تعمیری کاموں میں لگاتی ہے اور جملہ رقم پر ایک متعین سود ادا کرتی ہے

ہر ملازم کے نام پر سالانہ اندراج کیا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی ملازم اس رقم میں سے قرض لینا چاہے تو پراویڈنٹ فنڈ کی نصف رقم سے اسے قرض دیا جاتا ہے اور اس قرض رقم پر ۹ فی صدی سود ملازم سے وصول کیا جاتا ہے۔ یہ رقم ع (Company's contri buton) دو ہی صورتوں میں ہمارے قبضے میں آسکتی ہے ایک یہ کہ ہم ملازمت سے علیحدہ ہو جائیں یا فوت ہو جائیں۔

ایک سوال یہ ہے کہ اس رقم میں سے کمپنی کی شرائط کے مطابق قرض لینا جائز ہے یا نہیں۔ اگر سود کی وجہ سے قرض نہیں لیا جا سکتا اور ضرورت کے باوجود ہم اس رقم کو طویل عرصے تک تصرف میں نہیں لا سکتے تو کیا پھر بھی زکوٰۃ واجب ہوگی؟

جواب

گرامی نامہ ملا۔ پراویڈنٹ فنڈ کی زکوٰۃ کا مسئلہ ہو یا اسی طرح کی کسی اور رقم کا۔ تفصیلات سے قطع نظر پہلے دو اصولی سوالات پر غور کر لینا چاہیے اس سے مسئلے کو سمجھنے میں سہولت ہوگی۔ پہلا سوال یہ ہے کہ کیا وجوب زکوٰۃ کے لیے بہرحال یہ لازمی ہے کہ مال صاحب مال کے قبضے میں موجود اور اس کے زیر اختیار و زیر تصرف ہو؟ یا دوسرے لفظوں میں یوں سوچیے کہ اگر کسی کا مال کسی دوسرے شخص کے قبضہ و تصرف میں ہو تو کیا کسی صورت میں بھی اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ چاروں ائمہ، ابوحنیفہ، مالک، شافعی، احمد رحمہم اللہ میں سے کسی امام کے نزدیک بھی وجوب زکوٰۃ کے لیے یہ بات بہرحال لازمی نہیں ہے کہ مال صاحب مال کے قبضے اور تصرف میں موجود ہو بلکہ بہت سی صورتوں میں کسی شخص کے اس مملوکہ مال میں بھی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے جو کسی دوسرے شخص کے قبضہ و تصرف میں ہو۔ اس ضمن میں یہ بات خوب ذہن نشین رکھیے کہ کسی امام نے بھی صاحب مال پر یہ واجب قرار نہیں دیا کہ وہ اپنے غیر مقبوضہ مال کی زکوٰۃ اپنے پاس موجود مال سے ادا کرے بلکہ ہر امام کے نزدیک ایسے مال کی زکوٰۃ ادا کرنا اس وقت واجب ہوگا جب وہ مالک کے پاس آجائے۔

دوسرا سوال یہ ہے۔ کیا کسی کے غیر مقبوضہ مال میں وجوب زکوٰۃ کے لیے یہ شرط بھی ہے کہ وہ اس سے بخوشی حاصل کیا گیا ہو یا یوں کہیے کہ اگر کسی کا مال کسی نے جبراً حاصل کر لیا ہو تو

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ [illegible] مال کی [illegible] ان میں سے کسی میں بھی وجوب زکوٰۃ کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ مال کسی سے بخوشی حاصل کیا گیا ہو بلکہ کسی سے بجبر حاصل کیے ہوئے مال میں بھی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ فقہائے احناف فرماتے ہیں کہ اگر بجبر مال حاصل کرنے والا اس مال کا مقر ہو یا مالک کے پاس ایسے ذرائع موجود ہوں کہ وہ اس سے اپنا مال وصول کرسکتا ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ راقم الحروف نے ان دو اصولوں اور کسی کے ذمہ باقی رہنے والے اموال کی تفصیلات کو سامنے رکھ کر پراویڈنٹ فنڈ کی زکوٰۃ کے مسئلے پر غور کیا تو اس مال سے زکوٰۃ کو ساقط کرنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہ آئی اور دل اب تک اس پر مطمئن ہے کہ اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اس توضیح کے بعد اب آپ کے استفسار کا مختصر جواب عرض کرتا ہوں

آپ نے میری جو عبارت تشریح کے لیے نقل کی ہے اس میں شاید آپ کی نظر "قدرت حاصل ہو" کے جملے پر جم گئی حالانکہ عبارت میں بات یہ نہیں کہی گئی ہے کہ اسے فی الحال اس مال پر اختیار حاصل ہو بلکہ یہ کہی گئی ہے کہ قبضہ حاصل کرلینے کی قدرت حاصل ہو۔ "قدرت" کا مطلب کیا ہے اسے میں اپنے مقالے میں واضح کرچکا ہوں آپ میری یہ عبارت پڑھیے :-

> "فقہائے احناف کے نزدیک ملکیت تامّہ کے حصول کے لیے قبضۂ حقیقی شرط نہیں ہے قبضۂ حکمی کافی ہے۔ ان کے نزدیک ایسا اموال جو بالفعل مالک کے قبضے میں نہ ہوں لیکن ان پر اس کا قبضہ ممکن ہو، مال مقبوض کے حکم میں داخل ہیں۔ یہ حکمی قبضہ دو طرح حاصل ہوتا ہے۔ دائن کے پاس بیّنہ موجود ہو یا مدیون خود دین کا مقر ہو۔" (زندگی فروری ۶۳ء صفحہ ۴۵ سطر ۲۲)

اگر پراویڈنٹ فنڈ پر اس کے مالک کو فوری قبضہ و اختیار حاصل ہوتا تب تو وجوب زکوٰۃ میں کوئی شبہہ پیدا ہی نہ ہوتا۔ شبہہ تو اسی لیے پیش آرہا ہے کہ مالک کو اپنی رقم پر فوری اختیار حاصل نہیں ہے۔ میں نے اپنے مضمون میں یہی بات واضح کی ہے کہ زکوٰۃ واجب ہونے کے لیے فوری قبضہ ضروری نہیں ہے۔ قبضے کا امکان کافی ہے اور پراویڈنٹ فنڈ کے مالک کو اپنے مال پر قبضہ حاصل کرنے کے لیے بہت مضبوط ثبوت حاصل ہوتا ہے اس لیے اس پہلو سے اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہونے کی کوئی وجہ موجود نہیں ہے۔ کچھ لوگ زکوٰۃ کے وجوب کا حکم پڑھتے ہی یہ سمجھ لیتے ہیں کہ انہیں اپنے پاس موجود مال میں سے فنڈ کی زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا جارہا ہے اور پھر وہ گھبرا اٹھتے ہیں کہ تنخواہ سے

باقی صفحہ ۱۳۶ پر

تنقید و تبصرہ

تاریخ دعوت و عزیمت حصہ سوم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صفحات ۳۱۲۔ کاغذ کتابت طباعت بہتر۔ قیمت مجلد چھ روپیہ۔ غیر مجلد پانچ روپیہ

ناشر: مجلس تحقیقات و نشریات اسلام۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

تاریخ دعوت و عزیمت کے تیسرے حصے میں فاضل مصنف نے ہندوستان کے تین مشہور و جلیل القدر بزرگان دین حضرت خواجہ معین الدین چشتی رح، سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رح۔ حضرت مخدوم شیخ شرف الدین یحیی منیری رح کے حالات لکھے ہیں۔ یہ حصہ سوانح حیات، صفات و کمالات، تجدیدی و اصلاحی کارناموں اور تلامذہ و منتسبین و مسترشدین کے تذکرہ و تعارف پر مشتمل ہے۔

حسن ترتیب، افادیت اور سلیس و فصیح عبارت کے لیے مولانا کا نام کافی ہے۔ ہندوستان کے حالات اور تاریخ و سیر پر نظر رکھنے والا کوئی شخص ان دینی و اسلامی خدمات سے انکار نہیں کرسکتا جو صوفیہ صافیہ اور بزرگان دین نے اس ملک میں انجام دی ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ یہ لوگ نہ ہوتے تو یہاں مسلمانوں کی اتنی تعداد بھی موجود نہ ہوتی جو اس وقت موجود ہے۔ ان بزرگوں نے ایک طرف اپنی سیرت اور اخلاق و کردار سے اسلام کی اشاعت کی اور دوسری طرف بہت سے مسلمان بادشاہوں کی بدعت و ضلالت کے خلاف، اعلائے کلمہ حق کی جدوجہد کرکے دین اسلام کی حفاظت کی۔

اس کتاب کا سب سے زیادہ مفید حصہ وہی ہے جس میں ان کی اس طرح کی کوششوں کو نمایاں کیا گیا ہے۔ فاضل مصنف کے لکھے ہوئے بہت سے پیراگراف بڑے مؤثر اور دلکش ہیں۔ میں ذیل میں دو ایک نقل کررہا ہوں۔ مشائخ چشت نے مسلمان حکمرانوں کی رہنمائی و نگرانی کی جو خدمت انجام دی ہے اس کے چند مثالیں نقل کرنے کے بعد آخر میں مولانا نے لکھا ہے:-

"ان چند اقتباسات سے جو تاریخ کے [illegible] سے مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر بغیر کسی تاریخی ترتیب کے جمع کر دیے گئے ہیں اندازہ ہوگا کہ مشائخ چشت کا تصوف محض عزلت و خلوت، نفس کشی اور ترک دنیا اور اقبال کے الفاظ میں سربزیری اور گوسفندی و میشی نہیں تھا، انھوں نے اپنے اپنے دور میں زمانے کے دھارے کو بدلنے اور حالات زمانہ سے پنجہ آزمائی کی بھی کوشش کی۔ جابر سلاطین کے روبرو کلمۂ حق کہنے، ان کے غلط رجحانات کا مقابلہ کرنے اور ان کو صلاح و مشورہ دینے سے بھی پس و پیش نہیں کیا اور جب کبھی ان کے اولو العزم مشائخ کو موقع ملا انھوں نے اصلاح و انقلاب کی کوششوں سے بھی دریغ نہیں کیا۔" (ص ۱۹۵-۱۹۶)

معلوم نہیں مولانا کا یہ حاصل مطالعہ ہند و پاک کے موجودہ مشائخ چشت کے ان درباروں میں پہنچ سکا ہے یا نہیں جن کے نزدیک کسی عالم دین کا ملکی سیاست اور انقلابی جدوجہد میں حصہ لینا اس کی عالمیت کو بھی داغ دار کر دیتا ہے

ص ۲۶۷ پر "ایک انقلاب انگیز دعوت" کے عنوان سے مولانا نے جو پیراگراف لکھا ہے وہ بھی بڑا مؤثر ہے۔ جن صوفیوں نے "خود شکنی" اور "خود انکاری" کی تبلیغ کر کے وجودك ذنب لا يقاس به ذنب (اے انسان تیرا وجود ہی ایک ایسا گناہ ہے جس کے برابر کوئی گناہ نہیں) کا نعرہ لگا کر انسان کو مرتبۂ انسانیت سے ناآشنا کر دیا تھا ان کی تردید کرتے ہوئے پیراگراف کے آخر میں لکھتے ہیں:-

> "اس فضا میں حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ نے ایک نامانوس آواز بلند کی اور اس جوش اور بلاغت کے ساتھ انسانیت کی بلندی اور انسان کی رفعت و محبوبیت اور اس کے خلیفۃ اللہ ہونے کا اعلان کیا اور اس مضمون کو اپنے مکتوبات میں اتنے بار دہرایا اور مختلف اسالیب اور طریقوں سے اس کو بیان کیا کہ اگر اس کو یک جا جمع کر دیا جائے تو اس موضوع پر ایسا ادبی ذخیرہ جمع ہو جاتا ہے جس کو پڑھ کر انسان کا دل حوصلوں اور امنگوں سے معمور ہو جاتا ہے اور انسان کے قلب افسردہ اور تن مردہ میں زندگی کی روح دوڑ جاتی ہے اور اس کو اپنی انسانیت پر ناز ہونے لگتا ہے۔" (صفحہ ۲۶۸)

تبصرہ نگار کو اس کتاب میں متعدد چیزیں کھٹکی بھی ہیں ان میں سے صرف دو کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ صفحہ [illegible] پر قطب الدین مبارک شاہ کے قتل کا جو واقعہ لکھا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ

اس کے قتل کا سبب حضرت سلطان المشائخ کی مخالفت تھا ۔۔۔ کے
ن نے جو کچھ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آخر میں سلطان المشائخ کی خلافت کا معترف
لیا تھا۔ اس اعتراف کے بعد مخالفت کا باقی رہنا اور اس کی وجہ سے اس کا قتل ہونا عجیب بات
دم ہوتی ہے۔ اصل میں بزرگوں کے بارے میں ان کے عقیدت مندوں نے بہت سی باتیں گھڑ لی
، اور ان میں تاریخی صداقت کا عنصر بہت کم ہے یا بالکل نہیں ہے۔ صفحہ ۲۱۰ پر حضرت مخدوم منیریؒ
کے حوالے سے یہ شعر لکھا ہے:۔

دنیاست بلا خانہ و عقبیٰ ہوس آباد ما حاصل ایں ہر دو بیک جو نستانیم

عقبیٰ کو ہوس آباد کہنا اور حاصلِ عقبیٰ کو لینے سے انکار کرنا آخر کس کتاب و سنت کی تعلیم ہے اور
معرفت و علیائے ہمت کی کون سی قسم ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی کو ایک نوٹ لکھ کر اس نقطۂ نظر کی
جیہ ضرور کرنی چاہیے تھی۔ اگر اس نقطۂ نظر کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو پھر وجودک ذنب لا یقاس بہ ذنب کے نقطۂ نظر کی
دید نہیں کی جا سکتی۔ افسوس ہے کہ اس مختصر تبصرے میں اشارے کے سوا تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔
صفحہ ۲۵۰ پر فارسی عبارت کے ترجمے میں دو جگہ لغزشِ قلم کی وجہ سے غلطی ہو گئی ہے۔ "چہار صد سال"
کا ترجمہ "سات لاکھ برس ہو گیا ہے اور "ہفصد ہزار سال" کا ترجمہ "سات ہزار سال" چھپ گیا ہے۔
بحیثیت مجموعی اس کتاب نے دینی لٹریچر میں قابل قدر اضافہ کیا ہے اور اس کا مطالعہ بہر حال مفید ہے۔

(ع ق)

سالنامہ جامعہ دہلی

مرتب جناب عبداللطیف اعظمی۔ صفحات ۸۰ کاغذ کتابت طباعت بہتر۔
قیمت ایک روپیہ ملنے کا پتہ:۔ دفتر رسالہ جامعہ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی۔

ہندوستان کے مشہور اور رفیع علمی و ادبی ماہنامہ جامعہ کا یہ سالنامہ جائزہ نمبر کے نام سے شائع
ہوا ہے۔ یہ مئی اور جون ۶۳ء کا مشترک شمارہ ہے۔ اس شمارے میں ۱۹۶۲ء کے اردو ادب کا جائزہ
لیا گیا ہے اور یہ جائزہ صرف بھارت تک محدود نہیں ہے بلکہ پاکستان تک وسیع ہے۔ اس شمارے
کا سب سے پہلا مقالہ "پاکستان میں شائع ہونے والی کتابوں کا ایک سرسری جائزہ" ہے۔ مرتب سالنامہ
نے "ہندوستان کے تصنیفی اداروں کے عنوان سے ایک مختصر مقالہ لکھا ہے۔ اس کے علاوہ "وفیات"
کے عنوان سے اردو کے ان مشہور ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کے مختصر حالات لکھے گئے ہیں

جن کا اجمال ۱۹۶۲ء میں ہوا ہے۔ اردو زبان میں جو علمی و ادبی کام ہو رہا ہے اس نمبر سے اس کا ایک اجمالی خاکہ سامنے آجاتا ہے۔ ادارۂ جامعہ کی یہ خدمت، قدر کے لائق ہے۔

جناب علی جواد زیدی نے ۱۹۶۲ء کے شعری ادب پر ایک نظر ڈالی ہے اور اس میں رشید کوثر فاروقی صاحب کا بھی ذکر کیا ہے۔ ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"انھوں نے ایک اسلامی غزل کا نعرہ دے کر غزل کے ماضی و حال کے علاوہ پوری شاعری کی تاریخ کو قاضی شہر کے دربار میں لاکر کھڑا کر دیا ہے" (صفحہ ۶۶)

کوثر صاحب نے "زمزمہ" میں اپنی شاعری اور غزل کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس پر علی جواد صاحب کی یہ تنقید منصفانہ نہیں ہے اس لیے کہ کوثر صاحب نے غزل یا شاعری میں نعرہ بازی کے خلاف قوت اور صراحت کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے۔ علی جواد صاحب نے یہاں تک لکھ دیا ہے۔

"اگر ہم نے اس بات کو زیادہ پھیلایا تو وہ دن دور نہیں جب "ہندو غزل" اور "مسلم غزل" کی سی چیزیں سامنے آنے لگیں گی"

موصوف نے یہ بات کوثر صاحب کے نظریۂ شعر و ادب کی تخفیف کے لیے لکھی ہے حالانکہ اس نظریے میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو اس پھبتی کی مستحق ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ جو لوگ اس نظریہ زندگی سے متفق نہیں ہیں جس کا اظہار کوثر صاحب نے کیا ہے وہ اس سے ہم آہنگ نظریۂ شعر و ادب سے کس طرح متفق ہو سکتے ہیں۔ فقرے چست کرنے کا اختیار ہر شخص کو ہے لیکن اسلامی ادب کا نظریہ اب ان فقرہ بازیوں کے مرحلے سے آگے نکل چکا ہے۔

ایک مقالے میں ہندوستان کے تصنیفی اور اشاعتی اداروں پر جو اچٹتی سی نظر ڈالی گئی ہے اس میں متعدد قابل ذکر تصنیفی اور اشاعتی ادارے نظر نہیں آتے، حالانکہ وہ کسی اچٹتی نظر سے بھی شاید ہی پوشیدہ رہ سکیں۔ مثال کے طور پر کیا مجلس تحقیقات و نشریات اسلامی لکھنؤ، مکتبہ الفرقان لکھنؤ اس لائق نہ تھے کہ ان کا ذکر کیا جاتا۔ خود دہلی میں کیا مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند اس لائق نہ تھا کہ اس کا ذکر کیا جائے؟ یہ بات بھی نہیں کہ تصنیفی اداروں کے بارے میں کوئی خاص قید مقالہ نگار کے سامنے ہو۔ پٹنہ عظیم آباد کے تصنیفی و اشاعتی اداروں کا بھی کوئی ذکر موجود نہیں ہے۔

بحیثیت مجموعی یہ جائزہ نمبر لائق مطالعہ ہے۔ (ع۔ق)

جامعہ نئی دہلی کا آزاد نمبر — مرتبہ جناب عبداللطیف اعظمی صفحات [illegible] کاغذ کتابت طباعت بہتر قیمت ایک روپیہ ملنے کا پتہ دفتر رسالہ جامعہ جامعہ نگر دہلی۔

جامعہ نئی دہلی کا مارچ کا شمارہ مولانا ابوالکلام آزاد نمبر ہے۔ مولانا مرحوم کا شمار ان شخصیتوں میں ہے جنہیں تاریخ فراموش نہیں کرتی، ان پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور بہت کچھ لکھا جائے گا۔ اللہ تعالےٰ نے انہیں غیر معمولی صلاحیتیں عطا کی تھیں اور وہ اپنے وقت کے عبقری تھے۔ ان کے علم و فضل اور عبقریت کا انکار کوئی غالی متعصب ہی کر سکتا ہے۔ البتہ یہ بات ضرور متنازع فیہ ہے کہ "الہلال" میں انہوں نے اسلام کی جو دعوت پیش کی تھی خود ان کی عملی زندگی اس کے مطابق رہی یا نہیں؟ اس سوال کے جواب میں نفی و اثبات کا اختلاف ہے اور رہے گا۔

جامعہ نئی دہلی نے مولانا کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر سنجیدہ مقالات شائع کر کے ان کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان مقالات میں مرتب رسالہ کا مقالہ "مولانا آزاد اپنے معاصرین کے خطوط کی روشنی میں" بڑی محنت سے مرتب کیا گیا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کی ذات بڑی ہمہ گیر اور ہمہ جہت تھی۔ مولانا غلام رسول مہر کا بھی ایک سرسری مقالہ شریک اشاعت ہے۔

اس نمبر میں سب سے پہلے پروفیسر آل احمد سرور کا مقالہ "ہندوستانی قومیت اور مسلمان" نظر نواز ہوتا ہے۔ اس مقالے کی دوسری سرخی یہ ہے۔ "مولانا آزاد کی پانچویں برسی کے موقع پر چند خیالات" ان خیالات کا حاصل یہ ہے کہ مولانا آزاد ہندوستان میں "متحدہ قومیت" کے امام تھے اور اس نظریے کو مولانا نے اس طرح اپنا مقصد حیات بنا لیا تھا کہ گویا انھوں نے قرآن کی تفسیر بھی اسی نظریے کو ثابت کرنے کے لیے لکھی تھی اور جب تک ہندوستان کے مسلمان اس نظریے پر ایمان لا کر اسے اپنی زندگی میں داخل نہیں کریں گے وہ ترقی کے میدان سے خارج ہی رہیں گے۔

پروفیسر صاحب کے خیالات پر مفصل تبصرے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ چند باتوں کی طرف مختصر اشارے کیے جاتے ہیں۔ ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے:

"ہندوستان کا مسلمان جذباتی طور سے اسلام سے محبت کرتا ہے مگر اس کا اسلام عجمی اسلام ہے خالص وہ [illegible] ہے" (صفحہ ۸)

ہندوستان کے مسلمانوں پر جب کوئی مسلمان یہ تنقید کرے گا تو پڑھنے والا یہ سمجھے گا کہ ناقد کا اسلام حقیقی اسلام سے خاصہ قریب ہوگا۔ توحید، رسالت اور آخرت کے عقیدے اور نماز، زکوٰۃ روزہ اور حج کے ارکان کو پروفیسر صاحب بھی یقیناً حقیقی اسلام کے اجزا تسلیم کرتے ہوں گے جاننے والے تو خیر جانتے ہی ہیں ان کو خود بھی کبھی اس آئینے میں اپنی صورت و سیرت دیکھنی چاہیے اور جائزہ لینا چاہیے کہ وہ خود حقیقی اسلام سے کتنے قریب ہیں اور اگر ان کے نزدیک حقیقی اسلام کا صرف ایک جزو ہے اور وہ ہے "متحدہ قومیت" تو یہ حقیقی اسلام صرف پروفیسر صاحب کا تراشیدہ ہے اسے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش کیے ہوئے اسلام سے دور کا تعلق بھی نہیں ہے۔ جو لوگ اسلامی نقطہ نظر سے ایک ناخواندہ دیہاتی سے بھی فروتر ہوتے ہیں وہ جب حقیقی اسلام کا نام لے کر مسلمانوں میں پھیلی ہوئی بدعتوں اور خرابیوں پر تنقید کرتے ہیں تو ان کی اس حرکت پر ہنسی آتی ہے۔

ایک جگہ بھارت کی اکثریت کے مذہبی و تہذیبی جذبات کی حمایت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

> "کچھ عرصہ ہوا پروفیسر ہمایوں کبیر نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک کانووکیشن میں خطبہ پڑھتے ہوئے یونیورسٹی کے مسلمان طلبہ کو مشورہ دیا کہ وہ ہندوستان کے مشاہیر کو اپنائیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ وہ ہندو مذہب کے بزرگوں پر ایمان لے آئیں بلکہ سیدھا سادہ مطلب یہ تھا کہ اشوک، کالی داس، وکرماجیت، کرشن جی، رام چندر جی کا بھی اقرار کریں۔ مگر عام طور پر پروفیسر کبیر کے ارشادات کو ایک ہندو پرست وزیر کے بھاشن سے زیادہ اہمیت نہ دی گئی جو جس کا کھاتا ہے اسی کا گاتا ہے۔" (صفہ)

یہ عبارت اردو ہی میں ہے مگر اس کا سمجھنا آسان نہیں ہے۔ پروفیسر صاحب ایک دوسرے پروفیسر کے ارشادات کا مطلب بیان فرما رہے ہیں اور اس طرح کہ یہ مطلب ایک اور مطلب بیان کرنے کا خواہاں ہے "ہندو مذہب کے بزرگوں پر ایمان نہ لاؤ بلکہ ان کا اقرار کرو" کوئی بتائے کہ اس عبارت کا مطلب کیا ہوگا؟ آخر کس مسلمان نے پروفیسر صاحب کی شمار کی ہوئی شخصیتوں کا انکار کیا ہے۔ پروفیسر صاحب تو اردو زبان کے بڑے محقق ہیں کیا اردو لٹریچر اور مسلمانوں کی لکھی ہوئی اردو کی کتابوں میں ان شخصیتوں کا ذکر ہے۔ کیا ان کا ذکر بالکل موجود نہیں ہے؟ وہ کون مسلمان ہے جو یہ کہتا ہو کہ یہ شخصیتیں ہندوستان میں نہیں گزریں یا یہ کہ ان میں کوئی خوبی نہ تھی۔ اگر ایسا کوئی مسلمان موجود نہیں ہے تو پھر اس مشورے کے کیا معنی

ید و تبصرہ

یہ مسلمان ہندوستان کے مشاہیر کو اپنائیں؟ اس کا سیدھا سادہ مطلب یہ ہوگا کہ جس طرح مسلمان
اپنے بزرگوں سے عقیدت رکھتے ہیں اور نمونے کے طور پر انہیں پیش کرتے ہیں اسی طرح وکرماجیت، کرشن جی
اور رام چندر سے بھی عقیدت رکھیں اور مسلمانوں کے سامنے نمونے کے طور پر انہیں بھی پیش کریں۔ پروفیسر
بیر صاحب کے ارشاد کا وہ بے معنی مطلب تو صرف پروفیسر سرور صاحب سمجھ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ
لیے ادب سے یہ سوال کرنے کو جی چاہتا ہے کہ مولانا آزاد نے اپنی کن کن تصانیف و تقاریر میں ان
شخصیتوں کا اقرار فرمایا ہے جن کے نام پروفیسر صاحب نے لکھے ہیں۔ اگر وہ اپنی یہ تحقیق ایک پیش کر دیں تو
بڑی عنایت ہوگی۔

پروفیسر صاحب نے جماعت اسلامی کا نام جس سیاق میں لیا ہے اس کی شکایت بے کار ہے
ظاہر ہے کہ جو شخص مذہب اور سیاست کی تفریق کا قائل اور مذہبی بنیاد پر سیاست کا منکر ہو، اس کے لیے
جماعت اسلامی کو سمجھنا بھی آسان نہیں ہے۔ حمایت کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ بہرحال ہمارے پروفیسر صاحب
بڑے دلچسپ محقق ہیں اور ان کا یہ مقالہ بھی بہت دلچسپ ہے۔ (ع۔ ق)

زمزمہ رشید کوثر فاروقی۔ کاغذ، کتابت، طباعت عمدہ۔ صفحات ۱۶۰۔ مجلد قیمت تین روپیہ
ناشر:۔ ادارۂ ادبیات عالیہ ۱۳۱ خیالی گنج۔ لکھنؤ۔

جناب رشید کوثر فاروقی کی غزلوں کا مجموعہ "زمزمہ" شعر و شاعری اور ادب سے دلچسپی رکھنے
والوں کی توجہ اپنی طرف کھینچتا ہے۔ ہندوستان میں جدید شعراء کے جو مجموعے شائع ہوتے رہتے ہیں
ان میں یہ مجموعہ ایک خاص امتیاز رکھتا ہے۔ ابو المجاہد زاہد کے مجموعۂ کلام "تگ و تاز" اور
حیرت شملوی کے "آئینۂ حیرت" کے بعد یہ تیسرا مجموعہ ہے جو تعمیر پسند اذہان کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے
بلکہ کسی شاعر و ادیب کے لیے اسے نظر انداز کرنا آسان نہیں ہے۔

تبصرہ نگار کا اس وقت خالص ادب سے بہت کم تعلق باقی رہ گیا ہے اور موجودہ مشاغل
کے ساتھ اس مجموعے کی غزلوں اور متفرق اشعار پر کوئی مفصل تنقید یا تبصرہ دشوار ہے۔ جہاں تک
اشعار کو پسند کرنے کا تعلق ہے، ہر شخص کی پسند الگ ہوتی ہے۔ تبصرہ نگار کو اس مجموعے کے جو اش
و [illegible] ان کی تعداد کم نہیں ہے۔

ہیں کہ چند شعر ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں۔

یہ دبی بی تمنا، یہ تھکے تھکے ارادے — کہو میر کارواں سے کہ حدی کے لے بڑھا دے

شاید اس مطلع کا پہلا ٹکڑا پہلے "یہ قدم قدم تامل" تھا۔ معلوم نہیں کوثر صاحب نے اسے بدل کیوں دیا۔

بخوشی قبول کر لوں مجھے تو اگر سزا دے — ترے آستاں سے لیکن کوئی غیر کیوں اٹھا دے

حیات، بار دو عالم ہے اور کچھ بھی نہیں — جو روح پیکر اخلاق میں ڈھلی نہ ہوئی

فریبِ محویتِ انتظار کیا کہیے — یہ ان کے پاؤں کی آہٹ ہے یا مرا افکار

بلا کشانِ محبت کی آزمائش ہے — یہ دام گاہ عناصر، یہ تنگنائے حواس

تیر و تفنگ فطرتِ آزاد کے لیے — روکا ہے خار و خس نے بھی سیلِ رواں کہیں

دل میں اتر رہی ہے نوائے پیامِ دوست — بے چنگ و ساز کیف سماعت نہ پوچھیے

باز رکھتی ہے جو کرم سے انہیں — میری کوتاہ دامنی تو نہیں

لغزشِ پا پہ طعنۂ اہلِ جہاں بجا سہی — اس پہ ہزار ہا سلام جس نے قدم اٹھا دیا

کہاں ہو تم کہ درد و یاس و حرماں — ستاتے ہیں اکیلا مجھ کو پا کے

تیرے کوثر کو ہزاروں غم تھے کل کی بات ہے — ایک تیرے غم نے ہر غم کا مداوا کر دیا

کلیجے سے لگائے ہے متاعِ بازگشت اپنی — ترے کوثر کو کیا کیا ناز ہے تجدید ایماں پر

جولاں گہِ زمان و مکاں سے پرے بھی دیکھ — تو نے تو سنگِ میل کو منزل بنا لیا

اس مجموعے میں متعدد اشعار ایسے بھی ہیں جو نہ ہوتے تو اچھا تھا۔ انھوں نے کوثر صاحب کی سنجیدہ مقصدی اور تعمیری شاعری کو مجروح کر دیا ہے ـــ نئے معنی اور نئی ترکیبوں کی تلاش اشعار میں ابہام بھی پیدا کرتی ہے۔ شاعر سمجھتا ہے کہ اس نے اپنا مفہوم ادا کر دیا، حالانکہ اس کا آدھا حصہ اس کے ذہن ہی میں رہ جاتا ہے۔ اس مجموعے میں بھی اس طرح کے اشعار ملتے ہیں ـــ کچھ محاورے، ترکیبیں اور الفاظ

ایسے بھی ہیں جن سے کان آشنا نہیں۔

اب نگاہِ خود نگر خود آشنا ہونے لگی ۔ رفتہ رفتہ اٹھ چلا ہے امتیازِ ما و من

یہ بات واضح نہیں کہ شاعر کیا کہنا چاہتا ہے۔ اس کے علاوہ " امتیازِ ما و من " کا محاورہ کھٹکتا ہے " امتیازِ با و شما " یا " امتیازِ من و تو " سے تو کان آشنا ہے۔ " امتیازِ ما و من " سے آشنا نہیں۔ اور پھر یہ کہ اس کا مفہوم کیا ہوگا؟ ایک جگہ ص۵ کوثر صاحب نے " مصلحت نشناس " لکھا ہے۔ ضرورتِ شعری کے عذر کی بنا پر ناشناس کو نشناس بنا دینا کچھ عجیب سا محسوس ہوتا ہے۔ ص۶ پر " گرگِ آشتی " کی ترکیب بھی غریب ہے۔ اس شعر میں " گرگِ آشتی " کے بجائے " مکرِ آشتی " کی ترکیب زیادہ موزوں ہے۔

حجابِ حسن چاہیے، جمالِ روح چاہیے مشام کی ہوس نہیں شمیم ڈھونڈتا ہوں میں

اس شعر کا مدعا بھی عنقا ہے۔ اس کے علاوہ پتہ نہیں مشام کا لفظ شاعر نے کس معنی میں استعمال کیا ہے ویسے یہ لفظ قوتِ شامہ یا دماغ کے معنی میں مستعمل ہے۔

عرضِ ناشر میں فاروقی صاحب کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں خاصہ مبالغہ محسوس ہوا۔ " میں اور میری شاعری میں " خود کوثر صاحب نے جو ادعائی اسلوبِ بیان اختیار کیا ہے وہ ممکن ہے دوسروں کو پسند آئے لیکن تبصرہ نگار کو پسند نہ آیا۔ انہیں خود بھی یہ چیز محسوس ہوئی ہے اور انھوں نے اس کا اثر کم کرنے کی کوشش بھی کی ہے لیکن اثر کم ہوا نہیں ہے۔

اسلام پر انھوں نے اپنے جس یقین کا اظہار کیا ہے اس سے خوشی ہوئی اللہ تعالیٰ ہم سب کو اسلام کی سیدھی راہ پر مستقیم رکھے۔ غزل کے بارے میں انھوں نے جو اظہارِ خیال کیا ہے اس کے بڑے حصے سے اتفاق ہے۔

رشید کوثر صاحب کو تبصرہ نگار نے تحریک ادبِ اسلامی کے واسطے سے جانا پہچانا ہے وہ ادارہ ادبِ اسلامی ہند کے ایک معروف و ممتاز ادیب و شاعر سمجھے جاتے رہے ہیں۔ اسی طرح وہ دعوتِ اسلامی یا تحریکِ اقامتِ دین سے بھی ناآشنا نہیں رہے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اسلام کو سمجھنے اور اس پر یقین کے استحکام میں جماعتِ اسلامی کے لٹریچر نے انہیں کافی مدد پہنچائی ہے لیکن وہ " میں اور میری شاعری " میں ان دونوں تحریکوں کے ذکر سے اس طرح دامن بچا گئے ہیں جیسے انہیں جانتے ہی نہیں؟ اور جیسے خود

اسلام کو براہِ راست کتاب و سنت سے سمجھا ہے
یہاں اس اعتراض کا کوئی قیاسی سبب لکھنا مناسب نہیں، صحت کے ساتھ کوثر صاحب ہی اسے بیان
کرسکتے ہیں۔
بحیثیت مجموعی اردو غزلوں کا یہ مجموعہ اردو شاعری کے ذخیرے میں ایک اچھا اضافہ ہے۔ (ر۔ق)

شائع کردہ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان۔ اچھرہ

پوتے کی وراثت کا مسئلہ

لاہور۔ قیمت ۶ ر

یہ پمفلٹ، چودھری محمد اقبال چیمہ کے مسودۂ قانون پر ایک نظر ہے۔ یہ پمفلٹ بقامت کہتر اور بقیمت بہتر کا مصداق ہے۔ یہ مسئلہ منکرین حدیث کا پیدا کیا ہوا ہے اور اب اس نے ایک فتنے کی شکل اختیار کرلی ہے۔ پوتے کی وراثت سے محرومی کا مسئلہ ایک اجماعی مسئلہ ہے۔ اگر اس کو کوئی شخص سمجھنا چاہے تو اس کے لیے یہ چھوٹا سا پمفلٹ بہت کافی ہے اور اگر کوئی سمجھنا نہ چاہے تو ضخیم کتاب بھی بیکار ہے۔ اس میں پوتے کی محرومی سے جو اشکال پیدا ہوتا ہے اس کا بھی نہایت معقول اسلامی حل پیش کیا گیا ہے۔

(صفحہ ۵۳ کا بقیہ)

فنڈ بھی کٹتا اور پھر اس فنڈ کی زکوٰۃ بھی تنخواہ ہی سے ادا کرو۔ حالانکہ میں نے اپنے مضمون میں یہ بات بھی واضح کردی ہے کہ زکوٰۃ اس وقت ادا کی جائے گی جب فنڈ کی رقم اس کے مالک کو واپس مل جائے اور بعض لوگوں کے اسی جزع فزع کو سامنے رکھ کر آپ کے جواب میں بھی میں نے اسے واضح کرنا ضروری سمجھا ــــ اگر ملازمت سے علیحدہ ہونے کے بعد پراویڈنٹ فنڈ سے مثال کے طور پر پانچ ہزار کی رقم ملے تو اس میں سے چند سو روپے، زکوٰۃ نکالنے میں ایک مسلمان کو دل تنگ نہ ہونا چاہیے چہ جائیکہ وہ اسے "وبال جان" قرار دے۔

آپ نے پراویڈنٹ فنڈ سے قرض لینے کے بارے میں جو سوال کیا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ قرض لیا جاسکتا ہے۔ اس میں سود کا معاملہ محض ضابطے کی خانہ پری ہے کیونکہ وہ فاضل رقم بھی خود اسی کے کھاتے میں جمع ہوتی ہے اور ملازمت سے الگ ہونے کے بعد اسی کو واپس مل جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اپنے آپ کو سود دینا ایک بے معنی بات ہے۔

ماہنامہ **چراغِ راہ** کراچی

کی نئی پیش کش

تحریکِ اسلامی نمبر

ماہنامہ "چراغِ راہ" کراچی اپنی سابقہ روایات کے مطابق اکتوبر ۱۹۶۳ء میں منعقد ہونیوالے
کل پاکستان جماعت اسلامی کے موقع پر شائع کر رہا ہے۔

حصہ اوّل مضامین کی ایک مختصر جھلک

● فریضہ اقامت دین ● مجدد الف ثانی اور ان کی تحریک ● تحریک اسلامی اور شاہ ولی اللہ اور انکے بعد۔

حصہ دوم ● جماعت اسلامی کا موجودہ ● اسلامی انقلاب کے لئے جماعت اسلامی کی جدوجہد

● جماعت اسلامی اور جمہوریت ● جماعت اسلامی اور خارجہ پالیسی ● جماعت اسلامی اور خدمت خلق

● جماعت اسلامی کا معاشی پروگرام ● جماعت اسلامی کے اجتماعات ● جماعت اسلامی کا تربیتی پروگرام

● جماعت اسلامی عالمی لٹریچر میں ● تحریک اسلامی مشرقی پاکستان میں

حصہ سوم : میری تحریکی زندگی کا ایک اہم واقعہ (مختلف تاثرات)

حصہ چہارم : مذاکرہ : تحریک اسلامی کا مستقبل

حصہ پنجم : داعی کے خطوط

آفسٹ کی دیدہ زیب طباعت اور خوبصورت سرورق

ضخامت ۳۰۰ صفحات قیمت ۴ روپے

عام اشاعت فی پرچہ ۶۲ پیسے سالانہ چندہ معہ خاص نمبر ۹ روپے

ناظم ادارہ ماہنامہ چراغِ راہ، ۵۷ وزیر مینشن نکل روڈ کراچی ۲

(ہندوستان میں ترسیل زر کا پتہ:۔۔۔۔۔۔۔۔ محمد منظور الحسن ۸۸/۹۸ پریم نگر۔ کانپور۔ یو۔پی۔

جمادی الاخری ۱۳۸۳ھ
نومبر ۱۹۶۳ء

زندگی رامپور

جلد:- ۳۱
شمارہ:- ۵

مدیر:- سید احمد قادری

● خط و کتابت و ارسالِ زر کا پتہ ـــــــ منیجر "زندگی" رامپور - یوپی
● زر سالانہ :- پانچ روپیہ ـــــ شش ماہی :- تین روپیہ ـــــ فی پرچہ :- پچاس نئے پیسے
● ـــــ ممالکِ غیر سے :- دس شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر
پاکستانی اصحاب مندرجہ ذیل پتے پر رقوم بھیجیں اور رسید ہمیں ارسال فرمائیں
منیجر ہفت روزہ "شہاب" ۱۱/c شاہ عالم مارکیٹ لاہور

مالک :- جماعت اسلامی ہند - ایڈیٹر :- سید احمد عروج قادری - پرنٹر پبلشر :- احمد حسن - مطبع :- دہلی پرنٹنگ پریس محلہ بنگلہ آزاد خاں آنولہ یوپی
مقام اشاعت :- دفتر زندگی رامپور یوپی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

(سید احمد قادری)

گزشتہ ماہ اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ کے ترجمے پر گفتگو کر کے واضح کیا گیا تھا کہ اس کا ترجمہ "دین قائم کرو" اصل لغت کے اعتبار سے حقیقی ترجمہ ہے اور یہ کہ صرف جماعت اسلامی والوں نے نہیں بلکہ دوسرے مفسرین اور علماء نے بھی یہ ترجمہ کیا ہے اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے تو اسی ترجمے کو "دین قائم رکھو" کے ترجمے پر ترجیح دی ہے ——— آج اس بات کی وضاحت مقصود ہے کہ یہاں "الدین" سے مراد کیا ہے؟ ہم کہتے ہیں کہ اس سے مراد پورا دین اسلام ہے، وہ دین اسلام جس کے بارے میں اللہ جل شانہٗ نے فرمایا ہے:۔ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو بہ لحاظ دین پسند کیا۔) اَقِیْمُوا الدِّیْنَ کے ٹکڑے سے امت مسلمہ کے لیے جس دین کی اقامت کا حکم نکلتا ہے اس میں پوری شریعت محمدی بھی داخل ہے، ہرگز خارج نہیں ہے اور جو شخص اس سے شریعت اسلامی کو خارج مانتا ہے اسے توبہ کرنی چاہیے آج تک کسی قابلِ اعتماد مفسر یا عالم نے نہ ایسی بات کہی ہے اور نہ بسلامتی ہوش و حواس ایسی لغو بات کہہ سکتا ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ اس ٹکڑے کی تفسیر میں وَلَمْ یُرِدْ بِہِ الشَّرَائِعَ فَاِنَّہَا مُخْتَلِفَۃٌ (اس سے شریعتیں مراد نہیں ہیں اس لیے کہ وہ مختلف رہی ہیں) جیسے جملے جو مفسرین نے لکھے ہیں اس سے کوئی ناواقف ہی یہ سمجھ سکتا ہے کہ ان کی غرض یہ تھی کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جس دین کی اقامت کا حکم دیا گیا تھا اس سے وہ شریعت خارج ہے جو اللہ کی طرف سے آپ پر اتری تھی۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ان کا یہ مطلب نہ تھا تو پھر اس طرح کے جملوں کا صحیح مطلب کیا

ان سے اُن کی غرض کیا ہے ، جبکہ انھوں نے صاف طور پر یہ لکھا ہے کہ ان اقیموا الدین میں دین کا جو لفظ آیا ہے اس سے شریعتیں مراد نہیں ہیں کیونکہ وہ مختلف رہی ہیں۔ یہی وہ سوال ہے جسے حل کرنے کے لیے یہ اشارات لکھے جا رہے ہیں۔

صحیح مطلب کیا ہے سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ انھوں نے یہ تصریح کیوں کی ہے؟ جس محل اور جس پس منظر میں جو بات کہی جاتی ہے اسے نہ سمجھنے یا نظر انداز کر دینے سے انسان خود بھی دھوکا کھاتا ہے اور دوسروں کو بھی غلط فہمی میں مبتلا کرتا ہے۔

ان اقیموا الدین کے ساتھ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ کا ٹکڑا بھی لگا ہوا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ دین میں تفرقہ نہ ڈالو یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرات نوح، محمدؐ، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کو دین کی اقامت کا حکم دیا اور یہ ممانعت بھی فرمائی کہ اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔ اب ایک زبردست اشکال اور شبہہ یہ پیش آ رہا تھا کہ جب تمام انبیاء کو ایک ہی دین کی اقامت کا حکم دیا گیا تھا تو پھر ان کی شریعتوں میں اختلاف کیوں پیدا ہوا جب کہ شریعت بھی دین ہی کا جزو ہوتی ہے، کیا نعوذ باللہ انبیاءؑ نے اس ممانعت کا خیال نہیں کیا اور شریعتوں میں بطور خود اختلاف پیدا کر لیا؟ یہ تھا وہ اشکال اور شبہہ جسے دور کرنے کے لیے مفسرین کرام کو یہ تصریح کرنی پڑی کہ یہاں دین سے مراد شریعتیں نہیں ہیں بلکہ وہ اصول اور دین کا وہ جزو مراد ہے جو تمام انبیاءؑ کے درمیان متفق علیہ رہا ہے اور جس میں کبھی کوئی اختلاف نہیں ہوا مثال کے طور پر توحید، رسالت اور آخرت کے عقائد ہمیشہ ایک رہے ہیں اور بندگیِ رب کا حکم ہمیشہ دیا جاتا رہا ہے۔ انبیاء کرام کو اصول دین میں اختلاف پیدا کرنے کی ممانعت کی گئی تھی، اس ممانعت کا تعلق دین کے اس جزو سے نہیں ہے جس کو شریعت کہتے ہیں، کیونکہ مختلف شریعتیں، خدا ہی کی نازل کی ہوئی ہیں، انبیاء نے اپنے جی سے انہیں نہیں گھڑا ہے۔ مفسرین نے یہاں ان اقیموا الدین کی تفسیر میں، شریعتیں مراد نہ ہونے کی جو نفی کی ہے اس کا یہ ہے محل و مقام اور پس منظر۔

اس پس منظر کو سمجھ لینے کے بعد اب ان کی عبارت کا مطلب سمجھنا آسان ہے۔ صحیح مطلب یہ ہے کہ اللہ نے حضرت نوحؑ کو جس دین کی اقامت کا حکم دیا تھا اس میں وہ شریعت بھی یقیناً داخل تھی جو اُن پر نازل ہوئی۔ ان کے بعد حضرت ابراہیم کو جس دین کی اقامت کا حکم دیا گیا وہ اصل کی حد تک تو وہی تھا جس کا حکم حضرت نوحؑ کو دیا گیا تھا لیکن شریعت وہ تھی جو خاص طور سے ان پر نازل ہوئی تھی نہ کہ

وہ بھی اسی شریعت کے مکلف بنائے گئے ہوں جو حضرت نوح پر اتری تھی۔ اسی طرح حضرت موسیٰ کو جس دین کی اقامت کا حکم دیا گیا وہ اصولوں کی حد تک وہی سابق دین تھا لیکن شریعت وہ تھی جو ان پر کتاب توریت میں نازل کی گئی۔ حضرت عیسیٰ بھی اس کے مکلف تھے الا یہ کہ کتاب انجیل میں کچھ فروعی احکام خاص طور سے نازل ہوئے ہوں تو وہ انہیں احکام کے مکلف تھے جو ان پر خاص طور سے نازل ہوئے اور اب آخر میں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جس دین کی اقامت کا حکم دیا جا رہا ہے وہ اصول کی حد تک بالکل وہی ہے جو سابق انبیاء کو دیا گیا تھا لیکن شریعت وہ ہے جو خاص طور سے آپ پر نازل کی گئی اور آپ اسی شریعت کو قائم کرنے کے مکلف ہیں جو آپ پر نازل کی گئی۔ حاصل کلام یہ کہ مفسرین کی عبارت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے وحدت دین کا جو اعلان کیا ہے اس سے مراد اصل دین کی وحدت ہے۔ شریعتوں کی وحدت مراد نہیں ہے اس لیے کہ اس نے خود فرما دیا ہے :-

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا

اگر مفسرین کی عبارت کا مطلب کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ اقیموا الدین میں شریعت محمدی کی اقامت کا حکم داخل نہیں ہے تو اسے ماننا پڑے گا کہ انبیاء سابقین کو بھی اللہ نے صرف اصل دین کو قائم کرنے کا حکم دیا تھا اور ان شریعتوں کی اقامت کا حکم نہیں دیا تھا جو ان پر نازل ہوئیں۔ مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو جو حکم دیا وہ یہ تھا کہ تم اصل دین کو قائم کرو باقی رہا وہ شریعت جو ہم نے تم کو دی ہے تو اس کی اقامت کے تم مکلف نہیں ہو ــــ کوئی ذی علم مسلمان اس طرح کی بات سوچ بھی نہیں سکتا چہ جائیکہ اسے بڑے دعوے اور طنطنے سے شائع کرے۔ مفسرین کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہ ہوگی کہ ان کی عبارت سے کوئی شخص یہ مطلب بھی نکال سکتا ہے کہ دین کی اقامت کے حکم سے ان مخصوص شریعتوں کی اقامت کا حکم خارج ہے جو مختلف دور میں مختلف شریعت انبیاء پر نازل ہوتی رہی ہیں۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اقیموا الدین میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور امت مسلمہ کو جس دین کی اقامت کا حکم دیا گیا ہے اس میں شریعت محمدی کی اقامت کا حکم بھی موجود ہے۔

اوپر جو کچھ لکھا گیا وہ دین کی ایک ایسی مسلّم حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن

رہنمائی کے لیے یہ بتا دینا بھی مناسب ہے کہ مفسرین نے اپنا مطلب واضح کرنے کے لیے سورۂ مائدہ کی آیت لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا کا حوالہ بھی دے دیا ہے تاکہ ان کی عبارت کا مطلب اس آیت کی روشنی میں سمجھ لیا جائے اور کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو۔ اس آیت سے پہلے تورات و انجیل کا تفصیلی ذکر کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے:-

وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتَابَ	پھر اے محمد! ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب
بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ	بھیجی جو حق لے کر آئی ہے اور جو تصدیق کرنے
مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ	والی ہے سابقہ کتابوں کی اور ان کے مضامین
فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ	کی محافظ و نگہبان ہے لہذا تم خدا کے نازل کردہ
اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاءَهُمْ عَمَّا	قانون کے مطابق لوگوں کے معاملات کا فیصلہ
جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ لِكُلٍّ	کرو اور جو حق تمہارے پاس آیا ہے اس سے
جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً	منہ موڑ کر ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔ ہم
وَّمِنْهَاجًا	نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک شریعت اور
(مائدہ ۵ : ۴۸)	ایک راہِ عمل مقرر کی۔

اس آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پوری تاکید کے ساتھ اس قانونِ شرعی پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے جو آپ پر نازل ہوا اور اس کے بعد کہا گیا ہے کہ "ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک شریعت اور ایک راہِ عمل مقرر کی۔" اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ سابق انبیاء پر جو شریعتیں نازل کی گئی تھیں وہ ان کے مکلف تھے اور حضورؐ اس شریعت کے مکلف ہیں جو آپ پر نازل کی گئی ہے۔ مفسرین کرام نے "المائدہ" کی جس آیت کا حوالہ دیا تھا اس سے نہ صرف یہ کہ ان کی عبارتوں کا مطلب اچھی طرح واضح ہوتا ہے بلکہ سورۂ شوریٰ کی اس آیت کا مفہوم بھی پوری طرح کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ ٹھیک یہی سورۂ مائدہ کی ترتیب ہمیں سورۂ جاثیہ میں بھی ملتی ہے۔ اس میں بنی اسرائیل کو کتاب حکومت اور نبوت عطا کرنے کا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جو حکم دیا ہے وہ یہ ہے:-

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ	پھر ہم نے تم کو اے محمد! ایک عظیم الشان
مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاءَ	شریعت پر مقرر کیا لہذا تم اسی کی پیروی کرو اور

الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۞ (جاثیہ ۱۸) اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو جو علم نہیں رکھتے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ مفسرین کرام کی مذکورہ بالا عبارات سے دھوکا وہی شخص کھا سکتا ہے جو فنی کتابوں کو سمجھنے کے لیے صرف ذہانت کو کافی سمجھتا ہے۔

گیارہ نہیں اگر ایک سو گیارہ مفسرین کی بھی اس طرح کی عبارتیں نقل کردی جائیں تو ان سے یہ مطلب ہرگز نہیں نکل سکتا کہ اقیموا الدین کے حکم سے شریعت محمدی کی اقامت کا حکم خارج ہے۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم مکلف صرف انہیں باتوں کی اقامت کے تھے جو تمام انبیا کے درمیان متفق علیہ رہی ہیں۔ آپ ان باتوں کی اقامت کے مکلف نہ تھے جو خاص طور سے آپ پر نازل کی گئیں۔ کوئی مخلص مسلمان اس طرح کا مطلب بے شعوری اور ناسمجھی ہی میں نکال سکتا ہے، فہم و شعور کے ساتھ نہیں۔

دوسری سورتوں سے قطع نظر خود سورۂ شوریٰ شاہد ہے کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کریم کے اتباع و اقامت کے مکلف تھے جو دین و شریعت دونوں کا جامع ہے اور یہ کہ آپ صرف انذار و تبشیر پر نہیں بلکہ معاشرے کے درمیان اقامتِ عدل پر بھی مامور تھے۔ اس سورہ کی آیت ۱۵ میں دس ٹکڑے ہیں اور ہر ٹکڑے میں دین کی ایک اہم حقیقت بیان کی گئی ہے۔ اس لحاظ سے آیت الکرسی کے سوا پورے قرآن میں اس کی کوئی نظیر نہیں ہے۔

اس کا ایک ٹکڑا یہ ہے: وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمُ (اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان عدل کروں) اس ٹکڑے کی تفسیر میں امام رازیؒ لکھتے ہیں:

"اس سے مراد فیصلے میں عدل کرنا ہے یعنی جب تم آپس میں جھگڑو اور مجھے حَکَم بناؤ تو میں تمہارے درمیان منصفانہ فیصلہ کروں۔ قفّال نے کہا کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ میں اپنے اور تمہارے درمیان فرق نہ کروں اس طرح کہ جس چیز پر خود عمل نہ کروں اس کا تمہیں حکم دوں یا جس چیز سے تمہیں روکوں اسے خود کروں بلکہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اپنے اور تمہارے درمیان مساوات برتوں اور اسی طرح میں تمہارے بڑوں اور چھوٹوں کے درمیان ان تمام چیزوں میں مساوات برتوں جن کا تعلق اللہ کے حکم سے ہے۔" (تفسیر کبیر جلد ۷)

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے اس ٹکڑے کی تفسیر میں لکھا ہے :-

اور مجھ کو حکم ہے کہ تمہارے درمیان انصاف کروں، جو اختلافات تم نے ڈالے ہیں ان کا منصفانہ فیصلہ دوں اور تبلیغ احکام و شرائع یا فصل خصومات میں عدل و مساوات کا اصول قائم رکھوں ۔

اس کے بعد آگے چل کر ہمارے سامنے آیت ۲۱ آتی ہے :-

اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا	کیا ان کے لیے اور شریک ہیں جنھوں نے
لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْ	ان کے واسطے دین کی راہ نکالی ہے جس کا
بِهِ اللّٰهُ	حکم اللہ نے نہیں دیا ۔

یہ آیت اس لحاظ سے خاص اہمیت رکھتی ہے کہ اس میں وہی صیغہ اور وہی اسلوب اختیار کیا گیا ہے جو شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا الخ میں اختیار کیا گیا ہے ۔ اس سے اس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ ایک دین وہ ہے جو اللہ نے مشروع کیا ہے اور ایک دین وہ ہے جو شیاطین نے گھڑا ہے ۔ سوال یہ کیا گیا ہے کہ اللہ نے جو دین مشروع کیا وہ تو وہ ہے جس کی وحی اس نے اپنے انبیاء کو کی ہے تو ان کے لیے کچھ شرکاء ایسے ہیں جنھوں نے وہ دین مشروع کیا ہے جس کا حکم اللہ نے نہیں دیا ، ظاہر ہے کہ یہاں دین شرک سے صرف مشرکانہ عقائد مراد نہیں ہیں بلکہ وہ پوری مشرکانہ شریعت بھی مراد ہے جو انھوں نے گھڑ لی تھی ۔ مفسر ابن کثیرؒ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے :-

"وہ اس سیدھے دین کی پیروی نہیں کرتے جو اللہ نے تمہارے لیے مشروع کیا ہے بلکہ اس دین کی کرتے ہیں جو ان کے شیاطین جن و انس نے مشروع کیا ہے ۔ انھوں نے ان پر بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام کو حرام قرار دیا ہے اور مردار، خون اور جوے کو حلال قرار دیا ہے اور اسی طرح کی دوسری گمراہیاں اور جہالتیں جو انھوں نے جاہلیت کے زمانے میں گھڑ لی تھیں یعنی اشیاء کی تحریم، باطل عبادتیں اور فاسد اموال ۔"

بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام کی شیطانی شریعت کی تردید سورۂ مائدہ آیت ۱۰۳ میں نازل ہوئی ہے ۔ بحیرہ :- وہ جانور جس کا دودھ مشرکین بتوں کے نام کر دیتے تھے اور کوئی شخص اس کو اپنے کام میں نہ لاتا تھا ۔ سائبہ :- وہ جانور جو بتوں کے نام پر چھوڑ دیا جاتا تھا جیسے ہندوستان میں سانڈ

چھوڑے جاتے ہیں۔ وَصیلہ:۔ وہ اونٹنی جو مسلسل مادہ بچے جنتی اسے بھی بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے تھے۔ حامی:۔ وہ اونٹ جس کے نطفے سے کئی بچے پیدا ہو چکے ہوں، ان کو بھی بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے تھے ۔۔۔ یہاں سوال یہ ہے کہ اگر شیطان کے گھڑے ہوئے دین سے شیطانی شریعت خارج نہیں ہے تو پھر اللہ کے دین مشروع سے شریعتِ الٰہی کیوں خارج ہو جائے گی؟ ابن کثیر کے علاوہ امام رازی شرعوا لھم من الدین کی تفسیر میں لکھتے ہیں:۔

یعنی ان تلک الشرائع باسرھا علی ضد دین اللہ — اس سے مراد یہ ہے کہ تمام گھڑی ہوئی شریعتیں دین الٰہی کی ضد ہیں۔

یہ آیت اور اس کی یہ تفسیریں صاف اشارہ کر رہی ہیں کہ اقیموا الدین میں دین سے شریعت محمدی خارج نہیں ہے۔

اس کے بعد اس سورۃ کی آخری دو آیتیں پڑھیے جن میں کہا گیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندوں کی صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی کر رہے ہیں۔ اس راستے کی طرف جو اللہ، مالک ارض و سماوات کا راستہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ صراطِ مستقیم جس دین کی تعبیر ہے، شریعت اس میں داخل ہے یا اس سے خارج؟

پھر اسی سورۃ میں وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (اور ان کے معاملات باہمی مشورے سے انجام پاتے ہیں) کی آیت بھی ہے جو ہمیشہ سے علمائے امت کے نزدیک، اسلامی حکومت اور اسلامی تنظیم کے لیے ایک اصل عظیم کی حیثیت رکھتی ہے اور جس کی اہمیت اس قدر ہے کہ اس سورت کا نام ہی سورۂ شوریٰ رکھ دیا گیا ہے۔

ان تمام واضح دلائل کے باوجود اگر کوئی شخص یہ رائے رکھتا ہے کہ اقیموا الدین کے حکم سے شریعت اسلامی کی اقامت کا حکم خارج ہے تو وہ یہ رائے رکھنے میں آزاد ہے لیکن اس رائے کو مفسرین کے سر تھوپنا انتہائی غلط بات ہے۔

اب اس سوال پر بھی غور کر لیجیے کہ جب مکے میں پوری شریعت نازل نہیں ہوئی تو پھر ایک مکی آیت سے پوری شریعت کی اقامت کا حکم کیسے نکل آیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہم اس وقت کے مکے میں مقیم نہیں ہیں جب یہ آیت اتری تھی بلکہ سن تیرہ سو تراسی میں زندگی بسر کر رہے ہیں (دانی صلاح۔۔۔

"رُوحُ القرآنْ" مُرتبہٗ ونوبا بھاوے جی

(مولانا صدرالدین اصلاحی)

[میری درخواست پر جناب مولانا صدرالدین اصلاحی نے "روح القرآن" پر یہ قیمتی تبصرہ کیا
ہے چونکہ اس کی ضخامت ایک مقالے کی ہوگئی ہے اس لیے مقالات میں شائع کیا جا رہا ہے۔
توقع ہے کہ کتاب کے آئندہ اڈیشن میں اس سے فائدہ اٹھایا جائے گا۔
"ادارہ"]

کتاب کا اجمالی تعارف ملک کے مشہور سماجی رہنما، گاندھی جی کے جانشین اور بھودان تحریک کے بانی و علم بردار، ونوبا بھاوے جی نے قرآن مجید کا ایک انتخاب تیار کیا ہے، جسے ہندوستان کی ساری زبانوں میں شائع کیے جانے کا پروگرام ہے۔ اس پروگرام کا آغاز انگریزی اور اردو اڈیشنوں سے ہوا ہے، جو اس وقت تک چھپ کر بازار میں آ چکے ہیں۔ اردو اڈیشن کا نام "روح القرآن" ہے۔ سر دست اس میں منتخبہ آیتوں کا صرف ترجمہ دیا گیا ہے لیکن ناشر کی طرف سے یہ اعلان کیا گیا ہے کہ آیندہ اس کتاب کو جب دوبارہ شائع کیا جائے گا تو عربی متن کے ساتھ شائع کیا جائے گا۔ اس وقت چونکہ متن کے بلاک تیار نہیں ہو سکے تھے، اور کتاب کی مانگ بہت شدید تھی، اس لیے مجبوراً صرف اردو ترجمہ ہی شائع کرنے پر اکتفا کرنا پڑا۔

اس کتاب میں قرآن مجید کی چھ ساڑھے چھ ہزار آیتوں میں سے (۱۰۶۵) آیتوں کا انتخاب کر کے انھیں ایک خاص ترتیب سے جمع کر دیا گیا ہے۔ کتاب کے "نو قطعے" (حصے)، تیس باب، نوے فصلیں، اور چار سو ذیلی عنوانات ہیں۔

اصل کتاب صرف دو چیزوں پر مشتمل تھی۔ ایک، تو قرآن کی منتخبہ آیتوں پر (اپنے عربی متن ہی کی

شکل میں، دوسرے ونوباجی کے اپنے قائم کیے ہوئے عنوانوں پر (جو اُن کی مادری زبان مراٹھی میں تھے) اس کے بعد اس کا اردو میں ترجمہ کرایا گیا۔ ترجمے کا کام شری اچیت دیش پانڈے صاحب نے انجام دیا ہے، جو ونوباجی کے پرانے عقیدت مندوں میں ہیں، اور خود اس کتاب کی ترتیب میں بھی ان کے معاون و مددگار رہے ہیں۔ کتاب کے ناشر کا بیان ہے کہ "آپ نے مولانا محمود الحسن، مولانا شبیر احمد عثمانی، شاہ رفیع الدین، مولانا اشرف علی تھانوی، حافظ نذیر احمد، محمد مارما ڈیوک پکتھال اور یوسف علی کے ترجموں نیز تفسیر صغیر اور لغات القرآن کی مدد سے ترجمے کا کام پورا کیا...... آخری مرحلے میں تفسیر ماجدی، ترجمان القرآن اور تفہیم القرآن سے بھی استفادہ کیا گیا۔ بعض مراحل میں ہندوستان کے ممتاز علمائے کرام سے بھی رجوع کیا گیا۔ پریس میں بھیجنے سے پہلے کتاب کا مسودہ بنارس کے دو عالموں، حضرت مولانا عبدالعلیم صاحب نائب شیخ الجامعہ مظہر العلوم اور حضرت مولانا محمد حسن احسن مظہری صدر المدرسین مدرسہ چراغ علوم کی خدمت میں نظر ثانی کے لیے پیش کیا گیا۔ تعلیم و تعلّم کی کئی مصروفیات کے باوجود ان حضرات نے پورے خلوص اور انتہائی توجہ کے ساتھ اس ترجمے کو جانچا۔ آخر میں کشمیر کے مشہور عالم دین حضرت مولانا محمد سعید صاحب مسعودی نے اپنی علالت کے باوجود اس پر نظر ثانی کی۔" اس بیان سے معلوم ہوا کہ ترجمۂ قرآن کی نازک اور اہم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے میں اپنے امکان بھر کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی گئی ہے۔

پانڈے جی نے ترجمے کے علاوہ ایک خدمت اور بھی انجام دی ہے اور وہ یہ کہ شروع میں کچھ ایسے خاص خاص الفاظ کی فرہنگ دے دی ہے جو "روح القرآن" کے ترجمے میں استعمال ہوئے ہیں اور یہ مناسب ہی نہیں بلکہ ضروری بھی تھا، کیونکہ ان الفاظ میں سے اکثر کی حیثیت قرآنی اصطلاح کی ہے۔ اگر ان کے معنی و مفہوم کو نہ کھول دیا جاتا تو عام لوگوں کے لیے قرآنی آیتوں کا مدعا سمجھ لینا بسا اوقات بہت مشکل ہوتا۔

کتاب اصل کی اہمیت

یہ کتاب ایک تصنیف کی حیثیت سے کس پایے کی ہے؟ یہ بحث ہمارے لیے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی۔ لیکن اس لحاظ سے اس کی بڑی اہمیت ہے کہ اس کا تعلق اسلام اور قرآن سے ہے، اور وہ ایک ایسے شخص کی مرتب کی ہوئی

ہے جسے ملک میں بڑا احترام اور خاص مقبولیت حاصل ہے، اور جس نے اسے ساری دنیا کو قرآن کی "روح" سمجھانے کے لیے مرتب کیا ہے اور اس غرض سے ملک کی ایک ایک زبان میں اس کے شائع کیے جانے کا پروگرام ہے۔ گویا یہ صرف ایک تصنیف نہیں ہے، بلکہ ایک مشن ہے ایسا مشن جو اسلام کے نظریاتی مستقبل سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ صورتِ حال تقاضا کرتی ہے کہ اس کتاب کا پورے غور سے اور قدرے تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا جائے، اور یہ معلوم کیا جائے کہ یہ قرآنِ عزیز کا مغز و جوہر بتانے میں کس حد تک کامیاب ہے؟ اور اس کے پڑھنے والے اسلام کو کس حد تک سمجھ سکیں گے؟

قدرتی طور پر یہ جائزہ چار پہلوؤں سے ہوگا:۔

(۱) کتاب کے مؤلف نے قرآن کریم کی "روح" سے دنیا کو متعارف کرانے کے لیے اس کی آیتوں کا جو انتخاب کیا ہے، اور پھر ان منتخبہ آیتوں کو جس طرح مرتب کیا ہے، وہ کہاں تک صحیح، حسب ضرورت اور قابلِ اطمینان ہے؟

(۲) ان کے قائم کیے ہوئے عنوانات کیسے ہیں؟ وہ قرآنی تصورات سے کتنی ہم آہنگی رکھتے ہیں؟

(۳) کتاب کے مترجم، ترجمۂ قرآن کی ذمہ داری سے صحیح طور پر کس حد تک عہدہ برآ ہو سکے ہیں؟

(۴) انھوں نے شروع میں جو فرہنگ دی ہے، اس میں قرآنی الفاظ و اصطلاحات کے معنی و مفہوم کی صحت کا کیا حال ہے؟

آئیے اسی ترتیب سے کتاب کا جائزہ لیں۔

انتخاب

کسی کتاب کی "روح" متعین کرنا اور اس کا خلاصہ و مغز تیار کرنا ایک نازک ذمہ داری کا کام ہے، اور یہ ذمہ داری اس وقت اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے جب یہ کتاب محض ایک کتاب نہ ہو، بلکہ کتابِ الٰہی ہو۔ اس بھاری ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے قطعی ضروری ہے کہ انسان پوری طرح خالی الذہن ہو، اور اپنے ذاتی خیالات و رجحانات سے یکسر بلند ہو کر صرف یہ دیکھے کہ اس کتاب کی بنیادی باتیں فی الواقع کیا ہیں؟ اور پھر انھیں، ان کی پوری حقیقی شان امتیاز کے ساتھ، جوں کا توں تمام بند کر دے۔ اسے اس مسئلے سے ہرگز کوئی بحث نہ ہونی چاہیے کہ ان باتوں میں سے کون سی بات صحیح ہے اور کون سی غلط؟ کیونکہ یہ کام ایک ناقد کا ہے، خلاصہ نگار

کا نہیں۔ اسی طرح اسے اس امر کا بھی کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ ان میں سے اپنی پسندیدہ باتوں کو تو لے اور ناپسندیدہ باتوں کو چھوڑ دے، کیونکہ ایسی شکل میں یہ انتخاب اس کی پسندیدہ باتوں کا انتخاب ہوگا، کتاب کا انتخاب نہ ہوگا۔ کسی کتاب کا انتخاب کرنے والے اور خلاصہ نگار کی حیثیت تو دراصل ایک 'شاہد' کی ہوتی ہے، شاہد کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ اس نے واقعہ کو جس شکل میں ہوتے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے ٹھیک اسی شکل میں لوگوں کے سامنے بیان کر دے اور اس سلسلے میں اپنے جذبات اور رجحانات کو ذرا بھی دخیل نہ ہونے دے۔

خلاصہ نگاری کا یہ ایک ایسا مسلمہ اصول ہے جس سے ذرہ برابر بھی اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔ اس اصول کو سامنے رکھ کر جب ہم 'روح القرآن' کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ یہ کتاب اس اصول پر پوری نہیں اترتی، اور ونوباجی جس وقت قرآن کریم کا مغز و خلاصہ تیار کر رہے تھے، ان کا ذہن دھرم کے بارے میں اپنے ذاتی تصورات سے پوری طرح خالی نہیں رہ سکا تھا، جس کے نتیجے میں قرآن کا یہ 'انتخاب' جو انھوں نے کیا ہے روحِ قرآن اور جوہرِ اسلام کا حقیقی عکاس نہ بن سکا۔ یہ بات کہ موصوف انتخابِ آیات کے وقت خالی الذہن نہیں رہ سکے تھے، اس 'انتخاب' کے مطالعے سے تو واضح ہوتی ہی ہے، خود ان کے اپنے ارشادات میں بھی اس کا کھلا ہوا ثبوت، بلکہ صاف اعتراف موجود ہے۔ چنانچہ کتاب کی 'تمہید' میں وہ فرماتے ہیں:۔

> "سائنس نے دنیا چھوٹی بنائی اور سب انسانوں کو نزدیک لانا چاہتا ہے۔ ایسی حالت میں انسانی سماج فرقوں میں بٹا رہے، ہر جماعت اپنے کو اونچا اور دوسروں کو نیچا سمجھے یہ کیسے چلے گا؟ ...... میری زندگی کے کل کام دلوں کو جوڑنے کے واحد مقصد سے متحرک ہیں۔ اس کتاب کی اشاعت میں وہی تحریک کارفرما ہے۔ (صفحہ ۷، ۸)

اسی طرح 'روح القرآن' کے چھپ چکنے پر جو جشنِ افتتاح منعقد ہوا تھا اس میں تقریر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:۔

> "...... اور گرنتھ صاحب میں ایسے خیالات جگہ جگہ ملتے ہیں کہ چاہے شری وید ہوں یا قرآن شریف ہو، جو لبِ لباب ہے وہ ہے اللہ کا نام، اور وہ جوہر ہم نے لے لیا ہے۔ اس طرح ہندو مسلمان اور بدھ دھرم کا میل جول، تطبیق و توافق، یہاں ہو رہی تھی، یہ آپ سب

جانتے ہیں۔ ہندوستان کی خصوصیت ہے برہم ودّیا۔ ویدک دھرم میں سب چیزیں اہمیت
میں کم تر ہیں، دوئم ہیں، سب سے اہم برہم ودّیا ہے، جو ویدک دھرم کی دنیا کو دین ہے۔
جین دھرم کہتا ہے کہ انسان کی انسانیت دوسرے جانوروں کی حفاظت کرنے میں ہے۔
انھیں اپنی خوراک بنانا غلط ہے۔ یہ بچار جین دھرم کی دنیا کو بڑی دین ہے۔ عیسائی دھرم
نے ہمیں سکھایا کہ غریبوں کی خدمت کرنی چاہیے، رحم کے خیال سے ہمیں غریبوں کی سطح پر اُترنا
چاہیے۔ اس طرح عیسیٰ مسیح نے خدمت کا خاص بچار دنیا کو دیا .... اسی طرح قرآن
شریف کی اپنی ایک خصوصیت ہے۔ یہ سب مل کر ہندوستان کا بچار رچنا اور قوی ہوا۔
ہندوستان کا اسلام دوسری انداز کا ہے .... ہماری زندگی میں ہمیں دل
جوڑنے کے سوا اور کسی چیز میں دلچسپی نہیں ہے۔ ہم نے قرآن شریف کا مطالعہ بھی اسی لیے کیا
ہے۔" (دعوت، رجولائی ۱۹۶۳ء)

ونوبا جی کے ان الفاظ کے اندر دو باتیں بالکل واضح شکل میں موجود ہیں:۔ ایک تو ان کا یہ
تصور کہ کسی جماعت اور دینی گروہ کو دوسرے گروہوں سے اپنے کو اونچا نہیں سمجھنا چاہیے،
بالفاظ دیگر یہ کہ سارے مذاہب کو یکساں برحق سمجھنا چاہیے۔ دوسری یہ کہ قرآن کا مطالعہ اور
اس کا یہ انتخاب انھوں نے بنیادی طور پر اسی مقصد کی خاطر کیا ہے۔ گویا اس انتخاب کے وقت
ان کے سامنے اس امر کی خالص نظری اور بے لاگ تحقیق کرنا نہیں تھا کہ قرآن کی تعلیم فی الواقع
کیا ہے؟ بلکہ اس بات کا ثبوت بہم پہنچانا تھا کہ قرآن اپنی ہی تعلیم کو برحق اور واجب الاتباع
اور دوسرے مذاہب کو غلط یا عنداللہ غیر مقبول نہیں کہتا، اور اس طرح وہ دوسری ملتوں کو
راہِ راست سے بے گانہ قرار دے کر ان کے اور اپنے پیرووں کے درمیان کوئی تفریق قائم کرنے
کے بجائے ان سب کو حق و باطل کے نقطۂ نظر سے ایک سطح پر رکھتا، اور ان کے دلوں کو جوڑنے
کا کام کرتا ہے! ایسی شکل میں ظاہر ہے کہ قرآنِ حکیم کا یہ انتخاب صحیح، امرِ واقعی کے مطابق اور
پوری طرح قابلِ اطمینان اسی وقت ہو سکتا تھا جب کہ مذاہب کے بارے میں یہی نقطۂ نظر خود
قرآن کا بھی ہوتا۔ لیکن چونکہ یہ بات حقیقت سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتی، اس لیے ان کے اس انتخاب
کے بارے میں بھی صحیح اور قابلِ اطمینان ہونے کی توقع باقی نہیں رہ جاتی۔ کیونکہ اس صورتِ حال

کے سامنے آتے ہی ذہن میں قدرتی طور پر یہ خیال ابھر آتا ہے کہ جب یہ انتخاب ایک خاص نقطۂ نظر کو لے کر اور ایک خاص مقصد کی خاطر کیا گیا ہے، خالی الذہن ہو کر اور آزاد تحقیق کے طور پر نہیں کیا گیا ہے، تو وہ لازماً اسی نقطۂ نظر کے رنگ میں رنگا ہوا ہوگا۔ چنانچہ اس 'انتخاب' کا مطالعہ اس خیال کی پوری پوری توثیق کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر چند خاص امور کو دیکھیے۔

(۱) اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات سے تعلق رکھنے والی آیتوں کا ایک بہت بڑا انتخاب اس کتاب میں موجود ہے، جن میں توحید اور ردِ شرک سے تعلق رکھنے والی آیتیں بھی بکثرت شامل ہیں، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ دین میں صفاتِ الٰہی، بالخصوص توحید کی بنیادی اہمیت کے پیش نظر ایسا ہونا ہی چاہیے تھا، مگر یہ انتخاب اس قدر طویل ہونے کے باوجود جامع نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں شرک کا ردّ و ابطال کرنے والی صرف ان آیتوں پر اکتفا کر لیا گیا ہے جن میں 'شفعاء' اور 'شرکاء' کے الفاظ آئے ہیں، ان آیتوں کو مطلق نہیں لیا گیا ہے جن میں 'اصنام' یا 'اوثان' (بتوں اور مورتیوں) کے الفاظ مذکور ہیں۔ جیسے سورۂ حج کی آیت نمبر ۳۰ "........ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ" الخ اور سورۂ صافات کی آیت ۹۵ قَالَ أَتَعْبُدُونَ مَا تَنْحِتُونَ۔ اور سورۂ ابراہیم کی آیت ۳۵ "........ وَاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ أَنْ نَعْبُدَ الْأَصْنَامَ" وغیرہ۔ اسی طرح سورۂ مائدہ کی آیت لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ بھی انتخاب میں نہ آسکی، جو اوتار واد کے عقیدے کی تردید کرتی ہے اگرچہ اس سے انکار نہیں کہ ایسی دوسری بہت سی آیتیں (خصوصاً سورۂ اخلاص کی آیت لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ) اس انتخاب میں موجود ہیں، جن سے اس عقیدے کا قرآن کی نظروں میں باطل ہونا معلوم ہو جاتا ہے، لیکن سورۂ مائدہ کی مذکورہ بالا آیت اس بارے میں جس نمایاں پوزیشن اور راست نوعیت کی حامل تھی اس کے پیش نظر اس کا شامل انتخاب ہونا بہر حال ضروری تھا۔

(۲) عقیدۂ رسالت اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق رکھنے والی جن آیتوں کو منتخب کیا گیا ہے ان کی تعداد بھی اگرچہ اچھی خاصی ہے، مگر ان سے دعوت قرآنی کی اس اہم ترین اساس کے بارے میں جو واقفیت حاصل ہوتی ہے وہ اس واقفیت سے بھی زیادہ ناقص رہ جاتی ہے جو اس کتاب کے مطالعے سے قرآنی عقیدۂ توحید کے بارے میں حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ ان منتخبہ

آیتوں میں وہ آیتیں کہیں نظر نہیں آتیں جن میں رسالت محمدی کے خصوصی امتیازات بیان ہوئے ہیں۔ مثلاً سورۂ احزاب کی آیت ختم نبوت "وَمَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیِّیْنَ" اور سورۂ آل عمران کی آیات "اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ" ــــ اور ــــ "وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ" جن میں اس امر کا اعلان ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری نبی ہیں، آپؐ کے بعد وحی و نبوت کا سلسلہ ختم کر دیا گیا ہے، اور یہ کہ آپؐ کا لایا ہوا دین ہی اب اللہ کے حضور پسندیدہ، منظور شدہ اور مقبول ہے، اس کے سوا اب کوئی دوسرا دین اللہ کی طرف سے منظور شدہ اور قابل اتباع باقی نہیں رہ گیا ہے۔ بلا شبہ اس انتخاب میں ایسی آیتیں بھی موجود ہیں جن میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عالمی پیغمبر ہونے کا ذکر ہے، مگر ایک تو مرتب کے اپنے قائم کیے ہوئے عنوانات میں (جیسا آگے چل کر معلوم ہوگا) اس طرح کا کوئی عنوان موجود نہیں جس سے آں حضرتؐ کی اس ممتاز اور عظیم حیثیت کی طرف لوگوں کا ذہن آپ سے آپ منتقل ہو جائے، دوسرے عالمی پیغمبر ہونے کا مفہوم جہاں یہ ہے کہ آپؐ ہی ساری دنیا کے لیے واجب الاتباع رسول ہیں، وہیں اس کا دوسرا مفہوم یہ بھی لیا جا سکتا ہے کہ "آپؐ بھی ساری دنیا کے لیے رسول ہیں" قرآن نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے معنوں میں عالمی پیغمبر قرار دیا ہے، جب کہ کتنے ہی لوگ اس لفظ کے دوسرے ہی معنی مراد لیتے ہیں، اور اس بات سے شاید ہی اختلاف کیا جا سکے کہ دنو باجی ایسے ہی لوگوں میں شامل ہیں۔ ان حقائق کی موجودگی میں مذکورہ بالا آیتوں کا شامل انتخاب نہ ہونا بلاوجہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ حالانکہ ان آیتوں کے بغیر روحِ قرآنی کا تعارف ہرگز مکمل نہیں ہو سکتا۔

(۳) بعض مقامات پر ایسا بھی کیا گیا ہے کہ آیت کے کچھ حصے کو لے لیا گیا ہے اور باقی کو حذف کر کے اس کی جگہ نقطے لگا دیے گئے ہیں۔ یہ بات اگر صرف طوالت سے بچنے کے لیے اختیار کی گئی ہے تب تو خیر چنداں قابل اعتراض نہیں۔ لیکن اگر ایسا اس لیے کیا گیا ہے کہ حذف کردہ حصہ مرتب کی نگاہ میں دین کی روح سے مناسبت نہیں رکھتا تھا تو قطعاً یہ ایک قابل اعتراض بات ہے، اور ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ بعض مقامات پر حقیقت واقعہ کچھ ایسی ہی معلوم ہوتی ہے، خصوصاً سورۂ فتح کی آخری آیت "مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ ......" الخ کے معاملے میں، جس کا

صرف "یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ" تک کا ترجمہ دیا گیا ہے، اور آگے کے دو تین لفظوں لِیَغِیْظَ بِهِمُ الْکُفَّارَ کا ترجمہ حذف کر دیا گیا ہے، حالانکہ اس ٹکڑے کے بغیر بات ادھوری رہ جاتی ہے، اور صرف ان تین لفظوں کے ترجمے سے کسی طوالت کا بھی کوئی سوال پیدا نہیں ہو رہا تھا۔

عنوانات عنوانات چونکہ ونوباجی کے اپنے قائم کیے ہوئے ہیں، اس لیے ان کی ایک خاص اہمیت ہے، اور اس بات کا اندازہ لگانے کے لیے، کہ موصوف نے قرآن کریم کا انتخاب کسی ذہنی پس منظر کے ساتھ کیا ہے، یہ عنوانات سب سے زیادہ فیصلہ کن عنصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان عنوانوں کا جائزہ لیجیے تو آپ کو درج ذیل باتیں نظر آئیں گی:۔

(۱) اللہ اور صفاتِ الٰہی کے مباحث میں اگرچہ 'توحید' کا عنوان بھی موجود ہے اور 'شریکوں کی نفی' کا عنوان بھی، مگر مورتی پوجا کی نفی، اور اوتار واد کی نفی، جیسے اہم عنوان موجود نہیں ہیں۔

(۲) صاحبِ قرآن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جو عنوانات قائم کیے گئے ہیں ان میں، آخری پیغمبر، عالمی پیغمبر، اور سب کے لیے واجب الاتباع پیغمبر، جیسے عنوانوں کو کوئی جگہ نہیں دی گئی ہے۔

(۳) سورۂ نساء کی آیات ۱۵۰ تا ۱۵۲ (اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ الخ) کو "مذہبی رواداری" کے زیرِ عنوان درج کیا گیا ہے، حالانکہ ان آیتوں میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اس کا "مذہبی رواداری" کے مسئلے سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں۔ یہ آیتیں ان یہودیوں اور عیسائیوں کو خطاب کر رہی ہیں جو اپنے نسلی (یعنی اسرائیلی) پیغمبروں کی نبوت پر تو ایمان رکھتے تھے مگر محض خاندانی تعصب کی وجہ سے نبوتِ محمدی پر ایمان لانے سے انکار کر رہے تھے۔ انھیں ان آیتوں کے ذریعہ متنبہ کیا گیا کہ اگر تم اللہ کے دوسرے رسولوں کو مانتے ہو، مگر اس کے ایک رسول کو نہیں مانتے تو یہ دراصل نہ اللہ کا ماننا ہے، نہ اس کے رسولوں کا ماننا ہے، بلکہ محض اپنی ہوائے نفس کا ماننا ہے۔ اس طرح کا ایمان، ایمان نہیں، بلکہ ایمان کا فریب ہے، یہ اللہ سے بغاوت اور حقیقی کفر ہے۔ خدا پر ایمان تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے جس بندے کو بھی منصبِ رسالت پر سرفراز کر دے اسے اللہ کا رسول مان لیا جائے، خواہ اس کا تعلق کسی نسل، کسی خطۂ ارض اور کسی قوم سے ہو۔ ظاہر ہے کہ اس ارشاد کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے، اور نہ ہو سکتا ہے، کہ زبان سے ماننے کی حد تک

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بھی اللہ کا رسول مان لو، اس کے بعد عملی پیروی جس رسول کی بھی چاہو کرتے رہو، کچھ ضروری نہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو رسولِ خدا ماننے کے بعد پیروی بھی انہی کی کرو! یہ بات عقل و منطق کے بھی بدیہی خلاف ہے اور قرآن کی بے شمار تصریحات کے بھی۔ چنانچہ اگر قرآن کا یہود و نصاریٰ سے صرف اتنا ہی مطالبہ ہوتا کہ وہ زبانی اعتراف و اعتقاد کی حد تک رسالتِ محمدی کو بھی مان لیں (اور عملی پیروی بدستور تورات و انجیل اور موسیٰؑ و عیسےٰؑ ہی کی کرتے رہیں) تو وہ انھیں اپنے اوپر ایمان لانے کی دعوت نہ دیتا، ان سے اپنی اور اپنے لانے والے رسول کی پیروی کا بار بار مطالبہ نہ کرتا، یہ ہرگز نہ کہتا کہ اب اللہ کے نزدیک مقبول دین صرف اسلام ہے ___ لیکن ونوباجی نے ان آیتوں کا مفہوم کہیں ایسا ہی تو نہیں سمجھ رکھا ہے؟ اگر نہیں، تو انھوں نے انہیں "مذہبی رواداری" کے زیرِ عنوان آخر کیسے درج کر دیا؟

(۴) ایسی آیتوں پر، جن میں انصاف، صلح پسندی، عفو و درگذر اور تحمل سے کام لینے کی ہدایت کی گئی ہے، ایک جگہ (صـ۱۵۷ پر) "اہنسا پسند" کا، دوسری جگہ (صـ۲۱۲ پر) "اہنسا (بے آزاری)" کا، اور تیسری جگہ (صـ۲۱۶ پر) "اہنسائی عقیدہ" کا عنوان قائم کیا گیا ہے، حالانکہ 'اہنسا' اور چیز ہے اور عفو و درگزر اور تحمل و صلح پسندی بالکل دوسری چیز ہے۔ 'اہنسا' ایک خاص اصطلاح ہے، اور اس کا مدعا یہ ہے کہ کسی حال میں بھی قوت کا استعمال نہ کیا جائے لیکن قرآن نے جس عفو و درگذر اور تحمل و صلح جوئی کی تلقین کی ہے اس کا مفہوم و منشاء اتنا وسیع و ہمہ گیر ہرگز نہیں ہے۔ چنانچہ بعض خاص حالات میں وہ قوت کے استعمال اور جنگ کو نہ صرف یہ کہ جائز قرار دیتا ہے، بلکہ اس کی زبردست تلقین کرتا ہے۔ ایسی حالت میں عنوانوں کی فہرست میں 'اہنسا' کے عنوان کے لیے کوئی جگہ نہیں ہو سکتی تھی۔

(۵) سورۂ حدید کی آیت "...... وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا الخ" کو نقل کر کے اس پر "غیر مستند رہبانیت" کا عنوان لگایا گیا ہے (صـ۲۳۱) جسے پڑھ کر خیال ہو سکتا ہے کہ قرآن کے نزدیک کوئی رہبانیت 'مستند' بھی ہے۔ حالانکہ یہ خلافِ واقعہ بات ہے۔ اس لیے یہ عنوان اس طرح ہونا چاہیے تھا: "رہبانیت غیر مستند"

(۶) اسی طرح صـ۲۲۵ پر ایک عنوان ہے "ترکِ لذات" اس کو دیکھ کر یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ

قرآن نے ترکِ لذات کی تعلیم دی ہے، حالانکہ یہ بات حقیقت سے مطابقت نہیں رکھتی۔ قرآن اور
اسلام نے جس چیز کی تعلیم دی ہے وہ لذت پرستی کا ترک ہے نہ کہ نفسِ لذت کا ترک۔

(۷) ص۴۲۲ پر سورۂ احزاب کی آیت لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ کا
ترجمہ دے کر اس پر "عبادت کا بہترین نمونہ" کا عنوان لگایا گیا ہے، جو آیت کے منشا سے پوری طرح
مطابقت نہیں رکھتا۔ یہ آیت 'عبادت' (اپنے عام مفہوم میں) کے ذکر و بیان کے سلسلے میں نہیں آئی
ہے، بلکہ میدانِ جہاد میں ثابت قدمی اور جان بازی دکھانے کی تلقین و تاکید کے سلسلے میں آئی ہے۔
اس لیے عنوان "اللہ کی راہ میں ثابت قدمی کا بہترین نمونہ" ہونا چاہیے تھا۔

(۸) بعض عنوانات ایسے بھی ہیں جو متعلقہ آیتوں سے کوئی ربط نہیں رکھتے۔ مثلاً ص۱۹ پر ایک
ذیلی عنوان ہے "مخالف حالات میں ہدایت کرنے والے"۔ اور یہ ذیلی عنوان جس باب کے اندر ہے اس
کا نام "رسول" ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرتب کے نزدیک وہ آیت، جو انھوں نے اس ذیلی
عنوان کے تحت درج کی ہے، رسولوں کی صفات سے تعلق رکھتی ہے۔ حالانکہ یہ آیت (وَإِذْ
قَالَتْ أُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُونَ الخ۔ اعراف) کسی رسول کے بارے میں نہیں بلکہ پیروانِ موسیٰ کے ایک
خادمِ حق گروہ کے بارے میں وارد ہوئی ہے۔

(۹) ص۱۹۵ پر ایک عنوان ہے "کھانے میں اللہ کا نام" اور اس کے تحت سورۂ انعام کی آیت ۱۱۹
(فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ الخ) اور آیت ۱۲۱ (وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ
يُذْكَرِ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ الخ) درج کی گئی ہیں، حالانکہ یہ آیتیں عام کھانوں سے نہیں بلکہ ذبیحے کے
مسئلے سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس لیے عنوان بھی اسی کے مطابق قائم کرنا چاہیے تھا۔

(۱۰) ص۴۳۲ پر سورۂ مومن کی آیت ۱۵ (رَفِيعُ الدَّرَجَاتِ ذُو الْعَرْشِ يُلْقِي الرُّوحَ)
درج کر کے اس پر "الہام" کا عنوان لگایا گیا ہے، جب کہ عنوان 'وحی' یا 'وحی بھیجنے والا' ہونا چاہیے تھا۔
'الہام' اور شے ہے اور 'وحی' دوسری چیز ہے۔

(۱۱) بعض عنوانوں کے الفاظ غیر عربی ناظرین کے لیے بالکل ناقابلِ فہم ثابت ہوں گے۔ مثلاً "امن حسنة"
(ص۹۶) اور "قلِ غمة" (ص۲۲۱)

<u>ترجمہ</u>: آیاتِ قرآنی کا ترجمہ، جیسا کہ ناشر نے مقدمے میں خود وضاحت کر دی ہے، بالعموم [illegible] ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ جب یہ کتاب اس غرض سے مرتب کی گئی تھی کہ وہ "خواص کے علاوہ عوام کے لیے بھی مفید ہو اور مطالعہ و تلفظ میں زیادہ سے زیادہ آسانی ہو" تو ترجمے کو اتنا لفظی نہیں رکھنا چاہیے تھا جتنا کہ رکھا گیا ہے، بلکہ اسے قدرے بامحاورہ اور سلیس و عام فہم ہونا چاہیے تھا۔ تاکہ عام لوگ قرآن کریم کا فی الجملہ مقصد سمجھ لینے میں دشواری نہ محسوس کرتے۔ اس غرض کے لیے توضروری مقامات پر قوسین میں وضاحتی الفاظ بھی بڑھا دیے جانے چاہئیں تھے۔ چنانچہ بعض آیتوں کے ترجمے میں ایسا کیا بھی گیا ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ دوسری آیتوں کے سلسلے میں بھی یہی طریقہ کیوں نہیں اختیار کیا گیا۔ موجودہ ترجمے کا حال تو یہ ہے کہ کتنے ہی مواقع پر عام لوگوں کی سمجھ میں کچھ نہ آئے گا کہ آخر آیت کیا کہنا چاہتی ہے۔

رہ گیا ترجمے کی صحت کا معاملہ، تو ہمیں یہ دیکھ کر بڑا افسوس ہوتا ہے کہ اس میں بکثرت غلطیاں رہ گئی ہیں، بلکہ کئی مقامات پر تو یہ غلطیاں انتہائی فاحش قسم کی ہیں۔ اتنی غلطیوں کا رہ جانا قابلِ افسوس ہونے کے ساتھ ساتھ اس بنا پر باعثِ حیرت بھی ہے کہ مترجم نے ترجمے کی صحت کا بڑا کافی اہتمام کیا تھا، اور علماء سے اس کی دو دو بار نظر ثانی بھی کرائی تھی۔ غالباً اس صورت حال کی ایک وجہ سہوِ کتابت بھی ہے۔ نمایاں غلطیاں ملاحظہ ہوں :-

(۱) سورۂ انعام کی آیت ۵۹ کے آخری الفاظ "اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ" کا ترجمہ "....مگر بیان کرنے والی کتاب میں نہیں ہے" درج ہے (ص۵۹) حالانکہ ترجمہ "....مگر بیان کرنے والی کتاب میں موجود ہے" ہونا چاہیے تھا۔

(۲) سورۂ کہف کی آیت ۱۰۹ میں "کَلِمٰتُ رَبِّیْ" کا ترجمہ "میرے رب کی صفتوں" کیا گیا ہے (ص۱۹۲) جبکہ "میرے رب کی باتیں" ہونا چاہیے تھا۔ 'کلمات' کے معنی 'صفات' کے نہیں ہوتے۔

(۳) سورۂ حشر کی آخری آیت کے الفاظ "لَہُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی" کا ترجمہ "اس کے اچھے اچھے نام ہے" کیا گیا ہے۔ (ص۵۴۲) حالانکہ ترجمہ یوں ہونا چاہیے تھا "اسی کے لیے ہیں سارے اچھے نام"۔

(۴) سورۂ قدر کی آیت "لَیْلَۃُ الْقَدْرِ خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَہْرٍ" کے ترجمے میں "لَیْلَۃُ الْقَدْرِ" کے معنی "اللہ کی رات" درج ہیں جب کہ "قدر والی رات" یا "فضیلت والی رات" ہونا چاہیے تھا۔

(۵) سورۂ فلق کی آخری آیت کے ترجمے میں "شَرِّ حَاسِدٍ" کے معنی "حاسد کی بدی" کے بجائے

"حاسدوں کی بدی" درج ہو گئے ہیں۔ (صلا۱۳)

(۶) سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۱۱۰ کے ٹکڑے "اَیًّا مَّا تَدۡعُوۡا فَلَهُ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰى" کا ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے "جو بھی کہہ کر پکارو گے اس کے سبھی نام اچھے ہیں" (صلا۱۱) جب کہ ہونا اس طرح چاہیے تھا "جو بھی کہہ کر پکارو سارے اچھے نام اسی (ایک ذات) کے ہیں"

(۷) سورۂ انعام کی آیت ۱۶۲ کے ترجمے میں "نُسُک" کے معنی "عبادت" کے دیے گئے ہیں (صلا۱۱) اگرچہ ازروئے لغت اس ترجمے کی بھی گنجائش ہے، لیکن یہاں اس لفظ کا صحیح ترجمہ "قربانی" ہے۔

(۸) سورۂ مدثر کی آیت "قَالُوۡا لَمۡ نَكُ مِنَ الۡمُصَلِّيۡنَ" کا ترجمہ "وہ کہیں گے ہم صلوٰۃ کرنے والوں میں سے نہ تھے" کیا گیا ہے (صلا۱۴) یہ ترجمہ بڑا عجیب سا ہے۔ یوں تو مترجم نے نہ جانے کس بنا پر ایک آدھ مقامات کو چھوڑ کر باقی ہر جگہ لفظ صلوٰۃ کا ترجمہ "صلوٰۃ" ہی رہنے دیا ہے اور "اقامتِ صلوٰۃ" کے معنی "صلوٰۃ قائم کرنے" درج کیے ہیں، مگر اس آیت میں "نماز پڑھنے والے" کے بجائے "صلوٰۃ کرنے والے" کا جو ترجمہ کیا گیا ہے وہ بالکل ہی بھونڈا ہو کر رہ گیا ہے۔

(۹) سورۂ بقرہ کی آیت لَيۡسَ الۡبِرَّ .... الخ کے ترجمے میں "بِرّ" کے معنی "مذہب" بتلائے گئے ہیں (صلا۱۳) حالانکہ "بِرّ" کے معنی "نیکی" یا "ادائے حقوق" کے ہوتے ہیں، نہ کہ مذہب کے۔

(۱۰) سورۂ نساء کی آیت ۱۵۲ کے الفاظ "وَلَمۡ يُفَرِّقُوۡا بَيۡنَ اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ" کا ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے "اور رسولوں میں کوئی فرق نہیں کیا" (صلا۹۱) یہ ترجمہ بظاہر غلط نہ ہونے کے باوجود سخت غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے۔ کیونکہ "کوئی فرق نہ کرنے" کے معنی اردو زبان اور محاورے میں ہر حیثیت سے یکساں سمجھنے یا ماننے کے ہوتے ہیں۔ اس لیے اس ترجمے کو پڑھ کر لوگوں کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ قرآن مجید سارے پیغمبروں کو ہر حیثیت سے یکساں قرار دیتا ہے، اور جس پیغمبر اور کتاب کی بھی پیروی کی جائے اس کے نزدیک یہ ایک حق پسندانہ رویہ ہوگا، واضح لفظوں میں یہ کہ وہ سارے مذاہب کو یکساں برحق اور عنداللہ مقبول بتاتا ہے، حالانکہ یہ سرتاسر ایک خلافِ واقعہ بات ہے۔ اس خیال کی طرف ذہنوں کا منتقل ہونا اس لیے اور بھی قرین قیاس ہے کہ مؤلف نے اس آیت کو "مذہبی رواداری" کے زیرِ عنوان درج کیا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ آیت کے زیرِ بحث ٹکڑے کا ترجمہ ان لفظوں میں نہ کیا جائے جن میں کہ مترجم نے کر رکھا ہے، بلکہ کچھ اس طرح کیا جائے "اور وہ

رسولوں میں تفریق نہیں کرتے (کہ کسی کی رسالت کو مانیں اور کسی کا انکار کر دیں)۔

(۱۱) سورۂ بقرہ کی آیت ۲۱۹ کے ترجمے میں وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا کا ترجمہ "گران کا نقصان ان کے فائدے سے بہت زیادہ ہے" کیا گیا ہے (ص۲۶۵) حالانکہ اثم کے معنی گناہ کے ہوتے ہیں نہ کہ نقصان کے۔ اس لیے ترجمہ اس طرح ہونا چاہیے تھا "مگر ان کا گناہ ان کے فائدے سے زیادہ ہے"۔

(۱۲) سورۂ احزاب کی آیت ۷۲ کے آخری ٹکڑے "اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا" کا ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے "واقعی وہ بڑا بے باک اور بڑا ہی نادان ہی ہے" (ص۲۷۰) اس ترجمے میں ایک تو "ہی" کا لفظ زیادہ ہے، دوسرے 'ظلوم' کے معنی 'بے باک' بتائے گئے ہیں جو صحیح نہیں۔

(۱۳) سورہ لیل کی آیت "وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى" کے ترجمے میں "حُسنیٰ" کے معنی 'بھلی بات' کے بجائے صرف 'بات' درج ہیں۔ (ص۲۸۵)

(۱۴) سورۂ صافات کی آیت ۷۵ "وَلَقَدْ نَادٰىنَا نُوْحٌ الخ" کا ترجمہ "ہم نے نوح کو پکارا الخ" کر دیا گیا ہے (ص۲۹) حالانکہ "نوح نے ہمیں پکارا" کرنا چاہیے تھا۔

(۱۵) اَلْمَسْجِدُ الْاَقْصٰى" ایک مسجد کا نام ہے اس لیے اس کا ترجمہ نہ کیا جانا چاہیے تھا، مگر اس کا بھی ترجمہ (دور کی مسجد) کر دیا گیا ہے (ص۳۱۲)

(۱۶) سورۂ تکویر کی آیت ۱۴ "عَلِمَتْ نَفْسٌ الخ" کے ترجمے کے شروع میں "اور" کا لفظ بالکل غلط طور سے شامل کر دیا گیا ہے (ص۳۰)

(۱۷) سورۂ انشقاق کی آیت ۷ "فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ الخ" کا ترجمہ "پس جب اس کا اعمالنامہ اس کے دائیں ہاتھ میں دیا گیا" کیا گیا ہے (ص۳۵۶) حالانکہ "پس جب اس کا" کی جگہ "پس جس کا" ہونا چاہیے تھا۔

ترجمے کی غلطیوں کے علاوہ بعض مقامات پر کچھ الفاظ کے ترجمے چھوٹ بھی گئے ہیں۔ مثلاً ص۲۶ پر سورۂ عبس کی آیات ۲۴ تا ۳۲ کے ترجمے میں آیت ۲۸ (وَعِنَبًا وَّقَضْبًا) کا ترجمہ، ص۱۲۱ پر سورۂ مائدہ کی آیت ۶۷ کے ترجمے میں "مِنَ النَّاسِ" کا ترجمہ اور ص۲۶ پر سورۂ مجادلہ کی آیت ۹ کے ترجمے میں "مَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ" کا ترجمہ۔

ص۲۳ پر "وَهُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى" کے ترجمے میں "شعریٰ" کی "شعراء" چھپ گیا ہے۔

فرہنگِ الفاظ ترجمے کی طرح الفاظ کی فرہنگ بھی نظرثانی اور اصلاح کی محتاج ہے کیونکہ اس میں متعدد الفاظ کے معانی کہیں ناقص اور کہیں یکسر غلط درج ہیں۔ مثلاً:۔

(۱) لفظ "آیت" کے معانی بیان کرتے ہوئے اس کے ایک معنی اس طرح لکھے گئے ہیں "قرآن مجید کے الفاظ کا ایسا فقرہ جو ایک مفہوم ادا کردے" (ص۱) حالانکہ 'آیت' قرآن مجید کے ایسے متعینہ ٹکڑے کو کہتے ہیں جس کا تعین اللہ تعالےٰ نے خود کر رکھا ہے۔ قرآن کا یہ متعینہ ٹکڑا ضروری نہیں کہ ایک پورا فقرہ (یعنی جملہ) ہو، یا صرف ایک ہی جملہ ہو، بلکہ وہ ایک فقرے اور ایک پوری بات کا محض ایک جزو بھی ہو سکتا ہے اور کئی فقروں اور جملوں کا جامع بھی ہو سکتا ہے۔

(۲) 'ابلیس' کے معنی "رحمتِ الٰہی سے ناامید" بتائے گئے ہیں۔ بلاشبہ اس لفظ کے لغوی معنی یہی ہیں لیکن قرآن مجید میں یہ لفظ ایک خاص ہستی کے علم (نام) کی حیثیت سے استعمال کیا گیا ہے نہ کہ صرف اپنے لغوی معنی میں، اس لیے اس کا لغوی ترجمہ کرنے کے بجائے یہ بتانا چاہیے تھا کہ یہ فلاں شخصیت کا نام ہے۔

(۳) 'اسلام' کے معنی اس طرح بیان کیے گئے ہیں "اللہ پر ایمان لانا اور اس پر مستحکم رہنا" لیکن یہ ایمان اور استقامت کے معنی ہیں نہ کہ اسلام کے۔ اسلام کے معنی اللہ کے حضور سر اطاعت خم کر دینے کے، اور احکامِ الٰہی کے مطیع و منقاد ہو جانے کے ہیں۔

(۴) 'اخلاص' کے معنی "اللہ ہی کے لیے کیے گئے نیک عمل" نہیں ہوتے، جیسا کہ لکھا گیا ہے، بلکہ دل کی سچائی اور خلوص کے ہوتے ہیں، اور اس کے ساتھ 'للہ' کی قید لگ جاتی ہے تو اس وقت اس کے معنی اپنے عمل اور اپنی بندگی کو اللہ ہی کے لیے خالص اور بے آمیز کر دینے کے ہوتے ہیں۔

(۵) 'ایمان' کے معنی "یقین، تصدیق، اعتقاد" اگرچہ پوری طرح صحیح نہیں، تاہم انہیں کچھ ایسا غلط بھی نہیں کہا جا سکتا، لیکن 'ایمان' کے معنی "ہوائے نفس کو اللہ کے تابع کرنا" کسی طرح صحیح نہیں، یہ اسلام کے معنی ہیں نہ کہ 'ایمان' کے۔

(۶) 'سرق' کا لفظ لکھ کر اس کے معنی اس طرح بیان کیے گئے ہیں "اس چیز کو لینا یا رکھنا جس چیز کو لینے کا حق نہ ہو۔ حاجت سے زیادہ رکھنا" ایک تو یہ لفظ ہی غلط لکھا گیا ہے، اسے 'سرقہ' لکھنا چاہیے تھا، دوسرے اس کے معنی بھی یکسر غلط دیے گئے ہیں بالخصوص "حاجت سے زیادہ رکھنا" تو سرقہ کا بالکل ہی بے بنیاد اور عجیب مفہوم ہے۔ 'سرقہ' کے معنی 'چوری' کے ہوتے ہیں، 'چوری' اسی مفہوم میں جو کہ اس لفظ

کا جانا پہچانا اور متعارف مفہوم ہے، نہ کسی اور مفہوم میں۔

(۷) 'سلامتی' کے معنی 'اطاعت، اپنے تئیں اللہ کو سونپنا' وغیرہ بتائے گئے ہیں، حالانکہ یہ 'اسلام' کے معنی ہیں نہ کہ سلامتی کے۔

(۸) 'سود' مطلق 'بڑھوتری' زیادت، نمو' کو نہیں کہتے، جیسا کہ اس کتاب میں درج ہے، بلکہ اس مخصوص بڑھوتری کو کہتے ہیں جو قرض دینے والا اپنے راس المال کے علاوہ قرض دار سے وصول کرتا ہے۔

(۹) 'نبی' اس شخص کو کہتے ہیں جس پر اللہ اپنی وحی بھیجتا اور اپنا کلام نازل فرماتا ہے تاکہ وہ اسے دوسروں تک پہنچا دے۔ "اللہ کا پیغام کھول کر بیان کرنے والا' غیب کی خبریں بتانے والا" نبی کی قرآنی اصطلاح کا نہایت ناقص مفہوم ہے۔

(۱۰) 'وحی' کا مطلب بیان کرتے ہوئے لکھا گیا ہے "وہ کلامِ الٰہی جس کا القا انبیاء اور اولیاء کو ہوتا ہے" یہ 'وحی' کے انتہائی غلط معنی ہیں۔ 'اولیاء' پر وحی نہیں آتی، وحی اور کلامِ الٰہی کا نزول صرف انبیاء کے لیے مخصوص ہے۔ 'ولایت' ایک اکتسابی شے ہے، جب کہ 'نبوت' سرتاسر 'وہبی' چیز ہے، ولایت صرف ایک وصف ہے جب کہ نبوت ایک منصب بھی ہے، نبوت کے مقابلے میں ولایت بالکل ادنیٰ شے ہے، لیکن 'وحی' کی اس تعریف نے جو اس کتاب میں درج ہے، دونوں کو ہم رتبہ بلکہ ہم معنی بنا دیا ہے، اور یہ اسلامی عقیدے کی رو سے کھلی ہوئی گمراہی ہے۔

اس تنقید میں بظاہر شدت اور سخت گیری نظر آئے گی، مگر دین اور قرآن کا معاملہ ہونے کی بنا پر ہم نے اپنے کو اس کے لیے بالکل مجبور پایا۔ ویسے ہمارا احساس یہی ہے کہ اس کتاب کے مرتب، مترجم اور ناشر، سب نے اخلاص اور عقیدت کے ساتھ قرآن کریم کی خدمت کرنا چاہی ہے، جس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں، اور ہمارا یہی احساس تھا جس کے تحت ہم نے اس کتاب پر اتنی تفصیل سے تبصرہ کیا ہے، اور اس توقع کے ساتھ کیا ہے کہ اگلے ایڈیشن کو اس طرح کی ساری خامیوں سے پاک کر دیا جائے گا۔

فوز و فلاح اور قرآن کریم

(مولانا محمد سلیمان، فرخ آبادی)

ف،و،ز کا مادہ ذیل کے معانی پر مشتمل ہے

۱۔ فَازَ بِالْاَمرِ ۔ ظَفَرَ بِہٖ ۔ کامیاب ہوا۔ فتح حاصل ہوئی، مہم سر کرلی، مقصود حاصل ہوا۔

۲۔ فَازَ مِنَ الْمَکْرُوْہِ ۔ نجات پائی، ناگواریوں سے بچ گیا۔ ہلاکتوں سے کامیاب گزر گیا۔

۳۔ فَازَ الرَّجُلُ حشر خیز بربادیوں سے بال بال بچ گیا۔

۳۔ فَازَ الرَّجُلُ ۔ تباہ ہوگیا۔ برباد ہوگیا۔ مٹ گیا۔ ہلاک ہوگیا۔ کہیں کا نہ رہا۔

۴۔ فَوَّزَ الرَّجُلُ ۔ گزر گیا۔ موت کی سرحد پار کر گیا۔

۵۔ فَوَّزَ الطَّرِیْقُ ۔ راہ کھل گئی۔ راستہ واضح ہوگیا۔ شاہراہ سامنے آگئی۔

۶۔ اَلْمَفَازَۃُ ۔ نجات گاہ۔ جائے فلاح۔ ہلاکتوں کا گھر۔ بربادیوں کا ٹھکانہ۔ ایسا بیابان جنگل اور لق و دق صحرا جہاں پانی میسر نہ ہو۔

اور ف، ل، ح کا مادہ ذیل کے معانی پر مشتمل ہے۔

۱۔ فَلَحَ الْاَرْضَ ۔ زمین کو پھاڑا۔ کھیت کو جوتا۔

۲۔ فَلَحَ فُلَانًا ۔ اس کے ساتھ مکر و فریب کیا۔

۳۔ فَلَحَ فَلَاحَۃً لِلْقَوْمِ وَ بِالْقَوْمِ ۔ خرید و فروخت کرنے والوں کے درمیان معاملہ کو سنوارا سدھارا اور درست کیا۔

۴۔ اَفْلَحَ الرَّجُلُ ۔ اپنا مقصود و مطلوب حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ منزل حاصل کرلی، مہم سر کرلی، اپنی جدوجہد اور سعی و پیہم میں کامرانی و کامیابی حاصل کرلی، اپنے

اپنی دوڑ دھوپ میں ٹھیک ٹھیک تدابیر اختیار کریں۔

۵۔ اَلْفَلْحُ وَالْفَلَاحُ۔ فوز، صلاحِ حال، بقار، نجات، کامیابی کی راہ، نجات کی شاہراہ۔

۶۔ اَلْفِلَاحَۃُ وَالْفَلَاحَۃُ۔ کھیتی، کاشتکاری۔

۷۔ اَلْمَفْلَحَۃُ۔ ہر وہ چیز اور جگہ جو فلاح کا ذریعہ ہو۔ کامیابی و کامرانی کا ٹھکانہ۔

فوز و فلاح کے لغوی مفہوم کی اس وضاحت سے جو باتیں کھل کر سامنے آئیں وہ یہ ہیں:۔

۱۔ مطلوب و مقصود کی منزل حاصل ہو جانے اور تباہیوں و بربادیوں کے جہنموں سے بچ جانے کا نام فوز و فلاح ہے۔

۲۔ لیکن خوش بختیوں کا حسین ٹھکانہ اور خوش کامیوں کا مقام بلند بغیر جد و جہد، بغیر جہدِ مسلسل، بغیر جاں فشانی اور بغیر صبر و توکل کے حاصل نہیں ہو سکتا۔

۳۔ محنت و جاں فشانی اور جاں کاہی کے علاوہ سوجھ بوجھ اور فراست و دانائی سے کام لینا بھی لازمی اور ضروری ہے۔ نجات اور کامیابی دونوں کے واسطے جذبۂ عشق کے ساتھ عقل و خرد بھی اول و آخر لازماً درکار ہے۔

۴۔ یہ وہ منزل ہے جس کی طرف رخ کرنا اور پھر راہ کی صعوبتوں سے گریز کرنا اور صبر و استقامت سے جان چرانا، اپنے پیر پر خود کلہاڑی مارنا ہے اور تباہیوں و بربادیوں کو خود دعوت دینے کے مترادف ہے۔ آیئے دیکھیں، قرآن کی نگاہ میں فوز و فلاح کیا ہے اور وہ کیسے حاصل ہوتا ہے۔ آیئے قرآن کے ان تمام مقامات پر غور کریں اور تدبر و تعمق کی نگاہ ڈالیں جو فوز و فلاح سے متعلق ہیں تاکہ وہ اوصاف اور خوبیاں یا وہ شرائط سامنے آجائیں جن پر فوز و فلاح کا دار و مدار ہے۔

سورۂ بقرہ میں

۵۔ سورۂ بقرہ کے پہلے رکوع میں جن اوصاف و شرائط پر فلاح کو منحصر قرار دیا گیا ہے وہ یہ ہیں:۔

۱۔ انسان برائی، بھلائی کی تمیز رکھتا ہو، آل اندیش ہو، برائیوں سے بچتا اور بھلائیوں کی طرف لپکتا ہو، حق و باطل میں فرق کی فطری تڑپ رکھتا ہو، مستقبل کو بربادیوں سے بچانے اور کامرانیوں سے مالا مال دیکھنے کا بھرپور داعیہ رکھتا ہو یعنی وہ فطری تقوے کا مالک ہو۔

۲۔ ان تمام ان دیکھی حقیقتوں کو نہ صرف مانتا اور تسلیم کرتا ہو بلکہ ان پر ایمان و اذعان اور

کامل یقین رکھتا ہو جن کی طرف تمام انبیاء علیہم السلام اور تمام آسمانی کتابوں نے رہنمائی کی ہے اور جن کی تعلیم قرآن اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دیتے ہیں۔

۳۔ وہ اپنے رب کا نہ صرف وفادار ہو بلکہ فرماں بردار بھی ہو، اپنے آقا کی اطاعت و بندگی کے لیے ہر وقت کمر کسے تیار کھڑا رہتا ہو، اپنے حاکم حقیقی اور بادشاہ ازلی و ابدی کے فرامین پر لبیک کہنے کے واسطے اور شاہی احکام کی تعمیل کے لیے ہر وقت آمادہ اور ایستادہ رہتا ہو۔ یعنی اقامتِ صلوٰۃ پر وہ کاربند ہو۔

۴۔ وہ کنجوس اور بخیل نہ ہو۔ بلکہ اللہ کی دی ہو توانائی، خدا کے بخشے ہوئے رزق اور ازلی و ابدی داتا کے عطا کیے ہوئے تمام جسمانی قویٰ، اور مادی ذرائع وسائل کو اپنے آقائے حقیقی کی راہ میں لگاتا اور کھپاتا ہو، یعنی انفاق فی سبیل اللہ کے حکم پر وہ عامل ہو۔

(۵) اللہ تعالیٰ کے تمام انبیاء اور کتب پر ایمان رکھتا ہو اور کسی قسم کی تنگ نظری اور تعصب میں مبتلا نہ ہو وہ حق کو نسل و نسب، لون و لسان، جغرافیائی حدود، قوم و وطن وغیرہ کی تنگ و تاریک عینکوں سے نہ دیکھتا ہو بلکہ عالی ظرفی اور وسیع الخیالی کا مالک ہو اور حق کو حق ہی کی عینک سے دیکھنے کا عادی ہو، اللہ تعالیٰ کی تمام پچھلی کڑیاں ماننے اور تسلیم کرنے کے علاوہ سلسلۂ رشد و ہدایت کے آخری تاجدار جناب احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نبی آخر الزماں اور ان کی لائی ہوئی تعلیمات کو من وعن تسلیم کرتا ہو اور اس پر ایمان رکھتا ہو۔

(۶) اس کائنات کو نہ صرف یہ کہ بے خدا فرض نہ کرتا ہو اور نہ صرف یہ کہ قرآنی و اسلامی تصور توحید رکھتا ہو بلکہ آخرت کو اپنا مطلوب و مقصود ٹھہراتا ہو۔ آخرت پسندی اس کی زندگی کے تمام لمحات سے جھلکتی ہو، وہ ہر آن تمام کاروبار حیات میں عالم آخرت کی کامیابی کے لیے جہد مسلسل میں لگا رہتا ہو۔

جن لوگوں میں یہ صفات ہوں اور جو ان شرائط کو پورا کر دکھائیں، ایسے ہی لوگ فلاح و بہبود سے ہم کنار ہونے والے ہیں۔

سورۃ آل عمران میں

سورۂ آل عمران کے گیارھویں رکوع میں جن اوصاف و شرائط پر فلاح و بہبود کا وعدہ کیا گیا ہے وہ یہ ہیں:۔

۱۔ ایمان کے علاوہ تقویٰ کی صفت اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ کامل اور جامع طور پر کسی انسانی فرد یا گروہ میں موجود ہو۔

۲۔ یہ افراد اور گروہ زندگی بھر اسلامی کیرکٹر کے حامل اور اسلامی زندگی کے مالک رہے ہوں، انھوں نے اپنے تمام کاروبار حیات میں اور زندگی کے تمام پہلوؤں میں اللہ کی اطاعت کی ہو، اس کے وہ سچے وفادار اور کامل فرماں بردار رہے ہوں۔

۳۔ انھوں نے اجتماعی زندگی گذاری ہو اور مل جل کر اللہ کی رسی کو (دین کو) مضبوط تھام رکھا ہو

۴۔ آپس میں پھوٹ اور انتشار کا شکار نہ ہوئے ہوں، وہ دین کی بنیادوں پر متحد اور متفق رہے ہوں۔

۵۔ ان کا نصب العین امر بالمعروف اور نہی عن المنکر رہا ہو، ان کی سعی وجہد اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے وقف رہی ہو۔ وہ اقامت دین کے واسطے دامے، درمے، قدمے، سخنے ہر طرح پیہم کوشاں رہے ہوں

جن لوگوں میں یہ صفات اور خوبیاں ہوں ایسے ہی لوگ فلاح و بہبود سے ہمکنار ہونے والے ہیں۔

سورۂ آل عمران ہی کے ۱۹ ویں رکوع آیت ۱۸۵ کے مطالعہ سے جو حقیقتیں سامنے آتی ہیں وہ یہ ہیں:۔

۱۔ ہر ذی روح کے واسطے موت مقدر ہے، یہ قافلہ یہاں سے بہرحال جانے والا ہے لہٰذا دنیا سے جی لگانا اس کی محبت میں گرفتار ہونا اس کا گرویدہ اور فریفتہ ہونا، غلط اور سراسر غلط ہے۔ یہاں کی کامیابیوں کو کامیابی، یہاں کی کامرانی کو کامرانی، یہاں کے عیش کو عیش اور یہاں کی راحت کو راحت شمار کرنا یا یہاں کی بے مائگی اور کم مائگی کو بدنصیبی و بدبختی تصور کرنا لغو اور بے کار ہے۔

۲۔ آخرت کی خوش بختیاں اور خوش کامیاں ہی دراصل کامیابی و کامرانی ہے وہاں کے جہنموں کے دہکتے اور بھڑکتے ہوئے شعلوں سے نجات پا جانا ہی حقیقی کامیابی اور نصیب وری ہے جس پر دنیا کی تمام کامیابیوں راحتوں اور عشرتوں کو قربان کر دینا چاہیے۔ وہاں کی جنتوں سے ہم کنار ہو جانا وہاں کی بہشتوں کے لطف و راحت کا مزہ پا لینا وہ مقام بلند اور کمال ارتقاء ہے کہ جس کے حصول پر یہاں کی کلفتوں یہاں کے رنج والم کی دنیاؤں اور یہاں کی تباہیوں اور بربادیوں کی تمام حشر خیزیوں کو انگیز کر لینا آسان پسندیدہ اور خوش گوار ہے۔

(۳) لہٰذا اپنی اس دنیا میں اس دنیا کو آباد کرنے کی فکر میں لگنا اور لگے رہنا چاہیے اپنے

اس جیون کو وہاں کے سکھ کی خاطر تج دینا چاہیے۔ یہاں کی تمام کامرانیوں کو وہاں کی خوش بختیوں کے لیے قربان کر دینا چاہیے۔

غرض کہ جو دوزخ کے عذاب سے بچ گیا اور جس نے اپنی فردوس گم گشتہ حاصل کر لی وہ کامیاب و بامراد اور فوز و فلاح سے ہم کنار ہوا۔ (آل عمران، رکوع ۱۹۔ الصّٰفّٰت، رکوع ۲ الدخان، رکوع ۳۔ الفتح، رکوع ۱۔ الحشر، رکوع ۳۔

اسی سورۃ کے آخری رکوع کی آخری آیت میں پانچ اوصاف پر فلاح کی توقع قائم کی گئی ہے۔

۱۔ ایمان اور ایمان والوں کا ایکا اور اتحاد۔

۲۔ ایمان کی راہ میں ہر مصیبت، تکلیف اور نقصان کو انگیز کرنا اور صبر و استقامت سے کام لینا۔

۳۔ اہلِ حق، حق کے لیے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر جان مال کھپائیں اور باطل پرستوں سے زیادہ پامردی کا، زیادہ عزم و حوصلہ کا، زیادہ جاں فشانی اور جان و مال کی قربانی کا ثبوت دیں

۴۔ دین کی پیروی اور اقامت کے لیے ہر دم کمربستہ رہیں، باطل پرستوں کے مقابلے میں بنیان مرصوص ثابت ہوں۔ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ اور رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ پر کاربند ہوں۔

۵۔ اور ہر آن، ہر کام اور ہر بات میں اللہ تعالیٰ کا دھیان خیال رکھیں اس کی نافرمانیوں سے ہر دم بچتے اور اس کے عذاب سے ہر وقت ڈرتے رہیں، پرہیزگاری کی زندگی گذاریں اور تقوے کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔

جن لوگوں میں یہ اوصاف ہوں وہ فوز و فلاح سے ہم کنار ہونے والے ہیں۔

سورۂ نساء کے ابتدائی حصے میں تنظیم خاندان کے کچھ اصول، یتامیٰ کے حقوق، نکاح

سورۂ نساء میں کے بعض احکام اور قانون وراثت بیان کرنے کے بعد رکوع دو میں فرمایا یہ اللہ کی (قائم کردہ) حدود ہیں جو ان کی پابندی کرے گا اور اللہ و رسول کی اطاعت کرے گا وہ ہمیشگی کی جنتوں سے نوازا جائے گا اور یہی فوز عظیم ہے غرض کہ جو چاہے اللہ تعالیٰ کی حدود و قوانین کو قائم اور نافذ کر کے بہشت بریں سے ہم کنار اور فوز عظیم سے مالا مال ہو سکتا ہے۔

سورۂ مائدہ رکوع ۶ میں ایمان کے علاوہ تین کاموں پر فلاح کی توقع

سورۂ مائدہ میں قائم کی گئی ہے۔

۱- جو آدمی ہر دم اس بات کا دھیان رکھے کہ اُسے مرنا ہے اور پھر اپنے مالکِ حقیقی کے روبرو لمحہ لمحہ اور ذرّہ ذرّہ کا حساب دینا ہے اسے ہر آن یہ خیال ستاتا رہے کہ کہیں اللہ کی کوئی فرماں برداری چھوٹ نہ جائے اور کہیں اس کی کسی نافرمانی کا دھوکے دھڑی سے ارتکاب نہ ہو جائے۔ وہ اسلام کی سیدھی پگڈنڈی پر دامنوں کو سمیٹے، قدموں کو سنبھالے، احتیاط اور ہوشیاری سے چلتا ہے کہ کہیں فسق و فجور اور کفر و شرک کے خندقوں اور گہرے کھڈوں میں نہ جا پڑے اور اس کے دامن کہیں بےعملی اور بدعملی اور غلط فکری کی جھاڑ دار جھاڑیوں میں الجھ نہ جائیں۔ وہ تقوے کی زندگی گذارتا اور پرہیز گاری کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا ہے ایسا شخص فلاح کا مستحق ہے۔

۲- جو شخص رضاءِ باری تعالےٰ کے ہر ذریعہ کی طرف لپکتا ہے خوشنودیِ رب کے ہر طریقے کو اپناتا ہے اور تقرب خداوندی کے ہر وسیلے کو اختیار کرتا ہے وہ فلاح و بہبود کا حق دار ہے۔

۳- اور جو انسان، ابلیس لعین سے اپنے نفس، اپنے باپ دادا، اپنے ماحول اور معاشرے سے اور اپنے دور کے غلط سیاسی، تمدنی اور معاشی نظاموں سے جو کھی لڑائی لڑتا ہوا اور باطل کے ہر حربے کا منہ توڑ جواب دینے کو آمادہ رہتا ہوا اور زندگی کے ہر میدان میں خدا کا سپاہی ہو، اور باطل پرستوں اور باطل کے علمبرداروں سے فکر و عمل کے ہر میدان میں نبرد آزما ہوا ایسا شخص فلاح سے ہم کنار رہے۔

یعنی جو لوگ اہل ایمان ہوں، تقویٰ اور پرہیزگاری کے حامل ہوں۔ خوشنودی اور تقرب خداوندی کے سچے طالب ہوں اور جان و مال سے اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والے ہوں۔ ایسے لوگ فلاح و بہبود سے انشاءاللہ ضرور نوازے جائیں گے۔

فلاح صرف دو چیزوں پر مشتمل ہے اولاً یہ کہ اللہ اور اللہ کے رسول کی کامل اطاعت کی جائے دوم یہ کہ اس کی نواہی سے کامل پرہیز اور پورا اجتناب اختیار کیا جائے۔ اللہ تعالےٰ نے جن چیزوں، کاموں اور باتوں کو حلال ٹھیرایا ہے ان کو پاکیزہ اور طیب سمجھ کر ان کی طرف لپکنا چاہیے اور جن کاموں باتوں اور چیزوں کو حرام اور ممنوع ٹھیرایا ہے ان سے اس طرح بھاگنا اور بچنا چاہیے جس طرح کوئی آگ کے شعلوں سے بھاگتا اور بچتا ہے۔ چنانچہ سورۂ مائدہ رکوع ۱۲ میں فرمایا گیا ہے۔ "اے ایمان والو! یہ شراب اور جوا اور یہ آستانے اور پانسے یہ سب گندے شیطانی کام ہیں ان سے پرہیز کرو۔ امید ہے کہ تمہیں فلاح نصیب ہوگی۔

کامیابی اور فوز و فلاح بس یہ ہے کہ آدمی سے اس کا رب راضی ہوجائے اور اپنی مرضی کے مقام جنت میں ٹھکانہ عطا فرما دے اور یہ ان خوش نصیبوں کا ہی حصہ ہے جو سچے ہوں اور صدق و صفا پر مبنی زندگی کے مالک ہوں جنھوں نے انسان اور کائنات کے بارے میں سچا اور حقیقی نظریہ اپنایا ہوا اور زندگی کا رویہ بھی سچا اور حقیقی اختیار کیا ہو غرض کہ جو لوگ نہ صرف اپنے قول و قرار میں، نہ صرف اپنے قلب و ضمیر میں بلکہ اپنے عمل کی وسعتوں اور اپنے دماغ کی پہنائیوں سمیت سچے اور صدق و صفا کے حامل ہوں اللہ انہیں سے راضی ہوگا اور اپنی جنتوں سے نوازیگا اور یہی فوز عظیم ہے۔ (المائدہ رکوع ۱۶)

تنگ نظر، تنگ دل اور تنگ ظرف خسیس مزاج و ذلیل طبیعت کا جو خود غرض اور دنیا پرست ہو وہ اُن اوصافِ حمیدہ، اخلاق فاضلہ بلند خیالات اور اعلیٰ کیرکٹر کا حامل ہو ہی نہیں سکتا جو شخص حبِ دنیا میں لت پت ہو وہ حقوق اللہ ادا کرے گا اور نہ حقوق العباد لہذا ایسے نکمے اور ناکارہ آدمی کو فلاح و بہبود اور فوز عظیم ہرگز حاصل نہیں ہوسکتی۔ فوزِ عظیم اور فلاح و بہبود سے اگر کوئی ہم کنار ہونا چاہتا ہے تو اسے حبِ دنیا سے باز رہنا اور تقوی کی شاہراہ اختیار کرنا ہوگی چنانچہ سورۂ آل عمران رکوع ۱۴ میں فرمایا:۔ "اے ایمان والو! یہ بڑھتا چڑھتا سود کھانا چھوڑ دو اور اللہ کا تقوی اختیار کرو۔ توقع ہے کہ تم فلاح یاب، کامراں اور بامراد ہوسکو گے۔

● ۔ واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کی گرفت سے اس کے عذاب سے اس کے جہنم کے دہکتے اور بھڑکتے شعلوں سے جو بچ گیا وہی کامیاب ہے۔ ظاہر ہے کہ آخرت کے عذاب سے وہی بچ سکے گا جس پر اللہ تعالےٰ رحم فرمائے گا اور اللہ تعالےٰ اسی پر رحم فرمائے گا جو اس کا مستحق ہو۔ لہذا جہنم سے بچنے اور رحمتِ خداوندی کا مستحق قرار پانے کے لیے انسان کو اپنی اس دنیوی زندگی ہی میں، اپنے نفس اور شیاطین الانس و الجن سے مجاہدہ کرنا ہوگا۔ جو یہ مجاہدہ کرلے گا وہ رحمت خداوندی کا حقدار بن گیا اور جہنم سے محفوظ ہوگیا۔ نمایاں اور کھلی کامیابی ایسے ہی لوگوں کو نصیب ہوگی چنانچہ سورۂ الانعام رکوع ۲ میں فرمایا:۔ "اس دن جو سزا سے بچ گیا اس پر اللہ نے بڑا ہی رحم فرمایا۔ اور یہی نمایاں کامیابی ہے۔

● ۔ انبیاء علیہم السلام نے کائنات اور انسان اور خدا کے بارے میں مبنی بر حقیقت جو نظریہ اور

اس کے مطابق نظام بندگی پیش فرمایا ہے اور بندگی رب کی جو تحریک چلائی ہے اور حق کا جو پرچم بلند کیا ہے وہ عدل و قسط پر مبنی ہے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ اور انسانی جسم کا رونگٹا رونگٹا خود منہ سے بول رہا ہے کہ اطاعتِ خدا اور بندگی رب ہی ان کا اصل وظیفہ ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی دعوت اور کائنات کی فطرت میں یہ ہم آہنگی اس بات کا ثبوت ہے کہ عدل و قسط پر مبنی اگر کوئی نظریہ اور نظام، کوئی مذہب اور ازم ہوسکتا ہے تو وہ اسلام ہی ہے دیگر تمام فلسفے، تمام نظامہائے حیات تمام مذاہب اور تمام جدید ازمس اور نظریے سب ظلم و عدوان پر مبنی اور فطرت کائنات سے متصادم ہیں یہی وجہ ہے کہ انسان کا فلاح و بہبود سے ہم کنار ہونا اسلام اور صرف اسلام سے وابستہ ہے۔ کیونکہ ظالموں کو کبھی فلاح حاصل نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ سورۃ الانعام رکوع ۱۶ میں فرمایا:۔ "اے نبی! کہہ دو کہ لوگو! تم اپنی جگہ عمل کرتے رہو اور میں بھی اپنی جگہ عمل کر رہا ہوں عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ انجام کس کے حق میں بہتر ہوتا ہے۔ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ ظالم کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔

سورۃ اعراف میں

سورۃ الاعراف کے پہلے رکوع میں پیرایہ بدل بدل کر ایک ایسی بات چند بار دہرائی گئی ہے جس پر فلاح و کامرانی کا دارومدار ہے۔ قانون خداوندی اور ہدایت ربانی کی پیروی اختیار کی جائے اور اللہ کے علاوہ کسی کو اپنا ولی نہ بنایا جائے۔ نظریہ کائنات، نظامِ حیات، نصب العین اور طریقِ کار، انفرادی زندگی کے طور طریق اور اجتماعی زندگی کا لائحہ عمل، غرض کہ فکر و عمل کے ہر میدان اور ہر زاویہ میں اللہ تعالیٰ کی ہدایت کو اختیار کیا جائے اور اسی کی اطاعت کی جائے۔ سر مو اس کے خلاف کروگے تو ہمیشہ ہمیش کی تباہی مول لوگے۔ الٰہی قانون اور ربانی ہدایت کو چھوڑ کر انسانی قوانین یا انسانی رہنمائی کی طرف لپکوگے تو ہمیشہ ٹاپک ٹوئیاں مارتے اور اپنا سر پھوڑتے پھروگے۔ مومن ہو تو نصیحت قبول کرو ورنہ ہم تمہیں اس کی خلاف ورزی کے برے انجام سے ڈراتے ہیں ــــ تاریخ میں بارہا ایسا ہو چکا ہے کہ جنھوں نے من مانی کی اور فکر و عمل میں اللہ کی ہدایت اور انبیاء کی پیروی سے منہ موڑا انھوں نے ہمیشہ منہ کی کھائی، راتوں رات یا دن دہاڑے خدا کا عذاب آپہنچا اور وہ صفحۂ ہستی سے ایسے مٹا ڈالے گئے کہ ان کا نام و نشان تک نہ رہا۔ مومنین سے ہمارا دہرا مطالبہ ہے اول یہ کہ وہ خود اتباعِ مَآ اَنْزَلَ اللہ کریں۔ دوم یہ کہ دوسروں تک اس

دعوت کو پہنچائیں اس کی تبلیغ کریں۔ اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے اور اس کے دین کو قائم کرنے کی جدوجہد کریں، صرف مومنین سے نہیں ہمارے یہ دونوں مطالبے رسولوں سے بھی ہیں، آخرت کے پیش نظر یہ معاملہ اور بھی سنگین ہو جاتا ہے۔ ہم اُرسِلَ اِلَیھِمْ (رسولوں کی امتوں) اور مرسلین (انبیاء علیہم السلام دونوں سے اچھی طرح بازپرس کریں گے —— پھر اس روز وزن بھی حق ہے اس دنیا میں (جو شخص یا گروہ حق کا پیرو اور علمبردار ہوگا اس دنیا میں وہی فلاح پائے گا اور اسی کے اعمال وزنی ہوں گے اور جس کے اعمال وزنی ہوں گے وہی کامیاب و کامراں ہوگا۔

۱۔ غرض کہ جو لوگ اللہ کی ہدایت اور اس کے قانون کو حق جانیں اور مانیں اور اس کے حق ہونے میں کسی شک و شبہ کا شکار نہ ہوں۔

۲۔ اس کی تبلیغ و اقامت کی طرف سے بھی کسی قسم کی تنگی محسوس نہ کریں، مخاطبین کی مخالفت، ان کے غلبہ و اقتدار اور لاؤ لشکر سے نہ ڈریں، ان کی تکذیب سے ملول نہ ہوں، ان کی اذیتوں اور ایذا رسانیوں کی قطعاً پروا نہ کریں۔

۳۔ جو انذار اور تذکیر کا فریضہ انجام دیتے ہوں۔

۴۔ خود اپنی زندگیوں پر دین و قانون خداوندی کو نافذ اور غالب کرنے کی فکر کرتے ہوں۔

۵۔ اللہ کے علاوہ کسی انسانی یا غیر انسانی ہستی کو اپنا ولی، سرپرست، رہنما اور پیشوا نہ بناتے ہوں الا یہ کہ وہ انسان خود اللہ کا نبی ہو یا اللہ کے نبی کا سچا پیرو ہو اور اللہ ہی کی طرف بلاتا ہو اور اسی کی بندگی کی دعوت دیتا ہو۔

۶۔ قرآنی عینک لگا کر تاریخ کے واقعات سے فائدہ اٹھاتے ہوں۔

۷۔ آخرت کی بازپرس کے پیش نظر اس دنیا میں اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوں۔

۸۔ اللہ کی صفات خصوصاً اس کی صفت علم غیب کو اس کے سمیع و بصیر اور علیم و خبیر ہونے کو ہر کام اور بات میں مدنظر رکھتے ہوں۔

۹۔ آخرت میں وزنِ اعمال کے نہ صرف قائل ہوں بلکہ ہم ایسے اعمال اختیار کریں، جو آخرت میں وزنی ثابت ہوں ایسے ہی لوگ فلاح و بہبود سے ہم کنار ہونے والے ہیں۔

۱۰۔ انسان کی تمام بے راہ رویاں، تمام بدکرداریاں، تمام ظلم و ستم اور تمام الحاد و زندقہ، کفر و طغیان

اور فسق و فجور کا بڑا سبب غلط فکری، غلط فہمی اور غلط اندیشی ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے فلاسفہ اور عقلاء روزگار آخر گمراہ کیوں ہوئے اور آج بھی دانشورانِ عالم آخر ٹامک ٹوئیاں کیوں مار رہے ہیں وہ آغاز کائنات اور انجام کائنات اور دنیاوی زندگی کے بارے میں حقیقت سے ناآشنائے محض کیوں ہیں؟ اس لیے کہ انھوں نے اپنے فکر و نظر کی بنیاد ہی غلط قائم کی لہٰذا جتنا زیادہ سوچا اور دماغ لڑایا اتنا ہی زیادہ اور بھٹکتے چلے گئے۔ قرآن کہتا ہے کہ فکر کا آغاز ذکر سے ہونا چاہیے۔ اللہ، اس کی صفات، اس کے کرم اور احسانات، اس کی نعمتیں اور نوازشیں، غور و فکر کی اگر بنیاد قرار پائیں تو پھر انسان نتائج بھی صحیح اخذ کرے گا اور نہ صرف یہ کہ گمراہ ہونے سے بچے گا اور تباہیوں کے گڑھوں میں گرنے سے محفوظ رہے گا بلکہ فلاح و بہبود سے ہم کنار ہو گا۔

خدا اور اس کی صفات کے علاوہ غور و فکر کا آغاز کسی اور منفی بنیاد پر ہو گا تو ایسے فکر کے نتیجے میں دنیا ظلم و ستم سے بھر جائے گی اور یہ بھی یقینی بات ہے کہ ظالم افراد اور ظالم معاشرے کو کبھی فلاح نصیب نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ سورۂ اعراف رکوع ۹ میں فرمایا پس اللہ کی نعمتوں اور اس کی قدرت کے کرشموں کو یاد کرو۔ امید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔ اسی سورۂ اعراف رکوع ۱۹ کی آخری آیت میں پہلے تو یہ فرمایا کہ رحمت خداوندی کے مستحق وہ لوگ ہیں جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع، کامل اتباع، فکر و عمل کے تمام زاویوں، سب ہی گوشوں اور سارے ہی میدانوں میں کریں پھر حضورؐ کے بعض اوصاف گنائے آپؐ نبی امی ہیں، آپؐ کا تذکرہ پچھلی کتب مقدسہ میں جابجا موجود ہے۔ آپؐ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں آپؐ کی تعلیم تمام پاکیزہ چیزوں کو حلال اور تمام خبیث چیزوں کو حرام قرار دیتی ہے اور ان تمام جکڑ بندیوں اور خود ساختہ حدود و ضوابط اور رسوم و رواج سے انسان کو نجات بخشتی ہے جن کے بوجھ تلے انسان کراہ رہا ہے اور سسکیاں لے رہا ہے۔ آگے بتایا کہ فلاح چار شرطوں پر موقوف ہے۔

۱۔ یہ کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی تعلیم و شریعت پر ایمان لانا اور کائنات و انسان کے بارے میں اس نظریے کو پورے اطمینان قلب اور انشراح صدر کے ساتھ تسلیم کرنا جو تمام انبیاء علیہم السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمایا ہے۔ ان تمام ان دیکھی بنیادی حقیقتوں کو نہ صرف تسلیم کرنا بلکہ قلب کی گہرائیوں اور دماغ کی وسعتوں سے تسلیم کرنا جو تمام کتب آسمانی اور قرآن پیش کرتا ہے

۲۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تقویت پہنچانا اور آپؐ کو تقویت پہنچانے کا طریقہ یہ ہے

کہ آپ پر اور آپ کی تعلیم پر ایمان لایا جائے آپ کی پیروی کی جائے آپ کے دین کی علم برداری کی جائے آپ کے مشن میں آپ کا ساتھ دیا جائے اور دامے درمے قدمے سخنے ہر طرح آپ کا ساتھ دیا جائے۔ قوت ید، قوت لسان اور قوت قلب تینوں سے کام لیکر آپ کے دین کو تقویت پہنچائی جائے غرضکہ ہر اس مادی اور روحانی طاقت سے آپ کو تقویت دی جائے جو اللہ نے بخشی ہے۔

۳۔ آپ کی اور آپ کے دین کی مدافعت کی جائے۔ باطل پرستوں اور حق پرستوں کے دشمنوں نے ہمیشہ حق اور سچائی کے علمبرداروں کو زک دینے اور انہیں صفحہ ہستی سے مٹا ڈالنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور صرف کیا ہے۔ آج بھی شیاطین الانس والجن اپنی تمام مادی طاقتوں اور اپنے تمام جدید اور سائنٹیفک ذرائع سے کام لے کر نور حق کو بجھانے کی کوششوں میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ لہٰذا اہل حق پر لازم ہے کہ وہ بھی مادی طاقتوں سے کام لے کر اور نشر و اشاعت اور افہام و تفہیم کے تمام ذرائع استعمال کر کے کفر و الحاد کے طوفان کے مقابلے پر ڈٹ جائیں اور عزم و حوصلہ، صبر و توکل، یقین محکم اور عمل پیہم سے مسلح ہو کر باطل کے مقابلے پر استقامت کا پہاڑ بن جائیں۔ یہی ہے نصرت اللہ کی، اللہ کے دین کی، اللہ کے نبیؐ اور اس کی شریعت کی۔

۴۔ لیکن جب تک سچے خدا پرستوں، نبی کے مخلص حلقہ بگوشوں، اسلام کے فدائیوں اور سر فروشوں میں اتفاق و اتحاد نہ ہو گا، وہ منظم نہ ہوں گے، ان میں ڈسپلن نہ ہو گا، وہ ایمان کا حق ادا نہیں کر سکتے وہ نبی کو تقویت پہنچانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے اور نہ دشمنان حق کے مقابلے میں، نبی اور دین نبی کی مدافعت میں بازی لے جا سکتے ہیں اور یہ نظم و اتحاد اور یہ ڈسپلن اس روشنی اور نور کے ذریعہ پیدا کیا جائے گا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کا نور اور آپؐ کی شریعت کی روشنی ہے۔ اس روشنی سے فکر و عمل کے تمام پہلوؤں میں پورا پورا استفادہ کیا جائے گا۔ افراد کے تزکیہ نفس میں خاندان کی اصلاح میں معاشرے کی تربیت میں اسٹیٹ کے قیام و بقاء میں ہر جگہ اور ہر حال میں اسی نور کے ذریعہ وہ اتحاد و اتحاد پیدا ہو گا جس سے اعداء دین کے دانت کھٹے کیے جا سکیں گے، دین نبی کو تقویت دی جا سکے گی اور ایمان و اسلام کا حق ادا کیا جا سکے گا۔ جو شخص یا قوم فوز و فلاح سے ہم کنار ہونا چاہتی ہو اسے اسی راہ پر گامزن ہونا چاہیے۔

● ۔ انسان کا دل و دماغ ایک حکمران ہے جو اس کے اعضاء و جوارح پر حکومت کرتا ہے جس قسم کے افکار و خیالات اور عقائد و نظریات اس کے دل و دماغ پر مسلط ہوتے ہیں انہیں کے مطابق اس کے

اعضاء کو تحریک ہوتی ہے اور اعضاء حرکت میں آتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے عقائد پر دین
توجہ صرف کی ہے حتیٰ کہ خدائے تعالیٰ کے وجود و صفات یا انبیاء علیہم السلام کی نبوت و رسالت،
آخرت اور اس کی تفصیلات وغیرہ عقائد میں سے کسی ایک کا بھی انکار کر دینے یا کم از کم ان میں سے
کسی ایک کے بارے میں شک و شبہ میں مبتلا ہو جانے کے بعد آدمی کی کوئی نیکی بھی مقبول نہیں ہوتی
کیونکہ جب آدمی وفادار ہی نہ رہا تو اس کی نیازمندیاں اور فرماں برداریاں پرکاہ کی حیثیت بھی نہیں
رکھتیں لیکن صرف دل و دماغ اور اپنے ذہن و مزاج کو اللہ کی وفاداری کے رنگ میں رنگ دینے
کا زبانی دعویٰ اور صرف دل میں اس کی محبت و عظمت کے غلبہ و تسلط کا اعلان و اظہار ہرگز قبول نہیں
کیا جا سکتا بلکہ اس کے واسطے دو شرطیں لازمی ہیں اول یہ کہ دیگر تمام محبتوں تمام وفاداریوں اور تمام
عظمتوں کو تمام تعلقات اور روابط کو اللہ کے رسول کی اتباع اور اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے قربان
کر دے یا کم از کم اس کے واسطے آمادہ اور تیار ہو اور ان کاموں اور باتوں سے رک جائے جن سے
اللہ نے روکا ہے سوم یہ کہ صرف منفی پہلو (ترک کر دینا اور رک جانا) پر ہی بس نہ کرے بلکہ مثبت طور پر
اپنا تمام دنیاوی مال و متاع اور تمام جسمانی و مادی ذرائع و وسائل بلکہ اپنا تمام سرمایہ زیست اللہ کی راہ
میں اس کے کلمہ کی سربلندی کی خاطر تج دے، تب کہیں آدمی اپنے رب کے ہاں بلند مرتبے اور اعلیٰ مدارج
پا سکے گا اور اسے اس کا رب فوز عظیم سے نوازے گا چنانچہ سورہ توبہ رکوع ۳ میں فرمایا کہ جو لوگ ایمان
لائے اور ہجرت کی اور اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کے راستے میں جہاد کیا اللہ کے ہاں انہیں کا درجہ
بڑا ہے اور یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔ (باقی)

خدا کا آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم

(مولانا جلال الدین عمری)

اگر کوئی شخص مجھ سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے کی دلیل پوچھے تو میں اس کے سامنے آپ کی سیرت پیش کروں گا۔ آپ کی پختہ سیرت، آپ کے مضبوط عزائم، آپ کے بلند حوصلے، آپ کا ایمان و یقین، آپ کا خدا سے تعلق اور اخلاص اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ آپ عام انسان نہیں ہیں بلکہ خدا کے رسول ہیں۔ آپ کے اندر ایسی غیر معمولی صلاحیتیں اور بے نظیر خوبیاں موجود تھیں جو خدا کے کسی پیغمبر ہی میں پائی جا سکتی ہیں۔ تاریخ میں جتنی بڑی شخصیتیں گزری ہیں ان کی بڑائی ان کی زندگی کے کسی خاص پہلو سے ابھرتی ہے اور پھر وہ ان کی پوری زندگی پر چھا جاتی ہے۔ اگر اس خاص پہلو کو نظر انداز کر دیا جائے تو ان کی بڑائی ختم ہو جاتی ہے۔ شکسپیر اور سعدی کا شمار دنیا کے چوٹی کے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں ادب کے علاوہ بہت سی اور خوبیاں بھی ہوں لیکن یہ ان کی عظمت کی دلیل نہیں ہیں۔ ان کے جس پہلو نے انہیں عام سطح سے اوپر اٹھایا ہے وہ ان کا ادب ہے۔ اگر آپ ان کے ادب کو ان سے چھین لیں تو وہ عام انسانوں کی صف میں نظر آئیں گے۔ اس کے برعکس محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا مطالعہ ہم جس پہلو سے بھی کرتے ہیں، اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ آپ عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ آپ نے چالیس سال کی عمر میں رسالت کا دعویٰ کیا۔ اس دعوے کے بعد آپ کا کردار منصب رسالت کے ساتھ اس طرح مل گیا ہے کہ ہم دونوں کو جدا نہیں کر سکتے۔ لیکن اس دعوے سے پہلے بھی آپ کی شخصیت اتنی حیرت انگیز اور اس قدر بلند اور فائق تھی کہ کوئی دوسری شخصیت اس پایے کی کہیں نظر نہیں آتی۔ سیرت و کردار اور اخلاق و شرافت کے لحاظ سے آپ کا مقام اتنا اونچا تھا کہ اگر آپ رسول نہ ہوتے تو تاریخ کو ماننا پڑتا کہ اس سطح کا انسان سوائے پیغمبروں کے اور کوئی پیدا نہیں ہوا۔ آپ کا اخلاق مثالی اخلاق تھا۔ آپ کا کردار نمونے کا کردار تھا

آپ کے اندر شرافت تھی اور اعلیٰ درجے کی شرافت تھی، آپ راست باز اور منصف مزاج انسان تھے، آپ کی ہر بات واقعہ کے مطابق ہوتی اور آپ کا ہر فیصلہ عدل و انصاف کے تقاضے پورے کرتا۔ آپ کی زندگی اتنی شستہ اور بے داغ تھی کہ کسی نے آپ میں کسی اخلاقی عیب کی نشان دہی نہیں کی۔ آپ کی ذات سے دوستوں ہی کو نہیں دشمنوں کو بھی فائدہ پہنچا، آپ اپنوں کے لیے بھی رحمت تھے اور غیروں کے لیے بھی۔ آپ تاجر تھے تو دیانت دار تاجر تھے، اپنے وطن کے شہری تھے تو پُرامن شہری تھے — پڑوسی تھے تو خیر خواہ پڑوسی تھے، دوست تھے تو ہمدرد دوست تھے، بھائی تھے تو مہربان بھائی تھے۔ کسی کے ساتھ آپ نے مکر و فریب کا معاملہ نہیں کیا اور نہ کسی نے آپ سے دھوکا کھایا۔ آپ کی قوم نے بار بار کے تجربے کے بعد بالاتفاق اعلان کیا کہ یہ "امانت دار" انسان ہے۔ اس سیرت کا انسان جب اپنے رسول ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تو اسے جھوٹا کہتے ہوئے شرم آتی ہے اور ضمیر ملامت کرنے لگتا ہے۔

میں یہاں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے چند خاص پہلو پیش کروں گا۔ ان سے آپ کو معلوم ہوگا کہ آپ خدا کے سچے رسول ہیں۔ کیونکہ کسی جھوٹے شخص کی زندگی میں یہ پہلو ہرگز نمایاں نہیں ہو سکتے۔

۱۔ آپ بہت ہی باوقار اور سنجیدہ انسان تھے۔ آپ کی پوری زندگی اور لوگوں کے ساتھ آپ کے تعلقات گواہ ہیں کہ آپ مسخرے نہیں تھے، آپ کی قوم آپ کی باتوں کو مذاق نہیں سمجھتی تھی، آپ کے اندر متانت اور شائستگی تھی اور آپ کے ہر کام میں اس کا ظہور ہوتا تھا۔ کیا آپ اس شخص کو غیر سنجیدہ اور اس کی باتوں کو مذاق کہیں گے جسے اختلافات میں حَکَم قرار دیا جائے اور جو لوگوں کے معاملات کا دوربینی کے ساتھ فیصلہ کرے؟ دعویٰ نبوت سے پانچ سال پہلے کا واقعہ ہے کہ قریش نے کعبہ کی تعمیرِ نو کا ارادہ کیا جب تعمیر ہونے لگی تو اس بات پر شدید اختلاف پیدا ہوگیا کہ حجرِ اسود کو جو حضرت ابراہیم کی یادگار ہے، کون اس نئی تعمیر میں اپنی جگہ نصب کرے۔ چار پانچ دن تک اختلاف جاری رہا اور قریب تھا کہ تلواریں چل جائیں۔ اتنے میں طے پایا کہ اس جھگڑے کا فیصلہ وہ شخص کرے گا جو کل صبح سب سے پہلے خدا کے گھر میں داخل ہوگا۔ دوسرے دن لوگوں نے جب سب سے پہلے داخل ہونے والے انسان کو دیکھا تو پکار اٹھے کہ یہ محمد ہے، یہ امانت دار ہے۔ ہم اسے حکم ماننے کے لیے تیار ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد آپ نے جو فیصلہ کیا اسے سب نے بخوشی قبول کر لیا[1]

---

[1] سیرۃ النبی لابن ہشام مطبوعہ قاہرہ جلد ۱ صفحہ ۲۱۴-۲۰۹

ایک شخص جو اپنی قوم میں لیڈر بننے کی صلاحیت رکھتا ہے وہ اپنے اس دعوے کی وجہ سے کہ وہ خدا کا رسول ہے، قوم کی ملامت کا نشانہ بن جاتا ہے۔ وہ اسے ستاتی ہے، اس پر طنز و تعریض کرتی ہے، اس کی راہ میں کانٹے بچھاتی ہے، اس پر گندگی پھینکتی ہے، اسے پتھروں سے مار کر زخمی کر دیتی ہے۔ اس کا اور اس کے خاندان کا پورے تین سال تک مکمل بائی کاٹ کیے رہتی ہے، اس کے قتل کے منصوبے بناتی ہے، اسے وطن چھوڑنے پر مجبور کرتی ہے، اس پر اور اس کے ساتھیوں پر حملہ آور ہوتی ہے اور اسے ختم کر دینا چاہتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ اپنے اس دعوے سے باز نہیں آتا بلکہ اس میں ایک لفظ اور ایک شوشے کی تبدیلی کے لیے تیار نہیں ہے تو کیا یہ مذاق ہے جو ساری دنیا کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ اگر یہ مذاق ہے تو اپنی نوعیت کا واحد مذاق ہے۔ ایسا مذاق آج تک نہ تو کسی کے ساتھ کیا گیا اور نہ عملاً کیا جا سکتا ہے۔

آپ کے دعوے کی سنجیدگی میرے نزدیک آپ کی صداقت کی دلیل ہے۔ حقیقت اور مذاق کبھی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ حقیقت اپنے اظہار کے لیے سنجیدگی کی طالب ہے۔ کسی سنجیدہ دعوی میں غیر سنجیدگی نہیں پائی جا سکتی۔

۲۔ آپ اپنی ہر بات میں سچے تھے، آپ کے بارے میں کبھی جھوٹ کا تجربہ نہیں ہوا اس لیے بظاہر آپ کا دعوی رسالت بھی سچا دعوی تھا۔ جو شخص آپ کو جھوٹا کہتا ہے وہ ایک ایسی ہستی پر جھوٹ کا الزام لگاتا ہے جس کے سچے ہونے کی گواہی اس کے دشمنوں تک نے دی ہے۔ آپ نے رسالت کا اعلان کیا تو آپ کی مخالفت کرنے والوں میں نضر بن حارث بہت ہی نمایاں تھا اور ہمیشہ آپ کی اذیت کے درپے رہتا تھا۔ وہ آپ کی قوم سے کہتا ہے۔ "اے قریش کے لوگو! محمدؐ کی دعوت ایک ایسی مصیبت ہے جس کا تمہارے پاس کوئی علاج نہیں ہے۔ وہ جب جوان تھا تو تمہارے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ، سب سے زیادہ سچا اور سب سے بڑا امانت دار تھا۔ لیکن جب اس کے بال سفید ہو گئے اور وہ بڑھا ہو گیا اور اس نے وہ کلام پیش کیا جسے تم سن رہے ہو تو تم اسے جادوگر کہتے ہو ہم جادوگروں کو اور ان کی جھاڑ پھونک کو خوب جانتے ہیں۔ خدا کی قسم وہ جادوگر نہیں ہے"[1]

قریش کے چند لوگ تجارت کے لیے شام گئے ہوئے تھے۔ شاہ ہرقل نے انہیں اپنے دربار میں

---

[1] [illegible] ۱۲ [illegible] ۳۱۹

بلوایا اور کہا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے شہر میں ایک شخص نے خدا کا رسول ہونے کا دعویٰ کیا ہے، میں اس کے بارے میں بعض معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ بتاؤ تم میں اس کا قریبی رشتہ دار کون ہے؟ حضرت ابوسفیانؓ نے جواب دیا کہ وہ میرے خاندان کا ہے۔ اس کے بعد ہرقل نے ابوسفیانؓ سے جو چند سوالات کیے ان میں سے ایک یہ تھا۔

بتاؤ اس دعوے سے پہلے کبھی اس پر دروغ گوئی کا الزام لگا ہے؟

ابوسفیانؓ نے جواب دیا کہ نہیں۔

یہ سن کر ہرقل نے کہا کہ جس شخص نے کسی انسان کے معاملے میں کبھی جھوٹ نہ کہا ہو، یقین نہیں آتا کہ وہ خدا کی طرف اتنا بڑا جھوٹ کیسے منسوب کر دے گا؟

شاید آپ کہیں گے کہ حضرت ابوسفیانؓ مسلمان تھے اس لیے ان کی شہادت کا اعتبار ہی کیا؟ لیکن میں آپ کو بتا دوں کہ یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب کہ ابوسفیان محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جانی دشمن تھے اور آپ کے مخالفین کی قیادت کر رہے تھے۔ خود فرماتے ہیں کہ اگر مجھے اس کا اندیشہ نہ ہوتا کہ ہرقل کے دربار میں جو قریشی بیٹھے ہیں وہ مجھے جھوٹا مشہور کر دیں گے تو میں اس موقع پر غلط بیانی سے کام لیتا[1]

۳۔ سچائی یقین کا سرچشمہ ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا ایک زبردست ثبوت آپ کا وہ بے پناہ یقین ہے جو آپ کو اپنے دعوے پر حاصل تھا۔ سچا انسان واقعات کی صحیح ترجمانی کرتا ہے اس لیے وہ پورے یقین کے ساتھ بول سکتا ہے لیکن جھوٹا شخص تذبذب اور بے یقینی کا شکار ہوتا ہے کیونکہ وہ واقعات کو چھپاتا ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم مسلسل تئیس سال تک اپنے دعوی رسالت پہ قائم رہے لیکن کبھی بھی آپ کی زبان سے یا آپ کے کسی عمل سے یہ ظاہر نہیں ہوا کہ آپ کو اپنے رسول ہونے میں کوئی شک یا تردد ہے۔ جھوٹا شخص عزم و ارادے کی قوت سے خالی ہوتا ہے۔ وہ مشکلات میں اپنے مقام پر جم نہیں سکتا۔ آزمائشیں اس کے چہرے سے جھوٹ کی نقاب اتار دیتی ہیں اور وہ دنیا کے سامنے بالکل ننگا ہو جاتا ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ نازک ترین مواقع پر بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اس یقین میں بال برابر فرق نہیں آتا کہ آپ خدا کے رسول ہیں۔

---

[1] بخاری، کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

آپ نے رسالت کا اعلان کیا تو آپ کی قوم جو آپ کو امین کہتی تھی آپ کی دشمن بن گئی۔ آپ کے چچا ابوطالب گو مسلمان نہیں تھے لیکن آپ کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ قریش کے ذمہ داروں نے ان سے کہا کہ آپ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اس کام سے باز رکھیے یا آئیے کہ میدان جنگ میں ہمارا اور آپ کا فیصلہ ہو جائے۔ قوم کی اس دھمکی سے حضرت ابوطالب یقیناً متاثر ہوئے۔ انھوں نے آپ سے کہا بیٹے میرے حال پر اور خود اپنی ذات پر رحم کھاؤ۔ مجھ پر اتنا بار نہ ڈال دو کہ میں اٹھا نہ سکوں۔" یہ سنتے ہی آپ سمجھ گئے کہ اب ابوطالب آپ کی حمایت سے دست کش ہونا چاہتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے اس نازک موقع پر عزیمت کے وہ الفاظ کہے کہ اس سے زیادہ عزم وارادے کو ظاہر کرنے والے الفاظ آج تک تاریخ نے نہیں سنے "چچا جان! خدا کی قسم اگر میرے مخالفین میرے داہنے ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ دیں اور چاہیں کہ میں اس کام کو چھوڑ دوں تو بھی اسے نہیں چھوڑ سکتا۔ یا تو خدا اسے غالب کرے گا یا میں اسی راہ میں فنا ہو جاؤں گا۔" [1]

یقین کا یہ مقام اس عالم میں اسی شخص کو ملتا ہے جس کی زبان سے سچائی بول رہی ہو۔ جھوٹ ایک جرم ہے اس لیے جھوٹا شخص ہمیشہ اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے اندر اقدام کا حوصلہ نہیں ہوتا بلکہ اسے ہر وقت اپنی مدافعت کی فکر ہوتی ہے لیکن سچائی اپنے اظہار کے لیے بے تاب ہوتی ہے۔ اس کی فطرت ہے کہ کھلے اور غالب آجائے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر ایک سچے انسان کی طرح یقین کا ایسا طوفان اٹھ رہا تھا جو مزاحمتوں کو توڑ کر ساری دنیا پر چھا جانا چاہتا ہے۔ آپ اپنی قوم کے بارے میں جس سے آپ کی جنگ جاری تھی فرماتے ہیں۔

ارید منھم کلمۃ تدین	میں چاہتا ہوں کہ قریش صرف ایک کلمہ
لھم بھا العرب وتؤدی الیھم	قبول کرلے۔ اگر وہ اس کے لیے تیار ہے تو سارا
العجم الجزیۃ۔	عرب اس کا تابع ہو جائے اور عجم اسے جزیہ
(ترمذی، ابواب التفسیر، سورۂ ص)	دینے لگے۔

خدا کی طرف بلانے کے جرم میں آپ پر اور آپ کے ساتھیوں پر مصیبت کے پہاڑ ٹوٹ رہے ہیں۔ بے بسی اور مظلومیت کا وہ عالم ہے کہ کوئی شخص اس کے ختم ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا لیکن آپ

پورے یقین کے ساتھ صحابہ سے فرماتے ہیں کہ صبر کرو ان حالات میں لازمًا انقلاب آنے والا ہے۔

واللّٰہ لیتمن ھذا الامر	خدا کی قسم یہ دین غالب آکر رہے گا
حتی یسیر الراکب من	ظلم مٹ جائے گا اور سارے عرب میں امن
صنعاء الی حضر موت لا	حد تک امن وامان ہوگا کہ ایک سوار صنعاء سے
یخاف الا اللہ او الذئب	حضر موت تک تنہا سفر کرے گا اور اسے سوائے
علی غنمہ ولکنکم	خدا کے خوف کے یا اپنی بکریوں کے سلسلے میں بھیڑیے کے
تستعجلون[1]	خطرے کے اور کوئی خوف نہ ہوگا لیکن تم لوگ تو
	جلدی کر رہے ہو۔

عدی بن حاتمؓ آپ کی خدمت میں موجود تھے کہ ایک شخص آیا اور فقر وفاقہ کی شکایت کرنے لگا۔ اتنے میں دوسرا شخص پہنچا اور شکوہ کیا کہ راستہ غیر محفوظ ہے اور ہر طرف لوٹ مار مچی ہوئی ہے۔ حالات کے اس بگاڑ اور ابتری کو سن کر نہ آپ گھبراتے ہیں اور نہ مایوس ہوتے ہیں بلکہ خاص پیغمبرانہ وثوق کے ساتھ عدی بن حاتم سے کہتے ہیں کہ یہ حالات باقی نہیں رہ سکتے۔ لازمًا انہیں بدلنا ہے اور وہ بدل کر رہیں گے۔ آپ نے فرمایا "عدی! تم (عراق کے شہر) حیرہ سے واقف ہوگے؟ اگر تمہاری زندگی رہی تو دیکھوگے کہ ایک بڑھیا حیرہ سے چلے گی اور کعبہ کا طواف کرکے لوٹ جائے گی۔ سوائے خدا کے خوف کے اور کسی کا خوف اسے نہ ہوگا۔ اگر تمہاری زندگی رہی تو دیکھوگے کہ کسریٰ کے خزانے تمہارے ہاتھ میں ہیں۔ اگر تمہاری زندگی رہی تو دیکھوگے کہ آدمی اپنا ہاتھ بھر کر سونا چاندی لے کر نکلے گا تاکہ کسی محتاج کو دے لیکن اسے کوئی محتاج نہ ملے گا[2]

جنگ احد میں مسلمانوں کو فتح کے بعد شکست کھانی پڑی۔ ستر مسلمان شہید اور خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہوگئے۔ حتیٰ کہ ایک وقت آپ کی شہادت کی افواہ بھی پھیل گئی جس کی وجہ سے بہت سے مسلمان ہمت ہار کر بیٹھ گئے۔ لیکن اس کے باوجود آپ کے اس یقین نے شکست نہ مانی کہ آپ خدا کے رسول ہیں اور خدا کی مدد آپ کے ساتھ ہے۔ جب مشرکین نے جنگ کا نقشہ دیکھا تو ان کے قائد ابوسفیان نے بتوں کے نعرے لگانے شروع کر دیے اس پر آپ نے اپنے

---

[1] بخاری، کتاب المناقب، باب علامات النبوۃ فی الاسلام۔ [2] حوالہ سابق

ساتھیوں سے کہا کہ تم انہیں بتا دو کہ ہم بے یار و مددگار نہیں ہیں " اَللّٰہُ مَوْلَانَا وَلَا مَوْلٰی لَکُمْ " ہمارا سرپرست خدا ہے اور تمہارا کوئی سرپرست نہیں ہے[1]

اسی طرح جنگِ حنین میں قبیلہ ہوازن کا حملہ اتنا سخت ہوا کہ مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے لیکن آپ اس اعلان کے ساتھ پہاڑ کی طرح اپنی جگہ جمے رہے کہ ' اَنَا النَّبِیُّ لَا کَذِبْ ' میں خدا کا پیغمبر ہوں یہ سچا دعویٰ ہے۔ اس میں کوئی جھوٹ نہیں ہے[2]

۴۔ خدا سے آپ کا بہت گہرا تعلق تھا۔ یہ آپ کے رسول ہونے کی دلیل ہے۔ کیونکہ جو شخص خدا کا رسول ہوگا لازماً خدا سے اس کا رشتہ مضبوط ہوگا۔ آپ کی زندگی میں خدا سے تعلق اس قدر نمایاں تھا کہ اسے ہر وہ شخص جو آپ سے قریب تھا پوری شدت سے محسوس کرتا تھا۔ ظاہر ہے کوئی غیر حقیقی وصف انسان کی زندگی میں اس طرح کبھی بھی نمایاں نہیں ہوسکتا۔ جو جذبات انسان کے اندر سے ابلتے ہیں وہ اس کی پوری سیرت پر چھا جاتے ہیں لیکن جن جذبات کے لیے انسان کے اندرون میں کوئی تحریک نہیں ہوتی وہ بہ تکلف ابھرتے ہیں اور بآسانی دب جاتے ہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خدا کی یاد کوئی مصنوعی چیز نہیں تھی بلکہ وہ آپ کے باطن میں اتری ہوئی تھی۔ آپ کی روح اس احساس سے سرشار تھی کہ خدا آپ کا حاکم اور معبود ہے۔ آپ کا سر نیاز اسی کے سامنے جھکتا، آپ اسی کو موت وحیات اور تکلیف و راحت کا مالک سمجھتے، اسی سے دعائیں مانگتے اور الحاح وزاری کرتے، آسائش میں اسی کے شکر گزار ہوتے اور مصیبت میں اسی سے مدد طلب کرتے۔ اگر دنیا کو فریب دینے کے لیے آپ نے خدا سے تعلق کا دعویٰ کیا تھا تو اس طرح قدم قدم پر اس کا مظاہرہ نہ ہوتا۔ کیونکہ کسی جھوٹے تعلق کی اتنی زبردست حکومت انسان پر قائم نہیں ہوسکتی۔ آپ نے اپنے رنج و راحت، خوف و اطمینان، مرض و صحت غرض یہ کہ ہر حال میں خدا کی ذات سے جس مضبوط تعلق کا اظہار کیا ہے وہ آپ کی صداقت کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔

حضرت ابو طالب کی وفات کے بعد مکے میں آپ کی مخالفت اپنی آخری حد کو پہنچ گئی تو آپ طائف تشریف لے گئے اور وہاں کے سرداروں کے سامنے اپنی دعوت پیش کی لیکن انھوں نے مکہ والوں سے بھی زیادہ برا سلوک کیا۔ ان کے اشارے پر طائف کے غنڈوں نے آپ کو اتنا ستایا کہ آپ

---

[1] بخاری، کتاب المغازی [2] بخاری کتاب المغازی۔

ایک باغ میں پناہ لینے پر مجبور ہوگئے۔ اس وقت آپ نے اپنے خدا سے فریاد کی۔

"اے اللہ میں اپنے ضعف و ناتوانی، اپنی کم تدبیری اور لوگوں کے نزدیک اپنی سبکی کی تجھ سے شکایت کرتا ہوں۔ اے سب سے بڑے مہربان! کمزوروں کا سہارا تو ہی تو ہے۔ اے میرے رب! مجھے کس کے حوالے کرتا ہے؟ کسی غیر کے حوالے، جو میرے ساتھ بد خلقی سے پیش آئے۔ کیا کسی دشمن کو میرے معاملات سونپ رہا ہے؟ اگر تو مجھ سے خوش ہے اور مجھ پر تیرا غضب نہیں ہے تو مجھے کسی بھی چیز کی پروا نہیں ہے لیکن اس کے باوجود میں ہر حال میں تیری عافیت کا طالب ہوں۔ اے اللہ! میں تیرے چہرے کے نور کے ذریعہ، جس سے ظلمتیں چمک اٹھتی ہیں اور جس سے دنیا و آخرت کے معاملات سنورتے ہیں، اس بات سے پناہ مانگتا ہوں کہ مجھ پر تیرا غضب نازل ہو اور تو مجھ سے ناخوش ہو جائے۔ اے اللہ! مجھے تجھ ہی کو خوش کرنا ہے تاآنکہ تو خوش ہو جائے۔ گناہ سے بچنے اور اطاعت و بندگی کی قوت کا خزانہ تیرے ہاتھ میں ہے اور یہ اسی کو ملتا ہے جسے تو نوازے"[1]

انسان اپنی مصیبتوں میں کسی حقیقی سہارے کو تلاش کرتا ہے۔ جس شخص کا دل صحیح معنی میں خدا سے لگا ہوا نہ ہو اس کے اندر خدا کے بارے میں اتنے گہرے جذبات نہیں ہو سکتے اور وہ مصیبت کے وقت خدا کو اس طرح پکار نہیں سکتا۔

ایک مرتبہ جنگل میں آپ درخت کے نیچے تنہا سو رہے تھے کہ ایک شخص نے آپ کو جگایا اور سوال کیا بتاؤ اب تمہیں کون بچائے گا؟ آپ نے پورے اطمینان کے ساتھ جواب دیا "اللہ"۔ اس کے ہاتھ میں ننگی تلوار تھی لیکن اس لفظ کے سنتے ہی اس نے تلوار نیام میں رکھ دی[2]

یہ اس بات کی ناقابلِ تردید شہادت ہے کہ آپ صرف خدا کو موت و حیات کا مالک سمجھتے تھے۔ اس ایک لفظ کے ذریعے آپ نے خدا پر اپنے اعتماد کا ایسا ثبوت پیش کیا ہے کہ کسی بھی دلیل سے اس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کے اس اعتماد کو غیر حقیقی کہنا انسان کی نفسیات کو جھٹلانا ہے۔ دشمن کی تلوار میں وہ زور اور قوت نہیں ہے جو آپ کے اس ایک لفظ میں موجود ہے۔ تلوار چوک سکتی ہے لیکن اس یقین کی کاٹ سے دشمن بچ نہیں سکتا۔ اس لفظ کے زبان سے نکلتے ہی وہ بے اختیار پکار اٹھے گا کہ یہ شخص اپنی بات میں سچا ہے اور میں لوہے کے ٹکڑے سے سچائی کا مقابلہ کر رہا ہوں۔

---

[1] سیرت ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۲۹-۳۰ [2] بخاری، کتاب الجہاد، باب من علق سیفہ بالشجر فی السفر عند القائلۃ

حضرت حذیفہؓ کی روایت ہے۔

كان النبى صلى الله عليه وسلم اذا حزبه امر صلى[1] — نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی پریشانی لاحق ہوتی یا کوئی اہم کام درپیش ہوتا تو نماز پڑھتے

جو شخص پریشانی میں خدا کی طرف لپکے اور اس کے دربار میں ہاتھ پھیلا دے، ہم کس دلیل سے اس کے رجوع الی اللہ کو جھوٹ اور تصنع قرار دیں؟ یہ کتنی بڑی بدگمانی ہے کہ ہم خدا سے اس انسان کے تعلق کے بارے میں شک و شبہہ کا اظہار کریں جو اسے اپنی آخری پناہ سمجھتا ہے اور اپنی تمام توقعات اسی سے وابستہ کیے ہوئے ہے حقیقت یہ ہے کہ اس نے اپنے عمل سے تعلق باللہ کا ایسا ثبوت فراہم کیا ہے کہ کسی بھی دلیل سے اس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔

آدمی غیروں سے اپنی شخصیت کو پوشیدہ رکھ سکتا ہے لیکن اس کے حقیقی جذبات، بیوی بچوں اور بے تکلف صحبتوں میں چھپے نہیں رہ سکتے۔ آپ کی بیوی حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ ایک رات میں نے آپ کو بستر پر نہیں دیکھا تو خیال ہوا کہ شاید آپ کسی دوسری بیوی کے گھر ہوں گے، لیکن میں نے دیکھا کہ آپ رکوع یا سجدے کی حالت میں ہیں اور خدا کی حمد و ثنا کر رہے ہیں۔

سُبْحَانَكَ وَبِحَمْدِكَ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ — میں تیری پاکی بیان کرتا ہوں اور تعریف تیرے ہی لیے ہے کیونکہ اس کی توفیق تجھ ہی سے ملتی ہے۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے

یہ الفاظ سنتے ہی حضرت عائشہؓ نے کہا "میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، میں کس خیال میں ہوں اور آپ کس عالم میں ہیں؟"[2]

حضرت عائشہؓ ایک دوسری شب کا حال بیان کرتی ہیں کہ میں نے آپ کو بستر سے غائب پا کر اندھیرے میں اِدھر اُدھر تلاش کیا تو میرا ہاتھ قدم مبارک سے چھو گیا۔ آپ سجدے میں تھے اور آپ کی زبان پر یہ الفاظ جاری تھے۔

اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ وَبِمُعَافَاتِكَ مِنْ — خدایا! میں تیری رضا کے ذریعہ تیرے غضب سے اور تیرے عفو و کرم کے ذریعہ تیرے عذاب سے

[1] مسند احمد ج ۵ ص۳۸۸۔ ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ باب وقت قیام النبیؐ من اللیل۔ [2] مسلم کتاب الصلوٰۃ باب ما یقال فی الرکوع والسجود

عَفْوُبَتِكَ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْكَ	پناہ مانگتا ہوں اور خود تجھ سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔
لَا اُحْصِيْ ثَنَاءً عَلَيْكَ اَنْتَ كَمَا	میں تیری حمد و ثنا کا حق ادا نہیں کر سکتا تو بالکل ایسا
اَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ [1]	ہے جیسا کہ خود تو نے اپنے بارے میں کہا ہے۔

رات کی تنہائی ہے اور ایک شخص خدا کے حضور سجدے میں سر رکھے پڑا ہے، اس کی عظمت و تقدیس کا اعتراف کر رہا ہے، اس سے درد بھرے انداز میں التجائیں کر رہا ہے اور اس سے اپنی مغفرت کا طالب ہے۔ بتایئے کہ اسے ہم کس زبان سے خدا پر جھوٹ باندھنے والا کہیں؟ اگر وہ بھی جھوٹا ہے تو کسی کی صداقت کو جانچنے کا آخر کیا معیار قرار دیا جا سکتا ہے؟

عبداللہ بن شخیرؓ کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے اور آپؐ کے سینے سے آہ وزاری اور خوف وخشیت کی آواز اس طرح نکل رہی تھی جیسے چولھے پر ہانڈی کھول رہی ہو، یا چکی چل رہی ہو۔[2]

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی روایت ہے۔

ان كان النبي صلى الله عليه	نبی صلی اللہ علیہ وسلم اتنی لمبی نماز پڑھتے
وسلم ليقوم حتى ترم قدماه	تھے کہ آپ کے پیر ورم کر جاتے۔ جب آپ سے کہا جاتا
او ساقاه فيقال له فيقول افلا	کہ آپ اتنی تکلیف کیوں اٹھا رہے ہیں تو جواب
اكون عبدا شكورا [3]	دیتے کہ کیا میں خدا کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟

خدا کے بارے میں اس شخص کے احساسات کے صحیح ہونے کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے جو خدا کے روبرو اس حال میں کھڑا ہو کہ اس کے خوف سے کانپ رہا ہو اور جس پر خدا کے انعامات کا احساس اس قدر غالب ہو کہ عبادت کرتے کرتے پیروں میں ورم آجائے لیکن اس کے باوجود وہ قصورِ شکر کا اعتراف کرے کہ ابھی حقِ نعمت ادا نہیں ہوا ہے۔ (باقی)

---

[1] مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب ما یقال فی الرکوع والسجود۔

[2] نسائی کتاب الافتتاح۔ ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ، باب البکاء فی الصلوٰۃ۔

[3] بخاری۔ کتاب التہجد، باب قیام النبیؐ حتی ترم قدماہ

قرآنی تعلیمات

(مولانا محمد یوسف اصلاحی)

نکاح علانیہ کیا جائے

فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ (النساء ۲۵)

پس ان لونڈیوں سے ان کے سرپرستوں کی اجازت سے نکاح کرلو۔ اور معروف طریقے کے مطابق ان کے مہر ادا کردو۔ تاکہ وہ حصار نکاح میں پاک دامن بنکر رہیں، آزاد شہوت رانی نہ کرتی پھریں اور نہ چوری چھپے آشنائیاں کریں

آزاد شہوت رانی اور چوری چھپے آشنائیوں کی گندگی سے بچانے کے لیے نکاح کے پاکیزہ اور معلوم و معروف تعلق کی تعلیم دی گئی ہے تو ضروری ہے کہ نکاح علانیہ کیا جائے۔ اسی لیے فقہاء نے پسند کیا ہے کہ نکاح مسجد یا کسی ایسی عام جگہ ہونا چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ شرکت کرسکیں اور سن سکیں اور دو گواہ تو نکاح کے انعقاد کے لیے لازمی ہیں دو گواہوں کے سامنے جب تک ایجاب و قبول نہ ہو نکاح منعقد ہی نہیں ہوسکتا۔

نکاح میں مہر ضروری ہے

وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ (النساء ۲۴)

اور ان حرام[1] عورتوں کے سوا جتنی عورتیں ہیں سب تمہارے لیے حلال ہیں اس طرح کہ مال خرچ کرکے ان سے نکاح کرلو۔

نکاح میں انتخاب کی آزادی

فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ۔ (النساء)

نکاح کرلو اپنی پسند کی عورتوں سے۔

---

[1] ان حرام عورتوں کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

رفیقۂ حیات کے انتخاب[1] میں جس طرح مرد کو آزادی ہے ٹھیک اسی طرح رفیقِ حیات کے انتخاب میں عورت کی پسند کا بھی احترام ہونا چاہیے۔ آج ہزاروں گھروں کی بربادی اور سیکڑوں زندگیوں کی تلخی کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ ماں باپ زوجین کی پسند کا لحاظ کیے بغیر دو افراد کو رشتۂ نکاح میں باندھ دیتے ہیں اور ان سے بے جا طور پر یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنی فطری پسند کے خلاف عمر بھر نباہ کرتے رہیں۔

ایک سے زائد نکاح کی اجازت

فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ (النساء ۳)

پس جو عورتیں تمہیں پسند ہوں ان میں سے دو دو تین تین چار چار سے نکاح کرو۔

قرآن حکیم نے پوری صراحت کے ساتھ ایک سے زائد نکاح کی اجازت دی ہے، اور یہ اجازت انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔ بعض حالات میں تعدد ازدواج ایک تمدنی تقاضا اور ایک اخلاقی ضرورت بن جاتی ہے۔ اگر اس کی اجازت نہ ہو تو پھر وہ لوگ جو ایک عورت پر قناعت نہیں کرسکتے دائرۂ زوجیت سے باہر اخلاقی آوارگی اور صنفی انارکی پھیلانے لگیں گے۔ اس لیے قرآن نے ان لوگوں کو جو اس کی واقعی ضرورت محسوس کرتے ہوں صاف صاف اجازت دی ہے کہ وہ اپنی رغبت اور پسند کے مطابق ایک سے زائد نکاح کرسکتے ہیں۔ اور ایسا کرنے میں کسی پہلو سے قطعاً برائی کا کوئی شائبہ نہیں۔

انصاف نہ کرسکو تو ایک ہی بیوی رکھو

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً (النساء ۳)

پس اگر یہ اندیشہ ہو کہ (ایک سے زائد بیویوں کے درمیان) انصاف نہ کرسکو گے تو پھر ایک ہی بیوی رکھو۔

بلاشبہ قرآن نے چار بیویاں رکھنے کی اجازت دی ہے لیکن اگر کسی کو یہ اندیشہ ہو کہ وہ ایک سے زائد بیویوں کے درمیان انصاف قائم نہ رکھ سکے گا تو پھر اس کو ایک ہی بیوی پر اکتفا کرنا چاہیے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر کوئی انصاف نہ کرسکنے والا شخص دوسرا نکاح کرلے تو وہ باطل ہوگا۔ شریعت کی رو سے ایسا نکاح جائز ہوگا۔ البتہ ایسا شخص خدا اور بندوں کی نظر میں خطا کار ہوگا

[1] اس آزادی انتخاب کی حدود اور تفصیلات کے لیے سنتِ رسولؐ اور کتب فقہ کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ (م ی)

کہ وہ خدا کی اجازت سے فائدہ اٹھانے کے لیے تو مستعد ہے، لیکن بیویوں کے درمیان انصاف کی شرط پوری کرنے کی ہمت اور حوصلہ نہیں رکھتا۔ ایسا شخص دوسرا نکاح کرکے خدا کے ساتھ دغا کرتا ہے آخر اس بودی ہمت اور پست حوصلے کے ساتھ اسے دوسرے نکاح کا کیا حق ہے۔

بیویوں کے درمیان مطلوب انصاف

وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ (النساء ۱۲۹)

اور تمہارے بس میں نہیں کہ بیویوں کے درمیان پورا پورا انصاف کرسکو، تم چاہو بھی تو نہیں کرسکتے پس (خدائی قانون کا منشاء پورا کرنے کے لیے یہ کافی ہے) کہ ایک بیوی کی طرف ایسے نہ جھک جاؤ کہ دوسری کو یونہی (بے سہارا) لٹکتا چھوڑ دو۔ اگر تم اپنے طرزِ عمل کو درست رکھو اور خدا سے ڈرتے رہو تو وہ چشم پوشی کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

ایک سے زائد نکاح کرنے کی شکل میں قرآن نے انصاف اور مساوات کی جو شرط لگائی ہے اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ آدمی ہر حالت میں تمام حیثیتوں سے بیویوں کے درمیان برابری کا سلوک کرے، آدمی انتہائی خواہش کے باوجود بھی اس بات پر قادر نہیں ہے کہ وہ ہر پہلو سے مساوات برت سکے، تو پھر کیا خدا نے ایک ناممکن کام کرنے کا حکم دیا ہے؟ نہیں بلکہ خدائی قانون کا منشاء یہ ہے کہ آدمی اپنے امکان بھر مساوات برتے، معاملات، حقوق، لباس، خوراک، مکان اور شب باشی میں پورا پورا انصاف برتے۔ پھر اگر کوشش کے باوجود کسی بیوی کی طرف طبیعت مائل ہی نہ ہو تو بہر کیف کوئی ایسا سلوک اس کے ساتھ ہرگز نہ کرے کہ وہ بیچ میں لٹکتی رہ جائے۔ شوہر ہونے کے باوجود عملاً ایسا معلوم ہو کہ بن شوہر کے ہے ——— آدمی کی ذمہ داری اس کے امکان اور قدرت کی حد تک ہے اگر وہ قصداً کوئی زیادتی نہیں کرتا۔ سب کو ایک ہی نظر سے دیکھتا ہے، اور سب کے ساتھ ایک سا سلوک کرتا ہے تو فطری مجبوریوں کے تحت تھوڑی بہت جو کوتاہیاں ہوں گی اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرما دے گا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں کے درمیان حقوق کی تقسیم

میں پورا پورا انصاف فرماتے اور دعا فرمایا کرتے اَللّٰھُمَّ ھٰذَا قَسْمِیْ فِیْمَا اَمْلِکُ فَلَا تَلُمْنِیْ فِیْمَا تَمْلِکُ وَلَا اَمْلِکُ ۔ اے اللہ! یہ میری تقسیم ہے، ان چیزوں میں جن پر میرا قابو ہے تو مجھے اس چیز میں ملامت نہ کر جو خالص تیرے قبضے میں ہے

تعددِ ازواج کی حد

فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ (النساء) "اپنی پسند کی عورتوں میں سے دو دو تین تین، چار چار سے نکاح کرو"

قرآن کی اس آیت نے تعددِ ازواج کو محدود کر دیا ہے۔ امت کے تمام فقہا اس پر متفق ہیں کہ بیک وقت صرف چار بیویاں رکھنے کی اجازت ہے۔ احادیث رسول سے بھی آیت کے اسی مفہوم کی تصدیق ہوتی ہے۔ طائف کا رئیس غیلان جب مسلمان ہوا تو اس وقت اس کے نکاح میں نو بیویاں تھیں، آپؐ نے اسے حکم دیا کہ صرف چار بیویاں رکھ لو اور باقی کو چھوڑ دو۔

عدت میں نکاح نہ کرو

وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّکَاحِ حَتّٰی یَبْلُغَ الْکِتٰبُ اَجَلَهٗ (البقرہ ۲۳۵) اور نکاح کر لینے کا فیصلہ اس وقت تک نہ کرو جب تک عدت پوری نہ ہو جائے یعنی دورانِ عدت نکاح کا قطعی فیصلہ نہ کر لو۔ ہاں اگر اشاروں میں عورت تک اپنا مدعا پہنچا دو تو کوئی حرج نہیں۔

عدت میں صاف صاف پیغام نہ دو

وَلَا جُنَاحَ عَلَیْکُمْ فِیْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَکْنَنْتُمْ فِیْ اَنْفُسِکُمْ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّکُمْ سَتَذْکُرُوْنَهُنَّ وَلٰکِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا (البقرہ ۲۳۵) اور عدت کے زمانے میں بیوہ عورتوں سے منگنی کا ارادہ خواہ تم اشارے کنائے میں ظاہر کر دو یا دل میں چھپائے رکھو دونوں صورتوں میں کچھ مضائقہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ ان کا خیال تو تمہارے دل میں آئے گا ہی مگر دیکھو خفیہ عہد و پیمان نہ باندھنا اگر کوئی بات کرنی ہے تو معروف دستور کے مطابق ہی کرو

یعنی جب تک عورت عدت میں ہے نہ تو اس کو صاف صاف نکاح کا پیغام بھیجو۔ نہ اس سے کوئی ایسا وعدہ لو، ہاں اگر کوئی دل میں ایسی خواہش رکھے یا اشاروں کنایوں میں اس تک اپنی خواہش پہنچا دے تو اس میں کوئی حرج نہیں لیکن عدت کے دوران یہ اجازت نہیں کہ دونوں نکاح کا کھلم کھلا فیصلہ کریں۔

عورت سے مقاربت نہ کرو

زوجین کی زندگی میں بعض ایسے مواقع بھی آتے ہیں کہ اس دوران عارضی طور پر زن و شو کے تعلقات ممنوع ہو جاتے ہیں۔

حیض کے زمانے میں

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ط قُلْ هُوَ اَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيْضِ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ

اور لوگ آپ سے حیض کا حکم پوچھتے ہیں؟ (ان سے) کہیے وہ ایک گندگی ہے اس (دوران) میں عورتوں سے الگ رہو، اور ان سے قربت نہ کرو جب تک پاک و صاف نہ ہو جائیں

دوران حیض میں قریب نہ جانے کا مفہوم ہرگز یہ نہیں ہے کہ حائضہ عورت کے ساتھ ایک فرش پر بیٹھنے اور ایک ساتھ ایک دسترخوان پر کھانے سے پرہیز کیا جائے اور اسے بالکل اچھوت بنا کر رکھ دیا جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ زندگی اور واضح تعلیمات سے اس حکم کی جو تشریح ملتی ہے وہ یہ کہ اس میں متعین طور پر صرف فعل مباشرت کی ممانعت کی گئی ہے۔

اعتکاف کی حالت میں

وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عَاكِفُوْنَ فِي الْمَسَاجِدِ (البقرہ)

اور جب تم مسجدوں میں اعتکاف میں بیٹھے ہو تو بیویوں سے مباشرت نہ کرو۔

اعتکاف کی نیت سے کسی ایسی مسجد میں جہاں پانچوں وقت نماز باجماعت ہوتی ہو، قیام کرنے کو اعتکاف کہتے ہیں۔ واجب اعتکاف میں روزہ رکھنا بھی ضروری ہے۔ رمضان کے آخری دس دنوں میں اعتکاف کرنا سنت مؤکدہ ہے۔ اعتکاف کی حالت میں انسانی حاجات کے لیے مسجد سے باہر جانے کی اجازت تو ہے لیکن یہ ضروری ہے کہ آدمی شہوانی لذتوں کی تسکین سے دور رہے۔

احرام حج کے ایام میں

فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ (البقرہ ۱۹۷)

جو شخص ان مقررہ مہینوں میں حج کی نیت کرے اسے چوکنا رہنا چاہیے کہ حج کے ایام میں کوئی شہوانی فعل کوئی برا کام اور کوئی لڑائی جھگڑے کی بات ہرگز نہ ہونے پائے

احرام حج کی حالت میں میاں بیوی کے درمیان نہ صرف تعلق زن و شو ممنوع ہے بلکہ دونوں کے درمیان کوئی ایسی بات یا عمل بھی نہ ہونا چاہیے جو شہوانی رغبت سے تعلق رکھتا ہو۔

ایک الزام کا جواب

۲۰ جولائی ۱۹۴۱ء کے "صدق" لکھنؤ میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے نام ایک محترم صدیقی صاحب کا مکتوب شائع ہوا تھا جس میں دو الزامات لگائے گئے تھے ان کے تصور دین پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ انھوں نے اسلام کا مطالعہ اپنی تکمیل ذات شخصی نجات اور اپنی انفرادی ہدایت کے نقطۂ نظر سے نہیں کیا ہے بلکہ ایک مجلسی و سیاسی نظام کی حیثیت سے کیا ہے اور ان کے نزدیک انفرادی اعمال محض اس لیے اہمیت رکھتے ہیں کہ وہ اس دنیا کے اندر ایک صالح نظام کے سنگ بنیاد ہیں۔ حالانکہ اصل راہ عبدیت بالکل اس کے برعکس ہے ابتداءً اپنی تکمیل فردیت سے کی جاتی ہے۔ نظام اجتماعی فی نفسہ مقصود نہیں بلکہ ایک ضمنی ضرورت ہے اصل غرض فرد کی تکمیل ہے اس لیے کہ فرد کی ذمہ داری ابدی ہے اور نظام اجتماعی اس کی فردیت کی تکمیل کے لیے ایک ضمنی ضرورت ہے۔ اگر صالح نظام نہ ہو تو فرد اپنی ابدی ذمہ داری کے لیے تیار نہیں ہو سکتا بس نظام اجتماعی کے تمام متعلقہ قوانین کی غایت یہی ہے۔

مولانا مودودی نے اس سلسلے میں اپنے خیالات محترم مدیر صدق کو دو مکتوبات میں لکھے تھے انھوں نے یکم ستمبر ۱۹۴۱ء کے صدق میں ان دو مکتوبات کے اقتباسات "مولانا مودودی اور ان کے عقائد و خیالات کی صحیح تعبیر" کے عنوان سے شائع کیے۔

مذکورہ بالا الزام کے جواب میں مولانا مودودی نے جو کچھ لکھا تھا ذیل میں اسے نقل کر رہا ہوں۔ (مدیر زندگی)

مولانا مودودی لکھتے ہیں:۔

دوسرا عجیب نتیجہ جو انھوں نے نکالا ہے وہ یہ ہے کہ میں محض اسلام کے اجتماعی و سیاسی نظام کا

معتقد ہوا ہوں اور انفرادی تکمیل کی صرف اس قدر اہمیت میری نگاہ میں ہے جس قدر اجتماعی نقطۂ نظر سے وہ مطلوب ہے، حالانکہ یہ محض ان کا قیاس ہے، اور لطف یہ ہے کہ وہ اپنے اس قیاس پر اس کے باوجود اصرار کر رہے ہیں کہ ان کے ایک سوال کے جواب میں واضح طور پر انہیں بتا چکا ہوں کہ میرے نزدیک اصل چیز فرد کی تکمیل ہے اور اجتماعی نظام بجائے خود مطلوب نہیں بلکہ فرد کی تکمیل میں مددگار ہونے کی حیثیت سے مطلوب ہے۔ قرآن کی رو سے ہر انسان فرداً فرداً ذمہ دار ہے اور آخرت میں تمام دنیوی تعلقات و روابط توڑ کر ہر شخص کو فرداً فرداً حساب کے لیے پیش کیا جائے گا۔ یہ تو میرا عقیدہ ہے۔ رہی میری تجدید ایمان کی تاریخ تو وہ بھی یہی ہے۔ سب سے پہلے میں جس چیز سے متاثر ہوا وہ یہ تھی کہ قرآن، انسان کو اس کی صحیح قدر و قیمت سے آگاہ کرتا ہے اور اس کی زندگی کا مقصد متعین کرتا ہے اور اس مقصد کی طرف جانے کا راستہ، قدم اول سے لے کر آخری منزل تک نہایت واضح صورت میں پیش کرتا ہے۔ اس چیز کی تلاش مجھے تھی اور اسی کی تلاش کے دوران میں مجھے معلوم ہوا کہ قرآن تکمیل فرد کا راستہ اجتماعی زندگی کے باہر نہیں بلکہ اس کے اندر متعین کرتا ہے اور ایک ایسا اجتماعی نظام بناتا ہے جس میں ہر فرد نہ صرف خود اپنے کمال لائق کو پہنچ سکے بلکہ دوسروں کے لیے بھی کمال کو پہنچنے میں مددگار بن جائے۔ پس ہمارے مدعیِ کشف، شاہ صاحب نے جو کچھ سمجھا ہے وہ اصل حقیقت کے برعکس ہے۔ میں فردیت سے اجتماعیت کی طرف آیا ہوں نہ کہ اجتماعیت سے فردیت کی طرف۔ میرے مضامین میں بھی عموماً یہ بات نظر آئے گی کہ میں فرد کو مقدم اور اجتماعی نظام کو موخر رکھتا ہوں البتہ جہاں مغربی نظامات اجتماعی و سیاسی کے معتقدین سے خطاب کا موقع ہوتا ہے وہاں اسلام کے اجتماعی و سیاسی نظام کی فضیلت پر زور دیتے ہوئے اگر انفرادی پہلو پر زور کم نظر آئے تو اس سے وہ شخص غلط فہمی میں پڑ سکتا ہے جو میری دوسری تحریروں پر نظر نہ رکھتا ہو۔

میری تحریروں میں اجتماعیت پر زیادہ زور جو پایا جاتا ہے اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ علمائے سلف نے بالعموم اخلاق اور عبادات کے انفرادی پہلو ہی کو پیش کیا ہے اور اجتماعی اخلاقیات کی طرف بہت کم توجہ کی ہے۔ نیز عبادات کا یہ پہلو کہ وہ فرد کی تکمیل کے ساتھ ایک صالح جماعت بھی پیدا کرتی ہیں سلف کی تحریروں میں اکثر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ میں نے ضرورت محسوس کی کہ اس کمی کو پورا کیا جائے اور اس ضرورت کا احساس خصوصیت کے ساتھ مجھے اس وجہ سے ہوا کہ مغرب کے اجتماعی

نظامات اپنے لٹریچر اور اپنی تنظیم کے ذریعے سے جب دنیا میں پھیلنے لگے اور رہ وہ مسلمان بھی جو اپنی انفرادی زندگی میں نہایت صحیح العقیدہ اور صحیح العمل ہیں، ان سے متاثر ہونے لگے تو میں نے اس کے اسباب پر غور کیا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ اول تو ہمارے لٹریچر میں انفرادیت غالب تھی جس کے اثر سے مسلمانوں کے رجحانات بالعموم انفرادی ہو کر رہ گئے ہیں اور اجتماعیت کی طرف سے ان کو ذہول ہو گیا ہے اور وہ صوم و صلوٰۃ کی پابندی اور اوامر و نواہی کی اطاعت کے ساتھ غیر اسلامی نظامات اجتماعی کے ساتھ تعلق پیدا کرنے میں کوئی غلطی نہیں پاتے۔ دوسرے اسلام کے اجتماعی نظام کی تفصیلات پر ہمارا لٹریچر اس قدر تشنہ ہے اور غیر اسلامی نظامات اجتماعی کا لٹریچر اس قدر پُر زور ہے کہ اسلام پر صحیح اعتقاد رکھنے کے باوجود ایک شخص جب اجتماعی مسائل سے دوچار ہوتا ہے تو لامحالہ کسی نہ کسی طور سے مغرب کا اجتماعی فلسفہ اور نظامات اجتماعی کے اصول اس کے ذہن پر مسلط ہو جاتے ہیں۔ ان وجوہ سے میں نے اپنے نزدیک دین کی خدمت اسی کو سمجھا کہ جس پہلو میں اسلامی لٹریچر پہلے ہی کافی مالدار ہے اس میں اضافہ کرنے کے بجائے اس پہلو کو (باعتبار توضیح و تفصیل) مکمل کرنے کی کوشش کروں جس میں سلف کا مہیا کردہ لٹریچر ناکافی ہے۔ اگر کوئی شخص کسی ایسی چیز کو فراہم کرنے کی کوشش کرے جو اگلوں سے چھوٹ گئی ہے یا جس میں اگلوں نے کام کم کیا ہے تو اس کو یہ الزام نہیں دیا جا سکتا کہ وہ اس چیز کے سوا کسی دوسری چیز کی اہمیت ہی نہیں سمجھتا۔ بزرگان سلف میں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ اپنے دور میں انھوں نے جس فتنے کو زیادہ سخت دیکھا اس کے مقابلے پر زیادہ زور صرف کیا اور اسی طرح جس پہلو میں مسلمانوں کو کمزور پایا اسی کو قوت پہنچانے کی زیادہ کوشش کی۔

شرائطِ ایجنسی

(۱) ایجنسی کم سے کم ۵ رسائل پر دی جائے گی۔

(۲) رسائل حسب ضرورت طلب کیے جائیں، اگر فروخت نہ ہوئے تو واپس نہیں لیے جائیں گے۔

(۳) کمیشن ۲۵ فی صدی دیا جائے گا۔ البتہ پچاس یا زائد رسالوں کی خریداری پر کمیشن ۳۳ فی صدی ہوگا۔

(۴) رسائل کی روانگی کا صرفہ ہمارے ذمے ہوگا اور رجسٹری یا وی پی کا خرچ ایجنٹ صاحبان کے ذمہ ہوگا۔

(۵) رقم ہر حال میں پیشگی آنی چاہیے یا پھر وی پی بھیجنے کی اجازت دی جائے۔ وی پی کے مصارف زیادہ ہوں گے۔

رسائل و مسائل

مجبوری کی توضیح

خط

عرض خدمت ہے کہ رسالہ زندگی ماہ اکتوبر ۱۹۶۳ء نظر سے گزرا اور رسائل و مسائل میں بینک کے سود سے متعلق جو سوال کیا گیا تھا اس کے جواب میں آپ نے اچھی وضاحت تو کر دی ہے لیکن آپ نے یہ جو لکھا ہے کہ "مجبوری کی بنا پر ایسا کیا جا سکتا ہے" یہ بات میری سمجھ میں نہیں آسکی اور شاید بہت سارے زندگی کے ناظرین اس جملے کو نہ سمجھے ہوں گے برائے مہربانی آئندہ شمارے میں اس کی وضاحت فرمادیں۔

جواب

میں نے اپنے جواب میں جو عبارت لکھی ہے وہ یہ ہے:۔

"مسلمان کو جہاں تک ممکن ہو اس سے پرہیز کرنا چاہیے' ہاں مجبوری کی حالت میں ایسا کیا جا سکتا ہے"

اس مسئلے میں مجبوری کی حالت سے میری مراد یہ ہے کہ اگر کثیر رقم کی حفاظت کا کوئی معقول اور قابلِ اطمینان انتظام نہ ہو سکے اور بینک میں داخل کیے بغیر اس کے ضائع ہونے کا شدید خطرہ لاحق ہو تو استحفاظ کے لیے رقم بینک میں محفوظ کرائی جا سکتی ہے۔

یہ مجبوری کی حالت' مختلف اشخاص و افراد' اداروں اور مقامات کے لحاظ سے متعین ہوگی اس کے لیے کوئی لگا بندھا قاعدہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر ہندوستان میں بعض بڑے ادارے ایسے ہیں اور ہو سکتے ہیں کہ وہ بطور خود کسی بڑی رقم کی حفاظت کا انتظام کر سکتے ہیں تو وہ بینک میں روپیے جمع کرنے پر مجبور نہ ہوں گے اور جو ادارہ یا ایسوسی ایشن اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ خود حفاظت کر سکے یا کسی غیر سودی اور قابل اعتماد ادارے کے ذریعہ حفاظت کرا [illegible] اس کے لیے مجبوری

کی حالت پیدا ہو جائے گی۔ غرض یہ کہ کوئی شخص ہو یا ادارہ اسے خدا کو حاضر و ناظر جان کر یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ مجبوری کی حالت پیدا ہوئی ہے یا نہیں ۔

معمہ بازی کا کاروبار ناجائز ہے

سوال

مسلمانوں میں معمہ بازی' وبا کی طرح پھیلتی جا رہی ہے' بہت سے رسائل و اخبارات یہ کاروبار کر رہے ہیں ان میں سے بعض افراد' اس کو گیم آف اسکیل کہتے ہیں اور اس کے ناجائز ہونے میں شبہہ ظاہر کرتے ہیں۔ آپ شرعی طور پر بتائیے کہ یہ کاروبار جائز ہے یا ناجائز اگر ناجائز ہے تو اس کی وجہ کیا ہے ؟

جواب

حصول مال کی خواہش' انسان کی طبیعت میں داخل ہے اور وہ طبعی طور پر مال سے محبت کرتا ہے ت جب تک اپنی حد پر قائم رہتی ہے' ہر شخص کی اپنی ذات کے لیے بھی مفید ہوتی ہے اور معاشرے لیے بھی' لیکن جب یہ اپنی حد سے آگے بڑھتی ہے تو فساد شروع ہو جاتا ہے ۔

معاشی طور پر معاشرے میں بگاڑ پیدا کرنے کے لیے شیطان نے انسان کو بہت سی تدبیریں سکھائی ' ان میں سے ایک بڑی تدبیر جوا ہے۔ جوے کی اصل یہ ہے کہ انسان محض قلیل رقم صرف کر کے کثیر م پر ہاتھ صاف کرنا چاہتا ہے' اس میں نفع و نقصان کا دارومدار محض بخت و اتفاق پر ہوتا ہے ۔ ت سے لوگ' جیت جاتے ہیں اور قسمت ہی سے ہار جاتے ہیں ـــــ اسلام سے پہلے عرب میں ے' پانسوں اور تیروں سے جوا کھیلتے تھے اور اب اس کے سیکڑوں طریقے ایجاد کر لیے گئے ہیں ۔ یں طریقوں میں سے ایک طریقہ "معمہ بازی" بھی ہے' جوے سے چونکہ معاشرے میں بڑی خرابیاں واقع ہوتی ہیں' اس لیے اللہ تعالے نے اس کو بڑی تاکید کے ساتھ حرام قرار دیا ہے۔ شراب' جوا' بتوں کے تھان اور پانسوں کو ایک ہی آیت میں حرام کیا گیا ہے اور ان سب کو گندگی اور شیطانی کام کہا گیا ہے اور مسلمانوں کو پوری تاکید کے ساتھ ان سے پرہیز کا حکم دیا گیا ہے ۔

جو لوگ، معمہ بازی کو گیم آف اسکیل سمجھتے ہیں، ان کو انصاف کے ساتھ اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ پانسوں کے ساتھ جوا کھیلنے میں اور معمہ بازی میں کوئی بنیادی فرق موجود نہیں ہے۔ پانسے میں بھی اصل مدار قسمت اور اتفاق پر ہوتا ہے اور معموں میں بھی جیتنے کا دارومدار محض قسمت اور اتفاق پر ہوتا ہے۔ تعجب ہے کہ لاٹری کو تو لوگ جوا سمجھتے ہیں اور معمہ بازی کے جوا ہونے میں شبہہ کرتے ہیں حالانکہ معمہ بازی لاٹری سے بدتر قسم کا جوا ہے۔ لاٹری میں تو صرف روپیہ برباد ہوتا ہے۔ اور معمہ میں روپیہ اور وقت دونوں غارت ہوتے ہیں۔ آخر کون شخص اس کو انصاف قرار دے سکتا ہے کہ ہزاروں افراد کو برباد کرکے دس بیس افراد اپنی جھولیاں بھرلیں۔ بڑے بڑے معمہ باز فیس کے نام سے لاکھوں روپیہ جمع کرتے ہیں، معمے حل کرنے والوں میں دو چار کو دس بیس ہزار دے دیتے ہیں اور باقی رقم ان کی موٹی توند میں پہنچ جاتی ہے — یہ ایک ظلم ہے، صریح ظلم ہے اس سے ہر اس شخص کو بچنا چاہیے جو آخرت کے عذاب و ثواب پر ایمان رکھتا ہے — اسلامی شریعت نے ہر ایسے معاملے کو ناجائز قرار دیا ہے جس میں نفع اور نقصان کی بنیاد محض قسمت اور اتفاق پر ہو اور اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ معموں میں نفع اور نقصان قسمت اور اتفاق ہی پر موقوف ہوتا ہے۔

روپیے اور وقت کی بربادی کے علاوہ اس کا ایک بڑا نقصان یہ بھی پہنچتا ہے کہ معاشرے کے ہزاروں افراد ذہنی اور عملی طور پر سست، کاہل، محنت سے جی چرانے والے اور مفلوج بن کر رہ جاتے ہیں اور اب تو معلوم ہوا ہے کہ بے حیائی کو پسند کرنے والے لوگ اس کو بے حیائی پھیلانے کے لیے بھی استعمال کر رہے ہیں۔ بہت سے حروف اس طرح مرتب کیے جاتے ہیں کہ ان کا حل کوئی فحش لفظ بنتا ہے۔ (سید احمد قادری)

جُوے کی حُرمت

اے مومنو! بلاشبہہ شراب اور جوا اور بتوں کے تھان اور پانسوں کے تیر گندگی اور شیطانی کام ہیں تو ان سے بالکل الگ رہو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

(المائدہ ۹۰)

رُوداد مجلسِ شوریٰ

منعقدہ ۶ ستمبر تا ۱۰ ستمبر ۱۹۶۳ء

۶ ستمبر ۱۹۶۳ء کو بعد نماز جمعہ مولانا ابواللیث صاحب اصلاحی ندوی امیر جماعت اسلامی ہند کی صدارت میں جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کا اجلاس شروع ہوا۔ جناب کے.سی عبداللہ صاحب جناب شمس پیرزادہ صاحب، مولانا نظام الدین صاحب، جناب انعام الرحمٰن خاں صاحب، جناب محمد مسلم صاحب، مولانا محمد عزیز صاحب، جناب امین الدین احمد صاحب، جناب افضل حسین صاحب جناب محمد شفیع صاحب مونس، مولانا صدرالدین صاحب، جناب محمد یوسف صاحب صدیقی، جناب سید حامد علی صاحب، جناب سید حامد حسین صاحب اور محمد یوسف قیم جماعت شریک اجلاس تھے۔ جناب محمد عبدالحی صاحب کچھ تاخیر سے پہنچے اور اگلے روز صبح کی نشست سے شریک اجلاس ہو سکے۔

اجلاس کا آغاز مولانا محمد عزیز صاحب کی تلاوت قرآن پاک سے ہوا۔ ایجنڈے کی خاص دفعات جماعت اسلامی کے کچھ اندرونی معاملات و مسائل سے متعلق تھیں جن میں دستور جماعت کے بارے میں بعض ترمیمات پر غور کرنا بھی شامل تھا جس کی تجویز ایک رکن شوریٰ کی طرف سے پیش ہوئی تھی۔ ان امور و مسائل کے سلسلے میں فیصلے ہوئے۔ دستور کے سلسلے میں جو ترمیمات پیش ہوئیں ان سے مجلس نے اتفاق نہیں کیا۔

عام حالات و مسائل پر بھی کچھ غور و خوض کیا گیا۔ شوریٰ نے اہمیت کے ساتھ سہ لسانی فارمولے کے نفاذ سے پیدا شدہ صورت حال پر تفصیل سے غور کیا اور حسب ذیل قرار داد منظور کی۔

سہ لسانی فارمولا ملک کی مختلف ریاستوں کے نصاب تعلیم اور درسیات کے ذریعے جس طرح مسلمان بچوں کے دل و دماغ مسموم کیے جا رہے تھے۔ یہی چیز کیا کم ہولناک تھی کہ اب بعض ریاستوں خصوصاً یوپی میں سہ لسانی فارمولا جس شکل میں نافذ کیا جا رہا ہے اس کا عملی نتیجہ یہ

ہوگا کہ مسلمان بچے سرکاری اسکولوں میں نہ صرف یہ کہ اردو کی تعلیم سے محروم رہیں گے بلکہ ان کو مجبوراً سنسکرت پڑھنا پڑے گی اور اس طرح وہ اپنی اس زبان ہی سے دور نہیں ہو جائیں گے جس میں ان کا تہذیبی سرمایہ ہے بلکہ سنسکرت زبان کے ذریعہ ان کے دل و دماغ میں مثبت طور پر وہ عقائد و خیالات داخل ہوں گے جو اسلام کے منافی ہیں ۔

مجلسِ شوریٰ اس صورت حال کو سخت تشویش کی نظر سے دیکھتی ہے' اس کی مذمت کرتی ہے اور حکومت سے پُرزور مطالبہ کرتی ہے کہ جو بچے اردو پڑھنا چاہتے ہیں ان کے لیے اردو تعلیم کا بندوبست کیا جائے اور ایسی صورت حال نہ پیدا کی جائے جس میں وہ اردو کے بجائے سنسکرت پڑھنے پر مجبور ہو جائیں

مجلسِ شوریٰ ملت کو بھی اس خطرے سے آگاہ کرنا ضروری سمجھتی ہے اور ملت کی تمام جماعتوں سے اور تمام دردمند اصحاب سے اپیل کرتی ہے کہ مذکورہ اسکیم کی خطرناکی کو محسوس کریں اور اپنی آئندہ نسل کے دین وایمان کو اس خطرے سے بچانے کے لیے مل جل کر ایک لائحۂ عمل طے کریں اور باہمی اشتراک و تعاون سے اسے زیرِعمل لائیں ۔

مزید طے کیا گیا کہ سہ لسانی فارمولے کا نفاذ جس شکل میں مختلف ریاستوں بالخصوص یوپی میں کیا جارہا ہے اس سے نہ صرف اردو زبان بلکہ اسلامی تہذیب کے لیے مزید خطرات پیدا ہو گئے ہیں اس لیے اس مسئلے کو پوری اہمیت کے ساتھ سامنے رکھ کر ایسی تدابیر اختیار کی جانی چاہییں جن سے ان خطرات کا انسداد ہو سکے ۔ اس مقصد کے لیے رائے عامّہ کو بیدار کیا جائے اور مختلف افراد اور جماعتوں کو ایک دوسرے کے ساتھ اشتراک و تعاون کی دعوت دی جائے اور ان کے ساتھ ممکنہ تعاون کیا جائے

مساجد کی واگذاری ہندوستان کے مختلف علاقوں میں جو مسجدیں غیر مسلموں کے قبضے میں ہیں ان کا معاملہ زیرِغور آیا ۔ متفقہ طور پر طے پایا کہ " رفقاء کو متوجہ کیا جائے کہ ان کے علاقوں میں جو مسجدیں غیر مسلموں کے قبضے میں ہوں ان کو واگذار اور آباد کرانے کی کوشش کریں اور اس کے لیے حسب ضرورت مناسب تدابیر اختیار کریں اور اس سلسلے میں حتی الوسع غیر مسلموں' حکّام اور مسلمانوں کے دیگر افراد اور جماعتوں کا تعاون حاصل کیا جائے ۔ اس سلسلے میں جو کچھ کیا جائے اور جو نتائج برآمد ہوں ان سے مرکز کو بھی برابر مطلع کیا جاتا رہے ۔

(باقی صد ۶۲ پر ملاحظہ ہو -)

تنقید و تبصرہ

تحقیق وحدۃ الوجود و الشہود

مرتبہ ثناء الحق ایم اے (علیگ) صفحات ۶۰۔ مجلد قیمت دو روپے پچاس نئے پیسے۔ ناشر:- پاک اکیڈمی (۱۴۱/۱ وحید آباد - گولی مار، کراچی ۱۸

مولانا شیخ محمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے مسئلہ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کی تحقیق ایک مختصر رسالے میں کی تھی۔ یہ رسالہ پہلے کبھی چھپا تھا لیکن اب نایاب تھا۔ مصنف، مرتب کتاب جناب ثناء الحق ایم اے کے پرنانا تھے، انھوں نے وہ رسالہ دوبارہ شائع کیا ہے اور اس کے ساتھ مصنف کے مفصل حالات کا اضافہ کیا ہے۔ اصل رسالہ فارسی زبان میں ہے۔ زیر تبصرہ ۶۰ صفحات کی کتاب میں رسالہ ۳۴ صفحات میں آیا ہے اور باقی صفحات مصنف کے حالات سے متعلق ہیں اور تبصرہ نگار کے نزدیک افادۂ عام کے لحاظ سے یہی صفحات قابل قدر ہیں۔ اصل رسالہ کو سمجھنے والے پڑھے لکھے لوگوں میں بھی بہت کم ہوں گے۔

مولانا شیخ محمد ۲ مئی ۱۸۱۵ء کو تھانہ بھون میں پیدا ہوئے اور یکم اپریل ۱۸۷۹ء کو وفات پائی وہ عہد ہندوستان کا ہنگامہ خیز اور انقلابی عہد تھا۔ فاضل مرتب کتاب کی تحریر تھانہ بھون کے اعاظم رجال کی تاریخ پر روشنی ڈالتی ہے۔ مولانا شیخ محمد تھانوی کے جو حالات انھوں نے لکھے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کی شخصیت اس عہد کی ایک ممتاز شخصیت تھی۔ وحدۃ الوجود کے مسئلے پر مولانا کا مختصر رسالہ ان کے علم اور ان کی ذہانت پر خود ایک دلیل ہے۔

وحدۃ الوجود کا مسئلہ در اصل اللہ تعالےٰ کی ذات و صفات اور خالق و مخلوق کے درمیان تعلق کی نوعیت سے متعلق وہ بحث ہے جس نے عربی تصوف کو یونانی فلسفہ بنا دیا۔ وحدتِ وجود اور وحدتِ شہود سے متعلق یہ ساری بحثیں دو وجہوں سے پیدا ہوئیں۔ فلسفۂ یونان سے اثر پذیری

اور قرآن و حدیث کے متشابہات میں غور و خوض، ان مباحث میں بڑی بڑی شخصیتوں کی دھینگا مشتی نے دین کے چشمۂ صاف کو گدلا کر دیا ہے۔ اس نظریے نے جو نقصان پہنچایا ہے اس پر فاضل مرتب نے بھی روشنی ڈالی ہے اور آخر میں عوام کو مشورہ دیا ہے کہ وہ ان مباحث میں نہ الجھیں اور دین اسلام پر جو سادہ اور فطری ہے عمل کریں لیکن مشکل یہ ہے کہ ہمارے خواص نے عوام کو اس یونانی تصوف اور اس کے معتقدات و لوازمات کے چکر میں اس طرح پھنسا دیا ہے کہ وہ اسی کو اصل دین سمجھنے لگے ہیں۔

اس کتاب نے مولانا شیخ محمد تھانوی رحؒ کے حالات زندگی اور ان کی ایک علمی یادگار کو محفوظ کر دیا ہے۔ (ع۔ق)

للعلامۃ المخدوم عبداللطیف التتوی السندی ۔

ذب ذبابات الدراسات (عربی) صفحات ۹۹۰ مجلد مع گرد پوش۔ ناشر:۔ لجنۃ احیاء الادب السندی، سندھ اسمبلی بلڈنگ۔ بندر روڈ۔ کراچی ۔

سندھ کے علماء و ادباء نے اپنے پیچھے جو علمی و ادبی سرمایہ چھوڑا ہے اس کی نشر و اشاعت کے لیے ایک نیم سرکاری ادارہ لجنۃ احیاء الادب السندی (سندھی ادبی بورڈ) کے نام سے قائم ہوا ہے زیر تبصرہ کتاب اسی ادارے کی طرف سے شائع کی گئی ہے۔ عربی ٹائپ میں تقریباً ایک ہزار صفحات کی کتاب شائع کرکے ادارے نے قابل قدر علمی خدمت انجام دی ہے۔ کتاب کا پورا نام ذب ذبابات الدراسات عن المذاہب الاربعۃ المتناسبات ہے۔ یہ کتاب، دراسات اللبیب فی الاسوۃ الحسنۃ بالحبیب کا جواب ہے۔ دراسات اللبیب، شیخ محمد معین بن الشیخ محمد امین سندی متوفی ۱۱۶۱ھ کی ہے اور اس کا جواب ذب ذبابات الدراسات شیخ محمد عبداللطیف بن الشیخ محمد ہاشم سندی متوفی ۱۱۷۴ھ نے لکھا تھا۔ یہ دونوں کتابیں تقلید و عدم تقلید کے موضوع سے متعلق ہیں۔ دراسات اللبیب علمائے اہل حدیث میں بہت مقبول کتاب ہے۔ وہ اپنی کتابوں میں بکثرت اس کے حوالے دیتے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب سے راقم الحروف کو جو نئی بات معلوم ہوئی وہ یہ ہے کہ دراسات کے مصنف دراصل شیعہ تھے اور تقیہ کرکے غیر مقلد بن گئے تھے۔ علامہ شیخ محمد عبداللطیف نے

مقدمہ کتاب میں دلائل کے ساتھ اس پر گفتگو کی ہے۔ اگر واقعہ یہی ہے تو پھر دراسات اللبیب کی علمی حیثیت بہت مجروح ہو جاتی ہے ــــ اس کتاب کے مباحث پر اظہار خیال موجب طوالت بھی ہے اور لاحاصل بھی۔ اس لیے اس سے قطع نظر کرنا ہی مناسب ہے ــــ یہ کتاب مولانا محمد عبدالرشید نعمانی کی تحقیق و تعلیق کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ جدید انداز میں اس ضخیم کتاب کی کئی فہرستیں مرتب کی گئی ہیں جن سے کتاب کی افادیت بڑھ گئی ہے اور اس سے استفادہ آسان ہو گیا ہے۔ کتاب پر قیمت درج نہیں ہے۔ (ع-ق)

تحریکِ اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی۔ صفحات ۲۰۴۔ کاغذ، کتابت طباعت بہتر۔ مجلد مع گرد پوش۔ قیمت تین روپیہ۔

ناشر:۔ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ۱۱، سی شاہ عالم مارکیٹ لاہور۔

اس کتاب کے طبع دوم میں ناشر رقم طراز ہیں:۔

فروری ۱۹۵۷ء کے تیسرے ہفتے میں جماعت اسلامی پاکستان کے ارکان کا ایک اجتماع عام بہاولپور ڈویژن کے ایک غیر معروف قریے ماچھی گوٹھ میں اس غرض کے لیے منعقد ہوا تھا کہ جماعت کے پچھلے کام اور آئندہ لائحہ عمل کے متعلق ایک واضح اور قطعی فیصلہ کیا جائے۔ اس موقع پر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ایک مفصل قرارداد پیش کی تھی اور اس کی تشریح و توضیح کرتے ہوئے ایک طویل تقریر کی تھی تاکہ ارکان جماعت اس پالیسی کو بھی اچھی طرح سمجھ لیں جس پر ابتدا سے آج تک یہ جماعت چلتی رہی ہے اور اس لائحہ عمل کے بھی ہر پہلو سے بخوبی واقف ہو جائیں جو آئندہ کے لیے تجویز کیا جا رہا تھا۔ اور پھر علیٰ وجہ البصیرت ایک فیصلہ کریں۔ اس کے ساتھ ان تمام حضرات کو بھی اپنا نقطۂ نظر اور اپنی تجاویز پیش کرنے کا پورا موقع دیا گیا جو اس سے مختلف رائے رکھتے تھے۔ تین دن کے غور و خوض اور ہر نقطۂ نظر کے متعلق تفصیلی بحث سن لینے کے بعد ارکان جماعت میں سے ۹۲۰ نے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی پیش کردہ قرارداد کے حق میں اور صرف ۱۵ نے اس کے خلاف رائے دی۔ اس طرح یہ قرارداد جماعت کی ۹۸ فی صد سے بھی زیادہ اکثریت سے پاس کی گئی۔ اب وہ قرارداد اور اس پر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تقریر ایک مستقل رسالے کی

صورت میں شائع کی جارہی ہے تاکہ ہر وہ شخص جو جماعت اسلامی اور اس کے کام کو سمجھنا چاہے اس سے فائدہ اٹھا سکے، خود جماعت کے کارکنوں کے لیے بھی ان شاء اللہ اس کا مطالعہ بہت مفید ثابت ہوگا۔ (دیباچہ)

تبصرہ نگار بھی اس رائے سے اتفاق کرتا ہے کہ جماعت اسلامی اور اس کے کام کو سمجھنے کے لیے یہ رسالہ بہت مفید ہے۔ جماعت اسلامی کی تاسیس سے لے کر ۱۹۵۸ء تک کا ایک مفصل جائزہ اس میں آگیا ہے۔ (ع۔ق)

(رُوداد کا بقیہ)

مجلس نے مالیگاؤں کے فسادات پر گہری تشویش کا اظہار کیا اور مظلومین کے ساتھ اظہار ہمدردی کیا اور طے کیا گیا کہ مزید حالات معلوم کرنے کے لیے سید حامد حسین صاحب معاون قیم جماعت کو مرکز کی طرف سے بھیجا جائے اور وہ تحقیقات کے بعد اپنی رپورٹ مرکز کے سامنے پیش کریں۔ یہ بھی طے ہوا کہ ضرورت ہو تو ریلیف کا کام بھی کیا جائے۔

مسلم پرسنل لا کا مسئلہ سامنے آیا۔ تفصیلی گفتگو کے بعد طے پایا کہ

"محمڈن لا میں اصلاحات کرانے کے لیے جماعت اسلامی کو الگ سے کوئی جدوجہد کرنے کی ضرورت نہیں ہے البتہ جماعتی طور سے اس بات کی کوشش کی جانی چاہیے کہ دیگر جماعتیں اور ادارے جو اس سلسلے میں کچھ کرنا چاہتے ہیں ان کے درمیان حتی الوسع زیادہ سے زیادہ اشتراک و تعاون پیدا ہو سکے اور ان کوششوں کے بہتر اور قابل اطمینان نتائج برآمد ہو سکیں

۱۰ ستمبر کو مغرب کے قریب دعا پر اجلاس کی کارروائی ختم ہوئی۔

محمد یوسف قیم جماعت اسلامی ہند

(اشارات کا بقیہ)

اور اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ کی آیت کو اترے ہوئے تیرہ سو چہتر سال گزر چکے ہیں۔ اب پورا قرآن ہمارے ہاتھوں میں ہے صرف وہ حصہ نہیں ہے جو مکہ میں نازل ہوا تھا ـــــ جس وقت

یہ آیت اتری تھی اس وقت کے مسلمان اتنے ہی احکام کی اقامت کے مکلف تھے جتنے ان پر فرض کیے گئے تھے اور پھر جیسے جیسے شرعی احکام نازل ہوتے رہے وہ دین حق کا جزو بنتے رہے اور ان کی اقامت فرض ہوتی رہی۔ اللہ نے نماز فرض کی وہ دین کا جزو بن گئی، اس نے زکوٰۃ فرض کی وہ دین کا جزو بن گئی۔ اس نے رمضان کے روزے فرض کیے وہ جزو بن گئے۔ پھر اس نے حج فرض کیا وہ جزو بن گیا۔ اللہ نے حکم دیا کہ میرے راستے میں جنگ کرو۔ قتال فی سبیل اللہ دین کا جزو بن گیا، اس نے چوری، زنا اور دوسرے جرائم کی حدیں نازل کیں وہ دین کا جزو بن گئیں، اس نے سود حرام کیا اور اس کی حرمت، دین حق کا ایک اہم قانون بن گئی، یہاں تک کہ دین و شریعت کی تکمیل کردی گئی اور اب امت مسلمہ پورے دین کی مکلف اور اس کی امین ہے۔

مکی آیتوں میں "دین"، "ایمان"، اور "عمل صالح" کی جو جامع اصطلاحیں استعمال ہوتی ہیں، مفسرین ان کی تفسیر پورے قرآن کو سامنے رکھ کر کرتے ہیں، نہ کہ صرف مکی آیتوں کو سامنے رکھ کر۔ اسی سورۂ شوریٰ میں وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کا ٹکڑا آیا ہے اب اگر کوئی شخص اس آیت کے تحت ان تمام اعمالِ صالحہ کو داخل کرے جو مدینہ میں نازل ہوئے تھے تو اس پر یہ اعتراض نہیں کیا جا سکتا کہ تم اس آیت کے تحت ان اعمال کو کیسے داخل کر رہے ہو جو مکے میں نازل ہی نہ ہوئے تھے۔ یہ اعتراض دین سے ناواقفیت کا اعتراض ہوگا اس لیے کہ اب "عمل صالح" تمام شریعت کے مجموعے کا نام ہے اسی طرح اب "دین" پورے مجموعۂ دین و شریعت کو کہتے ہیں نہ کہ دین کے صرف ان اجزاء کو جو مکے میں نازل ہوئے تھے۔ مکی آیتوں کی تفسیر مدنی آیتوں کی روشنی میں اور مدنی آیتوں کی تفسیر مکی آیتوں کی روشنی میں مفسرین کا ایک ایسا عام اصول ہے جس سے قرآن کا کوئی طالب العلم ناواقف نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، اقامت دین کو پوری شریعت اسلامی کی اقامت کے لیے ایک جامع اصطلاح تسلیم کرتے ہیں اور مولانا فراہی وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ (العصر) کے ٹکڑے سے خلافت کا وجوب ثابت کرتے ہیں۔

جو لوگ، مفسرین اور سلف کی حمایت کے لیے اٹھے ہیں انہیں ان کے اصول اور علوم و فنون پر دسترس حاصل کرنی چاہیے ورنہ ان کا شمار، سلف کے نادان دوستوں میں ہوگا۔

مختلف چیزوں کے لحاظ سے اقامت کا مفہوم کیا ہے؟ چند لفظوں میں اس کی طرف بھی اشارہ کرنا

مناسب معلوم ہوتا ہے۔ یہ لفظ کسی بیٹھے ہوئے انسان یا جانور کے لیے استعمال کیا جائے گا تو اس کے معنی وہی ہوں گے جو اصل لغت میں اس کے معنی ہیں یعنی کھڑا کرنا مثلاً کَانَ زَیْدٌ قَاعِدًا فَاَقَامَہٗ خَالِدٌ (زید بیٹھا ہوا تھا تو خالد نے اس کو کھڑا کر دیا) لکڑی یا کسی ٹھوس چیز کے لیے جب استعمال ہو گا تو اس کے معنی سیدھا کرنے کے ہوں گے۔ مثلاً اَقَامَ الْعُوْدَ (اس نے لکڑی سیدھی کر دی) کسی معنوی چیز مثلاً نماز کے لیے جب یہ لفظ بولا جائے گا تو اقامت صلوٰۃ کے معنی اس کو پورے حدود و شروط کے ساتھ ادا کرنے کے ہوں گے۔ کسی حد شرعی کے لیے مستعمل ہو گا تو اس کے معنی نافذ کرنے کے ہوں گے۔ مثلاً اَقَامَ حَدَّ السَّرِقَۃِ (اس نے چوری کی حد نافذ کی) کسی آئین و قانون کے لیے استعمال ہو گا تو اس کے معنی اس کو نافذ اور رائج کرنے کے ہوں گے۔ مثلاً اَقَامَ الْقَوَانِیْنَ الْاِسْلَامِیَّۃَ (اس نے اسلامی قوانین کو نافذ اور رائج کیا) ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے:۔ لَحَدٌّ یُقَامُ فِی الْاَرْضِ خَیْرٌ لِاَھْلِھَا مِنْ اَنْ تُمْطَرُوْا اَرْبَعِیْنَ صَبَاحًا (کوئی ایک حد بھی جو زمین میں نافذ کی جاتی ہے وہ اہل زمین کے لیے چالیس دن کی بارش سے زیادہ بہتر ہے) اس حدیث میں اقامت حد کے معنی نافذ ہی کرنے کے ہیں کسی حد شرعی کو نافذ کرنے کے معنی یہی ہوتے ہیں کہ اس پر ٹھیک اس طرح عمل کیا جائے جس طرح تعلیم دی گئی ہے مثلاً چوری کی حد نافذ کرنے کے معنی یہ ہیں کہ تعلیم نبوی کے مطابق حکومت اسلامی کا کوئی کارندہ چور کا ہاتھ کاٹ دے۔

دین چونکہ انفرادی و اجتماعی احکام کا مجموعہ ہے اس لیے کسی حکم (مثلاً نماز) کے لحاظ سے اس کے معنی اس کو پوری اور اچھی طرح ادا کرنے کے ہوں گے اور کسی حکم (مثلاً حد زنا) کے لحاظ سے اس کے معنی نافذ کرنے کے ہوں گے۔ یہ بات بھی ناقابلِ انکار ہے کہ دین اسلام ایک مکمل قانون حیات اور آئین زندگی ہے اس لیے اگر کوئی شخص اَقِیْمُوا الدِّیْنَ (دین قائم کرو) کا مفہوم یہ بیان کرے کہ دین کو نافذ کرو تو یہ مفہوم بالکل صحیح ہو گا۔ گزشتہ ماہ بتایا گیا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ نے اَقِیْمُوا الدِّیْنَ میں دین کا ترجمہ آئین کیا ہے۔ اب اس ترجمے کے لحاظ سے اقامت دین کا مفہوم تنفیذ و ترویج کے سوا اور کیا ہو گا؟

ان سطروں میں بال کی کھال اس لیے کھینچنی پڑی کہ بعض حضرات اقامت دین کے مفہوم کو بھی اپنے محدود و ناقص نقطۂ نظر کی وجہ سے محدود کرنا چاہتے ہیں۔

ماہنامہ

زندگی رامپور

رجب ۱۳۸۳ھ
دسمبر ۱۹۶۳ء

جلد:- ۳۱
شمارہ:- ۶

(مدیر:- سید احمد قادری)

- خط و کتابت و ارسال زر کا پتہ — منیجر "زندگی" رامپور۔ یوپی
- زر سالانہ:- پانچ روپیہ ——— شش ماہی:- تین روپیہ ——— فی پرچہ:- پچاس نئے پیسے
- ——— ممالک غیر سے:- دس شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر

پاکستانی اصحاب مندرجہ ذیل پتہ پر رقوم بھیجیں اور رسید ہمیں ارسال فرمائیں
منیجر ہفت روزہ شہاب ۳/۱ شاہ عالم مارکیٹ لاہور

مالک:- جماعت اسلامی ہند۔ ایڈیٹر:- سید احمد عروج قادری۔ پرنٹر پبلشر:- احمد حسن۔ مطبع:- دہلی پرنٹنگ ورکس محلہ بنگلہ آناد خاں رامپور
دفتر اشاعت:- ماہنامہ زندگی رامپور۔ یو۔پی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

(سید احمد قادری)

آج مسلمان ملکوں کا ہر حکمراں (الا ماشاءاللہ) ہٹلر اور مسولینی بننا چاہتا ہے ان میں کا کوئی بھی ابوبکر اور عمر بننے کا خواہش مند نہیں ہے۔ یہ ایک بڑی مصیبت ہے جس میں وہاں کے عوام گرفتار ہیں، لیکن یہ مصیبت اصل مرض نہیں ہے بلکہ اس کی علامت ہے۔ اصل مرض یہ ہے کہ ان ملکوں کا برسر اقتدار طبقہ اسلام سے ناآشنا ہے، اس نے یورپ کی متعدد حکومتوں کے زیر اثر جو تعلیم و تربیت پائی ہے وہ خالص مادہ پرستانہ ہے، وہ نہیں جانتا کہ اسلام کی حقیقت کیا ہے اور اس کی برکتیں کیا ہیں؟ شاید اس نے شعور کے ساتھ کبھی سوچا بھی نہیں ہے کہ اللہ، رسول اور آخرت پر ایمان کا مطلب کیا ہے، اس کا تقاضا کیا ہے اور مسلمان کسے کہتے ہیں، اسلام کے اصل سرچشمے کتاب و سنت سے وہ بالکل بے خبر ہے اور بے خبر ہی رہنا چاہتا ہے اس کو اس بات کی قطعی فرصت نہیں ہے کہ دین کا علم حاصل کرنے کی کوشش کرے، وہ زیادہ تر مستشرقین کی کتابوں سے اور کچھ ادھر ادھر سے اسلام کے بارے میں ناقص معلومات حاصل کرتا اور اپنی تقریروں اور تحریروں میں اسلام کی الٹی سیدھی مدح و ثنا کرتا ہے اور مدح و ثنا بھی مسلمان عوام کو اس بات پر مطمئن کرنے کے لیے کرتا ہے کہ وہ اسلام کا بڑا عقیدت مند ہے حالانکہ اسلام سے اس کو محض نسلی اور جذباتی قسم کا تعلق ہے اور بس۔

اسلامی ممالک کے عوام نے بیرونی طاقتوں کی غلامی سے آزاد ہونے کے لیے بڑی قربانیاں دی ہیں، انھوں نے اس کے لیے مسلسل اور انتھک محنت کی ہے، سخت مشقتیں برداشت کی ہیں، اور مثال کے طور پر الجزائر کے عوام نے جان و مال کی ایسی قربانی دی ہے کہ آزادی وطن کی تاریخ میں اس کی مثال

نہیں ملتی، لیکن آزادی ملنے کے بعد بہت جلد ان پر یہ حقیقت منکشف ہوگئی کہ جس آرزو اور جس تمنا میں انھوں نے یہ قربانیاں دی تھیں اس کا حصول اب پہلے سے زیادہ مشکل ہوگیا ہے۔ انھوں نے سمجھا تھا کہ وہ اپنے دین و مذہب، کیش و آئین، تہذیب و تمدن اور قومی و ملی انفرادیت کی آزادی کے لیے قربانیاں پیش کر رہے ہیں اور جب ان کا ملک بیرونی جوے سے آزاد ہوگا اور وہ خود اس خار دار اور بے رحم ڈنڈے سے نجات پائیں گے جو انہیں دینی و اخلاقی تباہی کی طرف ہانک رہا ہے تو ان کا دین آزاد ہو جائے گا، ان کی تہذیب آزاد ہو جائے گی، ان کی اخلاقی قدریں آزاد ہو جائیں گی اور ان کے ملک میں ایک ایسی حکومت قائم ہوگی جو خلافت راشدہ نہ سہی، اس کا عکس اور پرتو ضرور ہوگی، لیکن آج انڈونیشیا سے لے کر انڈونیشیا تک، ہر جگہ کے عوام زبان حال سے پکار پکار کر کہہ رہے ہیں۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ ——— وہ اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ بیرونی طاقتوں نے اپنا خار دار اور بے رحم ڈنڈا اپنے شاگردانِ رشید کے ہاتھوں میں تھما دیا ہے اور وہ انہیں ٹھیک اسی تباہی کی طرف ہانک رہے ہیں جس کی طرف بیرونی ہاتھ ہانک رہے تھے اور ستم یہ ہے کہ ان اندرونی ہاتھوں نے اس ڈنڈے پر اسلام اور قومی و وطنی محبت کا غلاف بھی چڑھا لیا ہے۔

مغربی تہذیب کے درخت کی جڑ، آخرت فراموشی اور اس کا پھل دنیا پرستی ہے، آخرت فراموشی اور دنیا پرستی نے منطقی نتیجے کے طور پر، انسانوں کے سامنے ان کی زندگی کا صرف ایک ہی نصب العین پیش کیا ہے اور وہ ہے مادی ترقی ـــ یہی نصب العین اشتراکیت کے نمائندوں کے سامنے بھی ہے اور سرمایہ دارانہ نظام کے نمائندوں کے سامنے بھی، ایک کا آئیڈیل ماسکو ہے اور دوسرے کا واشنگٹن ـــ اس نصب العین نے ملحد و غیر ملحد دونوں کی منزل مقصود ایک کر دی ہے ـــ مسلمان حکومتوں میں سے چند کے سامنے واشنگٹن ہے اور چند کے سامنے ماسکو، عہد رسالت کا مدینہ ہر ایک کی نگاہ سے اوجھل ہے۔

مثال کے طور پر اسی نصب العین کی یکسانی نے ہمارے بھارت کے پنڈت جواہر لال نہرو اور مصر کے جمال عبد الناصر کو ملکی و وطنی ارتقاء کے لحاظ سے بے حد متحد الخیال بنا دیا ہے ـــ راجستھان پردیش کانگرس آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے اجلاس کے موقع پر ایک مخصوص کتابچہ شائع کر رہی ہے۔ اس کتابچے میں ہمارے ملک کے وزیر اعظم کا ایک پیغام شامل ہے۔ اس پیغام میں وہ فرماتے ہیں:۔

"کانگریس کس چیز کی علم بردار ہے؟ یقیناً صرف الکشن لڑنے کے لیے نہیں، نہ صرف حکومت کرنے کے لیے حکومت صرف اس حد تک ضروری ہے جس حد تک وہ ہمارے مقاصد اور نصب العین کے حصول میں ممد و معاون ہو"

وزیر اعظم نے مزید کہا ہے۔ نصب العین ہمارے عوام کا معیار زندگی بلند کرنا ہے اور ان کو غریبی کی لعنت سے نجات دلانا ہے اور ہمارا یہ خیال ہے کہ نظریاتی اور عملی دونوں لحاظ سے یہ نصب العین ایک ایسے سماجی نظام میں پورے ہو سکتے ہیں جس کی بنیاد سوشلسٹ بنیاد پر ہو تاکہ ایک ایسا سماجی نظام کھڑا ہو سکے جو ہر شخص کو ترقی کا موقع دے اور موجودہ معاشی اونچ نیچ کو ختم کر سکے۔

انھوں نے کہا ہے کہ سوشلزم محض کوئی فرضی اور تصوراتی چیز نہیں ہے بلکہ جدید دنیا میں ایک قابل عمل نظریہ ہے۔ یہ سوشلزم کیا شکل اختیار کرے گا اس کا فیصلہ ہم اپنے ملک کے حالات و ماہیت کی روشنی میں کر سکتے ہیں۔

انھوں نے کہا ہے لیکن ایک چیز کو ذہن میں صاف رہنا چاہیے وہ یہ کہ سوشلزم کو جمہوریت کے ساتھ آنا چاہیے اور اس کے لانے کے تمام طریقے پُرامن ہونے چاہیں۔

قومی آواز یکم نومبر ۶۳ء

اس کے بعد دیکھیے کہ جمال عبدالناصر صاحب "متحدہ عرب جمہوریہ کے قومی منشور" میں کیا فرماتے ہیں:

"اشتراکیت، سماجی ترقی کا راستہ ہے، قومی دولت میں ہر شہری کے لیے مساوی مواقع کا انتظام کیے بغیر سماجی آزادی حاصل نہیں کی جا سکتی، اس کا مطلب قومی دولت کا شہریوں میں از سر نو تقسیم کرنا نہیں ہے بلکہ سب سے اہم کام یہ ہے کہ قومی دولت کی بنیادوں کو وسیع کیا جائے تاکہ اس میں محنت کش عوام کے جائز حقوق شامل ہو سکیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اشتراکیت، خوش حالی اور انصاف کے اپنے دو سہاروں کے ساتھ سماجی آزادی کا راستہ ہے، مصر میں معاشی اور سماجی انحطاط کے مسئلے کا حل یعنی انقلابی طریقے پر ترقی حاصل کرنا کوئی اپنی پسند اور ناپسند کی بات نہیں تھی، اشتراکی حل درحقیقت ایک ناگزیر تاریخی بات تھی جس کو عوام کے ولولوں اور بیسویں صدی کے نصف آخر میں دنیا کی بدلتی ہوئی حالت نے حقیقت بنا کر ناگزیر بنا دیا۔"

"چست اشتراکی منصوبہ بندی وہ واحد طریقہ ہے جو تمام قومی وسائل کو ــــ وہ چاہے مادی ہوں قدرتی اور انسانی ہوں۔ عملی، سائنسی اور انسانی طریقے سے استعمال کرنے کا ضامن ہے اور جس کا مقصد عوام کا مفاد حاصل کرنا، ان کے لیے ایک خوش حال زندگی کو یقینی بنانا ہے، چست اشتراکی منصوبہ بندی ضامن ہے تمام موجودہ اور امکانی وسائل کے سنجیدہ استعمال کی۔"

تیسری جگہ فرماتے ہیں:۔

"دس سال میں، اپنے معیار زندگی کو کم سے کم دوگنا کرنے کا جو مقصد مصر کے عوام نے انقلاب کے ذریعے اپنے سامنے رکھا تھا وہ محض نعرہ بازی نہیں تھی۔"

مساوات مرد وزن کے بارے میں ارشاد ہے:۔

"عورت کو مرد کے برابر سمجھا جانا چاہیے، عورت کو وہ تمام بیڑیاں اتار پھینکنا چاہیے جو اس کی آزادانہ رفتار کو روکتی ہیں تاکہ وہ زندگی کے بنانے میں اہم اور تعمیری حصہ لے سکیں۔"

ملک کے باشندوں کے لیے خوش حال زندگی اور مادی ترقی پنڈت جواہر لال نہرو کا نصب العین بھی ہے اور کرنل ناصر کا نصب العین بھی، کس قدر اتحاد ہے دونوں کے فکر و خیال میں ــــ پنڈت جواہر لال ان لوگوں میں ہیں جو خدا تک کو نہیں مانتے اور کرنل صاحب خدا، رسول، آخرت، سب کو مانتے ہیں، لیکن ملک کی سماجی و معاشی ترقی اور حیات اجتماعی کے ارتقا کے لیے دونوں کا نصب العین اور منزل مقصود تو ایک ہے ہی، راستہ بھی ایک ہے۔ دونوں ایک ہی راہ کے راہی اور ایک ہی منزل پر پہنچنے والے مسافر ہیں اور انہیں دونوں پر کیا موقوف ہے دنیا کی ہر حکومت، اسی منزل مقصود کی طرف رواں دواں ہے۔

مغربی تہذیب نے زندگی کا جو نقطہ نظر اور جو نصب العین پیش کیا ہے وہ دنیا کے ممالک کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑنے والا نہیں بلکہ توڑنے والا ہے۔ یہ انسانوں کو قوم پرستی، وطن پرستی، علاقہ پرستی اور اس طرح کی بہت سی پرستشوں کی لعنت میں گرفتار کرتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے ملکوں کے باشندے بھی اپنی ڈفلی الگ بجاتے ہیں۔ اپنے وطن ہی کو اپنا معبود سمجھتے اور اس کی حفاظت اور نام نہاد ترقی کی راہ میں ہر چیز قربان کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں، اس کی تازہ بتازہ مثال مراکش اور الجزائر کی جنگ ہے۔ ابھی فرانس کا اقتدار ان ملکوں سے پوری طرح ختم بھی نہیں ہوا ہے کہ یہ دونوں آپس ہی

میں ایک دوسرے کا گلا کاٹنے لگے ہیں۔ کل تک وہاں کے مسلمان، فرانسیسیوں کی گولیوں کا نشانہ بن رہے تھے اور آج مراکش اور الجزائر کے مسلمان خود ایک دوسرے کو گولی کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ مراکش کی پشت پر فرانس، امریکہ اور اسپین کا ہاتھ ہے اور الجزائر کی پشت پر جمال عبدالناصر کے واسطے سے روس کا دستِ شفقت ـــــ آخرت فراموشی اور دنیا پرستی کی یہ کیسی عبرت ناک مثال ہے۔

یوں تو اللہ تعالیٰ مقلب القلوب ہے وہ جب چاہے دلوں کو بدل سکتا ہے لیکن بظاہر حالات اس کی توقع نہیں ہے کہ مسلمان حکمرانوں کے دل بدل جائیں گے اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانوں کے بارے میں اللہ کا دستور یہ نہیں ہے کہ وہ اپنی قدرت کا زور استعمال کر کے دلوں کو بدل دے بلکہ وہ انہیں دلوں میں اپنی ہدایت کا نور ڈالتا ہے جو اسے قبول کرنے پر آمادہ ہوں۔ مسلمانوں کا برسر اقتدار طبقہ صرف یہی نہیں کہ بذات خود آمادہ نہیں ہے بلکہ وہ اپنے اپنے ملکوں کے تمام باشندوں کے دل بھی اسلامی طریق زندگی سے پھیر دینا چاہتا ہے، اسی پر بس نہیں وہ آگے بڑھ کر خود اسلام کا ایک ایسا ایڈیشن تیار کرنے پر تلا ہوا ہے جو یورپ، امریکہ اور روس کے "ترقی یافتہ" ملکوں کے لیے قابلِ قبول ہو، وہ ایک ایسے اسلام کا خواہش مند ہے جس میں مغربی تہذیب کے تمام لوازم کھپ سکیں۔

یہ صورت حال ان تمام لوگوں کے لیے زبردست چیلنج ہے جو خلوص کے ساتھ اس اسلام پر یقین رکھتے ہیں جو اللہ کی کتاب میں موجود ہے اور اس طریق زندگی کو پسند کرتے ہیں جس کا نمونہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا ہے۔

بلاشبہہ ہر مخلص مسلمان ذمہ دار ہے کہ اس چیلنج کا جواب دے لیکن اس کی سب سے زیادہ ذمہ داری علماء پر عائد ہوتی ہے۔ ان کا عالمِ دین ہونا ہی اس بات کے لیے کافی ہے کہ ان پر دین کی حفاظت و تقویت کی ذمہ داری زیادہ ہو، وہ براہ راست، کتاب وسنت سے واقف ہیں، دین کا تفصیلی علم رکھتے ہیں، دلائل سے واقف ہیں۔ اس کی برکتیں جانتے ہیں اور سچے دل سے یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام دین و دنیا کی خوبیوں اور بھلائیوں کا جامع اور فلاح دارین کا ضامن ہے۔ وہ اشتراکیت اور سرمایہ داری کی بے اعتدالیوں سے محفوظ ایک معتدل اور ہمہ گیر نظام زندگی ہے۔ وہ زبان سے بھی کہتے ہیں اور دل سے بھی مانتے ہیں کہ اسلام قیامت تک، تمام حالات اور تمام زمانوں میں قابل عمل ہے۔ ایسا کوئی زمانہ نہیں

آسکتا جب اس کے احکام فرسودہ اور بے کار ہو جائیں۔ یہ علم و یقین ان پر ایک عظیم ذمہ داری عائد کرتا ہے۔
اس کے علاوہ ان کی ذمہ داری کو جو چیز بڑھا دیتی ہے وہ یہ بھی ہے کہ اس گئی گزری حالت میں بھی عامۃ المسلمین، دینی امور و احکام میں انہیں پر اعتماد کرتے ہیں اور ابھی وہ ان کے کنٹرول سے باہر نہیں ہوئے ہیں۔ اگر انھوں نے عوام کو یورپی و امریکی ملاؤں کے استیلاء سے بچانے کی سعی نہیں کی تو بے دینی اور الحاد ان کے اندر بھی پھیل جائے گا اور حالات قابو سے باہر ہو جائیں گے۔ پھر وہ خدا کو کیا منہ دکھائیں گے اور اس کی بازپرس کا کیا جواب دیں گے۔

ایک تیسری وجہ اور ہے جو اُن کی ذمہ داری کو بہت بڑھا دیتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر جگہ آزادیِ وطن کی جد و جہد میں انھوں نے سرگرم حصہ لیا ہے اور ہر منصف مزاج کو اعتراف کرنا چاہیے کہ اگر وہ حصہ نہ لیتے تو مسلمان عوام سر سے کفن باندھ کر میدان میں کبھی نہ کودتے۔ یہ علماء اور دیندار رہنما تھے جنھوں نے آیاتِ قرآن اور احادیث رسول سُنا سُنا کر مسلمانوں کو یقین دلایا کہ آزادیِ وطن کی کوشش، دراصل آزادیِ اسلام کی کوشش ہے اور اس میں حصہ لینا جہاد فی سبیل اللہ کا درجہ رکھتا ہے۔ اگر وہ یقین نہ دلاتے تو مغربی ملا، لاکھ سر پٹکتے رہتے اس راہ میں مسلمان عوام کبھی، جان و مال و آبرو کی وہ قربانیاں پیش نہ کرتے جو انھوں نے پیش کر دکھائیں ـــــ اگر اس جد و جہد میں عوام نے مغرب پرستوں سے دھوکا کھایا ہے تو علماء کے واسطے سے کھایا ہے، براہِ راست وہ فریب میں مبتلا نہیں ہوئے اس لیے کہ دینی فتووں کے معاملے میں انہیں علماء پر اعتماد تھا نہ کہ مغربی ملاؤں پر۔ تیونیشیا سے انڈونیشیا تک ہر ملک میں یہی ہوا ہے۔ دوسرے ملکوں کے بارے میں میرا علم کتابی و اخباری علم ہے لیکن جہاں تک اپنے ملک کی تحریک آزادی اور تحریک پاکستان کا تعلق ہے میں اس کے اندر سے ہو کر گزرا ہوں اور مشاہدے و تجربے کی بنیاد پر مجھے معلوم ہے کہ اگر علماء اس کا ساتھ نہ دیتے تو مغرب پرست لیڈر کبھی بھی مسلمان عوام کا خون گرم نہیں کر سکتے تھے۔

آزادی ملی، لیکن یہ دیکھ دیکھ کر دل خون ہوا جاتا ہے کہ اسلام آزاد تو کیا ہوتا وہ دونوں ہی جگہ پہلے سے زیادہ مظلوم و مقہور ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر مغرب پرستوں نے جھوٹے وعدے کیے تھے تو کیا علماء نے بھی عوام کو غلط یقین دہانی کرائی تھی؟ علماء کو اس سوال کا جواب دینا ہوگا۔

اگر انھوں نے غلط یقین دہانی نہیں کرائی تھی بلکہ یورپی اماموں کے شاگردوں نے انہیں دھوکا دیا، ان سے جھوٹے وعدے کیے اور اقتدار پر بیرِ تسمہ پا کی طرح قابض ہو گئے تو اب کیا یہ ان کی ذمہ داری نہیں

ہے کہ وہ مغربی تہذیب کے چیلنج کا جواب دیں اور ان ذلیل شاگردوں کی ہر اس سازش کو ناکام بنانے کے لیے ، سر دھڑ کی بازی لگا دیں جو وہ اسلام کے خلاف کر رہے ہیں ۔

بلا شبہہ یہ اُن کے علم کا تقاضا ہے ' ان کے ایمان کا تقاضا ہے ' ان کی یقین دہانیوں کا تقاضا ہے اور ان کی شرافت و دیانت کا تقاضا ہے ۔

علما ر مجھ جیسے طالب العلم سے زیادہ بہتر طور پر سوچ سکتے ہیں کہ وہ اپنی ذمہ داری سے کس طرح عہدہ برآ ہوں لیکن ذیل کی چند باتیں تو بالکل سامنے کی باتیں ہیں جو اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری قرار پاتی ہیں ۔

۱ ۔ سب سے پہلی بات جو اول قدم کی حیثیت رکھتی ہے ' یہ ہے کہ وہ حزبی و فقہی مسائل پر جنگ و جدال اور آپس کی تفسیق و تضلیل بالکلیہ بند کر دیں ۔

۲ ۔ غلبۂ اسلام کو روکنے والی طاقتیں ' مال و زر اور عہدہ و منصب کا لالچ دلا کر ' علمار کو آپس میں لڑانا چاہتی ہیں ۔ ہر عالم کو اس طرح استعمال ہونے سے قطعاً انکار کر دینا چاہیے ۔

۳ ۔ انہیں اپنی توجہ ان برائیوں کو مٹانے کی طرف لگانی چاہیے جن کا برائی ہونا آج بھی امت مسلمہ کے نزدیک مسلم ہے ۔

۴ ۔ انہیں متحد ہو کر ان لوگوں کے خلاف صف آرا ہونا چاہیے جو ملک میں الحاد اور اخلاقی انارکی پھیلانا چاہتے ہیں ۔

۵ ۔ انہیں اپنے اوقات اس بات پر صرف کرنے چاہیں کہ وقت کے چھائے ہوئے باطل نظریات کا اچھی طرح علم حاصل کریں اور پھر معقول و مؤثر انداز میں ان کی تردید کریں ۔

۶ ۔ انہیں پوری کوشش کرنی چاہیے کہ آئندہ نسل ' وقت کے تمام علمی ہتھیاروں سے مسلح ہو کر اسلام کی سپاہی بنے ۔

۷ ۔ جو لوگ براہِ راست ' اقامت دین اور انقلاب قیادت کی جدوجہد کر رہے ہیں ان کا ساتھ اگر وہ نہ دے سکیں تو ان کی راہ روکنے سے ضرور پرہیز کریں ۔

اسلامی اخلاقیات کی دینی بنیادیں

جناب عبدالحق انصاری، ایم اے (علیگ)

اسلامی اخلاق اور اسلامی عقائد کے درمیان دوگونہ تعلق

اسلام ایک مربوط نظام زندگی ہے۔ اسلامی عقائد اور اسلامی اخلاق کے درمیان بہت گہرا تعلق ہے۔ اس تعلق کی دو نوعیتیں ہیں۔ ایک نوعیت کو 'عملی' اور دوسرے کو 'فکری' کہا جا سکتا ہے۔ عملی تعلق سے مراد یہ ہے کہ اخلاقی زندگی کی تشکیل میں اسلامی عقائد کو بہت اونچا مقام حاصل ہے۔ قرآن و سنت کے ایک سرسری مطالعہ سے بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اخلاقی ذمہ داری کے احساس کو بیدار کرنے اور قوی بنانے، خیر سے محبت اور شر سے نفرت پیدا کرنے، فضائل و خیرات میں سبقت کرنے، برائی کو مٹانے اور بھلائی کو پروان چڑھانے، مشکلات و مصائب میں صبر و استقامت دکھانے، لوگوں کے ساتھ ہمدردی اور خیرخواہی کرنے حقوق ادا کرنے، اور تعلقات میں ایثار و قربانی کی راہ اختیار کرنے، شر کے محرکات کے خلاف اندر اور باہر جہاد کرنے وغیرہ کاموں میں خدا سے خوف و محبت، آخرت کی کامیابی کی امید اور ناکامی کے خوف، تعلق بالرسول اور اتباع سنت نبوی کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ اسلامی عقائد ابتدائی اخلاق کے اکتساب میں نہ صرف معاون ثابت ہوتے ہیں بلکہ انھیں صحیح خطوط پر لگانے کے لیے بھی ضروری ہیں۔ مثال کے طور پر کسی ضرورتمند کی ضرورت پوری کر دینا ایک فعل حسن ہے لیکن اسلامی نقطۂ نظر سے یہ فعل صحیح معنی میں اخلاقی قدر و قیمت کا حامل اسی وقت ہوتا ہے جب کہ اسے خالصتہً لوجہ اللہ کیا جائے۔ اسلامی اخلاق کی بلندیوں تک رسائی کے لیے اسلامی عقائد پر گہرا اور بیدار یقین شرط لازم ہے۔ جب تک خدا اور آخرت کے بارے میں اسلامی عقائد قلب

کی گہرائیوں میں جاگزیں نہ ہو جائیں اور احساس و عمل ان کے تابع نہ ہو جائیں اس وقت تک اسلام کی بلند ترین اخلاقی زندگی وجود میں نہیں آسکتی۔

اسلامی عقائد کو اخلاقی زندگی کی تعمیر میں جتنی اہمیت حاصل ہے اتنی ہی اہمیت انھیں اخلاقی تصورات اور نظریات کی تشکیل میں بھی حاصل ہے۔ اسلامی اخلاق اور عقائد کے درمیان تعلق کی یہ دوسری نوعیت ہے جسے 'فکری' کہا گیا ہے۔ خدا، کائنات اور انسان سے متعلق اگر اسلام کی تعلیمات پیش نظر نہ ہوں تو خیر و شر، صائب و غیر صائب، فرض و حرام، مستحب و مکروہ، اباحت و رخصت، قصد، محرک، نتائج و عواقب، فضائل و رذائل، سعادت و شقاوت، جیسے اخلاقی مسائل کے بارے میں اسلام کا صحیح نقطۂ نظر معلوم نہیں کیا جا سکتا۔ خدا کی ذات و صفات، حیات آخرت، مقام رسالت اور ختم نبوت کے بارے میں اسلامی نظریات اخلاقی فکر کے ہر گوشے کو اس حد تک متاثر کرتے ہیں کہ انھیں ملحوظ رکھے بغیر اخلاقی فکر کو استوار نہیں کیا جا سکتا۔

اسلامی عقائد کو اسلامی اخلاق کی بنیاد قرار دینے کا مفہوم

اسلام کے بنیادی عقائد کو اسلامی اخلاق کی بنیاد قرار دینے سے میری مراد یہ ہے کہ اسلام کے اخلاقی تصورات و نظریات کی تشکیل میں اسلامی عقائد کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ انھیں نظر انداز کر کے جو نظریۂ اخلاق قائم کیا جائے گا وہ اور جو کچھ بھی ہو اسلامی نہیں ہو سکتا۔ دوسری بات جو اس سے مراد ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کا اخلاقی فکر ایک حد تک اسلامی عقائد سے مستنبط ہوتا ہے۔ اس بات کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اسلامی عقائد فکری ترتیب میں اسلامی اخلاق سے پہلے آتے ہیں اور اسلامی اخلاق سے خود مستنبط نہیں کیے جا سکتے۔

اسلامی عقائد کو اسلامی اخلاق کی بنیاد قرار دینے کا بس اتنا ہی مفہوم ہے۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ بات اسلامی عقائد اور اخلاق کے درمیان 'فکری تعلق' کی وضاحت کے سلسلے میں کہی جا رہی ہے، نہ کہ عملی تعلق کی وضاحت کے سلسلے میں۔ اس مقالے میں اسلامی عقائد اور اسلامی اخلاق کا یہی فکری تعلق اصل موضوع بحث ہے اور آئندہ صفحات میں اسلامی عقائد اور اخلاق کے درمیان تعلق کے فقرے کو اسی مفہوم میں لیا جانا چاہیے۔

اسلامی عقائد کو اسلامی اخلاق کی بنیاد قرار دینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسلام کے اخلاقی

تصورات کے لیے کوئی بنیاد انسان کی فطرت میں نہیں ہے اور یہ کہ اسلام کے اخلاقی تصورات و نظریات کے لیے تنہا ماخذ و بنیاد وحی الٰہی اور ارشادات نبویہ ہیں حقیقت یہ ہے کہ انسانی فطرت میں بھی اسلامی اخلاق کی بنیادیں موجود ہیں اور بہت گہری ہیں اور انھیں بنیادوں میں اسلامی اخلاق کی آفاقی نوعیت قوت اور پائداری کا راز مضمر ہے لیکن دوسرا موضوع ہے جو فی الحال یہاں زیر بحث نہیں ہے۔

اسلامی عقائد کو بنیاد قرار دینے کے دلائل

تاریخی دلیل: اسلامی عقائد اسلامی اخلاق کے لیے بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس بات کی صحت پر اصولی حیثیت سے ـــــ بھی غور کیا جا سکتا ہے ـــــ اور تاریخی حیثیت سے بھی۔ تاریخی حیثیت سے غور کرنے سے مراد یہ ہے کہ اسلامی فکر کی تاریخ میں جن حلقوں نے اخلاقی مسائل کو موضوعِ گفتگو بنایا ہے یا جن کی تصنیفات سے اخلاقی نظریات پر کوئی روشنی پڑتی ہے ان کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے فہم و فکر میں اسلامی اخلاق کے مسائل اسلامی عقائد سے ہمیشہ وابستہ رہے ہیں اور بسا اوقات یہ وابستگی اتنی گہری رہی ہے کہ ان کے اخلاقی نظریات، عقائد سے متعلق ان کے نظریات سے مستنبط معلوم ہوتے ہیں۔

علم کلام: یہ بات علم کلام، اصول فقہ، تصوف اور فلسفہ کی تاریخ کے مطالعہ سے واضح ہوتی ہے۔ کلام میں اخلاقیات کے دو مسائل زیر بحث آئے ہیں۔ ایک مسئلہ حسن و قبح کے علم کے ذریعہ سے متعلق رہا ہے اور دوسرا حَسَن کی انجام دہی اور قبیح سے اجتناب کی ذمہ داری کی بنیاد سے۔ ان دونوں مسائل میں متکلمین کے حلقے میں کیا کیا رائیں دی گئی ہیں ان کا احاطہ مقصود نہیں ہے۔ صرف دو رایوں کے ذکر پر اکتفا کیا جائے گا جن سے توقع ہے کہ اسلامی عقائد اور اخلاق کے باہمی تعلق کی نوعیت واضح ہو سکے گی۔

اہل کلام کے ایک گروہ کا خیال رہا ہے کہ اخلاقی حُسن و قبح کے علم کا ذریعہ عقل انسانی ہے اور عقل انسانی ہی ہم پر یہ لازم قرار دیتی ہے کہ فعلِ حَسَن انجام دینا چاہیے اور فعل قبیح سے اجتناب کرنا چاہیے۔ ایک دوسرا گروہ اخلاقی حسن و قبح کے علم کا واحد ذریعہ شارع کے امر کو قرار دیتا ہے اور اسی کو وہ اخلاقی ذمہ داری کا واحد ماخذ سمجھتا ہے۔ دونوں گروہوں کی رائیں بالآخر ان کے ان نظریات پر مبنی ہیں جو وہ خدا کی ذات و صفات کے بارے میں رکھتے ہیں۔ یہ بات اسلامی کلام

ے طالب علم کے لیے اتنی واضح ہے کہ مزید تشریح کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔

اصول فقہ جائز اور ناجائز، فرض و حرام، مستحب و مکروہ کے فقہی مسائل حسن و قبح کے کلامی مسئلے سے اس قدر وابستہ ہیں کہ حسن و قبح کے علم اور فعل حسن کی ذمہ داری کا مسئلہ اصول فقہ کی کتابوں میں بھی بہت ہی شرح و بسط کے ساتھ زیر بحث آیا ہے۔ اگرچہ فقہ میں آکر اس مسئلے کی نوعیت بہت بدل گئی ہے۔ کیونکہ یہاں صرف اخلاقی اصول و ضوابط تک بات محدود نہیں رہی ہے بلکہ ہر وہ بات اس میں داخل ہوگئی ہے۔ جس کے بارے میں جائز و ناجائز اور صائب و غیر صائب کا حکم لگایا جا سکتا ہے۔ اس توسیع کی وجہ سے اصل مسئلہ کے حل میں بڑی پیچیدگیاں پیدا ہوگئی ہیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ اصولی حیثیت سے یہ مسئلہ اخلاق ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ فقہ کے ایک باب (معاملات) کا بھی ویسا ہی مسئلہ ہے۔ اصول فقہ میں بھی ان مسائل کے بارے میں رائے قائم کرنے میں آخری فیصلہ کن بات وہ نظریات بنتے رہے ہیں جو خدا کی ذات و صفات اور انسانی علم و ارادے کے بارے میں مفکرین نے قائم کر لیے ہیں۔

تصوف اسلامی اخلاق کا مثالی نقشہ کیا ہے۔ اس میں کون سی بات سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے اور کون سے عناصر ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ زندگی کی غایت کیا ہے؟ حیات اخروی اور حیات دنیا کا باہمی تعلق کیا ہے؟ لذات دنیا کا کیا مقام ہے؟ روح و جسم کا باہمی رشتہ اور ان کے مفادات کی اضافی قدر و قیمت کیا ہے؟ تقرب الی اللہ اور مشاہدہ حق کے کیا معنی ہیں؟ عشق الٰہی فضائل و مکارم کو کس طرح متاثر کرتا ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جو اسلامی تصوف میں خصوصیت سے زیر بحث آتے ہیں۔ اہل تصوف نے ان کے بارے میں جو رائیں قائم کی ہیں ان کے پشت پر ان کے وہ نظریات کام کرتے رہے ہیں جو وہ خدا، کائنات روح و مادہ، فطرت انسانی، حیات بعد الموت کے متعلق رکھتے رہے ہیں۔

فلسفہ مسلمانوں نے جس فلسفہ کو پروان چڑھایا اور جو مسلم فلاسفہ کے حلقوں میں غالب رہا اگرچہ اس میں بہت سے غیر اسلامی عناصر شامل ہیں لیکن ایک حد تک اس میں اسلامی اثرات کی بھی کارفرمائی ہے۔ یہ بات عام فلسفہ کے متعلق جتنی صحیح ہے اتنی ہی فلسفیانہ اخلاق کے متعلق بھی صحیح ہے۔ مسلم فلاسفہ نے اخلاقیات کا جو تصور پیش کیا ہے اس کی بنیاد بعض مابعد الطبیعیاتی

اور نفسیاتی نظریات پر تھی۔ ان کے اخلاقیات کو مسلمانوں میں جس قدر بھی مقبولیت حاصل ہوئی ہے اس کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ ان کے مابعد الطبیعیاتی اور نفسیاتی نظریات اسلامی عقائد سے بہت حد تک مماثل تھے یہی مماثلت ہے جس کے سبب فلسفے کے بنیادی نظریات مسلمانوں میں رائج ہوئے اور جس کی وجہ سے فلسفیانہ اخلاق کو مسلمانوں کے مختلف حلقوں نے اپنایا۔

اصولی بحث اسلامی اخلاق اسلامی عقائد کی بنیاد پر قائم ہیں۔ چنانچہ اسلامی اخلاقیات کا کوئی تصور اسلامی عقائد سے ہٹ کر قائم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات اصولی حیثیت سے بھی صحیح ہے۔

خدا ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو کن صفات کا حامل ہے۔ کائنات سے اس کا رشتہ کیا ہے؟ کیا وہ محض ایک خالق ہے یا کچھ اور بھی ہے؟ کیا وہ حقیقی معنوں میں اس کائنات کا مالک اور حاکم ہے؟ کیا تاریخ انسانی پر وہی حکمراں قوت ہے؟ کیا اس کی قوت اور اس کی حکمت انسانوں کے لیے ایک ضابطۂ ہدایت کے ارسال میں ظاہر ہوتی ہے یا نہیں؟ کیا وہ رسولوں کو انسان کی رہنمائی کے لیے روانہ کرتا ہے؟ کیا وہ انسان کی زندگی کا بھی حقیقی فرماں روا ہے؟ کیا وہ مطیع کو جزا اور باغی کو سزا دیتا ہے؟ کیا وہ محتسب اور مجازی ہے؟ کیا اس کا خوف برائی سے روکنے اور اس کی محبت بھلائی کی طرف رغبت دلانے کے لیے مؤثر بن سکتی ہے؟ کیا وہ حق کی تائید و حمایت کرتا ہے اور باطل کو کچلتا اور مٹاتا ہے؟

کیا انسان کی یہ زندگی آخری ہے یا کوئی دوسری زندگی آنے والی ہے؟ اور اگر آنے والی ہے تو اس کی نوعیت کیا ہے؟ کیا دوسری زندگی پھر ایک نیا موقع ہے۔ قوتوں اور کوششوں کی آزمائش کا یا وہ محض احتساب اور مجازات کے لیے مخصوص ہے؟ کیا وہ محض روح کی زندگی ہوگی یا جسم کی بھی؟

حیات آخرت اور حیات دنیا کا باہمی تعلق کیا ہے؟ کیا محض مقصود اور ذریعہ کا یا مقصود ہونے میں دونوں کو ایک مقام حاصل ہے؟ کیا اس دنیا کی اہمیت محض تیاری کی ہے اور یہ محض آزمائش کی جگہ ہے یا اس کی تعمیر اور تشکیل خود ایک قدر و قیمت کی حامل ہے؟

زندگی کی تعمیر، آخرت کی فلاح اور اطاعتِ خدا اور رضائے الٰہی کی طلب میں اللہ کے بھیجے ہوئے نمائندوں (رسولوں) کو کیا مقام حاصل ہے؟ ان کی زندگی انسان کے لیے کن اعتبارات سے نمونہ، قابلِ تقلید یا واجب الاطاعت ہے؟

یہ اور اس طرح کے بہت سے سوالات ہیں جن کے بارے میں اسلام کی تعلیمات موجود ہیں۔ بہت واضح سی بات ہے کہ ان سوالات کے بارے میں جو رائے بھی قائم کی جائے گی اس کے اثرات اخلاقی زندگی ہی پر نہیں اخلاقی فکر کی تشکیل پر بہت گہرے پڑیں گے اور یہ بات بھی واضح ہے کہ اخلاقی مسائل کے بارے میں انسانی فطرت کے آزادانہ مطالعہ و مشاہدے سے جس حد تک نظریات قائم کیے جاسکتے ہیں ان سے زندگی کے ان بنیادی مسائل میں رائے قائم کرنے میں کسی حد تک مدد تو مل سکتی ہے لیکن وہ کافی نہیں ہوسکتے۔ یہ مسائل دوسری بنیادیں چاہتے ہیں۔ ایک بار جو رائے ان کے سلسلے میں قائم کرلی جائے گی اس کے اخلاقی نتائج بڑے دور رس ہوسکتے ہیں۔

مذاہب عالم | یہ بات کہ ان بنیادی مسائل میں جو رائے ہوتی ہے وہ اخلاقی فکر کو متاثر کرتی ہے اس کا اندازہ مذاہب کے فکری نظاموں کے تقابلی مطالعہ سے کیا جاسکتا ہے۔ ہندوازم اور بدھ ازم کے اخلاقی فکر کو آواگون کے نظریے نے بہت متاثر کیا ہے۔ یہ نظریہ ان دونوں مذاہب میں مشترک ہے۔ لیکن عیسائیت، یہودیت اور اسلام میں نہیں ہے۔ اس لیے ان مذاہب کے اخلاقی تصورات اس نظریے کے اثرات سے متاثر نہیں ہیں۔ ہندوازم اور بدھ ازم میں اس نظریے کے اشتراک کے بعد انسان کی حقیقت، خدا اور خدا اور کائنات کے تعلق کے مسائل کے سلسلے میں بنیادی اختلافات ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ زندگی کی آخری غایت کے تعین کے بارے میں ان دونوں مذاہب میں فرق ہے۔

اسلام، یہودیت اور عیسائیت میں اشتراک کے حدود وسیع تر ہیں لیکن گناہ اول، ہبوطِ انسانی، حضرت مسیحؑ کے کفارے کے عقیدے نے عیسائیت کے اخلاقی فکر پر جو اثرات ڈالے ہیں ان سے اسلام یا یہودیت کے اخلاقی افکار آزاد ہیں اس لیے کہ یہ دونوں مذاہب ان تصورات سے بری ہیں۔ توریت میں آخرت کی زندگی کے بارے میں جو مبہم اشارات ملتے ہیں ان کے برخلاف قرآن مجید میں آخرت کی زندگی کا نقشہ بہت واضح اور مؤثر ہے۔ اس فرق کا نتیجہ ہے کہ اسلامی اخلاقیات کی تشکیل میں آخرت کے تصور کو بڑا اہم مقام حاصل ہے، جو یہودیت میں اسے حاصل نہیں۔

ان چند اشاروں سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ زندگی کے بنیادی مسائل کے بارے میں جو نظریات اور عقائد قائم کیے جائیں گے ان کے بڑے گہرے اثرات اخلاقی فکر پر مرتب

مرتب ہوں گے۔ چونکہ زندگی کے بنیادی مسائل کے بارے میں اسلام کا ایک نقطۂ نظر ہے اور ایک عقیدہ ہے لازم ہے کہ وہ اسلامی اخلاق کی تشکیل میں اہم پارٹ ادا کرے۔

اس حقیقت کی اس قدر وضاحت کا سبب یہ ہے کہ موجودہ دور میں اخلاقی فکر کو مابعد الطبیعیاتی نظریات و مسلمات سے آزاد کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے اور اب یہ بات عصر حاضر کے اخلاقی فکر کا ایک جز بن گئی ہے جسے سوال اور بحث سے بلند ایک طے شدہ امر سمجھا جاتا ہے۔ اوپر کی گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ اگر اسلامی اخلاقیات کی تشکیل کی کوشش کرنی ہو تو اس رجحان سے بغاوت ضروری ہے اور اخلاقی فکر کے لیے مابعد الطبیعیاتی بنیادوں کا اثبات اور ان پر اخلاقیات کو استوار کرنے کے رجحان کو مدلل کرنے کی ضرورت ہے۔ مگر یہ خود ایک مستقل کام ہے جس کے لیے یہ مقالہ متحمل نہیں ہو سکتا۔

آئندہ کی ساری بحث اس حقیقت کو تسلیم کر کے اٹھائی جائے گی۔ اگر کسی کو اوپر کی گذارشات کافی ہوں تو وہ اس حقیقت کو مان کر ان بحثوں کا مطالعہ کرے اور اگر کسی کو یہ تسلیم نہ ہو تو وہ ان بحثوں کے مطالعہ سے یہ دیکھ سکتا ہے کہ کم از کم اسلامی اخلاق کی حد تک یہ بات مسلم ہے کہ اسے اسلامی عقائد سے علیحدہ اور آزاد نہیں کیا جا سکتا۔

مغربی فلسفہ اس سلسلے میں ایک اور بات کی طرف توجہ مبذول کرائی جا سکتی ہے۔ مغرب میں اخلاقیات کو مابعد الطبیعیاتی بنیادوں سے آزاد کرنے کی کوشش کا رجحان بہت نیا ہے۔ مغربی فکر کی طویل تاریخ میں اساطین فلسفہ کا غالب گروہ ایسا رہا ہے جس نے اخلاقیات کو مابعد الطبیعاتی بنیادوں پر استوار کیا ہے ان میں افلاطون، بڑی حد تک ارسطو، آگسٹائن، ٹامس ایکوناس، پھر ڈیکارٹ، اسپنوزا، لائبنز، کانٹ، ہیگل، بریڈلے اور برگسان جیسے مشاہیر کے نام پیش کیے جا سکتے ہیں۔ اخلاقیات کو مابعد الطبیعیاتی نظریات سے آزاد کرنے کی کوشش اس وقت سے زیادہ قوی ہو گئی جب سے مابعد الطبیعیات کو فلسفیانہ قوت کا غلط استعمال قرار دیا جانے لگا اور اس کو بے معنی عبارت و بیان قرار دے کر یک لخت رد کر دیا گیا۔ اس رجحان کے ابھرنے کے ساتھ فلسفیانہ فکر نے اخلاقیات کے دوسرے پہلوؤں کی طرف توجہ کی۔ مگر اس میں بھی تسکین نظر نہیں آئی۔ چنانچہ فلسفیانہ فکر اخلاقی مسائل میں اور علم کے دوسرے مسائل میں بھی یا تو تشکیک کی گھاٹیوں میں جا پہنچا

یا دوسری توجیہات تلاش کرنے لگا یا پھر مابعد الطبیعیات کے مسائل اور نظریات کی معنویت کا اس پر دوبارہ انکشاف ہونے لگا ہے۔ بہرحال یہ ایک طویل داستان ہے جس کی تفصیل نہیں بیان کی جاسکتی۔ آنے والے صفحات میں ہم اس بنیاد سے آغاز کر رہے ہیں کہ اسلامی اخلاق کی تشکیل میں اسلامی عقائد ناگزیر ہیں۔ توقع ہے کہ اسلامی اخلاق اور اسلامی عقائد کے تعلق کی تفصیلی وضاحت خود اس رائے کی صداقت پر روشنی ڈالے گی۔

خدا

اسلامی تصورِ خدا اسلام کے بنیادی عقائد جو خدا، آخرت، رسالت، انسان اور کائنات سے متعلق ہیں ان میں سب سے اول اور اسلامی اخلاق کے لیے بھی سب سے زیادہ اہم خدا کی ذات وصفات اور اس کی توحید کا عقیدہ ہے۔ اسلام نے خدا کا جو تصور پیش کیا ہے اس کے مطابق خدا ایک حی وقیوم ہستی ہے، جو کائنات اور انسان کی خالق، مالک، مدبر اور منتظم ہے۔ اس کی تخلیق اور اس کا نظم وانصرام اس کے ارادے، علم وحکمت اور قدرت کا مظہر ہے۔ خدا نہ صرف کائنات کا مالک اور حکمراں ہے بلکہ تاریخ انسانی پر بھی غالب ہے۔ فطرت کے عوامل اور حرکات اس کی مشیت کے تابع ہیں اور انسانی زندگی بھی اس کے ضابطے اور اس کی مشیت کی پابند ہے نہ کائنات کی تخلیق عبث ہے اور نہ انسانی زندگی۔ انسانی زندگی کا مقصد کیا ہے اور اس کے حصول کی راہیں کیا ہیں، خالق کائنات نے اس کے سلسلے میں انسان کی رہنمائی فرمائی ہے۔ وہ انسان کی زندگی سے نہ غیر متعلق ہے اور نہ تاریخ انسانی کا تماشائی ہے۔ انسان کو پیدا کرکے اس نے بھٹکنے کے لیے چھوڑ نہیں دیا، بلکہ ان کی ہدایت کے لیے انبیاء ورسل کا ایک سلسلہ قائم کر دیا ہے جو اس کی مرضیات وہدایات انسانوں تک پہنچاتے ہیں اور ان پر ایمان لانے اور ان کی اتباع کرنے کی دعوت دیتے ہیں جو لوگ اللہ کی ہدایت پر ایمان لاتے ہیں، وہ دنیا اور آخرت دونوں جگہ کی کامیابی سے سرفراز ہوتے ہیں اور جو اس کی ہدایت کا انکار کرتے ہیں اور اس سے روگردانی کرتے ہیں وہ دنیا اور آخرت کی ناکامیوں سے دوچار ہوتے ہیں۔

اسلام کے خدا کا تعلق انسان کے ساتھ اس سے بھی زیادہ قریب ہے۔ خدا ہی انسان کا

روزی رساں ہے، وہ ان کی دعائیں سنتا ہے، مصیبت میں ان کی دست گیری کرتا ہے، آزمائش میں ان کی مدد کرتا ہے، وہ نیکی کو پروان چڑھاتا اور برائی کی سرکوبی کرتا ہے، گناہوں سے درگزر کرتا ہے، بھٹکے ہوئے کو راہ دکھاتا ہے، جو اس سے ڈرتا ہے اسے وہ اپنی پناہ میں لے لیتا ہے۔ جو اس سے محبت کرتا ہے وہ اس کی آنکھ کی بصارت اور دل کا نور بن جاتا ہے، اس کی یاد قلب کا سکون اور اس کی عبادت زندگی کی قوت ہوتی ہے۔

اسلام کا خدا انسان سے بہت بلند ہونے کے باوجود اس سے بہت قریب ہے۔ کائنات سے ماورا ہونے کے باوجود اس کی حقیقی فعال قوت ہے۔ وہ سراپا علم و حکمت ہے، اور سراپا قوت و جبروت، وہ کمال رحمت ہے اور کمال عفو، اس کا غضب بے پناہ ہے اور اس کی عنایت بے پایاں۔

اسلام کا خدا واحد ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، تخلیق و بادشاہت، الوہیت اور ربوبیت ہدایت اور رزاقیت میں اس کا کوئی ساجھی نہیں۔ سارا وجود اس کا مخلوق اور اس کے احکامات کا پابند ہے۔ فرشتے اور ارواح، رسل اور صالحین سب اس کے بندے اور تابع فرمان ہیں۔

خدا کے اسلامی تصور اور دوسرے تصورات میں فرق

خدا کا یہ تصور ان تصورات سے بہت مختلف ہے جو عام طور پر فلسفہ اور حکمت کی تاریخ میں قائم کیے جاتے رہے ہیں۔ مثلاً کبھی خدا کو ایک "فکر عظیم" قرار دیا گیا ہے جس کا وجود کائنات کی حرکت کا نقطۂ آغاز ہے مگر کائنات اپنی حرکت کی ابتدا کے علاوہ کسی اور چیز میں خدا کی محتاج نہیں، بلکہ ایک مکمل اور مستقل نظام ہے جو آپ اپنی بنیادوں پر قائم ہے اور خدا کی طرح خود ازلی اور ابدی ہے۔ خدا کا سارا فعل اپنی ذات میں تفکر کی حد تک محدود ہے۔ اسے نہ کائنات سے کوئی تعلق اور نہ انسان کی زندگی سے کوئی سروکار۔

خدا کا اسلامی تصور اس تصور سے بھی مختلف ہے جس کے مطابق خدا ایک ذات واحد ہے، بسیط، ساری صفات سے بلند اور تعلق سے ماورا، وہ ساری کثرتوں کا مصدر حقیقی ہے اور وجود کا آخری سرچشمہ۔ وہ آخری غایت بھی ہے اور زندگی کا مقصود بھی لیکن نہ وہ رہنما ہے، نہ ہادی، نہ رب نہ الٰہ، نہ حاکم نہ مالک، نہ محتسب نہ مجازی۔

خدا کا اسلامی تصور اس تصور سے بھی مختلف ہے جس کے مطابق خدا ایک ایسا فکر (Idea) ہے جو جدلیاتی اصول کے مطابق خود حرکت کرتا ہے مختلف موجودات اور حوادث کی شکل میں رونما ہوتا ہے، سارا نظام وجود جس کی خود آگاہی کا مظہر ہے اور تاریخ انسانی جس کی تحصیل ذات کی داستان ہے۔

خدا کا اسلامی تصور اس تصور سے بھی مختلف ہے جس کی روشنی میں کائنات کی تنہا حقیقت اس کی ذات ہے، اور سارا وجود محض مظہر ونمائش ہے جس کی حیثیت شعبدے سے زیادہ کچھ نہیں جس کے مطابق سعادت حقیقی یہ ہے کہ انسان پر یہ انکشاف ہو جائے کہ حقیقی وجود صرف ذات واحد کا خود اس کا وجود اور ساری کائنات کا وجود جہالت کی پیداوار اور وہم کی تخلیق ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ذات واحد اور وہ خود ایک ہی ذات ہیں۔

خدا کا اسلامی تصور اس تصور سے بھی مختلف ہے جس کے مطابق خدا اس نظم وضبط سے عبارت ہے جو کائنات میں پایا جاتا ہے، یا اس ذہن سے عبارت ہے جس کے قوانین کائنات کی مشینری کو ریاضیاتی صحت کے ساتھ چلا رہے ہیں، مگر جو انسان، اس کی زندگی اور اس کی تاریخ سے بالکل بے تعلق ہے۔

اسلام کے تصور کے مطابق خدا محض ایک فکر نہیں ہے جس کا وجود کائنات کے نظم وضبط کی توجیہ کے لیے ضروری ہو، نہ وہ ایسی وحدت ہی ہے جو صفات سے عاری ہو اور جسے کثرت کی توجیہ کے لیے تسلیم کر لیا گیا ہو، نہ وہ محض ارادہ ہے جو فکر سے خالی ہو، اور جس کی قوت نہ کسی مصلحت کی پابند ہو اور نہ کسی حکمت کی، نہ وہ محض مجموعہ ہے فکر اور ارادے کا بلکہ وہ ایک عظیم ہستی ہے جو علیم و حکیم بھی ہے، قادر اور فعّال بھی ہے اور رحیم و کریم بھی۔ اسلام کے تصور کے مطابق خدا وہ ذات حی وقیوم ہے جس کی رضا مطلوب ہو، جس کے غضب سے دل دہل جائے، جس کے احسان سے قلب شکر سے لبریز ہو جائے جس کی ربوبیت اور الوہیت محبت کو بیدار کرے، جس کا عفو اور کرم مایوسی سے بچائے، جس کی تائید ونصرت مصیبت میں سہارا بن جائے، جس کی رہنمائی سے مشکلات حل ہو جائیں جس کی مدد سے بگڑے کام بن جائیں، جس کی پناہ میں آ کر انسان ہر خوف سے بلند ہو جائے، جس کے بھروسے پر ہم ساری دنیا کو دعوت مبارزت دے سکیں، جس کی بندگی ہماری زندگی ہو اور جس کا تقرب ہمارا مقصد وجود

خدا کے اسلامی تصور کی وضاحت

یہ ہے مجملاً وہ تصور جو اسلام نے خدا کے بارے میں پیش کیا ہے۔ اب ہم اس تصور کے ان پہلوؤں کو تفصیل سے بیان کریں گے جو اسلامی اخلاق کی بنیاد بنتے ہیں۔

تخلیق | خدا کے بارے میں قرآن مجید نے سب سے پہلے یہ تصور پیش کیا ہے کہ وہ ساری کائنات کا خالق ہے اور یہ تخلیق ارادی اور حکیمانہ ہے۔ تخلیق کی ساری صلاحیتیں علم و حکمت اور قدرت اس میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ فعل تخلیق میں وہ کسی کا نہ محتاج ہے اور نہ عملاً کوئی اس کا شریک کار ہے، ایک وہی تنہا خالق ہے۔

ملکیت | اس تصور تخلیق سے قرآن مجید نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ خدا اپنی تخلیق کا مالک ہے اور چونکہ وہی تنہا خالق ہے اس لیے وہی ساری کائنات کا تنہا مالک اور بادشاہ ہے۔ اس کی ملکیت میں کوئی دوسرا شریک نہیں، اس کی ملکیت مطلق ہے کسی دوسری ہستی کو اس میں کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ	اس نے آسمانوں اور زمین کو حکمت سے
بِالْحَقِّ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَ	پیدا کیا۔ وہ رات کو دن پر اور دن کو رات پر
يُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ	لپیٹتا ہے۔ اس نے سورج اور چاند کو کام پر
وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى	لگا دیا۔ ہر ایک وقت مقرر تک چلتا رہے گا۔
اَلَا هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ٥ خَلَقَكُمْ	یاد رکھو وہ زبردست ہے بڑا بخشنے والا۔ اس
مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ	نے تم لوگوں کو جان واحد سے پیدا کیا۔ پھر اسی
مِنْهَا زَوْجَهَا وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ	سے اس کا جوڑا بنایا اور تمہارے لیے آٹھ نر و
الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ يَخْلُقُكُمْ	مادہ چارپایوں کو پیدا کیا۔ وہ تم کو ماں کے
فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا	پیٹ میں ایک کیفیت کے بعد دوسری کیفیت
مِّنْ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ	پر بناتا ہے۔ تین تاریکیوں میں، یہ ہے اللہ
ثَلٰثٍ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ	تمہارا رب وہی مالک ہے۔ اس کے سوا کوئی
الْمُلْكُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ٥	لائق عبادت نہیں ہے۔ سو تم کہاں پھرے جاتے ہو۔

(الزمر: ۵-۶)

خدا نہ صرف اپنی تخلیق کا مالک ہے بلکہ انسان کی ہر کمائی اور ہر کاوش کا حقیقی مالک بھی وہی ہے۔ کیونکہ انسان کی ہر کاوش، ہر تخلیق اور ہر کمائی ان قوتوں اور صلاحیتوں، ان اسباب و وسائل کے ذریعہ انجام پاتی ہے جو اللہ تعالٰی نے اسے عطا کی ہیں۔

لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَهُوَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ...... وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (حدید۔ ۵-۱۰)

وہی مالک ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور اللہ ہی تک پہنچتے ہیں سارے کام، وہ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور اسے خبر ہے سینوں کی۔ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور خرچ کرو اس میں سے جس میں اس نے تمہیں نائب بنایا...... اور تمہیں کیا ہوا ہے کہ تم خرچ نہیں کرتے اللہ کی راہ میں درآں حالیکہ اللہ ہی وارث ہے آسمانوں اور زمین کا۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝

(آل عمران: ۱۸۰)

جن لوگوں کو اللہ نے اپنے فضل سے نوازا ہے اور پھر وہ بخل سے کام لیتے ہیں وہ اس خیال میں نہ رہیں کہ یہ بخیلی ان کے لیے اچھی ہے۔ نہیں، یہ ان کے حق میں نہایت بری ہے۔ جو کچھ وہ اپنی کنجوسی سے جمع کر رہے ہیں وہی قیامت کے روز ان کے گلے کا طوق بن جائے گا۔ زمین اور آسمان کی میراث اللہ ہی کے لیے ہے اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ (البقرہ: ۲۶۷)

اے ایمان لانے والو! جو مال تم نے کمائے ہیں اور جو کچھ ہم نے زمین سے تمہارے لیے نکالا ہے اس میں سے بہتر حصہ راہ خدا میں خرچ کرو۔

حکومت قرآن مجید نے تخلیق سے ملکیت کے ساتھ حکومت کو بھی وابستہ کیا ہے، جو کائنات کا خالق ہے وہی اس کا حقیقی مالک ہے اور وہی اس کا حاکم اور بادشاہ ہے۔ اسی کو تصرف اور حکومت کے سارے اختیارات پہنچتے ہیں اور تخلیق اور ملکیت کی طرح خدا کی حکومت میں بھی کوئی اس کا شریک یا ساجھی نہیں۔

قرآن مجید کی آیات کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت الٰہی کے تین مفہوم ہیں اور تینوں مفہوموں میں خدا ہی حقیقی اور تنہا حاکم ہے۔

(۱) حکومت الٰہی کا پہلا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کائنات کا بالفعل مدبر اور منتظم ہے، اسی کے قوانین کا ہر ذرۂ کائنات پابند ہے۔ کوئی واقعہ اس کے قوانین کے خلاف واقع نہیں ہوتا۔ اس کی مرضی اور مشیت ہر شے میں جاری ہے۔

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ یَطْلُبُهٗ حَثِیْثًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ ؕ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ؕ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (اعراف: ۵۴)	درحقیقت تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر اپنے تخت سلطنت پر متمکن ہوا جو رات کو دن پر ڈھانک دیتا ہے اور پھر دن رات کے پیچھے دوڑا چلا آتا ہے جس نے سورج اور چاند اور تارے پیدا کیے، سب اس کے فرمان کے تابع ہیں۔ خبردار رہو! خلق اسی کا ہے اور امر بھی اسی کا ہے بڑا بابرکت ہے اللہ، سارے جہانوں کا مالک اور پروردگار۔

(۲) حکومت الٰہی کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ انسانی تاریخ خدا کی مشیت اور اس کے قوانین کے تابع ہے۔ اس کا ہر واقعہ بغیر اس کی مشیت کے نہیں ہوتا، اور جب وہ اپنی کوئی مرضی نافذ کرنا چاہے تو کوئی قوت اسے روک نہیں سکتی۔

الٓمّٓ ۝ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۝ فِیْ اَدْنَی الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ	الم مغلوب ہو گئے رومی قریب کے ملک میں اور وہ مغلوب ہونے کے بعد عنقریب غالب ہوں گے

سَيَغْلِبُوْنَ ۝ فِىْ بِضْعِ سِنِيْنَ ۭ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ ۭ وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ بِنَصْرِ اللّٰهِ ۭ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝ (الروم ۱-۵)	چند برسوں میں۔ اللہ کے ہاتھ میں ہیں سارے کام اگلے اور پچھلے اور اس دن مسلمان خوش ہوں گے اللہ کی مدد سے، اللہ جس کی چاہتا ہے مدد کرتا ہے اور وہ زبردست اور رحیم ہے۔
يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ۭ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ۭ يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ۭ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ۭ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ (آل عمران: ۱۵۴)	یہ لوگ اب کہتے ہیں کہ "اس کام کے چلانے میں ہمارا بھی کوئی حصہ ہے؟" ان سے کہو "(کسی کا کوئی حصہ نہیں) اس کام کے سارے اختیارات اللہ کے ہاتھ میں ہیں"۔ دراصل یہ لوگ اپنے دلوں میں جو بات چھپائے ہوئے ہیں اسے تم پر ظاہر نہیں کرتے ان کا اصل مطلب یہ ہے کہ "اگر (قیادت کے) اختیارات میں ہمارا کچھ حصہ ہوتا تو یہاں ہم نہ مارے جاتے۔" ان سے کہہ دو کہ "اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو جن لوگوں کی موت لکھی ہوئی تھی وہ خود اپنی قتل گاہوں کی طرف نکل آتے" اور یہ معاملہ جو پیش آیا یہ تو اس لیے تھا کہ جو کچھ تمہارے سینوں میں پوشیدہ ہے اللہ اسے آزمالے اور جو کھوٹ تمہارے دلوں میں ہے اسے چھانٹ دے۔ اللہ دلوں کا حال خوب جانتا ہے

(۳) حکومت الٰہی کا تیسرا مفہوم یہ ہے کہ خدا کائنات اور تاریخ انسانی کا بالفعل حاکم ہی نہیں ہے بلکہ وہ انسان کا بھی حقیقی حاکم ہے جس طرح ساری کائنات میں اس کے قوانین جاری ہیں اور جس طرح تاریخ انسانی میں اس کی مرضیات نافذ ہوتی ہیں اور جس طرح انسان کی غیر اختیاری زندگی اس کے ضوابط کی پابند ہے اسی طرح اس کی اختیاری زندگی کو بھی اللہ تعالےٰ کے احکامات کا پابند ہونا چاہیے۔ وہی مقتدر اعلیٰ ہے اور انسان کو تنہا اسی کی اطاعت اور بندگی کرنی چاہیے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ٥

(البقرہ: ۲۱)

لوگو! بندگی اختیار کرو اپنے رب کی جو تمہارا اور تم سے پہلے جو لوگ گذرے ہیں ان سب کا خالق ہے تمہارے بچنے کی توقع اسی صورت سے ہو سکتی ہے۔

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ٥ (الاعراف: ۱۵۸)

(اے محمد!) کہو کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف اس خدا کا پیغمبر ہوں جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے، اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے بھیجے ہوئے نبی امی پر جو اللہ اور اس کے ارشادات کو مانتا ہے اور پیروی اختیار کرو اس کی امید کہ تم راہ راست پا لوگے

يَا صَاحِبَيِ السِّجْنِ أَأَرْبَابٌ مُتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ٥ مَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا أَسْمَاءً سَمَّيْتُمُوهَا أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ٥

(یوسف: ۴۰)

اے زنداں کے ساتھیو! تم خود ہی سوچو کہ بہت سے متفرق رب بہتر ہیں یا وہ ایک اللہ جو سب پر غالب ہے؟ اس کو چھوڑ کر تم جن کی بندگی کر رہے ہو وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ بس چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباء و اجداد نے رکھ لیے ہیں۔ اللہ نے ان کے لیے کوئی سند نازل نہیں کی۔ فرماں روائی کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے اس کا حکم ہے کہ خود اس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی سیدھا دین ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

(باقی)

خدا کا آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم

(قسط ۳)

(مولانا سید جلال الدین عمری)

۵۔ جھوٹے شخص کی پہچان یہ ہے کہ اس میں نفاق کا مرض ہوتا ہے۔ اس کے پاس عمل کی پونجی نہیں ہوتی بلکہ صرف کھوکھلے دعوے ہوتے ہیں۔ وہ اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ الفاظ کے جادو سے دنیا فریب کھا جائے مگر ایک نفسیات شناس اس کی باتوں میں اس کے دل کی کھوٹ کا بآسانی پتہ چلا سکتا ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل میں کامل یکسانیت ہے۔ آپ ٹھیک اس طرف چل رہے تھے جس طرف دنیا کو بلا رہے تھے۔ آپ نے انسانوں سے جو کچھ کہا وہ آپ کے کردار میں موجود تھا۔ کسی نے آج تک یہ کہنے کی جرأت نہیں کی کہ آپ کے قول و عمل میں تضاد ہے اور آپ کے عمل سے آپ کی باتوں کی تردید ہوتی ہے۔ جس طرح خدا کے بارے میں آپ کا علم سب سے زیادہ تھا اسی طرح آپ سب سے زیادہ خدا ترس بھی تھے۔ آپ فرماتے ہیں:

وَاللّٰهِ إِنِّي لَأَعْلَمُهُمْ	قسم خدا کی میں سب سے زیادہ خدا کو
بِاللّٰهِ وَأَشَدُّهُمْ لَهُ	جانتا ہوں اور سب سے زیادہ اس سے
خَشْيَةً [1]	ڈرتا ہوں۔

سعد بن ہشام نے حضرت عائشہؓ سے آپ کے اخلاق کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ کیا تم قرآن نہیں پڑھتے؟ آپ کا اخلاق تو بعینہٖ قرآن تھا[2]۔ مطلب یہ کہ قرآن کو دیکھ کر تمہیں سمجھ لینا چاہیے کہ آپ کے اخلاق کیا ہیں۔ قرآن اور آپؐ کی زندگی دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں، بلکہ جو

---

[1] مشکوٰۃ، کتاب الایمان، باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ بحوالہ بخاری ومسلم

[2] رواہ مسلم وابوداؤد (کتاب الصلوٰۃ، باب فی صلوٰۃ اللیل۔)

چیز تمہیں قرآن میں ملے گی، وہی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت میں جلوہ گر ہوگی۔

۶۔ آپ انسانیت کے بہت بڑے خیر خواہ تھے۔ آپ نے کسی کے ساتھ برا سلوک نہیں کیا۔ کسی سے بدعہدی نہیں کی، کسی کو دھوکا نہیں دیا، کسی کا خون نہیں کیا، کسی کا مال نہیں کھایا۔ غرض یہ کہ آپ سے کسی بھی شخص کو کوئی نقصان نہیں پہنچا، بلکہ ہمیشہ آپ ہر ایک کی کامیابی کی فکر میں رہے۔ آپ نے مکے سے ہجرت کی تو آپ کے کسی بھی مخالف کو اس کا علم نہیں ہو سکا۔ لیکن جاتے ہوئے آپ نے اس دشمن قوم کی امانتوں کو جو صحیح معنوں میں آپ کے خون کی پیاسی تھی، حضرت علیؓ کے حوالے کر دیا تاکہ وہ جن لوگوں کی یہ امانتیں ہیں انہیں پہنچا دیں۔

یہ کتنی حیرت انگیز بات ہے کہ جس قوم نے آپ کے قتل کا منصوبہ بنایا، جو قدم قدم پر آپ سے لڑتی رہی اور جس نے آپ کو اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور کیا وہ اپنی زبان ہی سے نہیں بلکہ اپنے عمل سے اس بات کا اعتراف کر رہی ہے کہ یہ شخص دیانت دار ہے۔ یہ کسی کو فریب نہیں دے سکتا۔

لَیْسَ بِمَکَّۃَ اَحدٌ عِندَہٗ	مکے میں جس کسی کے پاس بھی کوئی ایسی چیز
شَیْءٌ یُخْشٰی عَلَیْہِ اِلَّا وَضَعَہٗ	ہوتی جس کے بارے میں اسے کسی قسم کا اندیشہ ہوتا
عِنْدَہٗ لِمَا یَعْلَمُ مِنْ صِدْقِہٖ	تو اسے وہ آپ کے پاس رکھ دیتا، کیونکہ ہر ایک،
وَاَمَانَتِہٖ[1]	آپ کی سچائی اور امانت سے واقف تھا۔

ہجرت کے دس سال بعد مکہ فتح ہوا تو آپ کے دشمن دست بستہ آپ کے سامنے کھڑے تھے۔ آپ اگر چاہتے تو ان سے چن چن کر انتقام لیتے۔ لیکن آپ نے ان سے پوچھا "یا معشر قریش ماترون انی فاعل فیکم" قریش کے لوگو! بتاؤ کہ اب میں تمہارے ساتھ کیا معاملہ کروں گا؟ انھوں نے جواب دیا کہ آپ شریف بھائی ہیں اور شریف بھائی کی اولاد ہیں۔ اس لیے آپ سے اچھے سلوک ہی کی توقع ہے۔ آپ نے فرمایا "اذھبوا فانتم الطلقاء" جاؤ تم سب کے سب آزاد ہو۔[2]

آپ نے ایک مرتبہ حضرت عائشہ سے فرمایا۔ لقد لقیت من قومك ما لقیت وكان اشد ما لقیت منھم یوم العقبۃ (مجھے تمہاری قوم سے جو تکلیفیں پہنچیں ان میں سب سے زیادہ سخت وہ تکلیف

---

[1] سیرت ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۹۸

[2] سیرت ابن ہشام جلد ۴ صفحہ ۳۲

تھی جو عقبہ (طائف) کے دن پہنچی۔) انسانیت کے ساتھ خیر خواہی کی اس سے بڑی مثال کیا ہو سکتی ہے کہ آپ نے اس دن بھی طائف والوں کے حق میں دعا کی کہ خدایا تو انہیں ہلاک نہ کر دے، گو کہ وہ تیرے دین کو قبول نہیں کر رہے ہیں لیکن شاید کہ ان کی اولاد تجھے ایک مانے اور تیری بندگی کرے[1]

ایک شخص نے دعا کی" اے اللہ! تو مجھ پر اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر رحم فرما اور ہمارے ساتھ کسی تیسرے کو اپنی رحمت میں شریک نہ کر" اس کی یہ دعا آپ کو ناگوار گزری۔ آپ نے فرمایا کہ خدا کی رحمت وسیع ہے تم نے اسے محدود کر دیا ہے[2]

آپ اللہ تعالیٰ سے عرض کرتے ہیں کہ" اے اللہ! میں نے تجھ سے ایک وعدہ لیا ہے تو کبھی اس کے خلاف نہیں کرے گا۔ وہ یہ کہ میں انسان ہوں۔ اس لیے بتقاضائے بشریت میں نے جس مسلمان کو بھی تکلیف دی، یا برا بھلا کہا، یا لعنت کی یا مارا ہے تو اے خدا میری اس حرکت کو اس کے حق میں رحمت بنا دے، اس سے اس کے گناہوں کو معاف کر دے اور قیامت کے روز اسے اپنی قربت کا ذریعہ بنائے جس کی وجہ سے تو اس شخص کو اپنے سے قریب کرے[3]

غور کیجیے! جس شخص نے کبھی چھوٹے سے چھوٹے معاملے میں کسی کو دھوکا نہ دیا ہو، اس کے بارے میں ہم کیسے سوچ سکتے ہیں کہ وہ خدا کے بارے میں دنیا کو فریب دے گا؟ جس نے موقع پانے کے باوجود اپنے دشمنوں کو معاف کر دیا ہو اس کے بارے میں ہم کیسے باور کر سکتے ہیں کہ وہ ایسا بے حقیقت فتنہ کھڑا کر دے گا کہ جس میں دشمنوں ہی کے جان و مال کا نہیں بلکہ دوستوں کے جان و مال کا بھی عظیم نقصان ہو؟ جس نے اپنے مخالفین کی امانتوں میں خیانت نہ کی ہو اس کے بارے میں ہم کیسے مان لیں کہ وہ انسانیت کے ساتھ اتنی بڑی بے وفائی کرے گا کہ لوگ اس پر خدا کے معاملے میں اعتماد کریں اور وہ انہیں خدا کی راہ سے بھٹکا دے؟ جس نے دعائیں کی ہوں کہ انسانوں کے ساتھ اس کی سخت کلامی بھی خدا سے ان کے تقرب کا ذریعہ بن جائے اور جسے یہ بات بھی ناگوار گزرے کہ خدا کی رحمت تنہا اس کے حصے میں آئے اس کے بارے میں ہم کیسے تصور کریں

---

[1] بخاری، کتاب بدء الخلق، باب اذا قال احدکم آمین الخ

[2] بخاری، کتاب الادب، باب رحمۃ الناس والبہائم

[3] مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الدعوات، بحوالہ بخاری و مسلم

کہ وہ ضلالت کا علم بردار ہوگا اور انسانوں کو خدا سے دور کر دے گا ۔ یہی بات شاہ ہرقل نے ابوسفیان رضؓ سے کہی تھی ۔ اس نے آپ سے پوچھا :۔

بتاؤ کیا اس مدعی رسالت نے کبھی کسی کو دھوکا دیا ہے ؟

ابوسفیان رضؓ نے جواب دیا " ابھی تک دھوکا نہیں دیا ہے ۔ آئندہ کا حال ہم نہیں جانتے ۔"

یہ سن کر ہرقل نے کہا ۔ یہ اس کے پیغمبر ہونے کی دلیل ہے کیونکہ پیغمبر کسی کو دھوکا نہیں دیتے[1]

(۷) شہرت کی بھوک بڑی سخت ہوتی ہے ' اس کے لیے انسان بڑی بڑی قربانیاں دیتا ہے ۔ لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو ہم اس دھبے سے پاک دیکھتے ہیں ۔ کم ظرف انسان جب نوع بشر کی بھلائی کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا کام بھی انجام دیتا ہے تو اسے یہ خواہش ہونے لگتی ہے کہ ہر طرف اس کی عظمت کے قصیدے پڑھے جائیں ' اس کی یادگاریں قائم ہوں ' لوگ اس کے سامنے دست بستہ کھڑے ہوں اور اس کی تعظیم بجا لائیں ' اس کی تصویریں شائع ہوں اور دنیا انہیں احترام کی نظر سے دیکھے ۔ اس کے مقابلے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کہ آپ نے دنیا کو باطل سے حق کی طرف موڑ دیا اور شیطان کے تخت کو الٹ کر خدا کی حکومت قائم کر دی لیکن اس کے باوجود آپ کبھی شہرت اور نام آوری کے طالب نہیں ہوئے ۔ آپ کے غیر معمولی کارناموں کو دیکھ کر انسان سوچنے لگتا ہے کہ شاید یہ شخص سطحِ انسانیت سے بلند ہے اور مافوق الفطرت قوتوں کا مالک ہے ۔ لیکن آپ اس کی تردید فرماتے ہیں ۔ صحابہ کی زبان سے کبھی کبھی اس طرح کے جملے نکل جاتے تھے کہ ہوگا وہی جو خدا اور خدا کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم چاہیں گے ۔ آپ نے فرمایا کہ یہ صحیح نہیں ہے بلکہ کہو کہ جو خدا چاہتا ہے وہ ہوتا ہے۔[2]

آپ نے بار بار اس کی صراحت کی ہے کہ :۔

اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ اَنْسٰى كَمَا تَنْسَوْنَ فَاِذَا نَسِيْتُ فَذَكِّرُوْنِيْ[3]	میں تم ہی جیسا انسان ہوں ۔ تم سے جیسے بھول ہوتی ہے ایسے ہی مجھ سے بھی بھول ہوتی ہے ۔ لہٰذا اگر کبھی میں بھول بھی جاؤں تو یاد دہانی کر دو ۔

---

[1] بخاری ' کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ ۔ [2] مسند احمد ج ۵ صفحہ ۷۲ ' [3] بخاری ' کتاب الصلوٰۃ ' التوجہ نحو القبلۃ حیث کان ۔

آپ نے فرمایا "جو شخص یہ چاہتا ہے کہ لوگ اس کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوں تو وہ جہنم کو اپنا ٹھکانا بنائے[1]۔ چنانچہ آپ خود بھی جب دیکھتے کہ لوگ آپ کی تعظیم میں حد سے آگے بڑھ رہے ہیں تو سختی سے منع کر دیتے۔ ایک مرتبہ آپ تشریف لائے تو صحابہ کھڑے ہو گئے۔ آپ نے فرمایا "لوگوں کی تعظیم میں کھڑا ہونا عجم کا طریقہ ہے تم اس کی پیروی نہ کرو[2]۔

بنو عامر کا وفد آپ کی خدمت میں آیا اور کہا کہ آپ ہمارے سردار ہیں۔ آپ نے فرمایا "سردار تو اللہ ہے۔ میں سردار نہیں ہوں۔ انھوں نے کہا آپ ہم میں سب سے افضل ہیں اور آپ کا مقام سب سے اونچا ہے۔ آپ نے فرمایا "جو بات صحیح ہے وہی کہو اور غلط باتیں چھوڑ دو۔ اس کا خیال رکھو کہ کسی کی تعریف میں شیطان حد سے آگے نہ پہنچا دے[3]۔

آپ فرماتے ہیں:۔

لا تطرونی کما	میری تعریف میں اس طرح مبالغہ نہ کرو جس طرح
اطرو عیسیٰ بن مریم	عیسیٰ بن مریم کی تعریف میں ان کے ماننے والوں نے
وقولوا عبد اللّٰہ و	مبالغہ کیا اور انہیں خدا بنا ڈالا میرے بارے میں بس
رسولہ[4]	یہ کہو کہ میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔

قیس بن سعدؓ نے آپ سے کہا کہ میں نے عراق میں دیکھا ہے کہ لوگ اپنے بڑوں کے سامنے سجدہ کرتے ہیں تو کیوں نہ ہم آپ کو سجدہ کریں جب کہ آپ اس کے زیادہ مستحق ہیں۔ آپ نے فرمایا کیا میرے مرنے کے بعد اگر تم میری قبر پر سے گزرو گے تو اسے بھی سجدہ کرو گے؟ انھوں نے جواب دیا۔ نہیں! آپ نے کہا کہ مر کر مٹی ہونے والا انسان اپنی زندگی میں بھی اس قابل نہیں ہے کہ اسے سجدہ کیا جائے، لہٰذا تم مجھے سجدہ نہ کرو[5]۔

آپ نے اپنی امت کو نصیحت کی" لَا تَجْعَلُوا قبری عیداً (میری قبر پر میلہ نہ لگاؤ۔[6])

---

[1] ابوداؤد، کتاب الادب، باب الرجل یقوم للرجل یعظمہ بذالک۔ [2] حوالہ سابق۔

[3] ابو داؤد۔ کتاب الادب۔ باب فی کراہیۃ التمادح۔

[4] بخاری، کتاب استتابۃ المرتدین الخ باب رجم الحبلیٰ من الزنا اذا احصنت

[5] رواہ ابوداؤد ورواہ احمد عن معاذ بن جبل۔ (مشکوٰۃ المصابیح، کتاب النکاح، باب عشرۃ النساء وما لکل واحد من الحقوق۔

[6] ابوداؤد، کتاب المناسک، باب زیارۃ القبور۔ مسند احمد ج ۲ ص ۳۶۷

یہ چند واقعات میں نے آپ کے سامنے رکھے ہیں۔ جس کسی نے بھی آپ کے حالات کا مطالعہ کیا ہے وہ یہ کہنے کی کبھی جرأت نہیں کر سکتا کہ آپ نے شہرت اور نام آوری کے لیے اپنی رسالت کا اعلان کیا۔ دنیا اس شخص کو کیسے جاہ طلب اور عزت و شہرت کا خواہاں کہے گی جو انسان کی ہر توہین کو برداشت نہ کرے کہ اس کا سر خدا کے سوا کسی اور کے آگے جھکے؟ جس کی بے نفسی کا یہ عالم ہو کہ لوگ اسے سجدہ کرنے کی اجازت چاہیں اور وہ اجازت نہ دے، جو اپنے ساتھیوں کو اس سے بھی منع کرے کہ اس کی آمد پر کھڑے ہوں اور جس کی نصیحت ہو کہ میری تعریف و توصیف میں مبالغہ نہ کیا جائے کہ یہ گمراہ قوموں کی علامت ہے اور جو خدا سے دعا کرے" اَللّٰھُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِیْ وَثَنًا" (اے اللہ میری قبر کو بت نہ بننے دے کہ لوگ اس کو پوجنے لگیں)[1] حقیقت یہ ہے کہ یہ بے غرضی اور اخلاص اسی سینے میں پرورش پا سکتا ہے جو سچائی سے معمور ہو۔ جھوٹا شخص کبھی مخلص نہیں ہو سکتا۔

(۸) آپ دنیا دار نہیں تھے۔ آپ کی زندگی بے حد سادہ اور عیش و عشرت سے خالی تھی۔ آپ پر یہ الزام نہیں لگایا جا سکتا کہ دعویٰ رسالت کے ذریعہ آپ مال و دولت حاصل کرنا چاہتے تھے یا حکومت و ریاست اور عہدہ و منصب کے خواہاں تھے۔ آپ نے رسالت کے نام پر قوم سے سرمایہ فراہم نہیں کیا بلکہ اپنی تمام دولت اس راہ میں لٹا دی۔ منصبِ رسالت سے پہلے آپ ایک کامیاب تاجر تھے اور آپ کے نکاح میں حضرت خدیجہؓ جیسی عرب کی دولتمند بیوی تھیں لیکن رسالت کی ذمہ داریوں نے آپ کی تجارت اور حضرت خدیجہ کی دولت دونوں کو ختم کر کے رکھ دیا اور آپ کو اس سلسلے میں اتنی مصیبتیں اٹھانی پڑیں کہ آپ خود فرماتے ہیں۔" مجھے خدا کی راہ میں اس قدر ڈرایا اور ستایا گیا کہ کسی کو اتنا ڈرایا اور ستایا نہیں گیا۔ مجھ پر تیس شب و روز ایسے گزرے ہیں کہ میرے اور بلال کے لیے کھانا جسے کوئی جاندار کھا سکے۔ بس اتنی مقدار میں ہوتا کہ بلال اسے اپنی بغل میں چھپا لیتے"[2]

آپ نے یہ قربانیاں اس لیے پیش کیں تاکہ خدا کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچ جائے۔ ورنہ آپ چاہتے تو دنیا کی بڑی سے بڑی دولت اپنے لیے جمع کر سکتے تھے۔ آپ کو اپنی دعوت سے

---

[1] مسند احمد جلد ۲ ص۲۴۶
[2] ترمذی (مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الرقاق، باب فضل الفقراء)

باز رکھنے کے لیے قریش کی طرف سے عتبہ یہ پیش کش لے کر آپ کی خدمت میں پہنچا کہ "بھتیجے! اگر اس دعوت سے تم مال و دولت چاہتے ہو تو ہم اتنا مال جمع کر دیں کہ تم سب سے بڑے مال دار بن جاؤ۔ اگر اس سے سرداری مطلوب ہے تو آؤ ہم تمہیں اپنا سردار مان لیں اور تمہارے فیصلے کے بغیر کوئی کام انجام نہ دیں۔ اگر سلطنت کی خواہش ہے تو ہم اس کے لیے بھی تیار ہیں کہ تمہیں اپنا بادشاہ تسلیم کر لیں۔ لیکن اگر واقعہ یہ نہیں ہے اور تم اپنے اندر جنون کی کیفیت پاتے ہو اور تمہیں ایسی چیزیں نظر آتی ہیں جنہیں تم دور نہیں کر سکتے تو ہم تمہارا علاج کرنے کے لیے بھی تیار ہیں"۔

عتبہ کی یہ تقریر آپ خاموشی سے سنتے رہے۔ اس کے بعد آپ نے قرآن کی چند آیتیں اسے سنائیں۔ اس طرح آپ نے اپنی دعوت اس کے سامنے پیش کر دی اور فرمایا "یہ ہے میرا جواب، اب تم جانو اور تمہارا کام"[1]

مدینے میں آپ ایک ریاست کے مالک تھے لیکن اس کے باوجود صحیح روایات بتاتی ہیں کہ آپ نے ایک فقیر بے نوا کی زندگی گزاری۔

حضرت عمرؓ اپنا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میں آپ کے کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ آپ بغیر قمیص کے چٹائی پر لیٹے ہوئے تھے اور آپ کے جسم پر چٹائی کے نشانات صاف نظر آ رہے تھے۔ میں نے کمرے کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ ایک طرف تین چمڑے پڑے ہوئے ہیں۔ ایک کونے میں کچھ چھال اور دوسرے کونے میں قریب ایک صاع جَو ہے۔ یہ منظر دیکھ کر میں بے اختیار رو پڑا۔ آپؐ نے پوچھا روتے کیوں ہو؟ میں نے عرض کیا۔ قیصر و کسریٰ کو تو دنیا کی دولت حاصل ہے اور آپ خدا کے رسول اس حال میں ہیں۔ یہ سنتے ہی آپ بیٹھ گئے اور فرمایا۔ "عمر! آخر تم کس خیال میں ہو؟ کیا تم نہیں چاہتے کہ ان کو دنیا ملے اور آخرت ہمارے حصے میں آئے؟ خدا نے انہیں اپنی نعمتیں دنیا ہی میں دے دی ہیں اور آخرت میں انہیں محروم کر دیا ہے"[2]

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ دو دو مہینے گزر جاتے تھے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کے مکانات میں چولھا نہیں جلتا تھا۔ عروہ نے پوچھا تو آپ لوگ کیسے زندہ رہتے تھے؟ انھوں نے

---

[1] سیرت ابن ہشام جلد ۱ صفحہ ۳۱۴

[2] بخاری، کتاب النکاح، باب موعظۃ الرجل ابنتہ لحال زوجہا۔ مسلم، کتاب الطلاق، باب بیان ان تخییر امرأتہ لا یکون طلاقا الا بالنیۃ

جواب دیا کہ کھجور اور پانی ہماری غذا تھی، ساتھ ہی بعض انصار دودھ بھیج دیا کرتے تھے[1]

ان ہی کی ایک دوسری روایت ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینے آنے کے بعد آپ کے گھر والوں نے مسلسل تین دن تک گیہوں کا استعمال نہیں کیا اور اسی حالت میں آپ دنیا سے چلے گئے۔[2]

آپ کے خادمِ خاص حضرت انس رضؓ فرماتے ہیں، مجھے نہیں معلوم کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی تپلی روٹی دیکھی ہو اور نہ آپ نے اپنی آنکھوں سے بھنا ہوا بکری کا گوشت دیکھا[3]

ایک مرتبہ چٹائی پر لیٹنے کی وجہ سے آپ کے جسم پر اس کے نشانات پڑ گئے تھے حضرت عبداللہ ابن مسعود رضؓ نے دیکھا تو فرمایا کہ اگر آپ حکم دیں تو ہم کوئی نرم بستر تیار کر دیں اور آپ کی آسائش کا خیال کریں۔ آپ نے فرمایا۔ مجھے دنیا سے اور دنیا کو مجھ سے کیا تعلق؟ میں دنیا میں ایک مسافر ہوں، جس طرح ایک مسافر درخت کے نیچے کچھ دیر کے لیے سایہ حاصل کرتا ہے اور پھر اسے چھوڑ کر چلا جاتا ہے، اسی طرح یہ دنیا میری منزل نہیں ہے بلکہ یہاں میں ایک مسافر کی حیثیت میں ہوں۔[4]

آپ کی بیوی حضرت حفصہ رضؓ فرماتی ہیں کہ ایک کمبل تھا جسے ہم دو تہہ کر کے بچھا دیتے تھے، اسی پر آپ آرام فرماتے۔ ایک مرتبہ خیال ہوا کہ اگر اسے چار تہہ کر کے بچھا دیا جائے تو آپ کے لیے زیادہ آرام دہ ہوگا۔ چنانچہ میں نے اسے چار تہہ کر کے بچھا دیا۔ جب صبح ہوئی تو آپ نے پوچھا کہ رات کون سا بستر تھا؟ میں نے جواب دیا کہ یہ وہی کمبل ہے جس پر آپ ہمیشہ آرام فرماتے ہیں۔ البتہ رات میں نے اسے چار تہہ کر کے بچھا دیا تھا۔ آپ نے فرمایا' یہ ٹھیک نہیں ہے۔ جیسے پہلے بچھایا کرتی تھیں اسی طرح بچھایا کرو، کیونکہ بستر کے نرم ہونے کی وجہ سے رات میری نماز چھوٹ گئی۔[5]

عقبہ بن حارث کہتے ہیں کہ ایک دن عصر کی نماز کے فوراً بعد آپ غیر معمولی سرعت کے ساتھ مکان میں داخل ہوئے اور پھر باہر تشریف لے آئے۔ اس سے ہمیں بہت تعجب ہوا تو آپ نے فرمایا کہ گھر میں صدقے کا کچھ سونا رکھا ہوا تھا مجھے یہ بات ناپسند ہوئی کہ وہ رات بھر میرے پاس پڑا رہے،

---

[1] بخاری، کتاب الہبۃ و فضلہا و التحریض علیہا۔

[2] بخاری، کتاب الرقاق۔ باب کیف کان عیش النبیؐ و اصحابہ   [3] حوالۂ مذکور

[4] احمد، ترمذی، ابن ماجہ، (مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الرقاق۔)

[5] شمائل الترمذی، باب ما جاء فی فراش رسول اللہ

اس لیے میں نے ابھی اسے تقسیم کر دیا[1]

حضرت عائشہؓ مرض الموت کا حال بیان کرتی ہیں کہ آپ نے چھ سات دینار حاجت مندوں میں تقسیم کے لیے مجھے دیے تھے لیکن آپ کی علالت کی وجہ سے مجھے اس کا موقع نہیں ملا۔ آپ نے اس کے بارے میں پوچھا تو میں نے معذرت کی کہ ابھی یہ خدمت انجام نہیں دے سکی ہوں۔ آپ نے فرمایا۔ ان دیناروں کو لاؤ۔ اس کے بعد آپ نے انہیں اپنے ہاتھ میں رکھ کر کہا کہ محمد کا خدا کے بارے میں یہ کتنا گھٹیا تصور ہو گا، اگر وہ خدا سے اس حال میں ملے کہ یہ دنیا اس کے پاس ہو۔ جاؤ انہیں خرچ کر دو[2]

آپ نے اس طرح زندگی گزاری اور جب اس دنیا سے رخصت ہوئے تو اپنی بیویوں اور اولاد کے لیے کچھ نہیں چھوڑا، نہ دینار نہ درہم، نہ بکری نہ اونٹ اور نہ کسی چیز کی وصیت کی[3]

آپ نے فرمایا۔ لا نورث ما ترکنا صدقۃ (میرا تعلق پیغمبروں کے گروہ سے ہے۔ ہمارا کوئی وارث نہیں ہوتا۔ جو کچھ ہم چھوڑ جاتے ہیں وہ خیرات کر دیا جاتا ہے۔)[4]

جس شخص کے سامنے حکومت و ریاست، دولت و ثروت اور حسن و جمال اس شرط پر پیش کیا جائے کہ وہ خدا کا پیغام پہنچانے سے باز آجائے اور وہ اس پیش کش کو بے نیازی سے ٹھکرا دے اس پر بہت بڑا بہتان لگاتا ہے جو اسے دنیا کا بھوکا کہتا ہے اور اس کے دعوی رسالت کو دنیا کمانے کی تدبیر سمجھتا ہے۔

جس شخص کے پاس اقتدار ہو، حکومت ہو، مال و دولت کی فراوانی ہو اور اس کے باوجود اس کے گھر دو دو مہینے چولھا نہ جلے، جس کا تاثر یہ ہو کہ نرم بستر خدا سے غافل کرنے والی چیز ہے اور جو دنیا کو آرام کی جگہ نہ سمجھے، بڑی ناانصافی ہوگی اگر اس کے بارے میں کہا جائے کہ وہ دنیا کی خاطر نبوت کا دعویٰ کر رہا ہے۔ کیا کوئی دنیا کا چاہنے والا ایسا بھی گزرا ہے جو عیش کے سارے سامان کے باوجود فقر و فاقے کی زندگی گزارنے اور جو دنیا سے اتنا فائدہ اٹھانا بھی پسند نہ کرے جتنا فائدہ ایک بے حیثیت آدمی اٹھائے جاتا ہے۔؟

---

[1] بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب من احب تعجیل الصدقۃ من یومہا۔ [2] مسند احمد، جلد ۶، صفحہ ۱۰۴ و ۱۸۲

[3] مسلم، کتاب الوصیۃ، باب ترک الوصیۃ لمن لیس لہ شیئ یوصی فیہ۔ [4] بخاری، کتاب فرض الخمس۔ مسلم، کتاب الجہاد، باب حکم الفئ

ایسا انسان جس کی موت اس حال میں آئے کہ اس کی زرہ رہن رکھ کر غلہ حاصل کیا گیا ہو[1]
جو نہ صرف اپنے لیے دعا کرے کہ "خدایا تو مجھے مسکین زندہ رکھ، مسکینی کی حالت میں موت دے اور قیامت کے دن مسکینوں کے زمرے میں اٹھا"[2] بلکہ اپنی اولاد کے لیے بھی دعا کرے کہ "اے اللہ تو میری اولاد کو قوت لایموت دے"[3] اور جو اپنے ذاتی مال میں بھی اپنے گھر والوں کا حصہ قرار دے، دل کہتا ہے کہ وہ دنیا دار نہیں ہے۔ وہ خاندان اور قبیلے کی خاطر خدا پر تہمت نہیں باندھ سکتا۔

یہ بے غرضی اور اخلاص اور بے مثال قربانیاں ہمارے سامنے سوال بن کر آتی ہیں کہ ایک ایسا شخص جو اعلیٰ ترین صلاحیتوں کا مالک ہے، جو اگر چاہے تو اپنی دنیا بہتر سے بہتر طریقے سے بنا سکتا ہے وہ کیوں عسرت و تنگی برداشت کر رہا ہے؟ عیش و عشرت اس کا استقبال کرتی ہے تو کیوں وہ ٹھکرا دیتا ہے؟ آخر وہ کتنا بلند مقصد ہے جس کے لیے یہ بہترین قوتیں اور صلاحیتیں صرف ہو رہی ہیں؟ اگر انسان تعصب کا مارا ہوا نہ ہو اور حق کے لیے اس کے دل کے دروازے کھلے ہوں تو وہ ماننے پر مجبور ہوگا کہ جو شخص واقعتاً خدا کے لیے نہ کھڑا ہو اس کے اندر یہ بے غرضی اور بے نفسی کبھی نہیں پیدا ہو سکتی جس وقت اس کے اندر یہ احساس ابھرے گا اس کو خدا کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا گرویدہ بنا دے گا۔

۹۔ آپ کی سیرت کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ اس میں زبردست قوتِ تاثیر تھی۔ چنانچہ بڑی بڑی شخصیتیں اس سانچے میں ڈھل گئیں اور اس سے گہرا اثر قبول کیا۔ جن افراد کو آپ کا فیضِ صحبت نصیب ہوا وہ آپ کے عکسِ کامل بن گئے۔ ان میں خدا کی یاد، آخرت کا خوف، فنائے نفس اور ایثار و قربانی کا وہی جذبہ ابھر آیا جو آپ کے اندر تھا۔ ان کے اخلاق و سیرت میں وہی پاکیزگی آگئی جو آپ کے اخلاق و سیرت میں تھی۔ حق کے لیے ان کے پاس بے پایاں اخلاص تھا اور باطل کے مقابلے میں ان کے اندر بڑی شدت تھی۔ وہ بے یقینی کے عالم سے نکل کر یقین کے اس مقام تک پہنچ گئے جس سے اونچے مقام کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے آپ کو رسول مانا اور اس

---

[1] بخاری، کتاب الجہاد، باب ما قیل فی درع النبیؐ
[2] ترمذی، ابن ماجہ، بیہقی (مشکوٰۃ، کتاب الرقاق)
[3] بخاری، مسلم (مشکوٰۃ، کتاب الرقاق)

اس کے رسول کے حوالے ہیں[1]

غزوہ تبوک کے موقع پر لشکر کے لیے سازوسامان کا کوئی انتظام نہیں ہو رہا تھا اس وقت حضورؐ نے
یا کہ جو شخص اس لشکر کو مسلح کرے گا خدائے تعالے اس کا اجر دے گا۔ ان الفاظ کے سنتے ہی حضرت
ان ؓ کھڑے ہوئے اور لشکر کی ایک ایک ضرورت کا اس طرح انتظام کیا کہ اونٹوں کے لیے رسیاں اور نکیلیں تک فراہم کر دیں[2]

نبی علیہ السلام نے خدا کا حکم سنایا کہ انسان نیکی کا مقام اسی وقت پا سکتا ہے جب کہ وہ اپنی
بوب چیزوں سے دست بردار ہو جائے۔ تو حضرت ابو طلحہ نے کہا اے اللہ کے رسول میرا فلاں باغ مجھے
سب سے زیادہ پسند ہے۔ اسے میں اللہ کی راہ میں صدقہ کرتا ہوں اور اسی سے مجھے اس کے اجر و ثواب کی توقع ہے[3]

دو آدمی آپ کی خدمت میں ایک مقدمہ لے کر پہنچے لیکن دونوں میں سے کسی کے پاس کوئی دلیل نہیں
تھی۔ آپ نے ان سے فرمایا کہ "میں ایک انسان ہوں تم اپنے جھگڑے میرے پاس لاتے ہو ممکن ہے تم
میں سے کوئی شخص اپنے دعوے کو دوسرے سے زیادہ وضاحت اور چالاکی کے ساتھ پیش کرنے میں
کامیاب ہو جائے اور میں اس کے حق میں فیصلہ دے دوں لیکن یاد رکھو اگر اس طرح میں کسی کو اس
کے بھائی کی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی دوں تو وہ اسے ہرگز نہ لے۔ کیونکہ میں جہنم کی آگ کا ایک ٹکڑا اس
کے حوالے کر رہا ہوں"۔

اس تقریر کا اتنا اثر ہوا کہ دونوں بے اختیار رونے لگے اور اپنے اپنے دعوے سے دوسرے کے
حق میں دست بردار ہو گئے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول ماننے والوں کا یہ یقین یہ ایمان اور یہ قربانیاں میرے نزدیک آپ کے برحق
ہونے کی زبردست دلیل ہیں۔ کیونکہ آج تک اس کی کوئی مثال نہیں ہے کہ کسی جھوٹے نے دوسروں کو صداقت کا پابند
بنا دیا ہو کسی خدا سے بے خوف انسان نے اپنے ساتھیوں کے اندر اس کا خوف اور خشیت پیدا کر دی ہو اور کسی پست سیرت
آدمی کی صحبت سے لوگوں کی سیرت بلند ہو گئی ہو۔ جھوٹ انسان کو کمزور کر دیتا ہے۔ جھوٹے شخص میں یہ طاقت نہیں ہوتی
کہ کسی کو سہارا دے سکے اس کا مقام مصلح اخلاق کا نہیں ہوتا بلکہ وہ اس قابل ہوتا ہے کہ اس کی اصلاح کی جائے۔ جو
خود دوسروں کی مدد کا محتاج ہو وہ کسی کی دستگیری کیا کر سکتا ہے؟ میدان عمل میں جس کے قدم لڑکھڑا رہے ہوں
ناممکن ہے کہ وہ کسی کمزور اور ناتواں جسم میں استقلال اور ثابت قدمی کی روح پھونک دے۔

---

[1] ابو داؤد، کتاب الزکوٰۃ۔ [2] ترمذی و نسائی ابواب المناقب۔ [3] بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب الزکوٰۃ علی الاقارب۔
[4] ابو داؤد، کتاب القضاء، باب فی قضاء القاضی اذا اخطأ۔

فوز و فلاح اور قرآن کریم

قسط ۲

(مولانا سلیمان فرخ آبادی)

سورۂ توبہ میں

سورۂ توبہ رکوع ۹ آیت ۲، میں جن لوگوں سے فوز عظیم کا وعدہ کیا گیا ہے ان کے وہ اوصاف جن کی وجہ سے وہ فوز عظیم کے مستحق قرار پائے۔ آیت ۱؎ میں بیان فرمائے گئے ہیں۔

۱۔ مردوں اور عورتوں کا وہ گروہ، قوم یا امت جو ایمان و یقین کی نہ صرف حامل ہو بلکہ ان میں رشتۂ اتحاد بھی ایمان ہی ہو۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کے ولی دوست اور رفیق کار ہوں اور یہ باہمی الفت و محبت کا جذبہ ان میں صرف ایمان نے پیدا کیا ہو، وہ کسی رشتۂ نسل و نسب کسی تعلق لون و لسان یا کسی مفادِ دنیا کی خاطر متحد و متفق اور منظم نہ ہوئے ہوں ایمان اور صرف ایمان کے جذبہ یگانگت نے انہیں ایک دوسرے کا رفیق، ساتھی اور ہمدم و ہمساز بنا دیا ہو۔

۲۔ جس مقصد عزیز کی خاطر وہ ایک دوسرے کے رفیق اور ساتھی بنے ہیں جس نصب العین کی علمبرداری نے سب کو ایک لڑی میں پرو دیا ہے۔ جس منزل کے راہی وہ سب ہیں وہ مقصد عزیز اور وہ منزل مقصود شہادت حق کا نصب العین، اعلائے کلمۃ اللہ کا مقصد، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی غایت اور اقامت دین کا فریضہ ہے۔ یہی وہ لیلائے مقصود ہے جس کے سب دیوانے ہیں، یہی وہ منزل متعین ہے جس کے سب راہی ہیں اور اسی ایک چیز نے (کہ وہ معروف کا حکم دینا اور منکرات کا استیصال کرنا اپنا فریضہ گردانتے ہیں اور عملاً اس پر کاربند ہیں) ان کو ایک ایسے قافلے میں تبدیل کر دیا ہے جو اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔

۳۔ وہ نہ صرف حقوق اللہ ادا کرتے ہوں بلکہ حقوق العباد کا بھی پورا پورا حق ادا کرنے میں پیش پیش رہتے ہوں۔ نہ صرف اپنے جسم و جان سے بندگیٔ رب کا حق ادا کرتے ہوں بلکہ اپنا مال و دولت بھی راہ حق میں کھپاتے ہوں وہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتاءِ زکوٰۃ میں کسی غفلت اور سستی کا مظاہرہ نہ کرتے ہوں بلکہ سرگرم عمل ہوں۔

۴۔ وہ نہ صرف دین کی علمبرداری اور حقوق اللہ و حقوق العباد کی ادائیگی میں سرگرم ہوتے ہیں بلکہ اللہ و رسول کی اطاعت ان کی زندگی کے تمام لمحات اور کاروبارِ حیات کی تمام وسعتوں میں جاری و ساری ہوتی ہے۔

یہی چار خصوصیات ہیں جنہوں نے ان اللہ کے بندوں اور بندیوں کو آپس میں ایک دوسرے کا رفیق بنا دیا ہے اور انہیں خصوصیات کی وجہ سے وہ رحمتِ خداوندی سے نوازے جائیں گے اور فوزِ عظیم سے ہم کنار ہوں گے۔ یہ فوزِ عظیم خدا تعالیٰ کی جنتوں اور ہمیشہ ہمیشہ رہنے والی بہشتوں میں پاکیزہ اور پر لطف مکانات کی شکل میں اللہ کی خوشنودی سے معمور و منور ان کے آگے موجود ہوگی اور وہ اس سے ہم کنار اور لطف اندوز ہوں گے۔

سورہ توبہ رکوع ۱۱ میں بتایا گیا کہ دنیا و آخرت کی بھلائیوں کا دارو مدار اور فلاح و بہبود کا انحصار جہاد فی سبیل اللہ پر ہے اور آخرت میں فوزِ عظیم کا حصول بھی انہیں لوگوں کا نصیب ہے جو اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ذریعہ اللہ کے دین کو سربلند کرنے میں ہمہ تن مصروف رہیں — اپنی پوری سکت اپنی تمام توانائیوں، اپنے سب ہی ذرائع و وسائل، اپنی ساری صلاحیتیں اور فرصتیں دین نبی کی پیروی اور سربلندی میں کھپا دینا، اپنے دماغ کی تمام حکمت و دانائی اپنے دل کی تمام لگن، تڑپ، شوق و عشق اور بے تابیاں، اپنی آنکھوں کا تمام نور، اپنی زبان کی تمام قوتِ گویائی، اپنے قدموں کی تمام طاقت بادیہ پیمائی اور صحرا نوردی، اپنے ہاتھوں کی تمام قوتِ بطش اور طاقتِ گرفت، اپنے سینے کی تمام دھڑکنیں، اپنے جگر کا تمام سوز اور اپنے وجود کا سب کچھ اللہ کے دین کی خاطر تج دینا جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زندگیاں اس کا جیتا جاگتا نمونہ ہیں۔ چنانچہ وہ فلاح و بہبود سے ہمکنار ہو چکے دنیا و آخرت کی بھلائیوں سے دامن بھر چکے اور فوزِ عظیم سے ہم کنار ہو چکے آج بھی جہاد فی سبیل اللہ کا دروازہ کھلا ہے جو چاہے

آئے اور اس دروازہ سے فلاح و بہبود اور فوزِ عظیم کی جنتوں میں داخل ہو جائے اور دنیا و آخرت کی بھلائیوں سے دامن بھر لے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین خصوصاً مہاجرین اور انصار جنھوں نے سب سے پہلے اللہ کے دین پر لبیک کہا اور اس کی خاطر نہ صرف دنیا کی ہر مصیبت کو انگیز کیا بلکہ دنیا کی ہر شے کو قربان بھی کیا، وہ ایمان لائے تو اپنی جان و مال اللہ کی راہ میں تج کر اس کا ثبوت دیا۔ انھوں نے اسلام قبول کیا تو اس کا ثبوت شعب ابی طالب میں دیا۔ غزوۂ تبوک، جنگ خندق، جنگ احد اور میدانِ بدر میں دیا دہکتے انگاروں پر لوٹ کر اور پیٹھ پر دُرّے کھا کر اور پیٹ پہ پتھر باندھ کر دیا، سر سے کفن باندھ کر اور تختہ دار پہ مردانہ وار ثبوت پیش کیا، وہ صرف اپنے تزکیۂ نفس میں نہیں لگے رہے، وہ اصلاحِ معاشرہ کی غرض سے صرف وعظ نہیں کہتے رہے، خانقاہوں میں ضربیں نہیں لگاتے رہے مصلوں پر بیٹھے تسبیح نہیں پڑھتے رہے۔ مدرسوں میں بیٹھے کتابوں کے کیڑے نہیں بنے رہے بلکہ اعلاءِ کلمۃ الحق کے لیے ہمیشہ سینہ سپر ہو کر ہر باطل سے نبرد آزما رہے اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے اور جو ان کے نقش قدم پہ چلا اس کا بھی بیڑا پار ہوا اللہ نے ان کے واسطے جنتیں تیار کر رکھی ہیں جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں جن میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور یہ عظیم کامیابی ہے آج بھی اگر کوئی فرد و قوم خوشنودیِ رب کی طالب اور فوزِ عظیم کی خواہشمند ہے تو اسے انہیں السابقون الاولون کے نقش قدم پر چل کر اتباعِ دین اور علمبرداری دین کے تمام فطری مراحل سے گزرنا ہوگا چنانچہ سورۂ توبہ رکوع ۱۳ میں فرمایا۔ وہ مہاجر و انصار جنھوں نے سب سے پہلے دعوتِ ایمان پر لبیک کہنے میں سبقت کی اور وہ جو بعد میں راست بازی کے ساتھ اس کے پیچھے آئے اللہ ان سے راضی ہوئے اللہ نے ان کے لیے ایسی جنتیں مہیا کر رکھی ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہی عظیم الشان کامیابی ہے۔

مومن اپنے رب سے پورے شعور اور کمال ارادے کے ساتھ اپنے نفس و مال اور اپنے تمام سرمایۂ زندگی کی بیع کا معاملہ کرتا ہے اور اپنے اختیار اور ارادے کو اللہ کی خوشنودی کے عوض فروخت کر دیتا ہے۔ اس خرید و فروخت اور اس معاہدے پر جس قدر پختگی کے ساتھ وہ اپنی دنیوی زندگی کے تمام لمحات اور جملہ کاروبارِ حیات میں وفاءِ عہد کا پابند رہے گا اور استقامت کا ثبوت دے گا اسی قدر

ح اور قرآن کریم
ں، کامرانی، فلاح و بہبود اور فوز عظیم کا حصول یقینی ہوگا۔ چنانچہ سورہ توبہ رکوع ۱۴ میں فرمایا
ن ہے جو اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کا پورا کرنے والا ہو پس خوش ہو جاؤ اپنی اس بیع پر جو تم نے
اللہ سے) کی ہے اور یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

تہمت و افترا ہر حال میں بری چیز ہے۔ تہمت دھرنے اور الزام
ی فلاح نہیں پاسکتے | لگانے والا مفتری بہر حال ظالم ہوتا ہے لیکن ذات خداوندی جو کہ ہمتا
ح اور قدوس ہے، اپنی ذات میں آپ حمید ہے اور جامع صفات کمالیہ ہے۔ اس ذات بے
زام لگانا اور تہمت تھوپنا ظلم اور سب سے بڑا ظلم ہے اور یہ ظلم بے وفائی، اور غداری، الحاد اور
ے کے مساوی سب سے بڑا جرم ہے۔ اور ایسے مجرم کبھی فلاح نہیں پا سکتے وہ ہمیشہ ناکام و
راد رہیں گے وہ کبھی کامیابی و کامرانی سے آشنا نہیں ہو سکتے کیونکہ یہ ظلم وہ جرم ہے جو اپنی
ہرناکی میں اپنی آپ مثال ہے۔

اللہ تعالیٰ پر انسان دو طرح سے ظلم کرتا ہے۔ اول اس طرح کہ اللہ تعالیٰ کی طرف ان
مفات اور افعال کو منسوب کرے جن سے وہ ذات، پاک اور مبرا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی جانب
سے الہام و وحی سے سرفراز کیے جانے کا جھوٹا اور فرضی ڈھونگ رچا کر مخلوق خدا کو گمراہ کرے یا
اللہ نے جن اشیاء کو حلال قرار دیا ہو انہیں حرام ٹھہرائے یعنی تحلیل و تحریم اور قانون سازی جو خدا
تعالیٰ کا حق اور منصب ہے اسے خود اختیار کرے۔ دوم اس طرح کہ اللہ تعالیٰ کی آیات
(آفاق و انفس کی آیات، خصوصًا کتاب الٰہی اور وحی نبوت کی آیات) کا انکار کرے ان کو جھٹلائے
اور نہیں فرضی ٹھہرائے۔ ایسے مجرم خواہ دنیا میں کتنا ہی پھولیں اور پھلیں لیکن درحقیقت وہ فلاح سے
ہم کنار نہیں ہو سکتے کیونکہ ان کے جرم افترا اور جرم تکذیب کی سزا یہی ہے کہ وہ ہمیشہ ہمیش کے
واسطے فلاح سے محروم کر دیے جائیں چنانچہ سورہ یونس رکوع ۲ میں فرمایا۔ پس اس سے بڑھ کر اور
کون ظالم ہوگا جو اللہ پر جھوٹ تہمت باندھے اور اس کی آیات کو جھٹلائے۔ یقینا ایسے مجرم کبھی
فلاح نہیں پا سکتے۔ آگے رکوع ۷ میں فرمایا۔ کہہ دو کہ جو لوگ اللہ پر جھوٹے افترا باندھتے ہیں وہ
ہرگز فلاح نہیں پا سکتے۔

اولیاء اللہ کامیاب ہیں | اولیاء اللہ کے متعلق عجیب عجیب تصورات پائے جاتے ہیں۔ ولی اللہ

وہ جسے کشف ہوتا ہو جس سے کرامات صادر ہوتی ہوں، جو علائق دنیوی سے بے تعلق ہو کر صرف اللہ اللہ میں لگا رہتا ہو، ایک خاص قسم کا لباس اور مخصوص ہیئت رکھتا ہو۔ اجتماعی زندگی سے کوئی تعلق نہ رکھتا ہو اور اس سے بھی نچلی سطح پر اتر کر عوام تو ہر دیوانے کو پہنچا ہوا، ہر مجنون کو مجذوب قرار دیتے ہیں حتیٰ کہ سماع میں وجد کرنے لگنا بھی ولی اللہ ہونے کا ایک ثبوت ہے۔ صرف عوام نہیں اچھے خاصے دین دار اور تعلیم یافتہ بھی اس سلسلے میں طرح طرح کی غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں۔ حالانکہ قرآن صرف دو شرطیں بیان کرتا ہے اور ان پر پورا اترنے والوں کو نہ صرف ولی اللہ قرار دیتا ہے، بلکہ ان کو دنیا اور آخرت میں کامیابی کی خوش خبری سناتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ دنیا اور آخرت میں ان کے واسطے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں۔ پہلی شرط یہ ہے کہ اللہ، اس کی صفات، اس کے فرشتے، اس کی کتابیں، اس کے رسول، اس کا مقرر کردہ آخرت کا دن، یہ اور ان کے علاوہ ان تمام بنیادی حقیقتوں پر ایمان رکھنا جن کی تعلیم اور ہدایت، اللہ اور اس کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ اپنی پوری زندگی اور اس کے تمام لمحات اور تمام پہلوؤں میں اور تمام انفرادی اور اجتماعی میدانوں میں، تقویٰ کی روش اختیار کرنا، اللہ کے اوامر پر کاربند ہونا اور نواہی سے کامل پرہیز کرنا، ہر وقت اور ہر کام میں اس کا دھیان اور خیال رکھنا ہر وقت اس سے ترساں اور لرزاں رہنا بس یہ دو شرطیں ہیں جس نے ان شرطوں کو پورا کیا وہ گویا اولیاء اللہ کے زمرے میں شامل کر لیا گیا، فوز عظیم سے نوازا گیا اور وہ فلاح و بہبود سے ہم کنار ہو گیا۔ چنانچہ سورہ یونس رکوع ۷ میں فرمایا گیا۔ یقیناً اللہ کے دوستوں پر نہ خوف ہے اور نہ وہ رنجیدہ ہوں گے جنہوں نے ایمان اختیار کیا اور تقویٰ کی روش پر گامزن ہوئے، ان کے لیے دنیا اور آخرت میں خوش خبری ہے۔ اللہ کی باتیں بدل نہیں سکتیں۔ یہی عظیم کامیابی ہے۔

جادوگر فلاح نہیں پاتے

انبیاء علیہم السلام کی دعوت حق اور سحر میں زمین و آسمان کا فرق ہے مگر عقل کے مارے دشمنان حق نے ہمیشہ پیام حق کو جادو اور پیغمبران حق کو جادوگر کہا ہے۔ حالانکہ کردار اور کیرکٹر اور سیرت و اخلاق میں علمبرداران حق اور جادوگروں میں کوئی نسبت ہی نہیں ہوتی اسی طرح مقصدیت میں مشرق و مغرب کا فرق ہوتا ہے۔ انبیاء کا مقصد ثریا سے بھی بلند تر ہوتا ہے مگر جادوگر پستی کے قعر مذلت میں پڑے ہوتے ہیں

داعیِ حق بے دھڑک اور بے غرض ہوتا ہے۔ ساحر، چاپلوس، خوشامدی ہوتا اور کمائی کی فکر میں رہتا ہے۔ اس قدر فرق وامتیاز کے باوجود دل کے اندھے ہمیشہ داعیانِ حق کو جادوگر اور ان کی دعوت کو جادو سے تعبیر کرتے رہے ہیں۔ اخلاق و کردار اور مقصدیت اور نیت میں، دونوں میں جب یہ زمین و آسمان کا فرق ہے تو ان کے انجام میں بھی اسی قدر فرق ہوگا۔ انبیاء علیہم السلام اور ان کے سچے پیرو فلاح و بہبود سے ہم کنار ہوں گے اور ساحرانِ باطل پرست ناکام و نامراد ہوں گے چنانچہ سورۂ یونس رکوع ۸ میں فرمایا "اور جادوگر فلاح نہیں پایا کرتے۔" اور سورۂ طٰہٰ رکوع ۳ میں فرمایا "اور جادوگر فلاح نہیں پاتا۔"

ظالم فلاح نہیں پاتے

اللہ تعالیٰ کے احکام کو توڑنا، اس کی اطاعت سے منہ موڑنا اور اس کی نافرمانی کرنا، اس سے بے وفائی اور غداری کرنا اور اس کی بندگی سے کترانا ظلم ہے۔ سب سے بڑا بھاری اور وزنی ظلم، اور ایسے ظالم کبھی فلاح نہیں پاسکتے فلاح وہی لوگ پاسکیں گے جو احکامِ خداوندی کے پابند ہوں۔ اس کے اطاعت شعار ہوں، وفادار اور فرماں بردار ہوں اور اس کی بندگی کی راہ پر گامزن ہوں۔ چنانچہ سورۂ یوسف رکوع ۳ میں فرمایا "اور ظالم فلاح نہیں پایا کرتے۔"

شرارِ بولہبی، چراغِ مصطفوی سے ہمیشہ ستیزہ کار رہا ہے اور رہے گا۔ چند نوجوان جو اپنے رب پر ایمان لائے تھے اور ان کے رب نے ان کو مزید رہنمائی سے نوازا تھا، ان کے دلوں کو مضبوط اور مستحکم کیا تھا چنانچہ وہ عزیمت کا پہاڑ بن کر وقت کے جبار ظالم اور ستمگر بادشاہ "دقیانوس" کے سامنے آئے اور ربِ السموات والارض کی خداوندی تسلیم کرنے کی دعوت دی تو اس نے اور اس کی قوم نے ان نوجوانوں کا جینا دوبھر کر دیا۔ آخر کار ان نوجوانوں نے ایک غار میں پناہ لی سکون ملا تو آنکھ لگ گئی اور برسہا برس بلکہ صدیوں تک سوتے رہے ایک بار آنکھ کھلتی ہے تو آپس میں باتیں کرتے ہیں کہ اگر ان ظالموں کو تمہاری خبر لگ گئی اور وہ تم پر غالب آگئے تو یا تو تمہیں سنگسار کر ڈالیں گے یا پھر بجبر اپنی ملت میں شامل کر لیں گے اور حق پا کر کفر میں واپس جانا ہمیشہ ہمیش کی تباہی و بربادی مول لینا ہے اور فلاح و بہبود سے ہمیشہ کے لیے ہاتھ دھو لینا ہے۔ غرض کہ فلاح و بہبود، پیرویِ حق اور ... کے ساتھ وابستہ ہے اور باطل پرست کبھی بھی فلاح یاب نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ سورۂ کہف

رکوع ۴ میں ہے اور یاد رکھیں کہ تم لوگ اچھی امت ہیں اور [illegible]

سورۃ المومنون میں

سورۃ المومنون کی ابتدائی آیات میں ذیل کی صفات پر فلاح کی خوشخبری سنائی گئی ہے کہ جو لوگ مستقل طور پر ان صفات کے مالک ہوں وہ فلاح یاب ہوئے۔

۱۔ وہ لوگ جو کامل اور سچے مومن ہوں۔

۲۔ وہ لوگ جو اپنی نمازوں میں خشوع اور خضوع اختیار کرنے والے ہوں۔

۳۔ وہ جو لغو سے اعراض کرنے والے ہوں۔

۴۔ جو زکوٰۃ ادا کرنے والے ہوں۔

۵۔ وہ لوگ جو پاک باز اور پاک دامن ہوں۔

۶۔ جو امانت داری اور پابندیٔ عہد کی صفات سے مزین ہوں۔

۷۔ جو نمازوں کی حفاظت کرنے والے ہوں۔

ایسے لوگ جنت الفردوس کے وارث ہوں گے اور یہی فلاح و کامرانی کی معراج ہے

سورۂ معارج میں مزید چند صفات بیان فرمائیں۔

۸۔ وہ لوگ جو یوم الدین کی تصدیق کرتے ہوں اور اپنے رب کے عذاب سے ہر آن ترساں لرزاں رہتے ہوں۔

۹۔ وہ لوگ جو اپنی شہادتوں پر قائم رہنے والے ہوں۔

ایسے ہی لوگ جنتوں میں عزت و تکریم کے مدارج پر فائز ہوں گے۔

انسان کی کامیابی و ناکامی کا دارومدار اس کے فکر و عمل پر ہے۔ اگر فکر صحیح اور عمل صالح کے وزن سے آخرت کی ترازو کے پلڑے جھک گئے تو ایسا شخص فلاح یاب ہوگا اور اگر وزن اعمال کی ترازو میں غلط افکار و خیالات اور باطل عقائد و نظریات اور بے عملی و بدعملی کے علاوہ نیکی معدوم و مغلوب ہوگی تو اس کے پلڑے ہلکے اور بے وزن ہوں گے اور بے وزن انسان ہمیشہ ناکام و نامرادی رہے گا۔ چنانچہ سورۂ المومنون رکوع ۶ میں فرمایا۔ پس جن لوگوں کی میزانیں بھاری اور وزنی ہوں گی پس وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں اور جن لوگوں کی میزانیں بے وزن اور ہلکی ہوں گی۔ پس وہی

لوگ ہیں جنھوں نے اپنے کو خسارے میں مبتلا کیا۔ یہ ہمیشہ ہمیش جہنم میں رہنے والے ہیں۔
اللہ کے دین پر چلنے اور اس کو قائم کرنے کی راہ میں ہزار مصائب اور مشکلات سے دوچار ہونا
پڑتا ہے۔ طرح طرح کے نقصانات انگیز کرنا پڑتے ہیں اس راہ پر چلنے والوں کا مذاق اڑایا جاتا
ہے۔ ان کے پیچھے تالیاں پیٹی جاتی ہیں، ان پر فقرے چست کیے جاتے ہیں، انہیں طعنے دیے جاتے
ہیں غرض کہ ان کا ناطقہ بند کر دیا جاتا ہے۔ انہیں اپنے نفس، باپ دادا، قوم اور اقتدار وقت
سب سے بیک وقت نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ مومن فرد اور گروہ کے واسطے پورا باطل ماحول بھڑوں
کے چھتے کی حیثیت رکھتا ہے۔ باطل کا غلبہ و تسلط مومنین کے واسطے بھوکے بھیڑیوں کی مانند چاروں
طرف سے حملہ آور ہو کر دبوچ لینا چاہتا ہے اور نوچ کر کھا لینے کی فکر میں رہتا ہے۔ ایسے حالات
میں نہ صرف غیر بلکہ اپنے بھی ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ اس صورت حال میں مومن صبر و استقامت اور
توکل علی اللہ سے کام لیتا ہے اور اللہ اسے فائز بالمرام کرتا ہے۔ چنانچہ سورہ المومنون رکوع ۶
میں ہے: "میں نے آج ان کو ان کے صبر کی جزا سے نوازا کہ وہی فائز اور کامیاب و کامراں ہیں۔"
انسان اللہ کا پیدائشی غلام اور بندہ ہے۔ غلامی اور بندگی کی روش پر گامزن
سورۃ النور میں ہوتا اس کا مقصد تخلیق ہے۔ اللہ تعالیٰ کی پوجا پرستش اور اس کی
اطاعت و فرماں برداری کے دائرے سے باہر قدم رکھنا خود انسان کے اپنے لیے ناکامی و خسران مول
لینے اور اپنے پیر پر خود کلہاڑی مارنے کے مترادف ہے مگر اغوائے شیطانی، خواہشات نفس کی پیروی
اور بشری کمزوریوں کی وجہ سے انسان پر غفلتوں کے پردے پڑتے رہتے ہیں اور وہ بندگی رب کے
دائرے سے باہر قدم رکھتا رہتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی طرف بار بار رجوع ہونا اور بندگی کے دائرے میں پلٹ
آتے رہنا فلاح و بہبود سے ہم کنار ہونے کے لیے لازمی اور ضروری ہے، توبہ و استغفار پر دائمی عمل کے
بغیر آدمی فلاح و بہبود سے ہم کنار نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ سورہ نور رکوع ۴ میں فرمایا:۔
"اور توبہ کرو اللہ کی طرف سب کے سب اے ایمان والو شاید تم فلاح یاب ہو سکو۔"
فکر و عمل کے تمام زاویوں اور زندگی کے تمام گوشوں میں اللہ اور رسول کی اطاعت اور دل
کا خوف خدا و خشیت الٰہی سے معمور ہونا اور زندگی کے تمام لمحات اور جملہ شعبہ جات میں ہر قدم پر
احکام الٰہی کی بجا آوری اور نواہی باری تعالیٰ سے کامل پرہیز یہ تین امور آدمی کے فائز بالمرام ہونے

اور کامیاب و کامراں ہونے کے واسطے کافی ہیں۔ چنانچہ سورۂ نور رکوع ۷ میں فرمایا "جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں اور اللہ کی خشیت رکھیں اور اس کے تقوے کی روش اختیار کریں پس وہی لوگ کامیاب و کامراں ہونے والے ہیں۔ سورۂ احزاب رکوع ۹ میں فرمایا "اے ایمان والو اللہ کا تقوی اختیار کرو۔ اور بات ٹھیک ٹھیک کہو۔ اللہ تمہارے اعمال کو سدھار دے گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی پس وہ فوز عظیم حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

کامیابی و کامرانی کے لیے نہ صرف اصلاح نفس اور تزکیہ ذات ضروری ہے

سورۂ روم میں نہ صرف اصلاح معاشرہ اور اصلاح ریاست کے لیے جدوجہد اور سعی مسلسل ضروری ہے نہ صرف حقوق اللہ اور حقوق النفس کی ادائیگی ضروری ہے بلکہ حقوق العباد کی ادائیگی بھی ضروری اور لازمی ہے۔ اصلاح نفس اور حقوق اللہ کی ادائیگی کو فلاح و بہبود کے واسطے کافی خیال کرنا اور اصلاح معاشرہ اور اصلاح ریاست کے فرائض اور حقوق النفس اور حقوق العباد کی ذمہ داریوں کو ذمہ داری تسلیم نہ کرنا، درحقیقت ناقص تصور دین اور ناقص تصور بندگی کا شاخسانہ ہے بلکہ بندے کا اپنی حد سے بڑھ کر خدائی حدود میں قدم رکھنے کے مترادف ہے کیونکہ اپنی جانب سے دین اور اس کے تقاضوں میں ترمیم کرنا کار خداوندی ہے، کار بندگی نہیں حقوق النفس، حقوق اللہ اور حقوق العباد تینوں کی ادائیگی ضروری ہے اسی طرح تینوں کی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانا بھی از بس ضروری ہے حقوق النفس کی ذمہ داریوں میں اصلاح ذات، حقوق اللہ کی ذمہ داریوں میں اس کی عبادت اور حقوق العباد کی ذمہ داریوں میں ان کے افراد کی خبر گیری، معاشرے کی اصلاح اور ریاست کا باطل بنیادوں کے بجائے دین حق کی بنیادوں پر استوار کرنا سر فہرست آتا ہے۔ غرض کہ حقوق العباد کی ادائیگی بھی فلاح و بہبود کے لیے لازمی ہے چنانچہ سورۂ روم رکوع ۴ میں فرمایا "پس عطا کر عزیز قریب، مسکین اور مسافر کو اس کا حق، یہ ان لوگوں کے واسطے بہتر ہے جو اللہ کی خوشنودی چاہتے ہیں اور وہی لوگ فلاح سے ہم کنار ہونے والے ہیں۔

ایمان تسلیم و رضا کا نام ہے۔ اسلام، تسلیم و رضا کے فطری و عملی تقاضے پورے

سورۂ لقمان میں کرنا یعنی اطاعت و فرماں برداری کا نام ہے تقوی، تسلیم و رضا اور

اطاعت و فرماں برداری کا وہ اعلیٰ مقام ہے۔ جس میں آدمی خدا کے خوف و خشیت میں ڈوب کر اس کے احکام کی ہر آن پابندی اور بجا آوری میں منہمک رہتا اور اس کی نواہی سے ہر لمحہ پرہیز کی فکر کرتا ہے۔ وہ بندگی رب کی صراط مستقیم پر گامزن ہوتا ہے مگر اس طرح کہ دامن سمیٹے ہوئے کہ کہیں جھاڑیوں میں الجھ نہ جائیں، اور قدم سنبھالے ہوئے کہ کہیں ڈگمگا نہ جائیں۔ احسان کی منزل سب سے بلند اور آخری منزل ہے۔ خدا تعالیٰ کا فرماں بردار بندہ خدا کی محبت میں سرشار ہو کر رات دن اس کی بندگی کی روش پر نہ صرف گامزن ہوتا ہے بلکہ بندگیٔ رب کو رواج دینے اور اس کا راج قائم کرنے کی دھن میں لگا رہتا ہے۔ فلاح و بہبود کے لیے ایمان و اسلام اور تقویٰ کے علاوہ احسان کی روش اختیار کرنا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ سورۂ لقمٰن رکوع ا میں فرمایا " یہ کتاب حکیم کی آیات ہیں جو ہدایت و رحمت ہیں محسنین کے لیے۔ ایسے محسنین جو نماز قائم کرتے ہیں زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ یہی لوگ اپنے رب کی جانب سے ہدایت پر ہیں اور یہی فلاح پانے والے ہیں۔

سورۂ المومن میں حاملین عرش اور مقربین بارگاہ الٰہی فرشتے، اہل ایمان کے واسطے دعائیں کرتے ہیں اور یہ دعائیں وہ کیوں کرتے ہیں؟ اس لیے کہ اہل ایمان:۔

۱۔ ایمان رکھتے ہیں۔ ۲۔ توبہ کرتے ہیں۔ ۳۔ سبیل رب پر گامزن ہوتے ہیں۔

فرشتے اللہ سے کس چیز کی دعائیں کرتے ہیں؟

۱۔ بخشش اور مغفرت کی دعائیں۔ ۲۔ عذاب جہنم سے محفوظ رکھنے اور جنتوں میں داخل کرنے کی دعائیں۔ ۳۔ برائیوں اور گناہوں سے بچانے کی دعائیں۔

فرشتے نہ صرف اہل ایمان کے واسطے دعائیں کرتے ہیں بلکہ ان کے صالح والدین، صالح ازواج (شوہر کے لیے بیوی اور بیوی کے لیے شوہر زوج ہے) اور صالح اولاد کے لیے بھی جنتوں میں داخل کی دعائیں کرتے ہیں۔

یہ فرشتوں کا دعائیں کرنا، اہل ایمان کا مذکورہ صفات سے مزین ہونا اور ان کا سیئات سے محفوظ رہنا، محض اللہ کی مہربانی ہے اور جو اللہ کی رحمتوں سے نوازا گیا اسے فوز عظیم نصیب ہوا۔ وہ فلاح و بہبود سے ہمکنار ہو گیا۔ (المومن ع ۱)

سورۂ جاثیہ میں ان تمام بنیادی تعلیمات اور ان دیکھی حقیقتوں کو تسلیم کرنا جن کی تعلیم ا۔

دیتا ہے۔ فلاح و کامرانی کے واسطے ازبس ضروری ہے لیکن یہ تسلیم نہ صرف زبان سے ہو نہ صرف دل و دماغ کی گہرائیوں سے ہو بلکہ پوری زندگی بھی اس کی تائید میں ہونا ضروری ہے۔ تسلیم و رضا اور ایمان و اعتقاد کے علاوہ دوسری چیز جس پر فلاح کا دارومدار ہے وہ عمل صالح ہے اور یہ عمل صالح شخصی زندگی، عائلی زندگی اور زندگی کے معاشرتی اور معاشی اور سیاسی (وغیرہ) تمام پہلوؤں پر حاوی ہے۔ فرد کی زندگی کا کوئی گوشہ تدبیر منزل کا کوئی زاویہ اور شہری سیاست کا کوئی پہلو اس سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔ یہی ایمان و عمل ہے جس پر اللہ تعالےٰ اپنی رحمتوں سے نوازتا ہے اور یہی فلاح و کامرانی اور فوز مبین ہے۔ چنانچہ سورۂ جاثیہ رکوع ۴ میں فرمایا۔ "پس بہر حال جو لوگ ایمان لائے اور صالح اعمال اختیار کیے تو ان کا رب ان کو اپنی رحمت میں داخل فرمائے گا اور یہی کھلی کامیابی ہے"۔ سورۂ تغابن رکوع ۱ میں فرمایا "اور جو اللہ پر ایمان لایا اور صالح اعمال اختیار کیے، اللہ اس کی سیئات مٹا دے گا اور جنتوں میں داخل کرے گا جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہی فوزِ عظیم ہے۔ سورۂ البروج میں فرمایا۔ "یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور اعمال صالح اختیار کیے ان کے واسطے جنتیں ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔

انفاق فی سبیل اللہ

انفاق فی سبیل اللہ (اقامتِ دین کی جدوجہد اور جہاد فی سبیل اللہ میں خرچ کرنا) بھی اسی قدر ضروری ہے جس قدر اپنے جسم و جان کی توانائیاں دین کی اتباع اور اقامت میں تج دینا ضروری ہے۔ مومنین جو اپنے مال و جان کو رب کی بندگی کرنے اسے رواج دینے اور اسے فروغ دینے کے واسطے وقف کر دیتے ہیں۔ آخرت میں ان اللہ کے بندوں اور بندیوں کے آگے آگے ایک نور ہوگا جس کی روشنی میں وہ جنت میں داخل ہوں گے اور یہی عظیم کامیابی ہے۔ چنانچہ سورۂ نور رکوع ۲ میں فرمایا "آج کے دن تم کو خوش خبری ہے جنتوں کی جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں جن میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔ یہی فوز عظیم ہے۔

سورۂ مجادلہ میں

دنیا میں ہمیشہ سے عموماً دو پارٹیاں رہی ہیں اور رہیں گی۔ ایک حزب اللہ دوسری حزب الشیطان۔ شیطانی طاقتیں، پارٹیاں اور گروہ آپس میں خواہ زمین و آسمان کا فرق و امتیاز رکھتی ہوں۔ خواہ آپس میں ایک دوسرے کی دشمن اور خون کی پیاسی ہی کیوں نہ ہوں۔ آپس میں دست بہ گریباں کیوں نہ ہوں ان کے درمیان کشمکش اور جنگ و جدل

کیوں نہ برپا ہو، وہ بہرحال اہلِ حق کے مقابلے میں ایک ہیں۔ الکفر ملۃ واحدۃ۔ یہ حزب الشیطان
خواہ کتنی ہی پارٹیوں، جماعتوں اور قوموں میں بٹی ہوئی ہو، بہرحال اپنے عقائد و نظریات، اپنے اعمال و
طریق کار، اپنے مقصد اور نصب العین میں سب باطل پر متفق اور متحد ہوتی ہیں۔ باطل کے لیے جینا اور
مرنا اور باطل کو غالب کرنے، فروغ دینے اور پروان چڑھانے کی خاطر اپنا سب کچھ جھونک دینا ان
کے نزدیک نہ صرف کارِ ثواب ہوتا ہے بلکہ ان کی موت و حیات کی یہی غرض و غایت ہوتی ہے۔ اس
کے برخلاف حزب اللہ، اللہ کی پارٹی، اللہ کے وفاداروں اور اس کے فرماں برداروں پر مشتمل ہوتی ہے
جن کی موت و حیات سب اللہ رب العالمین کے واسطے وقف ہوتی ہے۔ بندگی رب کی روش،
ان کا طریق کار اور اللہ کے کلمہ کو بلند کرنا ان کا نصب العین ہوتا ہے چناں چہ سورۂ مجادلہ رکوع ۳ میں
پہلے حزب الشیطان کے بارے میں فرمایا: "شیطان نے ان پر قابو پالیا ہے پس ان کو اللہ کی یاد
(فکری و ذہنی، قلبی و لسانی اور عملی ذکر) سے غافل کر دیا ہے۔ یہی لوگ شیطان کی پارٹی ہیں۔ آگاہ
یقیناً شیطان کی پارٹی والے خائب و خاسر رہنے والے ہیں۔" پھر اسی رکوع میں حزب اللہ کے بارے
میں فرمایا: "اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھنے والی قوم کو تم نہ پاؤ گے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول سے
دشمنی رکھنے والوں سے محبت اور دوستی رکھتے ہوں، خواہ وہ (دشمنی رکھنے والے) ان کے باپ دادا
ان کے بیٹے پوتے، ان کے بھائی بند اور ان کے قوم قبیلے والے ہی کیوں نہ ہوں، یہی (اہل ایمان)
ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان راسخ کر دیا ہے اور غیب سے ان کی تائید کی ہے اور ان کو
جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اللہ ان سے راضی ہوا
وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ یہی لوگ اللہ کی پارٹی ہیں۔ آگاہ یقیناً اللہ کی پارٹی کے لوگ ہی فلاح
پانے والے ہیں۔"

سورۂ حشر میں

مومنین آپس میں بھائی بھائی ہوتے ہیں۔ ان کے بنیادی افکار و نظریات اور
اصول ایک ہوتے ہیں۔ ان کا طریق کار بنیادی طور پر ایک ہی ہوتا ہے وہ
نصب العین بھی ایک ہی رکھتے ہیں۔ دین کی پیروی، دین کی علم برداری اور اللہ کی خوشنودی ان کا منتہی
اور مشترک مقصد ہوتا ہے۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کے غم خوار ساتھی اور مخلص رفیق ہوتے ہیں
ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی و دل سوزی رکھتے ہیں۔ ایک دوسرے کے درد دکھ میں اس کا سا

دیتے ہیں۔ وہ فرائض اور ذمہ داریوں میں تو ایک دوسرے سے مسابقت کرتے ہیں مگر دنیاوی آرام وراحت اور مادی چیزوں میں ایثار پیشہ ہوتے ہیں۔ وہ تنگ نظر، تنگ دل اور تنگ ظرف نہیں ہوتے وہ وسیع النظر، کشادہ دل اور فراخ طبیعت ہوتے ہیں۔ فلاح و بہبود اور کامیابی و کامرانی ایسے ہی لوگوں کا حصہ ہے چنانچہ سورہ حشر رکوع ۱ اور سورہ تغابن رکوع ۲ میں فرمایا جو شخص شحِ نفس سے بچا لیا گیا تو یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

سورہ الصف میں

سورۃ الصف رکوع ۲ اہلِ ایمان کی رہنمائی ایک ایسی تجارت کی طرف کی گئی ہے جو ان کو عذاب الیم سے نجات دے گی۔ اس تجارت کے رخ دو ہیں۔ ایک اللہ اور رسول پر ایمان، معلومات، اعتماد اور یقین کا پہلو، دوسرے اللہ کے راستے میں جان و مال سے جہاد (اقامت دین کی جد و جہد، اعلاء کلمۃ اللہ۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور شہادت حق) یہ کوشش، جد و جہد، محنت و مشقت اور جاں فشانی کا پہلو ہے۔ اگر ایمان والوں نے یہ تجارت اختیار کر لی، تو منافع اللہ تعالےٰ عنایت فرمائے گا۔ اور گھاٹے سے محفوظ رکھے گا۔ گناہ معاف کر دے گا اور جنتوں میں پاکیزہ مکانات سے نوازے گا اور یہی فوز عظیم ہے۔

تزکیۂ نفس

نماز یاد الٰہی کا بہترین ذریعہ ہے اور یاد الٰہی وہ بنیاد ہے کہ جس کے بغیر آدمی کا تزکیۂ نفس اور تزکیۂ اعمال و اخلاق اور اس کی معاشرت و معیشت اور سیاست کا تزکیہ غرض کہ اس کے فکری و ذہنی اور اخلاقی اور انفرادی پہلو اور اس کے حیات اجتماعی کے تمام پہلوؤں کا تزکیہ اگر ہو سکتا ہے تو یاد الٰہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے اور جس کا تزکیہ ہو گیا اور جس نے اپنی حیات کو سنوار لیا اس نے فلاح پالی اور وہ کامیاب و کامراں ہو گیا چنانچہ سورۂ اعلیٰ میں فرمایا: "بے شک بھلا ہوا اس کا جو سنور گیا اور جس نے یاد کیا نام اپنے رب کا پھر نماز پڑھی لیکن اصلاح ذات اور تزکیۂ نفس پر آگے کے تمام تزکیے موقوف ہیں۔ چنانچہ سورۂ الشمس میں فرمایا: "یقیناً فلاح پالی جس نے اپنے نفس کو سنوار لیا۔

قرآنی تعلیمات

قسط (۴)

(مولانا محمد یوسف اصلاحی)

نکاح میں مہر فرض ہے

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً (النساء ۲۴)

عورتوں سے ازدواجی زندگی کا لطف اٹھانے کے بدلے ان کے مہر بطور فرض کے ادا کرو۔

مہر نکاح کے ارکان میں سے ہے

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَا اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ

آزاد مسلمان عورتیں بھی تمہارے لیے حلال ہیں اور اہل کتاب آزاد عورتیں بھی تمہارے لیے حلال ہیں بشرطیکہ ان کے مہر ادا کر کے ان سے نکاح کرو۔

مہر خوشی خوشی ادا کرو

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً

اور عورتوں کے مہر خوشی خوشی (ان کا حق سمجھتے ہوئے) ادا کرو۔

باندی کو بھی مہر دو

فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (النساء ۲۵)

پس باندیوں سے ان کے سرپرستوں کی اجازت سے نکاح کرو۔ اور معروف دستور کے مطابق ان کے مہر ادا کرو۔

باندی کا مہر حرہ سے کم ہے

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ

اور تم میں سے جو شخص اتنی وسعت نہ رکھتا ہو کہ خاندانی مسلمان آزاد عورتوں سے نکاح کر سکے تو وہ ان مسلمان باندیوں ہی سے نکاح کرے جو

[illegible]

الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ (النساء۔ ۲۵) — تم مسلمانوں کے قبضے میں ہوں۔

دیا ہوا مہر واپس نہ لو

وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا ؕ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ۝ وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۝ (النساء۔ ۲۰، ۲۱)

اور اگر تم ایک عورت چھوڑ کر دوسری عورت لے آنے کا ارادہ ہی کر لو۔ اور پہلی کو (چاہے) ڈھیر سا مال ہی کیوں نہ دیا ہو، اس میں سے کچھ واپس نہ لینا۔ کیا تم ناحق کھلم کھلا ظلم کر کے واپس لیگے۔ اور تم یہ مال کس منہ سے واپس لوگے۔ جب کہ تم اپنی بیویوں سے لطف اٹھا چکے ہو اور وہ تم سے پختہ عہد بھی لے چکی ہیں۔

نکاح ایک پختہ عہد ہے ایک عورت یہ اطمینان کر کے ہی خود کو ایک مرد کے حوالے کرتی ہے کہ دونوں زندگی بھر اس پختہ عہد کو نباہنے کی کوشش کریں گے۔ پھر اگر ازدواجی زندگی کا لطف اٹھانے کے بعد کوئی مرد اپنی خواہش سے خود ہی اس عہد کو توڑنا چاہے تو اسے معاہدے کے وقت پیش کردہ مال کے واپس لینے کا کیا حق ہے اور کس منہ سے اس کی واپسی کا مطالبہ کر سکتا ہے۔

غیر مدخولہ کا مہر نصف ہے

وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ (البقرہ۔ ۲۳۷)

اور اگر تم نے عورت کو ہاتھ لگانے سے پہلے ہی طلاق دے دی لیکن مہر مقرر کیا جا چکا ہے تو اس صورت میں نصف مہر دینا ہوگا۔

مہر کی ادائگی میں فیاضی سے کام لو

اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ؕ وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ؕ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (البقرہ:۔ ۲۳۷)

(غیر مدخولہ[1] کا مہر تو نصف ہے) ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ مرد جس کے اختیار میں عقد نکاح ہے فیاضی سے کام لے (اور پورا مہر دے دے) اور تم فیاضی سے کام لو تو یہ تقویٰ سے زیادہ لگتی بات ہے۔ آپس کے معاملات میں فیاضی کو نہ بھولو۔ تمہارے اعمال کو اللہ دیکھ رہا ہے۔

اجتماعی زندگی میں قانونی حق کی بھی بڑی اہمیت ہے، لیکن اجتماعی زندگی کی خوش گواری اس

[1] جس عورت سے مقاربت نہ کی ہو اسے غیر مدخولہ کہتے ہیں۔

یہ نہیں ہے کہ ہر شخص بس اپنے قانونی حق پر ہی اڑا رہے، بلکہ انسانی تعلقات اور معاشرتی زندگی کی بہتری اور خوش گواری اس میں ہے کہ لوگ باہم فیاضانہ برتاؤ کریں۔

مہر کی معافی عورت کے اختیار میں ہے

إِلَّآ أَنْ يَّعْفُوْنَ (البقرہ-۲۳۷)

مگر یہ کہ عورتیں نرمی برتیں (اور مہر نہ لیں تو معاف ہے۔)

مہر چونکہ عورت کا حق ہے اس لیے یہ اسی وقت معاف ہو سکتا ہے جب عورت خود معاف کردے۔

معاف کیا ہوا مہر مزے سے استعمال کرو

فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا (النساء)

اور اگر عورتیں اپنی خوشی سے کچھ مہر چھوڑ دیں تو اسے تم مزے سے (بے کھٹکے) کھا سکتے ہو۔

عورت کو ہر وقت یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنا مہر شوہر کو معاف کردے۔ چاہے کچھ حصہ معاف کرے یا سب کا سب۔ عورت کی معافی کے بعد یہ مال شوہر کا ہے وہ جس طرح چاہے اس کو بے کھٹکے اپنے صرف میں لا سکتا ہے۔

مقررہ مہر باہمی رضامندی سے کم و بیش ہو سکتا ہے

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ (النساء)

اور اگر آپس کی رضامندی سے مقررہ مہر میں کمی بیشی کر لو تو کوئی حرج نہیں ہے۔

اگر عورت معاف کردہ مہر کا مطالبہ کرے تو دینا ہوگا

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ۚ فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ (النساء)

اور عورتوں کے مہر خوش دلی سے ادا کردو۔ البتہ اگر وہ اپنی خوشی سے مہر میں سے کچھ معاف کردیں تو اسے مزے سے کھاؤ۔

مہر کی معافی کا تمام تر اختیار عورت ہی کو حاصل ہے اس لیے اگر وہ معاف کردے تو معاف ہو جاتا ہے لیکن قرآن کے یہ الفاظ "فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ منہ نفسا" اگر عورتیں دل کی خوشی سے کچھ حصہ معاف کریں۔" بتلاتے ہیں کہ اس میں عورت کی خوشنودی کا پورا پورا لحاظ کرنا ہوگا۔ گھر کی فضا کو ایسا نہ بنایا جائے کہ کسی دباؤ اور لالچ سے مجبور ہو کر عورت مہر معاف کردے اور در حقیقت وہ

مہر چھوڑنے کے لیے تیار نہ ہو۔ اسی لیے حضرت عمر اور قاضی شریح کا فیصلہ یہ ہے کہ اگر کسی عورت نے اپنے شوہر کو مہر کا کچھ حصہ یا پورا مہر معاف کر دیا ہو اور بعد میں پھر وہ اس کا مطالبہ کرے تو شوہر کو مہر ادا کرنا ہوگا۔ اور شوہر اس کے ادا کرنے پر مجبور کیا جائے گا۔ اس کا یہ مطالبہ ظاہر کرتا ہے کہ اس نے خوش دلی سے معاف نہیں کیا تھا بلکہ کسی بے جا دباؤ یا کسی اور وجہ سے معاف کرنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

اگر مہر مقرر نہ کیا ہو تو کچھ دے کر رخصت کرو

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ	اور اگر تم عورتوں کو ان کے پاس جانے
إِنْ طَلَّقْتُمُ	اور ان کا مہر مقرر کرنے سے پہلے طلاق دے دو تو
النِّسَاءَ مَا لَمْ	تم پر کوئی گناہ نہیں۔ ہاں اس صورت میں
تَمَسُّوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً وَّ	ان کو کچھ نہ کچھ دے ضرور دو۔ خوش حال
مَتِّعُوهُنَّ عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ وَ	آدمی اپنے مقدور کے مطابق اور غریب آدمی
عَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ	اپنی حیثیت کے مطابق معروف طریقے پر دے۔

یہ حکم اس عورت کا ہے جس کو شوہر نے ہاتھ نہ لگایا ہو رہی وہ عورت جس سے شوہر نے تعلق زن و شو قائم کر لیا ہو تو ایسی عورت کو اس کے خاندان کی دوسری اس جیسی لڑکیوں کے برابر مہر دیا جائے گا۔

عورت کو تنگ کر کے مہر میں حق تلفی نہ کرو

وَلَا تَعْضُلُوهُنَّ	اور انہیں تنگ کر کے دیے ہوئے مہر کا کچھ حصہ اڑانے کی کوشش
لِتَذْهَبُوا بِبَعْضِ مَا آتَيْتُمُوهُنَّ (النساء ۱۹)	نہ کرو۔

زوجین کے خوش گوار تعلقات

قرآن حکیم نے زوجین کے تعلقات کو اجتماعی زندگی کے لیے بنیادی اہمیت دی ہے اور انہیں خوش گوار رکھنے کی پُر زور تاکید کی ہے اور یہ ہدایت دی ہے کہ ان تعلقات کو رحمت و مودت عدل و انصاف اور ایثار و فیاضی کے ساتھ مستحکم رکھنے اور خوش گوار بنانے کی کوشش کی جائے یہ کوشش پیہم جاری رہنی چاہیے اور آخر دم تک اس میں کوتاہی نہ ہونی چاہیے۔ کیونکہ انہی تعلقات کی خوش گواری پر معاشرے کے استحکام، سدھار، پاکیزگی اور ترقی کا دار و مدار ہے۔

عائلی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے قرآن حکیم نے جو احکام دیے ہیں ان سے زیادہ عادلانہ اور مبنی برحقیقت احکام کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ان قوانین و احکام کا مصنف وہ علیم و خبیر خدا ہے جو عورت و مرد دونوں کی طبیعت، فطرت، صلاحیت اور کمزوریوں کے بارے میں محض قیاس و انداز سے کام لے کر کوئی حکم نہیں دیتا ہے بلکہ اس کے ہر قانون اور ہر حکم کی بنیاد وسیع ترین حقیقی علم پر ہے۔ دونوں صنفوں کے حقوق کا تحفظ اور دونوں کے درمیان انصاف انہی احکام کی پیروی میں ممکن ہے۔

زوجین کے حقوق مساوی ہیں

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ (البقرہ: ۲۲۸) — عورتوں کے لیے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے حقوق ان پر ہیں۔

یعنی خدا تعالیٰ نے مرد اور عورت دونوں پر اپنی اپنی حیثیت اور صلاحیت کے مطابق حقوق عائد کیے ہیں، ــــ اگر عورت کو اطاعت و فرماں برداری کا حکم دیا ہے تو مرد کو مہربانی اور عفو و درگذر سے کام لینے اور عورت کی ضروریات فراہم کرنے کا ذمہ دار قرار دیا ہے، باہمی حقوق کے لحاظ سے دونوں کی حیثیت یکساں ہے اور دونوں ان کو ادا کرنے کے یکساں ذمہ دار ہیں، حقوق کی نوعیت ضرور جدا جدا ہے لیکن اس کا تعلق ان کی فطری صلاحیت اور طبعی رجحان ہے۔

مرد کو کچھ برتری ہے

وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (البقرہ ۲۲۸) — اور مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ فضیلت ہے۔

جہاں تک زوجین کے باہمی حقوق کا تعلق ہے قرآن حکیم نے دونوں کے درمیان کسی قسم کا امتیاز نہیں برتا ہے، دونوں کے حقوق مساوی رکھے ہیں اور خاندان کے ادارے میں دونوں کے وجود کو یکساں حیثیت اور اہمیت دی ہے، البتہ ہر نظم کو درست رکھنے کے لیے یہ بات ضروری ہے کہ کوئی سردھرا اور آخری ذمہ دار ہو اور اس کی رائے مشورہ، منشا اور صواب دید کے مطابق وہ نظم قائم رہے اور متعلقہ نتائج پیدا کرے اس لیے عائلی زندگی میں قرآن نے مرد کو کچھ برتری دی، اور اسے آخری ذمہ دار قرار دیا ہے۔

خانگی زندگی میں مرد کی حیثیت

اَلرِّجَالُ — مرد عورتوں کے سر دھرے اور

قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ (النساء ۳۴) نگراں ہیں۔

مرد کو قرآن نے قوام قرار دیا ہے، جس کا ترجمہ سرپرست اور نگراں کیا گیا ہے۔ دراصل قوام اس شخص کو کہتے ہیں، جو کچھ افراد یا ادارے یا کسی نظم کو ٹھیک ٹھیک چلانے اور درست رکھنے کا ذمہ دار ہوتا ہے، خانگی زندگی بھی ایک منظم ادارہ ہے اور اس کا بھی ایک اہم نظم ہے، جس کے استحکام پر پورے معاشرے کی تعمیر موقوف ہے، اس نظم کو چلانے اور درست رکھنے کی ذمہ داری مرد پر ہوتی ہے، وہی گھر کا سردھرا اور نگراں ہوتا ہے۔ اسی معنی میں اس کو قوام کہا گیا ہے۔

مرد کی برتری کی وجوہ

بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ (النساء: ۳۴)

اس لیے بھی کہ اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر فضیلت بخشی ہے اور اس لیے بھی کہ مرد اپنا (محنت سے کمایا ہوا) مال عورتوں پر خرچ کرتے ہیں

خانگی زندگی میں مرد کو عورت پر جو فضیلت بخشی گئی ہے اور اس کو قوام اور نگراں قرار دیا گیا ہے، اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک وجہ فطری ہے اور ایک اخلاقی۔

۱۔ چونکہ عائلی نظم کو درست رکھنے اور نتیجہ خیز بنانے کی آخری ذمہ داری طبعی قوتوں اور فطری صلاحیتوں کے لحاظ سے مرد پر ہے اس لیے اس کو یہ فضیلت بخشی گئی ہے کہ خانگی معاملات میں اس کی رائے سب پر غالب ہو اور گھر کے تمام کام اس کی منشاء، حکم اور مشورے کے تحت انجام پائیں اور صنف مقابل اس کی برتری کو تسلیم کرکے اس کے مشورے کے تحت سرگرم رہ کر اس کے ساتھ تعاون کرے۔

۲۔ زندگی کا دار و مدار مال پر ہے۔ اسی وجہ سے قرآن حکیم نے مال کو قیام کے لفظ تعبیر کیا ہے۔ قیام یا قوام کسی چیز کی بنیاد یا اساس کو کہتے ہیں۔ زندگی کو یہ بنیاد اور اساس فراہم کرنے والا چونکہ مرد ہے، وہی محنت اور کوشش سے مال کماتا ہے اور پھر خوشی خوشی گھر والوں پر خرچ کرتا ہے۔ اس لیے بھی اس کو یہ فضیلت بخشی گئی ہے اور عورت کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ اطاعت و فرماں برداری کرتے ہوئے عائلی زندگی کو کامیاب اور مفید بنانے کی کوشش کریں۔

مگر مرد کی یہ فضیلت صرف گھریلو معاملات کو درست رکھنے اور خانگی زندگی کو نتیجہ بخش بنانے

کے لیے ہے اور اسی دنیا کی حد تک ہے۔ رہا آخرت میں فضیلت کا مسئلہ تو وہاں مرد کو محض اس بنا پر ہرگز کوئی فضیلت نہ ہوگی کہ اس کو گھر کا قوام بنایا گیا تھا۔ وہاں فضیلت کا تمام تر انحصار اس بات پر ہوگا کہ کس نے اپنے فرائض متعلقہ خدا کے منشا کے مطابق پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ انجام دیے اور محض خدا کی خوشنودی کو پیش نظر رکھ کر انسانیت کا ثبوت دیا۔

شوہر کے فرائض

خانگی زندگی کے نظم کو درست رکھنے اور مستحکم بنانے کے لیے مرد اور عورت دونوں ہی کے کچھ منصبی فرائض ہیں اور گھریلو زندگی اسی وقت خوش گوار اور نمونۂ رحمت بن سکتی ہے جب شوہر اور بیوی دونوں اپنی اپنی ذمہ داریوں کا حقیقی احساس اور شعور پیدا کریں اور اپنے اپنے فطری دائرے میں رہتے ہوئے پورے خلوص، دل سوزی اور مستعدی سے اپنی اپنی ذمہ داریاں انجام دیں، اور اگر کسی ایک نے بھی اپنے فرائض میں کوتاہی دکھائی تو خاندانی نظم بکھر جائے گا اور گھریلو زندگی انتشار اور کشاکش کی نذر ہو جائے گی پہلے ہم شوہر کے فرائض بیان کرتے ہیں۔

عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کرو

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ (النساء-۱۹)

اور عورتوں کے ساتھ نیک سلوک کا زندگی گذارو۔

یہ بڑا جامع جملہ ہے، نیک سلوک کے اس حکم میں وہ تمام ہی باتیں شامل ہیں جو خانگی زندگی کو خوش گوار اور نمونۂ جنت بنانے کے لیے ضروری ہیں۔

باہمی مصالحت کی کوشش کرو

اَلصُّلْحُ خَيْرٌ ۗ (النساء ۱۲۸)

باہمی مصالحت بہرحال خیر ہی خیر ہے۔

زوجین کے عمر بھر کی اس رفاقت میں بار بار ایسے مواقع آتے ہیں کہ دونوں کو ایک دوسرے سے شکایتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ان شکایتوں کا ایک نتیجہ تو یہ ہو سکتا ہے کہ دونوں میں علیحدگی ہو جائے اور خدا کے نام پر جڑا ہوا یہ مبارک رشتہ ٹوٹ جائے اور ایک صورت یہ ہے کہ دونوں اپنی اپنی طبیعتوں پر قابو پائیں، اپنے قانونی حق پر اڑنے اور اپنی بات کی پچ کرنے کے بجائے فیاضی، درگذر

یثار سے کام لیں اور نکاح کے پختہ عہد کو زندگی بھر نباہنے کی کوشش کریں

تحمل اور خوش گمانی سے کام لو۔

فَاِنْ کَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا (النساء - ۱۹)

پھر اگر وہ تمہیں (کسی وجہ سے) ناپسند ہوں تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند نہ ہو مگر اللہ نے اس میں (تمہارے لیے) بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو۔

اگر عورت کی بعض عادتیں ناپسند ہوں یا وہ خوبصورت نہ ہو، یا اس میں کوئی اور کمزوری اور نقص ہو تو مرد کو چاہیے کہ صبر و تحمل سے کام لے، درگذر کی روش اختیار کرے، اور بہر حال عورت کے ساتھ نباہ کرنے کی کوشش کرے۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اس عورت کے واسطے سے مرد کو کچھ ایسی بھلائیاں پہنچانے کا ارادہ کر لیا ہو جن تک مرد کی نگاہ نہ پہنچ سک رہی۔ مثلاً اس عورت کی ذات سے کوئی ایسی روحِ سعید وجود میں آنے والی ہو جس کی بھلائیوں سے ایک دنیا فائدہ اٹھائے اور اس کا اجر اس مرد کو بھی ہمیشہ ہمیشہ ملتا رہے، یا یہ عورت مرد کی اصلاحِ حال کا ذریعہ بنے اور اسے جنت سے قریب کرنے میں مددگار ثابت ہو، یا اس عورت کی قسمت سے دنیا میں مرد کو خوش حالی نصیب ہو، بہر حال کسی ظاہری عیب سے برداشتہ خاطر ہو کر ازدواجی تعلق کو ہرگز برباد نہ کیا جائے۔ بلکہ اس کو خوش گواری کے ساتھ قائم رکھنے کے لیے صبر و تحمل اور درگذر سے کام لیا جائے

عفو و کرم کی روش رکھو

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (التغابن ۱۴)

مومنو! تمہاری بعض بیویاں اور اولاد تمہارے دشمن ہیں سو ان سے بچتے رہو، اور اگر تم عفو و کرم، درگزر اور چشم پوشی سے کام لو تو یقین رکھو کہ اللہ تعالےٰ بہت ہی بڑا بخشنے والا اور بہت ہی مہربان ہے۔

بعض اوقات دینی تقاضوں کو پورا کرنے اور دین کی راہ میں آگے بڑھنے میں بعض بیویاں زبردست رکاوٹ بنتی ہیں اور آدمی کے لیے اپنی آخرت بچائے جانا انتہائی دشوار ہو جاتا ہے اور بعض اوقات آدمی خود بھی اپنی کمزوری کی بنا پر ان کی بے جا محبت میں پھنس کر اور ان کی ہر جائز اور ناجائز خواہش کی تکمیل میں اپنے دین و ایمان اور آخرت کے تقاضوں سے بہت دور جا پڑتا ہے

انھی وجوہ سے خدا نے بعض بیویوں کو دشمن قرار دیا ہے، لیکن ایسا نہیں ہے کہ سب ہی بیویاں اور بچے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ایسی بیویاں بھی تو ہوتی ہیں جو شوہروں کے دین کی حفاظت کرتی ہیں اور نیک کاموں میں ان کا ہاتھ بٹاتی ہیں۔

مرد مومن کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ بیوی بچوں سے بیزار ہو اور جھلا کر ان سے رحم و کرم کی نگاہیں پھیرے اور ان سے یکسر الگ ہو رہنے کی سوچنے لگے۔ صحیح روش یہ ہے کہ آدمی ان کی کوتاہیوں، نادانیوں اور سرکشیوں سے چشم پوشی کرے، صبر سے ان کو برداشت کرے، درگذر سے کام لے اور صبر و سکون اور سوز و رحمت کے ساتھ انھیں راہ راست پر لانے کی کوشش کرے، مرد مومن کی یہ روش خدا کی رحمت کو کھینچتی ہے اور اس کی بخشش و کرم کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔

تنقید و تبصرہ

ماہنامہ نظام کا تصوف نمبر

صفحات ۱۶۰، قیمت دو روپیہ، ملنے کا پتہ، دفتر ماہنامہ نظام شیخ الاسلام منزل، کرنیل گنج، کانپور۔

ماہنامہ نظام، کانپور، جناب مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی اور جناب قمرالدین مظاہری کی ادارت میں نکل رہا ہے۔ اس نے اگست، ستمبر، اکتوبر کا مشترک شمارہ "تصوف نمبر" کے نام سے شائع کیا ہے، اس میں مولانا گنگوہی، مجدد الف ثانی، مولانا تھانوی، مولانا مدنی، مولانا ابوالکلام، حضرت پھولپوری اور خواجہ محمد معصوم سرہندی رحمہم اللہ کے افادات بھی پیش کیے گئے ہیں اور وقت کے مشاہیر میں شیخ الحدیث مولانا زکریا، مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا محمد اسحاق سندیلوی وغیرہم کے مقالات بھی دیے گئے ہیں۔ مولانا گنگوہی اور مولانا عاشق الٰہی میرٹھی کے چند مکاتیب بھی اس کی زینت ہیں اور شریعت و طریقت کے موضوع سے متعلق شعراء نے بھی طبع آزمائی کی ہے۔ بحیثیت مجموعی تصوف سے متعلق ایک اچھا مجموعہ مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس نمبر کی تمام نگارشات پر تنقید و تبصرہ کی نہ گنجائش ہے اور نہ اس کی کوئی خاص ضرورت ہے۔ جس تصوف سے ابن تیمیہ، ابن قیم، ابوالاعلیٰ مودودی اور دوسرے علماء نے اتفاق کیا ہے اس پر کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے۔ اس لیے کہ وہ تمام مسلمانوں کے نزدیک مسلم ہے اور جس تصوف سے ابن تیمیہ وغیرہ نے اختلاف کیا ہے اس کی نشان دہی کرنا اور اس پر اظہار خیال کوئی ایسا کام نہیں جو اس مختصر تبصرے میں کیا جا سکے۔ اس نمبر کی جن باتوں نے تبصرہ نگار کے ذہن میں الجھن پیدا کی ہے ان میں سے چند کا ذکر اس لیے کیا جا رہا ہے کہ اس نمبر کے مرتبین ان پر غور کریں۔

پہلی بات یہ کہ تصوف کیا ہے؟ کا جواب اس نمبر میں متضاد نہ ہونا چاہیے تھا۔ کم سے کم اتنی بات تو مرتبین کو ضرور ملحوظ رکھنی چاہیے تھی اس لیے کہ اسی سوال پر تمام مباحث کا دار و مدار ہے۔ اس

سوال کا جواب حضرت مولانا گنگوہی نے دیا ہے جو اسی سوال کے تحت اس نمبر میں درج ہے اور پھر اس سوال کا جواب مولانا تھانوی نے بھی دیا ہے اور وہ بھی اس نمبر میں موجود ہے اور پھر اسی سوال کا جواب مولانا اسحاق سندیلوی نے بھی دیا ہے اور وہ بھی ان کے طویل و عریض مقالے میں موجود ہے جو اسی نمبر کی زینت ہے۔ حضرت گنگوہی، تھانوی اور جناب سندیلوی کے جوابات میں کھلا ہوا تضاد پایا جا رہا ہے۔ ان دونوں حضرات کے نزدیک تصوف ان اعمال باطنہ کا نام ہے جو خود بذاتہا مقصود ہیں اور مولانا سندیلوی کے نزدیک تصوف ان تدابیر کا نام ہے جو مقصود نہیں بلکہ مقصود کا ذریعہ ہیں۔ اب پڑھنے والے کو الجھن ہوتی ہے کہ ان دو جوابوں میں کس جواب کو صحیح مانے۔ مقصود اور وسیلۂ مقصود کا فرق ہر صاحب علم جانتا ہے۔ اس کے علاوہ مولانا سندیلوی نے یہ بات بھی محسوس نہیں فرمائی ہے کہ وہ پہلے کیا لکھ آئے ہیں اور بعد کو کیا لکھ رہے ہیں، مقالے کی ابتدا میں انھوں نے لکھا ہے کہ "خیر القرون میں اگرچہ اصطلاح تصوف موجود نہ تھی مگر خود تصوف موجود تھا" اور اس کے بعد آگے تحقیق فرمائی ہے کہ یہ تدابیر جن کو وہ 'تصوف' کہتے ہیں خیر القرون میں موجود نہ تھیں، کیونکہ ان قرون میں ان تدابیر کی ضرورت ہی نہ تھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت تو بڑی چیز ہے آپ کی صرف ایک نظر سحر اثر سارے مرحلے طے کرا دیتی تھی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی صحبتیں بھی اس قدر قوی التاثیر تھیں کہ تزکیۂ نفس کے لیے کسی مصنوعی تدبیر کی ضرورت نہ تھی، اب قاری حیران ہوتا ہے کہ مولانا کی کس بات کو تسلیم کرے۔ ظاہر ہے کہ خیر القرون میں جو چیز موجود تھی وہ کچھ اور ہوگی اور جو چیز موجود نہ تھی وہ کچھ اور ہوگی۔ موجود اور نا موجود دونوں ہی کو تصوف کہنا کس طرح صحیح ہوگا۔ تبصرہ نگار کے نزدیک اس تضاد بیانی نے تصوف نمبر کی افادیت کو بہت مجروح کیا ہے کیونکہ یہ بات ہی الجھ کر رہ گئی کہ تصوف کیا ہے؟ دوسری بات جس نے ذہن میں الجھن پیدا کی وہ یہ ہے کہ بعض وہ باتیں جو اکابر و ائمہ صوفیہ کی کتابوں میں بکثرت ملتی ہیں، اس نمبر میں ان باتوں کی تردید کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر ذات الٰہی کو منزل مقصود اور حاصل سیر و سلوک ان لوگوں نے بھی قرار دیا ہے جن کی ولایت اور اس فن میں ان کی امامت مسلم ہے۔ یہاں تک کہ یہ بات حضرت مجدد اور خواجہ محمد معصوم کے مکتوبات میں بھی پورے زور اور تاکید کے ساتھ موجود ہے یہاں تک کہ حضرت مجدد کے یہاں تو یہ چیز نظریہ قیومیت تک ترقی کر گئی ہے لیکن مولانا سندیلوی فرماتے ہیں کہ ذات الٰہی کو منزل مقصود بنانا ہندو یوگ

کی چیز ہے۔ اسلامی تصوف کی چیز نہیں ہے۔ اگر یہی بات ہم جیسے لوگ لکھ دیتے تو معلوم نہیں کن الزامات کے ہدف بنتے۔ اس تبصرے میں عبارتیں نقل کرنے کی گنجائش نہیں ہے ورنہ میں مکتوبات مجددی اور معصومی سے متعدد عبارتیں یہاں پیش کرتا۔ اسی طرح مولانا سندیلوی کا یہ لکھنا کہ ارباب شریعت کو اہل ظاہر صرف شیعۂ باطنیہ کہتے ہیں، عجیب بات ہے کیونکہ صوفیہ حق کی کتابوں میں ارباب شریعت کے لیے یہ لقب بلکہ اس سے بھی ادنیٰ درجے کا لقب موجود ہے۔ ہم میں سے اگر کوئی شخص ان عبارتوں کو نقل کرکے صوفیۂ حق کی ان باتوں کی تردید کر دے تو اسے گستاخ اور منکر تصوف کہہ دیا جائے گا ـــــ اس نمبر میں تصوف سے متعلق چند استفسارات کے جوابات جناب مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی نگران رسالہ نے دیے ہیں۔ ان کے جوابات میں سے بعض کے بارے میں بھی یہ الجھن پیش آتی ہے کہ ان کا جواب کچھ ہے اور بعض مستند کتابوں میں اس کے خلاف ہے۔ مثال کے طور پر ایک سوال میں پوچھا گیا ہے، کیا اولیاء اللہ انبیاء علیہم السلام کی طرح معصوم ہوتے ہیں؟ اس کا وہی مشہور جواب عصمت و حفاظت کے فرق سے دیا گیا ہے لیکن صراط مستقیم میں ہے کہ غیر انبیاء کو بھی عصمت کا مقام حاصل ہوتا ہے۔ حضرت مولانا شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے صدیقین کے مقامات و مراتب کی توضیح کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

پس لابد او را بہ محافظتے مثل محافظت انبیاء کہ مسمی بعصمت است فائز کنند

اسی طرح اولیاء کے تصرف فی العالم کے بارے میں جو جواب مفتی صاحب نے دیا ہے وہ صراطِ مستقیم سے مختلف ہے، اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اولیاء کو صرف عالم شہادت ہی میں نہیں بلکہ عالم مثال میں بھی تصرف کا اختیار دے دیا جاتا ہے۔ اصل میں ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے اکابر کی کتابوں میں اس طرح کی جو باتیں موجود ہیں ان کے بارے میں اظہار خیال کیا جائے اور ذہنوں کو مطمئن کیا جائے لیکن اس کام کو گستاخی شمار کر لیا گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ذہن کی الجھن دور نہیں ہوتی اور بات وہیں رہتی ہے جہاں پہلے تھی ـــــ آخر میں تاسف کے ساتھ یہ اظہار کرنا پڑتا ہے کہ نمبر میں مولانا مودودی کو بدنام کرنے کی جو سعی کی گئی ہے، وہ کوئی مفید کام نہیں ہے۔ مولانا مودودی کو اسلامی تصوف کا مخالف قرار دینا بہتان ہے۔ اس بہتان کو دہرائے چلے جانے کا آخر کیا فائدہ؟ مولانا سندیلوی نے تو مودودی صاحب پر الزام لگانے کے لیے ایک نئی تدبیر اختیار کی ہے اور وہ۔

یدہ تبصرہ
وایت بالمعنی۔ یہ ایک ایسی تدبیر ہے کہ عبارت میں کتر بیونت کی بھی ضرورت نہیں ہے بلکہ لوگ اس
ے پردے میں جو الزام چاہیں لگا سکتے ہیں۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ

از جناب سلام اللہ صدیقی جونپوری۔ صفحات ۲ ۸، قیمت ۸ ۰ منئے پیسے
ناشر:۔ مکتبہ اسلامی ادب للہ پورہ (فاطمان) بنارس۔ یوپی۔

یہ مختصر کتاب جناب سلام اللہ صدیقی نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے سوانح حیات پر مرتب کی ہے۔ موصوف ان موضوعات پر چھوٹی چھوٹی کتابیں مرتب کرتے رہتے ہیں تاکہ لوگ آسانی کے ساتھ انہیں خرید کر پڑھ سکیں۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ بھی چونکہ مسلمانوں کے ایک گمراہ فرقے کا ہدف بنتی رہتی ہیں اس لیے ضرورت ہے کہ ان کے حالات اور ان کی پاکیزہ سیرت سے مسلمان عوام بھی آگاہ ہوں۔ اس مقصد کے لیے یہ مختصر کتاب مفید ہوگی۔ جن موضوعات پر ضخیم کتابیں موجود ہیں ان کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ ان کو سامنے رکھ کر ایک مختصر کتاب تیار کر لینا آسان کام ہے حالانکہ فی الواقع یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اس طرح کے اختصار میں دو چیزیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ انتخاب واقعات اور زبان و بیان۔

جناب مرتب کو زبان و بیان کی طرف خاص توجہ دینی چاہیے، ان کی کتابوں میں یہ پہلو بہت کمزور ہوتا ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر جو چند چیزیں راقم الحروف کو کھٹکی ہیں ان کی نشان دہی اس غرض سے کی جا رہی ہے کہ جناب مرتب ان پر غور فرمائیں۔ سب سے پہلی نظر پیش لفظ کی ابتدائی سطور پر پڑی اور طبیعت میں اس سے انقباض پیدا ہوا اس لیے کہ قرآن کی آیت بھی غلط نقل ہوئی ہے اور اس کا ترجمہ یا مفہوم بھی ناقص ہے۔ دوسری غلطیوں کے علاوہ معلوم نہیں کس طرح اِنَّ الَّذِیْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْکِ کو کاتب نے جَآؤُکَ بِالْاِفْکِ لکھ مارا ہے۔ اس آیت کا جو ترجمہ توسین کی عبارتوں کے ساتھ دیا گیا ہے وہ بتا رہا ہے کہ جیسے اس آیت کی مخاطب خاص طور پر صرف حضرت عائشہؓ ہیں حالانکہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ صـ۱۳ پر جہیز کے عنوان سے مرتب نے جو کچھ لکھا ہے اسے اس جملے پر ختم کیا ہے — حالانکہ یہ جاہلانہ اور مشرکانہ رسوم کا مظاہرہ ہے۔ جہیز میں لڑکیوں کو ریشمی لباس، زیورات اور دوسرے قیمتی سامان دینا، اسلامی سادگی کے خلاف ضرور ہے لیکن اس کو جاہلانہ اور مشرکانہ رسوم کا مظاہرہ قرار

دینا صحیح نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ جملہ غلط جگہ جوڑ دیا ہے۔ ص۲۲۳ پر "ناز و انداز اور
دل جوئی" کا عنوان قائم کیا گیا ہے۔ اس موقع پر "ناز و انداز" کے الفاظ طبیعت پر گراں گزرتے ہیں ——
ص۲۳۳ پر لکھتے ہیں کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو علم تھا کہ سیدہ عائشہ رض پاک دامن ہیں" احادیث و سیر
کا جو ذخیرہ موجود ہے اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آیات کے نزول سے پہلے آپ کو اس کا "علم" نہ
تھا اور یہ واقعہ اس بات کی ایک بڑی دلیل ہے کہ آپ عالم الغیب نہ تھے۔ غیب کی وہی باتیں آپ کو
معلوم ہوتی تھیں جو اللہ کی طرف سے بتا دی جاتی تھیں ——۔ اسی صفحہ پر حضرت اسامہ کے لیے "پرورش کنندہ"
چھپ گیا ہے جو بالکل غلط ہے۔ "پرورش کردہ" ہونا چاہیے۔ ص۲۳۴ کی آخری سطر میں ہے: "اپنے ہاتھوں
سے دوا پلائیں" مرض الموت میں حضور کو حضرت عائشہ کا دوا پلانا معلوم نہیں مرتب نے کہاں سے لکھا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت خلافت، حضرت عائشہ سے اختلاف اور جنگ جمل کے بارے میں
مرتب نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے تشفی تو کیا ہوگی، ذہن میں یہ سوال ابھرنے لگتا ہے کہ حضرت علی کی خلافت
منعقد بھی ہوئی تھی یا نہیں۔ ایک طرف انہیں خلیفۂ راشد ماننا اور دوسری طرف ان کی خلافت کا نقشہ اس
طرح کھینچنا کہ صحابہ کی اکثریت نے زور اور زبردستی سے بیعت کی تھی، ایک متضاد بات معلوم ہوتی ہے
اس کے علاوہ ایک طرف حضرت زبیر اور حضرت طلحہ کے اس اقدام کو صحیح دکھانا جو انھوں نے حضرت علی رض
کے خلاف کیا تھا اور دوسری طرف اس حدیث کو بھی نقل کرنا جس میں حضور نے پیشین گوئی کی تھی کہ ایک
دن ایسا آئے گا کہ حضرت زبیر رض حضرت علی رض سے ناحق لڑیں گے۔ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔ اگر یہ
حدیث صحیح ہے تو پھر وہ سارا ہنگامہ ناحق ہی ثابت ہوگا جو حضرت علی کے خلاف کھڑا کیا گیا تھا۔ اجتہادی
غلطی معاف ضرور ہے لیکن غلطی بہرحال غلطی ہے اس کو صحت کی سند نہیں دی جا سکتی —— پھر یہ کہ جنگ
جمل کے واقعے کی تمام ذمہ داری سبائیوں کے سر ڈال دینا اور بنو امیہ کے بعض مفسد عناصر سے چشم پوشی
کرنا قرین انصاف نہیں ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے اس عنصر کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، مرتب نے
اسے بالکل نظر انداز کر دیا ہے، حالانکہ انھوں نے اپنی کتاب سید صاحب کی سیرت عائشہ کو سامنے رکھ کر
مرتب کی ہے۔ ص۲۸۲ کی ایک عبارت یہ ہے: "علامہ سید سلیمان ندوی نے اس روایت کے ایک
ایک راوی پر سخت جرح کی ہے اور ان کو ضعیف قرار دیا ہے" مرتب نے سیرت عائشہ طبع سوم ص۱۱۷
کا حوالہ دیا ہے، اس حوالے کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ سید صاحب نے متن کتاب میں نہیں، بلکہ فٹ نوٹ

میں تہذیب التہذیب کے حوالے سے اس روایت کے صرف ایک راوی قیس کے بارے میں یہ لکھا ہے

"قیس کو اکثر محدثین نے ثقہ اور ثبت کہا ہے۔ لیکن بعضوں نے ان پر تنقید بھی کی ہے اور ان کو ضعیف، منکر الروایۃ اور ساقط الحدیث بھی کہا ہے اور ان کی حوأب والی اس روایت کی صحت میں کلام کیا ہے۔"

سید صاحب کی اس عبارت کے بارے میں وہ کچھ لکھنا جو مرتب نے لکھا ہے کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ حوالے میں اس طرح کی بے احتیاطی بہت قابلِ افسوس ہے۔ بہرحال ان چند باتوں کی نشان دہی اس لیے کی گئی ہے کہ آئندہ اڈیشن طبع اول سے بہتر ہو۔ (ع۔ق)

ماہنامہ "افق" ترتیب دینے والے۔ بدنام رفیعی، مسعود جاوید ہاشمی۔ صفحات ۴۰۔ قیمت فی پرچہ پچاس نئے پیسے۔ سالانہ چندہ۔ پانچ روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ دفتر ماہنامہ افق۔ منڈی بازار ورنگل۔ آندھرا پردیش۔

ورنگل سے نکلنے والے اس نئے ماہنامے کے دو شمارے پریس سے باہر آچکے ہیں۔ صورت و سیرت دونوں ہی لحاظ سے یہ ماہنامہ دل کش ہے۔ تعمیری و اسلامی حلقۂ ادب کے معروف ادیبوں اور شاعروں کا تعاون اسے حاصل ہے۔ پہلے شمارے میں جناب شبنم سبحانی جنرل سکریٹری، ادارۂ ادب اسلامی ہند نے ادارے کی شش ماہی رپورٹ "منزل بہ منزل" کے عنوان سے شائع کی ہے۔ صالح اور تعمیری اقدارِ حیات کو فروغ دینے کی کوشش متعدد اور مختلف محاذوں پر کی جا رہی ہے۔ یہ ماہنامہ ادبی محاذ پر اپنی جد وجہد مرکوز رکھے گا۔ پہلے شمارے کے افتتاحیہ میں لکھا گیا ہے:۔

"ماہنامہ "افق" آپ کو پستی سے بلندی کی طرف۔۔۔ انتشارِ فکر سے کسی واضح اور بہتر نصب العین کی طرف گندگی اور عفونت سے پاکیزگی اور صالحیت کی طرف بڑھنے کی دعوت دیتا ہے۔"

امید ہے کہ سلیم الفطرت ادبا و شعرا اس دعوت کو قبول کریں گے۔ ماہنامہ کا دوسرا شمارہ پہلے سے زیادہ مکمل ہے۔ خدا کرے ہمارے ادیبوں، شاعروں اور تعمیری ذہن رکھنے والے عام قارئین و ناظرین میں احساسِ ذمہ داری پیدا ہو تاکہ "افق" کا قدم آگے ہی بڑھتا رہے۔ احساس ذمہ داری کے فقدان ہی نے ہمارے متعدد ادبی ماہناموں کو شہید کیا ہے۔ (ع۔ق)